کالی قبر
ایم اے راحت
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

بار اوّل ——— ۲۰۰۲ء
مطبع ——— یوایڈنڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— الحرم کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۲۰۰ روپے

ISBN 969-517-077-3

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نیست روڈ، نزد گنگا رام ہسپتال لاہور

مشکلات جب گھر گھیرتی ہیں تو بے بسی ہاتھ پاؤں جکڑ لیتی ہے۔ تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور انسان صرف مقدر کے ہاتھوں کھلونا بن جاتا ہے۔ زیادہ دن پرانی بات تو نہیں ہے۔ حیدر علی صاحب اچھے خاصے تھے' مضبوط ہاتھ پاؤں کے مالک' روشن خیال' زندگی کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے والے۔ ایک بچی کے علاوہ اور تھا ہی کیا ان کی زندگی میں۔ شاداب کو درحقیقت انہوں نے سرسبز و شاداب بنا دیا تھا۔ کھلتا ہوا رنگ' بڑی بڑی آنکھیں' مسکراتے ہونٹ شاید اس کا نام ہی اس کا چہرہ دیکھ کر رکھا گیا تھا۔ رشیدہ بیگم کی اور حیدر صاحب کی زندگی میں شاداب کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میٹرک کیا' انٹر کیا' بی اے کے پہلے سال میں تھی کہ تقدیر کے آسمان پر تاریک بادل چھا گئے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ حیدر علی صاحب اپنے کام سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں کسی بھڑ نے رخسار پر کاٹ لیا۔

شدید تکلیف کا شکار ہو کر گھر پہنچے۔ وہ ساری کارروائیاں کی گئیں جو ایسے موقعوں پر کی جا سکتی ہیں لیکن وہ شاید بھڑ تھی ہی نہیں کوئی ایسا ستارہ تھا جو تقدیر کی گردش میں پھنسانے کے لئے نمودار ہوا تھا۔ گال سوج گیا' تکلیف ایسی بے پناہ کہ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ہسپتال گئے بھلا ایک چھوٹی سی چیز کے لئے ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ کیا توجہ دیتے۔ چھوٹی موٹی سی دوائیں دے دی گئیں لیکن تکلیف نے ایسا بے حال کیا کہ بستر پر لیٹ گئے۔ رشیدہ بیگم اور شاداب ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں' ٹونے ٹوٹکے بھی کئے گئے لیکن بات اگر بھڑ ہی ہوتی تو بات ہی کیا تھی۔ بخار چڑھا' بخار نمونیے میں تبدیل ہوا اور نمونیا آخر کار جان لے بیٹھا۔ لیجئے ساری خوشیاں' سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ دو عورتیں سرپرستی سے محروم ہو گئیں' ان کی آنکھوں کے سامنے تاریکیوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ ماں بیٹیاں سارے خاندان سے محروم' کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک شخص کبھی پورا خاندان ہوتا ہے۔ حیدر علی اس گھرانے کے پورا خاندان تھے۔ ہمارے کے سارے منصوبوں کے ساتھ بچی اور بیوی کے ساتھ جی رہے تھے۔ اکثر ہنس کر کہتے کہ خاندانی منصوبہ بندی والے تو کہتے ہیں کہ دو بچے ہی اچھے لیکن ہم نے ان

پھر بھلا پرواہ کس بات کی' تھوڑا سا وقت گزرنے دو بی اے کر لے اس کے بعد انشاء اللہ اس کے لئے اچھا رشتہ تلاش کریں گے۔ ایک داماد زندگی میں شامل ہو گا' اس کا ایک گھرانہ ہو گا' چلو خاندان بن گیا۔ کون کہتا ہے کہ ہمارا کوئی نہیں ہے۔ ارے ذرا وقت تو گزرنے دو لیکن وقت جس انداز میں گزرا تھا' کھیل ہی بدل گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی تھیں۔ اب زندگی کیسے گزرے گی لیکن زندگی گزر جاتی ہے' وقت خود اپنے لئے راستے منتخب کر لیتا ہے۔ انسان سوچ بھی نہیں پاتا' ایسا ہی ہوا تھا۔

رشیدہ بیگم نے گھر کا نظام سنبھالا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اندر سے کھوکھلی ہو گئی تھیں لیکن بیٹی کی آنکھوں میں چھلکنے والا خوف ہمت بندھاتا تھا' اسے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے' اسے اس کا گھر مل جائے' بس اس کے بعد پرواہ نہیں ہے۔ ایک محافظ مل جائے اسے بس اتنا کافی ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال کر یہ ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ چنانچہ خود کو سنبھالا لیکن دل کا ایک حصہ جو گل گیا تھا وہ سکون نہیں لینے دیتا تھا۔ ہر لمحے شوہر کی آواز کانوں میں سنائی دیتی تھی' ادھر سے آئے ادھر سے گئے۔ یہ کیا........ وہ کیا' ہنسی مذاق' قہقہے' بساط بھر سیر و تفریح لیکن اب کوئی نہیں تھا جو یہ سب کچھ کراتا۔ غم کا احساس رات کی تاریکیوں میں آنکھوں سے پانی بن کر بہتا لیکن اس پانی نے آنکھوں سے بینائی چھین لی۔ رفتہ رفتہ آنکھوں میں دھندلاہٹ آ گئی۔ کسی نہ کسی طرح گر پڑ کر نظر کا چشمہ بنوایا لیکن بات نظر کی نہیں تھی' آنکھوں کا ستارا ہی کھو گیا تھا اور ستارے چشمہ لگانے سے واپس نہیں آتے۔ چنانچہ بہت تھوڑے سے عرصے میں چشمہ بھی بے کار ہو گیا اور آنکھوں کے سامنے گہری دھند چھا گئی۔ آج تک بیٹی سے بس اتنا ہی کہا تھا کہ نظر کچھ گر گئی ہے لیکن بینائی گری اور چارپائی سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گری تو شاداب کو ساری حقیقت معلوم ہو گئی۔ صدمے زندگی کا احاطہ کر چکے تھے' گھر کے حالات بھی اب خطرناک ہو چکے تھے' زندگی کی گاڑی جتنے عرصے چلائی جا سکی چلائی اور اس کے بعد ماں نے ہاتھ جھاڑ دیئے۔ اب کچھ نہیں تھا۔

"اب کیا کریں اماں!"

"کمبخت .... آنکھیں ہی ساتھ چھوڑ گئیں' آنکھیں ہی قائم ہوتیں تو کچھ کرتی۔"

"اماں! نوکری کر لوں؟"

"کیا مطلب؟"

"اماں مجھے نوکری کرنا چاہئے' یہ گھر بہرحال مجھے سنبھالنا چاہئے۔"

"تو نوکری [illegible]

کے لئے نکلو گی تم!"

"ہاں! نوکری کرنی ہے مجھے۔" ماں خاموش ہو گئی۔

اخبار والے سے اخبار لگوا لیا گیا۔ حالانکہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن ضرورت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اخباروں میں اشتہارات دیکھ کر درخواستیں ڈالی جاتی رہیں۔ آخر ایک جگہ سے انٹرویو لیٹر موصول ہو گیا۔ زندگی میں تمہارا ستوں کا پہلا سفر جیسا ہو سکتا ہے' ویسا ہی تھا۔ پہنچ گئی' ہمت سے کام لے کر۔ دوسری لڑکیوں کے ساتھ فرم کے دفتر میں بھی جا بیٹھی۔ ایسی جگہ زندگی میں کبھی کہاں دیکھی تھی۔ صاف شفاف ہال' بہت ہی خوبصورت جگہ یوں لگ رہا تھا جیسے سحر طاری ہو' ایک طلسمی وادی ہو جو آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔ نام پکارا گیا تو یقین نہیں آیا کہ کسی اجنبی زبان نے اس کا نام لیا ہے۔ چپڑاسی نے دروازہ کھولا' اندر پانچ افراد بیٹھے ہوئے تھے' انہی میں درمیان کی میز پر مرزا سلیم بیگ بیٹھے ہوئے تھے' اس فرم کے مالک۔ عمر چالیس سے بیالیس سال کے قریب' ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ زیادہ ہو۔ شخصیت بہت شاندار' آنکھوں میں نرمی' کشادہ پیشانی پر چمک' دوسرے لوگ غالباً ان کے تابعدار تھے۔ ان میں ایک عمر رسیدہ شخصیت جمیل صاحب کی تھی جو اس فرم کے مینیجر تھے۔ پہلا سوال جمیل صاحب ہی نے پوچھا تھا۔

"کوئی تجربہ ہے؟" حالانکہ کسی کو منہ کھول کر جواب دینے کی ہمت اس میں نہیں تھی' یہ شاید اس کی آواز نہیں تھی یا شاید الفاظ بھی اس کے نہیں تھے' زبان سے نکلا۔

"جی سر!......... زندگی کی لاتعداد تلخیوں کا تجربہ ہے۔ تقدیر اچانک کس طرح بگڑ جاتی ہے اس کا تجربہ ہے۔" نگاہیں اس کی جانب اٹھیں' مرزا سلیم بیگ نے بھی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا' وہ جلدی سے سنبھل گئی۔

"میرا مطلب ہے سر! کہ پہلی بار نوکری کے لئے نکلی ہوں جو الفاظ منہ سے نکل گئے ہیں ان کے لئے معافی چاہتی ہوں۔"

"آپ کی درخواست پر آپ کی تعلیم انٹر لکھی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں!"

"مگر ہمیں تو گریجویٹ لڑکی چاہئے تھی' سلیم صاحب کی پرسنل سیکرٹری۔"

"سوری سر!" اس نے کرسی پیچھے کھسکائی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی' سلیم صاحب نے اس کی درخواست اپنے ہاتھ میں لی' اسے دیکھتے رہے پھر آنکھیں اٹھا کر نرم لہجے میں بولے۔

"آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔"

"جی!........" وہ باہر نکل آئی۔ اپنی زندگی کا پہلا انٹرویو دے کر وہ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ تجربہ کچھ بھی نہیں تھا' نہیں جانتی تھی کہ اس انٹرویو کے بعد کے نتائج کیا ہوں گے لیکن جو نتیجہ نکلا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ اسے کمپنی کا لیٹر موصول ہوا تھا۔

"آپ اپنی ڈیوٹی پر آ جائیے' آپ کو منتخب کر لیا گیا ہے۔" یقین نہیں آ رہا تھا' کسی کا کیا ہوا مذاق محسوس ہو تا تھا۔ پھر بھی کمپنی کا لیٹر ہی تھا' اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے پہنچ گئی کہ اس مذاق کی کیا گنجائش تھی۔ جمیل صاحب نے اس کا لیٹر دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہو تا ہے .... آپ یقین کریں گی کہ اس ملازمت کے لئے کتنی کتنی تعلیم کی لڑکیاں آئی ہیں۔"

"لیکن سر!........ کیا واقعی مجھے ملازم رکھ لیا گیا ہے۔"

"جی' فی الحال آپ کی تنخواہ ساڑھے چار ہزار ہو گی' اچھی کار کردگی پر فوراً بڑھ جائے گی بشرطیکہ آپ نے مرزا سلیم بیگ صاحب کو مطمئن کر دیا۔ بہت نرم دل اور اچھے انسان ہیں۔ محنت اور لگن سے کام کیجئے گا۔"

"سر! کیا واقعی........؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جی' آپ کو یقین دلانے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟" جمیل صاحب نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں سر! ایسے ہی تعجب ہو رہا ہے کیونکہ تقدیر نے جس کھیل کا آغاز کیا ہے اس میں کسی بہتری کی گنجائش ذرا مشکل تھی۔ آپ ذرا خود سوچئے تعجب تو ہو تا ہے نا۔"

"بہتر ہے کہ فلاسفر بننے کی کوشش نہ کریں' جب کچھ مل گیا ہے تو اس پر بھروسہ کیجئے گا۔" مرزا سلیم بیگ ہی کے کمرے کا کالر ان کی سیکرٹری کے لئے تھا۔ دوسرا انٹرویو سلیم صاحب نے لیا۔

"آپ کی انگلش کیسی ہے؟"

"بالکل بے کار سر! ایسی کہ اگر غور کروں تو خود اپنے آپ پر ہنسی آئے۔ سر! ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔"

"جی!"

"یہ ہوا کیا ہے؟ مینجر صاحب کہتے ہیں کہ بہت سی تعلیم یافتہ لڑکیاں اس ملازمت کے لئے آئی تھیں۔ سر! آپ یقین کیجئے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار انٹرویو دیا ہے اور سوچا تھا کہ کم از کم سو پچاس بار انٹرویو دوں گی تو کم از کم انٹرویو دینے کا تجربہ تو ہو ہی جائے گا لیکن یہ کیسا تجربہ ہے؟"

"آپ کو برا لگ رہا ہے؟"

"نہیں سر! بہت خوش ہوں میں۔"

"کام شروع کر دیجئے' میں آپ کی رہنمائی کروں گا۔" سلیم صاحب انسان تھے یا نہیں' اتنے نرم اتنی نفیس طبیعت کے مالک کہ ان کی تعریفیں کرتے کرتے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ ان تعریفوں پر رشیدہ بیگم کبھی خوش ہو جاتیں اور کبھی ان کے چہرے پر تشویش کے آثار جھلکنے لگتے۔

"ہر وقت تُو نے سلیم صاحب' سلیم صاحب کی رٹ لگائی ہوتی ہے۔ بیٹا کسی سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے' بعض اوقات انسان کی شخصیت اس طرح ٹوٹتی ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"امی! بہرحال ایک اچھے انسان کو اچھا کہنا بری بات تو نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں ہے لیکن بیٹا اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔" یہ تو خیر تھا ہی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتی۔ اتنی محنت سے کام کرتی کہ خود جمیل صاحب بھی تعریفیں کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ آپ کی پہلی ملازمت ہے لیکن آپ کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس بات کا یقین آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان اس عمر میں ہی اس جگہ تک پہنچ سکتا ہے۔" مرزا سلیم بیگ بھی کبھی کبھی اس سلسلے میں اس کی تعریفیں کر دیا کرتے تھے۔ تنخواہ ساڑھے چار سے بڑھ کر چھ ہزار ہو گئی تھی اور وہ بھی دوسرے مہینے۔ جب اسے چھ ہزار روپے دیئے گئے تو اس نے کہا۔ "سر! یہ کچھ زیادہ نہیں؟"

"کم کرنا چاہتی ہیں آپ؟" کیشیئر نے پوچھا۔

"نہیں سر! میرا مطلب ہے کہ مجھے ساڑھے چار ہزار........"

"فہیم صاحب نے یہ لیٹر بھیجا ہے جس میں آپ کی تنخواہ بڑھانے کی ہدایت کی گئی ہے۔" وہ دوسرے ہی دن پُر مسرت انداز میں مرزا سلیم بیگ کے پاس پہنچی' کہنے لگی۔

"سر! میری تنخواہ بڑھا دی گئی ہے' اس کا مطلب ہے آپ مجھ سے مطمئن ہیں۔"

"ہاں' آپ ٹھیک جا رہی ہیں۔ اصل میں کچھ اور ذمہ داریاں بھی آپ کے سپرد کرنا

چاہتا ہوں۔" مرزا سلیم بیگ نے اپنی نیم غنودہ آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"سر! جیسا آپ حکم دیں۔ ویسے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ یہاں تک محدود ہیں۔ تنخواہ آٹھ ہزار' دس ہزار تک بھی ہو سکتی ہے۔ آپ ہماری فرم کی ایک ذمہ دار خاتون ہیں۔"

"سر! بے حد شکریہ! آپ یقین کیجئے کہ میری امی تو خوشی سے دیوانی ہو گئی ہیں۔ سر! مجبوری ہے ہم لوگ تمام چیزوں کے لئے ضرورت مند ہیں۔"

"آپ لوگوں کو اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو براہ کرم مجھ سے ضرور کہئے گا۔"

"سر! آپ کتنے اچھے انسان ہیں۔" پھر اس اچھے انسان نے ایک نئی ذمہ داری اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میرے ساتھ ایک میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا' کیا آپ یہ شرکت پسند کریں گی؟؟"

"سر! جیسا آپ کا حکم۔" اور مرزا سلیم بیگ اسے اپنی لمبی چوڑی کار میں بٹھا کر چل پڑے۔ کار وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ ان کے برابر بیٹھی ہوئی نہ جانے کیسے کیسے احساسات کا شکار تھی۔ یہ شخص کس طرح کا انسان ہے' اتنا نرم' اتنا ہمدرد' اتنی محبت کرنے والا لیکن کار جب ساحل سمندر کی ایک ہٹ پر رکی تو اسے ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ بہت ہی خوبصورت ہٹ تھا' جہاں ایک چوکیدار موجود تھا' چوکیدار نے سلام کیا۔ مرزا سلیم بیگ نے اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے!" ہٹ میں پہنچنے کے بعد وہ اسے ایک بڑے سے کمرے میں لے گئے۔ صاحب حیثیت لوگ زندگی کو کتنا آسان اور خوشگوار بنا لیتے ہیں۔ اس کا تجربہ اب شاداب کو ہوتا جا رہا تھا۔ خوبصورت ہٹ' اعلیٰ درجے کا فرنیچر' بڑے بڑے شیشے والی کھڑکیوں سے دور نظر آنے والا سمندر جس کی لہریں ساحل کی جانب دوڑ رہی تھیں۔ نہ جانے کس کی تلاش میں لیکن ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں تھا۔ مرزا صاحب نے تو کہا تھا کہ وہ اسے میٹنگ کے لئے لائے ہیں۔ کئی بار آفس میں میٹنگ ہوئی تھی' یہ میٹنگ کیسی ہے' وہ یہ سوال ذہن میں رکھے ہوئے کئی بار مرزا صاحب کی طرف دیکھتی رہی۔ مرزا صاحب نے کچھ کاغذات وغیرہ ایک الماری سے نکال کر میز پر رکھے تھے اور خود ہی ان کا مطالعہ کرتے رہے تھے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا وہ بولی۔

"سر! وہ .... میٹنگ میں کتنے افراد شریک ہوں گے۔" مرزا صاحب نے کاغذ سمیٹے

اور ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

"اصل میں مس شاداب! کچھ عجیب سی باتیں ہیں' کچھ عجیب سے معاملات ہیں۔ میں نے میٹنگ کے لئے ٹائم دیا ہوا تھا لیکن جب میں باہر نکلا تو میں نے موسم کو دیکھا۔ یہاں آسمان پر کبھی کبھی ہی ابر آتا ہے اور آتا ہے تو ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات مچلنے لگتے ہیں۔ بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ موسم کو دیکھ کر میں نے اپنا رخ بدل لیا اور یہاں آ گیا۔ یہاں بیٹھتے ہیں' یہ جگہ پر سکون ہے۔ تھوڑی دیر تک یہاں وقت گزاریں گے' باتیں کریں گے اور اس کے بعد واپس چلیں گے۔ میٹنگ تو ملتوی کر دی گئی ہے۔"

"سر! ایک بات بتایئے۔"

"جی!"

"ہرج نہیں ہو گا اس کا۔"

"نہیں' زندگی میں نفع نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ویسے آپ یقین کیجئے' مس شاداب کہ میری زندگی ایک پیاسا صحرا ہے۔ کیسی کیسی پیاس دل میں لئے جی رہا ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ نہ جانے انسان کی شخصیت کے کیسے کیسے روپ ہوتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ میں کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کا عادی نہیں رہا لیکن لوگوں نے مجھے بڑے نقصانات پہنچائے ہیں۔ کیا بتاؤں آپ کو خیر' خیر چھوڑیئے؟ ارے کچھ پینے کو لاؤ' چائے ہو تو چائے لے آؤ' کولڈ ڈرنک ہو تو کولڈ ڈرنک لے آؤ۔" مرزا صاحب نے اپنے ملازم سے کہا۔ باہر سے آواز آئی۔

"جی صاحب! ابھی لاتا ہوں۔" تھوڑی دیر کے بعد ملازم نے نفیس برتنوں میں کولڈ ڈرنک لا کر رکھ دیئے۔ شاداب نے ملازم کا چہرہ دیکھا۔ ایک عجیب سی مکار سی شکل کا آدمی تھا جس کی آنکھوں میں چیل جیسی کیفیت تھی' تیز اور نفرت انگیز۔ بہرحال مرزا صاحب نے جو کچھ تھا گلاسوں میں تیز خوشبو والا مشروب انڈیلا اور کہنے لگے۔

"بس شاداب! اس وقت کسی تکلف سے کام نہ لیں۔ مالک اور ملازم بے شک ہوتے ہیں' ان کے درمیان ادب و آداب کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی انسان کو انسان ہونا چاہئے۔ پلیز لیجئے۔"

"جی سر!" شاداب نے اپنا گلاس اٹھا لیا۔ بہت ہی خوشبودار مشروب تھا لیکن اس کے ذائقے میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ شاداب نے بمشکل تمام اسے اپنے معدے میں اتارا تھا۔ اس کے چہرے پر بدذائقہ مشروب کی تلخی موجود تھی۔ اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ

اس کا سر بھاری ہونے لگا ہے بلکہ آنکھیں بوجھل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"سر! نہ جانے کیوں اچانک میری طبیعت خراب ہو رہی ہے؟"

"اوہ' اچھا.......... آیئے اٹھئے پلیز یہاں سے۔" مرزا صاحب نے کہا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا اس کے بعد اسے بستر پر لٹا دیا گیا اور پھر یاقی تصورات اس کی زندگی کے سب سے انوکھے اور عجیب تصورات تھے۔ وہ لمحات جو اس پر گزرے تھے اس کے لئے ناقابل فہم تھے۔ ہاں' جب شعور کی واپسی ہوئی تو اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ کس طرح بے حجاب پڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ مرزا صاحب ایک کونے میں بیٹھے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نفیس انسان کو دیکھا جس کی خباثت اب بھی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی لیکن اپنے آپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی' اس نے کہا۔

"سر.......... سر' یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟"

"کیسا محسوس ہو رہا ہے؟"

"سر! یہ آپ کچھ.......... یہ سب کچھ.........." زندگی کا بہرحال تھوڑا سا شعور ضرور رکھتی تھی اور جس چیز کو اس نے سب کچھ کہا تھا وہ سب کچھ ہی تھا۔

"ہاں' کیا حرج ہے؟ آپ محفوظ ہیں' میرے پاس ملازمت کرتی ہیں آپ۔ میں نے آپ سے کہا تھا بلکہ جمیل صاحب نے بھی کہا تھا کہ اگر اعلیٰ کار کردگی رہی تو تنخواہ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو جو کچھ چاہئے' مس شاداب! آپ مجھ سے بے دھڑک مانگ لیجئے اور سنئے' کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اس واقعہ کا تذکرہ آپ کسی اور سے نہ کریں۔ ہفتے میں پندرہ دن میں مہینے میں ایک دن ہم یہاں آیا کریں گے۔ ساحل سمندر سے لطف اندوز ہوا کریں گے۔ زندگی سے لطف اندوز ہوا کریں گے' اس کے بعد آپ کی ترقی کے راستے کھلے رہیں گے۔ آپ میرے پاس ملازمت کریں یا نہ کریں' میرے آفس آئیں یا نہ آئیں جو کچھ آپ کو مل رہا ہے ملتی رہے گا۔ ویسے آفس آنے میں حرج ہی کیا ہے؟ تجربہ ہی ہو جاتا ہے' انسان کو دنیا کا.........." اور شاداب کو دنیا کا جو تجربہ ہوا تھا وہ بڑا سنگین تھا' اتنا بھیانک کہ وقت مقررہ پر واپسی کے بعد وہ اپنی ماں سے بھی اس کا تذکرہ نہ کر سکی جس سے اس نے زندگی کا کوئی راز کبھی نہ چھپایا تھا۔ رات کی تاریکیاں اسے بھرپور احساس دلا رہی تھیں کہ اسے کیا نقصان ہو گیا ہے۔ مکروہ چہرے والا سلیم بیگ تو ایک درندہ نکلا' ایک وحشی' ایک خوفناک شخص۔

دوسرے دن اس نے مرزا سلیم بیگ سے کھل کر بات کی۔

"سر! اب میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ کل جو کچھ ہو گیا ہے اسے سمجھ نہ پاؤں۔"

"اتنا نادان ہونا بھی نہیں چاہئے' آپ نے رات بھر اس کے بارے میں ضرور سوچا ہو گا۔ مس شاداب! کیا کسی سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا ہے' آپ نے؟"

"سر! ابھی تو نہیں کیا لیکن آپ مجھے بتایئے کہ آپ نے مجھے یہ دھوکا کیوں دیا؟"

"یہ دھوکا نہیں ہے' مس شاداب! بلکہ یوں سمجھئے کہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ آپ معصوم ہیں' ملازمت کے لئے نکلی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ملازمت ملتی کہاں ہے۔ ذرا گہری نگاہوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیجئے' کتنے بے روزگار لڑکے اور لڑکیاں دفتروں کے چکر کاٹتے نظر آتے ہیں۔ اصل میں ہمارے یہاں اس کی گنجائش بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیاں نوکری کی تلاش میں بھٹکتے ہیں اور پھر بے چارے نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ سڑکوں پر محنت مزدوری کرنے والے' آپ ذرا دیکھئے تو سہی انہیں۔ آپ کے خیال میں چھ ہزار روپے اتنی حقیر رقم ہے کہ آسانی سے مل جاتی ہے۔ دیکھئے مس شاداب! حقیقتوں کو اپنایئے' کچھ بھی نقصان نہیں ہوا ہے آپ کا۔ زندگی کو کیش کیجئے' عمر کو کیش کیجئے' اپنے حسن کو کیش کیجئے' ورنہ کیا ملتا ہے' کسی دو ٹکے کے کلرک سے شادی ہو جائے گی۔ آپ کی۔ ایک چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں زندگی گزر جائے گی۔ زندگی کا لطف حاصل کرنا ہے تو روشنیوں کی جانب قدم بڑھایئے۔"

"کیا روشنی یہی ہے؟ مرزا سلیم بیگ صاحب!"

"ہاں' دنیا کے بارے میں آپ اتنا کم جانتی ہیں کہ آپ کو بتاتے ہوئے بھی ایک پوری کتاب پڑھانی پڑے گی۔ دیکھو بی بی! کامیاب لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ میں تو تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔ تمہیں بہت آگے بڑھانا چاہتا ہوں.........."

"اس طرح؟"

"کوئی حرج نہیں ہے.......... کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آپ بہت زیادہ غور نہ کریں اس بارے میں۔" کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیا کہتی اس شاطر شخص سے جو شکل سے بے حد معصوم' اپنی کشادہ پیشانی سے ایک روشن خیال اور نفیس طبیعت والا لیکن اندر سے ایک شیطان' ایک ایسا گدھ جس کی شکل پروں سے بالکل خالی ہوتی ہے اور چونچ مڑی ہوئی اور بے حد مضبوط ہوتی ہے۔ وقت گزرنے لگا' بہت کچھ احساس ہوتے رہے اسے۔ مرزا سلیم بیگ نے اسے دوبارہ بھی کئی بار میٹنگ میں شرکت کی پیشکش کی' اس نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور مرزا سلیم بیگ نہ جانے کیوں خاموش ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ

یہاں اس کا مستقبل غیر محفوظ ہے۔ مرزا سلیم بیگ نے اسے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر میں بھی رہ سکتی تھی لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ ماں یہ پوچھتی کہ وہ گھر میں بیٹھ کر تنخواہ کس کام کی لے رہی ہے۔ بہرحال اس کی راتوں کی نیند ختم ہو گئی تھی۔ یہ تو خوشی کی بات تھی کہ اس کی ماں کی آنکھوں کی بینائی متاثر ہو گئی تھی اور وہ اس کے چہرے پر کچھ نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ پھر ایک دن چھٹی تھی' ماں بیٹھی باتیں کر رہی تھی' کہنے لگی۔

"کیا بات ہے' مرزا صاحب کی کہانیاں سنانا بند کر دی ہیں تم نے؟"

"ساری کہانیاں ختم ہو چکی ہیں امی!" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو کچھ ان کے بارے میں مجھے بتانا تھا وہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔" اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"بیٹا! اس کے باوجود میں تم سے ایک بات کہوں گی کہ انسان کے اصلی چہرے کو دیکھنا بہت مشکل کام ہے اور پھر ایسے تجربے کار لوگ بڑے گھاگ ہوتے ہیں محتاط رہا کرو۔ میں نے تم سے پہلے بھی کئی بار یہ بات کہی تھی۔" وہ خاموش ہو گئی لیکن اب اس کی زندگی میں تلخیاں مکمل ہو گئی تھیں اور یہ تلخی اس وقت انتہائی شدید ہو گئی جب ایک دن اس کی حالت خراب ہو گئی اور اس خراب حالت کے جو راستے سامنے آئے وہ بڑے بھیانک تھے۔ اسے علم ہوا کہ مرزا سلیم بیگ کا گناہ اس کے وجود میں پرورش پا رہا ہے۔ اب زندگی اتنی آسان و سادہ نہیں رہی تھی' ماں سے تو اس نے کچھ بھی نہ کہا حالانکہ ماں نے اس کی بگڑی ہوئی کیفیت کو محسوس کیا تھا اور بولی۔

"کیا بات ہے' رات کو کیا کھا لیا جو طبیعت بگڑ رہی ہے؟"

"ایسے ہی اماں! کچھ بازار کی چیزیں کھالی تھیں۔"

"نہیں بیٹی! بازار کی چیزوں سے پرہیز کیا کرو۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بازار کی چیزوں سے پرہیز نہ کرنے کا نتیجہ بھگت لیا تھا اس نے۔

کچھ دن اور گزر گئے' وقت اسے اور بہت سی چیزوں کا احساس دلانے لگا۔ بدن میں ہونے والی تبدیلیاں اسے محسوس ہونے لگیں۔ گو ابھی باہر کے لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن خود اسے ان چیزوں کا احساس اچھی طرح ہونے لگا اور ایک دن یہ احساس ماں کو بھی ہو گیا۔ وہ ماں کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ نیند آ گئی۔ رشیدہ بیگم نے کئی بار اسے آوازیں دیں۔ پھر اسے ٹٹول کر دیکھا اور ٹٹول کر انہوں نے جو کچھ دیکھا اس نے ان کا سانس روک

یا۔ جھنجھوڑ کر اسے اٹھایا' جب وہ اٹھ گئی تو رشیدہ بیگم عجیب کشمکش کا شکار ہو گئیں۔ ان کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"کیا ہوا امی! کیا بات ہے' کیا ہو گیا؟"

"وہ .... وہ .... شاداب وہ ...." رشیدہ بیگم آنکھوں سے اندھی تھیں لیکن عقل کی اندھی نہیں تھیں اور عقل کی اندھی اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ ماں کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا۔ ایک لمحے کے لئے ذہن میں سناٹا تو چھا گیا لیکن کافی عرصے سے کشمکش کا شکار تھی۔ کسی سے تو دل کی بات کہتی کسی سے تو زبان کھولتی۔ ماں نے کہا۔

"شاداب جو کچھ میں محسوس کر رہی ہوں وہ غلط ہے نا بیٹی!" اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور آہستہ سے بولی۔

"نہیں' امی غلط نہیں ہے!"

"کیا.........؟"

"ہاں امی! جو کچھ ہوا ہے اس کی میں آپ کو تفصیل بتاتی ہوں۔" اس نے کہا اور کھڑکی کی جانب رخ تبدیل کر لیا۔ پھر اس نے بغیر کسی کمی بیشی کے پوری داستان ماں کو سنا دی۔ ماں سے بہتر مشورہ دینے والا بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ ماں کو ساری تفصیلات بتاتی رہی' پھر اس نے کہا۔

"اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا امی! کہ اس معاملے میں میرا کتنا قصور ہے۔ انگاروں پر لوٹ رہی ہوں' کانٹوں بھرے بستر پر سو رہی ہوں۔ کیا کروں' کیا نہ کروں' کوئی تجربہ نہیں ہے میرا۔ بتائیے امی! کوئی حل بتائیے اس کا۔ مجھے کچھ نہیں آتا اور جو کچھ میں نے کہا ہے آپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ وہی سچ ہے' نہ اس میں کوئی جھوٹ بولا ہے میں نے نہ اس میں فریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سب کچھ ایک گھناؤنا سچ ہے۔" امی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔

"آپ کو میری مدد کرنا ہو گی۔ آپ کو........." اس نے پلٹ کر دیکھا امی پتھرائی ہوئی بیٹھی تھیں' ان کا چہرہ بے رونق تھا۔ اس نے ایک عجیب کیفیت محسوس کی۔ ماں کے شانے پکڑے تو وہ ایک جانب ڈھلک گئیں۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ "یہ تو اچھی بات نہیں ہے .... یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ کیا آپ نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا'

ہوئی' پڑوسی کم از کم اس حد تک تو کام آ ہی جاتے ہیں' معمولی سی بات تھی۔ آج کل دل
مرض عام ہے۔ اچھے خاصے بیٹھے بٹھائے آدمی کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور وہ زندگی سے محرو
ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی کچھ خیالات پڑوسیوں کے تھے۔ ورنہ معصوم ماں بیٹیوں کا اور کیا ہو
سکتا ہے۔ بہرحال اس پر جو بیتی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ الفاظ میں لکھنا سوائے فاطمی
اور کچھ نہیں ہو گا۔ ماں چلی گئی تھی' قصور کس کا تھا۔ قصوروار سے اس نے کہا۔

"اور مرزا صاحب! میری ماں آپ کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہے۔"

"دیکھو انسان کو بہرحال یہ دنیا چھوڑنی پڑتی ہے' وجہ کچھ نہ کچھ ہوتی ہے۔ میں نے تم
سے پہلے بھی کہا تھا کہ روشنیوں کی جانب قدم بڑھاؤ تاریکیوں کو پیروں سے کچلتی ہوئی آگے
بڑھو۔ تم نے مجھ سے کنارا کشی کر لی ہے' یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تمہیں روکا نہیں
ہے' ہر طرح سے تمہاری مدد کر رہا ہوں۔ اب بھی میں کہتا ہوں کہ .... کہ ...."

"ایک بات سنئے' آپ کو پتا ہے کہ ماں کا انتقال کیوں ہوا؟؟"

"بتا چکی ہو تم کہ تم نے ماں سے اس کا تذکرہ کر دیا تھا۔"

"نہیں' ماں نے خود مجھے ٹٹول کر دیکھا تھا۔ چونکہ اب میں ایک بے شرم اور فاحشہ قسم
کی عورت ہوں' لڑکی پن آپ نے مجھ سے چھین لیا ہے تو میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتی ہوں
کہ میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔" مرزا صاحب ایک لمحے کے لئے چونکے تھے اور
اس کے بعد ان کے چہرے کے پیچھے سے ایک اور چہرہ نمودار ہو گیا تھا' یہ ان کا اصل چہرہ تھا۔

"اول تو میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں' مس شاداب! آپ قانونی اور غیر قانونی
طور پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں اور اگر ایسا ہے بھی تو آپ جا کر گھر بیٹھ
جائیے' دوسرے معاملات جو ہیں میں دیکھ لوں گا' اس کے لئے میں آپ کو پیسے بھجوا دوں گا
لیکن وہ بھی اس شکل میں کہ آپ کسی کے سامنے اپنی زبان نہ کھولیں۔" وہ خاموشی سے وہاں
سے چلی آئی۔ یہ حل نہیں تھا۔ جمیل صاحب سے اس نے کہا۔

"جمیل صاحب! مرزا سلیم بیگ نے مجھے بدترین دھوکا دیا ہے۔ آپ تجربہ کار انسان
ہیں' آپ جانتے ہیں کہ میں فاحشہ نہیں ہوں۔ میں ایک سیدھی سادی لڑکی ہوں' وہ مجھے
دھوکے سے ساحل سمندر پر لے گئے' مجھے کوئی نشہ آور چیز پلا دی اور اب میں ان کے بچے کی
ماں بننے والی ہوں۔ میرا کوئی بھی نہیں ہے اس دنیا میں۔ جمیل صاحب! میں بالکل بے سہارا
ہوں۔ ماں صرف میری کیفیت کی وجہ سے اس دنیا سے چلی گئی۔ آپ غور فرمائیے کیا ملا ہے

نا اس دنیا میں ہو گی۔ ماں' بہن بھائی' بیٹی۔" جمیل صاحب نے انتہائی بے رحمی سے کہا۔

"میری ماں بھی ہے' بہن بھی ہے اور بیٹی بھی ہے اور میں نے ان سب کا تحفظ کیا ہے۔
وہ آج تک مرزا صاحب کے آفس میں نہیں آئیں اور نہ مرزا صاحب آج تک میرے گھر
گئے۔ دیکھو بی بی! یہ ساری چیزیں تو تمہارے بزرگوں کو معلوم کر لینی چاہئیں تھیں۔ میں نے
آج تک کسی کو نہیں دیکھا جو تمہارے بارے میں پوچھنے آیا ہو کہ تم یہاں نوکری بھی کرتی ہو یا
نہیں۔ جو لوگ نوجوان لڑکی کو اس طرح بغیر کسی سہارے کے گھر سے نکال دیتے ہیں انہیں ہر
طرح کی باتوں کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں' تم سے پہلے بھی کئی سیکرٹریاں
آ کر جا چکی ہیں' سب خوش و خرم ہیں۔ تم مرزا صاحب سے تعاون کرو' تمہیں بھی کوئی مشکل
پیش نہیں آئے گی۔" اس کے چہرے پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"ہوں .... ٹھیک تو آپ بھی واقعی اس فرم کے منیجر ہیں اور سارے پروگرام
آپ ہی ترتیب دیتے ہیں۔"

"جی ہاں! کرتا ہوں' آپ میری رپورٹ کر دیجئے۔ آپ کر لیجئے جو آپ سے کیا جا سکتا
ہے۔ کیا سمجھیں؟"

"جی' جی .... جی' جی سمجھ رہی ہوں۔" وہ وہاں سے چلی آئی۔ غصے سے کوئی کام
نہیں چل سکتا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اپنی اس ناتجربے کاری کو کس طرح دور کیا جائے۔ دو
چیزیں ہیں یا تو خودکشی کر لی جائے یا پھر حالات کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کیا جائے۔ وہ سوچتی
رہی اور وقت آگے بڑھتا رہا۔ آفس بھی جاتی تھی' تنخواہ بھی مل رہی تھی۔ جب اس کی
: سانی ساخت کافی بگڑ گئی تو جمیل صاحب نے ہی اس سے کہا۔

"سنو' تنخواہ گھر پر ہی مل جائے گی۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے تم اگر چاہو تو خو،
قدم آگے بڑھاؤ۔ میں تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ ایک لڑکی ہے سائرہ' اس سے
ملاقات کر لو وہ تمہاری بہت مدد کر سکتی ہے۔" اس نے سائرہ سے ملاقات کی لڑکی تو خیر وہ تھی
نہیں اٹھائیس انتیس سال عمر تھی۔ ایک ہسپتال میں ریسپشنسٹ کے طور پر کام کرتی تھی۔
:ب اس نے ساری تفصیل سنی تو خوب ہنسی اور بولی۔

"ہوں .... پہلے ہی سمجھ گئی تھی میں' جب جمیل صاحب نے فون کر کے مجھ سے کہا
تھا کہ میں تمہاری مدد کروں۔ جمیل صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ :ب کوئی لڑکی مرزا صاحب
کے ظلم کا شکار ہوتی ہے اور بے سہارا ہو جاتی ہے تو بے چارے جمیل صاحب ہی اس کی مد،

چکی ہوں مگر یہ پرانی بات ہے' اب تو بہت عرصہ ہو گیا میں نے ان کی منحوس شکل دیکھی بھی نہیں۔ چلو خیر میں تمہاری مدد کروں گی۔ یہاں تمہارا نام لکھوائے دیتی ہوں' کوئی احمقانہ قدم اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ اگر ایسے لوگوں کے لئے زندگی دے دی جائے تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ عقل کی بات نہیں ہے۔ تمہیں یہ آسانی ہے کہ تم تنہا ہو اور کوئی تم سے منسلک نہیں ہے۔ ویسے ایک بات کہوں' مرزا سلیم بیگ جیسے بھی ہیں' لین دین کے کھرے ہیں۔ مجھے باقاعدہ اب بھی تنخواہ ملتی ہے اور میرا کام بڑا اچھا چل جاتا ہے۔ تنخواہ تو خیر میں کہہ نہیں سکتی اسے پنشن سمجھ لو' اسے پنشن۔ تو اگر تم بھی پنشن لینا چاہو تو خاموشی اختیار کرو' باقی اخراجات کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" عجیب باتیں تھیں سائرہ کی۔ اگر ان باتوں کی گہرائیوں پر غور کیا جاتا تو ان میں بڑی تلخی چھپی ہوئی تھی لیکن سائرہ کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس تلخی کو آسانی سے محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زندگی کے راستے بگڑتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ہسپتال میں داخل ہو گئی۔ آنے والے لمحات کے تصور سے ہی اس پر خوف کا غلبہ تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر اس پر شدید کرب طاری ہو گیا۔ اس وقت سائرہ کی ڈیوٹی بھی یہاں نہیں تھی لیکن بہرحال نرسوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اسے لیبر روم میں پہنچا دیا جہاں اس نے بہرحال ایک بچی کو جنم دیا۔ اب ننھا سا وجود جو اس کے وجود سے برآمد ہوا تھا نہ جانے کیسی شکل و صورت ہے اس کی یہ ساری باتیں تو صرف دوسروں ہی کو معلوم ہو سکتی تھیں۔ پھر سائرہ اس سے ملی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بچی بہت خوبصورت ہے' تم نے اسے دیکھا؟"

"نہیں۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔

"اس معصوم کا کیا قصور ہے' اسے اپنی بھرپور محبت دو اس سے بھرپور پیار کرو' کیا سمجھیں؟"

"ہاں' ٹھیک ہے۔" وہ آہستہ سے بولی اس کے اخراجات کا بل پراسرار طریقے سے ادا ہو گیا اور پھر وہ اپنے گھر واپس آ گئی تھی لیکن اہل محلہ اب اتنے فراخ دل بھی نہیں تھے کہ اس سے اس بچی کے بارے میں نہ پوچھا جاتا وہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ سائرہ سے کچھ ایسی دوستی ہو گئی تھی کہ وہ ہر مسئلے میں اس کا ساتھ دیتی تھی۔ تقدیر نے بہرحال کوئی نہ کوئی سہارا مہیا کر دیا تھا۔ اپنا آبائی مکان بیچ کر اس نے ایک محلے میں چھوٹا سا فلیٹ لے لیا اور وقت گزارنے لگی۔ دل و دماغ پر وحشت کے سائے رقصاں تھے' اس کا دل پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ وہ اس معصوم بچی کو دیکھ کر بڑی دلبرداشتہ ہو جاتی تھی۔ [illegible]

کا مستقبل؟ اور آخر کار ایک دن وہ پھر وہاں پہنچ گئی جہاں اس کی سیٹ پر ایک اور خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ مرزا سلیم بیگ نے اسے دیکھا اور ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہیلو! تم تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ آؤ .... آؤ بیٹھو۔" وہ تلخ انداز میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے تلخ نگاہوں سے میز پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو اپنا کام چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

"اگر تم چاہو تو لبنی کو میرے بارے میں ساری تفصیلات بتا سکتی ہو لیکن تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا' لبنی میری بہت اچھی دوست ہے۔ وہ ان فضولیات پر یقین نہیں رکھتی' زندگی کچھ لو اور کچھ دو کا نام ہے' وہ اسی کی قائل ہے۔ کیوں لبنی! ارے میں ان سے تمہارا تعارف کرانا بھول گیا۔ یہ مس شاداب تھیں' مس ہیں' مکمل طور پر مس ہیں۔ بس ذرا میری دوست رہ چکی ہیں' کچھ اختلافات کی قائل ہیں اور کچھ نصیحتیں وغیرہ بھی جانتی ہیں۔ تمہیں انہوں نے بڑی طنز بھری نگاہوں سے دیکھا تھا سوچا ہو گا کہ مجھے بلیک میل کریں گی اور تمہیں بتانا چاہیں گی کہ میں کیسا ہوں۔ اب ایسا کرو کہ تم خود ہی انہیں کچھ بتا دو۔ ہاں مس شاداب! مس لبنی بھی میرے ساتھ ساحل سمندر کی اس ہٹ میں جا چکی ہیں لیکن خوش بختی سے انہوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور میں بھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہا ہوں' جانتی ہو ان کی تنخواہ کیا ہے۔ پندرہ ہزار' اور ان پندرہ ہزار میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ ان کی محنت ان کے تعاون کی وجہ سے سنا ہے تمہارے ہاں بچی ہوئی ہے؟"

"جی!"

"کیا نام رکھا ہے اس کا؟"

"فرخندہ بیگ!" اس نے ایک بھرپور حملہ مرزا بیگ پر کیا۔

"خوب' فرخندہ بیگ ویسے نام کچھ ثقیل سا ہے تم نے اس کے ساتھ بیگ کا نام کیوں لگایا ہے؟"

"اس لئے کہ جب وہ جوان ہونے کے بعد کسی فرم میں ملازمت کے لئے پہنچے تو اسے یہ کہنے میں دقت نہ ہو کہ وہ مرزا سلیم بیگ کی بچی ہے۔" شاداب نے مسکراتے ہوئے کہا اور محسوس کیا کہ اس کی لگائی ہوئی ضرب مرزا سلیم بیگ کو زخمی کر گئی ہے وہ الجھ کر رہ گیا تھا اور پھر وہ اس جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں گھر آ کر اسے سکون کا احساس ہوا تھا۔ وہ فرخندہ کے ساتھ کھیلتی رہی تھی [illegible] امید نہیں تھی کہ مرزا سلیم بیگ اس طرح اس کے

پاس آ جائے گا فلیٹ کے دروازے کی بیل بجی تھی وہ یہی سمجھی تھی کہ شاید سائرہ آگئی ہے سائرہ اکثر اس کے پاس آ جاتی تھی۔ دروازہ کھولا تو مرزا سلیم بیگ سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے رستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"آیئے مرزا صاحب! اب تو وہ شعر اتنا فرسودہ ہو گیا ہے کہ اسے پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ پتا نہیں کسی جدید دور کے شاعر نے اس سلسلے میں کوئی اچھا شعر کیوں نہیں کہا۔ آپ تشریف لایئے ذرا دیکھئے کیسی ہے وہ' اچھی لگے گی وہ آپ کو۔" سلیم بیگ اندر داخل ہو گیا اس نے خود پلٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا' پھر وہ دو قدم آگے بڑھا اور فلیٹ کو دیکھتا ہوا بولا۔

"اچھا فلیٹ ہے۔"

"آپ کی بیٹی کی پرورش اس میں بہت اچھی ہو گی۔"

"بار بار تم ایک ہی الفاظ کہے جا رہی ہو' ہو سکتا ہے کہ یہ میری بیٹی نہ ہو' تم نے کیا ثبوت رکھا ہے اس کے لئے۔"

"اس کی کشادہ پیشانی' اس کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں' دونوں چیزیں آپ پر گئی ہیں۔ اس کے باوجود اگر آپ نہ ماننا چاہیں تو نہ مانیے۔ آپ اطمینان رکھئے کہ میں یہ دعویٰ بھی نہیں کروں گی کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ بات ختم ہو گئی' پرانی ہو گئی۔ اب تو نئے انداز میں ہی سوچنا ہو گا۔ خیر دیکھنا تو نہیں ہے فرخندہ کو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی جی فرمایئے! آیئے ذرا آرام سے بیٹھئے۔ بہرحال آپ نے بھی مجھے کئی بار آرام سے بیٹھنے کی پیشکش کی ہے۔ میرا بھی یہی فرض بنتا ہے۔"

"ڈرامہ مت کرو شاداب! میں ڈرامے پسند نہیں کرتا۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ چلئے غیر ڈرامائی انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ یہ بتایئے آپ کو اس فلیٹ کا پتا کیسے معلوم ہوا۔"

"یہ اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ جمیل احمد نے پتا معلوم کر لیا۔"

"ایسا وفادار مینجر بھی آپ کو مشکل ہی سے ملے گا۔ اس کی تنخواہ میں بری سیکرٹری کے آنے پر کتنا اضافہ ہو جاتا ہے' بیگ صاحب!"

"یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ تم اگر چاہو تو اپنے آپ کو آزما سکتی ہو۔ ہم لوگ اس کے لئے تیار رہتے ہیں کہ کوئی ہم پر وار کرے' ہم اس وار کا مقابلہ کریں۔ مقابلے کے بغیر جینا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر تم مجھ پر کوئی دعویٰ کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ مجھے [illegible]

میں کوئی دقت نہیں ہو گی کہ فرخندہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں کہ صاحب حیثیت لوگ اپنا مشیر قانون رکھتے ہیں اور وہ مشیر کسی طرح جمیل احمد صاحب سے کم نہیں ہوتا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ بہت مشکل ہے۔ بس ایسے ہی سوچ رہی تھی کہ آپ کی بیٹی کا کیا کروں' کس طرح پرورش کروں اس کی۔ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ یہ چند روز میں جوان ہو جائے تو اسے آپ جیسے کسی شخص کی فرم میں ملازم کرواؤں اور ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جائے اور میرے دل کو ٹھنڈک حاصل ہو۔"

"سنو' اگر میں چاہوں تو اس بچی کو اغوا کرا کے کسی گورنس کی تحویل میں بھی رکھ سکتا ہوں۔ میرا مشورہ مانو تو اسے کھونے کی کوشش مت کرو' اس کی پرورش کرو تم۔ تمہیں اخراجات .... جیسا کہ میں نے کہا ہے ملتے رہیں گے اور اس کی پرورش میں بھی تمہیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ جس مشکل میں تم نے مجھے ڈال دیا ہے اس کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے میرے پاس۔ ہاں اگر تم خود اس کی دشمن ہو تو دوسری بات ہے۔ اپنی دشمنی جس طرح چاہو نکالو' برباد کر دو اسے۔ ظاہر ہے انسان کسی سے اتنا ہی متعلق رہ سکتا ہے جتنا اس کے لئے ممکن ہو۔" شاداب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"بڑی خوش نصیب ہے یہ بچی' کم از کم یہ پیشکش کر کے مرزا صاحب آپ نے یہ تسلیم تو کر لیا کہ یہ آپ ہی کی بچی ہے اور اس کے لئے جو محبت آپ کے دل میں ابھر رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔" مرزا سلیم بیگ کا چہرہ ایک لمحے کے لئے ست گیا تھا۔ نہ جانے وہ کس سوچ کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا خیال میں ڈوبا رہا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"میں غیر جذباتی آدمی ہوں' اس بات کو ذہن میں رکھنا۔ کسی بھی صورت میں تمہارے کسی جال میں گرفتار نہیں ہوں گا۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا' سمجھ لو کہ انسانی ہمدردی کا عمل تھا۔ اس دنیا میں لاتعداد بچے والدین کی شفقت سے محروم ہوتے ہیں لیکن زندگی گزار لیتے ہیں۔ اب تمہارا دل جو چاہے کرو اس کے ساتھ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" یہ کہہ کر مرزا سلیم بیگ وہاں سے چلا گیا لیکن بہرحال شاداب کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ ماں باپ تو خیر دنیا سے چلے ہی گئے تھے۔ اپنی زندگی تھی اور اب اس کے بعد فرخندہ کی زندگی تھی جسے وہ پیار سے سونو کہتی تھی' یہ اس نے پیار کا نام رکھا تھا' وہ سوچنے لگی کہ کیا کرنا چاہئے اور پھر ایک دن اس کے ذہن میں جنون نے سر ابھارا۔ وہ خوبصورتی سے میک اپ کر کے تیار ہو گئی کہ بازار میں نکلے اور برائی کے راستے کو اپنائے۔ اس نے آئینے میں اپنا حسن و جمال [illegible]

جاتا۔ وہ انسانوں کو راستے سے بھٹکانے کا کام کرنا چاہتی تھی۔ خصوصاً مرد جو بہرحال اس کے خیال میں یکساں ہی ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی تھی کہ باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ سائرہ اس کے پاس آ گئی۔ سائرہ نے اسے تشویش کی نگاہوں سے دیکھا۔ اس دوران کئی ملاقاتوں میں سائرہ اس کے بارے میں جان گئی تھی۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شاداب شدید ذہنی بحران کا شکار ہے اور بہت مشکل سے وقت گزار رہی ہے۔ اس نے تھوڑی بہت شاداب کی مدد بھی شروع کر رکھی تھی اور شاداب نے بہ حالت مجبوری اس مدد کو قبول کر لیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"بہت سوں کے احسان اتارنے۔" شاداب نے جواب دیا۔

"یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

"بری لگ رہی ہوں؟" شاداب نشیلے لہجے میں بولی۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

"ہاں، بری لگ رہی ہو۔ اس لئے کہ تمہارا قدرتی حسن اس مصنوعی حسن سے لاکھ درجے بہتر ہے۔"

"فضول باتیں کر رہی ہو۔ میرا قدرتی حسن اس قدر مکروہ ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے شفاف چہرے کے پیچھے گناہ کی ایک داستان ہے۔"

"دیکھو شاداب! پہلے بھی میں نے تمہیں بتایا ہے کہ زندگی کو جینا ایک مشکل کام ہے، کھو دینا آسان کام .... اور ہمیں زندگی کو لینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لاکھوں گناہ کئے ہوتے ہیں انسان نے زندگی میں۔ کہیں ایک نیکی کرنے کا موقع مل جائے تو اس سے گریز کیوں کرتی ہو؟"

"نیکی، کیا اب نیکیوں کی گنجائش ہے؟"

"اچھا فضول باتیں مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ کہاں جا رہی تھی؟"

"کمانا گناہ کی تلاش میں۔ کوئی مرزا سلیم بیگ مل ہی جائے گا۔ نیکی بھی ہو جائے گی کہ کم از کم سونو کی پرورش کے لئے کچھ رقم حاصل ہو جائے گی۔ اب یہی ایک طریقہ ہے زندگی گزارنے کا۔"

"بالکل نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مرزا سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اس کے بعد نہیں جب تمہیں بتایا تھا۔"

"ہاں، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ دوبارہ تم تک پہنچے لیکن ڈیئر .... تمہیں زندگی گزارنے کے لئے یہ راستہ اختیار کرنا زیب نہیں دیتا کیونکہ بنیادی طور پر تم بہت سی ذمہ داریوں کی حامل ہو۔"

"ذمہ داریاں؟"

"سو فیصدی ذمہ داریاں۔ تم ایک بچی کی ماں ہو، تمہیں اس بچی کو پروان چڑھانا ہے۔ ویسے اس وقت تم واقعی یہ بتاؤ کہ کہاں جا رہی تھی؟"

"سچ بتا رہی ہوں کہ میں نے زندگی کے لئے ایک راستہ منتخب کر لیا ہے۔"

"نہیں، تمہیں وہ راستہ نہیں منتخب کرنا، میں نے تمہارے لئے بات کی ہے۔ ڈاکٹر فرہاد جو ہمارے ہسپتال کے انچارج ہیں، اس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ ایک غیر تربیت یافتہ لڑکی کو ہسپتال میں نرس کے لئے ملازمت دے دیں اور اس کے بعد تمہیں نرس کی تربیت دلوا دی جائے۔ یہ بہت بہتر ہو گا تمہارے حق ...."

"لیکن ...."

"نہیں کچھ نہیں، بس چند روز باقی رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر فرہاد ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں جرمنی گئے ہوئے ہیں جیسے ہی وہ واپس آئیں گے میں تمہیں ان سے ملوا دوں گی۔ تم اس وقت تک گزارہ کرو۔ ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں۔"

"ہاں، بولو۔"

"سونو کے لئے تم کہیں اور بندوبست کر دو۔ میں بھی تمہیں اس سلسلے میں ایک پیشکش کر سکتی ہوں۔"

"کیا ....؟"

"میری ایک رشتے کی خالہ ہیں۔ اگر ہم سونو کو ان کے ہاں پہنچا دیں اور وہ وہاں پرورش پائے تو کیسا رہے گا؟ خالہ کو تھوڑا بہت معاوضہ دے دیا کریں گے۔ ارے .... میری شکل مت دیکھو۔ میں نے کہا نا تم سے کہ میں تمہارے لئے ملازمت کا بندوبست کر دوں گی۔"

"ہوں۔" اس نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی۔

"اس کے علاوہ ایک اور خیال میرے دل میں بار بار آتا ہے۔"

"کیا؟"

"بس .... اچھا خیر چھوڑو۔ تم ایک کام تو ضرور کرو۔"

"کیا؟"

"بس رہنے دو .... وہ بھی تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔" سائرہ نے نہ جانے کس خیال کے تحت اپنا ارادہ بدل دیا پھر اس نے سو سو روپے کے دو نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اب تم ایسا کرو' یہ چند روز کے لئے اپنا خرچہ رکھ لو۔ ویسے بھی تم احتیاط سے اخراجات کرتی ہو۔ میں تمہیں کچھ اور رقم دوں گی' بس تم انتظار کر لو۔ تھوڑے سے دن .... بس تھوڑے سے دن۔" سائرہ نے اسے ایک ایسا گناہ کرنے سے روک دیا جو نہ جانے شاداب کی زندگی میں کیسے کیسے حادثوں کو جنم دیتا۔ اس رات شاداب ساری رات روتی رہی تھی۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا مرزا سلیم بیگ پر۔ وہ جانتی تھی کہ ماں صرف اس لئے دنیا کو چھوڑ گئی تھی کہ اس سے اس کی یہ برائی برداشت نہ ہو سکی تھی لیکن اس برائی میں اس کا اپنا کیا ہاتھ تھا۔ اس کا جواب تو ماں کے پاس بھی نہ تھا۔ کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی اس پر دوسری صبح کہ اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ دوپہر کے بعد اس نے پھر ویسا ہی میک اپ کیا۔ سونو کو گھر کے کمرے میں بند کر دیا۔ دودھ وغیرہ پلا دیا تھا' اس نے سونو کو اور اس کے بعد وہ تیار ہو کر وہاں سے چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد آٹو رکشہ مرزا سلیم بیگ کی فرم کے سامنے رکا اور وہ زرق برق سیڑھی چڑھتی ہوئی مرزا سلیم بیگ کے آفس میں داخل ہوئی۔ اس وقت جمیل احمد اور سلیم بیگ آپس میں بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ نئی سیکرٹری بھی اپنے میز پر بیٹھی کام کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر تینوں چونک پڑے۔ مرزا سلیم بیگ کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔ جمیل صاحب نے اٹھنے کی کوشش کی تو شاداب نے دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

"اگر آپ نے قدم باہر نکالا جمیل احمد صاحب تو یہ پیپر ویٹ مار کر دیوار کے سارے شیشے توڑ دوں گی' ہر چیز کو تباہ و برباد کر دوں گی۔ آپ تشریف رکھئے اس وقت' بڑے اہم مسئلے کے لئے یہاں آئی ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ یہ دفتر ہے تمہیں پتا ہے۔ یہ ڈرامے بازی یہاں تمہارے حق میں کتنی نقصان دہ ہو گی۔" جواب میں وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔

"مرزا صاحب' آپ مجھے کسی الزام میں گرفتار کرا دیں گے بند کرا دیں گے۔ نتیجہ کیا ہو گا۔ وہ بچی مر جائے گی' بھوک سے بلک بلک کر' برے حالات میں۔"

"میں کہتا ہوں کہ تم چاہتی کیا ہو؟"

"کچھ نہیں' آپ دیکھئے مجھے غور سے دیکھئے۔ میں نے بدن کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔

آپ ہی نے مجھے اس راستے پر لگایا ہے۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ مرزا صاحب اس کاروبار میں کتنا منافع ہے۔ اس بارے میں تو میں نے پہلے سوچا ہی نہیں تھا' ورنہ شروع سے ہی اس لائن میں آ جاتی۔ کم سے کم ڈھنگ کی زندگی تو گزرتی۔ ماں کو اس طرح مرنا تو نہ پڑتا۔ خیر' آپ نے ایک فاحشہ کو جنم دیا ہے۔ آپ کو مبارک' یقینی طور پر یہ بات آپ کی سمجھ میں بھی آ گئی ہو گی اور آپ کو اس کا منافع بھی حاصل ہو گا' آنے کے بعد۔ میرا مستقبل بنا دیا ہے' آپ نے اور دیکھئے کیا دلچسپ بات ہے کہ آپ نے کسی کی اولاد کو اس راستے پر لگایا ہے اور آنے والے وقت میں فرخندہ بھی جوان ہو گی۔ میرے بڑھاپے کا سہارا' خوبصورت بچی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا۔ آپ کے چہرے کے نقش بھی جھلکتے ہیں۔ جوان ہو کر وہ قیامت ہو گی۔ قیامت تو ابھی بھی گزر رہی ہے اس دنیا میں۔ اچھا خیر چھوڑیئے' آپ سے تو میرے رابطے زیادہ دلچسپ ہو چکے ہیں۔ جمیل احمد صاحب' آپ بھی زیادہ بوڑھے نہیں ہیں۔ کیا خیال ہے؟ مجھ میں دلچسپی لیں گے۔ معاوضہ نہ ہونے کے برابر میں اپنے آپ کو زیادہ مہنگا بیچنے کی عادی نہیں ہوں۔" سلیم احمد صاحب غصے سے کھڑے ہو گئے۔

"فوراً نکل جاؤ یہاں سے ورنہ ...."

"جی .... ورنہ .... یہ ورنہ آپ کو نقصان دے گی' مرزا صاحب! ورنہ کے آگے کچھ رہ نہیں گیا۔ میں تو نکل ہی پڑی ہوں ان راستوں پر اور مجھے خوشی ہے کہ آپ جیسے بڑے آدمی کی اولاد بھی آخر کار دوسروں کی ہوس کی بھینٹ چڑھے گی۔ آپ کی مرضی ہے اگر میں آپ کے لئے قابل قبول نہیں تو نہ سہی۔ اب یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ انسان ہر جگہ اپنا مقصد پا لے۔ ٹھیک ہے' ویسے جمیل احمد صاحب! آپ بے شک عمر رسیدہ ہیں لیکن مجھے شوقین آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے کبھی اپنا شوق پورا کرنے کا خیال آئے تو میں حاضر ہوں۔ فلیٹ کا پتا آپ کے علم میں ہے' تشریف لے آیئے کبھی۔" اس کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آئی۔ بڑا لطف آیا تھا اسے' بیگ صاحب کے دل پر کچوکے لگاتے ہوئے لیکن گھر پہنچی تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ سونو اس طرح بسور بسور کر روئی تھی جیسے اسے ماں کے سارے غموں کا احساس ہو۔ وہ خود بھی بچی کے ساتھ رو پڑی۔

"کیا کروں بتا' اب کیا کروں۔ پتا نہیں کس کی غلطی .... میری .... تیرے باپ کی' میری ماں کی یا میرے باپ کی جس نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ چل ہو گا کوئی دیکھا جائے گا۔ اب جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ مجھ سے تعاون کیا کر میری بچی! مجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گا تیرا؟" جب سائرہ کو ساری باتیں معلوم ہوئیں تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"غلطیوں پر غلطیاں کئے جا رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مرزا کے دل میں اپنی بچی کے لئے کوئی احساس جاگ اٹھے۔ بھلا اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ بچی کو اغوا کرائے اور کہیں کسی کے پاس پرورش کے لئے چھوڑ دے۔ تم سمجھ لو کہ تم اپنی بچی سے محروم ہو جاؤ گی۔" بات واقعی سچ تھی۔ بڑے لوگوں کے لئے چھوٹے موٹے کام کرانا کون سی مشکل بات ہوتی ہے۔ اس نے کہا۔

"تو اب میں کیا کروں؟ میں تو یہ قدم اٹھا بیٹھی۔"

"خالہ کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ یہ کام کرنا تو ہے۔ تم بس وہیں جا کر اس سے مل لیا کرنا۔ میرا مطلب ہے سونو سے۔ دیکھتے ہیں کہ تقدیر نے آگے کیا لکھا ہے۔" سونو کو ان بزرگ اور مہربان خاتون کے پاس پہنچا دیا گیا۔ جنہوں نے کچھ لینے سے بہت گریز کیا تھا لیکن خود ان کا بھی کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ بہت سے معاملات طے ہو گئے۔ بے شک شاداب کو اپنے فلیٹ میں ہی رہنا تھا لیکن سونو سے ملنے کے لئے ایک وقت مقرر کر لیا گیا تھا۔ سارے معاملات کا ایک طریقہ کار منتخب کر لیا گیا تھا اور یہی مناسب بھی تھا۔ غرضیکہ زندگی کی گاڑی اس طرح آگے بڑھی۔ حسین و جمیل شاداب جب ہسپتال میں اپنا کام شروع کرنے کے لئے تیار ہوئی تو ہسپتال میں انقلاب آگیا۔ ایسی خوبصورت نرس دوسری کوئی نہیں تھی۔ ڈاکٹر حیات عمر رسیدہ آدمی تھے لیکن وہ شاداب کو دیکھ کر دل و جان سے اس پر فدا ہو گئے اور جب شاداب نے ان سے کہا کہ وہ ایک بچی کی ماں ہے تو ڈاکٹر حیات نے اس طرح آنکھیں پھیر لیں جیسے شاداب سے جان پہچان ہی نہ ہو۔ بہرحال سارے کام چلتے رہے۔ ڈاکٹر حیات کے سر سے شاداب کی محبت کا بھوت اتر گیا۔ باقی اچھے اور شریف لوگ تھے۔ انہوں نے وہاں شاداب کو عزت کے ساتھ ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔ شاداب کو اپنی بچی کا مستقبل بھی عزیز تھا۔ جو اب تین سال کی ہو چکی تھی اور اب شاداب کو اس کے لئے نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ فلیٹ پر تو وہ بہت کم رہا کرتی تھی۔ جب تک خالہ کے پاس رہتی سونو کھیلتی رہتی لیکن جب وہ تیار ہو کر اپنی ڈیوٹی پر جانے لگتی تو سونو اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر بلبلانے لگتی۔ شاداب کو مجبوراً اسے جھٹک کر جانا پڑتا تھا۔ رات کو جب وہ ڈیوٹی سے واپس آتی تو سونو بھی سوئی ہوئی ہوتی۔ روتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ بہرحال شاداب کو ایک سہارا مل گیا تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھی کہ ایک اور نوجوان اسے ملا۔ ہسپتال میں مریض کی حیثیت سے آیا تھا۔ جس بیماری کے تحت آیا تھا وہ ٹھیک ہو گئی لیکن وہ شاداب کا بیمار ہو گیا۔ اچھی شکل و صورت کا خوبرو جوان تھا۔ جب اس نے شاداب سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو

شاداب نے اسے بھی غافل رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک تین سالہ بچی کی ماں ہے۔ اس نے اسے اپنے تمام حالات بتائے اور ناصر اس کے باوجود اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گیا۔

"میں تمہیں مجرم نہیں سمجھتا شاداب! اس لئے کہ تم اس معاملے میں بے گناہ ہو۔"

بہرحال ناصر نے اس سے شادی کر لی اور شادی کے ایک سال کے بعد شاداب کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور ناصر کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے کہا۔

"ہم اپنے بیٹے کا نام عامر رکھیں گے۔ کیا تمہیں یہ نام پسند ہے؟"

"بہت .... ایک بات میں تم سے کہنا چاہتی تھی ناصر! خوفزدہ ہوں کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اب سونو چار سال کی ہو چکی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے اسکول میں داخل کرا دوں۔ کیا داخلے کے وقت تم فارم میں اس کے باپ کی جگہ اپنا نام لکھنا پسند کرو گے؟" ناصر کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"دیکھو شاداب! انسانیت کو ایک حد تک انسانیت کے طور پر استعمال کرنا جائز ہوتا ہے لیکن شرافت اور بے وقوفی میں فرق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ایسے بچے کو نام دینا پسند نہیں کروں گا جو تمہاری ناجائز اولاد ہے۔"

"ناصر! وہ لڑکی ہے۔ یہ اس کی زندگی کا سوال ہے۔ لڑکے تو گزارا کر ہی لیتے ہیں لیکن اسے قدم قدم پر باپ کے نام کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کیا اس سلسلے میں یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مرزا سلیم بیگ سے گفتگو کرو۔" ناصر نے آخری لہجے میں کہا پھر بولا۔

"میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس کے تمام اخراجات اٹھا رہا ہوں اور اگر تم اسے اسکول میں داخل کرانا چاہو تو میں یہ کڑوی گولی بھی نگل لوں گا۔ کیا سمجھیں؟" وہ خاموش ہو گئی۔ ادھر اس نے ہمیشہ یہ بات محسوس کی تھی کہ ناصر سونو سے نفرت کرتا ہے۔ کسی بھی طور وہ ایک لمحے کے لئے سونو کو اپنائیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ یہ شروع سے لے کر آخر تک کی بات تھی اور اب سونو کو بھی اس کا احساس ہو چلا تھا۔ اس ننھی سی عمر میں ہی وہ اپنے باپ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ جس کا اظہار وہ مختلف طریقوں سے کرتی رہتی۔ چھوٹی سی وحشت کی مالک تھی۔ چنانچہ وہ [illegible] گھر سے باہر نکلتے رہتے [illegible] لوگوں کے

ساتھ تکمیل کر لڑکوں جیسا ہو گیا تھا۔ آتا ہوں' جاتا ہوں' کرتا ہوں' کہتی تھی۔ ناصر باقاعدہ ایک فرم میں ملازمت کرتا تھا۔ اکثر اس کے دوست گھر پر آتے رہتے تھے۔ ایک دو بار اس نے شاداب کو حکم دیا تھا کہ سونو اس کے دوستوں کے سامنے نہ آنے پائے۔ کیونکہ وہ باتیں کریں گے کہ اس کی شادی کو اتنا کم عرصہ ہوا ہے پھر اتنی بڑی لڑکی کا باپ کیسے بن گیا وہ.......... وہ اپنے دوستوں کو حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا۔ ایسے موقعوں پر شاداب اپنی بیٹی کو مکان کے پچھلے حصے میں بند کر دیتی تھی۔ جہاں سونو روتی بلبلاتی رہتی تھی ایک دن اس نے ماں سے کہا۔

"ماں! یہ مرزا سلیم بیگ کون ہے؟" شاداب حیران رہ گئی تھی۔

"کیا وہ میرے ابو ہیں؟"

"تم سے یہ بات کس نے کہی؟"

"تمہارے شوہر نے" سونو نے جواب دیا اور ماں منہ پھاڑ کر رہ گئی۔ شاداب نے ناصر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے پاپا کہے۔ کیا سمجھیں؟ اس لئے میں نے اسے اس کے باپ کا نام بتا دیا۔" سونو بہرحال اسی طرح بڑی ہوتی رہی پھر نہ جانے ایک دن کیا ہوا کہ ناصر نے اس کے ایک تھپڑ رسید کر دیا تو سونو نے اس سے باقاعدہ مقابلہ کیا۔ اس نے ناصر کی قمیض' جو الگنی میں پڑی سوکھ رہی تھی' اٹھائی اور اسے چولہے پر رکھ دیا۔ نئی قمیض جل کر خاکستر ہو گئی۔ جب اپنے اس نقصان پر ناصر نے سونو کو مارنے کے لئے لکڑی اٹھائی تو سونو نے یہ لکڑی پکڑلی۔ ناصر اسے نچاتا تو رہا لیکن وہ لکڑی سونو نے نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے' تم مجھے مار لو' عامر کے ڈیڈی لیکن تم دیکھ لینا کہ ایک دن میرا باپ مجھے آکر لے جائے گا۔ دیکھ لینا تم جو میں کہتی ہوں ویسا ہی ہو گا۔"

"اسے اس کے باپ کے پاس چھوڑ دو۔ اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھو چھوٹی سی عمر ہے اس کی لیکن کتنا جنون پل رہا ہے اس کی آنکھوں میں۔ مجھے ان آنکھوں کو دیکھ کر نفرت کا احساس ہوتا ہے۔"

"بچی ہے ناصر' تھوڑی سی سمجھ دار ہو گی تو اسے خود احساس ہو جائے گا کہ اس کے باپ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے پھر بھول کر بھی اپنے باپ کا نام نہیں لے گی۔"

"ہونہہ' گناہ کی پیداوار کبھی ٹھیک نہیں ہو گی یہ تم چاہے کچھ بھی کر لو۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم بار بار مجھے مجھے گناہ کا حوالہ کیوں [illegible]"

نہیں رکھا تھا۔"

"میں تم سے فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اس بچی کو سمجھا لو کہیں یہ تمہارے مستقبل کی قاتل نہ بن جائے۔"

"میرا مستقبل تو قتل ہو چکا ہے۔ اب اور کیا قتل ہو گا۔" شاداب نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ بہرحال اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ مرزا سلیم بیگ نے پلٹ کر بھی ان کی خبر نہیں لی تھی۔ سونو چھ سال کی ہو گئی۔ شاداب اکثر اپنے دوسرے بچوں کی دیکھ بھال اور اپنے شوہر کی خوشنودی میں مصروف رہتی۔ سونو کے لیے بہت کم وقت نکال پاتی۔ ادھر سونو' ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر گزرتی جو شاداب کے لیے ناقابل برداشت ہوتی اور اس کے نتیجے میں وہ اسے بری طرح دھنک کر رکھ دیتی۔ ایک روز سونو باہر نکل گئی تو تھوڑی دیر کے بعد ایک پولیس والا اس بچی کے ساتھ واپس آیا اور اس نے شاداب سے کہا۔

"یہ آپ کی بیٹی ہے؟!"

"جی کیا ہوا؟"

"بڑی اچھی تربیت دی ہے اسے آپ نے۔ یہ ایک دکان پر کھڑی ہوئی سائیکل لے کر بھاگ نکلی تھی۔ اگر لڑکی ذات نہ ہوتی تو وہیں اس کی اتنی پٹائی ہوتی کہ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے۔ آپ اس کو سنبھالیے' اگر آپ لوگ بچوں کو سنبھال نہیں سکتے تو انہیں پیدا کیوں کرتے ہیں۔" پولیس والا برا بھلا کہہ کر چلا گیا لیکن شاداب نے سونو کو بری طرح مارا اور اتنا مارا کہ اس کے جسم پر نشان پڑ گئے پھر اس نے سونو کو مزید سزا دینے کے لئے اسے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس کے بعد وہ کسی کام میں مصروف ہو گئی لیکن جب وہ رات کو بستر پر آرام کرنے کے لیے لیٹی تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اسے سونو یاد آ گئی تھی۔ وہ بے اختیار اس کمرے کی جانب دوڑی۔ اندر داخل ہوئی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ سونو عقبی کھڑکی سے فرار ہو گئی تھی اور اب کمرے میں اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

☆------☆------☆

سونو جس ماحول اور جن حالات میں پلی تھی۔ انہوں نے اس کے اندر بڑی انوکھی صلاحیتیں بیدار کر دی تھیں۔ وہ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ سمجھ دار' کہیں زیادہ چالاک تھی۔ ہر بات کو غور سے سننا' اسے ذہن نشین کرنا' اسے یاد رکھنا' زندگی کا ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا اس کی فطرت کا حصہ بن چکا تھا اور وہ ہر چیز سے محتاط رہتی تھی۔ ابتدا میں ایک

بار جب شاداب ' ناصر سے اس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے سنا کہ اس کا باپ ناصر نہیں بلکہ مرزا سلیم بیگ ہے۔ مرزا سلیم بیگ کے بارے میں اس نے کئی تفصیلی باتیں ماں سے سنی تھیں۔ سوالات بھی کیے تھے اور ایسے اوقات میں جب شاداب کے دل میں سونو کے لیے محبت کا دریا موجزن ہوتا تھا۔ شاداب نے کئی بار اسے اس کے منحوس باپ کے بارے میں بتایا جس نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر بھی نہیں لی تھی۔ شاداب نے یہ بھی بتایا تھا اسے کہ اس کی ایک فرم ہے اور اس فرم کا نام فلاں ہے۔ شاداب کا خیال تھا کہ چھ سال کی سونو بھلا کیا فرم کا نام یاد رکھے گی اور کیا اپنے باپ کے بارے میں سوچے گی لیکن سونو کے ذہن میں جو لاوا پک رہا تھا' وہ بالکل مختلف تھا۔ اسے اپنے غیر محفوظ مستقبل کا خیال ہمیشہ رہتا تھا۔ ماں صرف سوتیلے باپ کے احکامات پر عمل کرتی تھی۔ اس کے بچوں کو بھی خوشی پروان چڑھا رہی تھی۔ جبکہ سونو کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ سونو اب اس قدر سمجھ دار ہو چکی تھی کہ اب وہ ہر بات کو محسوس کر سکتی تھی۔ ماں بھی شاید اس سے تنگ آئی ہوئی ہے کیونکہ اس کا اکثر اس کی وجہ سے ناصر سے جھگڑا رہتا ہے اور وہ ناصر کی بھی خوشامد کرتی رہتی ہے۔ چلو ناصر جب موجود ہو تب تو اس کی مجبوری ہوتی ہے کہ سونو سے گریز کرے اور ناصر کو خوش رکھے لیکن سونو نے محسوس کیا تھا کہ ناصر نہ بھی موجود ہو تب بھی ماں کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا اور اس چیز نے سونو کو زیادہ دل برداشتہ کر رکھا تھا اور آج جب وہ حد سے زیادہ دل برداشتہ ہو گئی تھی تو اس نے یہی سوچا کہ اب یہاں سے بھاگ جانا ہی اچھا ہے۔ جہاں اس کی کوئی عزت نہیں' جہاں کوئی اس سے محبت نہیں کرتا وہاں رہنا کیسے ممکن ہے اور اس سے فائدہ کیا۔ کھڑکی سے باہر نکل جانا اس کے لیے کوئی مشکل ثابت نہیں ہوا۔ ویسے بھی باہر گلی کے لڑکوں کے ساتھ پلی بڑھی تھی۔ درختوں پر چڑھنا' جامن کے پیڑ پر چڑھ کر جامن توڑنا' گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچ کے بھاگ نکلنا' چھتوں پر' دیواروں پر آسانی سے چڑھنا اور دوسری دیوار پر کود جانا اس کے لیے اب نہایت آسان کام تھا اور اسے اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ سمجھ دار اتنی تھی کہ حرفوں سے لوگوں کو متاثر کر دیا کرتی تھی۔ باہر نکلنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ مرزا سلیم بیگ کو تلاش کرے۔ چنانچہ جب ایک بزرگ اسے راستے میں ملا تو اس نے بزرگ کی قمیض پکڑ کر کہا۔

"مجھے بیگ سنٹر پہنچا دیجئے جناب۔ میں وہیں رہتی ہوں' راستہ بھٹک گئی ہوں۔"

"مگر بیگ سنٹر تو بیٹے عمارت کا نام ہے۔"

"میں وہیں کی بات کر رہی ہوں۔ میرے ڈیڈی مرزا سلیم بیگ ہیں۔ میں ان کے پاس...

...نا چاہتی ہوں۔" بہرحال شکل و صورت ماں جیسی پائی تھی' ہرچند کہ بہت چھوٹی سی تھی اور بہت مشکل حالات میں پلی بڑھی تھی لیکن خدا کی قدرت اس پر بھی مہربان تھی۔ ایک نگاہ دیکھنے والا اسے دوسری نگاہ دیکھے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ شخص بھی متاثر ہوا اور اس نے اپنا وقت ضائع کر کے اسے بیگ سنٹر پہنچایا اور اسے مرزا سلیم بیگ کے آفس پہنچا کر واپس پلٹا۔ سونو کمرے میں داخل ہو گئی۔ مرزا سلیم بیگ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی بچی کو جو برے حال میں تھی اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

"کیا بات ہے' کیا تم بھکارن ہو؟" اس نے سوال کیا لیکن سونو عجیب سی نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے ننھے ننھے سرخ ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"پاپا' میں آپ کی بیٹی ہوں۔ کیا میں آپ کو بھکارن نظر آتی ہوں۔"

"میری بیٹی............ کک کیا مطلب؟"

"پاپا' میری ماں کا نام شاداب ہے۔ ماں نے ہمیشہ مجھے یہی بتایا کہ آپ میرے پاپا ہیں۔ پاپا آپ دیکھ لیجیے کہ میں نے آپ کو دیکھا بھی نہیں لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا۔ میرا نام سونو ہے۔ میں آپ کی سونو ہوں پاپا۔" مرزا سلیم بیگ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس معصوم سی بچی کو دیکھا اور اچانک ہی اس کا کلیجہ پھڑک اٹھا۔ یہ بسورتے ہوئے ہونٹ' یہ بادامی آنکھیں' یہ حسین رخسار' یہ چمکدار رنگ' اس ننھے سے وجود میں شاداب مسکرا رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا سلیم بیگ نے اپنی عادت بد کے تحت شاداب کو نقصان پہنچا دیا تھا اور اس کے بعد اس سے رجوع نہیں کیا تھا لیکن اس بات کا اعتراف اس نے ہمیشہ کیا تھا کہ شاداب جیسے حسن و جمال کی مالک لڑکی اسے دوبارہ نہیں ملی اور سونو اسی شاداب کا عکس تھی۔ ایک لمحے کے اندر ماضی اس کے اندر گھوم گیا۔ اس نے بمشکل تمام اپنے آپ کو اس ذہنی الجھن سے نجات دلائی تھی کہ شاداب اسی کی بیٹی کو برائی کے راستے پر لے جائے گی لیکن اب اس چھ سالہ بیٹی کو دیکھ کر اس کے دل میں محبت کا ایک طوفان جاگ اٹھا۔ اس نے سیکرٹری کو باہر بھیج دیا اور سونو کو پاس بٹھا کر کہا۔

"بیٹی' کہاں رہتی ہو تم؟"

"پاپا' آپ نے مجھے پہچان لیا نا۔"

"ہاں ہاں' پہچان لیا۔ تم کہاں رہتی ہو۔"

"پاپا' ماما مجھ پر بہت ظلم کرتی ہے اور وہ میرا سوتیلا باپ وہ تو دن رات مجھے مارتا رہتا ہے۔ ماما وہ دونوں بہت ظلم کرتے تھے میرے ساتھ۔ ماما انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا

تھا۔ پاپا کسی دن میری مما مجھے مار ڈالے گی۔ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ پاپا آپ کی وجہ سے وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ پاپا مجھے .... مجھے اب وہاں نہیں بھیجو۔ مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔" مرزا سلیم بیگ ششدر رہ گیا تھا۔ سونو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور رو کر گڑگڑا رہی تھی۔ "پاپا مجھے اپنے پاس رکھ لو۔ پاپا وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔" سلیم بیگ کے اندر انسان بیدار ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں تمہیں واپس تمہاری مما کے پاس نہیں بھیجوں گا۔ اطمینان رکھو۔" اور وہ خوش ہو گئی لیکن جمیل صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا۔

"اسے کہیں الگ رکھنا خطرناک ہو گا مرزا صاحب' بہتر ہے کہ آپ ہی ہمت کریں اور بیگم صاحب سے بات کر کے اسے بھی اپنے درمیان جگہ دلوا دیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ لڑکی ذات ہے اور لڑکی کو کسی غیر جگہ نہیں رکھا جا سکتا' لمحوں میں بھٹک سکتی ہے اور ممکن ہے شاداب اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائے۔ آپ خاموشی سے اسے بڑی بیگم کے حوالے کر دیجیے گا۔" مرزا سلیم بیگ بہت سوچتا رہا تھا پھر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ بیوی کو اپنا رازدار بنائے گا۔ چنانچہ وہ سونو کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ مرزا سلیم بیگ کی بیوی نے سونو کو دیکھا تو بولی۔

"ہمیشہ یہی کرتے رہنا' یتیم خانہ بنا رکھا ہے تم نے اس گھر کو۔ کسی نہ کسی کو پکڑ لاتے ہو۔"

"اس بار مسئلہ ذرا مختلف ہے فریدہ۔"

"کیا............؟"

"فریدہ' میرے بارے میں تم جانتی ہو کہ زندگی میں بہت سے کھیل کھیل چکا ہوں اور اب تمہارے سامنے قسم کھا کر ان کھیلوں سے توبہ کر لی ہے۔" فریدہ نے طنزیہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی۔

"جی ہاں' آپ کی نئی سیکریٹری کا نام صوفیہ ہے اور سنا ہے کہ اس کی عمر صرف اکیس سال ہے۔"

"وہ............ وہ دراصل وہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔ اس کی سفارش پر میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔" مرزا سلیم بیگ بیوی کی معلومات سے گھبرا کر بولا۔

"ایک بات سنو مرزا! جب مجھے پہلی بار تمہارے کردار کا علم ہوا تھا تو میں نے اپنے باپ سے جا کر بات کی تھی اور کہا تھا کہ مجھے مرزا سے طلاق دلوا دی جائے۔ میرے باپ نے مجھ

ہمیشہ کے لیے دنیا سے روپوش ہو جائیں۔ مشرقی لڑکیوں کی شان یہ ہے کہ ہر حال میں گزارا کریں اور اپنا وقت نکال لیں۔ بیٹی دو ہی باتیں ہیں اگر تم طلاق لینا چاہتی ہو تو بے شک لے لو لیکن افسوس ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکیں گے۔ دنیا سے ہم یہی کہیں گے کہ بیٹی سسرال میں ہے۔ اس میں ماں باپ کا وقار اور عزت ہوتی ہے۔ اگر تمہارے پاس اپنے قیام کا کوئی بندوبست ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو اور اگر دل چاہے تو گزارا کر لو اور اس کے بعد سے مرزا سلیم بیگ میں صرف گزارا کر رہی ہوں۔ بات سمجھ گئے ہو نا تم۔"

"اب بہت بڑی بڑی کہانیاں نہ سناؤ مجھے۔ یہ بچی یوں سمجھ لو کہ میری ہی اولاد ہے۔ اگر اتنے بڑے دل والی ہو تو تفصیل نہ پوچھنا مجھ سے۔ میں اسے یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر لڑکی ذات نہ ہوتی تو بات الگ تھی۔ کیا سمجھیں؟"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے دیکھیں گے۔ تم لے آئے ہو تمہاری مرضی' چھوڑ دو اسے۔" چنانچہ سونو کو اس گھر میں قیام کی اجازت مل گئی لیکن مرزا سلیم بیگ کی بیوی کوئی فرشتہ صفت عورت نہیں تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ سونو اس کے اپنے بچوں کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اسے خدشہ تھا کہ اس خوبصورت لڑکی کی ماں بھی خوبصورت ہو گی اور یقینی طور پر وہ اسے یعنی مرزا سلیم بیگ کو اس عورت کی یاد دلاتی رہے گی۔ اس کے خیال میں اس کے امکانات بھی تھے کہ کہیں مرزا سلیم بیگ ایک بار پھر شاداب کی طرف مائل نہ ہونے لگے۔ یہ تمام چیزیں اس کے دل میں تھیں اور عورت' عورت کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے اور جو تشدد اور مظالم عورت' عورت پر کر سکتی ہے۔ مرد اس طرح کے مظالم کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ سوتیلی ماں نے سونو پر تشدد شروع کر دیا۔ اسے دن میں صرف ایک بار کھانا دیا جاتا۔ جب مرزا سلیم بیگ موجود نہ ہوتا تو وہ اسے بات بات پر بری طرح مارنے پیٹنے لگے۔ سوتیلی ماں کے مظالم نے سونو کے ذہن میں ایک بار پھر باغیانہ خیالات کی پرورش شروع کر دی۔ یہ بات اب رفتہ رفتہ اس کی سمجھ میں آنے لگی کہ اس دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے اور اسے خود اپنے وجود کو منوانا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنی سوتیلی ماں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ اسے زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی وہ۔ پڑوسی عورتوں کے سامنے سوتیلی ماں کی برائیاں کرتی' اسے گالیاں دیتی۔ اپنے مشغلے بھی اس نے جاری رکھے۔ وہ دیواروں پر چڑھ کر چھت پر چڑھ جاتی اور بری حرکتیں کرتی' جس سے احساس ہوتا کہ مرزا سلیم بیگ کے دوسرے بچے بھی اس کی وجہ سے بگڑ رہے ہیں۔ بہرحال

حیثیت سے اس کے سینے میں سونو کے لیے تڑپ تھی لیکن ناصر کی وجہ سے وہ اس تڑپ سے اپنے آپ کو بچائے رکھتی تھی کہ اس کا گھر بھی قائم و دائم رہے۔ پھر ناصر کہیں کام سے گیا' شاداب نے سونو کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ سائرہ بھی اب موجود نہیں تھی کہ اس سے ہی مشورہ کرلیتی۔ اس کے ذہن نے کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ سونو کو تلاش کرے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی طرح سونو مرزا سلیم بیگ کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ مرزا سلیم بیگ کے آفس جانے کے بجائے بڑی چالاکی سے اس نے مرزا سلیم بیگ کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور آخر کار وہ مرزا سلیم بیگ کے گھر پہنچ گئی۔ بیل بجائی اور جب اندر داخل ہوئی تو مرزا سلیم بیگ کی پہلی بیوی ہی نے اس سے پہلی ملاقات کی تھی۔ اگرچہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھیں لیکن ایک دوسرے کی شناخت میں انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ سونو ان کے درمیان شناخت کا ذریعہ تھی کیونکہ اس کے نقوش ماں سے مختلف نہیں تھے۔

"میرا نام شاداب ہے۔ شاید مرزا صاحب نے کبھی آپ سے میرا تذکرہ کیا ہو۔"

"ہاں' تم مجھے جانتی ہو۔" مرزا سلیم بیگ کی بیوی نے پوچھا۔

"نہیں' میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"میں وہ ہوں جو تم نہیں ہو اور نہ کوئی تم جیسی مجھ جیسی ہو سکتی ہے۔"

"واقعی میں آپ جیسی نہیں ہوں۔ دیکھیے میری بچی سونو آپ کے پاس ہو تو بتا دیجیے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

"میں جانتی ہوں' تمہاری بچی کو بھی جانتی ہوں اور تمہیں بھی جانتی ہوں اور اس کہانی کو بھی جانتی ہوں۔ تم یہی کہنا چاہتی ہو نا کہ سونو مرزا سلیم بیگ کی بچی ہے۔ تمہاری ناجائز اولاد۔"

"جی .... میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔ گھر سے بھاگ آئی ہے اور میں اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ اگر وہ یہاں ہے تو براہ کرم اس کے بارے میں بتا دیجیے۔" اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مرزا سلیم بیگ کی بیوی' سونو سے نفرت کرتی تھی لیکن بہرحال پالیسی کے تحت وہ سلیم بیگ سے انحراف بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مرزا اسے یہاں لایا تھا۔ اگر وہ سونو کو اس کی ماں کے حوالے کردیتی تو مرزا کے غصے کا نشانہ بنتی۔ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں' آپ کی صاحبزادی یہاں آئی تو تھیں لیکن میں آپ کو مبارک باد دیتی ہوں کہ بڑی زبردست بچی کی ماں ہیں آپ۔ کتنی عمر ہوگی اس بچی کی' چھ یا سات سال لیکن کمال ہے صاحب کیا شخصیت پائی ہے۔ ماں سے چھ جوتے آگے ہے۔ جو جوتے کہا سمجھیں، [illegible]

عشق بازی کرتی پھر رہی ہے۔ چھوٹے بڑے بچوں کے ساتھ اور اب میرا خیال ہے کہ یہاں سے بھاگ چکی ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔"

"مگر وہ تو بہت چھوٹی سی ہے۔"

"حیرت کی بات یہی ہے کہ اتنی چھوٹی سی بچی کو میں نے اپنی عمر سے اتنا آگے کبھی نہیں دیکھا۔ براہ کرم آپ یہاں سے چلی جایئے' ورنہ یہاں کئی ملازم ہیں۔ میں آپ کو دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔ جایئے آپ براہ کرم' دفع ہو جایئے یہاں سے۔"

"دیکھیے' بات اصل میں صرف اتنی سی ہے کہ اگر سونو یہاں موجود ہے تو آپ مجھے اس سے ملوا دیجیے' میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتی۔"

"تم نے سنا نہیں' میں کیا کہہ رہی ہوں۔ جاؤ اسے باہر نکال دو۔" مرزا سلیم بیگ کی بیوی نے اپنے ملازموں سے کہا۔ اتفاق سے اسی وقت سونو وہاں پہنچ گئی۔ اس نے مرزا سلیم بیگ کی بیوی اور اپنی ماں کی گفتگو سن لی تھی۔ پہلے تو اس کے دل میں خیال تھا کہ شاداب وہاں سے چلی جائے تو اچھا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن نہ جانے کون سا جذبہ تھا کہ ماں کی بے عزتی اس سے نہ دیکھی گئی۔ پاس رکھا ہوا ایک ڈنڈا اٹھایا اور اس ملازم کے پاس پہنچ گئی جو شاداب کو دھکے دے کر باہر نکالنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

"ہاتھ لگایا اگر تُو نے میری ماں کو تو دوبارہ کوئی چیز اس ہاتھ سے چھونے کے قابل نہیں رہے گا' سمجھا۔" مرزا سلیم بیگ کی بیوی نے غصے سے سونو کو دیکھا اور دانت پیس کر ملازم سے بولی۔

"بال پکڑ کر زمین سے دے مارو اس لڑکی کو۔ ذرا سی پدی' زبان دیکھو۔ سنا نہیں تم نے۔" ملازم' سونو کی جانب بڑھا تو سونو نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا پوری قوت سے ملازم کی پنڈلی پر مارا اور ملازم ہائے کہہ کر نیچے گر پڑا۔ اس کی پنڈلی کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی۔ سونو نے دو تین ڈنڈے ملازم کے اور رسید کیے تو وہ شدت تکلیف سے بے ہوش ہو گیا پھر سونو' مرزا سلیم بیگ کی بیوی کی جانب متوجہ ہوئی تو مرزا سلیم بیگ کی بیوی چیختی ہوئی اندر چلی گئی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ادھر شاداب اتنے عرصے کے بعد بچی کو دیکھ کر شدت جذبات سے پاگل ہو گئی۔ سونو جانتی تھی کہ اب اسے بدترین سزا ملے گی چنانچہ اب یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ باپ کا رویہ بھی دیکھ چکی تھی۔ مرزا سلیم بیگ نے اسے اپنے گھر میں رکھ بے شک لیا تھا لیکن اس کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔ اس کی بیوی' سونو کو بے دریغ [illegible]

میں برداشت کر لیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کے گھر کا ماحول خراب ہوتا۔ چنانچہ سونو یہاں سے بددل ہو گئی تھی۔ جب شاداب نے رو رو کر اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ واپس چلے تو وہ تیار ہو گئی اور ماں کے ساتھ گھر چل پڑی۔ اس نے کہا۔

"دیکھو ماں' حالات اب بدل گئے ہیں۔ میں نے جینا سیکھ لیا ہے۔ اگر تمہارے شوہر نے مجھ پر تشدد کیا تو پھر یہ بات سمجھ لو کہ اب مجھے تشدد کا بدلہ لینا آگیا ہے۔ اچھا ہے کہ مجھے ساتھ ہی نہ لے چلو' یہ تمہارے حق میں بھی بہتر رہے گا۔"

"تو میرے ساتھ چل سونو میں کوشش کروں گی کہ تجھے کوئی تکلیف نہ ہو میری بچی۔" شاداب جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے' وہ کر نہیں پائے گی۔ حالات ایسے تھے' ماحول ایسا تھا کہ وہ ہر کام نہیں کر سکتی تھی لیکن بہرحال بیٹی کی محبت اس وقت سب کچھ بھلائے ہوئے تھی۔ چنانچہ وہ سونو کو لے کر چل پڑی۔ گھر میں اب خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ خود اس کے اپنے بچے جن کی تعداد چھ تھی' پرورش پا رہے تھے۔ ناصر ان سب کی پرورش کے لیے محنت سے تھکا ہوا رہتا تھا' اس لیے وہ سونو پر زیادہ توجہ نہیں دے سکا اور اپنے کاموں میں مصروف رہا لیکن سونو کے شب و روز عام انسانوں کی زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ ناصر کے بچوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھی۔ ایک دن گھر سے باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو شاداب اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ سونو نے لڑکوں کی طرح بال کٹوا لیے تھے۔ ایک پرانی جینز اور موٹے کپڑے کی شرٹ پہنے ہوئے واپس آئی تھی۔ ایک لمحے تک تو شاداب بھی اسے نہ پہچان سکی کہ وہ کون ہے۔ پھر سونو کے قہقہوں نے اسے بتایا کہ وہ سونو ہے۔

"یہ تُو نے کیا کیا ہے اپنا............؟"

"لڑکا بن گئی ہوں میں۔"

"ناصر تجھے دیکھے گا تو کیا کہے گا؟"

"تم مجھے دیکھو گی یا دیکھ رہی ہو' تو تمہیں کیا احساس ہوتا ہے۔"

"پتا نہیں کیا گل کھلائے گی تُو!"

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا ہے ماں۔" بہرحال سونو نے لڑکا بن کر رہنا شروع کر دیا۔ البتہ اسے شدت سے یہ احساس ہوتا تھا کہ گھر میں سارے بچوں کی کیفیت مختلف ہے اور اس کی بالکل مختلف۔ ناصر کا رویہ اس کے ساتھ بالکل اچھا نہیں تھا۔ وہ اجنبی نگاہوں سے اسے دیکھتا تھا۔ گھر میں کوئی بھی ناخوشگوار بات ہوتی تو

بات بات پر اسے جھڑک دیتا۔ شاداب بعد میں سونو کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔ بہرحال سونو نے ان ساری باتوں کی پروا نہیں کی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ ایک غریب سے علاقے میں ان لوگوں کا قیام تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جنگل بکھرا ہوا تھا۔ قبرستان ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پرانی قبریں بھی بنی ہوئی تھیں اور کچھ ایسی بھی جن پر باقاعدہ مقبرے تعمیر کیے گئے تھے۔ ایسا ایک چھوٹا سا ٹوٹا مقبرہ سونو کو نظر آیا تو اس نے اس میں اپنے لیے ٹھکانہ تلاش کر لیا۔ کبھی کبھی وہ دن بھر اس مقبرے میں بیٹھی اپنے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اسے یہ ماحول اپنے لیے بالکل اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اسے کچھ کرنا چاہیے' کوئی ایسا عمل جو ناقابل یقین ہو' کوئی ایسی شخصیت اختیار کرنی چاہیے اسے جو اسے عام انسانوں سے مختلف کر دے۔ وہ دن بھر اس غار میں بیٹھی نئے نئے منصوبے بناتی رہتی تھی۔ بہت سے دوست بنا لیے تھے اس نے۔ جن میں لڑکی ایک بھی نہیں تھی' ہاں اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے ساتھ اس کا رویہ خاصا مناسب تھا اور وہ بھی اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر انہیں بھی اس مقبرے میں جمع کر لیا جاتا اور یہاں سونو اپنے بہن بھائیوں کو کھانے پینے کی اشیاء پیش کرتی تھی۔ اس کا سوتیلا بھائی عامر اس سے چار سال چھوٹا تھا اور دونوں کی شکلوں میں کافی حد تک مشابہت تھی۔ سونو اس پر خاص توجہ دیتی تھی۔ بہرحال اس کے بعد اس نے اپنے بھائیوں کو بھی اپنے راستے پر لگا لیا۔ عامر نے ایک بار اس سے پوچھا تھا۔

"سونو' یہ تم کھانے پینے کی اشیاء کہاں سے حاصل کرتی ہو۔ ہمیں بھی اس بارے میں بتاؤ۔"

"پہلے تم اپنی اصلاح کر لو۔ مجھ سے کبھی اس انداز میں بات مت کرنا کہ میں یہ چیزیں کہاں سے حاصل کرتی ہوں۔"

"تو پھر تم مجھ سے یہ پوچھو کہ میں یہ اشیاء کہاں سے حاصل کرتا ہوں۔"

"چلو یہی سہی۔"

"کام کرو گے میرے ساتھ؟"

"ہاں' جب فرید اور طوفان تمہارے ساتھ نظر آتے ہیں تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ وہ تو تمہارے کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم تو تمہارے بہن بھائی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟" سونو نے لڑکوں کے انداز میں کہا۔ طوفان ایک طرح سے سونو کا سب سے بڑا ساتھی تھا۔ سونو نے اور اس نے مل کر بہت

سونو کا نام بھی لے دیا۔ دکاندار سونو کی تلاش میں اس کے گھر تک آیا تو خوش قسمتی سے اسے شاداب ہی ملی۔

"مگر سونو تو لڑکی ہے' زیادہ تر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ہے۔"

"تو پھر اس لڑکے نے یقینی طور پر اس کا نام جھوٹ لیا ہو گا۔ وہ تو یہی کہہ رہا تھا کہ سونو اس کا ساتھی ہے اور میں سمجھا تھا کہ سونو کوئی لڑکا ہے۔" لیکن شاداب کو کرید لگ گئی تھی اور جب اس نے سونو کا پیچھا کر کے اس مقبرے کی تلاشی لی تو یہاں لاتعداد چیزیں نظر آئیں جو دکانوں سے چرائی تھیں۔

"تو چوری کا مال تو یہاں چھپاتی ہے۔"

"نہیں' میں کبھی چوری نہیں کرتی۔" سونو نے جواب دیا۔

"لیکن طوفان نے تو تیرا نام لیا ہے۔"

"وہ بے وقوف ہے اور بے وقوف ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ اب تم بتاؤ ممّا! میں تم سے کہتی ہوں کہ اس مقبرے کا دروازہ بند کر کے تم اسی میں سو جاؤ تو کیا تم میری بات مانو گی۔ وہ لوگ میری باتیں مان لیتے ہیں اور میں ان کی بے وقوفی سے فائدہ اٹھاتی ہوں' کیا سمجھیں؟" سونو کے چہرے پر ایک عجیب سی مکاری اور ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ بہرحال وہ اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کرتی رہی۔ پڑوس کے مختلف علاقوں سے' دکانوں اور بازاروں سے اس کے بارے میں شکایتیں ملتی رہیں لیکن بس ایک بچت ہو جاتی تھی۔ ایک بار پھر شاداب کو اس پر پابندی لگانی پڑی اور اسے کمرے میں بند کر دیا گیا اور وہ بھاگ نکلی۔ ایسے ایسے اسے بند کیا جاتا کہ بھاگنے کا کوئی امکان نہ ہو تک۔ اس کے سوتیلے بہن بھائی تو یہ سمجھنے لگے تھے کہ سونو پُراسرار قوتوں کی مالک ہے جو ایسے موقعوں پر اس کی مدد کرتی ہیں۔ بہرحال سونو کے دن اور رات گزرتے رہے اور وہ اپنے فن میں تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اب ناصر کے قبضے میں بھی وہ نہیں رہی تھی۔ دو تین بار اس نے ناصر کو سزا دی تھی اور اس انداز میں دی تھی کہ ناصر بھی دنگ رہ گیا تھا۔ بعد میں سونو نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر وہ ایسی حرکتیں کرتا رہے گا تو ایک دن اپنے ہاتھوں یا پیروں سے محروم ہو جائے گا اور ناصر کو واقعی اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سونو اس کے بس کی نہیں ہے اور وہ ایسی کوئی حرکت بھی کر سکتی ہے۔

سونو نے ناصر سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ممّا کو یہ تمام باتیں معلوم نہ ہونے پائیں۔ ناصر چھ بچوں کا باپ تھا اور اس کی آمدنی محدود۔ مالی پریشانیاں اسے دیوانہ کیے رہتی تھیں۔ اس نے

نے اب سے بھی سونو کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا۔ سونو کی اب یہ کیفیت تھی کہ گھر میں بہت کم رہتی تھی۔ مردانہ لباس پہنتی تھی اور مردوں کی طرح اس نے آواز بدل کر بولنا سیکھ لیا تھا۔ پتا نہیں ان صلاحیتوں کا آغاز کیسے ہوا تھا۔ وہ ایسے ایسے فیصلے کرتی تھی جن پر یقین نہ آئے اور ایسا ہی ایک فیصلہ انگریزی زبان سیکھنے کا تھا۔ اس نے باقاعدگی کے ساتھ ایک ادارے سے رجوع کیا تھا۔ اپنی تمام تر حرکتوں کے باوجود وہ اس ادارے میں جاتی اور انگریزی زبان سیکھتی لیکن یہاں بھی لوگ اسے لڑکا سمجھتے تھے۔ اپنی پسند کے لوگوں سے اس نے رابطے قائم کیے تھے۔ مثلاً تھیٹروں اور فلموں کے ایسے میک اپ مین جو اسے میک اپ سکھا سکتے تھے اور ان سے اس نے بڑی راہ و رسم پیدا کی تھی۔ شاداب کے نقوش اسے ورثے میں ملے تھے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں' دودھ کی طرح سفید رنگ' چکنا اور شفاف چہرہ' خوبصورت تراش کے ہونٹ اور پھر ان میک اپ مینوں سے اس نے جو میک اپ سیکھا تھا اس کے ذریعے اس نے داڑھی اور مونچھوں کی جگہ ہلکی نیلاہٹ بنالی جیسی شیو کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بدن کی رعنائیاں جنم لینے لگی تھیں لیکن بدن کو چھپانے کے لیے بھی اس نے انتہائی مناسب بندوبست کیا تھا اور اب وہ صرف ایک ورزشی جسم کا مالک لڑکا معلوم ہونے لگی تھی جو بھرپور بدن رکھتا ہے۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا منصوبے پروان چڑھ رہے تھے' پھر اس کی ملاقات استاد رسیا سے ہو گئی۔ استاد رسیا ایک عمر رسیدہ جیب کترا تھا۔ زندگی میں بہت اچھے دن بھی گزار چکا تھا۔ اب صرف گزارا کر رہا تھا۔ ایک بازار میں اس نے ایک شخص کی جیب کاٹی تو سونو نے اسے دیکھ لیا۔ رسیا کا تعاقب کر کے اس نے ایک سنسان جگہ اسے پکڑ لیا اور بولی۔

"بوڑھے شخص' میرا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے اور میری ذمہ داری ایک ایسے گروہ کی تلاش ہے جو جیب تراشی کی وارداتیں کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری ترقی کے لیے بہترین راستہ بن سکتے ہو کیونکہ اس وقت تمہاری جیب میں جو پرس ہے' وہ ایک ریٹائرڈ فوجی کا پرس ہے اور اس پرس میں کچھ ایسے کاغذات بھی موجود ہیں جو انتہائی سرکاری نوعیت کی اہمیت کے حامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں میری ترقی میں ضرور معاونت کرنی چاہیے۔"

رسیا اس کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا۔

"زندگی اتنی پریشان ہو گئی ہے کہ میں اپنا چھوڑا ہوا کاروبار دوبارہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اگر تم ایک بار مجھے معاف کر دو تو میں کوشش کروں گا کہ کسی معذور خانے میں داخل

"ایک شرط پر میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں۔" سونو نے کہا۔
"بتاؤ' مجھے منظور ہے۔"
"مجھے بھی جیب تراشی سکھاؤ۔"
"کیا.........؟" رسیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"ہاں' میرے محلے کے تمام افراد دنیا کا ہر کام سیکھتے ہیں۔ تاکہ جو بھی ضرورت انہیں پیش آئے اس کے لیے صحیح انداز میں کام کر سکیں۔ مجھے جس گروہ کی تلاش ہے اس کا پتا بھی تم ہی مجھے بتاؤ گے۔"
"یقین کرو میرا تعلق کسی گروہ سے نہیں ہے۔ میں تو ایک تنہا آدمی ہوں' بس اپنے گزارے کے لیے سب کچھ کر لیا کرتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے پھر مجھے جیب تراشی سکھاؤ۔" استاد رسیا واقعی فنکار تھا اور اس بار کوئی شاگرد اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ سکیورٹی کا ایک فرد اس سے یہ فن سیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی ہمت اور محنت کے ساتھ سونو کو اپنا فن سکھایا اور جب سونو اس فنکاری سے پہلی رقم لے کر گھر آئی تو ناصر ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور اس میں اس کی ٹانگ کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی۔ شاداب شدت غم سے نڈھال تھی۔ سونو نے وہ ساری رقم اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
"شاید میری پہلی کمائی میرے سوتیلے باپ کے نام کی تھی۔ تو یہ رقم تم اپنے شوہر کے علاج پر خرچ کرو۔"
"آہ.........میں نہیں جانتی تھی کہ تُو اس طرح میرے کام آجائے گی۔ تُو نہیں جانتی مجھے ناصر کی سخت ضرورت ہے۔ میرے بچوں کو باپ کے بغیر زندگی گزارنا کتنا مشکل ہو گا یہ میں ہی جانتی ہوں۔" جواب میں سونو نے کہا۔
"مجھے اس شخص سے کوئی ہمدردی اور دلچسپی نہیں ہے جس نے مجھے کبھی اپنائیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا لیکن بہرحال میں تمہارے لیے سب کچھ کروں گی۔" سونو کو اس طرح بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ماں اب اس کی نگاہوں میں مکمل طور پر واضح تھی اور وہ جانتی تھی کہ ماں کے ساتھ کس طرح مظالم ہوئے ہیں۔ باپ کے مسئلے میں بھی پہلے وہ بہت جذباتی تھی لیکن اب شعور کو پہنچنے کے بعد اور حقیقتوں کا اعتراف ہونے کے بعد وہ باپ کو مجرم سمجھتی تھی اور باپ سے اس کی رغبت بہت کم ہو گئی تھی۔ بہرحال ناصر کا علاج ہونے لگا۔ سونو نے

"میں نے سنا ہے کہ تمہارا تعلق کسی بھی طرح محکمہ خفیہ سے نہیں ہے۔ بلکہ تم باقاعدہ جیب تراشی کرتے ہو۔ کئی جگہ سے مجھے اس بارے میں اطلاع ملی ہے۔"
"فرض کرو اگر ایسا ہے تو........." سونو نے مردانہ آواز میں کہا۔
"اگر ایسا ہے تو تم اپنی کمائی کا آدھا حصہ مجھے دیا کرو۔"
"جو رقم میں کماتا ہوں اور اس سے جو کام کر رہا ہوں وہ بھی ایک ایسا ہی کام ہے۔ تم بوڑھے آدمی ہو اور تمہارے ذریعے مجھے ایک فن حاصل ہوا ہے۔ میں تمہیں باقاعدہ ادائیگی تو نہیں کر سکتا لیکن جو تھوڑی بہت رقم تمہاری ضرورت کی ہو وہ میں تمہیں دے دیا کروں گا۔" سونو نے جواب دیا لیکن رسیا اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں برائی پلنے لگی تھی۔ ادھر سونو نے اب پرزے نکالنا شروع کر دیے تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان لے کر اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بے شک اس کے ساتھ اور کوئی پارٹنر نہیں تھا لیکن اس نے سوچا تھا کہ اس جگہ رہ کر وہ مستقبل کے بارے میں بہت سے فیصلے کر سکتی ہے۔ جہاں تک شاداب کا تعلق تھا وہ شوہر پرست عورت' ناصر کے بچے پال رہی تھی اور اب اسے سونو پر ہی بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ناصر کو سونو کی ایڈونچر پسندی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ سونو اب ایک کامیاب شاطرہ بن چکی تھی اور اپنے چہرے پر میک اپ کر کے مردانہ روپ دھار کر وہ ایک کامیاب مجرمہ بنتی جا رہی تھی۔ اس نے نقب زنی' جیب تراشی یا چوری چکاری کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنانا مناسب نہیں سمجھا تھا بلکہ اپنے طور پر بہت سے فنون سیکھ رہی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا اس دنیا میں جہاں اسے کسی نے کوئی مقام نہیں دیا' وہ اپنے لیے ایک مقام حاصل کرے گی۔ ایک ایسا مقام جو عزت کا حامل ہو۔

آخر کار ایسا ہوا کہ رسیا نے اس مکان کا پتا لگا لیا جہاں سونو رہتی تھی۔ رسیا نے باقاعدہ پولیس کو اس سلسلے میں اطلاع دی اور پولیس نے دور سے اس مکان کو تاک لیا۔ وہ سونو کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی لیکن نہ تو رسیا نہ پولیس جانتی تھی کہ سونو در حقیقت ایک لڑکی ہے۔ سونو نے ادھر سے دیکھ لیا کہ پولیس کے کچھ جوان رسیا کی سرپرستی میں قرب وجوار میں موجود ہیں اور گھر کی نگرانی کر رہے ہیں' چنانچہ جب وہ ایک خوبصورت شلوار قمیض میں چہرے پر میک اپ کیے' سر پر دوپٹہ لیے' ہاتھ میں پرس لٹکائے اس گھر کے دروازے سے باہر نکلی تو سب کے سب دنگ رہ گئے۔ پولیس والوں نے رسیا کو پکڑ لیا۔ رسیا نے کہا کہ وہ قسم کھا

والی ہو۔ میں نے خود اسے اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ پولیس نے پڑوسیوں کی خدمات حاصل کر کے گھر کی تلاشی لی۔ تو اسے مردانہ لباس بے شک ملا تھا لیکن سونو نہیں ملا تھا۔ سونو محتاط ہو گئی تھی۔ رسیا کو ٹھکانے لگانا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن بہر حال وہ استاد تھا۔ بے وقوفی کر بیٹھا تھا لیکن پھر بھی اس نے سونو کو بارو زگار کر دیا تھا اور یہ روز گار انٹر نیشنل تھا۔ یعنی یہ کہ سونو جہاں بھی چاہتی اپنے لیے ضرورت کی رقم حاصل کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اسے معاف کر دیا۔ البتہ اب اس کا دل یہاں لگ نہیں رہا تھا۔ اپنی حیثیت سے باخبر ہو گئی تھی۔ یہاں ایک مفلوک الحال ماں تھی' سوتیلا باپ' سوتیلے بہن بھائی تھے جو بہر حال ماں کی نعمتوں سے متاثر ہو کر اس سے منحرف ہو گئے تھے اور اس کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ اب سونو ان سے ذہنی طور پر دور ہو چکی تھی۔ اس کا مزاج جس انداز کا بن چکا تھا' وہ ظاہر بات ہے زندگی کے چھوٹے موٹے معاملات میں دلچسپی نہیں لے سکتی تھی۔ ماں کو اس نے کہا۔

"ممّا میں نے تمہارا بہت ساتھ دیا لیکن میں اپنی حیثیت جانتی ہوں۔ میں وہ ہوں ممّا جسے کوئی بھی اپنا نام دینے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ یہاں سب میرے شناسا نہیں' تمہارے شناسا ہیں' میرے ناجائز باپ کے شناسا ہیں۔ ممّا میں ان شناساؤں سے دور جانا چاہتی ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا۔ اپنا پتا کبھی تبدیل نہ کرنا' میں تمہیں ضرورت کی تمام چیزیں بھیجا کروں گی۔ باقاعدہ رقم بھیجا کروں گی اور ممّا اگر ہو سکا تو تم سے دوسرے رابطے بھی کیا کروں گی۔ ٹیلی فون لگوا دوں گی یہاں پر۔"

"مگر تُو جانا کہاں چاہتی ہے؟"

"اپنے لیے ایسے جہانوں کی تلاش میں جہاں میرا صحیح مقام مل سکے۔ ٹھیک ہے ممّا۔" ماں نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا دی تھی۔ اس کی ہم شکل بس اس کی یہی اولاد تھی لیکن اس کی شخصیت جس قدر مسخ تھی' شاید اب تو بھی اس کا احساس تھا۔ بہر حال اس کے بعد سونو نے شہر میں اپنا نام شروع کر دیا۔ وہ زیادہ محنت سے ساتھ رقم جمع کر رہی تھی۔ ایک بڑی رقم اس نے ماں کے حوالے کی۔ ایک ٹیلی فون لگوایا اس کا نمبر ذہن نشین کیا اور اس کے بعد وہ سب سے پہلے ایک ایسے مکان میں پہنچی جہاں پر وہ ایک بوڑھا آدمی ہر کام کر دیا کرتا تھا۔ اس میں شناختی کارڈ' ورک پرمٹ' پاسپورٹ ہر چیز تیار کی جاتی تھی اور وہ جعلساز بوڑھا ہر قسم کے لوگوں کے لیے معاون ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ جب سونو نے اسے کہا۔

"مجھے اپنے لیے ایک انٹر نیشنل پاسپورٹ چاہیے۔ معاوضہ بتاؤ۔"

"پچیس ہزار۔" بوڑھے نے کہا تو سونو نے پستول نکال کر اس کی نال بوڑھے کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"اگر پانچ ہزار روپے لے کر تم یہ پاسپورٹ بنا کر دے سکتے ہو تو بہتر ہے کہ کچھ سال اور جی لو اور اگر اس سے پہلے مرنا چاہتے ہو تو ابھی اور اسی وقت اپنی چھٹی کر لو اور ایک بات ذہن میں رکھنا۔ بات ایک پر ایک کی ہے۔ تم اگر چاہو تو میں تمہیں یہ رقم ابھی دے سکتا ہوں اور اگر نہ چاہو تو جس طرح تمہارا دل چاہے کر لو۔ اس پستول کی گولی تمہارا راستہ تلاش کرتی ہوئی تم تک پہنچ جائے گی۔" بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر تم اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہو دوست تو میں بھی اپنے وقت میں بہت کچھ رہ چکا ہوں اور میں نے بھی اس طرح پستول استعمال کیا ہے اور ایک طریقہ کار تمہیں بھی بتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ زندگی کو ہر حالت میں پُر لطف بنانے کی کوشش کرنا' تھوڑی سی رقم یا کسی جذباتی فیصلے کا شکار ہونے کے بجائے اپنے آپ کو زندگی سے قریب لے جانے کی کوشش کرنا' سمجھے؟"

"ہاں ٹھیک ہے لیکن بہر حال تم کوئی جعلسازی نہیں کرو گے' سوائے اس جعلسازی کے۔" بوڑھا خود ہی تصویر تیار کیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ہر طرح کا سامان موجود تھا۔ صرف تیسرے دن سونو کو اس کا پاسپورٹ مل گیا اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے کاغذات بھی جن میں اس کا نام اپنے باپ کے حوالے سے درج تھا لیکن کچھ ایسا گڈمڈ کہ اگر کوئی اس کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہے تو مشکل ہو جائے۔ یہ ساری تیاریاں کرنے کے بعد آخر کار اس نے اپنی ماں کو خدا حافظ کہا اور سب سے پہلے اس نے ہندوستان کی جانب رخ کیا۔

ایئر انڈیا کا ایک طیارہ اسے لے کر دہلی چل پڑا۔ دہلی کے سفر کے دوران اس کی ملاقات پروفیسر آتما رام سے ہوئی۔ دوران سفر اس کے ذہن میں طرح طرح کے منصوبے بنتے رہے تھے۔ اپنے وطن سے پہلی بار دیار غیر کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ ہمت بے پناہ تھی اور اپنی منزل پا لینے کا خیال دل میں نمونیا حقیقت رکھتا تھا لیکن جانتی تھی کہ پہلی بات تو یہ کہ عورت ذات ہے' دوسری بات ماحول اور حالات سے ناواقفیت کی تھی۔ دیکھیں کیا بنتا ہے۔ آتما رام اس کی برابر کی سیٹ پر تھا اور اس کے ہاتھ میں بھگوت گیتا لی ہوئی تھی۔ وہ گیتا کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد جب اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ہم سفر پر نگاہ ڈالی تو اسے [illegible]

رام نے اسے بغور دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم کچھ بے چین ہو بیٹے۔" سونو نے نگاہ اٹھا کر آتمارام کو دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"آپ غالباً اپنی کوئی مقدس کتاب پڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں' یہ بھگوت گیتا ہے۔"

"کیا اس میں کہیں سکون کا ذکر ملتا ہے۔" سونو کے عجیب سوال نے اس شخص کو کچھ بے چین سا کر دیا۔ وہ پوری طرح سونو کی جانب متوجہ ہو گیا اور پھر بولا۔

"میرا نام آتمارام ہے۔ ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔ کچھ بچوں کو پڑھا دیتا ہوں او بس' مگر تمہارا یہ سوال عجیب ہے۔ تمہارا اپنا نام کیا ہے؟"

"آہ.......... میں اپنا نام ہی تو نہیں بتانا چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ کوئی مجھے اپنی پسند نام دے دے۔ ایک ایسا نام جو سکون کا مظہر ہو۔"

"بڑے عجیب خیالات ہیں تمہارے نوجوان لڑکے۔ آج تک کسی نام سے تو پکارے جاتے ہو گے۔"

"ہاں' وقار کہتے ہیں مجھے۔" سونو نے پاسپورٹ پر درج شدہ نام بتاتے ہوئے کہا۔

"بڑا نام ہے۔ اسی سے تو سنسار کی بڑائی قائم ہے۔ ویسے تمہیں شانتی کی تلاش ہے۔ کہاں رہے ہو؟"

"شانتی کی تلاش میں۔ اصل میں بڑی عجیب و غریب زندگی ہے میری۔ آپ نے مجھے نو عمر اور نوخیز کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے مجھے بے شمار تجربے دیے ہیں اور میں ان تجربوں میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔" سونو نے اسے ایک چھوٹی سی من گھڑت کہانی سنادی اور آتمارام بے حد متاثر ہو گیا اور کہنے لگا۔

"دیکھو' تم ہندو ہو یا مسلمان! ابھی تم نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں شانتی کی تلاش ہے۔ یہ بتاؤ' آج تک کسی کا سہارا لیا ہے تم نے۔"

"نہیں' اب وقت ملا ہے اور اسی لیے باہر نکلا ہوں۔"

"تو تھوڑا سا وقت مجھے نہیں دو گے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دہلی میں ایک چھوٹے سے علاقے میں رہتا ہوں۔ مل جل کر کچھ دن ساتھ رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔ اگر تم مجھے کچھ وقت دو گے تو مجھے دلی خوشی ہو گی۔"

"آپ بھی عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں آتمارام جی۔ ایک اجنبی کو اور وہ بھی مسلمان لڑکے کو اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔"

"ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سب انسانوں ہی کے نام ہیں۔ دھرم کی تقسیم ہے' انسانیت کی تقسیم تو نہیں ہے۔ تھوڑا سا وقت مجھے دو۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ کر دوں۔" دہلی میں آتمارام بھی ایک بہت بڑے علاقے میں رہتے تھے اور یہ شاید سونو کی خوش قسمتی ہی تھی کہ اپنی شکار گاہ میں اسے ایک موٹا تازہ شکار مل گیا تھا۔ یعنی پروفیسر آتمارام' کم از کم ایک مضبوط ٹھکانا قائم کرنے کے بعد اسے اپنے مقصد کے لیے قدم جمانے کا موقع تو مل سکے گا۔ چنانچہ اس نے بڑی خوشی کے ساتھ آتمارام کے ساتھ قیام کا فیصلہ کیا۔ اپنی اصل شخصیت کو اس نے سینکڑوں پردوں میں چھپا دیا تھا اور اب اس کی شاطرانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز ہو رہا تھا۔

☆-------☆-------☆

آتمارام کی رہائش گاہ بہت خوبصورت اور وسیع تھی' سونو یہاں آ کر کافی خوش ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کے رنگ بدل گئے تھے۔ اس کے سامنے ایک عظیم شکار گاہ تھی' اپنی زندگی کا مقصد اس نے بنا لیا تھا۔ ہوشیاری اور ذہانت سے کام لے کر دولت کمانا اور زندگی کو عیش سے گزارنا۔ بس اس کے علاوہ چھوٹی سی زندگی کے مالک انسان کی اور کیا خواہش ہو سکتی تھی۔ اپنوں میں ماں تھی اور اس سے منسلک افراد' سوتیلے بہن بھائیوں کے ساتھ اس نے ایک مناسب وقت گزارا تھا لیکن وہ اس کے دل تک نہیں پہنچے تھے۔ وہاں ماں کے حوالے سے وہ ان سب سے نفرت بھی نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ سے نفرت کرنے والے ناصر کو بھی معاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کا باپ رہ جاتا تھا' مرزا سلیم بیگ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک برا انسان تھا لیکن زمانے سے واقف ہونے کے بعد سونو نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ خون کے رشتے بہرحال خون کے رشتے ہوتے ہیں اور ان سے انحراف ممکن نہیں ہوتا۔ باپ کے لیے بھی اس کے دل میں جگہ تھی۔ ہاں یہ بات وہ جانتی تھی کہ باپ ایک فارغ البال آدمی ہے اور روپے پیسے کی اسے کوئی پروا نہیں ہے۔ چنانچہ باپ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ماں کے بارے میں اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ خواہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو' ماں کی خدمت کرتی رہے گی اور اسے مالی طور پر پریشان ہونے نہیں دے گی۔ بہت بڑی

"وقار! ایک ہندو کے گھر رہ کر تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے؟" جواب میں سونو نے مسکرا کر کہا۔

"پروفیسر صاحب! آپ نے دین دھرم کی بات ہی ایسی کی ہے۔ اصل میں میری کوئی ریسرچ نہیں ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میں ابھی اس عمر کو بھی نہیں پہنچا کہ اپنے آپ کو کسی منزل پر پا سکوں۔ دیکھنا ہے کہ وقت میری تسلی کیسے کرتا ہے۔"

"وقت خود چل کر تمہارے پاس نہیں آئے گا۔" آتما رام نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"آسان سی بات ہے۔"

"لیکن مجھے سمجھائیے۔"

"اپنی جگہ ساکت رہنا چاہتے ہو۔"

"بالکل نہیں۔"

"تو وقت کا تعاقب کرو۔"

"تعاقب؟"

"ہاں۔"

"وہ کیسے؟"

"اپنے جسم میں تحریک پیدا کرو' وقت کے ساتھ ساتھ قدم ملاؤ' وقت سے پوچھو کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے۔"

"کیا وقت مجھے آواز دے گا؟"

"ضرور دے گا۔"

"لیکن میں نہیں جانتا کہ ایسا کیسے ہو گا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تو کیا آپ میرا استاد بننا پسند کریں گے؟"

"اگر تم ایسا چاہو گے۔"

"میں چاہتا ہوں۔"

"ایک بہت بڑی رکاوٹ درمیان میں آئے گی۔"

"کیا؟"

"دین دھرم۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کیا میں آپ کا دھرم قبول کر لوں؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر؟"

"کہا نا تحقیق کرو۔ دیکھو دھرم کوئی بھی ہو' میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اس میں شانتی کی ساری باتیں موجود ہیں۔ جن لوگوں نے دھرم کا پرچار کیا ہے انہوں نے یہی کہا ہے کہ انسانی سکون کے لئے عبادات اول حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ سکون کی دوا ہے وہ اور اس سے بڑی سکون کی دوا اور کوئی نہیں ہے۔ تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دھرم کی بات درمیان سے نکال دو۔ دھرم میں الفاظ بدلے ہوتے ہیں۔ مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔ تم مسلمان لڑکے ہو' اگر کوئی تم سے کہے کہ گائے کی پوجا کرو' تو مت کرو۔ اس طرح کی اور باتیں بھی تم سے کہتا ہے' کوئی مت کرو۔ کوئی اگر یہ کہتا ہے کہ کسی ڈوبنے والے انسان کا جیون بچا لو تو مجھے بتاؤ کہ اس میں کوئی برائی ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"بس بات وہی آ جاتی ہے کہ اچھائیوں کا دامن تھام لو اور جیون کے اچھے راستے اپنا لو۔ تم جس شانتی کی تلاش میں ہو وہ اسی میں ملے گی۔" سونو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"کیا اس شانتی کی تلاش کے لئے کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

"ہے۔ میرے ایک بہت ہی گہرے دوست ہیں بالم رام گپتا' ہم انہیں بالم جی کہہ کر پکارتے ہیں' ان کے گھر پر بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ سب دنیا کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ مذہبی اسکالر' ان میں مسلمان بھی ہوتے ہیں' عیسائی بھی' سکھ بھی' ایک مشترکہ انجمن بنائی ہے بالم رام نے اور وہاں ہفتے میں ایک بار اجتماع ضرور ہوتا ہے۔ بس یہ ان کا شوق ہے۔ یہ سمجھ لو کہ بالم رام جی دولت مند آدمی ہیں اور ایک طرف تو ان کا کاروبار بڑا شاندار چل رہا ہے تو دوسری طرف ایک بڑا خرچہ اس بات پر کرتے ہیں۔ تم دیکھ لو ایک بار ان کے ہاں چل کر۔ دل چاہے تو دوبارہ جانا' ورنہ نہ جانا۔"

"نہیں' نہیں پروفیسر صاحب! ضرور جائیں گے ہم وہاں۔" سونو نے کہا۔ بہت پختہ

اپنی اس شکار گاہ میں شکار کھیلنا چاہتی تھی۔ ہندوستان کی وسعتیں اس کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ قدرت نے شاید اس کے دماغ میں کوئی ایسی مشین نصب کر دی تھی جو وقت سے بہت آگے سوچتی تھی اور سونو وہ فیصلے کر لیتی تھی جو عام لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال اس نے ایک ایسا طریقہ کار دریافت کر لیا تھا جو مستقبل میں اس کے لئے بڑا کار آمد ثابت ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ صرف دین دھرم کے حوالے سے یا کسی ایسے سماجی حوالے سے جو راستے کی رکاوٹ نہ بنیں' اپنے راستوں کو نہیں روکنا چاہئے بلکہ اس سلسلے میں حالات سے مکمل تعاون کرنا چاہئے تاکہ راستے کی رکاوٹیں دور ہوں' نہ کہ کوئی چیز مشکل بن سکے۔ چنانچہ پہلی بار وہ پروفیسر آتمارام کے ساتھ بالم رام کی شاندار حویلی میں پہنچی۔ بالم رام اس قدر دولت مند آدمی تھے کہ وہ علاقہ جہاں وہ رہتے تھے' حویلی بالم رام کے نام ہی سے مشہور تھا اور لوگ اس حویلی کا احترام کرتے تھے۔ بہرحال بالم رام کے ہاں ہونے والی نشست میں سونو کو بہت مزا آیا۔ پہلی بات تو اس حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے ایک انوکھی فرحت کا احساس ہوا تھا۔ یہاں کا ماحول بڑا ہی دلکش اور دلچسپ تھا۔ ملازمائیں اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ لوگ ایک خوبصورت بارہ دری میں بچھی ہوئی نشست گاہوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کے غول کے غول آ جا رہے تھے اور ایک حسین منظر اور ایک حسین ماحول تھا۔ مہمانوں کی تعداد مکمل ہو گئی۔ بالم رام بڑے خوش اخلاق آدمی تھے۔ ہر ایک سے ملے۔ جب آتمارام نے سونو سے ان کو ملایا تو بالم رام نے پُرخلوص انداز میں سونو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "ایک حسین اور نازک نوجوان پُرکشش شخصیت کا مالک ہماری اس سبھا میں شریک ہو تو سبھا کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی وقار صاحب۔ بڑی شانتی ملی ہے من کو۔"

"بے حد شکریہ۔" سونو نے اپنی بنائی ہوئی آواز میں کہا۔ مردانہ آواز پر اب اسے اس قدر عبور حاصل ہو گیا تھا کہ بڑے سے بڑے ماہرین بھی اس آواز کی بناوٹ کا شبہ نہیں کر سکتے تھے۔ سونو یہاں کا ماحول دیکھتی رہی۔ درحقیقت یہاں عالم اور اسکالر جمع ہوئے تھے۔ بڑے اچھے خیالات تھے ان کے۔ وہ لوگ مذہب کے حوالے سے بنیاد کی بات کرتے تھے' بنیاد انسانیت ہوتی ہے۔ سونو کے ذہن میں لاتعداد جملے مچلے تھے۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر انسان انسانیت سے بہت نیچے گر جائے تو اسے اٹھانے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ جبکہ اس کے متاثرین سو فیصد انسانیت کے راستوں کے راہی ہوتے ہیں لیکن جانتی

...ہو جاتی ہیں تو بہت سے راز' راز نہیں رہتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نظر سونو کا اس انداز میں جائزہ نہیں لے رہی تھی بلکہ سونو کے فرشتوں کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ وہ کس طرح سونو کا جائزہ لے رہی ہے پھر وہ اس کے قریب پہنچ ہی گئی۔ حسن و جمال کی مورت' نازک اندام' حسین و دلکش' حسن کا جتنا معیار قائم کیا جا سکتا ہے' قدرت نے اسے اس میزان پر مکمل کر دیا تھا۔ عقب سے اس کی مترنم آواز ابھری۔

"ہیلو۔" سونو نے پلٹ کر دیکھا۔ مشرقی لباس' مشرقی حسن' مشرقی مجسم اس کے سامنے تھا۔ سونو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"ہیلو۔"

"اور بڑا تعجب ہوتا ہے مجھے پتا جی پر جب وہ کسی نئے آنے والے سے مجھے تعارف نہیں کراتے اور نیا آنے والا بھی وہ جس کا تعارف اگر نہ ہو تو تقریب ادھوری رہ جائے۔"

"اگر آپ میری بات کر رہی ہیں تو کسی کو آسمان پر بٹھا دینا آپ کے لئے واقعی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"نہیں' آپ ہی کے بارے میں کہہ رہی ہوں میں اور آکاش پر نہیں دھرتی پر بھی آپ کا ٹھکانا تلاش کر رہی ہوں۔"

"پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ کون ہیں؟"

"میرا نام شیلا گپتا ہے۔ بالم رام گپتا کی بیٹی ہوں۔"

"واقعی' پھر تو آپ سے لوگوں نے میرا تعارف نہ کرا کے آپ پر نہیں' مجھ پر ظلم کیا ہے۔"

"ایک بات پوچھ سکتی ہوں آپ سے؟"

"کیا؟"

"آپ نے اندر جی مہاراج کو دیکھا ہے۔"

"افسوس میں پہلی بار یہاں آیا ہوں اور ان سے میرا کوئی تعارف نہیں ہے۔" سونو نے کہا اور شیلا گپتا خوب ہنسی۔

"ہمارا بھی ان سے تعارف نہیں تھا لیکن بھگوان کا شکر ہے کہ آج وہ چوری چوری پکڑے گئے۔"

"اندر مہاراج' سنیں ایک بات کہیں آپ سے؟"
"جی۔"
"آپ کا نام کچھ بھی ہو' آپ براہ کرم ہمیں اپنا نام نہ بتائیں۔ ہم خود ہی آپ اپنی پسند کا نام دے دیتے ہیں۔"
"جی فرمایئے۔" سونو بولی۔
"اندر۔"
"ارے تو آپ مجھے اندر کہہ رہی تھیں۔"
"بس .... میں .... بس' کہہ رہی تھی نہیں' کہہ رہے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ تو اندر جی مہاراج ہم اپنا نام تو آپ کو بتا ہی چکے ہیں' شیلا گپتا۔"
"جی ہاں' آپ کے نام سے آپ کی شخصیت جھلک رہی ہے۔"
"نہیں' غلط آپ کی بات نہیں مانیں گے ہم۔"
"میں زبردستی تو کوئی بات آپ سے نہیں منوانا چاہتا۔" سونو بولی۔
"اب آپ کی تعریف کریں کچھ۔"
"شرمندہ کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ بھلا کون کسی کو روک سکتا ہے۔"
"آپ اتنے سندر ہیں کہ آپ کو یا تو سندر کہا جا سکتا تھا یا اندر۔"
"بڑی دلچسپ بات ہے۔ بہت ہی دلکش' بہت ہی حسین۔"
"شکریہ' اب آپ یہ بتایئے کہ ہمارے ساتھ کچھ وقت گزاریں گے۔" سونو کے ذہن میں فوراً ہی چرخیاں چلنے لگی تھیں۔ ایک انوکھا منصوبہ اس کے دل میں آیا تھا بہرحال وہ شیلا گپتا کے ساتھ چل پڑی اور تھوڑی ہی دیر میں یہ محسوس ہوا جیسے دونوں برسوں سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں۔ سونو فنکار تھی اور سب سے بڑا مسئلہ یہ کہ اس کے پاس خوبصورت الفاظ کا ذخیرہ تھا۔ اس کے علاوہ شیلا بھی انتہا پسند ہی تھی کہ اس نے دھرم کرم کی بات ہی نہیں پوچھی تھی اور خود اپنے طور پر سونو کا نام اندر رکھ دیا تھا بہرحال آج کی اس نشست میں سونو کو بہت لطف آیا اور اپنی اس شکار گاہ میں اپنے شکار کے بارے میں اس نے سوچا۔ شیلا' بس ایک دولت مند آدمی کی بیٹی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ذہنی پہنچ کچھ بھی نہیں تھی۔ آتمارام نے جب سونو سے آج کی اس نشست کے بارے میں پوچھا تو سونو مسکرا کر بولی۔

اندر سبھا کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے لیکن آج سب کچھ خود بخود جان گئے۔"
"ان لوگوں کے خیالات کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"
"اتنے بڑے بڑے عالم جمع ہو گئے تھے وہاں کہ آپ یقین کریں کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں نے کچھ بھتے ان لوگوں کی باتیں سن لیں تو میں شاید وہ پا جاؤں' جس کے لئے میں نے یہاں کا رخ کیا ہے۔" آتمارام جی خوشی سے جھوم اٹھے تھے۔ انہوں نے کہا۔
"اور اگر میں نے کسی بھٹکے ہوئے کو من کی شانتی دے دی تو میں سمجھوں گا کہ بھگوان نے مجھے بہت بڑا مرتبہ دے دیا ہے۔"
"جی آتمارام جی! میرے لئے اگر کوئی ہدایت ہو تو۔"
"نہیں بس ہر کام میں کچھ دیر لگتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جو کچھ بھی ہو گا بہرحال ٹھیک ہو گا' سب ٹھیک ہے۔" اور پھر آتمارام جی پر سکون ہو گئے لیکن دوسرے ہی دن شیلا آتمارام جی کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے آتمارام جی سے ہی ملاقات کی تھی۔ آتمارام جی نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولے۔
"کیا بات ہے بیٹی! خیریت تو ہے۔ پہلے تو تم کبھی ہمارے ہاں نہیں آئیں۔"
"ہاں چاچا جی! میں ایک مشکل میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ آپ کی مدد چاہتی ہوں میں۔"
"بولو .... بولو' کیا بات ہے۔"
"چاچا جی بے حیا' بے شرم تو نہیں کہیں گے مجھے؟"
"بات کیا ہے' یہ تو بتاؤ۔"
"چاچا جی ایک مشکل میں گرفتار ہو گئی ہوں۔"
"کیسی مشکل؟"
"زبان نہیں کھل رہی آپ کو بتانے کے لئے۔"
"میرے پاس آئی ہو' یہ سوچ کر آئی ہو کہ اس مشکل میں تمہارا ساتھ دوں گا تو جب تم مشکل نہیں بتاؤ گی ساتھ دینے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔"
"چاچا جی بے حیا بن کر یہ بات کہہ رہی ہوں۔ اندر جی آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"وہ جو آپ کے ساتھ کل آئے تھے۔"

"اندر جی؟" آتمارام حیرت سے بولے۔

"نہیں' یہ نام میں نے انہیں دیا ہے۔"

"اس نے تمہیں اپنا نام کیا بتایا تھا۔" آتمارام کا تجربہ ان سے جو کچھ کہہ رہا تھا وہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔

"انہوں نے اپنا نام کچھ نہیں بتایا مجھے۔ میں نے انہیں بتانے بھی نہیں دیا' بس میرے من میں ایک نام آیا ان کے لئے تو میں نے ان کا نام اندر رکھ دیا۔ وہ کہتے رہے کہ میرا نام اندر نہیں ہے' پر میں نے کہا کہ میں کچھ اور سننا ہی نہیں چاہتی۔"

"او اچھا' چلو یہ مسئلہ حل ہوا۔ کیونکہ میں حیران ہو گیا تھا اس کا نام سچ مچ اندر نہیں ہے مگر تمہاری طبیعت سے میں واقف ہوں۔ تم نے اسے اپنا نام بتانے ہی نہیں دیا ہو گا۔"

"ایسی ہی بات تھی چاچا جی۔" شیلا ہنس کر بولی اور آتمارام بھی ہنسنے لگا۔

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"اندر ہے۔"

"چاچا جی ویسے تو بہت سی باتیں من میں آئی ہیں' پر آپ ذرا مجھے یہ تو بتایئے کہ آپ سے اس کا کیا رشتہ ہے؟" آتمارام بہت سمجھدار آدمی تھا۔ پہلے ہی مرحلے پر جلد بازی کر کے صورت حال کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"انسان کا انسان سے کیا رشتہ ہوتا ہے' یہ تو تم جانتی ہو نا۔"

"میں یہ جانتی تھی چاچا جی کہ آپ ایسی ہی بات کریں گے۔ وہ تو ساری باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں' پر میرا معاملہ کچھ اور ہے........." ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ سامنے سے سونو آتی ہوئی نظر آئی۔ یہاں اس نے جو اپنا روپ بنا رکھا تھا اس نے انتہائی ذہانت کے ساتھ اس کیفیت کو خود پر مسلط کر لیا تھا۔ اب اگر اسے کوئی سوتے سے بھی جگاتا تو وہ مردانہ آواز میں ہی بولتی۔ باقی اپنے آپ کو چھپانے کی ذمہ داری اس نے مکمل طور سے نبھائی تھی۔ بہرحال وہ مسکراتی ہوئی شیلا کے پاس پہنچ گئی۔

"اور یہ حیرت کی بات ہے پروفیسر کہ اس سے پہلے شیلا دیوی کو میں نے یہاں آپ کے گھر کبھی نہیں دیکھا۔"

بار ہی یہاں آئی ہے۔ خیر کوئی کسی بھی وقت کسی بھی طرح آ جائے۔ چلو اب ایسا کرو' ہم اپنے مہمان کو تمہارے حوالے کرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ تمہیں ہی پوچھتی یہاں تک آئی ہے' کیا سمجھے؟"

"ٹھیک ہے پروفیسر!" سونو نے کہا اور پھر مسکراتی ہوئی شیلا سے بولی۔

"آیئے شیلا جی!" شیلا بھی مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔ اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے سونو نے کہا۔

"ویسے سچ کہوں میں بہت حیران ہوں آپ کے اس طرح آنے سے لیکن یقیناً اتنا جانتا ہوں کہ مجھ سے کوئی ضروری کام ہو گا۔"

"دنیا کا سب سے ضروری کام۔" شیلا بے باکی سے بولی۔

"اچھا' اب تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ دنیا کا سب سے ضروری کام کیا ہوتا ہے۔" دونوں ہنس پڑی تھیں۔ سونو اسے ساتھ لئے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی تو شیلا نے اس کا کمرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"عورتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ایک چیز پر نگاہ رکھتی ہیں۔ کسی کو اگر کسی سے کوئی واسطہ نہ ہو تو اسے دوسرے کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہئے لیکن میں کیا کروں۔ میں جس معاملے میں ٹانگ اڑا رہی ہوں اس سے تو میرا براہ راست واسطہ ہے۔"

"بیٹھیے شیلا جی!" حالانکہ سونو سمجھ رہی تھی کہ شیلا کیا کہنا چاہتی ہے لیکن بہت زیادہ سمجھداری کا مظاہرہ بھی بعض اوقات نقصان دہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بہت زیادہ سمجھداری کا مظاہرہ نہ کرے۔ کہنے لگی۔

"آپ بیٹھیں تو سہی' بعد میں ساری باتیں ہوں گی۔"

"آپ نے پوچھا نہیں اندر جی کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔"

"آپ اطمینان سے بیٹھئے تو سہی۔"

"شکریہ!" شیلا بیٹھ گئی۔ سونو بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ حسن و جمال میں تو بے مثال تھی ہی جو ناک نقشہ اس نے پایا تھا وہ ایسا تھا کہ کسی بھی رنگ و روپ میں ہو' انسان کو ایسا دیوانہ بنائے کہ وہ سب کچھ بھول جائے۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ ایسا ہی دلکش ہو رہا تھا اور شیلا قربان ہو جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سونو

"اندر جی! بھگوان کی سوگند۔ نہ میں ہوس پرست ہوں' نہ شاعر کہ بس جو من بھائے اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا دوں۔ پر آپ کے بارے میں' میں ایک بات کہہ سکتی ہوں کہ آپ کے اندر ایک ایسی کشش ہے جو انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔"

"آپ بہت اچھی مہمان ہیں اور جو اس طرح اپنے میزبان کی پذیرائی کرے اس کے لئے تو دنیا کی ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ ویسے آپ بہت سی باتوں میں الجھ گئیں۔ یہاں آکر آپ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔"

"بھلا کیا؟"

"یاد کریں۔"

"کہنا آپ کو دیکھ کر تو سب کچھ بھول جانے کو دل چاہتا ہے۔"

"آپ واقعی بڑی عجیب باتیں کرتی ہیں۔"

"عجیب کیوں؟" شیلا نے کہا۔

"اصولی طور پر تو آپ کی تعریف کرنا میرا فرض ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ عورت ہیں۔" جواب میں شیلا ہنس پڑی' پھر بولی۔

"کبھی کبھی الٹی گنگا بھی بہہ جاتی ہے۔"

"آپ نے الٹی گنگا بہتی ہوئی دیکھی ہے۔"

"اصل میں۔"

"ہاں۔"

"اصل میں تو خیر نہیں دیکھی لیکن لوگ تو کہتے ہیں۔"

"لوگ تو بڑے کمال کے ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں کی کہانیاں اکٹھی کر دیتے ہیں۔ ارے توبہ اصل بات سے پھر ہٹا دیا میں نے آپ کو۔ اچھا یہ بتایئے کہ کیا منگواؤں آپ کے لئے؟"

"میری مان لیں گے اندر جی۔"

"جیون بھر کے لیے۔" سونو نے شیلا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور شیلا کھو گئی۔ سونو کا انداز اس قدر دلربا تھا کہ شیلا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ سونو

قدر ہیں۔ اس نے پالم رام گپتا کا گھرانہ دیکھا تھا' شان و شوکت دیکھی تھی۔ اس خاندان کو اگر مٹھی میں جکڑ لیا جائے تو در حقیقت بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور سونو نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان میں اس کی پہلی شکار گاہ یہی گھر ہو سکتا ہے۔ آتمارام کا سہارا تو مل ہی گیا تھا۔ وہ اس کا اسٹیشن بنے تھے اور اس اسٹیشن سے وہ اپنی کارروائیاں شروع کر سکتی تھی۔ جس قدر جلد پاؤں جما لیے جائیں اچھا ہے۔ شیلا نے کہا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ تمہیں دیکھتی رہی اور جب ہوش آیا تمہارے پاس پہنچ گئی۔"

"اس محبت کا شکریہ۔"

"میں اپنی بات پوری کر لوں۔ تمہاری اس رہائش گاہ کے بارے میں کہہ رہی تھی۔"

"کیا؟"

"مجھے معاف کرنا برا تو نہیں مانو گے۔"

"بالکل نہیں۔"

"یہ جگہ تمہارے قابل نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"بس مجھے پسند نہیں آئی۔"

"ہر انسان کا ایک مقام ہوتا ہے اور ویسے آپ یہ جانتی ہیں شیلا جی کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ آتمارام جی سے میرا کیا رشتہ ہے؟"

"پوچھا تو تھا میں نے آتمارام جی سے مگر وہ نہیں بتاتے اور پھر سچ کہوں۔ اب تو تمہارے بارے میں کچھ بھی پوچھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اگر کوئی بات ایسی نکل آئی جو انسان کو سوچنے پر مجبور کر دے تو پھر سے بہت کچھ کھو جائے گا اور میں کھونا نہیں چاہتی۔"

"بہت گہری بات کر رہی ہیں آپ۔"

"آپ جو کچھ بھی سمجھ لیں۔"

"یعنی آپ .... آپ۔"

"ہاں کہہ دیجیے۔ آپ جو کچھ کہیں گے اندر جی' مجھے منظور ہو گا۔ میں ایسی ہی پاگل لڑکی ہو...... نہیں کہوں گی کہ مجھے ایسا ہونا چاہیے لیکن کیا کروں ہوں' اور جو ہوں'

وہ ہوں۔ اپنے آپ کو بدل نہیں سکتی۔ وقت اگر مجھے تبدیل کر دے تو میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا بن جاؤں گی لیکن اب جو کچھ ہوں آپ یقین کریں اندر جی اس پر فخر نہیں کرتی۔ اپنی مجبوری کا احساس ہے مجھے۔" سونو ہمدردی کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"میں آپ کے دل کی بات سمجھ رہی ہوں لیکن ایسے لوگ تو بڑے قابل احترام ہوتے ہیں جن کی زندگی کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے' صرف ایک راستہ اور وہ اسی پر چلتے ہیں' کہیں بھٹکتے نہیں ہیں۔"

"آپ یہ بات تسلیم کرتے ہیں اندر جی۔"

"میرے تسلیم نہ کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جو بات سنسار تسلیم کرتا ہے اسے اگر ایک انسان تسلیم نہ کرے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ نے میرا دل بڑھا دیا ہے۔" شیلا نے مسرور لہجے میں کہا۔

"شیلا جی! آپ یہاں آئی ہیں اس لیے نہیں بلکہ آپ یقین کریں آپ کے بارے میں کوئی بھی انسان بڑے محبت بھرے انداز میں سوچ سکتا ہے۔"

"مجھے کسی انسان کی پروا نہیں ہے۔"

"تو پھر۔"

"تم بتاؤ اندر' تم میرے بارے میں کس انداز میں سوچتے ہو؟"

"شیلا جی برا تو نہیں مانیں گی میری بات کا؟"

"تمہاری بات کا اور برا مانوں میں۔ ایسا ناممکن ہے۔"

"مجھے صرف ایک بات بتایئے آپ۔ کوئی اگر چاند کے بارے میں سوچے۔ چاند اسے بہت اچھا لگتا ہو تو وہ صرف یہ سوچ سکتا ہے کہ چاند بہت خوبصورت ہے۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ کاش چاند کسی طرح اسے مل سکتا ہو لیکن کیا پھر وہ اپنے آپ پر ہنسے گا نہیں۔"

"کیوں ہنسے گا۔"

"اس لیے کہ چاند اس کے بس میں نہیں آسکتا۔"

"اور اگر چاند خود چاہے کہ اس کے بس میں آجائے تو۔"

"تو اسے بڑی مشکل سے اپنی خوش بختی پر یقین آئے گا۔"

"اگر مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو۔"

"میں پریم کرنے لگی ہوں تم سے' بہت چاہنے لگی ہوں تمہیں۔ بولو' کیا اس قابل ہوں میں کہ تم میرے پریم کا جواب' پریم سے دے دو۔"

جواب میں سونو خاموش ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر بڑی احتیاط سے بولنا پڑتا ہے ورنہ صورت حال خراب ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ "کیا آپ کے ماتا پتا مجھے سویکار کر لیں گے۔"

"ایک بات کہوں آپ سے۔ اندر جی! میں ہمیشہ کی ضدی رہی ہوں اور میرے ماتا پتا میرا جیون چاہتے ہیں۔ ایک بار مجھے کسی چیز کے لیے منع کر دیا گیا تھا' میں بیمار ہو گئی اور اس کے بعد بس یوں سمجھ لیجیے کہ پتا جی نے سارے سنسار کے ڈاکٹر جمع کر دیے میرے لیے۔ ڈاکٹروں نے صرف ایک بات کہی تھی ان سے کہ جو میں مانگوں اس سے مجھے انکار نہ کیا جائے' ورنہ میرے لیے جیون مشکل ہو جائے گا۔ اس وقت سے میرے ماتا پتا میری حریات کا خیال رکھتے ہیں۔ بچپن کی بات تو اور تھی۔ جوان ہوئی تو اپنی اس عادت کا اندازہ ہوا۔ ڈاکٹروں کی بات بھی سنی اور دل میں یہ فیصلہ کیا کہ ایسی کسی چیز کو کبھی نہیں مانگوں گی اپنے ماتا پتا سے جسے وہ نہ دے سکیں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ اب میرے ماتا پتا جانتے ہیں کہ جو کچھ میں مانگوں وہ مجھے ملنا چاہیے اور وہ مل جاتا ہے لیکن انہیں یہ احساس ہے کہ میں کوئی ایسی چیز کبھی ان سے نہیں مانگوں گی جو وہ نہ دے سکیں۔ اگر میں اپنے ماتا پتا سے کہوں کہ مجھے اپنے جیون ساتھی کے انتخاب کا حق دیا جائے تو تم یقین کرو وہ انکار نہیں کریں گے' مجھے وہ حق مل جائے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا اندر جی۔"

"ہاں۔"

"بس میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ .... کہ تم میرے من میں آ بسے ہو۔ کوئی اور لڑکی شاید یہ بات برسوں نہ کہہ پاتی۔ اسے بھی میری فطرت کا ایک حصہ سمجھ لو کہ میں دل کی بات کہنے میں کوئی مشکل نہیں محسوس کرتی اور یہ چاہتی ہوں کہ فیصلہ بھی سن لیا جائے۔"

"فیصلہ؟" سونو بھلا موقع سے فائدہ اٹھانے میں کیسے چوک سکتی تھی۔

"ہاں' تمہیں اس کا پورا حق ہے۔ میں ان دولت مندوں میں سے نہیں ہوں جو یہ سوچتے ہیں کہ جو انہوں نے سوچ لیا بس وہ آخری بات ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں

"ٹھیک ہے' میں اس بات پر غور کر لوں۔ کچھ الجھنیں ہیں' ہو سکتا ہے بعد میں تمہارے لیے مشکل بن جائیں۔"

"سنو ایک بات میں تمہیں بتادوں۔ جب جیون کے فیصلے کرنے ہوتے ہیں تو سب سے پہلے الجھنوں ہی کو دماغ میں رکھنا ہوتا ہے۔ کوئی بھی کام الجھن کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ میں صرف تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں اندر جی کہ سنسار کی جتنی الجھنیں ہوتی ہیں وہ میرے لیے چھوڑ دو' بس اپنے من کو شانت کر کے فیصلہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بہت جلد تمہیں اس بارے میں جواب دوں گا۔" سونو نے کہا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ جواب میرے لیے خوشگوار ہی ہو گا۔"

"شاید۔" سونو مکاری سے بولی اور جب کافی دیر بیٹھنے کے بعد شیلا چلی گئی تو سونو نے اپنے آپ کو شاباشی دیتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے سونو کہ تم عظیم ہو اور تم نے جو کچھ سیکھا ہے اسے نبھانے کی ہمت رکھتی ہو۔ واہ کیا موٹی مرغی ہاتھ لگی ہے لیکن ذرا غور کر کے' سوچ سمجھ کر۔ یہ اجنبی جگہ ہے اور یہاں جو کچھ کرنا ہے اپنے آپ کو محفوظ کر کے کرنا ہے۔" لیکن اس وقت وہ ذرا سی الجھ گئی جب آتما رام نے اس سے کہا۔

"بات کچھ بھی نہیں تھی۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری کھوج میں رہتا ہوں۔ اصل میں شیلا بالم رام کی بیٹی ہے اور اس لڑکی کے بارے میں مجھے اس بات کا علم ہے کہ بچپن ہی سے شدید ضدی اور ذرا دیوانی قسم کی ہے۔ یعنی کبھی کبھی ایسے فیصلے کر لیتی ہے جس کے لیے بالم رام سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اس نے ایک بار مجھ سے اس کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ میں اس وقت سخت پریشان ہو گیا ہوں' جو کچھ اس نے کہا ہے تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو وقار؟"

"آپ نے اندازہ لگایا پروفیسر کہ وہ کس طرح کی لڑکی ہے۔ کیا آپ یہ چاہیں گے کہ وہ زندگی سے محروم ہو جائے۔"

"مطلب؟"

"وہ اگر' میں نے اسے اخلاقی بنیادوں پر انکار کر بھی دیا تو جی نہیں سکے گی وہ۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم.........."

"ہاں' میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ جیتی رہے اور پھر زندگی میں ایک مقام مل رہا ہے مجھے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ کیا وہ مقام میں چھوڑ دوں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو' یہ بات سوچ رہے ہو تم۔" پروفیسر آتما رام نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں پروفیسر! اگر میں کچھ غلط سوچ رہا ہوں تو آپ میری راہ نمائی کیجیے۔ میں نے ہمیشہ آپ کو ایک رہنما سمجھا ہے۔"

"کیا تمہارا دین دھرم اس کے آڑے نہیں آتا؟ کیا تم.......... کیا تم ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لو گے وقار۔ مسلمان ہو کر.........." جواب میں سونو ہنس پڑی۔

"بہت اچھی بات کہی ہے آپ نے پروفیسر! بہت ہی اچھی بات کہی ہے۔ یہ ہے وہ بات جو ہمیشہ مجھے بھٹکاتی رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا کے بڑے لوگ کیسے تھے؟ ان کا انداز فکر کیا تھا؟ لیکن بہت سے ایسے اچھے لوگ ہوتے ہیں جو انسان کو کسی اچھی بات کی تلقین کرتے ہیں اور جب ان پر براہ راست کوئی بات آجاتی ہے تو سب سے پہلے وہی سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ پروفیسر' میں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ میں آپ کو تکلیف دوں۔ میں نے اپنے طور پر شانتی کی تلاش کے لیے قدم اٹھایا تھا۔ آپ مل گئے۔ آپ نے مجھے پیشکش کی۔ میں نے آپ کی پیشکش قبول کرلی۔ آپ نے مجھے کچھ سبق دیے' دین دھرم کی باتیں بتائیں۔ اتنے خوبصورت الفاظ میں کہ میرے دل میں آپ کے لیے ایک مقام پیدا ہو گیا ہے۔ پروفیسر' انسان اگر واقعی انسان ہے تو اسے ہر معاملے میں انسان بن کر ہی سوچنا چاہیے۔ اس لڑکی سے میری باتیں ہوئی ہیں۔ محبت کی بات کرتی ہے یہ۔ کہتی ہے کہ اسے مجھ سے شدید لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میری ہم مذہب نہیں ہے لیکن آپ مجھے صرف ایک بات بتایئے کہ کیا صرف اس بنیاد پر میں اسے صحرا میں بھٹکتا چھوڑ دوں۔ میں تو نہیں چاہتا پروفیسر! میں تعاون چاہتا ہوں اس سے لیکن آپ انکار کرتے ہیں تو آپ یقین کیجیے کہ میں اسے بتادوں گا کہ میں کون ہوں؟" پروفیسر کے ہوش اڑ گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سونو کو دیکھتا رہا پھر اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ سقراط کو بھی بھٹکا دیا گیا تھا۔ اس سے بھی غلطی ہو گئی تھی۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ غلطیاں کرتے رہے ہیں۔ بڑی خوبصورت مثال دی ہے تم نے ان کے بارے میں اور میرے بارے میں بھی۔ واقعی سچ کہتے ہو۔ جو کچھ میں نے کہا۔ میں خود اس کی نفی بن رہا ہوں لیکن یوں سمجھ لو کہ تم نے اپنے استاد کو بھی سبق دے دیا ہے۔ واقعی سچ ہے' بالکل سچ کہہ رہے ہو۔ سب سے پہلے انسانیت کی پذیرائی

ہونی چاہیے۔ اس کے بعد دنیا کے کوئی اور کام ...."

سونو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"تو پھر کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"وہ تمہیں اندر کہتی ہے۔"

"جی۔"

"تو اندر بنے رہو۔" پروفیسر نے جواب دیا اور سونو نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

☆------☆------☆

شیلا' اندر کی دیوانی ہو گئی تھی اور اس سے بہت سے عہد و پیمان کر چکی تھی۔ اندر نے اس سے کہہ دیا تھا کہ زندگی میں شیلا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ شیلا کا اپنا لاکھوں روپے کا بینک بیلنس تھا' جو مختلف طریقوں سے سونو کی جیب میں منتقل ہوتا رہا اور وہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتی رہی۔ یہاں تک کہ شیلا نے اسے ایک فلیٹ کی چابی دی اور کہا۔ "اب ہماری ملاقاتیں اس فلیٹ میں ہوا کریں گی۔" سونو کو یہ خوبصورت فلیٹ بے حد پسند آیا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن حقیقت منظر عام پر آئے گی۔ پروفیسر آتما رام تھوڑا سا بد دل ہو گیا تھا اور یہ چیز اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ بہر حال لاکھوں روپے کا بینک بیلنس' خوبصورت فلیٹ' عارضی وقت گزاری کے لیے سونو کو ایک شاندار شکار ملا تھا اور وہ شیلا کا بینک بیلنس اپنی ماں کے پاس مسلسل منتقل کر رہی تھی۔ کم از کم اور کچھ نہیں تو ماں اور سوتیلے بہن' بھائیوں کی یہ خدمت ہی سہی جو اسے ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ شیلا کو اس نے باقاعدہ اپنے جال میں پھانس لیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ذرا وقت آجائے تو صورت حال کا صحیح اندازہ ہو۔ بالم رام گپتا کو شیشے میں اتارنا آسان کام نہیں ہو گا۔ جب اسے صورت حال پتا چلے گی' تو وہ جو کچھ بھی نہ کر بیٹھے کم ہے۔

بہر حال یہ سارا سلسلہ جاری تھا اور شیلا تقریباً پچپن لاکھ روپے سونو پر لٹا بیٹھی تھی۔ اب اس کا ذاتی بینک بیلنس ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر آتما رام بھی ان سے ملاقات کرتا رہتا تھا۔ سونو بڑی عزت سے اس سے پیش آتی اور بہت ہی عمدگی سے وہ ان دونوں کو ہینڈل کر رہی تھی پھر چورا ہے پر ہانڈی پھوٹ گئی۔ شیلا نے بینک سے اوور ڈرافٹ مانگا تھا جو اسے ملنے ہی والا تھا لیکن مینجر نے کسی طرح بالم رام گپتا سے اس بارے میں بات کرلی اور

پتا اس بات پر اعتراض کریں۔ گپتا جی کو اندازہ تھا کہ بیٹی کا بینک بیلنس بہت زیادہ ہے۔ حیران ہو کر انہوں نے تحقیقات شروع کی تو اندر کا نام سامنے آیا اور وہ ایک دم متحیر ہو گئے۔ پروفیسر آتما رام سے انہوں نے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے پاس پہنچ گئے۔ آتما رام نے بالم رام گپتا کا پر جوش استقبال کیا تھا لیکن گپتا جی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھ کر آتما رام حیران ہوا اور اس نے کہا۔

"خیریت تو ہے گپتا جی! کچھ فکر مند نظر آتے ہیں۔"

"آپ کے ساتھ اندر کمار رہتا ہے۔ پروفیسر آتما رام جی اس کے بارے میں آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"اندر کمار اب میرے ساتھ نہیں رہتا بالم رام جی۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ میرے ساتھ نہیں رہتا۔"

"کون ہے وہ آپ کا؟"

"کوئی نہیں لیکن آپ کا لہجہ بتاتا ہے کہ کوئی پریشانی کی بات ہو گئی ہے۔" آتما رام کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شیلا اور وقار کا معاملہ سامنے آگیا ہے اور بالم رام کو یہ پتا چل گیا ہے کہ وقار ایک مسلمان لڑکا ہے۔ بہر حال ساری باتیں اپنی جگہ' آتما رام کو اپنی پوزیشن بھی صاف کرنی تھی۔ بالم رام نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"آپ بتا سکتے ہیں کہ اس سے آپ کا کیا رشتہ تھا۔"

"کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ہوائی سفر کے دوران ملا تھا۔ کہتا تھا شانتی کی تلاش میں آیا ہے۔ شانتی چاہتا تھا۔ میرے پاس آگیا پھر اس دن آپ کے ہاں آپ سے ملاقات ہوئی۔ بعد میں شیلا اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ کچھ دن میرے ساتھ رہا اور اس کے بعد اس نے کہا کہ اس نے اپنے لیے کوئی ٹھکانا کر لیا ہے۔ شاید شیلا ہی نے اسے کوئی فلیٹ دیا تھا۔"

"اوہ! تو اب وہ آپ سے نہیں ملتا؟"

"کبھی اس کا دل چاہتا ہے تو مل لیتا ہے لیکن باقاعدہ ملاقات نہیں ہے۔ بات بتائیں گے کیا ہے۔"

"وہ ایک فریبی ہے اور اس نے شیلا کا لاکھوں روپے کا بینک بیلنس ہضم کر لیا ہے۔ شیلا اس کے جال میں گرفتار ہو گئی ہے اور اب اس نے بینک سے اوور ڈرافٹ مانگا ہے۔

لاکھ روپے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر کمار شیلا کے وہ پچاس' ساٹھ لاکھ روپے ہضم کر چکا ہے۔ یہ صورت حال انتہائی خوفناک ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں۔"

آتمارام کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ باتیں تو کچھ ان کے علم میں تھیں لیکن وقار اس طرح گیم کھیلے گا' اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ یہ ہمت نہ کر پائے کہ گپتا جی کو اصلیت بتا سکیں۔ اگر وہ گپتا جی کو یہ بتا دیتے کہ وہ ایک مسلمان لڑکا ہے تو قیامت ہی آجاتی۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اپنی شخصیت کو نظرانداز کر کے وہ صرف اس بات کا اظہار کریں کہ اندر کمار کو وہ صرف عام حیثیت سے جانتے تھے اور شیلا کا کھیل انہیں نہیں معلوم تھا۔ بالم رام نے کہا۔

"بہر حال آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ وہ شیلا کے فلیٹ پر ہی رہتا ہے؟"

"بس جب اس سے ملاقات ہوئی تھی تو یہی بتایا تھا اس نے مجھے۔ آگے میں کچھ نہیں جانتا۔" آتمارام کے حواس اس کا ساتھ چھوڑے جا رہے تھے۔ جو تفصیل بالم رام گپتا نے بتائی تھی۔ اگر اس کے حوالے سے سوچا جائے تو بہت جلد یہ پولیس کیس بننے والا تھا اور سیدھی سچی بات تھی کہ وقار یا اندر کمار کو اعلیٰ سوسائٹی میں روشناس کرانے والے آتمارام جی ہی تھے۔ سیدھی سیدھی ان کی گردن پھنس جاتی۔ بالم رام گپتا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"میں تو یہ سمجھتا تھا آتمارام جی کہ آپ مجھے اس فراڈیے کے بارے میں بہت سی تفصیلات فراہم کر دیں گے۔ میں یہ کیس پولیس کو دینا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں' میں دیر نہیں کر سکتا۔"

"افسوس' اگر مجھے رنگون نہ جانا ہوتا تو میں آپ کی پوری پوری مدد کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں رنگون کی ایک سوسائٹی کئی بار مجھے دعوت دے چکی ہے اور ہر بار میں معذرت کر لیتا ہوں لیکن اس بار میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں فوراً آرہا ہوں۔"

"افسوس آتمارام جی! میں بہت بڑا نقصان اٹھا چکا ہوں لیکن پولیس کو مجھے آپ کا حوالہ تو دینا ہی پڑے گا۔"

"آپ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں بالم رام گپتا' جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں' بھلا میں آپ کو اس سے کیسے روک سکتا ہوں لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں اعلیٰ سوسائٹی کا ایک فرد ہوں۔ دین دھرم کے لیے کام کرتا رہتا ہوں۔ چنانچہ کوئی یہ بات تسلیم نہیں کرے گا کہ میں اس معاملے میں شریک ہوں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس وقت میں اپنی

زبان بند نہیں رکھ سکوں گا اور ہو سکتا ہے میں یہ بیان بھی دے ڈالوں کہ آپ نے میرا نام دھرم دشمنوں کے اشارے پر لیا ہے۔"

"ارے نہیں .... نہیں آتمارام جی! بات یہ نہیں ہے' بات یہ نہیں ہے۔ میں آپ کا نام اس انداز میں نہیں لینا چاہتا۔ میں تو بس آپ کی گواہی دلوانا چاہتا ہوں۔"

"اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں عمر کی اس منزل میں بھی نہیں ہوں کہ عدالتوں کے چکر کاٹوں اور اگر آپ کچھ زیادہ کہلوانا چاہتے ہیں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ گھٹیا قسم کے فراڈ کے معاملات میں میرا نام لیا جائے اور میں گواہیاں دیتا پھروں۔"

"پھر آپ مجھے مشورہ دیجیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"سیدھا سیدھا آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سلسلے میں شیلا ہی سے بات کریں اور کوشش کریں کہ معاملہ اندر اندر ہی نمٹ جائے۔ باقی جہاں تک پولیس سے مدد لینے کا تعلق ہے تو آپ دیکھ لیجیے کہ یہ معاملہ اتنا اچھلے گا کہ آپ کو بھی اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل ہو جائے گی۔"

آتمارام کی باتوں پر بالم رام گپتا سوچ میں ڈوب گیا تھا' پھر اس نے کہا۔

"کچھ بھی ہو جائے' میں اس فراڈیے کو چھوڑوں گا تو نہیں۔"

"میں نے کہا نا' چھوڑنا تو آپ کو ویسے بھی نہیں چاہیے۔ ورنہ وہ کچھ اور کرے گا۔" تاہم رام گپتا وہاں سے واپس چل پڑا۔ بڑی مشکل میں گرفتار تھا وہ۔ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ بیٹی اپنے پچاس' ساٹھ لاکھ روپے بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ گنوا بیٹھی تھی۔ بات یہ تھی کہ اندر کمار اس کی بیٹی سے چمٹا رہتا تو آگے چل کر اور بہت بڑے بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ نقصانات اس کے لیے ناقابل قبول تھے۔ بہر حال آخری فیصلہ اس نے یہی کیا کہ بیٹی سے بات کرے۔ شیلا ان تمام واقعات سے بے نیاز تھی اور نہیں جانتی تھی کہ باپ اس حقیقت سے آشنا ہو چکا ہے۔ بالم رام نے شیلا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے اور بولے۔

"شیلا بیٹی! تم جانتی ہو کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ بولو' کیا تمہیں میری چاہت کا اندازہ ہے۔"

"کیوں نہیں پتا جی' یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

گی۔"

"میں سمجھی نہیں پتا جی۔"

"اندر کمار کون ہے؟"

"اوہ.......... آپ کو اس کے بارے میں پتا چل گیا؟"

"ہاں۔"

"پتا چل ہی گیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں پتا جی۔"

"جو پوچھ رہا ہوں مجھے بتاؤ۔"

"انسان ہے وہ۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"تو پھر کیا پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"کیسا انسان ہے؟"

"بہت اچھا۔"

"کہاں رہتا ہے؟"

"میں نے اسے ایک فلیٹ خرید کر دیا ہے۔"

"بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا میں تم سے۔"

"کسی مناسب موقع پر میں آپ کو خود بھی بتا دیتی پتا جی۔"

"لیکن تم نے مجھ سے پوچھے بغیر ایسا کام کیوں کیا؟"

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں پتا جی' جن پر خطرہ ہوتا ہے کہ آپ مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"گویا تم نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس مسئلے میں تمہیں کوئی اجازت نہیں دوں گا' یہ کام کیا؟"

"ہاں پتا جی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں.......... کہ میں.......... کہ میں۔"

"اندر کمار کو چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"ہاں۔"

"کون ہے وہ؟ میرا مطلب ہے کس ذات پات سے تعلق رکھتا ہے۔ ماتا پتا کہاں ہیں اس کے۔ کیا ٹھکانا ہے اس کا؟"

"سنسار میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ تنہا ہے وہ اس سنسار میں۔ ہاں آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو بہت اچھا لگے گا وہ۔"

"کیوں نہیں' یہی تو اس کی خوبی ہے کہ بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو پھانس لیتا ہے۔ کیا کتنا پیسہ خرچ کر چکی ہو تم اس پر۔" بالم رام گپتا نے سوال کیا اور شیلا کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اصل بات یہی تھی جو آپ نے اتنی گھما پھرا کر کہی پتا جی! آپ کو بس یہی زیادہ چبھ رہی ہے نا بات کہ میں نے کتنا پیسہ خرچ کر دیا ہے اس پر۔ پتا جی! پیسہ خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اگر صحیح جگہ خرچ ہو جائے تو آپ اس سے اچھی بات کوئی اور نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں ظاہر ہے جو پیسہ اپنی محنت سے نہ کمایا جائے اس کے بارے میں بڑی آسانی سے یہی الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ دولت آپ کی ہے؟"

"کہنا کیا چاہتا ہوں' حقیقت تو یہی ہے لیکن بہرحال میں نے تمہیں کبھی ایسا کچھ کرنے سے نہیں روکا لیکن بہرحال تم خود اپنے ذہن سے ایک بات سوچو کہ جو شخص اتنی بڑی رقم قبول کر سکتا ہے وہ کس طرح کا انسان ہو گا۔"

"پتا جی! بات انسان کی ضرورت کی ہوتی ہے۔ اس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ میں نے خود ہی اس کے حالات کے تحت اسے دیا ہے۔"

"اور اس نے اس رقم کا کیا کیا؟"

"یہ میں نے کبھی نہیں پوچھا۔" بالم رام جی کو فوراً ہی یہ احساس ہوا کہ بیٹی سادگی کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ اگر کوئی سخت بات کی تو سارا کھیل الٹا ہو جائے گا۔ اندر کمار کو اتنی بڑی رقم ہضم کرنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ یقینی طور پر کوئی خاص منصوبہ سوچنا ہو گا۔ بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ کام سرانجام دینا ہو گا۔ ایک طرف بیٹی کو سمجھانے کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف اتنی بڑی رقم' اتنی بڑی دولت واپس حاصل کرنے کا معاملہ۔

[illegible]

سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اندر کمار تمہارے دل کی گہرائیوں میں بہت نیچے تک اتر ہے؟" شیلا نے کوئی جواب نہیں دیا تو بالم رام نے کہا۔

"بیٹی! تمہاری اپنی پسند' تمہاری اپنی خواہش ہمیشہ میں نے سرفہرست رکھی ہے تمہیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں تو بس اس لیے پریشان تھا کہ کہیں کوئی آدمی تمہیں کوئی فریب نہ دے رہا ہو۔"

"آپ اسے جانتے نہیں ہیں پتا جی! وہ بہت اچھا انسان ہے۔ کسی کو فریب دے نہیں سکتا وہ۔"

"میں اس سے ملوں گا۔" بالم رام نے کہا۔ شیلا بھی بالم رام کی بیٹی تھی۔ باپ جس طرح اس مخالفت کا آغاز کیا تھا اور پھر اچانک ہی وہ نرم ہو گیا تھا۔ یہ بات شیلا کی میں نہیں آئی تھی۔ اندر کمار کو ہوشیار کرنا بے حد ضروری تھا۔ بالم رام نے بھی یہی تھا کہ ایک مضبوط بنیاد پر کام کرے گا اور اندر کمار کو نکلنے کا موقع نہیں دے گا' چنانچہ ہم شیلا کی بات کرتے ہیں۔ وہ فلیٹ پر پہنچی تھی۔ اندر کمار اپنے معمولات میں مصروف تھا۔ شیلا کا اس نے مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا تھا پھر اس نے شیلا کے چہرے پر تشویش لکیریں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے شیلا' پریشان نظر آ رہی ہو؟"

"ہاں۔" شیلا نے کہا اور اس کے بعد بالم رام سے ہونے والی تمام گفتگو اندر کمار بتا دی۔ اندر کمار کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے کہا۔

"تو پھر بتاؤ کیا کرنا چاہیے مجھے۔"

"دیکھو' ویسے تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ تمہاری بھرپور مدد کروں گی میں لیکن ہوشیار رہنا شرط ہے۔ میں سمجھتی ہوں اپنے پتا جی کو' اتنی آسانی سے وہ ہار نہیں مانیں گے۔ انہوں نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے لیکن میں دھوکا کھاؤں گی نہیں۔ بس تمہیں ہوشیار کرنا چاہتی ہوں۔"

"ایک بات کہوں۔"

"ہاں ضرور۔"

"میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔ سنو اگر بالم رام جی نے کوئی الٹا سیدھا کام کیا

حیرت کا اظہار مت کرنا بلکہ جو کچھ بھی تمہارے سامنے آئے اس کو تسلیم کر لینا اور تصدیق کرنا کہ بات وہی ہے۔"

"لیکن میرے سامنے کیا آئے گا؟"

"یہ تو وقت پر ہی بتایا جائے گا تمہیں۔"

"ارے واہ مجھے بھی نہیں بتاؤ گے۔"

"میں نے کہا نا شیلا! میں ایک گیم کھیلوں گا اور ہو سکتا ہے اس کی ضرورت نہ پیش آئے۔ ہو سکتا ہے کہ میرا وہ گیم کامیاب نہ ہو لیکن تمہیں بہر حال تصدیق کرنا ہو گی' ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ۔"

"تم نے مجھے الجھن میں گرفتار کر دیا ہے۔"

"نہیں' جب دوستی اور اعتماد کی بات ہوتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تم سے تین دن کے بعد ملوں گی' اصل میں' میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم پر کوئی مصیبت آئے۔ سارے حالات کا جائزہ لوں گی میں۔"

"اوکے۔" اندر کمار نے اسے رخصت کر دیا لیکن شیلا کے جانے کے بعد سونو کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں پیدا ہو گئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کھیل شروع ہو گیا۔ خیر ایسے کھیل کی اسے بالکل پروا نہیں ہوتی تھی۔ کچھ انتظامات ضروری تھے جو اس نے فوراً ہی کیے اور سب سے پہلے اس نے فلیٹ میں موجود سارے مردانہ کپڑوں کا بنڈل بنایا اور ایسی تمام چیزیں لیں جن سے اس کے اندر کمار یا مرد ہونے کا اظہار ہو پھر وہ تمام چیزیں لے کر وہ وہاں سے چل پڑی۔ یہ ساری چیزیں اس نے دریائے جمنا میں پھینکیں اور زنانہ لباس خریدے۔ میک اپ کا سامان۔ ایسی دوسری تمام چیزیں جو اسے لڑکی ظاہر کریں۔ فلیٹ پر آنے کے بعد اس نے حلیہ فوراً بدل لیا۔ ویسے بھی وہ ایک حسین لڑکی تھی اور اگر اپنے آپ کو لڑکی کے روپ میں رکھتی تو دیکھنے والی نگاہ اسے ایک بار دیکھنے کے بعد نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ آئینے میں اپنا مکمل جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنا ایک نام تجویز کیا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

ادھر شیلا کی توقع کے مطابق بالم رام نچلا نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ایک بہت ہی گہرے دوست جو "ایس پی" کے عہدے پر فائز تھا۔ مول چند سے رابطہ قائم کیا اور اس سے اس کے گھر پر ملا۔ اب سارا کیس مول چند کے حوالے کرنا ضروری تھا۔ مول چند کو

"اور تم نے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ شیلا بینک سے اتنی بڑی رقمیں کیوں نکال رہی ہے۔"

"بس یوں سمجھ لو مول چند کہ بیٹی پر مکمل اعتبار تھا اس لیے کبھی غور نہیں کیا۔"

"میرا خیال ہے ایک لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں فوراً اندر کمار پر ہاتھ ڈال دینا ہو گا۔"

"تو پھر جیسا تم کہو۔"

"میں اپنے ایک علاقہ انچارج کو طلب کرتا ہوں۔ کون سے علاقے میں ہے وہ فلیٹ..........." اور بالم رام نے علاقے کا پتا بتا دیا۔ ایس پی مول چند نے تھانہ انچارج کو فون کر کے کہا "جا کر وہ فلیٹ گھیر لیا جائے۔" اس کے ساتھ ہی وہ بالم رام سے بولا۔

"اگر تم چاہو تو شیلا کو بھی طلب کر لو؟"

"مناسب نہیں ہو گا......... بالکل مناسب نہیں ہو گا۔"

"تو پھر؟"

"اسے بعد میں پتا چلے گا۔ نمٹ لوں گا میں اس سے' اس کی فکر مت کرو۔"

"تو پھر آیئے۔" بالم رام مول چند کے ساتھ فلیٹ پر پہنچ گئے۔ تھانہ انچارج کو صرف اتنی ہدایت ملی تھی کہ وہ فلیٹ گھیر لیا جائے۔ بالم رام نے فوراً آگے بڑھ کر فلیٹ کی بیل بجائی تھی۔ مول چند اس کے ساتھ تھا۔ دروازہ کھولنے والی حسین لڑکی کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے سو رہی تھی۔ بالم رام کو اس لڑکی کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"اندر کمار کہاں ہے؟"

"یہاں کوئی اندر کمار نہیں رہتے۔ آپ دوسرے فلیٹ کو دیکھیے۔" لڑکی نے کہا اور اندر جانے لگی تو مول چند نے اندر پاؤں رکھ دیا اور بولا۔

"بات سنو لڑکی! تم دیکھ رہی ہو میرے جسم پر پولیس کی وردی ہے اور یہ ایک شریف آدمی ہیں۔"

"جی' میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں؟ آپ اندر کمار کو پوچھ رہے ہیں۔ یہاں کوئی اندر کمار نہیں رہتا۔ یہاں میں رہتی ہوں۔ شکنتلا ہے میرا نام۔"

"لیکن یہ فلیٹ شیلا کا ہے۔" بالم رام نے کہا۔

"[illegible]

.. شیلا نے مجھے تھوڑے دن کے لیے یہیں ٹھہرایا ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

"میں شیلا کا باپ ہوں۔"

"اوہو' بالم رام جی۔" لڑکی کے انداز میں نیاز مندی پیدا ہو گئی۔ ادھر ایس پی مول چند کھڑا سر کھجا رہا تھا۔ بالم رام خود بھی حیران تھے۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹی! یہاں اندر کمار نہیں رہتا۔"

"نہیں جناب' جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ میں نے کسی اندر کمار کو نہیں دیکھا' ..ں میں ہی یہاں رہتی ہوں۔ کچھ ریسرچ ورک کر رہی ہوں میں۔" مول چند بغور لڑکی کو ..یکھ رہا تھا' پھر اس نے کہا۔

"دیکھو شکنتلا جی! ہمیں تمہارے فلیٹ کی تلاشی لینا ہو گی۔ کچھ ایسے ہی حالات ہیں ..ن کی وجہ سے ہم تلاشی لینے پر مجبور ہیں۔" لڑکی نے اتنی معصومیت سے گردن ہلائی تھی ..ک مول چند بھی بالم رام کو گھور کر رہ گیا تھا۔ پتا نہیں بالم رام جی کی کھوپڑی گھوم گر رہ ..ئی تھی یا کوئی ایسی غلط فہمی جو سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ لڑکی تو بہت ہی معصوم سی ..لگ رہی ہے۔

بہر حال مول چند نے فلیٹ کی تلاشی لی۔ فلیٹ سے جو کچھ برآمد ہوا وہ صرف لڑکی ..ے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ مول چند نے بالم رام سے کہا۔

"آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" بالم رام ضدی لہجے میں بولا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کوئی نوجوان مرد نہیں' بلکہ ایک معصوم سی لڑکی ہے۔"

"فراڈ ہے وہ۔" بالم رام غصے سے بولا۔ "میں تصدیق کر چکا ہوں۔"

"کیسی تصدیق۔" مول چند نے پوچھا۔

"وہ سو فیصدی مرد ہے' ایک چالاک کم سن نوجوان۔ یقیناً اس نے دوسروں کو دھوکا ..دینے کے لیے لڑکی کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں مول چند۔ مکمل تحقیقات کرئی ..ہے میں نے۔ اتنی بڑی دولت کا معاملہ ہے کہ میں اسے نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔ آپ براہ کرم قانونی کارروائی کیجئے۔ میری طرف سے باقاعدہ ایف آئی آر درج کیجئے۔ میں ذمہ ..دار ہوں تمام باتوں کا۔" مول چند نے حیران نگاہوں سے بالم رام کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کے ذہن پر اس وقت ہندوستانی فلمیں سوار ہیں' جن میں گدھے قسم [illegible]

گوونڈا عورت بن کر سارے ہندوستانیوں کو بے وقوف بناتا ہے۔ معاف کیجئے گا یہ قانون ہے گپتا صاحب! بمبئی کی فلم انڈسٹری نہیں ہے۔"

"میں جو آپ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ باقاعدہ میری طرف سے یہ رپورٹ درج کیجئے۔ ایک نوجوان لڑکی بن کر میری بیٹی کو بے وقوف بناتا رہا ہے اور اس نے ایک بہت بڑی دولت ہتھیالی ہے۔ اگر یہ رپورٹ جھوٹی ثابت ہو تو قانون کے مطابق کارروائی کیجئے گا۔ میں ساری ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ جب آپ قانون کی بات کر رہے ہیں اور باقاعدہ رپورٹ درج کرانے کو تیار ہیں تو میں پھر قانونی کارروائی کروں گا۔ کیا چاہتے ہیں آپ! اس لڑکی کو گرفتار کر کے لے چلوں میں۔"

"جی میں یہی چاہتا ہوں۔" بالم رام گپتا نے سرد لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" مول چند بولا اور پھر اس نے نرم لہجے میں سونو سے کہا۔

"بیٹے! گپتاجی کو تمہارے سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تمہیں کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ بے فکر رہو' پولیس تمہاری مکمل حفاظت کرے گی اور کسی بھی طرح تمہیں پریشان نہیں کیا جائے گا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں جناب لیکن اگر شیلا کو اس بارے میں اطلاع دے دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔" سونو نے شکنتلا کی حیثیت سے کہا۔

"بالکل نہیں۔ جب تک تمہارے بارے میں مکمل تصدیق نہیں ہو جاتی' تم شیلا سے نہیں مل سکو گی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم دوبارہ اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرو گی اور وہ وہی سب کچھ کہے گی جو تم اس سے کہلوانا چاہو گی۔" مول چند نے ناخوشگوار نگاہوں سے بالم رام گپتا کو دیکھا تھا۔ بے شک گپتا جی اس کے دوست تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سرمایہ دار کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اگر مول چند ان کی مرضی کے مطابق نہ کرتا تو ان کے تعلقات ڈی آئی جی' آئی جی صاحب سے بھی تھے۔ اس لئے بلاوجہ بات بگاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شکنتلا کو وہ بڑے آرام سے پولیس اسٹیشن لایا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے رجسٹرار کو طلب کیا اور بالم رام گپتا کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

[illegible]راؤ۔"

شکنتلا کو انہوں نے انسپکٹر کے دفتر میں ایک طرف بٹھا دیا۔ اسی وقت ایک انتہائی خوبصورت اور اسمارٹ سا نوجوان اندر داخل ہوا اور اس نے چاچا جی کہہ کر مول چند سے ملاقات کی۔ مول چند نے بھی حیرانی سے اسے سینے سے لگایا اور بولا۔

"ارے نیل' تم اچانک۔"

"بس چاچا جی! آپ سمجھ لیجیے تھوڑی دیر کے لئے یہاں رکا تھا۔ نائجیریا جا رہا تھا' میں نے سوچا کہ چاچا جی سے ملے بغیر کیسے جاؤں گا۔ چاچا جی کچھ کاغذات تھے آپ کے پاس میرے۔"

"ہاں' ہاں مگر تو یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"بس سمجھ لیجیے کہ معلومات کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ گھر گیا تھا اور چاچی جی سے ملا تھا۔"

"کاغذات تو گھر پر ہی ہیں تیرے۔ ظاہر ہے یہاں تو نہیں لے پھر رہا میں اپنے ساتھ۔"

"چاچا جی! آپ کے ساتھ ہی گھر چلوں گا' کھانا کھاؤں گا اور بس پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے .... ٹھیک ہے۔ بیٹھو' تھوڑا سا وقت لگے گا مجھے یہاں۔ تمہاری نائجیریا کی فلائٹ کب ہے۔"

"وہ تو رات کو ساڑھے دس بجے ہے۔"

"بس تو پھر تیرے پاس تو وقت ہے نا۔"

"ہاں چاچا جی ابھی تو ہے۔ آپ آرام سے اپنا کام ختم کر لیجیے۔"

نیل نامی نوجوان نے ایک اچٹتی ہوئی سی ایک نظر سونو پر ڈالی۔ ان آنکھوں میں پسندیدگی کے تاثرات تھے پھر وہ مول چند سے باتیں کرنے لگا اور اس گفتگو سے سونو کو اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ یہ اسمارٹ سا نوجوان اسے پسند آیا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد بالم رام گپتا اپنا بیان درج کرا کے واپس آ گئے تو مول چند نے کہا۔

"جی اب کیا ارادہ ہے آپ کا۔"

اس کا جائزہ لے۔"

مول چند نے ایک بار پھر گپتا جی کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔

"چلئے اس کے لیے بھی تیار ہوں میں' آؤ بیٹی۔" راستے میں نیل شرما نے سونو کے بارے میں اپنے چاچا سے بہت سوال کیے اور اس کے بعد وہ پولیس ہسپتال پہنچ گئے۔ یہاں مول چند نے اپنے اختیارات سے کام لے کر ایک لیڈی ڈاکٹر کو مخصوص کیا۔ بات بڑی حیران کن تھی' چنانچہ لیڈی ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ کچھ اور ذمہ دار افراد بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے اور کوئی بیس منٹ کے بعد ہی رپورٹ پیش کر دی گئی' جس میں لیڈی ڈاکٹر نے تصدیق کی تھی کہ شکنتلا ایک نوجوان اور صاحب کردار لڑکی ہے اور اس میں کوئی شک کی بات ہی نہیں ہے۔ اب بالم رام گپتا کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی اور مول چند نے ان کے سامنے سونو سے کہا تھا۔

"بیٹی! تم ہتک عزت کا پورا پورا حق رکھتی ہو۔ اگر تمہیں وکیل درکار ہے تو وہ بھی میں تمہیں مہیا کروں گا اور فوری طور پر رہائش گاہ بھی تمہیں فراہم کی جا سکتی ہے۔" سونو نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔ شیلا کو ذرا میرے پاس بھجوا دیجیے۔ میں ابھی اس کے فلیٹ پر ہی جا رہی ہوں۔"

"چلو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔" مول چند نے کہا۔

بالم رام گپتا بری طرح نروس نظر آ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "میں اسے اپنے ساتھ گھر لے جا رہا ہوں مگر یہ ہوا کیا ہے' یہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا۔"

سونو نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اور اب بھی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ کہیں جاؤں گی۔ معاف کیجیے گا۔ شیلا بہت اچھی لڑکی ہے لیکن آپ اس کی نسبت بہت برے انسان ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح شیلا سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ اس کے فلیٹ پر میں صرف اس لیے جاؤں گی کہ وہاں سے اپنا سامان لے لوں۔"

مول چند اور بالم رام گپتا نے اسے بہت سی پیشکشیں کی تھیں لیکن اس نے کسی پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا پھر سونو ایک ٹیکسی کر کے شیلا کے فلیٹ کی جانب چل پڑی۔

خطرناک ہو سکتے ہیں۔ خاصی رقم ہاتھ میں ہے اس وقت چولا بدل لینا چاہیے۔ کہیں کوئی مشکل پیش نہ آ جائے۔ ویسے بھی اس نے یہاں سے بہت کچھ کما لیا تھا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ شیلا اس تک پہنچے' اپنا سامان سمیٹ کر نکل لینا زیادہ مناسب ہے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ قیمتی سامان کا ایک سوٹ کیس' نقد رقم اور قیمتی چیزیں لے کر وہ وہاں سے چل پڑی اور اس کے بعد ایک ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنا اس کے لئے مشکل ثابت نہ ہوا۔ شیلا کی کہانی اس نے اپنے ذہن میں ختم کر دی تھی لیکن شیلا پر جو بیتی تھی اس کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ساری تفصیلات سن کر شیلا نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔ ادھر آتمارام جی پہلے ہی فرار ہو چکے تھے۔ سونو نے تین دن تک اپنے ہوٹل کے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالا۔ تیسرے دن اس نے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اسے نئے شکار اور نئے جہانوں کی تلاش تھی۔ جس زندگی میں قدم رکھ دیا تھا' اس سے نکلنے کو اب نہ اس کا دل چاہتا اور نہ ہی وہ اس طرح کے حالات رکھتی تھی کہ اس زندگی سے نکل جائے۔ بہت بڑی دولت ماں کو بھیجی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کے حالات بہت بہتر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اپنے لئے بھی اس نے معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ حلیہ تبدیل کرنا ضروری تھا کیونکہ بہرحال اس حیثیت سے اور کچھ نہ سہی کم از کم مول چند کی نظروں میں تو آ چکی تھی۔ چنانچہ تین دن کے بعد اس نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں قدم رکھا۔ ایک میز پر بیٹھ کر دنیا کی مصروفیات دیکھنے لگی۔ لوگ کس طرح جیتے ہیں؟ کس طرح کے لوگ کہاں کہاں سیر و سیاحت کرتے ہیں؟ کس طرح ایک دوسرے کو بے وقوف بنایا جاتا ہے؟ کسی سنسان گوشے میں بیٹھ کر اگر نگاہوں کے زاویے مناسب رکھے جائیں تو بڑے بڑے حسین تجربات ہوتے ہیں لیکن اس تجربے میں یہ نوجوان شامل نہیں تھا جو کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ نیلی آنکھوں اور شفاف چہرے والا یہ شخص جس کے بال اخروٹی رنگت کے تھے لیکن نقوش خالص ہندوستانی' دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کو دیکھتا ہوا بولا۔

"اور یقیناً آپ مجھے نہیں جانتی ہوں گی لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ جس نام سے میں آپ کو مخاطب کر رہا ہوں' اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں آپ کو کیسے جانتا ہوں۔ مس شکنتلا........"

سونو سرد نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی' پھر بولی۔

ہے؟ اور جس طرح بے تکلفی سے آپ میرے سامنے بیٹھ گئے ہیں اس کے نتیجے کا بھی آپ کو احساس ہو گا۔"

"دو جینئس پہلے اپنا تعارف کراتے ہیں' بعد میں ایک دوسرے کو تسلیم کرتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں مس شگفتلا کہ میں بھی آپ کی طرح ایک ذہین شخص ہوں۔ میری آپ سے ملاقات اس تھانے میں ہو چکی ہے جہاں آپ' بالم رام گپتا کے مسئلے میں ایس پی مول چند کے ساتھ پہنچی تھیں اور میں وہاں انیل شرما کے نام سے موجود تھا۔"

سونو کو سب کچھ یاد آگیا اور اس کے چہرے پر جو تاثر پیدا ہوا اسے محسوس کر کے نوجوان نے کہا۔

"ہاں' اس وقت آپ کو ضرور حیرت ہو رہی ہو گی۔ اس وقت میرے نقوش کچھ اور تھے اور اس وقت کچھ اور ہیں۔ میرا نام انیل شرما نہیں ہے' بلکہ میرا صحیح نام اجے کمار ہے۔ مقامی آدمی ہوں لیکن زندگی کے بیشتر حصے دنیا کے مختلف ملکوں میں گزارے ہیں۔ انیل شرما مول چند جی کا بھتیجا تھا۔ ایک حادثے میں مارا گیا۔ اس کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن بنکاک میں وہ ایک ریکیٹ کے ساتھ کام کر رہا تھا اور کسی کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے کچھ کاغذات تھے جو میرے لئے قیمتی ہو سکتے تھے اور میں ان ہی کے حصول کے لئے بنکاک سے سفر کر کے ہندوستان آیا تھا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ میں نے مول چند جی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ کاغذات میرے حوالے کر دیں لیکن بات ایک پولیس آفیسر کی تھی۔ میری بدقسمتی ہی کہیں کہ حقیقت مول چند جی تک پہنچ گئی اور انہیں بنکاک سے خبر مل گئی کہ انیل شرما ہلاک ہو چکا ہے' چنانچہ مجھے کاغذات لئے بغیر فرار ہونا پڑا اور پھر سادہ سی بات ہے کہ میں نے وہ میک اپ اتار دیا۔ خیر یہ تو رہی میری بات۔ آپ کے بارے میں آپ یہ سمجھ لیجئے کہ شیلا نے بڑے عجیب و غریب بیان دیئے ہیں۔ وہ یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ اندر کمار' اندر کمار نہیں بلکہ شگفتلا ہے۔ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہو گئی ہے اور بڑا سنسنی خیز سلسلہ چل رہا ہے۔ اب وہ لوگ آپ کو بھی تلاش نہیں کر سکتے لیکن مس شگفتلا میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے آپ کو تلاش کر لیا اور آپ کے سامنے اپنی حقیقت بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب میں آپ سے دوستی چاہتا ہوں۔"

سونو کچھ دیر سوچتی رہی۔ چاہتی تو منحرف ہو سکتی تھی لیکن ایک دلچسپ مشغلہ مل

نہ وہ کسی سے متاثر ہوئی تھی اور نہ ہی اجے کمار کے سلسلے میں اس کے امکانات تھے ...سی دوست اور کسی ساتھی کا ہونا اتنا ضروری ہوتا ہے جتنی زندگی۔ چنانچہ کچھ لمحے ...چنے کے بعد اس نے اجے کمار کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور دونوں ایک دوسرے ...حل گئے۔ اجے کمار نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ ساری دنیا اس کی شکار گاہ ہے۔ ...جہاں بھی مل جائے غنیمت ہوتا ہے۔ بس کماؤ عیش کرو۔ چنانچہ اس ہوٹل کو چھوڑ ...یا اور ایک نئے ہوٹل میں دونوں نے رہائش اختیار کر لی۔ اجے کمار کو بھی اندازہ ہو ...تھا کہ واسطہ ایک عجیب و غریب شخصیت سے ہے جو جرم کی دنیا میں ہونے کے باوجود ...رت کی حیثیت سے صاحب کردار ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ دوستی کے راستے میں ...ور قسم کے جذبات بھی شامل ہونا ضروری ہوں۔ چنانچہ دونوں اس سمجھوتے پر تیار ہو ...نے تھے کہ ساتھ مل کر کام کریں اور صرف دوست رہیں۔

سونو بڑی فراخ دلی سے شگفتلا کی حیثیت سے اجے کمار پر خرچ کرتی رہی۔ ویسے بھی ...لے دل' کھلی طبیعت کی مالک تھی۔ اجے کمار کام کا آدمی تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ ...س کے لئے ہمیشہ کا ساتھی ثابت ہو' جبکہ کبھی کبھی اجے کمار کے انداز میں ایسی بات پیدا ہو جاتی تھی۔ دونوں اپنے طور پر کام کر رہے تھے اور سونو اپنی جمع شدہ دولت لٹا رہی تھی۔ اس دوران اعلیٰ سوسائٹی میں دعوتیں دی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ سونو کی نگاہیں ...یسے لوگوں کو بھی چھانٹتی جا رہی تھیں جنہیں معاشرہ اور قانون پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں ...یکھتا تھا۔ ایسے لوگ سونو کے لئے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ چنانچہ اس نے ایسے چند ...فراد سے رابطے قائم کر لئے۔ اجے کمار کو تو بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ شگفتلا کیا کر رہی ...ہے' لیکن شگفتلا یا سونو نے اپنے دو خاص ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈکیتی کی کچھ خاص ...وارداتیں کیں اور ان وارداتوں سے انہیں اتنی رقم حاصل ہوتی کہ کافی دن عمدگی سے ...گزر جاتے۔ پھر جب چھوٹی چھوٹی وارداتوں سے ملنے والی رقم اس کے لئے ناکافی ثابت ...ہونے لگی تو اس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ امیر لوگوں کے ہاں دعوتوں میں شرکت ...کرتی اور خود گھوم پھر کر گھروں کا جائزہ لیتی۔ بعد میں اپنی یادداشت کے بھروسے پر اس گھر ...کا نقشہ بنا کر اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیتی جو دوسرے تیسرے دن گھر کا صفایا کر دیتے ...اور سونو کو اس کا حصہ مل جاتا۔ اجے کمار بھی چونکہ اسی لائن کا آدمی تھا' اس لئے چند ہی روز کے بعد اسے علم ہو گیا کہ شگفتلا کا طریقہ کار کیا ہے۔ اس نے کہا۔

مجرم شمار ہوں گے اور یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔"

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟" سونو نے پوچھا۔

"اصل میں اپنی ذہانت کو صحیح راستے پر استعمال کرنا ہی میری ہابی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو کہ میں کچھ دن کے لئے اپنا ہاتھ روک لیتی ہوں' تم اپنا کام شروع کرو۔" بہت عرصے سے اجے کمار سونو کے خرچے پر پل رہا تھا لیکن اب اجے کمار نے یہ صورت حال سنبھال لی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے دہلی کے نہایت پوش بازار میں ایک بڑے سٹور کا انتخاب کیا اور سٹور میں داخل ہو کر کئی قیمتی اشیاء خریدیں۔ دونوں کی شخصیتیں شاندار تھیں۔ سونو بھی ایک عمدہ لباس میں ملبوس کسی اعلیٰ پائے کی سوسائٹی کی فرد نظر آ رہی تھی اور اجے کمار تو تھا ہی ایک شاندار نوجوان۔ تقریباً پینتیس ہزار روپے کی خریداری کی تھی انہوں نے اور اس کے بعد اجے کمار نے چیک بک نکال کر اس کا چیک کاٹا تو سیلز مینوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس دن ہفتہ تھا اور بینک بھی بند تھے۔ اکاؤنٹ کی تصدیق بھی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس انکار پر اجے کمار ایک دم بھڑک اٹھا۔

"کیا تم مجھے چور یا اچکا سمجھتے ہو۔ میں ہندوستان کا ایک معزز شہری ہوں۔ میرا لاکھوں کا بزنس ہے۔ تم نے میری بیوی کے سامنے میری بے عزتی کی ہے۔ تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا ہو گا۔"

"سر! ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں آپ سے لیکن دیکھئے نا ہم تو سیلز مین ہیں۔"

اسی ہنگامہ آرائی کے دوران سٹور کا منیجر آ گیا اور اس نے ان دونوں کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد چیک قبول کر لیا اور معذرت بھی کی۔ یہ کہتے ہوئے کہ بہرحال ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں جو اس طرح کی حرکتیں کر ڈالتے ہیں۔ بہرطور اب اس وقت ان حالات میں ان دونوں کو ایسے حالات سے نمٹنا تھا جو بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ کیونکہ رقم ختم ہو گئی تھی۔ بہرحال سونو اپنی مثال آپ تھی' اور ادھر اجے کمار بھی اس کا ایک اچھا ساتھی ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بڑے دلچسپ انتظامات کئے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ شہر چھوڑ دیا جائے اور اس کی تیاریاں بھی مکمل ہو چکی تھیں۔

اس دن پولیس ہیڈ کوارٹر میں شعبہ شکایات کے خصوصی سیل کے افسر اعلیٰ نے اپنی میز سنبھالی ہی تھی کہ اشوکا ہوٹل کا منیجر اندر داخل ہوا۔ سراسیمگی اور بدحواسی اس کے

ہوٹل کے قیام کے دوران دو میاں بیوی ہوٹل کا تقریباً ڈھائی لاکھ کا بل ادا کئے بغیر رات کو چوری چھپے ہوٹل سے فرار ہو گئے ہیں۔ افسر اعلیٰ نے ان کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ابھی اس سے گفت و شنید شروع کی ہی تھی کہ کرائے کی کاریں فراہم کرنے والی ایک ایجنسی کا منیجر ہانپتا کانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"سر! ہم ایک فراڈ کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک شخص نے ہم سے کار کرائے پر حاصل کی تھی اور وہ کار بیچ کر فرار ہو گیا ہے۔"

"آپ بیٹھئے پلیز! میں آپ سے معلومات حاصل کروں گا۔" ابھی افسر اعلیٰ پہلے شخص کی جانب متوجہ ہوا ہی تھا کہ ایک اور شخص لڑکھڑاتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا لباس مسلا ہوا اور بال الجھے ہوئے تھے۔ سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں جیسے نیند سے بیدار ہوا ہو۔ اس نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ گزشتہ رات اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا ہے۔ اس کی ملاقات ایک جوان جوڑے سے ہوئی۔ مرد کی عمر چوبیس پچیس سال تھی اور اس کے ساتھ ایک انتہائی حسین لڑکی جو انیس سے لے کر اکیس تک کی عمر کی مالک ہو گی۔ دونوں انتہائی پرکشش تھے' ابھی یہ شخص اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ پہلے دونوں آدمی چیخ اٹھے۔

"بالکل وہی' بالکل وہی۔ یہ دونوں میاں بیوی وہی ہیں۔" اعلیٰ آفیسر نے انہیں خاموش رہنے کو کہا اور پھر اس شخص سے باتیں کرنے لگا۔

"بس جناب! میرے اور ان کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کافی کا آرڈر دیا۔ وہ لوگ میرے ساتھ کافی میں شریک ہو گئے۔ کافی کے دوران ہی میں نے اپنے سر میں بوجھ سا محسوس کیا۔ نیند اچانک ہی مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی۔ میرے لئے آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہوا اور وہ دونوں سہارا دے کر مجھے میرے کمرے میں لے گئے۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پر تھا۔ سر میں بوجھل پن اور درد کا احساس ابھی بھی موجود تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے رات بھر کی گہری نیند کے باوجود میری نیند پوری نہ ہوئی ہو لیکن کچھ دیر کے بعد جب میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا تو مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ میرے سوٹ کیس سے انتہائی قیمتی اشیاء کے علاوہ بیس ہزار برطانوی پونڈ اور تقریباً ایک لاکھ روپے نقد غائب ہو گئے ہیں۔" بہرحال اس بارے میں افسر اعلیٰ نے اپنے ماتحتوں کو تحقیقات کا حکم دیا تھا لیکن مشکل تھا۔ سونو اجے کمار کے ساتھ سفر کرتی ہوئی آگرہ تک پہنچ

تاج محل میں لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے سنگ مرمر کے فرش پر چل رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک گائیڈ تھا' جو تاج محل کی تاریخ دہرا رہا تھا۔ فوٹوگرافر ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ اس یادگار جگہ کی تصویریں بنوائی جائیں لیکن بہرحال انہوں نے ایکو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

☆------☆------☆

آگرے میں تقریباً سات دن گزارنے کے بعد اے جے کمار اور سونو ایک منصوبے کے ت بمبئی چل پڑے۔ دونوں نے اپنے انداز میں معمولی سی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ اے جے مار کو بہت جلد ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ جس حسین لڑکی کے ساتھ وہ وقت گزار رہا ہے وہ ذہانت میں اس سے کہیں زیادہ ہے اور اس بات کو اس نے تسلیم بھی کر لیا تھا۔ اس ے ساتھ ساتھ سونو نے اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ایک اچھے ساتھی کی حیثیت سے ِس کے ساتھ بے شک رہ سکتا ہے لیکن اگر کبھی اس کے دل میں مرد کا تصور جاگے تو وہ اپنے تصور کو گہری نیند سلا دے' ورنہ خود اسے گہرائیوں میں سونا پڑے گا۔ یہ الفاظ کچھ اس انداز میں کہے گئے تھے کہ اے جے کمار کو ان کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے' وہ ممکن کر کے بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ بہرحال بمبئی میں بھی انہوں نے اپنے لئے ایک حلقہ بنا لیا تھا اور بڑی عمدگی سے اپنا وقت پورا کر رہے تھے۔ بمبئی میں ایسے دولت مندوں کی کمی نہیں تھی جو امریکن یا دوسری قیمتی گاڑیاں رکھنے کے خواہشمند تھے۔ خاص طور سے فلم انڈسٹری میں یہ گاڑیاں بڑی اہمیت کی حامل تھیں لیکن یہ انہیں بہت مہنگی پڑتی تھیں۔ اگر شیورلیٹ قانونی طور پر درآمد کی جاتی تو اس پر کم از کم پچیس ہزار ڈالر کی رقم خرچ ہوتی اور اس کے علاوہ انتظار کی کوفت الگ ہوتی تھی لیکن بمبئی کی اونچی سوسائٹی میں اب اے جے کمار اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس کے حلقے میں چوٹی کے فلم سٹار' صنعت کار اور سیاست دان بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سے بھی بیشتر لوگ قیمتی گاڑیاں حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس اس کے وسائل نہیں تھے۔

سونو نے ایک منصوبہ اے جے کمار کو پیش کیا۔ اے جے کمار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل ئی۔ وہ ایسے لوگوں سے گاڑیوں کے آرڈر بک کرنے لگا۔ ہر گاڑی کے لئے وہ کچھ پیشگی ، صول کر لیتا تھا اور اس کے بعد سونو کے منصوبے کے مطابق ایران پہنچ جاتا تھا۔ اس ِ زنس سے منسلک قابل اعتماد لوگوں سے رابطہ قائم کر کے وہ مرسڈیز' بیوک اور شیورلیٹ

ملک سے چوری کر کے لائی گئی ہوتی تھیں۔ گاڑی خریدتے ہی منصوبے کے مطابق اجے کمار اپنے نام سے اس کے جعلی کاغذات تیار کر لیتا اور سڑک کے راستے کسی ایسی جگہ سے ہندوستان میں داخل ہوتا' جہاں متعلقہ محکمے کے کارکن گاڑی کے بارے میں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے اور اگر کبھی کوئی اعتراض اٹھایا جاتا تو اسے کچھ رقم سے مٹھی گرم کر کے اعتراض کرنے والے کی زبان بند کر دیتا۔ پھر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی وہ گاڑی کے کاغذات ضائع کر دیتا اور گاڑی کو بمبئی کے نواح میں واقع ایک ایسے گیراج میں پہنچا دیتا' جہاں اس نے ایک مکینک سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ مکینک کی مدد سے گاڑی کا انجن' ریڈیو' ایئرکنڈیشنر' پہیے' ٹائر اور دیگر قیمتی اشیاء نکال لی جاتیں۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا مصنوعی حادثہ کر کے وہ اسے چھوٹا موٹا نقصان پہنچا دیتا۔ یہ نقصان ایسا نہیں ہوتا تھا جو گاڑی کو تباہ کر دے۔ اس کی نکالی ہوئی بقیہ چیزیں اطمینان سے رکھی جاتی تھیں اور پھر گاڑی کو کسی ویران مقام پر چھوڑ کر گمنام کال کے ذریعے پولیس کو اس لاوارث گاڑی کی اطلاع دے دی جاتی۔ پولیس اس لاوارث گاڑی کو قبضے میں لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی کہ یہ گاڑی سمگل کر کے ہندوستان لائی گئی ہے لیکن اس کے مالکان پکڑے جانے کے خوف سے گاڑی چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔ بہرحال پولیس کے توسط سے ڈھانچہ نما گاڑی کسٹم تحویل میں پہنچا دی جاتی۔ جہاں کچھ عرصے کے بعد اسے کباڑ کی حیثیت سے نیلام کر دیا جاتا۔ گاڑی کسٹم کی تحویل میں پہنچنے کے بعد سونو اور اجے کمار اس پر پوری پوری نگاہ رکھتے تھے کہ اس کا نیلام کب ہو گا۔ نیلام کے دن وہ اپنے کسی آدمی کے ذریعے گاڑی کا وہ ڈھانچہ اپنے کسی گاہک کے نام خرید لیتا اور جب یہ ڈھانچہ اس تک پہنچ جاتا تو اسی گاڑی سے نکالے ہوئے تمام کل پرزے اس میں دوبارہ فٹ کر دیئے جاتے اور مکمل فنشنگ کے بعد یہ قیمتی گاڑی گاہک کے حوالے کر دی جاتی۔ وہ کسٹم کے کاغذات کے باعث اس کی قانونی ملکیت بن جاتی۔

اس کاروبار میں ان لوگوں کو زبردست منافع حاصل ہو رہا تھا اور ایسی بے شمار گاڑیاں وہ لوگ فروخت کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک شاندار علاقے میں ایک رہائش گاہ بھی حاصل کر لی تھی اور بڑی زبردست زندگی گزر رہی تھی لیکن پھر ایک دن جب اجے کمار اسی طرح سے یہ گاڑی لے کر ایران آ رہا تھا تو کچھ ذہین اعلیٰ افسران نے فوراً ہی اس پر قابو پا لیا۔ یہ افسران کافی عرصے سے اس چکر میں تھے کہ صورت حال کا

ـے اطمینان سے اپنا حلیہ تبدیل کیا اور اپنی رہائش گاہ سے انتہائی قیمتی اشیاء لے کر خاموشی سے نکل آئی اور بمبئی میں ایک خوبصورت ہوٹل میں مرد کی حیثیت سے قیام پذیر ہو گئی۔ اخبارات اور دوسرے ذرائع سے اسے یہ معلوم ہوتا رہا کہ پولیس شکنتلا کی تلاش میں ہے' جو گاڑیوں کے اس اصل کاروبار کی ذمے دار تھی اور اجے کمار صرف اس کا آلہ کار تھا۔ چنانچہ اب سونو کو ایک دم سے یہ اندازہ ہو گیا کہ اجے کمار اس کا ساتھی رہنے کے قابل نہیں ہے اور پھر ویسے بھی عورت کی حیثیت سے کافی دن تک زندگی گزارتی رہی تھی۔ جو فن اس نے حاصل کیا تھا' اس فن سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے اس نے نئے راستے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اجے اکمار کو اب اپنے قریب لانے کا مطلب تھا کہ اپنی گردن بھی پھنسا دے۔ اسی طرح کی انسان تھی وہ۔ ہاں اس نے اپنی کمائی ہوئی دولت میں سے ایک حصہ اسی بینک میں محفوظ رہنے دیا تھا جس میں اس کا اور اجے کمار کا الگ الگ اکاؤنٹ تھا۔ یہاں وہ ایمانداری کے ساتھ اجے کمار سے یہ سلوک کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتی تو اجے کمار کی رقم بھی نکلوا سکتی تھی لیکن یہ بے ایمانی کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا کیونکہ بہرحال اجے کمار ایک اچھے ساتھی کی حیثیت سے کافی عرصے تک اس کے ساتھ رہا تھا۔

اس تمام کارروائی کے بعد اپنے مخصوص طریقہ کار کے مطابق سونو نے چند دنوں کے لئے خاموشی اختیار کر لی۔ جس ہوٹل میں وہ اندر کمار کی حیثیت سے مقیم تھی' وہ بہت خوبصورت ہوٹل تھا۔ خوشنما کمرے بکھرے ہوئے تھے۔ یہیں پر اس کی ملاقات نیلا سے ہوئی۔ نیلا عجیب سی تر و تازہ چہرے کی مالک' تیز اور چمکدار آنکھوں والی لڑکی تھی۔ یہ ملاقات بھی بڑے دلچسپ انداز میں ہوئی تھی۔ سونو اس وقت ہوٹل کے بائیں باغ کے ایک گوشے میں پرسکون انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس جگہ کا ماحول بے حد حسین اور خاموش تھا۔ آگے والے دوسرے لان پر سوئمنگ پول کے گرد بہت سے لوگ موجود تھے اور ساری ہنگامہ آرائی اسی جگہ تھی۔ سونو کے کانوں میں ایک آواز ابھری۔

"یوں لگتا ہے زندگی میں پہلی بار ہم اپنی کوششوں میں ناکام رہیں گے۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔"

"استاد گنگو! اگر تم یہاں کامیابی حاصل کر لو تو یہ سمجھو کہ بہت عرصے تک ہمیں کوئی کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" یہ ایک نسوانی آواز تھی۔

تقدیر ساتھ نہیں دے رہی۔ خیر "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" میں نے اگر ا
سٹور میں ڈاکا نہ ڈالا تو سمجھو کہ زندگی بھر کوئی کام ہی نہ کیا۔"

سونو کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے ر
اور سونو دم سادھے بیٹھی رہی۔ بہرحال یہ گفتگو اس جھنڈ کے پیچھے ہو رہی تھی' جو
کے عقب میں تھا۔ سونو جانتی تھی کہ اگر ان خطرناک لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ان
باتیں کسی نے سن لی ہیں تو صورت حال خاصی خراب ہو جائے گی۔ چنانچہ جیسے ہی ا
موقع ملا وہ اپنی جگہ سے جھکی جھکی اٹھی اور بلی کی طرح دبے قدموں چلتی ہوئی اس ج
سے بہت دور نکل آئی۔ ایک اور جگہ بیٹھ کر اس نے ادھر نگاہیں جمائے رکھیں۔ وہ شخ
جو یقینی طور پر استاد گنگو تھا کسی قدر پست قامت اور بہت ہی ٹھوس بدن کا مالک تھا۔ چہ
سے ہی خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن لڑکی نیلا تھی اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ۔
کے اندر عورت سے زیادہ مردانہ صفات تھیں اور اگر ایک مرد کی حیثیت سے وہ کس
اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی تھی تو مدمقابل یقینی طور پر اس کی طرف متوجہ ہوتی تھی۔ ا
اپنی اس صفت پر بہت ناز تھا۔ چنانچہ جوئے خانے میں اس نے نیلا سے ملاقات کی اور ا
انداز میں کی کہ نیلا اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی۔ اس نے خود ہی سونو سے تعار
حاصل کیا تھا۔ سونو کو شاید شیلا کا دیا ہوا نام اندر کمار بہت زیادہ پسند آیا تھا۔ اس نے
سے اپنا تعارف اندر کمار کی حیثیت سے کرایا تھا۔ نیلا نے کہا۔

"اندر کمار جی! آپ تقدیر کے بڑے دھنی معلوم ہوتے ہیں۔ جوا کھیلتے ہوئے مج
اس بات کا احساس ہوا لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ آپ نے زیادہ نہیں کھیلا جبکہ آ
مسلسل جیت رہے تھے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جب قسمت کی دیوی مہربان ہوتی ہے
اس سے منحرف نہیں ہونا چاہئے"۔

جواب میں سونو مسکرا دی۔ اس نے کہا۔

"مس نیلا آپ کو کافی پلاؤں۔" کافی پیتے ہوئے وہ نیلا سے بولی۔

"بات یہ ہے کہ انسان کو اعتدال پسند ہونا چاہئے۔ ایک بار ہی نہیں جیتنے کی خواہ
تو بار بار دل میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ سے مشکوک ہوتے ہیں' یہ کوش
کرتے ہیں کہ اگر انہیں کامیابی حاصل ہو رہی ہے تو جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکے' اٹ
چاہئے۔ جبکہ میں اس سے مختلف مزاج رکھتا ہوں۔"

"مثلاً یہ کہ اگر میں جیتنا چاہوں تو یوں سمجھ لیجئے کہ جب تک میرا دل چاہے گا جیتتا
رہوں گا۔"

"اتنا یقین ہے آپ کو اپنے آپ پر۔"

"ہاں مس نیلا۔"

"ویسے آپ کا مشغلہ کیا ہے۔" نیلا نے پوچھا۔

"ڈاکا زنی۔" سونو بڑے اطمینان سے بولی اور نیلا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں
پھر اس نے کہا۔

"دلچسپ مذاق ہے۔"

"نہیں مس نیلا! یہ مذاق نہیں ہے اور ظاہر ہے آپ کو اس بات پر حیرت ہونی
چاہیے کہ میں نے آپ کو اپنے پیشے کے بارے میں بے تکلفی سے بتا دیا لیکن اس کی وجہ
ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ بے مقصد ہی میرا آپ سے ٹکراؤ ہو گیا ہے تو یہ آپ کی
غلط فہمی ہے۔"

نیلا تعجب سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی پھر وہ بولی۔

"کچھ نہیں سمجھی میں۔ آپ یقین کیجیے میں نہیں سمجھی۔"

"پہلے تو آپ یہ سمجھ لیجیے مس نیلا کہ میرا تعلق کسی ایسے سکیورٹی کے محکمے سے
نہیں ہے جو آپ کی تلاش میں یا استاد گنگو کے بارے میں جاننا چاہتا ہو۔ مس نیلا ایسی کوئی
بات نہیں ہے۔ بس اتفاق ہے کہ میں آپ کے منصوبے میں شریک ہو گیا ہوں لیکن اس
سے یہ نہ سمجھ لیں کہ میں آپ سے الگ ہٹ کر کوئی کام کرنا چاہتا ہوں۔"

اب نیلا کی آنکھوں میں خوف و دہشت کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں لیکن سونو نے
اس طرح اسے شیشے میں اتارا کہ نیلا کا خوف دور ہو گیا اور پھر اس نے استاد گنگو اور
اندر سے سونو کی ملاقات کرائی۔ سونو نے اندر کمار کی حیثیت سے استاد گنگو کو اس قدر
متاثر کر لیا کہ اس نے آگے بڑھ کر سونو کے پاؤں پکڑ لیے اور کہنے لگا۔

"اندر کمار مہاراج اپنے کام میں مجھے آپ جیسے استادوں کی ضرورت ہے۔ میرے
جیون کا ایک بہت بڑا مقصد یہاں ہوٹل شنگھائی کے ایک بڑے اسٹور میں ڈاکا ڈالنا ہے۔
آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اسٹور کے شوروم میں سجے ہوئے زیورات مجھے اپنا منہ چڑاتے ہوئے
محسوس ہوتے ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ میں ایک ایسی ڈکیتی کروں جو ذمے دار

ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" سونو نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"اگر آپ حصے کی بات کرتے ہیں تو جو آپ طے کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ بات تو اصل میں وہی ہے کہ بس کام کرنا چاہتا ہوں میں۔"

"ٹھیک ہے۔ بہرحال اگر بات چیت ہو جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔" سیدھی سیدھی سی آدھے آدھے پر بات ہوئی تھی اور گنگو نے اسے قبول کر لیا تھا۔ باقی آدھے حصے میں گنگو، نیلا اور سندر تینوں شامل تھے۔ مکمل منصوبہ سونو نے ہی بنانا تھا۔ چنانچہ ہوٹل شنگھائی کے قرب و جوار کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیا گیا۔ سونو کا شیطانی ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور آخر کار اس نے ایک منصوبہ ذہن میں ترتیب دے لیا۔ گنگو کی مدد سے اس نے وہ تمام چیزیں مہیا کیں۔ یعنی ڈرل مشین، فلیش لائٹ اور بہت سی ایسی چیزیں جو اس منصوبے میں کار آمد ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد اس نے اسٹور کا بھرپور جائزہ لیا۔ نیلا اس کے ساتھ تھی کیونکہ نیلا کا قیام اسی ہوٹل میں تھا۔ سونو اس جگہ کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد جگہ منتخب کرنے میں کامیاب ہو گئی اور نیلا کی مدد سے اس نے یہ معلومات حاصل کیں کہ جو کمرہ اس اسٹور کی چھت پر ہے وہ مستقل طور پر ریبوکا نامی ایک فلمی اداکارہ کے قبضے میں ہے۔ ریبوکا مستقل طور پر اسی کمرے میں رہتی ہے۔ یہ بہت زیادہ مقبول اداکارہ تو نہیں تھی لیکن اٹھائیس سال کی ایک خوبصورت عورت تھی اور بہرحال تھوڑے بہت رول اسے مل ہی جاتے تھے۔ البتہ اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے قابل تھے۔ غالباً اداکارہ ہونا اس کے اپنے اصل کاروبار کے لیے ایک سہارا تھا اور مزید اہم بات یہ تھی کہ یہ کاروبار وہ شنگھائی میں اپنے اس کمرے میں نہیں کرتی تھی، بلکہ یہاں وہ صرف ایک باعزت اداکارہ کے طور پر ہی رہتی تھی اور ہوٹل کے اس کمرے میں اس کے ملنے جلنے والے نہ ہونے کے برابر آیا کرتے تھے۔

یہ تمام معلومات فراہم کرنے کے بعد آخر کار سونو نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دے دی اور وہ ریبوکا کے کمرے پر پہنچ گئے۔ وقت ایسا منتخب کیا گیا تھا کہ کوئی دقت نہ ہو۔ یہ انتظامات بھی کر لیے گئے تھے کہ باہر سے اس دروازے کو لاک کر دیا جائے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ مس ریبوکا اس وقت اپنے کمرے میں موجود نہیں ہیں اور کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ منصوبہ تھا۔ کمرے کے دروازے کو باہر سے لاک کر کے سندر عقبی دیواروں سے کھڑکی کے ذریعے اندر کمرے میں آ گیا۔ ادھر سونو، گنگو اور نیلا

نے ریبوکا کو آسانی سے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ بزدل عورت تھی، خوفزدہ ہو گئی اور اس نے لرزتی آواز میں درخواست کی کہ نہ تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھے جائیں، نہ منہ میں کپڑا ٹھونسا جائے تاکہ وہ آزاد رہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ ان کے احکامات پر حرف بہ حرف عمل کرے گی۔ بہرحال کمرے کو سب سے پہلے ساؤنڈ پروف کیا گیا اور جب یہ سارا عمل ہو گیا تو انہوں نے ایک حصہ منتخب کر کے ڈرل سے چھت میں سوراخ کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن اس سلسلے میں انہیں کسی حد تک ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ڈرل کمرے کے فرش پر کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ زیادہ طاقت سے کام کرتے ہوئے اس کی آواز خوفناک ہو جاتی تھی اور یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے سوچا تو تھا کہ رات کو اپنا یہ کام کریں گے لیکن حالات سے یہ اندازہ ہوا کہ رات دن سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ صبح کو جب زندگی رواں دواں ہو جائے تو کام شروع کیا جائے۔ ادھر ریبوکا کو بستر پر لٹا دیا گیا تھا اور وہ خوفزدہ نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تم اطمینان سے ہمارے ساتھ تعاون کرتی رہو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہاں اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

"تو کیا رات تم یہیں گزارو گے؟"

"ہاں، پورے اطمینان کے ساتھ۔" ریبوکا رات کو نہ جانے کب تک جاگتی رہی تھی۔ ادھر سونو نئے پروگرام ترتیب دیتی رہی تھی۔

بہرحال صبح کو ریبوکا نے ان کی ہدایت پر روم سروس کو کچھ مہمانوں کے لیے ناشتے کا آرڈر دیا اور سندر کو کھڑکی کے راستے باہر بھیج دیا گیا تاکہ وہ دروازہ کھول دے پھر اس کے بعد ویٹر نے ناشتہ لا کر لگایا تو ریبوکا نے رحم طلب نگاہوں سے انہیں دیکھا لیکن سونو نے اس طرح اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا جس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ خطرے میں ہے اور پھر وہ اس طرح صوفے پر دراز ہو گئی جیسے وہ ریبوکا کا کوئی دوست ہو اور صبح ہی صبح اس کی خیریت دریافت کرنے آیا ہو۔ اس کی نظریں ریبوکا پر مرکوز تھیں اور انداز بتا رہا تھا کہ ریبوکا نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی یا کوئی اشارہ کیا تو ایک لمحے کے اندر اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ ویٹر کے جانے کے بعد انہوں نے ریبوکا کو بھی ناشتے میں شریک کر لیا تھا۔

بہر حال ان تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد جب یہ اندازہ ہو گیا کہ ہوٹل زندگی رواں دواں ہو گئی ہے تو انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ کوئی دس بجے کے قر دروازے پر دستک سنائی دی اور وہ چونک گئے۔ یہ ہوٹل کا ایک ملازم تھا جو کمرے صفائی کے لیے آیا تھا۔ سونو کی ہدایت پر ریتو کا نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر جواب دے کہ آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ سونو اس دو دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوئی تھی اور اس کے پستول کا رخ ریتو کا کی طرف تھا۔ حال ملازم کے جانے کے بعد دوپہر تک گنگو اور سندر فرش میں سوراخ کرنے میں مصروف رہے۔ فرش انتہائی مضبوط تھا اور گنگو بار بار گالیاں بک رہا تھا۔ اس دور ریتو کا نے ایک دو بار ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ا خاموش کر دیا جاتا۔ ایک مرتبہ تو گنگو چلتی ہوئی ڈرل مشین لے کر اس کی طرف لپکا اور اگر سونو ریتو کا کا منہ نہ دبا لیتی تو اس کی چیخ یقینی طور پر باہر چلی جاتی۔ دوپہر کا کھانا روم سروس کے ذریعے منگوالیا تھا۔ پھر شام کے سائے فضا میں اترنے لگے۔ کچھ دور تعمیر کا کام ہو رہا تھا اور کنکریٹ مکس کرنے والی مشین چل رہی تھی۔ اس وقت جب یہ مشن کام میں ناکام ہو گئی تو سونو کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار پھیل گئے۔ اس کا چہرہ بگڑ تھا۔ ساری رات اور سارا دن گزر گیا تھا اور ابھی تک کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ عمارت کا نقشہ نکال کر اس کا جائزہ لینے بیٹھ گئی۔

ہوٹل کی پوری عمارت مرکزی طور پر ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ سونو نے آخر کار ایک ایئر کنڈیشننگ پائپ تلاش کر لیا جو اس منزل سے نیچے جیولری اسٹور تک جاتا تھا اور سو اس سے مکمل طور پر اندازہ لگانے لگی۔ اگر نیلا مکمل طور پر اس سلسلے میں کار آمد ہو جا۔ تو لطف آجائے گا۔ وہ دونوں اسمارٹ اور دبلے پتلے جسم کے مالک تھے اور اس پائپ کے اندر آسانی سے رینگ سکتے تھے لیکن مسئلہ صرف رگوں میں خون منجمد کر دینے والی سردی کا تھا۔ اس کا بندوبست کرنا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی ریتو کا ہی کام آئی۔ اس کے تمام سوئٹر وغیرہ نکلوا لیے گئے اور ریتو کا کو پلنگ پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ اس نے احتجاج کیا تو سونو کہنے لگی کہ اس دوران وہ ایک اچھی اور تعاون کرنے والی عورت نہیں ثابت ہوئی ہے' اس لیے مجبوری ہے۔ بہر حال اس کے بعد سونو خود پائپ کا جائزہ لینے کے لیے راہداری میں باہر نکل آئی ... پائپ راہداری کی چھت ... [illegible]

... تک چلا گیا لیکن اس کی توقع کے برعکس پائپ کا قطر اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اس جیسی ... لی پتلی لڑکی بھی اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ ایک بار اس نے پھر اپنے ذہن میں مایوسی ... وس کی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے گنگو کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو گنگو نے ... دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہم لوگ اناڑی مجرموں کی طرح بار بار اپنے منصوبے بدل رہے ہیں۔ یہ مناسب تو ... ں ہو گا۔ یا تو کوئی مؤثر منصوبہ ترتیب دیا جائے یا پھر اس منصوبے سے ہی دستبردار ہوا ... نے۔" سونو کو یہ بات اپنی توہین محسوس ہوئی۔ اس نے کہا۔

"صرف چند گھنٹے اور ایک بہترین منصوبہ یا پھر یہاں سے ناکام واپسی۔" اور آخر کار ... نے یہ منصوبہ پایہ تکمیل پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی نگاہیں اب ریتو کا کا جائزہ لے ... ی تھیں۔ "ہر چند کہ تم ایک کامیاب اداکارہ نہیں ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری ... اپنی ایک حیثیت ہے اور یقینی طور پر تم اپنی اس حیثیت کو مستحکم کرنا چاہو گی اور اگر ایسا نہ ... ہی ہو تو زندگی کتنی قیمتی چیز ہے اس کا تمہیں بخوبی اندازہ ہو گا۔ ایک بار زندگی کھو جائے ... دوبارہ کبھی نہیں ملتی۔ جینا بہت ضروری چیز ہے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"دیکھئے مس ریتو کا۔ یہ جو نیچے جیولری اسٹور ہے۔ ہم اس اسٹور کے قیمتی زیورات ... نوادرات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بہر حال یہ ہم کر لیں گے۔ اس سلسلے میں آپ ... یہ رہی ہیں ہماری کچھ کوششیں ناکام ہو گئی ہیں لیکن ہم ان میں کامیابی حاصل کریں ... ے۔ آپ اگر اس سلسلے میں ہمارا ساتھ دیں تو آپ یوں سمجھ لیجئے آپ کو بہت ہی بڑی ... رقم معاوضے کے طور پر دی جائے گی۔ بلاشبہ آپ اپنی عام زندگی میں یہ رقم آسانی سے ... یں کما سکتیں۔ ویسے تو زندگی کی قیمت بھی لاکھوں سے کم نہیں ہے لیکن زندگی کے ... ساتھ ساتھ یہ دس لاکھ کی رقم جو خاموشی سے آپ کے نام سے کوئی اور اکاؤنٹ کھلوا کر ... اس میں جمع کر دی جائے گی اور بعد میں آپ ضرورت کے تحت اسے استعمال کر سکیں ... ی۔" ریتو کا کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ اس سلسلے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس نے کہا۔

"لیکن مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"پہلے اپنی تیاری کا اعلان کریں۔ اس کے بعد آپ کو اس بارے میں مکمل تفصیل

"میں تیار ہوں۔" پتا نہیں ریتوکا نے یہ جان چھڑانے کے لیے کہا تھا یا پھر واقعی اس سلسلے میں لالچ میں آگئی تھی۔ گنگو' سندر اور نیلا کے چہروں پر مایوسی پھیلی ہوئی تھی نئے منصوبے سے وہ آگاہ نہیں ہوئے تھے لیکن اب تک کی کوششوں سے ان کے اعصاب تھکن سی بیدار ہوگئی تھی۔ گنگو شاید یہی سوچ رہا تھا کہ ایسی کوششیں تو وہ اب تک ہی کرتا رہا ہے۔ پھر شام ہونے کا انتظار کیا گیا۔ تقریباً شام کو پانچ بجے ریتوکا نے سونو ہدایت کے مطابق تیاریاں شروع کر دیں۔ سونو نے اس کے کپڑوں میں سے اس کے ایک بے حد حسین سوٹ کا انتخاب کیا اور پھر خود اس کے چہرے پر میک اپ کیا جسے دیکھ کر ریتوکا بولی۔

"تم تو ایک زبردست میک اپ آرٹسٹ ہو۔ آہ .... تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔"

"شاید تمہاری تقدیر کے دروازے کھل رہے ہیں۔ جو کچھ تم اب تک نہ حاصل کر سکیں وہ آہستہ آہستہ تمہارے نزدیک آرہا ہے۔"

"یعنی؟" ریتوکا بولی۔

"دولت۔"

"کاش۔"

"تمہیں یقین نہیں ہے۔"

"تمہیں ہے۔" ریتوکا نے ایک دلچسپ سوال کیا۔

"مطلب .... میں سمجھا نہیں۔" سونو نے کہا۔

"بہت سی باتیں ہیں۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے۔" سونو بولی۔

"کہا نا' بہت سی باتیں ہیں۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"نمبر ایک' جس کام کے لیے تم آٹھ گھنٹوں سے محنت کر رہے ہو اور تم نے مجھے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ کیا تم آئندہ کچھ گھنٹوں میں اس کوشش میں کامیاب ہو سکو گے۔"

"شاید۔"

"تمہیں اس کا یقین نہیں ہے؟" سونو نے سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔"

"ٹھیک' تمہاری صاف گوئی مجھے پسند آئی لیکن بہرحال تم ایک مشکل میں ہو' اور بظاہر اس مشکل سے نکلنے کا کوئی آسان طریقہ نہیں ہے۔ اب میں جو کچھ تمہیں سنا رہا ہوں' وہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لو۔ اسی کے مطابق کام کرنا ہے۔ باقی ساری باتیں تقدیر پر چھوڑ دو' کیونکہ تقدیر ہی مناسب فیصلے کرتی ہے۔" ریتوکا کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"ہاں تقدیر ہی مناسب فیصلے کرتی ہے لیکن بہرحال تم نے مجھے میک اپ کر کے جو شخصیت دی ہے وہ مثالی ہے۔" گنگو' نیلا اور سندر ان سارے معاملات سے بے پروا تھے۔ بہرحال انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کچھ وقت اور اندر کمار کے ساتھ گزاریں گے اور اس کے بعد یہاں سے نکل جائیں گے پھر دیکھیں گے کہ کیا صورت حال ہوتی ہے۔ انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ سونو کے منصوبے کے مطابق آخر کار ریتوکا نے جیولری اسٹور ٹیلی فون کیا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"ہیلو جیولری اسٹور۔ دیکھو میں کمرہ نمبر 70 میں مقیم ہوں۔ میرا نام ریتوکا ہے۔ شاید تم مجھے جانتے ہو۔ آرٹسٹ ہوں۔ اب سے چند منٹ کے اندر اندر میرا ایک نوجوان دوست میرے پاس آنے والا ہے' تم یوں کرو کہ کچھ قیمتی زیورات لے کر یہاں آجاؤ۔ ہم یہ زیورات خریدنا چاہتے ہیں۔ اگر تم یہاں آسکتے ہو تو مجھے بتا دو ورنہ میں کہیں اور ٹیلی فون کروں گی۔"

"نہیں میڈم ہم آپ کو جانتے ہیں۔ آپ جیسا پسند کریں ہم اپنے سیلزمین کو قیمتی زیورات کے ساتھ آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں اور اگر کوئی ہدایت ہو تو آپ ہمیں بتا دیجیے گا۔"

"کچھ نہیں۔ وہ شخص آنے والا ہے جب آپ کا سیلزمین ہمارے پاس پہنچے گا تو یہی اظہار کرے گا کہ پہلے سے اسے یہ زیورات لانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ زیورات پسند کر کے قیمت کی جب ادائیگی ہونے لگے تو وہی شخص قیمت ادا کرے گا۔ سیلزمین سے کہہ دیجیے کہ تکلف نہ کرے اور رقم جس شکل میں بھی ہو' قبول کر لے۔"

"بات سمجھ میں آگئی ہے۔ میڈم! آپ کی پسند کے مطابق ہی کام ہو گا' اطمینان

سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔ ریتوکا کا نام جنبی نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ماہر شکاری' شکار پھانس رہا ہے۔ سارا سیٹ اپ مکمل کر لیا گیا تھا۔ سونو مردانہ روپ میں پُر وقار طریقے سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ریتوکا اس کے سامنے اور سندر ایک با ادب سیکرٹری کی طرح کھڑا ہو گیا' جبکہ نیلا اور گنگو باتھ روم میں چلے گئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دستک ہوئی تو سونو نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"حالانکہ تم نے مجھ سے تعاون کا وعدہ کیا ہے ریتوکا لیکن پھر بھی احتیاطاً میں تمہیں بتا دوں کہ سامنے غسل خانے سے دو پستول کی نالیں تمہاری طرف اٹھی ہوئی ہیں اور ان دونوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ کسی اور طرف نہ دیکھیں' تمہارا جائزہ لیتے رہیں۔ چنانچہ تم بہکنے کی کوشش مت کرنا کیا سمجھی۔"

ریتوکا کانپ کر رہ گئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ سندر ڈرامائی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ جیولری ہاؤس کا سپروائزر ہی تھا' جو اندر داخل ہوا تھا پھر وہ ریتوکا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ ایک نفسیاتی چال تھی جو عام لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ حسین چہرے اور پُر کشش شخصیت کچھ لمحوں کے لیے انسان سے سوچ سمجھ چھین لیتے ہیں اور سونو جیولری ہاؤس کے سیلزمین پر سب سے پہلا اثر یہی ڈالنا چاہتی تھی کہ بہرحال سیلزمین ضرورت سے زیادہ با اخلاق ہو گیا۔ سونو نے اس کہا۔

"ارے بڑے بے وقت آگئے تم۔ میں نے تم سے کہا تو تھا لیکن تم نے خود بھی آنے میں دیر لگا دی۔"

"کیا عرض کروں میڈم! بس یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کی پسند کا حصول بھی آسان نہیں ہوتا۔ آپ کی خواہش کے مطابق کچھ اشیاء لے کر آیا ہوں اور اس میں دیر ہو گئی۔ آپ دیکھ لیجیے گا' اگر ابھی نہ خریدنا چاہیں تو بعد میں سہی۔" اور اس وقت سونو نے اپنی مخصوص مردانہ آواز میں مداخلت کی۔

"نہیں ریتو! اگر تم نے انہیں بلایا ہے تو اپنا کام جاری رکھو۔" سونو کے منصوبے کے مطابق ریتوکا نے گردن ہلا دی اور سیلزمین نے وہ بریف کیس اس کے سامنے کھول دیا جس میں انتہائی حسین انگوٹھیاں' بریسلیٹ اور نیکلس رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب قیمتی ہیروں سے جڑے ہوئے زیورات تھے۔ سیلزمین نے کہا۔

"یہ ہمارے جیولری ہاؤس کی نایاب ترین چیزیں ہیں۔" ریتوکا نے عورت کے فطری

اٹھا دیا۔ سونو کی طرف نگاہیں اٹھائیں تو سونو نے تیز آنکھوں سے اسے دیکھا اور ریتوکا کو پورا منصوبہ یاد آگیا۔

"نہیں' ان میں سے کوئی چیز مجھے پسند نہیں۔ آپ دیکھیے۔" اس نے سونو کی طرف رخ کر کے کہا۔ سونو نے ایک سرسری نگاہ ان زیورات پر ڈالی اور منہ بنا کر بولا۔

"سیلزمین' ریتوکا کے شایان شان کوئی چیز لے کر آتے تو یقینی طور پر تمہیں اس کا بہترین معاوضہ ملتا اور شاید ذاتی انعام بھی۔"

"جناب عالی! بس آپ یوں سمجھئے کہ شخصیتوں کا جائزہ لیے بغیر کام نہیں ہوتا ہے لیکن آپ تھوڑا توقف فرمایئے۔ مجھے ایک بار پھر موقع دیجیے۔" اس نے بریف کیس سمیٹا اور اس کے بعد معذرت کر کے باہر نکل گیا۔ سونو کے اشارے پر سندر نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ گنگو اور نیلا باہر نکل آئے۔ گنگو نے کہا۔

"تم عجیب آدمی ہو جو زیورات وہ لے کر آیا تھا وہ کتنے قیمتی تھے۔ میں نے اتنی دور سے اس کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا۔ ایسی جگہ جہاں ہم اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور اس عورت کو راز دار بنا کر ہم نے اپنے ہاتھ مستقل طور پر کاٹ لیے ہیں۔ اگر تم........"

"مسٹر گنگو! تھوڑا سا وقت اور' مجھے دوسرے منظر کی تیاریاں کرنے دیجیے۔" چنانچہ سونو نے ریتوکا کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے پیر رسی سے باندھ دیے اور اس پر اس طرح کمبل ڈال دیا کہ ریتوکا کی پوری ٹانگیں ڈھک گئیں۔ اس کے بعد اس نے سندر کو حکم دیا کہ جب وہ اشارہ کرے تو ریتوکا کے پیروں سے کمبل ہٹا دیا جائے تاکہ جیولری ہاؤس کا نمائندہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لے کہ ان خطرناک لٹیروں نے اسے اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔ سونو نے ریتوکا سے پہلے ہی یہ بات کہہ دی تھی کہ اس ڈاکے میں اسے شریک قرار نہیں دیا جائے گا اور وہ بالکل صاف شفاف رہے گی۔ اس کام سے فارغ ہو کر سونو نے ایک بار پھر کمرے کا بھرپور جائزہ لیا اور اب گنگو بھی اندر کمار کے منصوبے کو سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت شام کے ساڑھے سات بجے تھے' جب دروازے پر دستک ہوئی اور سندر نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس بار جو شخص آیا تھا وہ پہلا شخص نہیں تھا۔ ریتوکا کرسی پر اسی انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آنے والے کو سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

آپ کی شخصیت سے آگاہ کیا۔ در حقیقت بڑے لوگوں کی بڑی بات۔ آپ ذرا ایک نظ
میرے لائے ہوئے اس سامان پر ڈال لیجئے۔" اور جب اس نے بریف کیس کھولا تو کمر
میں روشنیاں پھیل گئیں۔ آنکھیں بند سی ہونے لگیں۔ نیکلس' آویزے جن میں د
جڑے ہوئے تھے۔ زمرد کا بروچ' نیلم اور یاقوت کی لاتعداد انگوٹھیاں' شاندار نیکلس
در حقیقت بہت بڑی مالیت کے جواہرات اس وقت ان کے سامنے موجود تھے۔ ریتوکا
ایک چیز اٹھا کر اس کا جائزہ لے رہی تھی اور سونو بھی ان کی تعریف کر رہا تھا۔ چنا
جیولری ہاؤس کا منیجر خاصا بے تکلف ہو گیا۔ سونو اپنے منصوبے کا بھرپور جائزہ رہی
پھر جب اس نے دیکھا کہ ماحول بالکل پر سکون اور ساز گار ہے۔ کسی کی مداخلت کا
اندیشہ نہیں ہے تو اچانک اس نے اپنا پیچھے رکھا ہوا ہاتھ سامنے کر دیا۔ پستول کی نال ا
منیجر کی پیشانی کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ اسی وقت سندر نے ریتوکا کے پیروں پر سے ک
ہٹا دیا اور گنگو اور نیلا بھی پستولیں سنبھالے ہوئے باہر نکل آئے۔

جیولری ہاؤس کے منیجر کا منہ خوف سے پھیل گیا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھ
سے ان سب کا جائزہ لیا تو سونو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے منیجر کیا کیا جائے۔ جس شخص نے جتنی زندگی پائی ہوتی ہے'
ہی گزارنا ہے۔"

"کک .... کیا مطلب؟" منیجر کی پھٹی پھٹی آواز ابھری۔

"تمہیں دنیا سے جانا ہو گا۔"

"لل .... لیکن کیوں۔ اگر تم یہ زیورات لوٹنا چاہتے ہو تو میں اس میں مداخ
نہیں کروں گا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر یقین کرو' بعد میں کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ بات بھی نہیں مسٹر منیجر۔ اصل میں ہمارا منصوبہ کچھ اور ہے۔ ہمارا ایک آ
تمہارے میک اپ میں تمہاری دکان پر جائے گا اور وہاں تمام کاموں کی نگرانی کرے گا
جب دکان بند ہو جائے گی تو وہ وہاں رکا رہے گا اور پھر جیولری ہاؤس خالی ہو جائے گا۔

منیجر کا چہرہ زرد ہو گیا تھا پھر اس نے کہا۔ "اگر تم یہی کرنا چاہتے ہو تو اس کا ط
بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجھے قتل نہ کرو۔ میں تمہیں دکان کی چابیاں دے سکتا ہوں۔ ہم نو بجے دکان بند
کر دیتے ہیں۔ ایک چابی سپروائزر کے پاس ہوتی ہے' دوسری میرے پاس۔ نو بجے تک
انتظار کریں۔"

"چابی کہاں ہے؟"

"میرے پاس۔" منیجر نے جیب سے ایک چابی نکال کر سونو کو دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے منیجر! اگر تقدیر تمہیں زندگی دینا چاہتی ہے تو بھلا ہم کون ہوتے ہیں تم
سے زندگی چھیننے والے۔" یہ کہہ کر سونو نے چابی منیجر کے ہاتھ سے لی اور اس کے بعد
اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ تم اس شخص کو قابو میں رکھو۔ تمہاری معمولی
لغزش بھی پانسہ پلٹ سکتی ہے۔"

استاد گنگو نے سونو کے جانے کے بعد منیجر کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ہوٹل کے باتھ روم
میں پہنچا دیا۔ ادھر ریتوکا کو بھی سنبھالنا تھا۔ چنانچہ وہ پوری ہوشیاری سے اپنی ذمے داری
پوری کرنے لگے۔ سونو اس طویل عرصہ کے بعد پہلی بار باہر نکلی تھی۔ گنگو استاد' نیلا اور
سندر کے کئی گھنٹے مزید وہاں گزرے۔ پھر اچانک گنگو کا چہرہ فق ہو گیا۔

"نیلا ...." وہ گھگھیائی آواز میں بولا اور شاید اس کے لہجے سے ہی نیلا نے
اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ ہم نے اپنے کیریئر کا سب سے بڑا دھوکا کھایا ہے اور زبردست
حماقت کی ہے۔"

"لل .... لیکن گنگو استاد۔"

"ہو گیا' جو ہونا تھا ہو گیا۔ بھلا اسے کیا پڑی ہے کہ کامیاب ہو کر ہمارے پاس واپس
آئے۔ وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔"

تینوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی تھی اور نہ جانے کیوں ریتوکا کو ان کی اس کیفیت
سے خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس موڑ کا اختتام جاننا چاہتی تھی۔

☆-------☆-------☆

اختتام گنگو استاد کے تجربے کے مطابق ہی تھا۔ سونو کو کامیابی حاصل ہو گئی اس کے
بعد اسے کیا پڑی تھی کہ ہوٹل واپس آتی۔ ایک بڑی دولت حاصل کرنے کے بعد اس

جائے اسے لمحوں میں چھوڑ دینا ہی زندگی ہوتی ہے' کسی کے لئے اپنا وقت برباد کرنا حماقت کی بات ہے۔ دل سے اگر کوئی چیز لگی تھی تو صرف ماں تھی۔ پتا نہیں کیوں دوسری شادی کرنے کے باوجود اور اپنے آپ کو نظرانداز کئے جانے کے باوجود اسے ماں سے بے پناہ محبت تھی اور سوتیلے باپ اور بہن بھائیوں کے بارے میں اس کے دل میں یہ خیال نہیں آتا تھا کہ کیا وہ رہی ہے اور کیا وہ رہے ہیں۔ ساری باتیں اپنی جگہ' وہ ماں سے بہت محبت کرتی تھی۔ باپ کا خیال بھی لاتعداد دفعہ ذہن میں آیا لیکن اس نے اس خیال کو نظرانداز کر دیا اور یہی سوچتی رہی کہ بہرحال وہ ایک غلط انسان تھا۔ جیولری سٹور کے کامیاب ڈاکے کے بعد اس نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ اس کی شکارگاہ میں بڑی وسعتیں تھیں اور وہ کہیں بھی اپنا کھیل کھیل سکتی تھی لیکن اب سوچنے کا انداز کچھ بدلتا جا رہا تھا۔ پچھلے کافی دنوں سے وہ مختلف سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور اب اس نے انوکھے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ دولت بے شک اس کا آخری نظریہ نہیں تھی لیکن ایک ایڈونچر پسند زندگی اس کی فطرت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں جب اسے کسی پُرسکون مقام پر وقت بسر کرنے کا موقع ملتا تھا تو وہ اپنے بارے میں بھی سوچتی تھی اور جب بالکل انسان بن کر سوچتی تو ایک عجیب و غریب کہانی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔

ماں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی' اس کے نتیجے میں نمودار ہونے والے واقعات' اس کا اپنا وجود ایک ایسی کہانی جس پر اگر غور کرتی تو اسے خود اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی تھی لیکن کیا کیا جا سکتا تھا یہ کہانی اس کی اپنی تحریر نہیں تھی۔ وقت نے اور دنیا والوں نے اسے تحریر کیا تھا اور جب یہ احساس اس کے دل میں جاگتا تھا کہ اس سے ایک عام زندگی چھین کر ایک انوکھی زندگی دینے کا عمل اسی دنیا والوں کا ہے تو وہ اپنے آپ کو ان سے بالکل الگ محسوس کرنے لگتی تھی اور پھر اس کے جنون کا آغاز ہو جاتا تھا۔ اس رات بھی اس نے یہی سوچا تھا جس ہوٹل میں اس کا قیام تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک قبرستان بکھرا ہوا تھا اگر وہ پہلے سے اس ماحول کو دیکھ لیتی تو اس ہوٹل میں کبھی قیام نہ کرتی۔ اس نے تو وہ عقبی کھڑکی بھی نہیں کھولی تھی جس کی دوسری جانب پتا نہیں کیا تھا اور جب رات کے پُرہول سناٹوں میں اس نے گھٹن محسوس کر کے کھڑکی کھول کر دوسری طرف دیکھا تو ایک قبرستان بکھرا ہوا نظر آیا چاند کی چھاؤں میں مٹی کے نیچے سونے

عجیب سا احساس اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ نہ جانے ان سونے والوں کی کیا کیا کہانیاں ہوں گی۔

اچانک ایک اور خیال اس کے دل میں آیا کوئی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی کہانیاں اس کے علم میں آ سکیں' وہ جان سکے کہ دنیا میں رہنے والے کیسی کیسی زندگی گزارتے رہے ہیں۔ کاش کوئی ایسی چیز میرے ہاتھ آ جائے کوئی جادو کی چھڑی یا کوئی اور ایسا مؤکل جو دوسروں کو اس کے سامنے زبان کھولنے پر مجبور کر دے وہ لوگوں کے دلوں کا حال جان سکے۔ یہ ایک عجیب احساس تھا جو اس کے دل میں اتر آیا اور وہ ایسی بے خود ہوئی کہ اسے احساس بھی نہیں ہو سکا کہ کب وہ ہوٹل کے کمرے سے باہر آئی اور کب ہوٹل سے باہر نکل کر قبرستان کی جانب چل پڑی۔ بہت ہی عجیب و غریب صورت حال تھی' بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ لیکن یہ ایک دلچسپ عمل تھا اور آج کے بعد اس کی زندگی میں ایک نئے اور انوکھے باب کا اضافہ کرنے والا تھا۔ چنانچہ قبرستان میں قبروں کے درمیان ایک آوارہ روح کی مانند بھٹکتی ہوئی وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ قبرستان کے ایک دور افتادہ حصے میں نکل آئی ہے۔ یہ حصہ بڑا ہی ڈراؤنا تھا۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ خود رو جھاڑیوں اور پودوں نے ماحول کو خاصا وحشت ناک بنا رکھا تھا۔ وہ انسان کی حقیقت کے بارے میں سوچتی ہوئی پرانی قبروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔

اچانک وہ چونک کر رک گئی۔ نظارہ ہی ایسا تھا کہ وہ رکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسے ایک ایسی ٹوٹی پھوٹی قبر نظر آئی جو بالکل کالے رنگ کی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ قبر کا یہ کالا رنگ آگ جلنے اور دھوئیں کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ سونو نے قریب جا کر غور سے قبر کو دیکھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ عذاب کس قسم کا ہوتا ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس قبر کے مردے کو آگ میں جلا کر عذاب دیا گیا ہو گا۔ وہ اس کا تصور کر کے کانپ گئی اور اللہ سے معافی مانگنے لگی۔ وہ قبر کے کتبے کی طرف گئی تو اسے ایک اور عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔

ٹوٹی ہوئی قبر کے اندر سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ اس جلی ہوئی کالی قبر سے یہ سات رنگ کی روشنی پھوٹتے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ انسانی فطرت اور تجسس

ایک مرغی کے انڈے کے برابر ہیرا پڑا نظر آرہا تھا اور اس سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پھوٹ رہی تھیں۔ سونو اس عجوبے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پہلے تو وہ بہت خوفزدہ ہوئی مگر پھر نے حوصلہ کر کے اپنا بازو کالی قبر کے اندر ڈالا اور ہیرا باہر نکال لیا۔ وہ غور سے اس نادر روزگار ہیرے کو دیکھنے لگی۔ دفعتاً ہی اس پر کچھ نقش ابھرنے لگے اور وہ حیران رہ گئی یہ عمل خود بخود ہوا تھا۔ اس نے غور سے ان نقوش کو دیکھا ایک تحریر بن رہی تھی۔

"کسی کو جب کچھ دیا جاتا ہے۔ اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے اور پس منظر فوراً ہی پیش منظر میں آجائے تو تجسس ختم ہو جاتا ہے یہ تم ہی ہو جسے میں تمہارے نام کے پہلے حروف سے مخاطب کر سکتا ہوں یعنی "سین" بس اتنا کافی ہے اور یہ تمہارے لئے ہے کہ تم نے جو سوچا اس میں وہ موجود ہے یعنی اگر تم کسی کے بارے میں جاننا چاہو' اگر تم کسی ایسے عمل میں مصروف ہونا چاہو جو مختلف ہوتا ہے تو تم اس عمل میں مصروف ہو سکتی ہو۔ ان حالات کو جان سکتی ہو اور جس نے ماں کی خدمت کی اس نے انعام پایا۔ بے شک تمہارے راستے برائی کی سرنگ سے گزرتے ہیں لیکن گناہوں کا حساب الگ' محبت اور خدمت کا حساب الگ' جاؤ اپنا مقصد اپنا عمل پاؤ۔" یہ تحریر مٹ گئی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس انوکھے پتھر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر جب وہ تحریر اس کے ذہن سے گزری تو اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ اسے تو کائنات کی بہت بڑی دولت مل گئی ہے۔ اس سے اچھی بھلا کیا بات ہو سکتی ہے لوگوں کی مدد بھی کی جائے ان کے بارے میں جانا بھی جائے بلکہ اس پتھر کی مدد سے اپنی اور دوسروں کی مشکلات بھی حل کی جائیں۔ بے شک سونو کا انتقام بڑے غلط طریقے سے ہوا تھا لیکن جو بھی سنبھل جائے اچھی بات ہے۔ وہ اپنے مزاج کو کبھی بدل نہیں سکتی تھی۔ دنیا کے ساتھ فریب کرنا اس کے لئے روح کی تسکین کا باعث تھا لیکن پھر بھی دل کے کسی گوشے میں انسانیت کے جذبے چھپے ہوئے تھے' اب وہ قبرستان سے واپس آگئی اور پھر پتھر سے اسے دلچسپ تجربات حاصل ہونے لگے۔ وہ سوال کرتی اور سفید پتھر پر سنہری تحریر ابھر آتی یہ اس کے سوال کا جواب ہوتی ایسے ایسے جواب جو اسے دنگ کر دیتے' آہ یہ تو واقعی بہت زیادہ قیمتی پتھر ہے اس میں تو زندگی پوشیدہ ہے اور انسان اس سے اپنے اور دوسروں کے فائدے کے لئے بہت سے کام کر سکتا ہے۔

تام حاصل کرنا چاہتی تھی جو بڑی حیثیت کا حامل ہو بس زندگی سے کھیلنا اس کا دلچسپ شغلہ تھا۔ بہرحال اس پتھر کے حصول کے بعد اس کی اپنی جدوجہد ایک طرح سے رک ن ئی تھی کئی دن تک وہ اس ہوٹل میں مقیم رہی پھر اس نے یہ ہوٹل بھی چھوڑ دیا۔ ... طور سے اسے مرد کا روپ دھار کر رہنا پسند آتا تھا پھر اس وقت وہ ایک مرد کی حیثیت سے ہی اس ہوٹل میں مقیم تھی کہ ایک بے وقوف سی لڑکی اس سے آ ٹکرائی عجیب سی یفیت کی حامل تھی۔ سونو نے نہ جانے کیوں اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور اس ے بعد لڑکی سے دوستی کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ لڑکی کی شخصیت کا ایک پُراسرار سا پہلو تھا جس کے بارے میں وہ جاننا چاہتی تھی اور آخرکار دو تین ملاقاتوں میں اس نے لڑکی کو اپنے جال میں گرفتار کر لیا فی الحال اس کے پاس کافی سرمایہ موجود تھا۔ دولت کی کوئی مشکل نہیں تھی چنانچہ اس نے ان تمام باتوں کو نظرانداز کر کے اس شام اس لڑکی سے پوچھا جسے اس نے عارضی طور پر اپنے کمرے ہی میں مقیم کر لیا تھا۔ لڑکی کی پُراسرار شخصیت اس کے لئے حیران کن تھی لیکن بہرحال زندگی میں بہت سے دلچسپ تجربات کرتے رہنا چاہئے چنانچہ اس نے بھی تجربے کے طور پر یہ سب کچھ کیا تھا اور پھر آخرکار اس نے لڑکی کی زبان کھلوا لی لڑکی نے اسے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

میری زندگی کی کہانی بے حد انوکھی ہے تم نے کبھی حیات علی کا نام سنا ہے۔ یقیناً تم نہیں جانتی ہو گی کہ وہ کون ہے اصل میں حیات علی ہمارے دادا تھے اور پنجاب کے مخصوص علاقے میں ان کی جاگیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ جاگیریں کافی تھیں اور ان سے بہترین آمدنی ہوا کرتی تھی۔ میں نے تو خیر دادا کو نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی داستانیں عموماً سننے کو ملتی تھیں۔ یہ سنا ہے کہ چوہدری صاحب خاندان میں بڑے کھلے ڈھلے کے آدمی تھے اور بڑی شان تھی ان کی۔ سینکڑوں واقعات ان کی زندگی سے وابستہ تھے۔ سخت مزاج اور اکھڑ طبیعت کے مالک تھے لیکن تھوڑے سے شوقین مزاج تھے۔ یعنی حویلی میں مجرے وغیرہ بھی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوا کرتے تھے اور دادا جان مجرا کرنے والیوں پر خاصی عنایتیں کرتے رہا کرتے تھے۔ بہرحال دادی جان کی زبانی بھی کبھی کبھی ایسی کہانیاں سننے کو مل جاتی تھیں۔ وہ بھی اس وقت جب مجھے نئی حویلی میں کبھی کبھی گھاس ڈال دی جاتی تھی اور میں بھی دوسروں کے ساتھ وہاں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ تو میری والدہ نے مجھے جو کہانی سنائی اسے سنانے سے پہلے انہوں نے ایک تمہید باندھی' کہنے لگیں۔

"بیٹی شیرانہ آج جب تم نے مجھ سے یہ سوال کر ڈالا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ

تمہیں تمام باتوں سے آگاہ کر دینا ضروری ہے بلکہ یوں سمجھو کہ نہایت ضروری ہے میں انتظار کر رہی تھی کہ کبھی تم یہ سوال اپنی زبان سے کرو۔"

"ارے کیا میرے اس سوال میں کوئی ایسی بات پوشیدہ ہے جس کے لئے آپ اتنی ساری باتیں کہنا پڑ رہی ہیں امی!"

"ہاں۔" ماں کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی سمٹ آئی۔

"آپ براہ کرم مجھے بتایئے۔"

"تو سنو شیرانہ! پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے والد مدثر حیات باقی دونوں بڑے بھائیوں یعنی مشرف حیات اور مقدس حیات کے سوتیلے بھائی تھے۔"

"سوتیلے کیا ہوتا ہے امی!" میں نے سوال کیا۔

"وہ جو تمہاری دادی اماں ہیں نا' وہ تمہارے والد کی سگی امی نہیں ہیں۔"

"تو پھر؟"

"اصل میں وہ مشرف اور مقدس بھائی کی سگی ماں ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں کوئی نہیں تھی۔ بہرحال پھر یوں ہوا کہ چوہدری حیات علی صاحب نے ایک اور عورت سے شادی کر لی۔ وہ عورت نہ جانے کون سے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ کوئی بتانے والا ہی نہیں ہے لیکن بہرحال مدثر حیات انہی کے بیٹے ہیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کچھ عرصے کے بعد یا تو ان خاتون سے چوہدری حیات صاحب کا تعلق ختم ہو گیا یا ان کا انتقال ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ لوگ کچھ بتاتے ہی نہیں ہیں۔ مدثر حیات کو حیات علی صاحب حویلی میں لے آئے اور کیونکہ مدثر حیات صاحب تمہاری دادی کے سوتیلے بیٹے تھے' اس لئے دادی اماں انہیں پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ ان کی سوکن کے بیٹے تھے لیکن حیات کو چونکہ بچپن ہی سے ماں نہیں ملی تھی اور پھر گھر میں وہ دوسروں کا رویہ بھی اپنے ساتھ برا ہی دیکھتے تھے اس لئے ان کی طبیعت میں سرکشی پیدا ہو گئی تھی۔ جاگیردار کے بیٹے تھے۔ جاگیرداری مزاج میں بسی ہوئی تھی۔ بڑے ہوتے گئے تو شوقین بھی ہوتے گئے اور انہوں نے اپنے طور پر بہت سے ایسے کارنامے سرانجام دیے جس سے چوہدری حیات علی بھی ان سے ناراض ہو گئے۔ پھر جب چوہدری حیات علی نے وصیت لکھی تو غصے کے عالم میں مدثر حیات کو اپنی دولت و جائیداد میں سے کوئی حصہ نہیں دیا اس کی وجہ مدثر حیات صاحب کی نالائقی تھی لیکن بہرحال مدثر صاحب کو کوئی حویلی سے نکال نہیں سکتا تھا۔ دادا جان صرف ناراض رہتے تھے یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے

بیٹے سے نفرت کرنے لگے ہوں۔ وصیت کے سلسلے میں بھی آج تک لوگوں کا خیال ہے کہ چوہدری حیات صاحب کی لکھی ہوئی نہیں تھی بلکہ جعلی طریقے سے اسے تیار کرایا گیا تھا۔ اب اس میں کون کون شامل تھا یہ بات میں نہیں جانتی۔

بہرحال وقت گزرتا رہا۔ پھر چوہدری حیات علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے انتقال کے بعد مدثر حیات علی کا معاملہ ذرا مشکل میں پڑ گیا۔ اب دونوں بڑے بھائی ان سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ مدثر بذات خود سرکش تھے اور گھر کے معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی فطرت میں بھی دادا کی طرح رنگین تھی اور وہ نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے تھے۔ اس طرح گھر والوں کو ان کے حقوق غصب کرنے کا بہترین موقع حاصل ہو گیا۔ دونوں بھائی آرام سے اپنے گھروں میں اپنی بیگمات کے ساتھ رہا کرتے تھے اور صحیح معنوں میں جاگیردار کی زندگی گزار رہے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک بار مدثر صاحب نہ جانے کس گاؤں پہنچے۔ میرے والد مسجد کے مؤذن تھے اور میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جو ان کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ مدثر صاحب مسجد کے دروازے پر زخمی پڑے ہوئے تھے۔ بے ہوش تھے۔ میرے والد مولوی قدرت علی انہیں اٹھا کر اندر لے آئے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ پٹیاں کیں۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل تھی۔ میری والدہ کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور میں اپنے والد کے ساتھ ہی حجرے میں رہا کرتی تھی۔ زندگی پرسکون گزر رہی تھی۔ والد صاحب میرے سلسلے میں اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ بہرحال مدثر صاحب اپنے طور پر صحت حاصل کرتے چلے گئے اور پھر نہ جانے کس طرح انہوں نے والد صاحب سے اپنے دل کی بات کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

والد صاحب نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور مدثر صاحب مجھے حویلی میں لے آئے لیکن میری آمد سے یہاں کہرام مچ گیا تھا۔ طرح طرح کی کہانیاں سنائی گئیں۔ پھر جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ میں بے شک ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہوں لیکن میرا حسب و نسب بہتر ہے اور میں ایک دیندار شخص کی بیٹی ہوں تو وہ لوگ خاموش ہو گئے لیکن انہوں نے مجھے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے امکانات تھے۔ کیونکہ مدثر بہرحال سوتیلے تھے۔ مجھے یہاں لانے کے بعد مدثر بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔ ویسے بھی ہمیں ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرح کے انسان ہیں۔ جتنے عرصے وہ میرے والد صاحب کے پاس رہے اتنے عرصے میں

یہ ظاہر ہوتا رہا کہ وہ ایک شریف اور نیک نفس انسان ہیں اور ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سارے سلسلے چلتے رہے اور ہم لوگوں کو اس انداز میں قبول کیا گیا کہ ہمیں اس پرانی حویلی میں جگہ دے دی گئی۔ یہاں ہم زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر تم پیدا ہوئیں بیٹی اور اس کے بعد کے حالات تمہیں معلوم ہیں۔ مدثر کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے اصل رنگ میں آ گئے تھے۔ میں تمہیں تمہارے ابو کے خلاف بالکل دلبرداشتہ نہیں کرنا چاہتی لیکن بیٹی آج جب تم نے یہ سوال مجھ سے کر لیا ہے تو حقیقتوں کو تمہارے سامنے لانا میرے لئے بھی ضروری ہو گیا ہے۔ یہ ہے تمہارے ابو کی کہانی۔ اب بھی وہ بس اپنی عیاشیوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ میں گھر میں رہنے والی بھلا کیا جانوں کہ وہ کہاں کہاں ہوتے ہیں۔ کہاں کہاں جاتے ہیں۔ بس کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ مجھے اخراجات کے لئے کچھ دے جاتے ہیں اور یوں ہماری زندگی گزر رہی ہے۔ اتنا ہی کافی ہے کہ یہ لوگ ہمیں سر چھپانے کو جگہ دیئے ہوئے ہیں۔"

"لیکن امی! آخر ابو دادا جان کے بیٹے ہی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹی' مگر دادا جان نے بھی تو اپنی وصیت میں ان کے لئے کچھ نہیں لکھا۔"

"امی کیا یہ زیادتی نہیں ہے دادا جان کی؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے۔ ہمارا ہم زبان ہے بھی کون۔"

میں خاموش ہو گئی اور کچھ عرصے بعد ابو معمول کے مطابق گھر واپس آئے لیکن اس بار وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا۔ وہ حویلی میں داخل ہونے کے بعد سیدھے پرانی حویلی آئے تھے اور بستر پر آ کر لیٹ گئے تھے۔ امی نے ان کی مزاج پرسی کی تو بولے۔

"بس کچھ الجھنوں میں پڑ گیا ہوں۔ سنو تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"جی ہاں آپ جو کچھ بھی دیتے ہیں اسی میں سے کچھ پس انداز کر کے رکھا ہوا ہے۔"

"کتنے پیسے ہوں گے؟"

"غالباً ساڑھے سات ہزار۔" امی نے جواب دیا اور ابو ہنسنے لگے۔

"صرف ساڑھے سات ہزار؟"

"جی اتنے ہی تھے۔"

"ہونہہ۔ ان سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے تقریباً پچاس ہزار روپے درکار ہیں۔" امی گردن جھکا کر خاموش ہو گئیں تو ابو نے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں ہے مقدس بھائی سے بات کرتا ہوں۔" اور پھر پہلی بار حویلی میں معرکہ ہوا۔ میں اور امی بھی ابو کے ساتھ ہی ساتھ گئے تھے۔ مقدس تایا نے ہمیشہ ہم لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ ہمارے آنے جانے پر خیر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی لیکن کوئی بھی ہم پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ ہم تینوں پہنچے تو مقدس تایا اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ آرام سے بیٹھے ہوئے کچھ گفتگو کر رہے تھے' ہمیں دیکھ کر انہوں نے عجیب سے انداز میں بھنویں سکیڑیں اور بولے۔

"کوئی کام ہے مجھ سے؟"

"جی بھائی جان!" ابو نے کہا۔

"میں جانتا ہوں ویسے بھی بغیر کام کے تم کب یہاں پہنچے ہو۔ خیر بتاؤ کیا بات ہے؟"

"بھائی جان مجھے پچاس ہزار روپے چاہئیں۔" ابو نے کہا۔

"سبحان اللہ' خیریت؟"

"خیریت ہی سمجھیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ پچاس ہزار روپے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"بس بھائی جان ایک ادائیگی کرنی ہے۔ اگر نہ کر سکا تو میرے لئے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔"

"تو پھر کر دیجئے۔"

"میں نے عرض کیا نا مجھے پچاس ہزار روپے چاہئیں۔"

"تو بھائی میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"پچاس ہزار روپے دے دیجئے آپ مجھے۔"

"سن رہی ہیں آپ۔" مقدس تایا نے اپنی بیگم مسرت جہاں سے کہا اور مسرت جہاں حقارت آمیز انداز میں ہنسنے لگیں۔ پھر بولیں۔

"یہ تو ہم لوگوں نے سن رکھا تھا کہ مدثر میاں شراب سے بھی شغل کرتے ہیں لیکن شراب پی کر بھی اس طرح حویلی میں داخل ہو جائیں گے یہ نہیں سوچا ہم نے۔"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابی!"

"اگر ہوش میں ہوتے تو ایسی بے وقوفی کی بات نہ کرتے مدثر! پچاس ہزار روپے کیا

پچاس روپے ہوتے ہیں جو تمہیں دے دیئے جائیں۔"

"بھائی میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں۔"

"اب میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی کچھ بولوں گی تو یہی کہہ دیا جائے گا کہ چھوٹا منہ بڑی بات۔"

"بھائی میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ میں آپ کا دیور ہوں۔ میں حیات علی کا بیٹا ہوں۔ لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔ لاکھوں روپے کی آمدنی ہے میں تو صرف پچاس ہزار مانگ رہا ہوں آپ سے۔"

"دیکھو میاں! ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں۔ تم یہاں رہ رہے ہو۔ اس کو غنیمت سمجھو۔ تمہاری رگوں میں حیات علی کا خون دوڑ رہا ہے اور ہم بہرحال اپنے باپ کی قدر کرتے ہیں۔ پتا نہیں کس طرح وہ تمہارے جنجال میں پھنس گئے تھے' میرا مطلب ہے تمہاری والدہ۔"

"مقدس بھائی! ہوش و حواس اور زبان قابو میں رکھئے گا ورنہ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں ایک بگڑا ہوا آدمی ہوں۔"

"ارے بھائی بگڑے ہوئے آدمی یہ ہم بھی جانتے ہیں کہ تم بگڑے ہوئے آدمی ہو لیکن ہم سے فضول باتیں کیوں کر رہے ہو۔ بھلا کس حساب میں تم یہ رقم مانگ رہے ہو۔"

"میرا حق بنتا ہے۔"

"کمال ہے جو حق تمہیں حیات علی نے تسلیم نہیں کیا تم وہ ہم پر کیسے جتا رہے ہو میرے بھائی!"

"دیکھئے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آپ لوگ مجھے پچاس ہزار روپے دے دیجئے مجھے ان کی اشد ضرورت ہے۔ میں اگر بگڑا ہوا بھی ہوں تو میں نے آج تک آپ لوگوں کے سامنے کوئی گستاخی نہیں کی۔ آپ لوگ مجھے کچھ بھی سمجھتے رہے ہوں لیکن میں آپ کو اپنا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی جناب! لیکن آپ ٹھنڈے ٹھنڈے تشریف لے جائیں۔ دھمکیاں دینا چاہتے ہیں تو نہ دیجئے تو بہتر ہے کیونکہ اس حویلی میں آپ کا وقار اور مان وابستہ ہے کیا فائدہ کہ ذرا سی دیر میں آپ کا سارا غرور خاک میں مل جائے۔"

فوراً اندر آگئیں اور بولیں۔

"جی میاں! مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ۔ میرے اور آپ کے درمیان تو کبھی بات چیت کا رشتہ رہا ہی نہیں۔"

"اس کے ذمہ دار بھی آپ لوگ ہیں۔"

"خیر اب جو کچھ بھی ہے الگ بات ہے۔ آپ سن رہی ہیں امی جی! ان صاحب کو پچاس ہزار روپے چاہئیں۔"

"تو بابا! بندوبست کرلے کہیں سے ہم انہیں کہاں سے پچاس ہزار روپے دے دیں گے اور کیوں دے دیں گے۔"

"اس لئے کیونکہ یہاں میرے باپ کا سرمایہ ہے۔"

"بھول جاؤ۔ میرے بچے! ان فضول باتوں کو۔ میں بھی سیدانی ہوں اور اب اتنی سیدھی باتیں کہیں تو یہ سمجھ لو وہ کچھ کر سکتی ہوں جو تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"آپ لوگ عجیب باتیں کر رہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ میرے ساتھ یہ سلوک کریں گے میں نے تو ہمیشہ آپ کو اپنا ہی سمجھا تھا۔"

"تو یہ غلطی آپ نے کی ہے ہم نے کبھی ایسی غلطی نہیں کی۔"

"گویا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کا کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"ہمارا آپ کا صرف اتنا رشتہ ہے کہ آپ پرانی حویلی میں رہتے ہیں اور ہم نے ازراہ کرم رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ ابو نے آپ کو باہر نہیں نکالا اگر وہ اپنی زندگی میں نکال دیتے تو شاید آپ ادھر کا رخ بھی نہیں کر پاتے۔ خود سوچ مدثر میاں کیا نام روشن کیا ہے تم نے حیات علی کا' ارے تم کیا سمجھتے ہو لوگ دبی دبی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔ وہ تو صرف ہمارا رعب ہے کہ لوگ کھل کر تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے ورنہ یقین کرو بستی سے نکال دیا جائے تمہیں۔"

"آپ لوگوں نے واقعی میرا دل توڑ دیا ہے۔ میں تو سب کچھ ہونے کے باوجود آپ ہی کو بھائی سمجھتا رہا تھا۔"

"ہاں ہاں' پچاس ہزار روپے کے لئے تو نہ جانے کس کس کو بھائی سمجھا جا سکتا ہے ہم تو پھر بھی حیات علی کے بیٹے ہیں۔"

"آخری سوال کر رہا ہوں میں آپ سے۔ آپ مجھے یہ رقم دیں گے یا نہیں؟"

لے کر یہاں سے باہر نکل جاؤ اور اپنا کوئی ٹھور ٹھکانہ کرو لیکن پھر بھی تم ہماری ہی جان پر مسلط رہنا چاہتے ہو تو کان دبا کر یہاں پڑے رہو۔ بچی کے باپ ہو اس لیے ہم کچھ نہیں کہیں گے اور اگر دوسری صورت میں تم نے یہاں کوئی گڑبڑ کی تو پھر یہ سمجھ لو کہ ہمیں تمہارے خلاف اٹھنا پڑے گا۔"

مدثر نے خونی نگاہوں مقدس حیات کو دیکھا۔ مشرف اس وقت موجود نہیں تھے۔ پھر اس کے بعد باہر نکلتے ہوئے بولے۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ میرے نام کے ساتھ سوتیلے کا نام وابستہ ہے اگر کچھ کروں گا تو دنیا واقعی حیات علی کا نام ہی لے گی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہے گی جو آپ نے کہنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ میں ایک بری ماں کا بیٹا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھئے گا۔ میری ماں کے بارے میں آپ لوگوں نے زبان سے اگر ایک لفظ بھی نکالا تو اتنے ٹکڑے کروں گا کہ کوئی انہیں جمع کر کے آپ کی تدفین نہیں کر سکے گا۔ سمجھ رہے ہیں نا یہ بات۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ سے خوفزدہ ہو کر جا رہا ہوں۔ آپ یقین کیجئے اس پوری حویلی کو آگ لگا سکتا ہوں۔ آپ لوگوں کو زندہ جلا سکتا ہوں۔ بہت آسان ہے یہ سب کچھ میرے لئے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ اس وقت صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ اگر میں نے یہ رقم ایک مخصوص جگہ نہ پہنچائی تو مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں جا رہا ہوں لیکن اس بات کو یاد رکھوں گا۔"

اور اس کے بعد ابو مجھے اور امی کو لے کر باہر لے آئے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ امی بچاری الگ افسردہ تھیں۔ ابو نے ہم لوگوں سے کچھ نہیں کہا۔ بس ساری رات سوچتے رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا۔

"سنو رحانہ! ایک کام کرو۔ ویسے تو حویلی میں کوئی غیر آدمی داخل نہیں ہو سکتا لیکن اگر کوئی کسی طرح پہنچ بھی جائے تم تک اور میرے بارے میں پوچھے تو تم یہ کہہ دینا کہ میں آیا بے شک تھا لیکن چلا گیا۔"

"تو آپ کہاں جائیں گے؟"

"کہیں نہیں جاؤں گا بلکہ ایسا کرتا ہوں دن میں حویلی سے باہر نکل جاؤں گا' رات کو دیوار کود کر اندر آ جاؤں گا۔ پھر اندر کے کمرے میں چھپا رہوں گا۔ یہاں ویسے بھی کوئی نہیں آتا لیکن اگر کوئی آ بھی جائے تو بہرطور پرانی حویلی میں تہہ خانہ موجود ہے میں تہہ

لوگوں کے سوا۔"

"مگر قصہ کیا ہے؟" امی نے پوچھا۔

"نہیں' قصہ مجھ سے نہ پوچھو' بتا نہیں سکتا۔" امی خاموش ہو گئی تھیں۔ ویسے بھی ابو اب امی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے بس آ گئے تو آ گئے ورنہ کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تھا ہمارا۔ بس یوں ہی زندگی گزر رہی تھی پھر یہ ہوا کہ ابو حویلی سے باہر چلے گئے۔ رات کو ہم سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ چار بجے کے بعد جب چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی طاری ہو گئی تو ابو واپس آ گئے اور انہوں نے امی کو کچھ رقم دیتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تم اس میں سے خرچ کرو وہ ساڑھے سات ہزار محفوظ رہنے دو۔ جس طرح ملازموں سے سودا سلف منگواتی ہو اسی طرح منگواتی رہو۔ میرے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہئے۔" تقریباً ایک مہینے تک ابو اسی طرح تہہ خانے میں پوشیدہ رہے اور پھر وہ بری طرح اکتا گئے۔ ایک دن تہہ خانے سے باہر آئے اور بولے۔

"سنو رحانہ! میں جا رہا ہوں۔ اب تھوڑے دن تک باہر وقت گزاروں گا۔ میرے لئے فکرمند نہ ہونا لیکن جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اس کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی اجنبی شخص میرے بارے میں پوچھے تو تم سادگی سے اسے بتا دینا کہ میں تو گھر پر رہتا ہی نہیں ہوں اور طویل عرصے سے گھر سے غائب ہوں۔ ظاہر ہے تم نہیں جانتی کہ میں کہاں ہوں گا۔" امی نے آنسو بھری آواز میں کہا۔

"اور میں آپ کے لئے سولی پر لٹکی رہوں گی۔" ابو کے چہرے پر پہلی بار میں نے پشیمانی کے آثار دیکھے۔ وہ امی کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

"ہاں مجھے احساس ہے بہت سے احساسات ہیں مجھے' ان دنوں تنہائی میں سوچتا رہا ہوں کہ میں نے تم لوگوں کے ساتھ واقعی بڑی سختیاں کی ہیں۔ وہ مقام نہیں دیا میں نے تمہیں جو تمہارا مقام ہے لیکن خیر رحانہ' تم میری زندگی کی دعا کرو۔ اگر میں اپنی مشکل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو اپنے کئے کا کفارہ ادا کروں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

پھر انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آنے لگے لیکن اس کے بعد وہ منہ پھیر کر چل پڑے تھے اور ہم نے دیکھا کہ وہ حویلی کی عقبی دیوار کود کر باہر نکلے ہیں۔ وقت آگے بڑھتا رہا۔ ابو کو گئے ہوئے دو دن گزر چکے تھے تیسرے دن راشد یوں ہی کھیلتا ہوا میری طرف آ نکلا۔ میں وہیں پرانی حویلی کے بیرونی حصے

"کچھ پتا چلا چچا کا' شیرانہ!"

"نہیں ہمیں نہیں معلوم۔ وہ تو بہت عرصے سے یہاں آئے ہی نہیں ہیں۔" میں نے وہی بات دہرائی جو ابو نے امی سے کہی تھی۔

"نہیں میں پوچھ رہا ہوں تمہیں یہ تو پتا چل گیا کہ وہ لوگ چچا مدثر کو لے گئے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"اب یہ تو پتا نہیں۔ شاید تمہیں اصل بات ہی نہیں معلوم۔"

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔"

"شکور تیلی کو جانتی ہو؟"

"ہاں' ہاں۔ شکور تیلی کو جانتی ہوں۔ وہ جو یہاں آتا رہتا ہے۔"

"اسی نے تو ابو کو یہ بات بتائی تھی۔"

"کیا؟"

"سرسوں کے کھیتوں کے پاس سے چچا مدثر گزر رہے تھے کہ بہت سے لوگ ان کے چاروں طرف آ کھڑے ہوئے۔ پھر چچا مدثر کی' ان سے لڑائی ہوئی۔ وہ بہت سے تھے اور چچا مدثر اکیلے۔ چنانچہ انہوں نے چچا مدثر کو پکڑ لیا اور پھر ایک گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔"

"کیا بک رہے ہو؟"

"نہیں' شکور نے ہی آ کر یہ بات بتائی ہے۔ میں نے سن لی تھی۔"

"کسے بتائی تھی؟"

"میرے ابو کو۔" میں کپڑے چھوڑ کر اندر بھاگی اور امی کو راشد کی بات بتائی۔ امی سکتے میں رہ گئیں۔ پھر وہ دوڑی دوڑی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے نئی حویلی کے اندر گئیں اور انہوں نے مقدس حیات سے کہا۔

"بھائی جان! یہ شکور تیلی نے آپ کو کوئی بات بتائی تھی۔"

"تمہیں معلوم نہیں۔" مقدس حیات صاحب طنزیہ انداز میں بولے۔

"نہیں خدا کے لئے مجھے بتایئے کہ کیا ماجرا تھا انہوں نے؟"

"وہی کہا تھا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ کچھ لوگ مدثر کو پکڑ کر لے گئے۔"

"پرسوں شکور آیا تھا اور اس نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔"

"اور آپ نے مجھے نہیں بتایا۔"

"کیوں' کیا میری ڈیوٹی تھی کہ میں آپ کو اطلاعات فراہم کروں؟" مقدس حیات نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آہ' اتنا بڑا واقعہ ہو گیا لیکن آپ نے؟"

"معصوم بننے کی کوشش کرو تو اور بات ہے۔ واقعہ تو بالکل بڑا نہیں ہے۔ اس بات کی توقع تو سبھی کرتے تھے۔ غلط کام کے نتائج غلط ہی ہوا کرتے ہیں۔ جھگڑا چل رہا ہو گا کسی سے لین دین کی بات ہو گی۔ وہ پچاس ہزار روپے جو مانگتے تھے وہ بے مقصد تو نہیں تھے۔ جن کا قرض ہو گا وہ لے گئے پکڑ کر۔"

"خدا سے ڈریں بھائی صاحب! خدا سے ڈریں۔ انسانیت کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ سارے رشتے و نظرانداز کیا جا سکتا ہے لیکن آپ کو پتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ میرا بچہ بے قصور ہے۔ کم از کم انسانیت کے نام پر ہی آپ ذرا سے انصاف سے کام لے لیں۔"

"دیکھو' رحانہ! بات اصل میں یہ ہے کہ مدثر بے شک ہمارا سوتیلا بھائی ہے لیکن آج تک اس نے جو رویہ ہمارے ساتھ رکھا اس نے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ ہمارا اس سے رشتہ ہے۔ بس ایک نفرت' ایک بے رخی' ایک طنز کا انداز اس نے ہمیشہ اختیار کیا اور اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے جو ہوا ہے۔ فرشتے تو ہم بھی نہیں ہیں کہ ایک ایسے شخص سے مسلسل رابطہ رکھیں جو ہمیں اپنا بڑا ہی نہیں سمجھتا۔"

"بھائی صاحب خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ آپ لوگوں نے تو اس طرح نظرانداز کر دیا ہمیں جیسے ہمارا آپ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔"

"بات کسی شریف آدمی کی شریف آدمی سے جھگڑنے کی ہوتی تو ہم یقینی طور پر آگے بڑھ کر کچھ نہ کچھ کرتے لیکن تم خود سوچ لو' جو کچھ ہوا ہے اس کے پس پردہ کوئی خطرناک لوگ ہی ہوں گے۔ اب کیا ہم لاٹھیاں لے کر ان پر دوڑ پڑیں۔"

"خدا کے لئے' آپ کو خدا کا واسطہ۔"

"اے بی بی! اپنا کیا خود بھگتو۔ ہمارے سر مت پڑو۔" اندر سے دادی اماں نکل آئیں۔ جو یہ ساری باتیں سن رہی تھیں اور اس کے بعد کچھ نہیں ہوا سوائے اس کے کہ

نہیں تھا۔ حویلی سے باہر ویسے بھی نکلنا نہیں ہوتا تھا۔ اب بھلا شکور تیلی سے زیادہ معلومات کرنے کون جاتا۔ بس خاموشی' صبر کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ سارا کام خود بخود ہی کرنا پڑتا تھا۔ گھر کے کپڑے دھونا' پرانی حویلی کی صفائی باہر سے سودا سلف لانا۔ یہ سارے کام امی خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ حالانکہ نئی حویلی میں ملازمین موجود تھے لیکن انہیں اجازت نہیں تھی کہ پرانی حویلی آکر ہماری خبرگیری کریں اور پھر ملازم لاکھ رحم دل سہی لیکن بہرحال بے چارے خود بھی پیٹ کے مارے تھے۔ مالکوں کی مرضی کے خلاف کچھ کرکے نوکری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے تھے۔ امی انتظار کرتی رہیں۔ سارے کام اللہ پر چھوڑ دیئے تھے۔ ہم تو بے بس تھے کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ جو پیسے پاس موجود تھے۔ انہی میں دو مہینے چار مہینے' چھ مہینے اور سال گزر گیا۔ اب تو ابو کی صورت بھی آنکھوں سے اوجھل ہوتی جارہی تھی۔ یاد تک نہیں آتا تھا کہ ان کی شکل و صورت کیسی ہے۔ پھر وقت نے ہم پر اپنی نحوستوں کے سائے ڈالنا شروع کردیئے۔ آہستہ آہستہ پیسے ختم ہوگئے اور اس وقت جب امی پر بھوک کی وجہ سے غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ میں روتی ہوئی اندرونی حویلی تک گئی۔ دادی یہاں موجود تھیں۔ مجھے دیکھ کر غصے سے آنکھیں نکالیں۔

"کیا بات ہے' کیوں آئی ہو یہاں؟"

"دادی اماں! امی مر رہی ہیں۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"مر رہی ہیں..........؟"

"جی دادی اماں!"

"کیا بات ہے' بیمار ہے؟"

"نہیں دادی اماں! ہم نے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" میں نے کہا اور نہ جانے دادی اماں کے دل میں کیسے انسانیت آگئی۔ ایک ملازم کو بلایا۔ کھانے پینے کی چیزیں بھجوائیں۔ امی کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ میں نے انہیں ایک گلاس دودھ پلایا تھا اور وہ دودھ پی کر گہری نیند سو گئی تھیں۔ پھر میں نے بھی تھوڑا بہت کھایا تھا اور اس کے بعد باقی چیزیں محفوظ کردیں۔ پیٹ میں خوراک گئی تو امی کی حالت کچھ بحال ہوگئی اور پھر انہوں نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں نے ساری تفصیل بتادی۔ دادی اماں کے سامنے روتے ہوئے انہوں نے ان کے قدم پکڑ لئے تھے۔

اپنے سائے نہ ہٹائیں۔ آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ مجھے اور میری بچی کو نوکری ہی دے دیجئے۔ ہم لوگ آپ کے گھر کا کام کاج کریں گے۔ بس ہمیں روٹی چاہئے۔ کپڑا تو ہمارے پاس ہے اور کچھ نہیں مانگیں گے آپ سے۔"

"خیر بی بی! کھانے سے تو دشمنوں کو بھی منع نہیں کیا جاتا لیکن شرط یہی ہے کہ تمہیں گھر کے کام کاج کرنے پڑیں گے۔"

"میں خوشی سے کروں گی۔"

بہرحال ان لوگوں کے دلوں میں جو کچھ بھی تھا وہ اپنی جگہ۔ لیکن نوکری دینے کے بعد کم از کم ہماری روٹی کا بندوبست ہوگیا تھا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ہم گھر کا کام کرتے رہتے تھے۔ امی نے بھی اپنی اس بدنصیبی کو قبول کرلیا تھا۔ اب تقدیر ہی نے کوئی فیصلہ کردیا ہو تو انسان بھلا اس فیصلے کو کیسے بدل سکتا ہے۔ گھر کے ملازموں کے ساتھ جتنی سختی ہوتی تھی اتنی ہی سختی ہمارے ساتھ تھی۔ میں حویلی کے پکے فرش کا پونچھا لگاتی تھی۔ جھاڑ دیتی تھی۔ فرنیچر صاف کرتی تھی اور اس پر بھی اگر کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو میرے رخساروں پر کسی نہ کسی کی انگلیوں کے نشانات نظر آنے لگتے تھے۔ اب تو راشد بھی مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔

"نوکرانیوں میں' میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔" اور میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی تھی۔ بات تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ اس کا قصور نہیں ہے۔ ہوں تو میں بالآخر گھر کی نوکرانی ہی۔ ابو کے زمانے کے کچھ اچھے کپڑے بھی تھے جو اب ہم لوگوں نے پہننا چھوڑ دیئے تھے۔ ابو کو گئے ہوئے تو اب سالہا سال ہو گئے تھے اور یہ طے کرلیا گیا تھا کہ ابو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں بڑی ہوتی جارہی تھی۔ کم بخت فاقہ کشی اور بے عزتی کی زندگی بھی میرے رنگ و روپ پر اثرانداز نہیں ہوئی تھی۔ جوانی کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ چہرے پر گلاب اترنے لگے تھے۔ آنکھوں میں شفق کی سرخیاں نہرانے لگی تھیں اور ہونٹوں پر خود بخود ہی ایک مسکراہٹ چسپاں ہو گئی تھی۔ جبکہ میں جان بوجھ کر بھی نہیں مسکراتی تھی لیکن ان لوگوں کا خیال تھا کہ میرے ہونٹ اس انداز کی تراش کے بنے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں اسے دیکھ کر مسکرا رہی ہوں۔ میں نے اپنی ان تبدیلیوں پر بالکل غور نہیں کیا تھا۔ ایسی باتوں پر غور کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے لیکن وہ عید کا دن تھا اور دوپہر کو اپنے تمام کاموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جبکہ گھر

تھے۔ ہم سے ہماری رہائش گاہ نہیں چھینی گئی تھی۔ چنانچہ واپس آنے کے بعد ہم دونوں نے غسل وغیرہ کیا۔ امی نے وہاں سے لائی ہوئی کچھ چیزیں سامنے رکھیں اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر امی نے پرانے لباسوں میں سے ایک لباس نکال کر مجھے پہننے کے لئے دیا۔ یہ غالباً امی کا لباس تھا۔ جو اب میرے بدن پر درست آ گیا تھا۔ امی مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولیں۔

"کم بخت تُو تو جنگلی بیل کی طرح بڑھتی جا رہی ہے اور میں تجھے دیکھ دیکھ کر خوفزدہ ہوتی ہوں۔"

"لیجئے امی! تو کیا میری عمر کو وہیں رک جانا چاہئے تھا؟"

"نہیں لیکن یہ بڑھتی ہوئی عمر میرے لئے کس قدر خوف کا باعث ہے تُو نہیں جانتی۔"

میں ہنس کر خاموش ہو گئی۔ امی جانے کیسے خوف کا شکار ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ پھر ہم دونوں ماں بیٹیاں ابو کے بارے میں باتیں کرتی رہیں اور امی غمزدہ ہو گئیں۔ کہنے لگیں۔

"خیر' ہماری تو تقدیر ہی میں عید' بقر عید کبھی نہیں رہی۔ شاید ہی میری زندگی میں کبھی کوئی ایسی عید آئی ہو۔ جب تمہارے ابو میرے ساتھ ہوں۔"

"لیکن امی! ابو گئے کہاں؟"

"مجھ سے سوال کر رہی ہو؟ اب تو سمجھدار ہو گئی ہو۔"

"امی یہ جو لوگ کہتے ہیں۔"

"خدا نہ کرے۔ کیوں تہوار کے دن برے فال منہ سے نکالتی ہو۔ وہ جہاں بھی ہیں اللہ انہیں زندہ سلامت رکھے۔ میرے تو سر کا تاج ہیں۔ کم از کم تصور ہی میں سہی۔ خدا نہ کرے بچی۔ تمہیں پتا نہیں' کتنی دعائیں مانگتی ہوں ان کے لئے۔ اللہ کسی نہ کسی دن میری دعا سن ہی لے گا۔" میں بھی افسردہ ہو گئی۔ واقعی آج مجھے ایسی بات منہ سے نہیں کہنی چاہئے تھی۔ نہ سہی ہمارے لئے عید' دن تو عید کا ہی تھا۔ میں نے اور امی نے پورے روزے رکھے تھے اور خوب عبادت کی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ ہماری ہر عبادت میں ابو کے لئے دعائیں ہوتی تھیں لیکن نہ جانے کیوں ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا۔ جب ہماری دعائیں پوری ہوں۔

باورچی خانہ دیکھنا تھا۔ چنانچہ میں چل پڑی امی اندر ہی اندر رہی تھیں۔ انہوں نے منع کر دیا تھا کہ وہ اس وقت کہیں نہیں جا سکتیں لیکن میں جو تھی اور ایک آدمی سے بھی کام چل ہی جاتا ہے۔ چنانچہ میں باورچی خانے میں پہنچ گئی اور اس کے بعد کام میں مصروف ہو گئی۔ کپڑے وہی پہنے ہوئے تھے کسی نے مجھے دیکھا نہیں تھا لیکن بہرحال کسی کے کپڑے تھے بھی نہیں۔ میری امی کے تھے۔ میں نے پہن لئے تھے یہ غور بھی نہیں کیا تھا میں نے کہ ان کپڑوں میں کیسی لگ رہی ہوں۔ پھر کسی کام سے باہر نکلی تھی۔ اندرونی حصے سے بہت سے بچوں کے چیخنے اور پکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مہمان آ گئے تھے۔ حویلی میں کئی کاریں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ باورچی خانے سے نکلی تو سامنے کی گیلری سے ایک صاحب آ رہے تھے۔ سفید شلوار قمیض اور واسکٹ میں ملبوس' بلند و بالا قد' سپید چہرہ' خاصی اچھی شکل و صورت کے مالک تھے۔ میں سادگی سے ان کے قریب سے گزری تو انہوں نے مجھے آواز دی اور کہا۔

"سنئے!" میں رک گئی' میں نے پلٹ کر دیکھا۔

"آپ کون؟"

"جی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو پہلے دیکھا نہیں ہے یہاں۔"

"میں یہیں رہتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"پرانی حویلی میں۔"

"مگر آپ ہیں کون؟"

"میں مدثر صاحب کی بیٹی ہوں۔ آپ جانتے ہیں مدثر صاحب کو؟"

"اوہو' جی ہاں نام سنا ہے' میں نے۔"

"میں انہی کی بیٹی ہوں۔"

"وہ جو کہیں گم ہو گئے ہیں؟"

"جی ہاں وہ میرے ابو ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ' کچھ معلوم ہے آپ کو؟"

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔"

"معاف [illegible] میرا نام [illegible] ہے۔ آپ کے تایا ہیں نا' مشرف حیات

صاحب.........."

"جی ہاں۔"

"اور قدسیہ بیگم آپ کی تائی ہوئیں۔"

"جی!"

"ہم' اصل میں میرے ابو قدسیہ بیگم کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ میں ملک سے باہر تھا ابھی تھوڑے دن ہوئے یہاں آیا ہوں۔ نام تو بتا چکا ہوں ناں اپنا۔ میرا نام عدنان ہے میڈیکل کی تعلیم حاصل کر کے آیا ہوں۔ آپ نے کتنی تعلیم حاصل کی ہے؟"

"میں جاہل ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ارے نہیں' میں واقعی مذاق نہیں کر رہا۔ نام بھی تو نہیں بتایا آپ نے اپنا۔"

"شیرانہ ہے میرا نام۔"

"ویری گڈ' بڑا شیریں نام ہے۔"

"اور کچھ؟" میں نے سوال کیا۔

"جی نہیں' جتنی آپ نے مجھ سے باتیں کرلیں۔ اسی کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"جی!" میں نے قدم آگے بڑھائے تو وہ پھر بولا۔

"سنئے۔"

"جی!" میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"عید مبارک۔" اس بے تکی عید مبارک پر مجھے ہنسی آگئی تھی۔

پھر بھی میں نے کہا۔

"شکریہ! آپ کو بھی عید مبارک۔" اور اس کے بعد میں آگے بڑھ گئی۔ پھر میں اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ گھر کا مہمان تھا۔ قدسیہ تائی کا رشتہ دار ہو گا کوئی' مجھے بھلا کسی سے ملایا جاتا۔ میری آنکھوں میں نہ تو اس کے لئے کوئی خواب ابھرا اور نہ ہی میں نے اس کے بارے میں مزید کچھ سوچا۔ اپنے کام کاج کرتی رہی۔ باورچی خانے میں ملازم بھی لگے ہوئے تھے۔ پھر مہمانوں کے سامنے کھانے پینے کی اشیاء لگائی جانے لگیں باورچی نے مجھ سے کہا۔

"شیرانہ بی بی! یہ سموسے اٹھا کر لے آیئے۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ ان کا مزہ گرم گرم کھانے ہی میں ہے۔" میں نے سموسوں کی ٹرے اٹھائی اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ بڑے ہال کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر تمام اشیاء سجائی جا رہی تھیں۔ پھل' شربت اور نہ جانے کیا کیا۔ میں سموسوں کی ٹرے ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوئی اور پھر سموسے ڈشوں میں رکھنے لگی تو کئی نگاہوں نے میرا جائزہ لیا۔ ان میں دادی اماں بھی تھیں۔ مسرت جہاں تائی بھی تھیں۔ قدسیہ تائی بھی اور بھی کئی خواتین تھیں۔ ایک خاتون نے جب میں ان کے قریب سے گزر رہی تھی میرا دوپٹہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"سنو۔" اور میں رک گئی۔

"تم سلام دعا نہیں کرتیں کسی سے؟"

"جی!" میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ خاتون گول مٹول سی تھیں اور اچھی شکل کی مالک تھیں۔ چہرے سے خوش مزاج بھی نظر آتی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی قدسیہ کی طرف منہ کر کے کہا۔

"قدسیہ یہ کون ہے؟"

"نوکرانی ہے گھر کی.........؟

کیا.........؟" ان خاتون نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' گھر میں نوکری کرتی ہے۔"

"مجھ سے کیوں جھوٹ بول رہی ہو بھئی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ نوکرانی ہے گھر کی۔"

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے......... اے چلو سموسے رکھ لئے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" قدسیہ تائی نے کہا۔ میں نے ایک طنز بھری نگاہ ان پر ڈالی اور پھر وہاں سے واپس پلٹی تو تھوڑے فاصلے پر بیٹھے ہوئے عدنان کی صورت بھی نظر آگئی۔ بہرحال میں وہاں سے باہر نکل آئی۔ نہ مجھے کسی بے عزتی کا احساس تھا نہ یہ کہ اتنے سارے مہمانوں میں میری توہین کی گئی۔ بہرحال نوکرانی تھی۔ تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا اسے بھگت رہی تھی۔ ابو کا خطبہ تھا یا پتا نہیں کس کا کیا تھا۔ مجھے کیا پڑی ہے جو ایسی بے کار باتوں کے بارے میں سوچوں۔ نوکرانی کا لفظ تو کئی بار میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ یہ لوگ اگر مجھے نوکرانی کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ مجھ پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ٹھیک ہے انسان جو ہوتا ہے اسے کہا ہی جاتا ہے۔ ہم بہرطور اس گھر کا نمک کھا رہے تھے۔ کون تھے کیا تھے' یہ تو پرانی بات تھی۔ اب تو باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ چنانچہ

باورچی خانے میں آ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کوئی باورچی خانے کے دروازے سے اندر آ گیا۔ میں نے پھر پلٹ کر دیکھا تو عدنان تھا۔ وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کمال کی بات ہے۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اس کے باوجود آپ بار میرے سامنے آ رہے ہیں۔ فرمایئے کیا کہنا چاہتے آپ؟" وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"انسان کی زندگی میں مشکل لمحات آ جاتے ہیں لیکن انہیں ان لمحات سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ آپ سے اجازت نہیں لی ہے' میں نے پھر بھی ایک پیشکش کر رہا ہوں آپ کو۔"

"ارشاد!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں آپ کو اس مشکل سے نکال لوں گا۔"

"مشکل کا تعین بھی آپ نے کر لیا ہے اور نکالنے کا فیصلہ بھی۔ جایئے پلیز اپنا کیجئے۔ یہاں کے لوگ بہت برے ہیں۔ بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن میرے ساتھ بدسلو ہو جائے گی۔"

"جا رہا ہوں لیکن میرے الفاظ امانت کے طور پر اپنے پاس رکھئے گا۔" اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔ میں نے ساری باتوں کو نظرانداز کر دیا تھا۔ ایسی فضول باتیں سوچنے کے لئے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ بہرحال عید کا دن گزر گیا اور ہنگامے جاری رہے حویلی میں آدھی رات تک مہمان رہے تھے اور کچھ زیادہ ہی کام کرنا پڑا تھا۔ جب سارے مہمان چلے گئے اور خوب رات ہو گئی تو میں واپس پلٹی اور امی کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے اپنے کپڑے اتارے اور پھر امی کو وہ واقعہ سنانے لگی۔ امی نے خوف سے آنکھیں پھاڑ لی تھیں۔

"اللہ رحم کرے۔ یہ تو بہت برا ہوا۔"

"کیوں امی کیا بات ہے؟"

"ارے تجھے معلوم نہیں ریاست جہاں کون ہے۔ شہر سے آئی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قدسیہ بیگم کی خالہ زاد بہن ہیں لیکن بہت بڑے لوگ ہیں۔ عدنان ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے ولایت [illegible]

بنی صوفیہ سے چل رہی ہے۔ غالباً دونوں کے درمیان رشتے کا مسئلہ ہے اور ریاست جہاں اس سلسلے میں کئی بار آ چکی ہیں۔ عدنان کو پہلی بار یہاں لایا گیا ہے۔ ایک طرح سے اسے بردکھاوا سمجھ لو۔ یا عید کی تقریب۔"

"تو اس میں غضب کیا ہو گیا امی!"

"جو کچھ میں سوچ رہی ہوں تو نہیں سوچ پا رہی بے وقوف۔ اللہ نظر نہ لگائے چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔ میرے ذہن میں تو یہ تھا کہ اب وہاں سے کام کاج کر کے واپس آ گئی ہے۔ وہ لوگ مجھے نہیں بلائیں گے۔ اگر اچانک ہی بلاوا نہ آ جاتا تو میں تجھ سے کہتی کہ یہ کپڑے پہن کر نہ جا۔"

"سبحان اللہ! آپ تو قصے کہانیوں والی باتیں کر رہی ہیں امی' یعنی گھر کی ایک مظلوم لڑکی جس کے ساتھ حویلی میں مظالم ہوتے ہیں۔ ہیرو کی نگاہوں میں آ جاتی ہے اور پھر ہیرو ساری دنیا کو ٹھکرا کر اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ گھریلو جھگڑے ہوتے ہیں اور اس کے بعد بالآخر ہیروئن' ہیرو کی ملکیت بن جاتی ہے۔ کچھ گانے وغیرہ ہوتے ہیں۔ ابتدا میں دکھ بھرے بعد میں خوشگوار اور یوں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔"

"خدا کی پناہ یہ ساری باتیں تجھے کہاں سے آ گئیں۔"

"میں نے اندر وی سی آر پر کئی فلمیں دیکھی ہیں۔ یہی سب کچھ ہوتا ہے ان میں۔"

"بہت زیادہ زبان درازی کی کوشش مت کرو۔ بات واقعی الجھن کی ہے۔ اللہ خیر کرے۔" امی نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

امی کا کہنا کافی حد تک درست ہی ثابت ہوا تھا۔ ایک دن اچانک ہی سفید رنگ کی بڑی کار حویلی کے احاطے میں داخل ہوئی اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ آگے بڑھتی ہوئی پرانی حویلی کے پاس پہنچ گئی۔ اس وقت میں اور امی اندر ہی تھے اور ایک کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ کار کو یہاں رکتے دیکھ کر ہم دونوں حیران رہ گئے ایسا کون ہے جو اس کار میں بیٹھ کر ہمارے پاس آیا ہے۔ نیچے اترنے والی ریاست جہاں اور ان کا بیٹا ڈاکٹر عدنان تھے۔ دونوں ہی پرانی حویلی میں آ رہے تھے۔ امی کا چہرہ اتر گیا۔ ان کے منہ سے خوفزدہ آواز نکلی۔

"ہائے اللہ یہ ادھر کیوں آ رہے ہیں۔"

میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ریاست جہاں اندر داخل ہو گئیں۔ عدنان ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ پرانی حویلی تو خاصی عظیم الشان تھی۔ گو ہمارے استعمال میں صرف دو کمرے ہی رہتے تھے اور باقی حویلی ویران پڑی ہوئی تھی لیکن یہ کمرے بھی ذرا اندرونی طور پر تھے۔ بس پیچھے سے ایک ایسی کھڑکی تھی جو باہر کا نظارہ کراتی تھی۔ ریاست جہاں کی آواز ابھری۔

"ارے بھئی کوئی ہے؟" امی اپنی جگہ سے اٹھ گئیں اور بولیں۔

"تم یہیں رہنا جب تک میں آواز نہ دوں نہ آنا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا' امی دروازے سے باہر نکل ہی تھیں کہ ریاست جہاں کمرے کے دروازے سے اندر آ گئیں۔

"ماشاء اللہ جگہ بہت بڑی ہے آپ دونوں ماں بیٹیاں یہاں پر کیسے گزارہ کرتی ہیں؟" وہ بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ امی نے میری طرف دیکھا' میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ عدنان شاید باہر ہی رہ گئے تھے۔ میں دوسرے کمرے میں آ گئی لیکن اس کمرے کی درمیانی کھڑکی میں شیشے نہیں لگے ہوئے تھے البتہ گرل لگی ہوئی تھی اور ایک پردہ بھی پڑا ہوا تھا لیکن اس کھڑکی سے دوسری طرف کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ میں نے امی کی آواز سنی۔

"جی ہاں' میں مدثر حیات کی بیوی ہی ہوں۔"

"میں نے آپ لوگوں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لی ہیں اور معاف کیجئے گا میں محسوس کر رہی ہوں کہ یہاں آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔" امی کی آواز ابھری۔

"خیر ایک صاحب ظرف انسان کو ایسا ہی کہنا چاہئے لیکن معاف کیجئے رحمانہ بیگم دوسروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں اس دن بھی وہ لوگ بے چاری شیرانہ کو ملازمہ بتا رہے تھے' اس سے ان کی نیت کا اندازہ ہوتا ہے حالانکہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ حماقت ہے۔ اصل میں آپ کو پوری تفصیل بتانا چاہتی ہوں لیکن ایک شرط پر۔"

"کیسی شرط؟"

"ہاں شرط۔"

"ساری باتوں کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے' بات اصل میں یہ ہے کہ ان لوگوں سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں' کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن تعلقات بھی رشتے سے کم نہیں ہوتے۔ میں عدنان سے' عدنان میرا بیٹا ہے۔ باہر موجود ہے' میں نے اسے باہر ہی چھوڑ دیا ہے۔ عدنان نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی۔ ہاؤس جاب مکمل کر چکا ہے اور اب ایک کلینک میں کام کر رہا ہے۔ اپنا کلینک بھی کھولنے کا پروگرام ہے لیکن تھوڑے سے تجربے کے بعد۔ میرا یہ اکلوتا بیٹا ہے اور ظاہر ہے ماؤں کا ایک ہی تصور ہوتا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کا گھر آباد کر دیں۔ میں رشتے کے لئے نگاہیں دوڑا رہی تھی' ان لوگوں سے جیسا کہ میں نے بتایا' پرانی شناسائی ہے۔ مشرف حیات کی بیٹی صوفیہ میری نگاہوں میں آئی اور میں نے اس سلسلے میں ان لوگوں سے تھوڑی سی گفتگو کی وہ خوشی سے تیار ہو گئے۔ بات آگے بڑھانے کے لئے ہم لوگ یہاں آئے تھے اس دن لیکن آپ کو پتا ہے رحمانہ بیگم آج کل نوجوان والدین کی پسند سے زیادہ اپنی پسند کا خیال رکھتے ہیں اور آپ کی بیٹی ماشاء اللہ ایسی ہے کہ ایک نگاہ ہی میں کسی کو پسند آ سکتی ہے۔ عدنان میاں کو صوفیہ کے بجائے شیرانہ پسند آئی ہے۔ میں ایک صاف ستھری طبیعت کی مالک ہوں۔ زندگی بچوں کو گزارنی پڑتی ہے چنانچہ میں نے اپنے بیٹے کی پسند کو خلوص دل سے قبول کر لیا ہے اور اس سے وعدہ کیا کہ آخری حد تک کوشش کروں کہ رحمانہ بیگم کو اس رشتے پر آمادہ کر لوں۔ تو معاف کیجئے گا آج میں اس خیال کے تحت یہاں آئی ہوں۔ رحمانہ بیگم' جب عدنان میاں نے شیرانہ کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو میں نے اپنے ذرائع سے کام لے کر آپ لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کروائیں اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔ خیر اس قسم کی داستانیں تو عام ہوتی ہیں۔ لوگ کسی کی حق تلفی اور کسی کو نقصان پہنچانے سے نہیں چوکتے۔ ان دونوں بھائیوں نے سوتیلے بھائی کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ مجھے یہ بھی علم ہوا ہے رحمانہ بیگم کہ مدثر حیات بہت عرصے قبل گھر سے غائب ہو چکے ہیں۔ آپ لوگوں کے دکھ کا مجھے اندازہ ہے۔ میں آپ کا دکھ پورے کا پورا تو نہیں بانٹ سکتی لیکن ایک جوان لڑکی کے ساتھ وہ سلوک جو اس کوٹھی میں ہو رہا ہے۔ یہ لوگ آپ کی بیٹی کا مستقبل تباہ کر دیں گے۔ میں آپ کو سہارا دینا چاہتی ہوں اور سوچ سمجھ کر یہاں آئی ہوں۔ دیکھئے بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اس کی عنایت ہے۔ میں جانتی ہوں آپ جن حالات میں یہاں گزر بسر

دیجئے۔ عزت و احترام کے ساتھ گھر لے جاؤں گی۔ خاندان والی ہوں' کبھی ایسا نہیں کروں گی کہ آپ کو کوئی طعنہ دوں۔ آپ چھوڑیئے ان تمام چکروں کو۔ آپ کو داماد مل جائے گا۔ مل جل کر مدثر بھائی کی تلاش کریں گے۔ یہ ساری باتیں میں خلوص دل سے کہہ رہی ہوں۔ آپ خود سمجھتی ہوں گی کہ اس میں کوئی لالچ نہیں ہے۔ صرف بیٹے کی پسند کا معاملہ ہے۔"

میں سکتے رہ گئی تھی۔ عدنان اچھی شکل و صورت کا انسان تھا لیکن میرے دل میں اس کے لئے ایسا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا اور اس گفتگو کے بعد بھی میں نے اس کے بارے میں ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ میں تو بس اس بات پر غور کر رہی تھی کہ رشتہ صوفیہ کے لئے تھا اور ریاست جہاں یہاں آ گئیں۔ یہ بات بہرحال ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گی اور جب ان لوگوں کو معلوم ہو جائے گی تو ہمارے ساتھ یہاں کیا سلوک ہو گا؟ اس کا اب مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس قدر چھوٹی تو نہیں تھی۔ امی پریشانی کا شکار ہو گئی تھیں۔ جب سوچنے سمجھنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"دیکھئے' یہ میرے لئے اتنی خوشگوار باتیں ہیں کہ میرا دل خوشی سے بند ہو جائے لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہ سب کچھ آپ نے جس انداز میں سوچ لیا ہے' اتنا آسان نہیں ہے۔ جب یہ بات ان لوگوں کے کانوں تک پہنچے گی تو ہمارے لئے یہاں ایک لمحہ گزارنا بھی مشکل ہو جائے گا۔"

"میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ آپ اگر چاہیں تو میں یہاں سے کسی اور جگہ رہائش کا بندوبست کر سکتی ہوں۔ اس مشکل سے نکل جائیے۔ یہاں آپ کے لئے خطرات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔"

رحمانہ بیگم نے افسوس بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا پھر بولیں۔

"ریاست جہاں صاحبہ! خدانخواستہ مجھے ان کی موت کی خبر نہیں ملی ہے۔ آپ خود سوچئے' کیا میں یہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہوں؟ کل اگر وہ واپس آ گئے تو مجھ سے پوچھیں گے کہ میں نے ان سے ان کا یہ حق کیوں چھین لیا تو میرے پاس کوئی جواب ہو گا۔"

"جذباتی طور پر انسان سب کچھ سوچ سکتا ہے لیکن حقیقتوں کا سامنا کرنا چاہئے۔ آپ بتایئے' آپ کا شوہر کہاں ہے اور آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ کتنے عرصے میں واپس آ جائیں گے۔ کیا آپ اس وقت کا انتظار کر رہی ہیں جب آپ اور آپ کی بچی جوانی کے

کے ساتھ ایک گھر تک پہنچانے کا کام اگر آپ ان کے بغیر بھی کر دیں گی تو یہ غیر مناسب نہیں ہو گا۔"

"میں کیا کروں' میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"آپ فیصلہ کر لیجئے۔ اب ایسی بھی ہتھیلی پر سرسوں نہیں جماؤں گی۔ آپ غور کر لیجئے' خوب اچھی طرح غور کر لیجئے۔ میں آپ سے تین چار دن کے بعد جواب مانگ لوں گی اور سنئے' ان لوگوں سے بالکل نہ ڈریئے۔ کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے' یہ آپ کا۔ یہ سب کچھ تو آپ کا قانونی حق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی سازشوں سے مدثر بھائی کا حصہ ضبط کر جائیں۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے' ان تمام چیزوں کی۔ میں نے تو آپ سے کہہ دیا ہے کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں اس کا وہی مقصد ہے۔ سمجھ رہی ہیں ناں آپ!"

"جی!"

"تو پھر کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"سوچنے کا موقع تو دیں گی ناں .... مجھے؟"

"ضرور' اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ریاست جہاں نے کہا۔

"آپ مجھے سوچنے کا موقع دیجئے' کم از کم تین دن۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تین دن کے بعد پھر آؤں گی۔"

"بیٹھئے' چائے تیار کرا دوں۔"

"ہاں چائے ضرور پیوں گی' اگر آپ اجازت دیں تو عدنان کو اندر بلا لوں۔"

"ارے ہاں' کیوں نہیں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" امی نے کہا اور اس کے بعد عدنان بھی کمرے میں آ گئے۔ امی باہر نکل آئی تھیں۔ باہر نکل کر مجھے آوازیں دیں اور میں بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔

"چائے بناؤ اور وہ بسکٹ جو رکھے ہوئے ہیں' وہ ایک پلیٹ میں رکھ کر لے آنا۔ ہم اپنی اوقات بھر ان کی خاطر مدارات کر سکتے ہیں۔"

میں نے گردن ہلائی اور باورچی خانے کی طرف چل پڑی۔ چائے میں خود ہی لے کر گئی تھی۔ ریاست جہاں نے بڑے پیار سے مجھے اپنے پاس بٹھایا تھا۔ باتیں کرتی رہیں پھر چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ عدنان نے اس دوران نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا لیکن ان کے انداز میں ایک خوشگوار کیفیت پائی جاتی

ایک کھڑکی سے ان کا جائزہ لینے لگے۔ امی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے کار حویلی میں داخل ہوئی ہے اور ریاست جہاں وہاں جانے کے بجائے ہمارے پاس آئی ہیں۔ وہ لوگ بے وقوف نہیں ہیں جو صورت حال کو نہ سمجھ سکیں شامت ہی آجائے گی' شیرانہ!"

"مگر ہمارا کیا قصور ہے امی!"

"قصور وار کب سزا پاتے ہیں۔ سزا تو بے قصوروں کو ہی ملتی ہے۔"

"یہ لوگ وہاں جا کر بھی یہی باتیں کریں گے۔"

"پتا نہیں۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہے امی!"

"کیا مطلب؟"

"ابو کے بغیر آپ جواب نہ دیجئے کسی کو۔" میں نے کہا اور امی مجھے حیرت سے دیکھنے لگیں۔

"تو تم نے ان کی باتیں سن لی ہیں۔"

"جی ہاں' دوسرے کمرے میں تھی۔ درمیان کی کھڑکی سے ان کی باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔"

"وہ بہت پیارا لڑکا ہے۔ ڈاکٹر ہے' خوبصورت ہے۔ مجھے تو بے حد پسند آیا لیکن لیکن.........."

"میں ایک بات آپ سے کہے دیتی ہوں' جب تک میرے ابو نہیں مل جائیں گے۔ میں ایسی کسی بات کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ امی! آپ خود غور کیجئے۔ ہم ابو سے ان کا حق چھین لیں گے۔" امی نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن ان کی آنکھوں سے یہ اظہار ہوتا تھا جیسے انہیں یقین نہ ہو کہ ابو آئیں گے۔ میں نے اس احساس کو محسوس کیا تھا لیکن خود کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ البتہ اس بات کو میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ریاست جہاں ایک گہری خاتون ہیں۔ وہاں ان لوگوں سے ملاقات تو کریں گی وہ اور اپنا مقصد بھی انہیں بتا دیں گی۔ وہ تو اپنے طور پر سب کچھ کر لیں گی لیکن ہمارے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ بہت برا ہوگا۔ بہرحال ہم وہ سب کچھ بھگتنے کے لئے تیار ہو گئے تھے اور وقت گزرتا رہا۔ پہلا دن' دوسرا دن' تیسرا دن۔ اُدھر سے کوئی تحریک نہیں ہوئی تو امی نے کہا۔

ہو سکتا ہے انہوں نے خوش اسلوبی سے کوئی بہانہ بنا دیا ہو۔ ویسے وہاں حویلی میں تمہارے ساتھ کوئی تبدیلی تو نہیں آئی۔"

"نہیں امی! مجھے کوئی اندازہ نہیں ہوا۔"

"وہ پھر آئیں گی۔ میری سمجھ نہیں آتا کیا جواب دوں گی۔"

"آپ کے پاس جواب موجود ہے۔ آپ ان سے کھل کر کہہ دیجئے کہ جب تک ہمارے ابو نہیں واپس آجاتے' ہمیں ان کا کوئی پتا نہیں چل جاتا' ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے۔"

اور یہی ہوا' ریاست جہاں آئیں' عدنان ساتھ تھے' سیدھی ہماری طرف پہنچیں' امی سے ملاقات کی۔ امی نے پہلے کی نسبت ذرا پرتپاک انداز میں ان کا استقبال کیا اور ریاست جہاں خوش ہو گئیں۔

"بہن! میرے دل کو لگی ہوئی ہے۔ میں بس جواب چاہتی ہوں' آپ کل۔ ادھر عدنان ہیں کہ کیا بتاؤں پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ امی وہ لوگ بڑے تنہا اور بے سہارا ہیں۔ انہیں ہماری فوری مدد کی ضرورت ہے۔ اصل میں ہم فوری طور پر مدثر حیات کی تلاش کا کام شروع کر سکتے ہیں لیکن دیکھئے نا ہمیں کوئی سہارا تو مل جائے۔ کم از کم ہم یہ تو کہہ سکیں کہ ہم کس لئے یہ کام کر رہے ہیں۔" امی پہلے سے جواب سوچ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

"ریاست جہاں بیگم! آپ یقین کیجئے۔ آپ لوگوں کے لئے میرے دل میں بڑی عزت' بڑا احترام ہے۔ میں خلوص دل سے یہ چاہتی ہوں کہ یہ رشتہ طے ہو جائے۔ عدنان بہت پیارا بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے زندگی کی ہر خوشی نصیب کرے۔ لیکن آپ صرف ایک بات سوچئے۔ ہم یہاں جس انداز میں زندگی گزار رہے ہیں' وہ ہمارے لئے بڑا ہی خوفناک ہے۔ ہم تو ویسے ہی ان کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہیں۔ اب اگر ہم نے یہ قدم بھی اٹھا لیا تو ہم پر کیا کیا تہمتیں نہ لگ جائیں گی۔ بچیاں جب اپنے گھروں کو بھیجی جاتی ہیں تو ان کے لئے ماں باپ کی طرف سے سب سے بڑا جہیز عزت و آبرو ہی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی زبان کے آگے لگام نہیں ہے۔ نہ جانے کیا کیا کہانیاں گھڑیں گے اور آپ کو بھی وہ کہانیاں پسند نہیں آئیں گی۔"

"ہوں' میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔ میں نے تو اس دن بھی صاف صاف کہہ دیا تھا

دوسروں سے متعارف کرواتے ہو لیکن حقیقت کہیں چھپ سکتی ہے۔"

"آپ نے انہیں جتا دیا تھا۔"

"تو' کوئی چوری تو نہیں کر رہی تھی اور صوفیہ کا مسئلہ ابھی ذہنوں ہی میں تھا۔ اشاروں میں باتیں ہوئی تھیں۔ ہم لوگ صحیح طریقے سے اسے دیکھنے آئے تھے۔ اب عدنان کا مزاج بدل گیا تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"برا تو مانا ہو گا ان لوگوں نے۔"

"مانا ہو گا تو دل میں مانا ہو گا۔ بھئی کوئی قرض تو دینا نہیں تھا' ہمیں ان کا۔ یہ ہماری مرضی ہے۔"

"تو میں آپ سے یہی عرض کرنا چاہتی تھی کہ مجھے تھوڑا سا وقت اور دیجئے۔"

"آخر کیوں؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ اس تھوڑے سے وقت میں آپ کے شوہر واپس آ جائیں گے۔"

"مجھے تو ہر لمحہ کا یقین ہے۔ آپ شاید میری بات کو سچ نہ سمجھیں گے۔ مجھے تو آہٹ اپنے شوہر کی آہٹ محسوس ہوتی ہے۔ رات کو اکثر مجھے سائے چلتے محسوس ہوتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ شاید مدثر واپس آ گئے ہیں۔"

"افسوس! لوگ بے سہارا عورتوں پر کیسا وقت ڈال دیتے ہیں لیکن میرا تو یہی خیال ہے' رحمانہ بیگم کہ آپ کم از کم ایک طرف سے تو فارغ ہو جائیں۔ شوہر سے آپ یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ آپ کیا کر سکتی تھیں؟ جس بے بسی کے عالم میں اور جن لوگوں کے درمیان گزارہ کر رہی تھیں' ان کے سامنے یہ احساس ہوتا تھا کہ کہیں بچی کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے اسے ٹھکانے لگا دیا اور پھر ہم لوگ بھی پوری پوری کوشش کریں گے' بلکہ آپ کو بتاؤں کہ عدنان نے تو کوشش شروع بھی کر دی ہے۔ وہ خاصی تفصیلات جمع کر رہے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں لیکن آپ یقین کیجئے میرا دل ڈرتا ہے۔"

"میں مانتی ہوں۔ اچھا آپ یوں کریں کہ دس پندرہ دن اور لگا لیں۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ کیوں الجھی ہوئی ہیں لیکن میری مانیں تو میری طرف سے یہ پیشکش ہے کہ آپ اپنی ہر مشکل ہمیں دے دیں۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔"

کروں گی۔"

"اب ان لوگوں سے اگر بات کریں گی تو آپ کو اندازہ ہے کہ تنگ دل لوگ ہیں۔ میں ان کی برائی نہیں کر رہی۔ ظاہر ہے ان ہی کے ذریعے آپ لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے لیکن انسان اندازے تو لگا لیتا ہے۔ وہ تنگ نظر لوگ کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ آپ کی بچی کسی اچھے گھر میں چلی جائے لیکن اگر پھر بھی آپ چاہیں تو ان سے تذکرہ کر دیں۔ دیکھیں تو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں وہ کیا جواب دیں گے۔" رحمانہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"دیکھئے' آپ دنیا سے جس قدر ڈریں گی' دنیا اتنا ہی آپ کو ڈراتی رہے گی۔ ہمت سے کام لیں گی تو دنیا آپ کو تسلیم کرے گی۔ ورنہ کون کسی کو تسلیم کرتا ہے۔ سب ایک دوسرے کو کھا جانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ رحمانہ بیگم خدا کے لئے میری مان لیجئے۔ آپ کو فیصلہ کرنا پڑے گا اور فیصلہ صرف آپ ہی کریں گی۔ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ خیر میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ صرف سمجھا رہی ہوں اور جو کچھ سمجھا رہی ہوں آپ یقین کریں آپ ہی کے حق میں بہتر ہے۔"

"میں جانتی ہوں' یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"تو بس اس سلسلے میں زیادہ الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ بسم اللہ کر کے اللہ کا نام لے کر ان لوگوں کے سامنے تذکرہ کر دیجئے اور یہ تو دیکھئے کم از کم۔"

"میں کوشش کروں گی۔"

"میں پھر آؤں گی آپ کے پاس بلکہ آتی رہوں گی۔ اب تو آپ کی خبرگیری بھی مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہے ناں!"

"آپ آیئے' ضرور آیئے لیکن ایک بات کا خدارا خیال رکھئے گا۔"

"ہاں' ہاں کہیں' دل کھول کر کہیں۔"

"ان کی طرف سے اگر کوئی آپ سے بدتمیزی کرے تو اس میں میرا قصور نہیں ہو گا۔"

"ارے مجال ہے ان کی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ لوگ بدتمیزی کریں تاکہ میں بھی زبان کھولوں۔ کم نہیں ہوں کسی سے۔"

کافی دیر تک ریاست جہاں بیٹھی رہیں۔ آج وہ نئی حویلی کی طرف گئی بھی نہیں

بڑی بات یہ تھی کہ آخر حویلی میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اتنی بڑی بات ہو گئی تھی ا
ہم سے کچھ بھی نہ کہا گیا تھا۔ ریاست جہاں کے بارے میں پوچھا بھی نہیں گیا تھا۔ بہرحا
تقدیر کے سہارے پر خاموش ہو گئے تھے لیکن امی نے مجھ سے کہا۔

"دیکھو شیرانہ! ریاست جہاں کی بات کسی حد تک درست ہے۔ مدثر نے ہمیں کو
سا سکھ دیا ہے۔ میں ایک شریف زادی ہوں۔ میں نے کبھی زبان نہیں کھولی لیکن میر۔
دل میں یہ سوال تو ہے کہ آخر مدثر حیات ہمیں یہاں کیوں لائے تھے۔ انہوں نے ا۔
بھائیوں کے بارے میں اندازہ کیوں نہیں لگایا تھا اور پھر یہ اندازہ لگا بھی لیا تھا تو اتنا
کرتے کہ ہماری خبرگیری کرتے۔ ہم نے تو ان کے ساتھ کوئی برا سلوک کبھی نہیں کیا؛
لیکن انہوں نے ہمارے بارے میں نہیں سوچا اور بالآخر ہمیں اس جہنم میں جھونک کر
جانے کہاں چلے گئے۔ میرا نہیں تو انہیں کم از کم تمہارا ہی خیال کرنا چاہئے تھا۔"

"امی! ابو بعد میں تو بہت ٹھیک ہو گئے تھے۔" میں نے حسرت بھری آواز میں کہا۔

"خاک ٹھیک ہو گئے تھے۔ ایک گھر ہوتا ہے' وہاں جو کوئی ہوتا ہے ان کا ایک
دوسرے سے رشتہ ہوتا ہے۔ وہ کم از کم بتاتے تو سہی کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں' کس سے
خوفزدہ ہیں' کیا وجہ ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم ہم حقیقت جان کر ان کو اس جگہ تلاش
کر سکتے تھے لیکن ہمیشہ کی طرح ہمیں صرف جانور سمجھا اور اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ
ہم سب صلاح و مشورہ کر لیتے یا ہمیں وہ مقام دے دیتے جو حقیقتاً ہمارا مقام ہے۔ بہت
ظلم کیا ہے' مدثر! تم نے ہم پر بہت ظلم کیا ہے۔"

"خیر امی! اب ان باتوں کو چھوڑیئے۔"

"میں تو چھوڑ دیتی ہوں بیٹی! لیکن تم خود بتاؤ کہ ایک اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے' ہماری
تقدیر کھل رہی ہے اور ہم صرف اس لئے خاموش رہ جائیں کہ مدثر موجود نہیں ہیں۔"

"امی! صرف ابو کی بات نہیں۔"

"پھر بھی دیکھو میں ان سے مشورہ کرتی ہوں' بات تو کرتی ہوں' دیکھتی تو ہوں کہ کیا
جواب دیتے ہیں۔"

"کن سے؟"

"ارے انہی لوگوں سے' تمہاری دادی اماں سے۔"

"جو جواب دیں گے وہ لوگ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی معلوم ہے۔ جو

جانتی تھیں کہ میں جو کہہ رہی ہوں' سچ کہہ رہی ہوں۔ ان لوگوں سے اس کی توقع کی جا
سکتی تھی۔ غرض یہ کہ ہم ایک بار پھر خوفزدہ انداز میں آنے والے وقت کا انتظار کرتے
رہے اور یہ سوچتے رہے کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے؟ آج تو ریاست جہاں بیگم ان لوگوں کی
طرف گئی بھی نہیں تھیں۔ حویلی کو وہ اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ پرانی حویلی میں صرف ہم
لوگوں کو اس لئے رہنے دیا گیا تھا کہ مدثر حیات کا نام بہرحال حیات علی صاحب کے نام سے
وابستہ تھا۔ کچھ دنیاداری بھی تھی اور کچھ اور احساسات بھی تھے لیکن اگر وہ تشدد پر آمادہ
ہو بھی جائیں تو یہی بات ہے کہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ بہرحال دو دن پھر گزر
گئے۔ تیسرا دن تھا' میں نے معمول کے مطابق کام کاج نمٹا لئے تھے۔ شام کے تقریباً
ساڑھے چار بج رہے تھے کہ مشرف تایا ہماری طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ چہرے پر
عجیب سے تاثرات تھے۔ امی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا خیر کرے' مشرف ادھر آ رہے ہیں۔" تھوڑی دیر میں مشرف تایا ہمارے پاس
پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمدردی سے میرے سر پر ہاتھ رکھا پھر امی کی طرف دیکھ کر بولے۔

"رحانہ! تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ حقیقتوں کا سامنا خندہ
پیشانی سے کرنا چاہئے۔ اس لئے میں تنہائی میں یہ بات نہیں کر رہا۔"

"خدا خیر کرے بھائی صاحب! خیر کی بات تو ہے۔"

"بس ہے' تم اسے خیر کی خبر نہیں کہہ سکتے لیکن خدا نخواستہ کوئی حادثہ بھی نہیں
ہے۔"

"کیا ہوا' آپ کو اللہ کا واسطہ کچھ بتائیں تو سہی۔"

"دراصل میں مدثر کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے۔"

"کیا؟" امی کی سانس گھٹنے لگی۔ میں بھی سکتے کے عالم میں رہ گئی تھی۔ میری نگاہیں
مشرف تایا کی طرف اٹھی تھیں۔

"بتایئے بھائی صاحب! کیا پتا چلا ہے۔"

"جیل میں بند ہیں۔ ساڑھے چار سال کی سزا ہوئی ہے۔"

"جیل میں!"

"ہاں۔"

"مگر کیوں؟"

"ہمیں ان سے ملا دیجئے بھائی صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا کی تمام خوشیاں نصیب کرے گا۔ کیا جیل ان سے ملاقات نہیں کی جا سکتی؟"

"کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اصل بات تو ان کا پتا چلنا تھا۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں۔ اب خدا کے فضل و کرم سے کم از کم ان کی زندگی کی خبر تو مل گئی ہے۔ د. رحمانہ! بات اصل میں یہ ہے کہ وہ ہمارا سوتیلا بھائی ہے۔ تمہیں اس کی زندگی میں شا ہوئے اچھا خاصا وقت گزر گیا ہے لیکن اس سے پہلے کے حالات تمہیں نہیں معلو انسان کچھ بھی ہو' غیر اپنے ہو جاتے ہیں اور کوئی غیریت نہیں رہتی لیکن مدثر کا ر شروع ہی سے ہم لوگوں کے ساتھ ایسا تھا جیسے وہ ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ ہم اس کے سو بھائی ہیں' اور پھر مزید یہ کہ حیات علی صاحب بھی اسے شہہ دیا کرتے تھے۔ ہم بچپن میں یہ محسوس کرنے لگے تھے۔ کیونکہ مدثر ان کی نئی بیگم کا بیٹا ہے۔ اس لئے وہ ہم فوقیت رکھتا ہے۔ اماں بھی سوکن کے خیال سے جلتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا ماحو بن گیا جس میں نفرتوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ یہ نفرتیں کتنا سفر کرتی ہیں' اس کا اندازہ ا تمہیں بھی ہو گیا ہو گا۔ بزرگوں کی غلطی کبھی کبھی اولاد کے لئے اس قدر خوفناک ہو ج ہے کہ بزرگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ خیر ساری باتیں اپنی جگہ' میں تمہیں بتا چکا ہوں نفرت کا یہ طوفان کیوں بلند ہوا لیکن بہرحال انسان' انسان ہی ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں یہاں اگر میں خود چاہوں بھی تو تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر سکتا۔ مقدس بھ ہیں' اماں جی ہیں' ہم ان کی مخالفت مول نہیں لے سکتے لیکن میں تمہیں مشورہ دیتا ہو کہ مدثر سے ملاقات کرو۔ اسے بتاؤ کہ اس کی بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ کس طرح زند گزار رہی ہے۔ میں تمہاری اتنی مدد ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس سے ملا دوں یہ کوشش کروں گا کہ اس کی سزا ختم نہیں تو تھوڑی بہت کم ہی ہو جائے۔ اسے سمجھ رحمانہ! اسے اس کی بیٹی کی صورت دکھاؤ۔ اس کی ذمہ داریاں بتاؤ۔ اس سے کہو کہ جیا سے چھوٹنے کے بعد وہ اپنی تمام بری عادتیں ترک کر دے۔ ہم سب بھی اتنے برے نہیں ہیں کہ کسی انسان کو گردن دبا کر مار ڈالیں۔"

امی' مشرف تایا کے پیروں میں جھک گئیں۔ انہوں نے ان کے پاؤں پکڑ لئے او گڑگڑاتی ہوئی بولیں۔

"خدا کے لئے' خدا کے لئے مجھے ایک بار ان سے ملوا دیجئے۔"

بھی نہیں بتایا کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے۔ اصل میں میرے کچھ شناسا ایک مقدمے میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو سزا ہو گئی۔ وہ لوگ جیل میں ان سے ملنے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے مدثر کو دیکھا اور اس سے بات چیت کی تو یہ ساری بات پتا چلی لیکن اس نے اب بھی ان سے یہی کہا ہے کہ ہمیں اس کے بارے میں نہیں بتایا جائے۔"

"ان کی سوچ میں دیوانگی ہے۔ وہ کبھی صحیح بات سوچ ہی نہیں سکے۔ آپ مجھے ان سے ملا دیجئے۔ خدارا! آپ مجھے ان سے ملا دیجئے۔"

"احتیاط کے ساتھ تیار ہو جانا۔ میں کوئی بہانہ کر دیتا ہوں گھر میں۔ رات کو دس بجے یہاں سے نکلیں گے۔ تم دونوں ماں بیٹی خاموشی کے ساتھ حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر چوراہے پر پہنچ جانا' وہاں سے میں تمہیں اپنی کار میں بٹھا لوں گا اور خاموشی سے لے جاؤں گا اور سنو' واپس آنے کے بعد یہ بالکل نہ بتانا کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے۔ اس مسئلے کو ذرا سنجیدگی سے دیکھتے ہیں۔ اماں بی وغیرہ کو پتا نہیں چلنا چاہئے۔ ورنہ وہ راستے میں روڑے اٹکائیں گی۔"

"میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی مشرف بھائی!"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے ہوشیاری سے وہی کچھ کرنا۔ تم بھی تیار ہو جانا شیرانہ بیٹی۔" میں نے خوشی سے گردن ہلا دی تھی۔ جب وہ چلے گئے تو امی زار و قطار رونے لگیں۔ میں خود بھی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کم از کم ہمیں ابو کی زندگی کی اطلاع تو ملی تھی۔ ہم تو مایوس ہی ہو گئے تھے اور کبھی کبھی ہم اپنے طور پر یہ سوچتے لگتے تھے کہ ابو شاید اس دنیا میں ہی نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو کبھی نہ کبھی ہم سے ملاقات ضرور کرتے۔ کبھی تو ہم انہیں یاد آتے۔ امی یہ کہتی تھیں کہ وہ یقیناً کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دل کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ ابو ہمارا ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جا چکے ہیں اور آج دل کی یہ بند کلی کھل گئی تھی۔ میں امی کو سمجھانے لگی اور بمشکل تمام انہیں چپ کرایا۔ وہ شکرانے کے نفل پڑھنے بیٹھ گئی تھیں۔ میں بھی خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ لمحہ لمحہ انتظار وحشت بن کر گزر رہا تھا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ان خوشیوں کو کیسے دبایا جائے۔ حالانکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک دلدوز تصور بھی تھا کہ ابو جیل میں ہیں اور انہیں ساڑھے چار سال کی سزا ہوئی ہے۔ مگر یہ سزا نہیں اب ہوئی۔ طویل عرصہ تو گزر چکا ہے۔ کیا یہ تازہ ترین سزا ہے یا پھر اس بات کے

معلوم تھیں۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا' تھوڑا بہت تعلق تو تھا ان سے اور پھر انسان کے د میں انسانیت جاگتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ حالانکہ تجزیہ یہ ہے کہ انسانیت سو بہت جلد جاتی ہے۔ اس کا جاگنا ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے لیکن بہرحال اللہ کا وجود ہے۔ وہ جانے کس کس کو کیسے کیسے کاموں پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

ہم لوگ وقت کا انتظار کرتے رہے۔ بہت سے خیالات دل میں جاگزیں تھے ا ہماری سوچیں نہ جانے کیسے کیسے رنگ اختیار کر رہی تھیں۔ پھر تیاریاں مکمل کر لیں۔ خ خدا کر کے وہ وقت آیا تھا جس کا حکم تایا ابو نے دیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹی چوروں کی طر پرانی حویلی سے نکلے۔ حویلی کے عقبی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ہم نے ہر طرح ۔ خیال رکھا تھا۔ مشرف تایا کی مشکل بھی ہمارے ذہن میں تھی۔ سب ہی بلاوجہ ہمار۔ دشمن بنے ہوئے تھے۔ کوئی ہمارے ساتھ ہمدردی بھی کرتا تو اسے چوروں کی طر ہمارے ساتھ ہمدردی کرنی پڑتی تھی۔ بہرحال چھپتے چھپاتے ہم دونوں ماں بیٹی چوراہے ت پہنچے اور پھر زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کار کی روشنیاں نظر آئیں مشرف تایا نے کار ہمارے پاس روک دی۔

"پیچھے بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے کہا۔ وہ خود کار ڈرائیو کر رہے تھے۔ ہمارے اندر بیٹھ کے بعد انہوں نے کار آگے بڑھا دی اور ہم عجیب سے انداز میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہے۔ ابو کا چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اچانک ہی ہم جیل میں ان سے ملاقات کر۔ پہنچیں گے۔ ان پر کیا بیتے گی۔ ہمیں دیکھ کر شرمندہ تو ہوں گے۔ ویسے ان آخری دنو میں جب ابو ایک مہینے تک تہہ خانے میں چھپے رہے تھے' ابو کے انداز میں بڑی تبد دیکھی تھی' ہم نے۔ پتا نہیں بے چارے کیسی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ انسان غلطیو کا پتلا ہے' غلطیاں کرتا ہے' ان کی سزا پاتا ہے۔ ابو نے اپنی غلطیوں کی' اپنی برائیو کافی سزا کاٹ لی تھی۔ ہو سکتا ہے اب ہمارے اچھے دن قریب ہوں۔ میں تو اپنے دل : کسی حسین تصور کو جگہ ہی نہیں دے سکتی تھی۔ جس سے خود میری اپنی زندگی کا تع ہو۔ یعنی امی نے اگر عدنان کے بارے میں سوچا ہو تو بے شک سوچا ہو لیکن میں نے یا نہیں سوچا تھا۔ بھلا ہم جیسے لوگوں کی زندگی میں بھی یہ خوشیاں داخل ہوتی ہیں۔ یہ تو ق کہانیوں کی باتیں ہیں۔ پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ عدنان کیسے بھی ہیں' خوش شکل ہوں۔

میں کسی شے کی ضرورت نہیں تھی۔

سفر جاری رہا۔ نہ جانے ہمیں کہاں جانا تھا لیکن بہرحال مشرف تایا ساتھ تھے۔ اس لئے خوف کی کوئی بات نہیں تھی۔ پکی سڑک ختم ہو گئی اور کار کچے راستوں پر دوڑنے لگی۔ ان راستوں پر دوڑنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ ان کے علاوہ گرد بھی اڑ رہی تھی جس کی وجہ سے قرب و جوار کا ماحول نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہم صبر و سکون سے خاموش بیٹھے رہے تھے۔ آخر شہر جانا ہے' نہ جانے کون سی جیل میں ابو کو بند کیا گیا ہے۔ یہ بات نہ امی کو اور نہ مجھے مشرف تایا سے پوچھنے کی ہمت ہوئی۔ یہاں تک کہ تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے کا سفر گزر گیا۔ ابتدا میں تو کار کی رفتار کافی تیز رہی تھی لیکن اب بھی کم نہیں تھی۔ مشرف تایا دیوانگی کے عالم میں کار چلا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک عجیب سا ہولناک سا علاقہ آ گیا۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وقت بھی چونکہ خاصا گزر چکا تھا اس لئے ماحول بالکل سنسان تھا۔ ہم تو خیر جانتے ہی نہیں تھے کہ کون سی جگہ کہاں سے گزرتی ہے اور کہاں پر ختم ہوتی ہے لیکن تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد مشرف تایا نے کار روک دی اور پھر خود دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے۔ انہوں نے کار کا بونٹ اٹھایا اور جھک کر اسے دیکھنے لگے۔ کافی دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر کار کی ڈگی میں سے پانی کا برتن نکالا۔ کار کا انجن دوبارہ سٹارٹ کیا اور کھلے ہوئے بونٹ سے شاید پانی کار کے کسی حصے میں ڈالنے لگے۔ مجھے اس بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے بونٹ بند کر دیا پھر ڈبہ واپس ڈگی میں رکھا اور ڈگی بند کر کے ہمارے سامنے آ گئے۔

"نیچے اتر آؤ تم دونوں۔" انہوں نے کہا۔

"کیا کار خراب ہو گئی ہے بھائی صاحب!" امی نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو' نیچے اتر آؤ۔" ان کا لہجہ ایک دم بدلا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ اچانک احساس ہوا تھا کہ مشرف تایا کے لہجے میں ہمدردی یا انسانیت نہیں ہے' بلکہ ایک عجیب سی سفاکی ہے۔ بہرحال میں اپنے آپ کو بہت زیادہ بقراط نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ میں اور امی خاموشی سے نیچے اتر آئے۔

"اس طرف چلو۔" انہوں نے ایک چٹان کی جانب اشارہ کیا۔ راستے میں جھاڑیاں

"دیکھو' میرے ہاتھ میں یہ پستول ہے اور اس میں چھ گولیاں ہیں۔ تم دونوں کے جسموں میں اگر ایک ایک گولی مار دوں تو صرف دو کارتوس خرچ ہوں گے۔ سمجھ رہی ہو تم۔" امی اور میں تھر تھر کانپنے لگے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مشرف تایا نے شاید کوئی بڑا ہی کھیل 'کھیلا ہے۔ بہت سے وسوسے ذہن میں ابھر آئے۔ امی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں بھائی صاحب!"

"سمجھی نہیں ہو تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم لوگوں کے دماغ زیادہ بلندیوں پر پہنچ گئے تھے ہاں۔ تمہیں معلوم ہے کہ صوفیہ میری بیٹی ہے۔"

"جی!"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں معلوم ہے کہ صوفیہ میری بیٹی ہے۔"

"جی.......... جی بھائی صاحب مگر.........."

"اور تم نے اس کے حق پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی۔"

"جی..........!" امی نے حیرانی کے عالم میں کہا۔

"دیکھو رحانہ! میں واقعی دوسرے لوگوں سے منفرد ہوں۔ رحم ہے میرے دل میں اور پھر میں نے کبھی زندگی میں کوئی انسانی جان لینے کی کوشش نہیں کی۔ اس عمر میں بھی نہیں چاہتا لیکن تم ماں بیٹی جو چکر چلا رہی ہو وہ معاف کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ریاست جہاں نے اپنے بیٹے مدثر کے لئے صوفیہ کا انتخاب کیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ کیا ضرورت تھی ان لوگوں کے سامنے آنے کی۔ بیٹی کی شکل و صورت پر بڑا ناز ہے تمہیں۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دوں۔ تھوڑے پیسے کسی غنڈے کو دے کر یہ کام میرے لئے مشکل نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے انسانیت سے کام لیا اور اپنے آپ کو سمجھایا۔ رحانہ خاتون! تمہیں پوری طرح اندازہ ہے کہ حویلی میں تمہاری حیثیت ایک ناسور کی سی ہے تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ مدثر ایک بدکار آدمی تھا۔ تمہیں علم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے ابو پر اتنی بدنامیوں کے داغ لگے۔ ان کی ماں ہی کیا کم تھی کہ بیٹا اس سے بھی زیادہ آگے نکل گیا اور اس کے بعد تم یہاں آگئیں۔ کس کس طرح ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور باز رکھا ہے۔ اور مدثر کو تو دیر سے گولی مار دی جانی تھی' ہمارا کیا تعلق

جہنم رسید ہو ہی گیا لیکن اب اس کی جگہ آپ سنبھالنا چاہتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے' میں ہر معاملہ میں خاموش رہا لیکن اب معاملہ میری بیٹی کا ہے۔ صوفیہ کے لئے وہ لوگ دل سے تیار تھے لیکن آپ نے اپنی بیٹی کا جلوہ دکھا کر ان لوگوں کو اپنی جانب راغب کیا۔ کیا شاندار لباس پہنا کر آپ نے کوٹھی میں بھیجا تھا اسے۔ جب وہ لوگ ہمارے گھر آئے تھے؟ سب کچھ جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں' میں ہر بات۔ بے وقوف نہیں ہوں۔ سب تم دونوں کی زندگی کے ہی خلاف تھے مگر میں نے کہا کہ ہم کم از کم ان لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کریں گے۔ سمجھ رہی ہیں۔ رحانہ خاتون! جہنم میں گیا مدثر اور جہنم میں جاؤ تم دونوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ مدثر کہاں ہے' زندہ ہے یا مر گیا۔ تم لوگوں کو اسی طرح میں یہاں لا سکتا تھا اور اب میں دونوں کو زندگی کے رحم و کرم پر چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تمہاری زندگی باقی ہے تو کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گی۔ ورنہ اس جنگل میں کہیں نہ کہیں تمہارا ٹھکانہ ہو ہی جائے گا۔ قبروں کی شکل میں نہ سہی تو کم از کم مردہ خور جانوروں کا شکار بن جاؤ گے۔ سمجھ رہی ہو ناں!"

امی اور مجھ پر سکتہ طاری تھا' تو مشرف تایا نے ہم لوگوں کے ساتھ یہ فریب کیا تھا۔ ابو کی زندگی کی جھوٹی اطلاع دے کر وہ ہمیں حویلی سے نکال کر یہاں لانا چاہتے تھے۔ خاموشی کے ساتھ وہ اپنی چال میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ تو ہم لوگوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ مدثر تایا جن کے سینے پر ہمارے ہاتھوں سے ضرب لگ رہی ہے' بھلا ہمارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں۔ دشمنی کا ہر عمل تو یہ ہمیشہ ہی کرتے رہے ہیں۔ دوستی کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے ان کے اندر' دھوکا کھا گئے تھے ہم۔ آہ' ہم مات کھا گئے تھے۔ امی ایک لمحے کے لئے سوچتی رہیں پھر نہ جانے کہاں سے ان کے اندر یہ جرأت پیدا ہو گئی۔

"ٹھیک ہے' مشرف بھائی! میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ریاست جہاں کے سلسلے میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ یہ بھی آپ کے علم میں ہے۔ اس وقت جب ریاست جہاں آئی ہوئی تھیں۔ میری مراد عید کے دن سے ہے' تو حویلی ہی سے شیرانہ کو طلب کیا گیا تھا۔ بچی ہے' عید کا دن اس کے دل میں بھی مردہ قسم کی خوشیاں پیدا کر رہا تھا جو باپ کے بغیر تھی۔ بے چاری نے اچھے کپڑے پہن لئے تھے۔ اس کے بعد آپ کو علم ہے مشرف بھائی کہ میں نے ریاست جہاں سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ خود ہی آئی تھیں۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ میں خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ٹھیک ہے میری اپنی زندگی ہے میرے

سے بدتر ہے۔ کیا آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اپنے کہنے کے مطابق پستول کی گولیاں ہمارے سینوں میں اتار دیں یا ہمیں زندہ رکھنے کا ظلم بھی آپ کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں یہاں ڈائیلاگ سننے نہیں آیا ہوں۔"

"آپ جو کچھ کرنے آئے ہیں' وہ اب ہمیں پتا چل گیا ہے۔ ظاہر ہے ہم نے د' زیادہ نہیں دیکھی۔ میں آپ کے قدموں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگ سکتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ وہ زندگی کی بھیک مجھے نہیں دیں گے لیکن میں ایسا کروں گی نہیں او ساری زندگی دکھ اٹھاتی رہی ہوں' آپ انسانوں نے تو ہم پر دنیا تنگ ہی کر دی۔ اب یہاں اس جنگل میں رہ کر یہ دیکھنا ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ ٹھیک ہے دونوں میں سے کوئی کام کر لیجئے۔ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ شیرانہ کے چہرے: تیزاب ڈلوانا چاہتے ہیں تو آپ کے پاس ہو تو وہ بھی ڈال دیجئے۔ آپ کی گاڑی میں پڑا ہے۔ نکالئے' ہم پر ڈالئے اور آگ لگا دیجئے ہمارے جسموں کو۔ پستول کی گولی سے مار چاہتے ہیں تو مار لیجئے۔ آپ کو کون روک سکتا ہے۔ یہاں چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں تو چ جائیں۔ ہم زندگی تلاش کریں گے لیکن آپ کے بھروسے پر نہیں۔ بہت اچھا ہوا کہ آ۔ نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور ہمارے قدم اس حویلی سے نکال دیئے۔ جو ہمار۔ لئے جہنم سے بدتر تھی۔ فیصلہ کر لیجئے' اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی میں' آ۔ ے۔"

امی کے لہجے میں عجیب سا غرور تھا۔ ایک عجیب سی تمکنت تھی۔ مشرف تایا ہمیں دیکھتے رہے اور اس کے بعد خاموشی سے کار کی جانب واپس مڑے۔ تھوڑی دیر کے بع ان کی کار آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میرا تو دل جیسے بند بند تھا لیکن امی کے اند بڑی جرأت نظر آ رہی تھی۔ ہم دیر تک مشرف تایا کی کار کی سرخ روشنیاں دیکھتے ر۔ اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو امی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"فیصلہ تیرے ہاتھوں میں ہے' میرے معبود! فیصلہ تیرے ہاتھوں میں ہے۔ ہم۔ جو کچھ کیا ہے' وہ بھی تو جانتا ہے اور دنیا نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے' وہ بھی تیرے' میں ہے۔ بیٹھ جاؤ شیرانہ! کوئی بات نہیں ہے۔ اب ہم اللہ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔"

"امی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہر جگہ پاک ہوتی ہے۔ بیٹھ جاؤ' اللہ کے حضور سر جھکا کر نماز پڑھو۔" امی نے

تک بکھرے ہوئے ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ آسمان پر تارے بکھرے ہوئے تھے۔ آخری راتوں کا چاند آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ یہاں بڑی ٹھنڈک تھی۔ ہم لوگ چونکہ ابو سے ملنے کی خوشی میں بس یونہی عام سے لباس میں نکل آئے تھے۔ اس لئے ہمارے پاس اور کپڑے وغیرہ بھی نہیں تھے۔ بیابان جنگل ہر طرف ویرانی' ہُو کا عالم طاری۔ کہیں کہیں جھاڑیوں میں کسی جانور کے بھاگنے کی آواز آتی تو خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے جنگل کے بھوت ابھی جھاڑیوں اور درختوں سے اتر کر ہم سے لپٹ جائیں گے۔ امی کافی دیر تک اس طرح سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں پھر جب چاند نکلا تو مجھے اپنے سامنے تقریباً دو گز کے فاصلے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کھنڈر نما عمارت نظر آئی۔ اینٹوں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ عمارت کی کچھ دیواریں سلامت تھیں۔ میں نے امی سے کہا۔

"امی! مجھے سردی لگ رہی ہے۔" امی نے سلام پھیرا اور اس کے بعد مجھے دیکھنے لگیں۔

"برداشت کرو۔"

"وہ دیکھئے' وہ ایک عمارت۔"

"کہاں؟"

"وہ سامنے۔" میں نے انگلی سے اشارہ کیا اور امی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"کوئی کھنڈر ہے۔"

"امی! وہاں سردی سے پناہ مل سکتی ہے۔" امی نے کچھ سوچا اور میرے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہم لوگ اس کھنڈر نما عمارت کی جانب چل پڑے۔ کافی دور جانے کے بعد ہم نے اسے قریب سے دیکھا تو اس کی کچھ دیواریں بالکل سالم نظر آئیں۔ وہ شاید کوئی پرانی مسجد تھی۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں وہاں قرب و جوار میں آبادی ہو اور آبادی کے رہنے والوں نے یہ مسجد بنائی ہو لیکن اب نہ تو قرب و جوار میں آبادی تھی' نہ اس مسجد میں زندگی کے آثار' لیکن بہرحال یہ سرد ہواؤں سے بچت کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ ہم مسجد کے ٹوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر چند سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کے اوپر ایک چبوترہ تھا جو مسجد کے صحن کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر دو تین دروازے نظر آ رہے تھے۔ ہر

انتظام بھی ہو سکتا تھا۔ میرا تو دل خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن نہ جانے امی کیوں اس قدر بے جگر ہو گئی تھیں جیسے ان کے دل سے خوف کا گزر ہی نہ ہو۔ صحن سے گزرنے کے بعد ہم لوگ اندرونی حصے کی جانب چل پڑے۔ امی نے مجھ سے جوتے اتارنے کے لئے کہا تو میں نے کہا۔

"امی! یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"یہ اندازہ ہے تمہیں کہ یہ مسجد ہے۔"

"جی!"

"تو بس جوتے اتار لو۔ کبھی نہ کبھی تو یہ مسجد آباد رہی ہو گی۔ اللہ کے نام پر بنائی گئی تھی۔ یہاں نمازیں بھی ادا کی گئی ہوں گی۔ اللہ کے گھر کا ہمیشہ احترام کرنا چاہئے۔"

"جی!" میں نے جوتیاں اتار لیں۔ اس کے بعد ہم اندر داخل ہو گئے۔ ہوا کے سرد جھونکے یہاں نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ اندر کی جگہ خاصی مضبوط اور محفوظ تھی۔ ہم لوگ بالکل ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے۔ اس ویرانے میں کبھی زندگی گزارنے کے لئے چند لمحات بھی آئیں گے' یہ میرے تصور سے بھی باہر تھا۔ میرے دل میں وحشتوں کا بسیرا تھا لیکن اپنے آپ کو سنبھالے ہوئی تھی۔ ہم ماں بیٹی پر مصیبتوں کا دور آ گیا تھا۔ ویسے تو ہم ان مصیبتوں کے عادی تھے۔ مختلف شکلوں میں یہ مصیبتیں ہم تک پہنچتی رہتی تھیں۔

لیکن اس وقت کچھ زیادہ ہی مشکل لمحات پیدا ہو گئے تھے ہمارے لئے۔ امی جس صبر کا مظاہرہ کر رہی تھیں' وہ قابل تعریف تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ درحقیقت امی کے اندر بڑی خوبیاں ہیں۔ مجھے ان کی طرح نڈر ہونا چاہئے۔ بہرحال ایک عجیب سی تھکن ذہن پر سوار تھی۔ امی نے کہا۔

"نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ' کافی رات گزر چکی ہے۔"

"امی! یہاں نیند آئے گی؟"

"دیکھو شیرانہ! مصیبت پڑی ہے ہم پر' خدارا دل نہ چھوڑنا۔ ہمت مت ہارنا بیٹی! زندگی تلاش کریں گے' نہ ملی تو اللہ کا حکم .... بے بس ہو گئے ہیں۔ اب صرف آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ لیٹ جاؤ' چلو لیٹ جاؤ۔ یہاں میرے زانو پر سر رکھ لو۔" امی نے کہا اور خود دیوار سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی گھٹنے سکوڑ کر امی کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کیا برا وقت آیا تھا ہم پر۔ کیا

سکتی ہے' بہیں۔ میں آنکھیں بند کئے سوچ میں ڈوبی رہی۔ کبھی کبھی قرب و جوار میں سرسراہٹیں سنائی دے جاتی تھیں لیکن ڈر کے مارے آنکھیں کھولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لاکھ اپنے آپ کو سمجھاتی کہ کچھ بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے پھر نہ جانے کس طرح آنکھوں میں نیند آ گئی۔ ذہن پر غنودگی طاری ہو گئی۔ امی بے چاری اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہی تھیں' میری وجہ سے۔ میں سوتی رہی۔ اس طرح بھی نیند آ جاتی ہے انسان کو۔ کیا ہی عجیب چیز ہے یہ انسان لیکن بہرحال یہ صرف ایک خیال ہی تھا۔ اس طرح کبھی نہیں سوئی تھی پہلے۔ تھوڑی بہت دیر ہی ہوئی ہو گی کہ پیروں پر کوئی چیز چلتی ہوئی محسوس ہوئی اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ امی ساکت و جامد تھیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اسی طرح بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر اپنے پیروں کو دیکھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے یہ صرف میرا وہم ہو لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے دو ننھی ننھی آنکھیں چمکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یہ آنکھوں کا احساس مجھے اس طرح ہوا کہ وہ تھوڑی سی متحرک ہوئی تھیں۔ میں تعجب سے ان چمکتی چیزوں کو دیکھنے لگی اور پھر میں نے پوری طرح ان کا جائزہ لیا۔ رات میں آنکھیں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اس لئے میں نے ان آنکھوں کے عقب میں ایک چوڑا پھن پھیلا ہوا دیکھا۔ آہ وہ سانپ ہی تھا۔ وہ یقیناً سانپ ہی تھا۔ کالا ناگ جو ہم سے کوئی پانچ گز کے فاصلے پر ایک دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میری سانس رک گئی۔ میں اپنے بدن کو جنبش دینے کی کوشش کرنے لگی لیکن یوں لگتا تھا جیسے خوف سے اعصاب ساکت ہو گئے ہوں۔ نہ جانے کس طرح ہاتھ بڑھا کر امی کا شانہ جھنجوڑا۔ امی سو نہیں رہی تھیں' جاگ رہی تھیں۔ میں نے بمشکل تمام آوازیں نکالیں۔

"امی' امی! سانپ۔" امی نے خاموشی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی اور کہا۔

"ہاں' میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ بہت دیر سے اسی طرح بیٹھا ہوا ہے۔"

"امی! یہ ہمیں ڈس لے گا۔"

"خاموشی سے لیٹی رہو۔ اب جب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے تو اسی پر بھروسا کرو۔ سانپ کو ہمیں ڈسنا ہو گا تو ضرور ڈس لے گا۔" میں خوفزدہ نگاہوں سے اس سانپ کو دیکھتی رہی۔ اب تو وہ مکمل طور سے نظر آ رہا تھا۔ کوئی تین فٹ کے قریب پھن بلند

پر کالی دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بار بار پھن ہلانے لگتا تھا لیکن پھنکار نہیں رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو امی نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"نہیں' کوئی تحریک نہ پیدا ہونے دو اپنے بدن میں۔ ورنہ وہ ہماری جانب متوجہ ہو جائے گا۔"

میں پھر جم کر رہ گئی تھی۔ تو یہ کالا ناگ یقیناً اس نوٹی مسجد میں رہتا ہو گا۔ ظاہر ہے یہاں اس کے علاوہ اور کیا نظر آئے گا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک میں اسی طرح اس ناگ پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ پھر اچانک ناگ نے اپنا پھن سکوڑا اور برق رفتاری سے زمین پر رینگتا ہوا مسجد کے صحن کی جانب چل پڑا۔ چند لمحوں میں وہ ہماری نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا۔ امی نے ایک گہری سانس لی۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"امی! بھاگیں یہاں سے۔"

"نہیں' باہر ٹھنڈک کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ رات یہاں گزارو' صبح کو یہاں سے نکل کر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا سہارا مل سکتا ہے۔"

"امی! خدا کے لئے۔"

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اس پر بھروسا کرو۔" امی نے کہا اور میں خاموش ہو گئی پھر میں بھی امی ہی کی طرح اٹھ کر دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ مسجد کے اندرونی حصے کے بارے میں ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا ہے۔ بس رات کی تاریکیوں میں یہاں تک آئے تھے۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں کہاں سوراخ ہیں اور کون کون سے سوراخوں میں سانپ نظر آ سکتے ہیں۔ پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک بار پھر آہٹ سنائی دی تھی۔ اب ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ صحن کی طرف سے ایک کالے رنگ کا ایک بلا آہستہ آہستہ پنجے دبائے اندر آیا تھا۔ مجھے وہ بلا ضرورت سے زیادہ ہی بڑا معلوم ہوا۔ اس نے ایک ستون کے ساتھ رک کر ہم دونوں کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔ رات کی تاریکی میں اس کی آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح روشن محسوس ہو رہی تھیں اور میرا خون اسے دیکھ کر خشک ہو رہا تھا۔ حالانکہ بلا تھا لیکن بالکل کالا۔ نہ جانے کیوں میں اسے دیکھ کر لرزتی رہی۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح ہمیں دیکھتا رہا پھر ٹہلنے کے سے انداز میں آگے بڑھ کر کسی اینٹوں کے ڈھیر میں روپوش ہو گیا۔ میں اپنے پورے بدن کو پسینے تر محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار پھر مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

صبح کب ہوگی۔ حالانکہ خوف سے بدن میں تھرتھراہٹیں دوڑ رہی تھیں۔ موسم بھی سرد تھا لیکن بار بار آنکھیں ایک دوسرے سے چپک جاتی تھیں۔ امی کے بارے میں میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان پر کیا بیت رہی تھی۔ یہ نوٹی مسجد بہت خوفناک لگ رہی تھی پھر اس وقت بھی ذہن نیم غنودہ تھا کہ اچانک ہی کانوں میں اذان کی آواز ابھری اور نہ صرف میں بلکہ امی بھی اچھل پڑیں۔ ہم لوگوں نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ قرب و جوار میں دور دور تک آبادی نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ یہ مسجد بالکل ویران تھی۔ پہلے سانپ بچھوؤں کا بسیرا تھا' دوسرے جانور بھی یہاں آتے جاتے رہتے ہوں گے لیکن اذان کی یہ آواز بتاتی تھی کہ مسجد میں کوئی موجود ہے۔ رات ہونے کی وجہ سے ہم کچھ دیکھ تو نہیں سکے تھے۔ اذان ہو گئی۔ صبح کی مدھم مدھم روشنی پھوٹنے لگی تھی۔ امی نے حیران لہجے میں کہا۔

"یہاں اذان..........!"

"ہاں امی! میں بھی حیران ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ.........."

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

"مگر آس پاس کوئی آبادی تو نہیں نظر آئی۔"

"ہو سکتا ہے کہ ہماری نظر نہ پڑی ہو۔"

"ہاں' ہو سکتا ہے۔" اور پھر ہمارا یہ خیال ختم ہو گیا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ وہ شخص سفید لباس میں ملبوس تھا۔ شانوں سے لے کر پیروں تک سفید لباس۔ بالکل ڈھیلا ڈھالا۔ سینے پر لمبی سفید داڑھی جھول رہی تھی۔ سر پر سفید امامہ باندھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"بچیو! ابھی نمازی آئیں گے' تمہارا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ ایسا کرو میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں حجرے میں پہنچا دوں۔" ہم لوگ تو کسی انسانی آواز کے تصور ہی کو ترس گئے تھے۔ امی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ سفید پوش واپسی کے لئے مڑ گیا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ مسجد کے بغلی حصے میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ دروازے پر رک کر اس سفید پوش نے ہمیں دیکھا اور بولا۔

"اندر چلی جاؤ۔" میں اور امی خاموشی سے اندر چلے گئے۔ سفید پوش باہر نکل گیا

تھے۔ امی آہستہ سے چلتی ہوئی ایک مونڈھے پر بیٹھ گئیں۔ سامنے ہی ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ جو مسجد کے صحن میں کھلتی تھی۔ امی کی زبان سے الفاظ نہیں ادا ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بولنا چاہتی ہوں لیکن آواز نہ نکل رہی ہو۔ میں نے حیرت سے کہا۔ "اوہو' امی دیکھئے' نمازی آ رہے ہیں۔" میں نے کچھ لوگوں کو مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب بھی سفید لباسوں میں تھے۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آ رہے تھے یہ لوگ۔ باہر کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا پھر مسجد میں اچھا خاصا رش ہو گیا۔ پوری مسجد بھر گئی تھی۔ حیرانی کی بات تھی۔ امی پر جیسے سکتہ سا طاری تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ مسجد آبادی میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رات کی وجہ سے ہم اس آبادی کو نہ دیکھ سکے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ٹھکانا مل ہی جائے گا۔"

امی نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ان کی زبان پر تالا پڑ گیا ہو۔ نماز پڑھی گئی۔ نمازی نماز پڑھنے کے بعد منتشر ہونے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد مسجد خالی ہو گئی۔ ہمارے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ شاید مسجد کے پیش امام ہم سے ہمارا حال پوچھیں۔ انہوں نے جس انداز میں ہمیں وہاں سے بچنے کے لئے کہا تھا' اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہماری موجودگی سے واقف تھے۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی پھر قدموں کی چاپ سنائی دی اور حجرے کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ وہی بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ ہم دونوں پر ڈالی اور بولے۔

"بچو! تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہو گا۔ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بھجوا تا ہوں۔ ناشتہ کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔" امی کے حلق سے سسکیوں کی سی آواز نکل تھی۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکیں۔ سفید پوش بزرگ پھر واپس چلے گئے تھے۔ میں امی کو سمجھانے لگی۔

"امی! اس وقت ہم خاموش رہ کر اپنا نقصان کریں گے۔ یہ دیندار لوگ ہیں' ان سے اپنی مشکل بیان کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے انہیں ہم پر رحم آ جائے۔ ہمیں کوئی ایسی جگہ بتا دیں جہاں ہم قیام کر سکیں۔" لیکن امی خاموش ہی رہی تھیں۔

"خاموش رہو' شیرانہ! خدا کے لئے کچھ وقت خاموشی سے گزار دو۔"

میں خاموش ہو گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت امی کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ جو کچھ مشرف تایا نے کیا تھا وہ انسان کبھی نہ کرتے۔ ہمیں یہاں مرنے کے لئے تنہا چھوڑ گئے تھے وہ۔ موت ہی کے مترادف بات تھی۔ بھلا یہاں زندگی کہاں سے تلاش کرتے ہم لیکن شاید ان سے بھی بھول ہو گئی۔ انہیں بھی یہاں قرب و جوار کی آبادی نظر نہیں آئی ہو گی۔ غرض یہ کہ وقت گزرتا رہا اور اب سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر مدھم سی آہٹ سنائی دی پھر اس کے بعد کوئی اندر داخل ہو گیا لیکن یہ وہ سفید پوش نہیں تھا۔ لباس تو اس کا بھی سفید ہی تھا لیکن چہرہ بھی لباس ہی کی مانند سفید' چاند کی طرح چمکتا ہوا۔ ایک عجیب روشنی اس کے چہرے پر تھی اور آنکھیں' ان پر تو نگاہ نہیں جم پاتی تھی۔ بڑی بڑی بادامی حسین آنکھیں' جن کی پتلیاں گہری نیلی تھیں۔ ان جیسی حسین آنکھیں میں نے بہت کم دیکھی تھیں۔ کشادہ پیشانی' سر پر سیاہ گھنے بال' گلابی ہونٹ' جن کی تراش بے حد خوبصورت تھی۔ سڈول جسم والا یہ نوجوان جس کی عمر چوبیں پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے لئے ہوئے اندر آیا تھا۔ ٹرے میں چائے کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں رکھی ہوئی تھیں جن کا ہم یہاں اس آبادی میں تصور نہیں کر سکتے تھے۔ تازہ ترین پھل' جنہیں دیکھ کر ہی آنکھوں میں روشنی اتر آتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری ناشتے کی چیزیں۔ اس نے مترنم آواز میں کہا۔

"دیکھئے' آپ اسے اجنبی جگہ سمجھ کر تکلف نہ کریں۔ اگر آپ نے تکلف کیا تو مجھے دکھ ہو گا۔" امی نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ میں بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک عجیب سا سرور میرے رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر دل کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ اس نے ایک بار پھر میری جانب دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ رات والا بلا یاد آ گیا۔ جس کی آنکھیں تیز روشن تھیں۔ میں نے ان آنکھوں کی بناوٹ پر غور نہیں کیا تھا لیکن بالکل ایسی ہی روشنی تھی ان آنکھوں میں۔ اس نے آخری نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے امی سے کہا۔

"امی ناشتہ کر لیں۔"

امی نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر ناشتے میں

جینا چاہتے تھے اور جی رہے تھے۔

☆-------☆-------☆

اس وقت دنیا کی کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ ہم اس کے لیے جتنا بھی افسردہ کیا' غمزدہ ہوتے ہمیں اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ تایا نے تو ہمیں دیس نکالا دے دیا۔ دیس نکالا ہی کیا بلکہ اپنی دانست میں ہماری زندگی ختم کر دی لیکن بچانے والا' مارنے والے سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ یہاں اس ویرانی میں بھی ہمیں کھانے پینے کی اشیاء مل گئیں اور ہو سکتا ہے وہ سفید پوش بزرگ جو اس قدر نرم طبیعت کے معلوم ہوتے ہیں ہماری اور بھی کچھ مدد کریں۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ ابی کچھ کہیں نہ کہیں' میں ان کو اپنی بپتا ضرور سناؤں گی اور ان سے کہوں گی کہ ہماری مدد کریں۔ پھر ہمیں ناشتہ ختم کیے ہوئے بہت زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہی بزرگ ایک بار پھر اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"بیٹی! دیکھو' یہاں تمہارا رہنا کسی طور ممکن نہیں ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس جگہ کو چھوڑ دو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

"بابا جی! ہم بہت پریشان حال لوگ ہیں بڑی مشکل کا شکار ہیں ہم' اگر آس پاس کوئی بستی ہے تو آپ ہمیں اس کا راستہ بتا دیں۔ یا پھر ہماری مدد کریں کہ ہم کہاں جائیں؟"

"تم کہاں جانا چاہتی ہو بیٹی..........؟" بزرگ نے میری بات کے جواب میں کہا۔

"ہم اس علاقے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اچھا' پھر یوں کرو تم مسجد کے دروازے سے نکل کر سیدھے ہاتھ مڑ جاؤ اور سیدھی چلتی چلی جاؤ۔ فاصلہ بے شک زیادہ ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ پھر تمہیں ریلوے لائن نظر آ جائے گی۔ یہاں سے ریل گزرتی ہے۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ تمہیں داہنی سمت چلنا ہے۔ اس طرح تم فضل پور کے سٹیشن پہنچ جاؤ گی۔ فضل پور کے سٹیشن سے تمہیں کہیں بھی جانے کے لیے راستہ جائے گا۔"

"مگر ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں اس کا بندوبست میں کیے دیتا ہوں۔" بزرگ نے تھوڑا سا رخ بدلا اور اس کے بعد کچھ نوٹ ہماری جانب بڑھا دیے اور بولے۔

"لو یہ رکھ لو۔ احتیاط سے رکھنا تمہارے کام آئیں گے۔ اب یہاں سے چل پڑو۔

اور ہاں یہ تمام چیزیں اپنے ساتھ رکھ لو ہو سکتا ہے کہ ٹھیک طرح سے ناشتہ نہ کر پائی ہو راستے میں کام آ جائیں گے۔"

"بابا جی۔ یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے۔"

"نہیں بیٹے۔ آبادی کافی دور ہے۔"

"تو ہم جائیں..........؟"

"خدا حافظ۔" بزرگ نے کہا اور اس کے بعد دروازے سے باہر نکل گئے۔ اس کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا کہ ہم لوگ بھی چل پڑیں۔ چنانچہ ہم ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے مسجد کے دروازے سے باہر نکل آئے۔ بزرگ نے پھر کہا۔ "دیکھو جو راستہ بتایا اسی راستے پر جانا۔ ورنہ بھٹک جاؤ گے۔ اطراف میں خطرناک جنگل بکھرا پڑا ہے۔" باہر نکل کر ایک بار پھر میں شدید حیران رہ گئی۔ کوئی آدم نہ آدم زاد تا حد نظر ویران چٹانیں' بدصورت راستے جہاں تک نظر کام کرتی تھی سوائے پتھریلی زمین' مٹی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد امی سے کہا۔

"یہ نمازی اتنا سارا فاصلہ طے کر کے روزانہ یہاں آتے ہیں۔ کیا جس بستی میں یہ لوگ رہتے ہیں وہاں کوئی مسجد نہیں ہو گی۔"

"خدا تمہیں سمجھے۔ اتنا بول رہی ہو کہ مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ یہ ساری باتیں بعد میں کریں گے۔ ابھی تو یہ سوچو کہ ہم کسی صحیح جگہ پہنچ جائیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گئی۔ تھوڑے سا فاصلہ طے کیا تھا کہ عجیب سی ٹن ٹن ٹن کی آوازیں سنائی دیں اور اسی کے ساتھ ساتھ میری نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ ایک بیل گاڑی آ رہی تھی۔ بیل گاڑی والا تھوڑے ہی فاصلے سے گزر رہا تھا لیکن اس کا رخ ہماری ہی جانب تھا۔ اس کے بدن پر ایک بڑا سا کمبل پڑا ہوا تھا۔ سر پر بہت بڑی سی پگڑی باندھی ہوئی تھی چہرہ بھی پگڑی میں چھپا ہوا تھا۔ کوئی دیہاتی معلوم ہوتا تھا لیکن اگر اس وقت وہ ہماری مشکل حل کر دیتا تو ہمارے لیے اس سے زیادہ قیمتی اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے امی سے کہا۔

"امی اگر یہ ہمیں اپنی بیل گاڑی میں بٹھا لے تو ہم اتنا راستہ پیدل طے کرنے سے بچ جائیں۔" پھر امی کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اسے زور سے آواز دی۔

"گاڑی والے او گاڑی والے ہماری بات سن۔ ذرا ادھر آؤ۔" میں نے اسے ہاتھ

جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

"گاڑی والے' ہمیں فضل پور جانا ہے۔ تم اگر اس طرف جا رہے ہو تو ہمیں وہاں چھوڑ دو یا پھر راستے ہی میں ہمیں اتار دینا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے ہو جائے گا۔ ہمیں راستہ بھی نہیں معلوم۔"

گاڑی والا اسی طرح گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نے داہنے ہاتھ سے ہمیں پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"آیئے' امی آیئے' امی آیئے ناں!" اور میں امی کو گھسیٹتی ہوئی بیل گاڑی تک لے گئی۔ پھر انہیں سہارا دے کر اوپر چڑھایا اور خود بھی جلدی سے بیل گاڑی پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی والے نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گو بیلوں کی رفتار زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی ہم پیدل چلنے سے تو بچ گئے تھے۔ وہ چلتا رہا۔ امی بدستور خاموش تھیں۔ نہ جانے انہیں یہ چپ کیوں لگ گئی تھی۔ اب ایسے حالات تھے تو ان کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔ اللہ ہماری مدد کر رہا تھا۔ اس سفید پوش بزرگ نے اچھے خاصے نوٹ دیے تھے امی کو۔ جو بہرحال انہوں نے لے لیے تھے۔ کیونکہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت تھی ورنہ امی بہت خود دار تھیں۔ سفر جاری رہا۔ پھر ہم نے ریلوے لائن دیکھی۔ گاڑی والا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ داہنی جانب ہی چل پڑا تھا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ گاڑی والے۔ ہو سکتا ہے تم اس طرف نہ جا رہے ہو لیکن یقین کرو اگر تم ہماری مدد نہ کرتے تو ہم راستہ بھٹک بھی سکتے تھے خدا تمہارا بھلا کرے۔"

میرے ان الفاظ پر اس نے کوئی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ بھی مجھے کوئی خبطی ہی معلوم ہوتا تھا ایک تو اس نے چہرہ اس طرح سفید کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا کہ سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہوگی لیکن یہ دیہاتی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر ہمیں دور سے ریل آتی ہوئی نظر آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہمارے قریب سے گزر گئی۔ اسٹیشن اب زیادہ دور نہیں تھا۔ گاڑی والے نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور ہاتھ سے ہمیں نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"ایک بار پھر تمہارا بہت بہت شکریہ۔ یہاں سے تو ہم آسانی سے پیدل چلے جائیں گے ویسے کیا تم گونگے ہو؟" میں نے کہا۔ گاڑی والے نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا

گئی تھیں۔ میں اتفاق سے اس انوکھے گاڑی والے کو دیکھ رہی تھی۔ تب اس نے اپنا ہاتھ کان کے قریب لا کر اپنے چہرے کا وہ کپڑا ہٹا دیا اور دوسرے لمحے میں دھک سے رہ گئی۔ یہ وہی نوجوان لڑکا تھا۔ جس نے ہمیں ناشتہ دیا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر اتنی حسین مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی کہ انسان اس مسکراہٹ میں کھو کر رہ جائے۔ نیلی شفاف آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ کپڑا اپنے چہرے پر لگایا اور بیل گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ امی ان لمحات سے بے خبر آگے بڑھ رہی تھیں اور میں ان سے چند گز پیچھے رہ گئی تھی۔ بیل گاڑی والا تیزی سے بیل گاڑی آگے بڑھا لے گیا اور میں دوڑ کر امی کے پاس پہنچ گئی لیکن بس کچھ عجیب سا احساس دل میں تھا۔ یہ کہاں سے آ گیا اور اس انداز میں شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھو میں نے تمہیں کیسا بیوقوف بنایا' اپنا چہرہ ہی نہیں دکھایا۔ واقعات جس طرح سے پیش آئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے دل ہلا دیا تھا لیکن اب تو آ ہی چکے تھے یا شاید یہ عمر کی بات تھی کہ میں ان وسوسوں کی شکار نہیں تھی۔ جن کا شکار امی ہوں گی۔ امی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولیں۔

"چادر سر پر کھینچ لو اور احتیاط سے چلو۔ تمہارا چہرہ کسی کو نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"جی امی..........." میں نے کہا اور ان کی ہدایت پر عمل کیا امی صبر کے ساتھ آگے گئیں۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے بس اکا دکا قلی نظر آ رہے تھے۔ فضل پور کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تھے لیکن امی شاید ہمت سے کام لے رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بوڑھے قلی کو روکا اور اس سے بولیں۔

"بھائی ریل کس وقت آتی ہے؟"

"کہاں جانا ہے بہن؟" بوڑھے قلی نے سوال کیا۔

"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ یہاں سے ریل کہاں کہاں جاتی ہے؟"

"بہت سے شہروں میں جاتی ہے اگر اس طرف جانا ہے تو............" قلی نے کئی شہروں کا نام لیا اور پھر داہنی طرف رخ کر کے کہا۔

"اور اگر ادھر جانا ہے تو............" اس نے ایک بار پھر شہروں کے نام گنوائے۔

"ہاں مجھے حسن آباد جانا ہے۔" امی نے کہا۔

"چلو۔ تمہاری ریل تو اب سے آدھے گھنٹے کے بعد آنے والی ہے ٹکٹ لے یا تم

"نہیں بھائی............"

"تو پھر ٹکٹ لے لو............"

"بھائی میری مدد کرو گے............"

"کیا مطلب پیسے نہیں ہیں کیا؟" قلی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ یہ پیسے لو اور مجھے دو ٹکٹ لے دو۔"

"لاؤ میں یہ کر دیتا ہوں۔ میں بھی غریب آدمی ہوں بہن۔ برا نہ ماننا میں نے پیسوں کے بارے میں اس لیے پوچھ لیا تھا۔ اگر تم کہتیں کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو تمیز کرو کہ میرے پاس بھی نہیں ہیں۔"

"نہیں بھائی مجھے تم دو ٹکٹ خرید کے دے دو حسن آباد کے............" قلی آگے بڑھ گیا تو میں نے امی سے پوچھا۔

"امی، حسن آباد میں کون رہتا ہے۔ کیا ہمارا کوئی جاننے والا ہے وہاں؟"

"کتنی معصوم اور بیوقوف ہو تم۔ کوئی نہ کوئی نام تو لینا تھا مجھے۔ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ میں کب گھر سے باہر نکلی ہوں۔ بس چلتے ہیں یہاں سے آگے چل کر دیکھیں گے کہ تقدیر میں کیا لکھا ہوا ہے۔" قلی نے ٹکٹ لا کر بقیہ پیسے واپس کر دیے پھر بولا۔

"ادھر آ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں تمہارے ڈبے میں بٹھا دوں گا۔"

"جی بھائی............" امی نے جواب دیا۔ قلی ہمدرد انسان تھا۔ ویسے بھی یہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے ہم دونوں ماں بیٹیاں پتھریلے پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ بات اتنی خوفناک ہوئی تھی۔ ہم بے گھر، بے در تھے۔ بھٹکتے پھر رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک لطف سا آ رہا تھا۔ کم از کم اس حویلی کے حصار سے نکلنے کا موقع تو ملا ہے۔ آگے کی زندگی ہو سکتا ہے کچھ اچھی ہی ثابت ہو۔ پھر دور سے ایک ریل آتی ہوئی نظر آئی اور ہمارے ہمدرد قلی نے مجھ سے کہا۔

"تیار ہو جاؤ بیٹی۔ تمہیں اس ریل میں بیٹھ کر جانا ہے۔"

"بابا جی! آپ کا بہت بہت شکریہ آپ یہ نہ سمجھیں ہم آپ کو آپ کا معاوضہ نہیں دیں گے۔"

امی نے کہا اور قلی مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ریل پلیٹ فارم پر آ کر رکی اور قلی ہمیں ساتھ آنے

سوار کرایا۔ ہماری سیٹیں ہمیں بتائیں۔ امی نے کچھ رقم اسے دینا چاہی تو وہ بولا۔

"کمائی تو زندگی بھری ہوتی ہے بہن۔ بہنوں کے لیے بھائی اتنا بھی نہ کرے تو اس پر لعنت ہے میں تم سے ایک پیسہ بھی نہ لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ڈبے سے باہر اتر گیا۔ ہم دونوں حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے۔ دنیا میں اچھے برے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ کسی کو نہ صرف اچھا کہا جا سکتا ہے اور کسی کو نہ صرف برا۔ ہر طرح کے لوگ اس دنیا میں ہوتے ہیں۔ ٹرین صرف چند لمحات کے لیے وہاں رکی تھی۔ اس کے بعد وہ سیٹی دے کر آگے بڑھ گئی تھی۔ میری زندگی میں تو یہ ریل کا پہلا سفر تھا اور آہستہ آہستہ میں خود پر گزرنے والے واقعات کو بھولتی جا رہی تھی۔ میں نے ٹرین میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا بہت سے مسافر تھے جو دور سے آ رہے تھے۔ ہمارے بالکل سامنے والی سیٹوں پر ایک بھاری بدن والی خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں پر قیمتی چشمہ لگا ہوا تھا۔ لباس بھی بہت عمدہ پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے برابر دو لڑکیاں برقعے میں لپٹی ہوئی تھیں لیکن انہوں نے چہرے کھول رکھے تھے۔ ان کے چہرے خاصے خوش شکل تھے۔ چہروں سے شریر معلوم ہوتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میں چونکہ اپنا چہرہ تقریباً ڈھکے ہوئے تھی۔ اس لیے انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میری شکل و صورت کیسی ہے۔ دوسرے تمام لوگ بھی موجود تھے امی سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ غالباً انہیں یہ احساس تھا کہ ایک بے گھر اور بے در عورت کو جوان بیٹی کے ساتھ آگے نہ جانے کیا کیا مشکلات پیش آنے والی ہیں۔ یہ تمام احساسات ان کے چہرے سے جھلک رہے تھے اور پھر جب خاصا وقت گزر گیا اور میں ریل کا جائزہ لے کر اکتا گئی تو میں نے امی سے کہا۔

"امی اتنی خاموش کیوں ہیں............؟"

"تو پھر کیا کروں............؟"

"اب یہ بتائیے ہم آگے کیا کریں گے............؟"

"اللہ مالک ہے۔"

"پھر بھی آپ حسن آباد جا رہی ہیں............؟"

"ہاں............"

"کیا آپ نے حسن آباد پہلے کبھی دیکھا ہے............؟"

"نام بھی نہیں سنا............"

"میں نے کہا نا۔ اللہ مالک ہے۔ جس طرح اس نے ہمیں حویلی سے نکال کر یہاں تک پہنچایا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے لیے آگے کے رستے بھی متعین کرے گا۔"

"کوئی خیال تو ہو گا آپ کے دل میں.........."

"تمہارے خیال میں کیا سوچ سکتی ہوں میں' میں بھی دنیا سے اتنی ہی ناواقف ہوں جتنی تم۔"

"ہونہہ۔ چلیے اللہ مالک ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں امی کہ اس حویلی سے نکلنے کے بعد ہمارے لیے اچھا ہی ہوا۔" امی گہری سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔ میری باتوں کا جواب دینا ان کے لیے ضروری تھا۔ ورنہ شاید اس وقت وہ خاموش ہی رہنا پسند کرتیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اچانک میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"امی ایک بات بتایئے۔"

"ہاں.........."

"اتنے ویرانے میں جو مسجد تھی اس میں اتنے سارے نمازی کہاں سے آ گئے۔ یہ تو ہی صبح نماز پڑھنے کے لیے اتنا لمبا راستہ طے کر کے بستی سے مسجد تک آتے ہیں۔" امی نے کوئی جواب نہیں دیا اور سوچ میں ڈوب گئیں میں نے پھر کہا۔

"اور رات کو کیسے عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے۔ وہ سانپ جو اتنا خوفناک تھا' گردن جھکا کر چلا گیا تھا اور پھر وہ کالا بلا' اس کو دیکھ کر تو میرے رونگٹے ہی کھڑے ہو گئے تھے مگر ایک بات اور بتایئے امی۔"

"پوچھو!"

"وہاں مسجد میں اتنا عمدہ ناشتہ کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ تو بہت ہی اچھا ناشتہ تھا۔"

امی مسکرا دیں اور بولیں۔

"دیکھو بیٹا ہر بات کی گہرائیوں میں نہیں اترتے۔ میں نے وہاں بھی تمہیں خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔"

"مگر کیوں اگر آپ مجھے بتائیں گی نہیں تو مجھے دنیا کے بارے میں معلومات کیسے ہوں گی۔" امی سوچ میں ڈوب گئیں اور انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"اس ویران مسجد میں جو نمازی نماز پڑھنے آئے تھے وہ انسان نہیں تھے۔"

"کیا مطلب..........؟"

"کہانیاں بھی سنی ہیں بہت سی۔"

"ویرانوں میں جن ہی رہتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا..........؟"

"بھئی۔ اب اور کون سی زبان میں بتاؤں تمہیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ وہ جنوں کی مسجد تھی۔"

"کیا..........؟" میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں.......... وہ بزرگ بھی جن تھے بہرحال انہوں نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ جنوں میں بھی اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔"

"مگر مگر آپ کا مطلب ہے کہ ہم نے یعنی ہم نے وہ جگہ اور وہ ناشتہ.........."

"ہاں' میرا یہی خیال ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"بری بات۔ چپ ہو جاؤ۔" اسی وقت سامنے بیٹھی ہوئی خاتون نے ہمیں مخاطب کیا۔

"آپ دونوں ماں بیٹیاں معلوم ہوتی ہیں شاید..........؟"

"جی..........؟" امی چونک پڑیں۔

"آپ نے اس بچی کو اس طرح گھونگھٹ کیوں لگوا رکھا ہے۔ کیا یہ آپ کے بیٹے کی دلہن ہے..........؟"

"نہیں.........." امی مسکرا دیں۔

"وہی تو میں سوچ رہی تھی۔ لباس تو دلہنوں والا نہیں ہے۔"

"یہ میری بچی ہے۔"

"اچھا اچھا لیکن اب اس کا چہرہ تو کھلوا دیجئے۔ دم گھٹ گیا ہو گا بچاری کا۔ ٹکر ٹکر جھانک رہی ہے گھونگھٹ سے۔"

"دوپٹہ ٹھیک کر لو شیرانہ۔" امی نے کہا اور میں نے چہرہ کھول دیا۔ سامنے بیٹھی خاتون مجھے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مدھم مدھم مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ۔ اس چاند کے ٹکڑے کو واقعی پردے میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔ ورنہ دنیا دیوانی ہو جائے گی۔ بڑی پیاری بچی ہے آپ کی.........."

کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ دونوں لڑکیاں بھی اب میری جانب متوجہ ہو گئی تھیں پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا نام ہے آپ کا..........؟"

"شیرانہ.........."

"بہت پیارا نام ہے بالکل آپ کے چہرے کی طرح۔ باتیں کیجئے ہم سے.........."

"جی.........." میں نے آہستہ سے کہا۔

"میرا نام صبا ہے اور یہ میری بہن حنا ہے۔"

"جی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا خاتون مسکرا کر پھر بولیں۔

"کہاں جارہی ہیں آپ.........؟"

"حسن آباد۔"

"اچھا اچھا حسن آباد میں رہتی ہیں۔"

"نہیں رہتی نہیں ہوں۔"

"پھر.........."

"بس جارہی ہوں۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا۔ رہتی نہیں ہوں' بس جارہی ہوں۔"

"جی ہاں' تقدیر کے سہارے تلاش کرنے جارہی ہوں۔" امی کے منہ سے نکل گیا اور خاتون نے مجھ سے کہا۔

"بیٹی اگر تم برا نہ مانو تو یہاں میری جگہ آ بیٹھو۔ میں تمہاری امی سے کچھ باتیں کروں گی۔"

"جی.........." میں نے کہا اور صبا اور حنا کے پاس آ بیٹھی۔ دونوں لڑکیاں مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے کہا۔

"دیکھیے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم جس طرح کے حالات کا شکار ہیں اس میں میرے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی زبان نہ کھولوں۔ بس آپ مجھ سے وہ باتیں کیجئے جو مجھ سے متعلق نہ ہوں۔"

"ارے ایسی بات کیا ہے۔" حنا بولی۔

ان خاتون کی آواز کی جانب بھی لگے ہوئے تھے خاتون نے کہا۔

"ایک نگاہ میں اندازہ لگا لیا تھا میں نے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"کیوں.........؟"

"بس یوں سمجھ لیجیے کہ اپنوں کے ستم کا شکار ہوں۔"

"او ہو۔ اگر برا نہ مانیں تو دیکھیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اگر آپ مجھے اپنی پریشانی بتائیں تو شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔" امی نے امید بھری نگاہوں سے اس خاتون کو دیکھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ حسن آباد میں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ امی کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے احساسات ہوں گے۔ یہ بات تو میں اچھی طرح سمجھتی تھی چنانچہ امی نے کہا۔

"بہن' بس مشکل کا شکار ہوں۔"

"دیکھیے میرا نام نگینہ ہے لوگ مجھے نگینہ خانم کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ میری دونوں بیٹیاں ہیں۔ حسن آباد کے ایک اچھے علاقے میں رہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کھاتی پیتی عورت ہوں۔ آپ مجھے بے تکلفی سے اپنے بارے میں بتایئے۔"

"بہن میں نے کہا نا سسرال والوں کے ستم کا شکار ہوں۔ شوہر گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کوئی نام و نشان نہیں ملا ان کا۔ سسرال والوں نے بھی نکال باہر کیا۔ بس اتنی سی داستان ہے میری اب زندگی کی تلاش میں جارہی ہوں۔ جن پریشانیوں کا میرے دل میں گزر ہو سکتا ہے آپ میری جگہ اپنے آپ کو رکھ کر سوچیں۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہے۔ کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ لوگ' انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتے ہیں یہ واقعی بہت ظلم کی بات ہے لیکن بہن آپ ایک بات تو جانتی ہیں۔ وہ یہ کہ انسان ہی انسان کا سہارا بنتا ہے اور تقدیر یہ سہارے انسان کو فراہم کرتی ہے۔ آپ سوچیں گی کہ میں ایک دم اتنی مہربان کیوں ہو گئی لیکن یہ سوچنے کی بات نہیں ہے انسان ہوں اور انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا جانتی ہوں آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ حسن آباد میں آپ میرے ساتھ چلیں گی۔ آپ کا نام کیا ہے.........؟"

"رحمانہ.........."

"اور آپ کی بیٹی کا نام.........؟"

"بس یوں سمجھ لیجئے رحمانہ بیگم آپ کی تکلیفوں کا وقت ختم ہو گیا حسن آباد میں میرے پاس بہت بڑا مکان ہے وہیں رہتی ہوں۔ بس آپ میرے ساتھ چلیں گی۔"

امی نے احسان بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ اور بولیں۔

"یہ عجیب بات ہو گئی۔"

"بالکل عجیب نہیں ہوئی۔ بس میں نے جو کہہ دیا ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیے۔ آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں آپ کی ساری تکلیفیں اپنے دامن میں سمیٹ لوں گی۔" امی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

☆------☆------☆

ہم حسن آباد پہنچ گئے۔ حسن آباد میں نگینہ خانم کی کوٹھی بے حد بڑی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہماری حویلی اس کوٹھی سے درجنوں گنا بڑی اور اس سے بہت شاندار تھی لیکن یہ کوٹھی زرا مختلف انداز کی بنی ہوئی تھی اور خوب صورتی میں حویلی سے کہیں زیادہ تھی۔ بہرحال کون سی ہماری تھی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ نگینہ خانم تو فرشتہ صفت خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمیں اپنی کوٹھی کے اندرونی حصے میں ایک کمرہ دے دیا۔ جس میں دو بستر لگوا دیئے گئے تھے۔ صبا اور حنا تو ضرورت سے زیادہ ہی شوخ و چنچل تھیں۔ ان کا انداز کچھ عجیب سا تھا لیکن بہرحال میں یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ اب اتنی معصوم تو نہیں تھی کہ اپنی شکل اور اپنے حالات کو بھول جاؤں اس کے علاوہ یہ غیر لوگ تھے کسی غیر کے سر پر اس طرح پڑ جانا بھی تو ایک نامناسب بات تھی۔ امی نے رات کو مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمیں یہ عارضی ٹھکانہ مل گیا ہے شیرانہ لیکن بہرحال ہمیں اپنا مقام تلاش کرنا ہوگا۔"

"اتنی جلدی سوچنے کی ضرورت بھی کیا ہے امی۔ کچھ وقت یہاں گزار لیں۔ ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات رکھیں گے اور کچھ نہیں تو تھوڑا سا وقت گزارنے میں آسانی حاصل ہو جائے گی پھر دیکھیں گے کہ ہم کس طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔"

امی نے بے خیالی انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ پھر یہاں کئی دن گزر گئے۔ ہم زیادہ تر کوٹھی کے اندرونی حصے میں رہا کرتے تھے۔ صبا اور حنا بھی نہ جانے کس کام میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ وہ دن کو ساڑھے گیارہ بجے اٹھنے کی عادی تھیں۔ جبکہ نگینہ خانم جلدی جاگ جاتی تھیں۔ صبح کو ناشتہ ان کی وجہ سے جلدی مل جاتا تھا ورنہ صبا اور حنا تو دن میں ساڑھے گیارہ بارہ بجے ناشتہ کیا کرتی تھیں۔ ہم لوگوں کو یہاں کئی دن گزر گئے تھے۔ جس کمرے میں ہم رہتے تھے اس کی ایک کھڑکی اس کوٹھی کے بیرونی حصے کو دیکھنے

کے کوئی رشتہ دار ہوں گے لیکن یہ کاریں صبح کو ہی واپس جاتی تھیں۔ نگینہ خانم ہمارے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتی تھیں لیکن صبا اور حنا کا کردار مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا وہ بالکل بے حجاب تھیں اور ایسی ایسی باتیں کرتی تھیں کہ میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں میں نے کئی اور خواتین کو بھی دیکھا تھا جو آتی جاتی رہتی تھیں لیکن ہم چونکہ نئے نئے آئے تھے' اس لیے محدود ہی رہتے تھے۔ پھر تقریباً دس بارہ دن گزر گئے۔ پھر ایک دن نگینہ خانم امی کے پاس آ بیٹھیں۔ موسم ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی چھائی ہوئی تھی نگینہ خانم نے امی کو دیکھا اور بولیں۔

"دنیا کو دیکھ لیا اچھی طرح تم نے رحانہ بہن۔"

"جی باجی۔ بڑی سنگدل ہے دنیا۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کیا جائے............؟"

"تمہارے شوہر نے پھر کبھی پلٹ کر تمہاری خبر نہیں لی............؟"

"کیا کہوں 'کیا نہ کہوں۔ وہ خود کسی مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ خدا جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا............"

"تو اب کیا کرو گی۔ انتظار کرتی رہو گی ان کا............؟"

"انتظار کرتی بھی رہوں تو ان کو پانے کا تصور ذہن سے نکل چکا ہے۔"

"تو زندگی گزارنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو سوچا ہی ہو گا تم نے۔"

"آپ یقین کریں میری سمجھ میں کچھ آتا ہی نہیں ہے۔"

"تو کسی سمجھانے والے سے پوچھیے کہ زندگی میں اب کیا کرنا ہے۔"

"کون ہے مجھے سمجھانے والا............؟"

"میں ہوں............" نگینہ خانم نے کہا اور امی نے احسان بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور بولیں۔

"آپ جیسی نیک خاتون تو شاید دنیا میں کم ہی ہوں گی۔ کون کسی کے اس طرح کام آتا ہے۔ جس طرح آپ نے میرا ساتھ دیا ہے۔"

"دیکھو! ایک بات کہوں تم سے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے کوئی جب خود زندگی کے مشکل تجربات سے گزرتا ہے تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ دوسروں کی مدد بھی کرے۔ میرا ذہن اسی قسم کا ہے۔ میں تمہیں اپنی ماضی کی داستان نہیں سناؤں گی لیکن یوں سمجھ لو کہ زندگی کی جتنی مشکل کہانیاں ہوتی ہیں سب کا ایک ہی

[illegible]

گئی ہیں کہ انسان سمجھتے ہی نہیں لیکن ہمارے پاس بھی انتقام کے ہتھیار موجود ہیں۔ ہم بھی اپنی زندگی اپنی پسند سے گزار سکتے ہیں۔ میں نے یہی کیا ہے۔ حنا اور صبا کا باپ ایک بہت بڑا آدمی تھا۔ اتنا بڑا آدمی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی رحانہ بیگم لیکن اس نے مجھ غریب عورت سے شادی کی۔ اپنے خاندان والوں سے چھپا کر رکھا۔ دو بیٹیوں کا باپ بن گیا اور جب دل بھر گیا تو مجھے اپنے آپ سے جدا کر دیا۔ زندگی کے حسین دن اور رات لوٹ کر اس نے مجھے قلاش کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ کسی دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو گیا بتاؤ میں کیا کرتی۔ نتیجے میں' میں نے انتقام کا راستہ اختیار کر لیا اور زندگی کے لیے ایک شعبہ اپنا لیا۔"

"کیا............؟" امی نے پوچھا۔

"بس۔ تم اب یہ سمجھ لو کہ اب صبا اور حنا کمائی کا ذریعہ ہیں۔ تماش بین آتے ہیں اپنا مطلب پورا کرتے ہیں اور میں ان سے ان کا بھرپور معاوضہ وصول کرتی ہوں۔ ایسی ہی کئی بے سہارا لڑکیاں میرے پاس آتی ہیں اور میں نے انہیں سہارا دیا ہے۔ دیکھو برا مت ماننا رحانہ بہن۔ تمہاری بچی تو انمول ہیرا ہے پہلی ہی بار اسے اتنی قیمت مل جائے گی اس کی کہ تمہاری بقیہ زندگی عیش سے گزرے گی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" امی گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"بیٹھ جاؤ رحانہ بہن بیٹھ جاؤ۔ میں نے کہا نا تم سے کہ اس دنیا میں خود غرضی ہی سب سے بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے ایک نگاہ میں تمہاری بچی کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ تمہیں اپنے ساتھ شامل کر لوں۔"

"لیکن میرا مطلب۔ میرا مطلب ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"بس جسموں کا کاروبار کرتے ہیں ہم لوگ' سمجھ رہی ہو اور خبردار پارسا بننے کی کوشش بیکار ہو گی۔ تمہیں اس غرض سے یہاں لائی ہوں میں۔ اب تک میں نے جو کچھ کیا وہ اسی نظریے سے کیا ہے۔"

"آپ پاگل ہو گئی ہیں کیا؟ میں ایک شریف خاندان کی عورت ہوں۔ میں اپنی بچی کو زندگی میں ایک اچھا مقام دینا چاہتی ہوں۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تمہاری بیٹی کو ایک اچھا مقام ملے۔ جس وقت تک اس پر جوانی ہے۔ فائدہ اٹھاؤ۔ کروڑوں کما لو گی۔ اس کے بعد باقی زندگی اس کی بھی عیش سے

[illegible]

"میں تھوکتی ہوں ایسی زندگی پر۔"

"نہیں رحمانہ۔ تم تھوک نہیں سکتیں۔ جب انسان کوئی قدم اٹھاتا ہے تو بہت غور کرلیتا ہے۔ تمہیں اب یہاں رہنا ہوگا ہر قیمت پر۔"

"زبردستی............"

"ہاں!"

"میں نہیں رہوں گی۔"

"ہونہہ' سوچ لو' اگر تم یہاں نہیں رہو گی تو ایسا ہو گا کہ تمہاری بیٹی کا چہرہ تیزاب ڈال کر بگاڑ دیا جائے گا۔ تمہاری دونوں آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی۔ پھر یہ ہو گا کہ ایک بد صورت جوان لڑکی ایک اندھی عورت کا ہاتھ پکڑ کر سڑکوں پر بھیک مانگے گی۔ میں اس کی زبان بھی کاٹ دوں گی اور تمہاری بھی تاکہ تم لوگ اپنی کہانی کسی کو نہ سنا سکو۔ میں تمہارے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کاٹ دوں گی تاکہ تم کسی کو اپنی داستان تحریر کر کے نہ دے سکو۔ پھر سڑکیں ہوں گی اور تم............ ایک بات بتاؤں۔ تیزاب سے جھلسے ہوئے چہرے والی جوان لڑکی بھی مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ لوگ اس کے چہرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا ہے اور میں تمہیں دنیا کا روپ دکھا رہی ہوں اور اب اس سے بھی مل لو............ شہباز۔"

نگینہ خانم نے دروازے کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی اور جو شخص اندر داخل ہوا وہ کسی زمانہ قدیم کا جلاد معلوم ہوتا تھا۔ کالا رنگ' موٹے موٹے ہونٹ' چھوٹی چھوٹی بھیانک آنکھیں۔ اتنا چوڑا چکلا بدن کہ دیکھنے والے پر دہشت طاری ہو۔

"جی خانم۔" اس نے اندر آ کر کہا۔

"یہ دونوں سرکشی کر رہی ہیں' انہیں ٹھیک کرنا ہے۔"

"جی خانم۔" شہباز نے کہا اور آگے بڑھا۔ پھر اس نے امی کے بال پکڑے اور انہیں اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

"سن رہی ہے تو............ خانم کیا کہتی ہے۔" امی کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی اور میں بھی چیخ کر ایک کونے میں سمٹ گئی تھی۔

"چھوڑ دو۔ شہباز۔" نگینہ خانم نے کہا اور شہباز نے امی کے بال چھوڑ دیے۔ نگینہ خانم نے کہا۔

"ضرورت ہو تو میں کیا کروں۔ وقت کو سمجھو' وقت کو دیکھو۔ بس اب میں چاہتی ہوں کہ یہ چیک کیش ہو جائے اور تم زندگی کے صحیح راستوں پر چل پڑو۔" چیک کے حوالے کے ساتھ نگینہ خانم نے میری طرف انگلی اٹھائی تھی۔ پھر انہوں نے کہا۔

"سوچنے کے لیے چوبیس گھنٹے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد اس فیصلے کے بعد ہی میرا عمل۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ امی نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے تھے ان کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

"میرے خدا۔ میرے خدا۔" میں خود بھی رو رہی تھی۔ اب اتنی نا سمجھ بھی نہیں تھی کہ نگینہ خانم کی باتوں کو نہ سمجھ پاتی۔ میں نے آگے بڑھ کر امی سے کہا۔

"رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا امی' ہمیں سوچنا ہو گا۔" امی نے درد بھری آواز میں کہا۔

"کیا ہے یہ ساری دنیا۔ یہ دنیا کیسی ہے شیرانہ۔"

"ہم وہ نہیں بنیں گے جو ہمیں بنایا جا رہا ہے آؤ خود کشی کر لیں شیرانہ' ہم زندہ نہیں رہنا چاہتے۔" آہ بظاہر کیسی نیک سیرت عورت تھی یہ کیسی اچھی شکل و صورت کی مالک اور وہ لڑکیاں بھی لیکن یہ اندر سے کیا نکلی بہت مشکل ہے' اس دنیا کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

"امی حوصلے سے کام لیں یہ سب کچھ تو مناسب نہیں ہے ہم خود کشی نہیں کریں گے ہم نکل چلتے ہیں یہاں سے۔ آیئے امی یہاں سے بھاگ چلیں۔" امی نے میری طرف دیکھا پھر پھیکی آواز میں بولیں۔

"اب یہاں سے بھاگنا اتنا آسان نہیں ہو گا میں سب کچھ سمجھتی ہوں سب کچھ جانتی ہوں۔"

امی کا کہنا بالکل ٹھیک تھا میں نے دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ ہم لوگ واقعی مصیبتوں کا شکار ہو گئے تھے اور اب ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ رو رو کر یہ خیال دل میں آتا تھا کہ دیکھو تقدیر نے کیسا دھوکہ دیا ہے خیر میں نے تو ہوش سنبھالتے ہی اپنے لیے دکھ دیکھے تھے۔ بچپن بھی اس طرح سے گزرا تھا کہ دوسروں سے الگ تھلگ۔ دوسرے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے تھے اور میں صرف اپنی ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھتی تھی۔ میری زندگی یہی ہو کر رہ

کم میرے لیے نہیں تھیں لیکن تقدیر کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا سب کچھ بے کار ہے۔ ہم فیصلہ بھلا کیا کر سکتے۔ امی کی تو رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں میں شاید اس سنگین صورت حال کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی جو کچھ انہوں نے کہا تھا تھوڑا بہت تو سمجھ میں آگیا تھا لیکن دنیا سے مکمل ناواقفیت تھی۔ میں نے امی سے کہا۔

"امی اب ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے آخر وہ ہم سے کیا چاہتی ہیں آپ ان سے تعاون کر لیجئے تاکہ ہماری یہ مشکل حل ہو جائے اب اس کے علاوہ ہمیں کون سا ٹھکانہ ملے گا۔" امی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ دیکھتی رہیں اور پھر اور بھی بلکنے لگیں میں نے کہا۔

"آخر وہ مجھ سے کیا چاہتی ہیں............؟"

"آہ میری معصوم بچی جو کچھ وہ بدبخت عورت چاہتی ہے تو اگر سمجھ لے تو زندگی کھونے پر آمادہ ہو جائے۔"

"تو مجھے سمجھایئے نا امی۔"

"کوئی ماں اپنی بیٹی کو یہ نہیں سمجھا سکتی کہ کہ............" امی جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئیں بہت غور کیا میں نے اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ جب امی کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال وقت گزرتا رہا۔ چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دیا تھا نگینہ خانم نے ہمیں اور وقت اتنی تیزی سے گزر رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر ہمیں کھانا دیا گیا۔ کھانا دینے کے لیے صبا آئی تھی میں نے صبا سے کہا۔

"صبا میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کھانا کھالو۔"

"دیکھو تو سہی میری امی کی حالت کیا ہو رہی ہے۔"

"امی کو سمجھاؤ کہ اماں کی بات مان لیں۔ اماں جو کچھ کہہ رہی ہیں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہیں۔"

"صبا' میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو کیا بات ہے؟"

"الگ میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم میرے ساتھ آؤ۔" صبا نے کہا اور امی چیخ پڑیں۔

"اس کو میرے ساتھ جانے دو بڑی بی تم کھانا کھاؤ ویسے بھی اب اس کا اور تمہارا ساتھ نہیں رہے گا۔ تم پاگل ہو جبکہ یہ مجھے سمجھدار لگتی ہے۔" صبا نے میری امی کے بارے میں ایسے الفاظ کہے تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا۔

"دیکھو صبا یہ میری ماں ہیں اور ان کی عزت کرنا تمہارا فرض ہے۔"

"تو پھر ان سے کہو کہ ہم لڑکیوں کے بیچ میں ٹانگ نہ اڑائیں۔ آؤ میرے ساتھ کھانا بعد میں کھا لینا۔" امی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو صبا نے باہر شہباز کو آواز دے دی۔ اسے دیکھ کر تو ہماری جان ہی نکل جاتی تھی۔ چنانچہ امی بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئیں۔ صبا مجھے ساتھ لیے ہوئے دوسرے کمرے میں آگئی۔

"صبا آخر آنٹی مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔" میں نے کہا اور صبا مسکرانے لگی۔ پھر اس نے مجھ سے جو باتیں کیں۔ انہوں نے میرا چہرہ شرم سے سرخ کر دیا ایسی ایسی شرمناک باتیں اس نے مجھے کہیں کہ میرا دل چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں میں نے اس کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا وہ ہنس پڑی اور بولی۔

"ٹھیک ہے بی بی وقت آنے دو دعائیں نہ دو ہمیں تو ہمارا نام بھی صبا نہیں۔" پھر صبا مجھے میرے کمرے میں چھوڑ گئی امی کھانا لیے بیٹھی تھیں ابھی تک انہوں نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ میں نے امی سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں امی آخر ہمارے پاس ایک حق تو ہے وہ یہ کہ ہم اپنی زندگی کھو دیں خودکشی کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا ہے مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے معافی چاہتی ہوں آپ تو مجھے کچھ بتا ہی نہیں رہی تھیں لیکن میرا حالات سے واقف ہونا ضروری تھا۔"

"کیا فیصلہ کیا تم نے............؟"

"مر جائیں گے امی دونوں' بے فکر رہیں آپ' آپ سے پہلے میں جان دوں گی۔ مجال ہے کسی کی کہ میرے بدن کو ہاتھ لگا سکے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں کھانا کھایئے چلیے ہمیں کم از کم فیصلہ کرنے کا موقع تو ملا۔"

میں نے بہادری سے کہا اور میرے ان الفاظ نے شاید امی کو حوصلہ دیا۔ ہم لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا میں بہت سی سوچوں میں گم تھی صبا اور حنا تو بہت بری لڑکیاں تھیں میں تو سمجھتی تھی کہ وہ صرف شوخ اور چنچل ہیں لیکن اصل میں وہ بدکار تھیں اور کسی فاحشہ سے بھلائی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ میں تو پرسکون

اسے اس کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکے۔ میں بھی بالکل مطمئن تھی اور مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ رات کا کھانا بھی آیا' ہم دونوں اب ذہنی طور پر مطمئن تھے اور یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ کھانے پینے کے بعد مر جائیں گے مرنے کے لیے طریقہ کار بھی سوچ لیا تھا اور مجھے یہ طریقہ کار سوچ کر بڑی ہنسی آئی تھی۔ بہر حال رات کے کھانے سے فراغت حاصل کی شہباز برتن اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ کم بخت شاید ہمارے دروازے پر ہی جما رہتا تھا۔ اسے ہماری پہرے داری سونپ دی گئی تھی۔ جس کمرے میں ہم تھے اس میں کوئی ایسی کھڑکی وغیرہ بھی نہیں تھی جس سے ہم فرار ہونے کی کوشش کر سکتے' بظاہر بالکل قیدی تھے اور ہمارے پاس بچت کا کوئی راستہ نہیں تھا لیکن پھر مجھے اس کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ البتہ کھانے کے بعد دماغ اتنا بھاری ہو گیا کہ ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے وہیں کے وہیں سو گئے شاید کھانے میں کوئی ایسی چیز دی گئی جو ہمیں بے ہوش کر دے اور میرا اندازہ بالکل ٹھیک ہی نکلا صبح کو میں اپنے بستر پڑی ہوئی تھی لیکن امی کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا میں نے امی کو آوازیں دیں اور جب ان کی آواز نہ پائی تو خوف سے پاگل ہو گئی۔ میں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا' امی کو آوازیں دینا شروع کر دیں تو شہباز اندر آیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"دیکھو یہ چاقو ہے میرے ہاتھ میں تیری ناک کاٹ لوں گا اور تیرے سر کے بال صاف کر دوں گا۔ پھر چیختی ہوئی اچھی لگے گی آواز بند کر ورنہ گردن دبا دوں گا۔"

وہ اس طرح آگے بڑھا کہ میں سہم گئی میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نہیں' نہیں میں نہیں چیخوں گی۔"

"ہاں خیال رکھنا الٹے دماغ کا آدمی ہوں۔" وہ باہر نکل گیا اور دروازہ باہر سے بند ہو گیا تھا اب میرا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ امی کے ساتھ رہ کر تو سب کچھ کر سکتی تھی لیکن یہ تنہائی اور پھر کچھ اس طرح مجھ پر ہیجان سوار ہوا کہ مجھے سردی لگنے لگی اور میں بستر میں لیٹ گئی اتنی شدید سردی لگ رہی تھی کہ بدن برف میں ڈوب رہا تھا۔ پھر مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ شدید بخار کا یہ اثر نہ جانے کتنا طویل رہا اس وقت شام کے سناٹے فضاؤں میں ابھرے ہوئے تھے اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کافی وقت گزر چکا ہے امی سے جدائی نے دل کی بری حالت کر دی تھی۔ آنکھیں کھولیں تو آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی' اسی وقت دروازہ کھلا اور نگینہ خانم نے اندر

"جی ڈاکٹر صاحب میری بیٹی ہے یہ کبھی کبھی اول فول بکنے لگتی ہے اس وقت دیکھیے کتنے شدید بخار میں مبتلا ہے۔"

"میں دیکھے لیتا ہوں آپ باہر جائیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"میرے سامنے دیکھ لیجئے آپ۔"

"سنا نہیں آپ نے آپ باہر جائیے۔" ڈاکٹر کی آواز کچھ عجیب سی تھی نگینہ خانم خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ جب ڈاکٹر میرے قریب پہنچا اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"ہاتھ دکھائیے۔" اور میں نے ہاتھ اس کی طرف نہ بڑھایا تو اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری نبض چیک کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت چھائی ہوئی تھی پھر اس نے میری آنکھیں دیکھیں پھر اس نے کہا منہ کھول کر زبان دکھاؤں تو میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ نہ تمہاری دی ہوئی دوا کھاؤں گی اور نہ میں جینا چاہتی' سنو ڈاکٹر اگر تم واقعی ڈاکٹر ہو تو میرا کام کر دو تمہیں بتائے دیتی ہوں ان لوگوں نے مجھے یہاں قید کر لیا ہے۔ انہوں نے میری امی کو اغوا کر کے کہیں روپوش کر دیا ہے ہم لوگ خود کشی کر لیں گے ورنہ ڈاکٹر ہماری مدد کرو۔" ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے اپنی گردن کے پاس کوئی چیز ٹٹولی اور اسے ٹٹول کر اپنے چہرے سے ایک جھلی سی ہٹا دی میری آنکھیں اسی کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن جھلی سی ہٹنے کے بعد میں نے جو دیکھا اسے دیکھ کر میرے دماغ میں ایک دھماکہ سا ہوا یہ تو وہی تھا جو مسجد میں ملا تھا جس نے ہمیں پہلی بار ناشتہ دیا تھا جس نے ہمیں گاڑی پر سٹیشن چھوڑا تھا۔ وہ حسین نیلی آنکھوں والا نوجوان لڑکا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ مسکرایا تو اس کے موتیوں جیسے چمکدار دانت نمایاں ہو گئے۔

"میرا نام شعبان ہے۔ شعبان علی۔ پہچانیں آپ مجھے........"

"تم.........تم؟"

"ہاں اور سنیے میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں آپ کا نام شیرانہ ہے نہ۔"

"ہاں........"

"ایک بات کہنا چاہتا ہوں آپ سے۔"

"اپنے حالات سے بالکل بے فکر ہو جایئے میں ہر جگہ آپ کے پاس موجود ہوں آپ جہاں بھی کسی مشکل کا شکار ہوں گی میں آپ کی مدد کروں گا آپ کے دشمن آپ پر قابو نہیں پا سکیں گے کیا آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں..........؟"

"تم مجھے اور امی کو یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

"یقیناً لے جاؤں گا۔ یہاں کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس بات پر آپ مکمل اطمینان رکھیے گا۔"

"مگر شعبان تم کون ہو؟" میرے سوال پر وہ ایک بار پھر مسکرا دیا اور بڑی معصومیت سے بولا۔

"شعبان.........."

"شعبان تو ہو لیکن.......... لیکن ان لوگوں سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"کن لوگوں سے؟"

"جن لوگوں کے درمیان تم آگھسے ہو کیا تم واقعی ڈاکٹر ہو.........."

"ارے باتوں میں تو میں بھول ہی گیا یہ دوا کھایئے آپ فوراً فوراً.........." اس نے اپنی جیب سے ایک پڑیا نکال کر مجھے دی۔

"مجھے دواؤں سے نفرت ہے۔"

"لیکن آپ کو بخار ہے۔"

"اتر جائے گا بخار پہلے تم میری بات کا جواب دو۔"

"نہیں پہلے آپ یہ دوا کھایئے مان لیجئے نا میری بات۔" اس نے زبردستی مجھے دوا کی پڑیا کھلا دی۔ وہ بے مزا سا پاؤڈر تھا۔ میں نے منہ بنا کر اسے حلق سے اتار لیا اور شعبان مسکرانے لگا۔

"تو جناب میں آپ کو بتا چکا ہوں میرا نام شعبان ہے اور میں آپ کا.........." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا کیونکہ باہر عجیب سی آوازیں ابھری تھیں، میں بھی ان آوازوں پر غور کرنے لگی یوں لگ رہا تھا جیسے دروازے سے باہر بہت سی بلیاں لڑ پڑی ہوں ایسی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں حیرانی سے دو قدم آگے بڑھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر اس سے کان لگا دیا۔ یہ آوازیں خود میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور میں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی، آنے والے چار افراد تھے

داڑھیاں تھیں ان کی شکلیں تقریباً یکساں ہی نظر آ رہی تھیں۔ میں ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے لگی وہ چاروں طرف دیکھ رہے تھے تب میں نے پلٹ کر شعبان کو دیکھا اور پھر بری طرح چونک پڑی شعبان میرے پیچھے نہیں تھا یہاں اس کمرے میں دو مسہریوں کے سوا کچھ نہیں تھا یا پھر وہ باتھ روم میں تھا جو کمرے کے اندر ہی بنا ہوا تھا۔ باقی کھڑکی وغیرہ اور کوئی نہیں تھی ان میں سے ایک پھرتی سے باتھ روم کی طرف دوڑا تھا اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا باقی افراد مسہریوں کے نیچے جھانکنے لگے تھے۔ ایک طرف دیوار میں الماری بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھر حیرانی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے جو باتھ روم میں داخل ہوا وہ بھی باہر نکل آیا تھا۔

"نہیں یہاں تو نہیں ہے.........." میں خود حیران پریشان کھڑی تھی۔ وہ لوگ ایک لمحے تک مجھے دیکھتے رہے لیکن انہوں نے شعبان کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں تو خود چکرائی ہوئی تھی۔ شعبان پتا نہیں کہاں نکل گیا میں نے حیرانی سے خود بھی ادھر اُدھر دیکھا اس دوران وہ چاروں دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے اور پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے ابھی باہر نکلتے ہوئے انہیں ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک ہی شہباز نگینہ خانم کے ساتھ اندر داخل ہو گیا نگینہ خانم نے بھی چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر کہاں گیا..........؟"

"ڈاکٹر' ڈاکٹر۔"

"یہ دروازہ باہر سے کس نے کھولا؟" نگینہ خانم نے دوبارہ سوال کیا۔

"یہاں کون آیا تھا۔" شہباز نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"تمہیں معلوم نہیں کون آیا تھا یہاں..........؟"

"تو پھر ڈاکٹر کہاں گیا..........؟"

"آسمان پر پرواز کر گیا۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"خانم یہ دروازہ باہر سے کس نے کھولا..........؟"

"مجھے کیا معلوم.........."

"شکر ہے اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی لیکن خانم جس نے بھی دروازہ کھولا

"مجھے تو وہ ڈاکٹر ہی مشکوک معلوم ہو رہا تھا۔"

"پتا نہیں کون مشکوک ہے۔" شہباز نے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"تمہارا بخار اتر گیا۔"

"تم جہنم میں جاؤ میری امی کو فوراً میرے پاس پہنچا دو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"ارے واہ کیا کرو گی تم۔"

"خودکشی کر لوں گی میں' سمجھے۔ دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جانا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے اگر یہ چاہتی ہو تو ایسا ہی کرو لیکن ایک اور آسان طریقہ ہمارے پاس ہے۔"

"کیا.........؟"

"جو ہم کہہ رہے ہیں وہ مان لو ورنہ تم تو شاید دیواروں سے ٹکرا کر نہ مر سکو لیکن تمہاری وہ بوڑھی ماں ضرور مر جائے گی۔"

"خدا کے لیے میری امی کو میرے پاس پہنچا دو۔"

"نہ صرف انہیں تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا بلکہ تم دونوں یہاں عیش کی زندگی گزارو گی۔ دیکھو ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ اس وقت کیا فائدہ ہو گا جب تم اپنی ماں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی وہ بڑھیا تو ہمارے لیے بیکار ہے لیکن تمہیں تو ہم مرنے نہیں دیں گے یہ ہمارا عہد ہے........."

میں نے گردن جھکالی' پریشانی میرے چہرے سے ٹپک رہی تھی' نگینہ خانم نے شہباز سے کہا۔

"تو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ ہی کرتا رہتا ہے شہباز' میری بچی ایسی نہیں ہے۔ بڑو ر کہنا ماننے والوں میں نظر آتی ہے وہ' چل دفع ہو جا یہاں سے میں اسے سمجھاؤں گی۔ اس سے بات کر لوں گی میں' جا باہر دیکھ ڈاکٹر کم بخت کہاں مر گیا۔ بغیر فیس لیے ہی بھاگ گیا۔" شہباز مجھے گھورتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ نگینہ خانم میرے قریب پہنچ گئی اور اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تو نہیں سمجھتی ہم سب مجبور ہیں میں بھی اور میری دونوں بیٹیاں بھی یہ شخص بڑا ظالم ہے اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ میں نے تجھے دھوکا دے کر یہاں بلایا ہے۔ تو یہ تیری

جہاں ہماری اور تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کم بخت نے مجھ سے پہلے' تجھے دیکھ لیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو قابو میں کرنا ہے ورنہ میں تمہاری دونوں بیٹیوں کو ہلاک کر دوں گا میں بھی مجبور ہو گئی تھی بیٹی!" نگینہ بیگم آنسو بہانے لگی لیکن مجھے اس بڑھیا کے چہرے پر مکاری نظر آ رہی تھی جھوٹ بول رہی ہے۔ اتنا اندازہ میں نے بھی لگا لیا تھا کہ شہباز اس کا ملازم ہے اس نے صرف مجھے دھوکہ دینے کے لیے یہ کہانی سنائی ہے۔ پھر میں نے چالاکی سے کام لینا مناسب سمجھا تھوڑی بہت عقل تو مجھ میں بھی تھی۔ میں نے بھی رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آہ آنٹی مجھے یہاں سے نکال لیجئے خدارا مجھے یہاں سے نکال لیجئے۔"

"بیٹی! اگر اس دروازے سے باہر ہم نے قدم بھی رکھا تو تم یقین کرو وہ ہماری بوٹیاں اڑا دے گا۔"

"تو پھر مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں۔"

"کچھ بھی نہیں بس اس کم بخت کی بات مان لو۔ ارے تم کیا سمجھتی ہو کیا صبا اور حنا میری بیٹیاں نہیں ہیں کیا میں نے ان کی حفاظت کرنے کا بندوبست نہیں کیا تھا کیا میں نے چاہا تھا کہ وہ' وہ اس طرح.........."

"تو پھر.........؟"

"بس نہیں کر سکی اور تم بھی لاکھ کوشش کر لو نہیں ہو سکے گا اور بیٹی ایک بات بتاؤں دنیا بہت بڑی جگہ ہے جہاں بھی جاؤ گی لوگ تمہارے حسن اور خوب صورتی کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ وہ تمہیں عزت کا مقام کبھی نہیں دیں گے۔ ہمارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم اس کی بات مان لیں اور اس کے بعد اپنے محل میں راج کریں ہاں' یہ کم بخت ایسا ہی ہے اگر تم اس کی بات مان لو گی تو یہ تمہیں نوٹوں کے ڈھیر کے اوپر بٹھا دے گا۔"

"مگر آنٹی.........."

"نہیں' اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا اگر تمہاری تقدیر ہی خراب ہے تو میں تمہیں سمجھانے کے علاوہ کیا کر سکتی ہوں میری بات مان لیتی تو بہت فائدہ میں رہتی.........." میں نے سر جھکا لیا تھا۔ نگینہ خانم نے کہا۔

"میں اسے بتا دوں گی کہ تم نے ہماری بات مان لی ہے۔ دیکھو اپنی ماں کی زندگی بچاؤ

کہا اور پھر مجھے دلاسے دیتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی دروازہ اندر سے بجایا تو اسے باہر سے کھول دیا گیا۔ کھولنے والا شہباز ہی تھا وہ ہمیشہ دروازے پر موجود رہتا تھا نگینہ خانم باہر نکل گئی اور دروازہ باہر بند ہو گیا۔ میں سکتے کے عالم میں مسہری پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ یا الٰہی کیا کروں تنہا سوچیں تو میرا ساتھ بھی نہیں دیتی ہیں۔ سارے فیصلے امی ہی کیا کرتی تھیں لیکن یہ بد بخت عورت جو کچھ کہہ رہی ہے او میرے خدا کیا واقعی زندگی کھو دوں مر جاؤں۔ کتنا آسان ہوتا ہے کرنا مشکل۔ کیسے دیوار سے سر ماروں گی اور کیا دیوار سے سر مارنے سے انسان مر جاتا ہے۔ کتنی زور کی چوٹ لگے گی سر میں۔ آہ نہیں میں نے ایسا کوئی قصور تو نہیں کیا ہے پھر کیوں مروں۔ میں کیا کروں.......... کیا کروں اور وہ شعبان کیا الٹی سیدھی بکواس کر رہا تھا تمہیں کچھ نہیں ہو گا اور پھر اس طرح بھاگ گیا لیکن وہ بھاگا کیسے کوئی ایک بات ایسی نہیں تھی جس کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوتی نہ جانے کہاں کہاں کی الٹی سیدھی سوچیں دامن گیر تھیں۔ پھر امی کا خیال آیا بے چاری میرے بغیر کیسے گزارہ کر رہی ہوں گی دل اس طرح سینے میں پھڑ پھڑانے لگا کہ بیان سے باہر ہے۔ کون سی ایسی ترکیب ہو جو میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ امی کے پاس پہنچ جاؤں پھر وہ جو کہیں وہی کروں جیسا بھی کہیں۔ وہی تو سب کچھ مناسب سمجھتی ہیں لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ.......... آہ یہ لوگ کچھ نہیں کرنے دیں گے اپنی منوا کر رہیں گے۔ میرے خدا' میری مدد کر میں نے دل میں سوچا پھر آنسوؤں کے علاوہ اور کیا رہ جاتا آنسو' اور یہ آنسو میں دو دن تک بہاتی رہی نگینہ خانم ہر بار ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی جو کچھ کہہ رہی ہے اسے مان لیا جائے بس اور کچھ نہیں ہو گا۔

☆------☆------☆

تیسرے دن نگینہ خانم نے پھر میرے سامنے پینترہ بدلا اور کہنے لگی۔

"بس اس سے زیادہ شہباز برداشت نہیں کر سکتا اس نے آخری بات کہہ دی ہے۔"

"کیا آخری بات کہہ دی ہے..........؟" میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"آج رات کچھ لوگ آئیں گے ان میں اہم مہمان بھی ہے۔ شہباز بتا رہا تھا کہ تمہیں اس مہمان کے ساتھ تنہا کمرے میں رات گزارنی ہو گی جو کچھ وہ کہے اسے ماننا ورنہ شہباز نے کہہ دیا ہے کہ مہمان کو ذرا بھی تم سے کوئی شکایت ہوئی تو تمہاری گردن

رہا تھا وہ۔"

"کیا..........؟" میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"کہہ رہا تھا کہ پہلے تمہارے سامنے تمہاری ماں کی گردن کٹی لاش رکھ دی جائے گی اور اس کے بعد اس کے سامنے تمہیں بھی بکرے کی طرح ذبح کر دیا جائے گا۔" میں نے خوفزدہ ہو کر گردن پر ہاتھ رکھ لیے نگینہ خانم مجھے سمجھاتی رہیں اور پھر چلی گئیں میرے دل پر جو کچھ گزر سکتی تھی کوئی بھی صاحب دل اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ کیسے وقت گزرا کس طرح مر مر کر جی' میرا دل ہی جانتا ہے۔ پھر وہ کم بخت حنا آگئی اس نے آنے کے بعد نیا لباس مجھے پہننے کے لیے دیا میرے چہرے پر میک اپ کیا اور مجھے سمجھانے لگی کہنے لگی۔

"دیکھو' بس یہ آخری موقع ہے اس کے بعد سمجھ لو زندگی کی شام ہو جائے گی تمہیں سب کچھ بتا دیا گیا ہے اور جو کہا گیا ہے وہ اسی انداز میں کرنا ہے بس اب تھوڑی دیر کے بعد سیٹھ صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

"کون سیٹھ صاحب..........؟"

"یہ تو ہم نہیں جانتے لیکن سنا ہے کہ بہت بڑے سیٹھ ہیں کروڑ پتی.......... اگر کسی کروڑ پتی نے تمہیں پسند کر لیا تو سمجھ لو سب کی عید ہو جائے گی۔"

"لعنت ہے اس کروڑ پتی پر۔"

"لعنت بھیجنے سے کام نہیں چلے گا بی بی اسے خوش ہونا چاہیے سمجھ رہی ہو نا تم۔" وہ مجھے بناتی سنوارتی رہی' بہت خوب صورت لباس پہنایا اور میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو خود بھی عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی اس سے پہلے میں اپنے آپ کو اچھی لگتی تھی لیکن آپ لوگ یقین کریں آج مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی کاش میں انتہائی بد صورت بد شکل چڑیل جیسی لڑکی ہوتی تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا کبھی کبھی بہت ہی پیاری شے بھی کس قدر دشمن بن جاتی ہے۔ میری صورت میری دشمن بنی ہوئی تھی اور اپنے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا یہاں تک کہ نگینہ خانم میرے پاس آئیں انہوں نے مجھے غور کر دیکھا اور بولیں۔

"یہی وقت ہے لڑکی' اپنے آپ کو بنانے یا مٹانے کا' سمجھ رہی ہو نا تم۔ سیٹھ صاحب کا نام سیٹھ ناصر ہے ناصر' اتنے بڑے سیٹھ ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں بس ان

سکتا۔" میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ چل پڑی۔ نہ جانے کس طرح دل کو سنبھالتی ہوئی یہ فاصلہ طے کر رہی تھی۔ بڑے ہال نما کمرے میں پہنچ کر میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ شہباز ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ صبا اور حنا ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دوسرے صوفے پر ایک عجیب و غریب شخصیت نظر آ رہی تھی گول مٹول کدو جیسا گردن کا تو نام و نشان نہیں تھا یوں لگتا تھا جیسے ایک بڑے سے تربوز پر چھوٹا سا خربوزہ رکھ دیا گیا ہو۔ چہرہ بڑا بد نما تھا۔ کالا رنگ بڑی بڑی مونچھیں۔ جس سے ہونٹ ڈھکے ہوئے تھے سر پر عجیب سے ڈیزائن کی ٹوپی پہنے ہوئے' دو بڑے دانت نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ بدن پر شیروانی پہنی ہوئی تھی اور زیریں لباس پائجامہ تھا۔ پتا نہیں کیا شے لگ رہا تھا وہ۔ دولت بھی کم بخت کیسی اندھی چیز ہوتی ہے۔ نہ جانے کس طرح ٹٹولتی ہوئی ایسوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ سیٹھ صاحب اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

ان کے دانت پہلے ہی نکلے ہوئے تھے ویسے بھی لگتا تھا جیسے مسکرا رہے ہوں۔ میری طرف دیکھ کر انہوں نے عجیب سے انداز میں آنکھیں مٹکائیں اور دانت نکال کر شرماتے ہوئے بولے۔

"اچھی ہے۔ اللہ قسم اچھی ہے۔" نگینہ بیگم آگے بڑھ کر بولیں۔

"حضور کہیے جیسا کہا تھا ویسی نہیں ہے..........؟"

"اس سے بھی زیادہ ہے۔" سیٹھ صاحب نے پھر بھکاریوں کے سے انداز میں بولے۔

"حضور ہم نے کہا تھا نا کہ قدر دانوں کی قدر ہمارے دل میں ہوتی ہے اور ہم ایسے ہی نگینے پیش کرتے ہیں۔"

"جبھی تو تمہارا نام نگینہ خاتون ہے۔"

"جی' جی' جی۔" نگینہ خانم نے سیٹھ صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔" سیٹھ صاحب نے پھر وہی فقیرانہ انداز اختیار کرکے مجھ سے کہا۔ میں نگینہ خانم کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے کہا۔

"سیٹھ صاحب کہہ رہے بیٹھ جاؤ۔" میں ایک صوفے کی جانب بڑھی تو سیٹھ صاحب بولے۔

تیرے پیٹ میں گھونپ دیتی اور اس میں غلاظت کا جو طوفان بھرا ہوا ہے اور اسے باہر نکال پھینکتی لیکن کیا کرتی بے بس تھی۔ قریب جا کر بیٹھ گئی۔

"کیا نام ہے..........؟" انہوں نے اسی انداز میں گردن مٹکاتے ہوئے پوچھا۔ دل تو چاہا کہ کہوں تمہاری ماں لیکن جانتی تھی کہ اس کے بعد شہباز کیا کرے گا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"شیرانہ.........."

"شیرینی۔" سیٹھ صاحب شاید بہرے بھی تھے۔

"شیرینی نہیں شیرانہ۔"

"ہمیں تو شیرینی لگتی ہو۔" سیٹھ صاحب نے کہا۔

"آپ کی آنکھیں کچھ کمزور ہیں..........؟" میں نے سوال کیا اور پھر دانتوں کے نیچے زبان دبالی لیکن سیٹھ صاحب ہیں ہیں کرکے ہنسنے لگے تھے۔

"نہیں دل کمزور ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ہارٹ فیل نہیں ہو سکتا آپ کا؟"

"ایں' یہ کیا بولا..........؟"

"نہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"ارے' شکریہ تو تمہارا۔ ابھی کیا نام ہے تمہارا نگینہ خاتون۔"

"جی جی نگینہ خانم۔"

"ایک ہی بات ہے عورت کو خاتون کہہ لو۔ خانم کہہ لو یا' پتا نہیں اور کیا کہہ لو۔ تو ہم انہیں ساتھ لے جائیں گے اپنے۔"

"جی.........." نگینہ خانم چونک پڑیں اور سیٹھ ناصر نگینہ خانم کو گھورنے لگا۔

"تمہارے کو اعتراض ہے کیا..........؟"

"وہ' نہیں بات یہ نہیں ہے سیٹھ صاحب کیا یہ گھر آپ کو پسند نہیں آیا..........؟"

"ارے کیا بولتی ہو۔ ارے کیا نام ہے تمہارا ایں۔ کیا نام ہے تمہارا..........؟"

"نگینہ' نگینہ خانم۔"

"ارے کوئی بھی نام ہو۔ میں تمہارے کو کیا بولتا ہوں اور تم کیا بولتی ہو۔"

"میں نے کہا نا کہ ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے' ہم لڑکیوں کو باہر نہیں بھیجتے۔"

بچی ہو بولو۔ کتنی قیمت مانگتی ہو اس کی۔"

سیٹھ صاحب نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سامنے رکھنا شروع کر دیں۔ نگینہ کی آنکھیں تو حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس نے کہا۔

"ارے نہیں' نہیں' سیٹھ صاحب آپ میں اور دوسروں میں تو فرق ہے ناں' ہے' ہے ناں۔" نگینہ خانم نے پیچھے کھڑے ہوئے شہباز کی طرف دیکھا اور اس نے بھی آنکھیں ہلا دیں۔

"تو ایسا بولو ناں۔ میرے کو ناراض کر دیا تم نے۔ تمہارے کو معلوم نہیں کہ جب بھی ناراض ہوتا ہوں۔ تو' تو زمین آسمان کانپ اٹھتا ہے۔"

"وہ تو آپ کی شکل ہی سے لگتا ہے۔" میں نے جلے کٹے لہجے میں کہا اور سیٹھ صاحب کے چوہے جیسے دانت پھر باہر نکل آئے۔

"تمہارا شکریہ۔ کیا نام ہے تمہارا..........؟"

"بس مجھ سے بکواس نہ کیجئے آپ۔"

"اے خدا قسم۔ ہری مرچ لگتا ہے بالکل ہری مرچ' میرے کو بہت پسند آیا ہے۔ نگینہ خانم' لو یہ اور پیسے لو اور میری بات مانو۔ میں اسے لے جا رہا ہوں۔ واپس پہنچا دوں گا ادھر۔"

"آپ ہمارے ڈرائیور کو ساتھ لے جایئے۔"

"میرے کو رعب مارتا ہے۔ میں اپنا بھی ڈرائیور رکھتا ہوں۔"

"نہیں سیٹھ صاحب۔ میرا مطلب ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" سیٹھ ناصر کو پھر غصہ آ گیا اور انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی کئی گڈیاں اور نکال لیں۔ نگینہ خانم کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"لے جایئے' لے جائیں میں بھلا کیا اعتراض کر سکتی ہوں۔"

"چلو کیا نام ہوا۔ شیرنی' شیرنی۔ چلو میرے ساتھ۔"

"میں' میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے فیصلے لہجے میں کہا۔

"اے کیا بولتا ہے یہ کیا نام ہے تمہارا نگینہ' نگینہ یہ کیا بولتا ہے۔ یہ تو میرے ساتھ نہیں جاتا ہے۔"

بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر پیار سے بولیں۔

"تم ذرا میرے ساتھ آؤ' شیرانہ بات تو سنو میری۔"

میں نہیں جاؤں گی بس میں نے کہہ دیا ہے۔"

"پیاری بچی ضد نہیں کرتے۔ تم دیکھتی نہیں ہو سیٹھ صاحب شکل و صورت سے ہی کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے دل ہی دل میں جل کر کہا کہ کم بخت شکل و صورت سے تو بالکل گینڈا لگتا ہے لیکن اس نے جو نوٹوں کی گڈیاں نکال کر تیرے سامنے رکھی ہیں۔ وہ تجھے بہت پسند آئی ہیں۔ بہر حال میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ شہباز بھی پیچھے پیچھے ہی آ گیا تھا۔ اس کم بخت نے ایک لمبا سا چاقو نکال کر میری گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ صراحی جیسی گردن ہے ناں ہلکا سا ہاتھ پھیروں گا تو شانوں سے نکل کر نیچے جا پڑے گی سمجھ رہی ہے ناں۔"

"تم لوگ آخر مجھ پر کتنا ظلم کرو گے۔"

"ابھی تجھ پر ظلم نہیں کیا ہے ہم نے۔ سمجھ رہی ہے ناں ابھی تو شرافت سے ہی کام چلا رہے ہیں اگر تو واقعی بے عقلی کا ایسا مظاہرہ کرتی رہی تو مجبوراً تجھ پر ظلم کرنا پڑے گا۔"

"ارے بد بخت کیوں اپنی ماں کی دشمن بن گئی ہے۔"

"اگر میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی تو واپسی پر تم مجھ کو میری ماں سے ملا دو گے۔"

"پکا وعدہ ہے بچی۔ سمجھ لے میرا وعدہ ہے۔ میں جان دے دوں گی۔ مگر تیری ماں کو تجھ سے ضرور ملا دوں گی۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی امی کے لیے اب دل جس قدر پریشان تھا میں ہی جانتی تھی۔ کوئی دوسرا اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بہر حال اس منحوس شخص کے ساتھ باہر آئی۔ اس کی لمبی سی خوب صورت کار کھڑی ہوئی تھی۔ کار میں ڈرائیور بھی موجود تھا۔ ناصر سیٹھ نے مجھے پیچھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود میرے ساتھ پیچھے ہی بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی ناصر سیٹھ نے ڈرائیور سے کہا۔

"اے ڈرائیور بھائی۔"

"اگر کوئی ہماری گاڑی کے پیچھے آئے ناں تو تم اس پر فائر کر دینا۔ ذمہ داری ہماری۔"

"جی سر............"

میں نے سوچا کہ یہ ناصر سیٹھ بہت چالاک معلوم ہوتا ہے اسے خطرہ ہوگا کہ کہیں نگینہ خانم' اس کی گاڑی کا تعاقب نہ کرائے۔ بہرحال میں تو پھنس گئی تھی اب اور یہ سوچ رہی تھی آگے چل کر کیا کروں گی۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی ہو سکتا تھا کہ اس سیٹھ کی رہائش گاہ جا کر اس کی منت سماجت کروں گی اسے اپنے غم کی داستان سناؤں گی اور اس کے بعد بھی اس کا دل نہ پسیجا تو پھر جو میری تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا میں تقدیر کے لکھے کو کیسے ٹال سکتی ہوں۔ سیٹھ ناصر بہت خوش نظر آ رہا تھا اس نے اپنے چوہے جیسے دانت باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"اے شیریں۔ ایسا نہیں لگتا کیا۔ جیسے دلہا دلہن کو رخصت کر کے لے جا رہا ہو۔"

"تم خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔" میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بری مرچ لگتی ہے پوری ہری مرچ۔" سیٹھ ناصر نے کہا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں ہیں ہیں' ہیں ہیں کرنے لگے۔ کار تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ میرے دونوں طرف روشنیاں جگمگا رہی تھیں لیکن میرے دل میں تاریکیاں اتری ہوئی تھیں اب اس قدر بے وقوف بھی نہیں تھی کہ یہ نہ جانتی کہ سیٹھ نے جو میری قیمت ادا کی ہے اس کا مطلب کیا ہے' لیکن' لیکن میری تقدیر کو اس طرح پھوٹنا تھا یہ بات میں نے کبھی خواب میں نہ سوچی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب ڈاکٹر عدنان نے مجھ سے اظہار محبت کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت میرے دل میں کوئی تصور نہیں جاگا تھا لیکن ڈاکٹر عدنان اس سے تو لاکھ درجے اچھا تھا۔ اگر میں اس کا کہا مان لیتی۔ مگر کیسے مان لیتی۔ اگر میں مان بھی لیتی تو مشرف تایا کو تو وہی کرنا تھا جو انہوں نے کیا تھا اور یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ لوگ کس قدر چالاک ہیں۔ اب انہوں نے یہ تو نہیں کہا ہوگا کسی سے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے بلکہ یہی بات اڑائی ہوگی' زمانے بھر میں کہ دونوں ماں بیٹیاں گھر سے بھاگ گئیں۔ خیر ظالم تو ظلم کرتا ہی ہے اب اس ظلم کا صلہ کس طرح ملتا ہے یہ دیکھنا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ظالم کی رسی دراز ہی ہوتی چلی جاتی ہے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے اور مظلوم زندگی کھو بیٹھتا ہے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے

بہرحال انہی تمام سوچوں میں ڈوبی رہی پھر دونوں طرف کے راستے تاریک ہو گئے۔ کار تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ نہ جانے یہ شخص مجھے کہاں لے جا رہا تھا' کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ واپس مجھے یہاں آنے ہی نہ دے۔ بات تو وہی امی سے ملاقات کی تھی۔ اگر اس طرح میں اس شخص کے چنگل میں پھنس گئی تو پھر شاید امی سے ملاقات کی امید بھی باقی نہ رہے' کار سفر کرتی رہی اور پھر وہ ایک تاریک عمارت کے بڑے سے گیٹ سے اندر داخل گئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ عمارت کس جگہ ہے۔ یہاں تو بالکل تاریکی نظر آ رہی تھی۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہاں' درخت اور پیڑ بکھرے ہوئے تھے۔ کار رکنے کے بعد ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر پہلے اس سمت کا دروازہ کھول دیا اور ناصر سیٹھ پیچھے سے گھوم کر میرے پاس آ گیا۔

"اترو ناں شیریں بائی۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔"

"شیریں' شیریں.......... بائی نہیں بائی میں نے اس ڈرائیور کو کہا ہے۔"

"اب کیا کروں۔"

"اے میرے ساتھ چلو۔ یہ میرا گھر ہے۔" اس نے بدستور بدن ٹیڑھا کر کے کہا۔ حالانکہ کم بخت کا بدن بھی مشکل سے ہی ٹیڑھا ہوتا تھا بس یوں لگتا تھا جیسے کوئی گیند لڑھک رہی ہو۔ اس کی چال کا بھی یہی انداز تھا۔ میں صبر کا گھونٹ پی کر آگے بڑھ گئی۔ وہ عمارت کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں سے اندر داخل ہو گیا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ یہ بڑی عجیب جگہ تھی۔ ایک بڑے سے دروازے سے گزرنے کے بعد ایک خوب چوڑا کمرہ تھا جس میں روشنی جل رہی تھی لیکن اس میں پڑا ہوا فرنیچر بڑا خوب صورت تھا۔ غالباً آبنوس کی لکڑی سے بنا ہوا تھا دیکھنے ہی سے بے حد قیمتی محسوس ہو رہا تھا۔ دروازوں پر موٹے موٹے پردے لٹکے ہوئے تھے خیر اس کی دولت کا مظاہرہ تو میں نگینہ خانم کے گھر پر ہی دیکھ چکی تھی لیکن میں ایسی دولت پر لعنت بھیجتی تھی' یہ بدبخت اس قدر عمر رسیدہ ہونے کے باوجود عیاش فطرت تھا۔ وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے گیا اور یہ کمرہ تھا کہ بس کوئی جواب نہیں تھا اس کا عظیم الشان مسہری پڑی ہوئی تھی۔ قرب و جوار میں الماریاں لگی ہوئی تھیں مدہم مدہم روشنیوں سے پورا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گئی۔ اب تو شکاری کے چنگل میں آ ہی پھنسی

حال ناصر سیٹھ نے مجھے بٹھانے کے بعد خود ایک بڑی سی چوڑی کرسی سرکائی اور میرے سامنے بیٹھ کر کرسی پر جھولنے لگا۔

"کرسی پر رحم کرو' ٹوٹ جائے گی۔" میں نے اس سے کہا اور وہ پھر ہی ہی کرتے ہنسنے لگا۔

"مذاق کر رہی ہو اچھی لگ رہی ہو۔"

"ایک ہی جملہ تم بار بار بکے جا رہے ہو۔ سنو تمہاری عمر کیا ہے.........؟" میں نے سوال کیا۔

"اے شیرنی مردوں سے ان کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔"

"تمہاری عمر کیا ہے.........؟"

"میں نے بولا ہے ناں۔ مردوں سے ان کی عمر نہیں پوچھتے .... ابھی تم کیوں پوچھتی ہو۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی مجھے دیکھو میں تمہاری بیٹی کے برابر ہوں۔"

"اے کیا بولتا ہے۔ تیرے منہ میں نمک مرچ' بلکہ مرچ زیادہ نمک کم۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ اس کی شکل بگڑ گئی تھی۔ میں نے پھر کہا۔

"اور تم مجھے یہاں لے آئے ہو۔ تمہاری کوئی بیٹی نہیں ہے۔"

"ابھی کدھر ہے۔ میرا شادی نہیں ہوا۔" ناصر سیٹھ نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا قبر میں جا کر شادی کرو گے۔"

"اے پھر میرے کو گالی دیتا ہے۔ اے بابا' میں نے کیا بگاڑا میں تو پورا قیمت ادا کیا۔"

"تم جنگل کے جانور' انسانوں کی قیمت لگاتے ہو خیر خدا کی لاٹھی بے آواز ہے ایسی برسے گی تم پر کہ تم بھی یاد کرو گے۔"

"ارے' رے' رے کاہے کو ڈراتا ہے شیرنی' کاہے کو ڈراتا ہے میرا دم ہی نکل جائے گا۔"

"کاش تمہارا دم ہی نکل جائے۔"

"بس رے کیا تم نے گالی یا ابھی اور گالی باقی رہ گیا ہے۔"

"دیکھو' ناصر سیٹھ میں ایک مجبور لڑکی ہوں ان لوگوں نے مجھے اپنے چنگل میں پھنسا

انہوں نے میری ماں کو اغوا کر کے اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اس طرح انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ آنے پر مجبور کیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" ناصر سیٹھ اس بار ٹھہری ہوئی آواز میں بولا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کی آواز ہی بدل گئی ہو یہ آواز ابھی تھوڑی دیر پہلے والے ناصر سیٹھ کی نہیں تھی میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولا۔

"ہاں میں جانتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب میرا مذاق سنگین ہوتا جا رہا ہے۔"

"مذاق.........؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اسے گھور کر کہا۔

"ہاں۔" اس نے شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے کہا اور جب اس نے شیروانی اتار کر ایک طرف پھینکی تو میں نے حیرت سے دیکھا کہ اس کے جسم پر فوم لپٹا ہوا ہے۔ وہ اس فوم کی بندشیں بھی کھولنے لگا اور پھر اس نے فوم کا اچھا خاصا موٹا لبادہ اتار کر ایک طرف پھینک دیا اب اس کا بدن کشادہ اور صاف ستھرا نظر آ رہا تھا پھر اس نے گردن کے پاس کچھ ٹٹولا اور اس کے بعد اس نے اپنے چہرے سے بھی ایک نقاب جیسی چیز اتار دی اس نقاب کے نیچے سے جو چہرہ برآمد ہوا اسے دیکھ کر جیسے دل میں کیف سرور کی گھنٹیاں بجنے لگیں' میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا میرے سامنے شعبان مسکرا رہا تھا ایک لمحے کے لیے تو چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے خوب ماروں اس نے یہ بھیس بدلا ہوا تھا پہلے بھی یہ ڈاکٹر کے بھیس میں میرے سامنے آیا تھا اور اب......... اب تو اس نے انتہا ہی کر دی تھی۔ میں مسرت و خوشی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ شعبان مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ' اس کی مسکراہٹ تو مجھے دنیا کی سب حسین مسکراہٹ لگتی تھی۔ میرے ہونٹ ہلے' لیکن منہ سے آواز نہ نکل سکی' تب اس نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔

"سوری' شیرانہ' ویری سوری۔"

"شعبان تم........."

"ہاں........."

"مگر تم........."

"بیٹھ جاؤ' شیرانہ باتیں کرنی ہیں تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے اور ایک بات ذہن میں رکھنا کہ تم ایک باعزت اور شریف لڑکی ہو۔ میری نگاہوں میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہارے لیے میلا پن نہیں اترا۔ شیرانہ اب تک جو کچھ اس میں نے کی ہے

باتیں بری لگی ہیں تو اس کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

"مگر یہ قصہ کیا ہے شعبان یہ کیا قصہ ہے تم' تم' تم۔" اور جواب میں اس کے چہرے پر ایک افسردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"شیرانہ۔ اگر میں کچھ کہوں تو برا تو نہ مانو گی۔"

"بہت برے ہو تم شعبان۔ معاف کرنا..........میں' میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ تم ہو گے۔"

"شیرانہ میں' میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں کہو کیا بات ہے۔"

"شیرانہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا اور نظریں جھکالیں۔ نہ جانے کیوں یہ الفاظ مجھے اپنے رگ وپے میں ایک مسرت آمیز سنسنی بن کر اترتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ان لفظوں کی مٹھاس میں میرا دل دماغ ڈوبنے لگا تھا میری آنکھیں خود بخود بوجھل ہو گئی تھیں وہ کہنے لگے۔

"ہاں شیرانہ۔ میں اسی وقت سے تمہیں چاہنے لگا ہو جب میں نے پہلی بار دیکھا تھا شیرانہ یہ ساری باتیں افسانوی معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت کا ایک وجود ہے۔ ایک تاریخ ہے محبت کی شیرانہ۔ انسانوں نے ایک دوسرے کو چاہا ہی ہے۔ یہ کم بخت دل جو ہوتا ہے ناں یہ اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ اس میں اچانک ہی ایک کونپل پھوٹ جاتی ہے اور پھر یہ کونپل کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ وہ جڑیں پکڑ لیتی ہے اور اس کے بعد وہ کونپل ایک تناور درخت بن جاتی ہے۔ شیرانہ میں تم سے اپنی اس بے باکی کی معافی چاہتا ہوں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے اگر میں نے تمہیں نہ بتایا تو میرا سینہ ہی پھٹ جائے گا۔" میں کوشش کے باوجود کچھ نہیں بول سکی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں شیرانہ میں' میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے لیکن۔ لیکن شیرانہ میں تم سے بھی ایک لفظ سننا چاہتا ہوں۔ کیا شیرانہ میں تمہارے لیے قابل قبول ہوں۔" میں نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ الفاظ ذہن میں تھے۔ دل میں تھے زبان پہ نہیں آ پا رہے تھے۔ اس نے کہا۔

ہوں شیرانہ میں اس وقت تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ جب تک میرے وجود میں زندگی باقی ہے وہ لوگ' وہ لوگ میرا جتنا راستہ روکیں گے۔ میری محبت اتنی ہی بڑھتی رہے گی۔ میں.......... شیرانہ میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میں تمہارے گرد ایک نادیدہ حصار قائم کر دوں گا۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ شیرانہ ایسا ہی ہوتا یہ لوگ تمہارے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کر سکتے تھے جو یہ کر رہے تھے لیکن' لیکن کسی نے مجھے مجبور کر دیا ہے شیرانہ میں اپنی مجبوریوں پر قابو پالوں۔ تم صرف مجھے ایک بات کا جواب دے دو شیرانہ' تمہارا جواب دینا ضروری ہے اسی پر میرے آئندہ اقدامات کا انحصار ہے۔ یہ نہ سوچنا کہ اگر تم نے میری محبت کو قبول نہیں کیا تو میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں گا۔ ایسی بات نہیں ہے شیرانہ۔ جو عہد میں نے کیا ہے اسے تو میں پورا کروں گا ہی۔ ہاں ذرا انداز بدل جائے گا۔ اگر تمہاری زبان میرے سامنے نہیں کھل پا رہی شیرانہ تو اپنے منہ سے ایک لفظ ضرور نکال دو۔ ہاں یا نہیں۔" میرا رواں رواں چیخ چیخ کر ہاں' ہاں کہہ رہا تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دے پا رہی تھی یہ ایک ایسی کیفیت تھی جو میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان حالات میں کہ میرے دل میں اچانک ہی جذبے بیدار ہو جائیں گے لیکن نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ پھر اچانک ہی باہر سے بلیوں کے لڑنے کی آواز سنائی دی۔ بالکل یوں معلوم ہوا کہ بلیاں ایک دوسرے پر غرا رہی ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہوں اور یہ آواز سن کر شعبان کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نمودار ہو گئے وہ ایک بار پھر کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر چیخ کر بولا۔

"آ رہا ہوں۔ زیادہ شور نہ مچاؤ۔"

"ک' کون ہے..........؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"کوئی نہیں شیرانہ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بس میں جو تم سے کہہ رہا ہوں شیرانہ۔ خدارا مجھے اس کا جواب دے دو۔ بولو ہاں یا نہیں۔ شیرانہ اگر تم نہیں بھی کہہ دو گی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ میں تقدیر پر شاکر ہو جاؤں گا لیکن شیرانہ جواب ضروری ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔ ہاں نہیں تو پھر نہیں ہی کہہ دو۔"

"ہاں' ہاں۔" میرے منہ سے دو بار نکلا اور شعبان کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہاں کے الفاظ میں نے جان بوجھ کر نہیں کہے تھے۔

سے سرشار ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"دیکھو' شیرانہ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ کچھ لوگ میرا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ غیر نہیں ہیں وہ مجھے کچھ سمجھانا چاہتے ہیں لیکن' لیکن محبت میں کچھ سمجھ نہیں جاتا۔ شیرانہ بالآخر' میں انہیں موم کر دوں گا۔ سنو شیرانہ' یہ جگہ بہت محفوظ ہے شہر سے بہت دور ہے یہ۔ ایک طرح سے یوں سمجھ لو کہ ہماری جگہ ہے یہ' اور' اور یہاں تمہیں باورچی خانہ بھی ملے گا زندگی کی دوسری ضروریات بھی یہاں موجود ہیں۔ ایک طویل عرصے تک بغیر کسی تکلیف کے تم یہاں رہ سکتی ہو۔ میں آؤں گا تمہارے پاس اور سنو شیرانہ ایک بات اور میں بتادوں میں تمہیں اس کمرے کے دروازے سے باہر نکلو گی تو ایک غلام گردش داہنی سمت کو نکل جاتی ہے۔ وہاں سے بائیں سمت کو مڑو گی تو بالکل آخری کمرے میں پہنچ جانا۔ وہاں امی موجود ہیں۔" اس کے یہ الفاظ ایک بار پھر دھماکہ بن کر میرے ذہن میں پھٹے تھے لیکن اس نے میری طرف دیکھا مسکرایا اور بولا۔

"خدا حافظ' شیرانہ بالآخر ایک دن میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ اچھی طرح نمٹ لوں گا۔ دیکھو براہ کرم نہ تو یہاں خوفزدہ ہونا اور نہ ہی ...." باہر سے پھر بلیوں کے لڑنے کی آوازیں سنائی دیں اور شعبان اسی انداز میں پھر چیخ کر بولا۔

"آ رہا ہوں۔ کیا تم بہرے ہو۔ سنتے نہیں ہو۔ آ رہا ہوں۔ دو منٹ۔" آواز بند ہو گئی تو اس نے پھر میری طرف رخ کر کے کہا۔

"میری بات سمجھ رہی ناں۔" لیکن اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"خدا حافظ شیرانہ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا لیکن میرا دل اچھل پڑا تھا۔ میرے قدم بے اختیار دروازے کی جانب بڑھے۔ میں اسے روکنا چاہتی تھی۔ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کم بخت کیسی کیفیت ہو گئی تھی نہ جانے کس طرح لڑکھڑاتے قدموں سے میں دروازے کی طرف آئی۔ باہر جھانک کر دیکھا لیکن تاحد نظر سناٹے اور خاموشی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اب نہ وہاں شعبان تھا اور نہ وہ لڑنے والی بلیاں لیکن' لیکن میری عقل میرا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ شعبان کے آخری الفاظ نے مجھے چونکا دیا تھا۔ پھر نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں دیوانوں کی طرح بھاگتی ہوئی اس طرف چل پڑی۔ جدھر کے بارے میں شعبان نے مجھے بتایا تھا۔ غلام

گردش ختم ہوتے ہی۔ میں نے پاگلوں کی طرح دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ اندر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ بڑا کمرہ تھا اس کمرے میں ایک مسہری پڑی ہوئی تھی اور اس مسہری پر امی گہری نیند سو رہی تھیں۔ آہ' یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو گیا۔ ناممکن' خدا کی قسم ناممکن' ذہن میں بے اختیار ہو گئی تھی۔ میں دوڑتی ہوئی اس مسہری تک پہنچیں اور پھر مسہری پر گر پڑی۔ میرے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"امی' امی۔" اور میری اس آواز پر مسہری پر سوتی ہوئی امی نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے نیند بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر ان کے منہ سے ایک پھٹی پھٹی آواز نکلی۔

"شیرانہ۔" اور دونوں ہاتھ بڑھا کر میری جانب لپکیں۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ انہوں نے مجھے سینے سے بھینچ لیا اور بلک بلک کر رونے لگیں۔ میں انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن امی کے رونے پر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور پھر میں بھی سسکیاں لینے لگی۔

ہم دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی رو رہی تھیں امی کی آواز بند ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ بمشکل تمام میں نے کہا۔

"امی سنبھالیے۔ خود کو سنبھالیے۔"

"آہ' وہ پھر' وہ پھر تمہیں میرے پاس سے لے جائیں گے۔ وہ ہمیں پھر جدا کر دیں گے۔ آہ' میں' میں' میں کس عذاب میں گرفتار ہو گئی۔ شیرانہ' میری بچی' ہم کس عذاب میں گرفتار ہو گئے۔"

"وہ یہاں نہیں ہیں امی۔ وہ اب یہاں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کہاں گئے وہ۔ کہاں گئے...........؟"

"وہ کم بخت شہباز' وہ منحوس کمینہ' وہ سنگدل ظالم' وہی مجھے بے ہوشی کے عالم میں یہاں اٹھا کر لے آیا تھا لیکن لیکن' شیرانہ۔" اچانک ہی امی کے لہجے میں حیرانی پیدا ہو گئی اور وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن یہ وہ کمرہ تو نہیں ہے۔"

"کون سا کمرہ امی۔"

"وہی جس میں مجھے تم سے دور رکھا گیا تھا۔"

"گھر نہیں ہے............؟"

"ہاں............"

"تو پھر............؟"

"آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ آپ یہاں کیسے آئیں............"

"یہاں کہاں کیا واقعی یہ وہ گھر نہیں ہے............"

"نہیں امی یہ تو شہر سے دور ویرانے میں بنی ہوئی ایک عمارت ہے۔"

"کیا............؟" امی حیرت سے بولیں۔

"جی امی............"

"تب پھر۔ ان بدبختوں نے مجھے دوبارہ بے ہوش کر دیا ہو گا۔"

"نہیں امی۔ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کے علم میں نہیں ہے کہ آپ وہاں سے کیسے چلی آئیں۔"

"نہیں میں تو سو رہی تھی۔ گہری نیند سو رہی تھی اور تمہارا ہی خواب دیکھ رہی تھی میں خواب میں دیکھ رہی تھی کہ تم میرے کمرے میں آئیں۔ میری مسہری تک پہنچی اور مجھ سے لپٹ گئیں۔ پھر' پھر' میں جاگ گئی۔ تمہاری آواز سن کر کیا واقعی یہ وہ گھر' وہ گھر نہیں ہے۔"

"نہیں امی............"

"مگر ہم یہاں کیسے آ گئے۔ تم' تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو رہی شیرانہ............؟"

"نہیں امی............"

"پانی مل سکتا ہے مجھے............؟"

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ ایک جانب روم سائز فریج رکھا ہوا تھا۔

میں فریج کی جانب بڑھ گئی۔ فریج میں سے میں نے پانی کی ایک ٹھنڈی بوتل نکالی اور امی کے پاس آ گئی۔ شعبان نے کہا تھا کہ یہاں اس عمارت میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ پہلے ہی مرحلے پر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی اس نے یہاں زندگی کے لوازمات جمع کر دیے ہیں لیکن کیا ہی انوکھا انسان تھا۔ کیا عجیب' یہ سب کچھ کرنے میں اسے کتنی مشکلیں پیش آئی ہوں گی یہ سب کچھ کرنے میں اس ویرانے میں بنی ہوئی ایک عمارت یقیناً

کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ میں امی کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے انہیں ٹھنڈا پانی پلایا اور وہ گہری گہری سانس لینے لگیں پھر بولیں۔

"یہ سب کیا ہے شیرانہ مجھے بتاؤ تو سہی وہ کم بخت کیا وہ یہاں نہیں آ سکتے' کیا انہیں یہ جگہ معلوم نہیں ہے۔"

"نہیں امی وہ یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"مگر شیرانہ' شیرانہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے امی۔"

"میری طبیعت کیا خراب ہوئی ہے بیٹی بس یوں سمجھ لے تیرے غم میں سلگ رہی تھی۔ نہ جانے تقدیر نے ہم پر اتنے مظالم کیوں کیے ہیں یقینی طور پر ہم سے غلطیاں ہوئی ہوں گی جن کی ہمیں سزا مل رہی ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں شیرانہ تو مجھے بتا تو سہی یہ سب کیا ہے۔"

"بتاتی ہوں امی۔" میں نے کہا اور پھر بغیر کسی تکلف کے امی کو ایک ایک لفظ بتا دیا۔ ماں تھی میری۔ ان سے چھپانا بے سود تھا۔ البتہ آخری الفاظ میرے منہ سے نہیں نکل سکے تھے میں نے انہیں یہ تو بتا دیا تھا کہ شعبان نے مجھ سے اظہار محبت کیا ہے لیکن اس بات کا میں نے کوئی جواب دیا یا نہیں یہ الفاظ کوشش کے باوجود میرے منہ سے نہیں نکل سکے تھے اور شاید نکل بھی جاتے تو امی ان پر کوئی توجہ نہ دیتیں ان پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھیں انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں کہا تھا۔ میں خاموش ہو گئی۔

"یہ ہے امی پوری کہانی۔" کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ امی نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا ان کے چہرے پر کشمکش کے سائے رقصاں تھے۔

"کچھ تو بولئے امی۔"

"نہیں بیٹی ٹھیک ہے اللہ کی مدد سے کون انکار کر سکتا ہے............" امی نے جواب دیا پھر کافی دیر تک ہم لوگ خاموشی میں ڈوبے رہے اور نہ جانے کیا کیا سوچیں ہمارے ذہنوں میں آتی رہی تھیں پھر امی نے کہا۔

"اس مکان کو تو نے پورا دیکھا ہے۔"

"نہیں امی لیکن جس راستے سے گزر کر ہم یہاں پہنچے ہیں وہ بہت لمبا ہے اور کچھ

پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ہر طرح کا سازو سامان یہاں موجود ہے لیکن یہ ویرانے میں ہے۔"

امی ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئیں پھر بولیں۔

"تو میرے ہی پاس لیٹ جا دروازہ اندر سے بند کر دے ہم مظلوم لوگ ہیں نہ جانے کہاں سے اور کب ہم پر قیامت نازل ہو جائے۔"

میں نے امی کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اس کے بعد ہم دونوں ماں بیٹیاں بستر پر لیٹ کر نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہیں۔ ساری رات ہی باتوں میں گزر گئی تھی' ہم پرانے قصے یاد کر رہے تھے خود پر گزری ہوئی داستانیں یاد کر رہے تھے اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی اور کی کہانی ایک دوسرے کو سنا رہے ہوں۔ یہ کہانی ہمیں اپنی کہانی معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ خاصا وقت گزر گیا اور پھر صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تو امی اپنی جگہ سے اٹھ کر بولیں۔

"دیکھتے ہیں یہاں کیا کیا موجود ہے۔" پھر ہم اجالے میں ہم دونوں نے اس عمارت کا پورا جائزہ لیا چھ بڑے بڑے اور وسیع کمرے تھے جن میں تین بیڈ روم تھے۔ باقی کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بڑا سا ہال تھا۔ ایک طرف باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ باورچی خانہ میں جدید زمانے کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ایک طرف ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا جو کھانے پینے کی اشیاء سے منہ تک بھرا ہوا تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر فریج بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ الماریوں میں جستوں کے ڈبے' چائے' کافی اور خشک میوے بھرے ہوئے تھے۔ میں تو ششدر رہ گئی۔ میں نے امی سے کہا۔

"امی یہ تمام چیزیں تو ہمارے لیے چھ سات مہینے کے لیے کافی ہوں گی.........." امی نے کوئی جواب نہیں دیا کافی کا لفظ منہ سے نکلتے ہی مجھے کافی کا خیال آیا ابو بھی کافی کے بہت شوقین تھے۔ چنانچہ میں نے امی سے پوچھا۔

"کافی بناؤں امی........" امی عجیب سے انداز سے مسکرائیں۔

"جو دل چاہے کرو۔" انہوں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ جب خوب روشنی پھوٹ آئی تو ہم لوگ حویلی کے بڑے دروازے سے باہر نکلے اور پھر اس کے گیٹ تک پہنچے یہاں سے باہر نکل کر ہم نے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور میرا سر چکرا کر رہ گیا ایک بار پھر میں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ یہاں تو واقعی نگاہوں کی حد تک کوئی انسان نظر

نے پھیکی ہنسی سے امی سے کہا۔

"تو اب ہم اس ویرانے میں رہیں گے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے بیٹی لیکن فی الحال ہمارے لیے یہ محفوظ جگہ ہے وہ کم بخت شہباز ہمیں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتا پھر رہا ہو گا۔"

"مگر امی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چلئے مجھے تو شعبان ناصر سینہ بن کر وہاں سے نکال لایا لیکن آپ کیسے آ گئیں۔"

"اللہ جانے۔" امی نے آہستہ سے کہا اس سلسلے میں انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے دل میں کوئی بات ہے جو وہ مجھ سے کہنا نہیں چاہتیں۔ ایک دوبار کریدنے پر بھی انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی حویلی میں واقعی بڑا سکون تھا۔ بس رات کو ہم لوگوں کو ڈر لگتا تھا۔ تقریباً چھ یا سات دن اسی طرح خاموشی سے گزر گئے ہم دونوں ماں بیٹیاں اسی ایک کمرے میں سوتے تھے جسے ہم خاصا محفوظ سمجھتے تھے۔ کمرے کے عقبی حصے میں ایک بہت بڑی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں اور شیشے لگے ہوئے تھے دروازہ بند کر لینے کے بعد کمرے میں تھوڑی گھٹن ہو جاتی تھی اس لیے رات کو میں ان کھڑکیوں میں سے ایک کا شیشہ کھول دیا کرتی تھی۔ یہاں ہمیں واقعی کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ جس چیز کا تصور کرتے وہ موجود ہوتی ایک الماری میں دواؤں کے بکس بھی رکھے ہوئے تھے۔ فرسٹ ایڈ کا سامان بھی تھا اور یہ تمام چیزیں ایک ایسے گھر کے لیے ضروری ہوتی ہیں جس کے مکین آبادیوں سے دور رہتے ہیں۔ آبادی سے دور کسی بھی چیز کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ وہ یہاں موجود تھیں۔ البتہ ٹیلیفون وغیرہ نہیں تھا۔ لیکن ہمیں کس کو ٹیلیفون کرنا تھا ہم تو خود خوفزدہ چوہوں کی مانند یہاں زندگی بسر کر رہے تھے۔ تو یہ ساتویں رات کی بات ہے میں اور امی مسہری پر لیٹے ہوئے ابو کو یاد کر رہے تھے کہ دفعتاً ہی گولیوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں اور ہم دونوں اچھل کر بیٹھ گئے یہ آوازیں خاصی دور سے آ رہی تھیں۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زبردست فائرنگ ہو رہی ہو ہم دونوں کے چہروں پر خوف کے آثار ابھر آئے۔ امی نے سرگوشی کی آواز میں کہا۔

"یہ تو گولیاں چل رہی ہیں۔"

"ہاں............"

بات ہماری سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی کہ کون ہو سکتا ہے یہاں۔ جو اس طرح ایک دوسرے سے جنگ کر رہا ہے لیکن کافی دیر تک فائرنگ کی آواز آتی رہی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی پھر کوئی آواز نہیں ابھری تھی۔ البتہ ہم دونوں سہمے ہوئے بیٹھے رہے ہماری ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ ہم دروازے سے باہر نکل کر ہی دیکھ لیں۔ ویسے آوازوں کا جتنا فاصلہ تھا' اس کے بارے میں یہ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یہاں سے کافی دور کی ہیں اور قریب میں کوئی آواز نہیں تھی لیکن پھر بھی ہمیں ڈر لگ رہا تھا۔ اس ویرانے میں تو ہم نے ان سات دنوں میں کسی انسان کو نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ فائرنگ کون کر رہا ہے؟ بہر حال نہ جانے کب تک اسی طرح بیٹھے رہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اس کے بعد کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی لیکن پھر اس وقت جب ہم مسہری پر دوبارہ لیٹ گئیں تو اچانک ہی ہمارے کمرے کے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک سنائی دی اور ہم دونوں ہی اٹھ کر بیٹھ گئے امی نے مجھ سے پوچھا۔

"کوئی آواز ہوئی ہے کیا؟"

"ہاں امی۔"

"ہمارے ہی دروازے پر ہے۔"

"ہاں۔" میں نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

"کیا کریں' کیا کریں اب ہم لوگ۔" امی پریشان لہجے میں بولیں۔ میں نے جواب نہیں دیا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی کہ اچانک ہی مجھے شعبان کا خیال آیا کہیں شعبان نہ ہو میں ایک بے اختیار تصور کے ساتھ آگے بڑھی اور میں نے دروازہ کھول دیا لیکن جو شخص دروازے پر نظر آیا اس کو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ چوڑے چکلے بدن کا ایک خطرناک صورت آدمی تھا۔ اس کے شانے سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے سامنے کی قمیض بالکل بھیگی ہوئی تھی وہ تیزی سے اندر گھس آیا اس نے اندر کا ماحول دیکھ کر عاجزی سے بولا۔

"دروازہ بند کر دو خدا کے لیے دروازہ بند کر دو میں تمہیں خدا کا واسطہ دے رہا ہوں دروازہ بند کر دو۔"

ایک لمحے تک تو ہمارے بدن متحرک نہ ہو سکے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"کون ہو تم بھائی کون ہو تم۔"

"کہا نا زخمی ہوں۔ تم دیکھ رہی ہو میرے سامنے کی قمیض خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔"

"تم مگر.........تم۔"

"نہیں دیکھو بہن مجھ سے اس وقت کوئی سوال مت کرو۔ میں صرف تمہیں ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی' میں مظلوم ہوں میرے اوپر ظلم ہوا ہے بس مجھے تھوڑی دیر کے لیے سہارا دے دو تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا آہ' تم' تم۔"

"مگر تم کون ہو.........؟" اس بار میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"میں تمہیں صورت سے جانور نظر آتا ہوں۔ انسان ہوں انسان ہوں بیٹی میں۔ یقین کرو میں کوئی برا انسان نہیں ہوں بس ایک مشکل کا شکار ہو گیا ہوں۔" اچانک ہی امی آگے بڑھیں اور انہوں نے کہا۔

"آؤ اس طرف آجاؤ۔" اس نے احسان مند نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور اس کے بعد آگے بڑھ آیا امی نے اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا۔

"یہ زخم کیسا ہے.........؟"

"گولی لگی ہے میرے شانے میں' ہڈی سے پار ہو گئی ہے ہڈی ٹوٹ گئی ہے شاید.........یا پھر ممکن ہے ایسا نہ ہوا ہو۔"

"تو پھر بتاؤ ہم کیا کریں۔"

"کچھ نہیں بس میں کراہوں گا بھی نہیں' تھوڑی دیر کے لیے مجھے چھپا لو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ میری تلاش میں ادھر آئیں یہاں اور کون کون ہے؟"

"ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" امی نے جواب دیا۔

"بس تھوڑی دیر کے لیے مجھے چھپا دو تم لوگ کمرے کی روشنی بند کر دو عمارت بالکل ویران نظر آتی ہے ہو سکتا ہے کہ میرے دشمن مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں۔ اگر کوئی تم تک پہنچ بھی جائے تو تم ایسا اظہار کرنا کہ تم یہاں کسی کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں جانتی' میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بہن میری مدد کرو بیٹی مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

صورت سے جس قدر خطرناک نظر آتا تھا اس کے بعد اسے اس طرح پناہ دینا میرے خیال میں مناسب نہیں تھا لیکن امی کے دل میں شاید رحم امڈ آیا تھا۔ امی نے لائٹ بھی بجھا دی وہ شخص تاریکی میں کرسی پر ہی بیٹھا رہا تھا ہم لوگ انتظار کرتے رہے رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی ہم بھی سانس روکے ہوئے تھے۔ بے شک یہ عمارت ویران تھی لیکن جتنے دن سے ہم ادھر رہ رہے تھے اس کے بعد ہم نے اس عمارت سے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا تھا حالانکہ اس تنہا عمارت میں جو ایسے کسی سنسان علاقے میں ہو، کسی کا رہنا کس قدر عجیب بات تھی لیکن بہرحال ہم یہاں پر رہ رہے تھے۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی پھر اس شخص نے کہا۔

"بہن اگر اب چاہو تو روشنی جلا دو میرا خیال ہے وہ لوگ اس طرف آئے ہی نہیں۔" امی نے آگے بڑھ کر روشنی جلا دی وہ شخص اسی طرح کرسی پر بیٹھا ہوا تھا امی نے اچانک ہی کہا۔

"ارے شیرانہ تمہارے پاس فرسٹ ایڈ بکس ہے۔"

"جی امی..........."

"جو کچھ کر سکتی ہو کرو خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"جی امی۔" میں نے کہا اور اس کے بعد مجھ سے جو بھی بن پڑ سکتا تھا میں نے کیا، اب ظاہر ہے میں کوئی ڈاکٹر یا نرس تو نہیں لیکن جیسے بھی الٹی سیدھی پٹی لپیٹ سکی اس شخص کے زخم پر خوب ساری روئی رکھ کر پٹی لپیٹ دی۔

"کوئی درد دور کرنے والی گولی ہے۔"

"ہاں..........."

"تو مجھے دو گولیاں دے دو..........." یہ کام بھی میں نے ہی کیا تھا۔

اس شخص کی آنکھوں میں احسان مندی کے آثار نظر آ رہے تھے امی نے کہا۔

"کیا دودھ پینا پسند کرو گے..........؟"

"مل جائے گا.........."

"ہاں.........."

"چائے یا کافی مل جائے گی۔"

"[illegible]"

"تو پھر دودھ کے بجائے مجھے گرم کافی دو جب احسانات کر رہی ہو تو پھر تکلف کیوں کروں۔"

"کچھ کھانا چاہو تو کچھ کھا بھی سکو گے۔"

"نہیں بس ایک کپ کافی۔" اس نے کہا۔

"شیرانہ تم جاؤ گی یا میں جاؤں..........؟"

"میں جاتی ہوں امی ...." میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی نہ جانے کیا سوچ کر امی بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی تھیں کچن میں پہنچ کر میں نے خاموشی سے کافی کے لیے پانی چڑھایا اور پھر امی سے بولی۔

"کیا آپ اس شخص کی طرف سے مطمئن ہیں..........." جواب میں امی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے میں نے ان کی آنکھوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"کیوں امی کیا بات ہے..........؟"

"کچھ نہیں..........." امی نے آنسو خشک کر لیے۔

"مجھے بتائیں گی نہیں۔"

"کیا بتاؤں شیرانہ تمہارے ابو یاد آ گئے تھے۔"

"ابو.........."

"ہاں تمہیں یاد نہیں ہے وہ بھی تو ایک مہینے تک تہہ خانے میں چھپے رہے تھے پتا نہیں ان پر کیا گزری ہوگی پتا نہیں ان پر کیا بیتی ہوگی۔" میں ایک دم خاموش ہو گئی اب میں سمجھ گئی تھی کہ امی کے دل میں ہمدردی امڈ آنے کی وجہ کیا تھی اس کے بعد میں نے کچھ نہ کہا خاموشی سے کافی بنائی ٹرے میں لگائی اور لے کر کمرے میں پہنچ گئی امی بھی میرے ساتھ ساتھ ہی تھیں کافی کے ساتھ ہم نے کچھ عمدہ قسم کے بسکٹ بھی رکھے تھے اس شخص نے ایک بار پھر ہمارا شکریہ ادا کیا تھا اور بسکٹ چھوئے بغیر کافی کے گھونٹ لینے لگا ہم دونوں نے اپنے لیے بھی کافی بنائی تھی میں نے اس کی کافی ختم ہونے کے بعد پوچھا۔

"اور چاہو تو اور مل سکتی ہے۔"

"ہاں ایک پیالی اور..........." اس کے بعد میں اس کا کپ لے کر باہر نکل آئی۔ اس دوران ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی میں نہیں جانتی لیکن اب اس شخص کے لیے زمین پر بستر بچھا دیا گیا تھا ظاہر ہے اس سے زیادہ ہم اسے موقع نہیں دے سکتی تھیں [illegible]

"اگر میں سو جاؤں تو میرا خیال رکھیے گا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے میرا مطلب ہے اگر کوئی آ جائے حالانکہ اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔" پھر وہ سو گیا ہم دونوں نے یہ رات جاگ کر گزاری تھی دوسری صبح وہ اٹھا اس کی حالت کافی بہتر نظر آ رہی تھی اس نے کہا۔

"آپ لوگوں نے میرے لیے مسیحا کا کام کیا ہے۔"

"مگر تم کون ہو تم نے بارے میں کچھ بتایا نہیں۔"

"بس یوں سمجھ لیجیے ایک ستم رسیدہ ہوں۔ بیوی ہے بچے ہیں ماں باپ نہیں ہیں۔ کچھ غلط لوگوں کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ دشمن بن گئے میرے لیکن آپ لوگ فکر مت کیجیے میں بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جب تک تم مناسب سمجھو' یہاں رہو۔ ہم تمہارا کوئی اور تو بندوبست نہیں کر سکتے۔ یہ عمارت بہت بڑی ہے اس کا جائزہ لے کر جہاں بھی دل چاہے اپنے لیے آرام کی جگہ بناؤ............ بس اس زخم کی فکر ہے۔"

"اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ گولی نے ہڈی نہیں توڑی بلکہ شانے کو زخمی کرتے ہوئے نکل گئی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"ہم اس کے بارے کچھ نہیں جانتے۔"

"مگر آپ لوگ اس عمارت میں تنہا کیوں رہتے ہیں۔"

"بس عارضی طور پر ہم یہاں مقیم ہیں۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی امی جلدی سے بول پڑیں۔

"نہیں کوئی خاص وجہ نہیں۔ ہمارے ساتھی کسی کام سے گئے ہیں۔ ایک آدھ دن میں واپس آ جائیں گے۔"

میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ امی کے ان الفاظ پر اس کے چہرے پر ایک تبدیلی آئی تھی اور میرے دل میں خوف کے سائے گھر کر گئے تھے۔

شیرانہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تو سونو کے چہرے پر بے چینی پھیل گئی۔ زیادہ عمر نہیں تھی اس کے کچھ خوش نصیب یا بد نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں زندگی کے بہت

تربیت کی تھی اور حالات نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ ماں' باپ' نسوانیت' انسانی وقار وہ عورت ہو کر مرد کی زندگی گزار رہی تھی۔ ایک عظیم جعلساز کی حیثیت سے خفیہ حلقوں میں روشناس ہو رہی تھی لیکن بدلے ہوئے حالات اور بدلے ہوئے ماحول نے اسے جو تبدیلی دی تھی' وہ اسے بہت خوشگوار لگ رہی تھی اور وہ بے چین تھی کہ اس نوفی داستان کا سرا مل کر آگے کی کہانی شروع ہو۔

☆-------☆-------☆

ہم نے اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا' یہاں اس کے لئے آرام کے تمام انتظامات تھے۔ میں نے اس سے اس کی ضرورتیں پوچھیں تو اس نے کہا۔

"جو کچھ کھاؤ تھوڑا سا مجھے دے دیا کرو بس ایک آدھ دن کی بات ہے' میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

دوپہر کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا' میں کھانا تیار کر چکی تھی اور ٹرے میں لگا کر اس تک جا رہی تھی کہ کمرے میں اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی اور میں حیران رہ گئی۔ نہ جانے وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کی ایک دراز سے جھانک کر دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک چوکور سا بکس دبا ہوا تھا جس میں ایک ایریل نکلا ہوا تھا اور اس بکس پر وہ باتیں کر رہا تھا۔ یہاں چونکہ گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا اس لئے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی کو ہماری کوٹھی کا پتہ بتا رہا تھا' میں دہل سی گئی نہ جانے کس کو پتہ بتا رہا ہے لیکن کیوں؟ لیکن امی نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی کہ اب مجھے اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کر لی وہ کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ غالباً یہ ٹرانسمیٹر تھا۔ زندگی میں کبھی دیکھا تو نہیں تھا لیکن سنا تھا اس کے بارے میں' تھوڑا بہت پڑھا بھی تھا۔ گویا اس کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھا خیر ہو گا کوئی ہمیں اس سے کیا جب تک یہاں نہ رہے گا اور اس کے بعد یہاں سے چلا جائے گا۔ پھر اسی دن شام پانچ بجے کے وقت ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور ایک بار پھر میں بے اختیار سی ہو گئی۔ اب مجھے نہ جانے کیوں شعبان کا انتظار رہنے لگا تھا۔ میں دیوانہ وار اس طرف بھاگی سیاہ رنگ کی بڑی سی ویگن تھی اس میں سے پانچ چھ افراد نیچے اترے تھے لیکن شعبان ان میں سے نہیں تھا میں الٹے پاؤں واپس پلٹی اور آ کر امی کو ان لوگوں کے بارے میں بتایا۔ امی بھی سہم سی گئی تھیں' انہوں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"امی وہ بڑے خطرناک آدمی نظر آ رہے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے' دیکھو کیا لکھا ہے تقدیر میں' جو لکھا ہے وہی تو ہو گا۔" پھر ہم لوگ اپنے کمرے میں بیٹھ گئے' چند لمحوں بعد کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دی اور باہر سے اسی شخص کی آواز ابھری۔

"بہن دروازہ کھولیے۔ دروازہ کھولیے۔" امی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ سب افراد اس کے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے اس شخص نے کہا۔

"آیئے............"

"ک' کہاں............"

"آیئے آیئے۔"

"لل' لیکن کہاں............؟"

"آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔" اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"مم' مگر کہاں بھائی............؟"

"فضول باتوں سے گریز کرو' میرے ساتھ چلو' یہاں تم لوگوں کو بھی خطرہ ہے۔ اس ویرانے میں تم دونوں ماں بیٹیوں کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میرے خیال میں تم دونوں مجھے پاگل معلوم ہوتی ہو یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ پھر جوان لڑکی تمہارے ساتھ ہے' مجھ جیسا شریف آدمی ہو سکتا ہے اور کوئی نہ ہو۔ یہ جگہ بہرحال مخدوش ہو چکی ہے کوئی بھی یہاں آ کر تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"نہیں ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گی۔" میں نے کہا اور اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اب سب نے پستول نکال لئے تھے۔

"جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کرو فوراً چلو ہمارے ساتھ............"

"مگر ہم اس جگہ محفوظ سمجھتے ہیں اپنے آپ کو............"

"تم ہوتے کون ہو ہمیں یہاں سے لے جانے والے؟؟"

"ایسے نہیں مانیں گی یہ' چلو گھسیٹ کر لے چلو۔" اور اس کے بعد وہ لوگ ہمیں بے دردی سے دھکے دینے لگے۔ پستول ان کے پاس تھے۔ کوئی بھی لمحہ ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ ہم پر گولیاں چلا دیں۔ چنانچہ مجبوراً ہمیں ان کے ساتھ بڑھنا پڑا۔ وہ ہمیں جس لے کر ایک بڑی سی ویگن کے پاس پہنچ گیا پھر ہمیں اوپر چڑھا دیا گیا۔ بقیہ افراد ویگن میں بیٹھ گئے

[illegible]

اس کے بعد گاڑی سٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ہماری چھوٹی سی حماقت نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال اس دنیا میں شریف زادوں کی تو کمی ہے۔ برے لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ بلاوجہ مصیبت میں پھنس گئے لیکن ایک بات اور بھی سوچ رہی تھی کہ شعبان اس دوران یہاں نہیں آیا۔ جو لوگ اسے یہاں سے لے گئے تھے پتہ نہیں انہوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو پھر ویسے بھی وہ جگہ مخدوش تھی' کھانے پینے کا بے شک کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تنہائی اور ویرانی کسی بھی لمحے حادثے کا شکار ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھ گئے۔ ویگن نے خاصا لمبا سفر کیا تھا اور اس کے بعد وہ کہیں جا کر رکی۔ ہم لوگوں کو بھی نیچے اتارا گیا' یہ بھی ایک عمارت تھی' ہمیں اندر لے جایا گیا اور اس کے بعد ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ امی خاموش تھیں۔ ان کے چہرے پر ایک مجرمانہ خاموشی طاری تھی۔ میں نے ان سے کچھ نہ کہا لیکن نئی گھٹنے کی قید کے بعد انہوں نے خود کہا۔

"پتہ نہیں مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔ یہ دنیا اتنی بری ہو گئی ہے کہ اب تو کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی بات تو درکنار اچھی طرح بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہے گا پتہ نہیں یہ کمبخت کیا چاہتے ہیں' ہم سے۔" بعد میں ہمیں ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ وہ تو بڑے خطرناک لوگ تھے اور یہ مجرموں کا اڈا تھا' جہاں ہم اس وقت موجود تھے۔ رفتہ رفتہ ہمیں تمام باتیں معلوم ہوتی جا رہی تھیں اس کا ذریعہ اس گھر میں کام کرنے والی ایک ملازمہ تھی' جس کا نام حسینہ تھا۔ بڑی تیز طرار اور چالاک سی عورت تھی' ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"ہوں............ لڑکی تو بہت خوبصورت ہے لیکن غلط جگہ آ گئی ہو' شکل و صورت سے تو شریف زادی لگتی ہو۔"

"بہن یہ لوگ ہمیں زبردستی پکڑ لائے ہیں' حالانکہ ہم نے ان کے ساتھ احسان کیا تھا۔"

"سانپ کو بھی دودھ پلایا ہے تم نے؟" حسینہ نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"تو بس یونہی سمجھ لو کہ اس دوران تم نے سانپ کو دودھ پلایا ہے۔ [illegible] نام دلاور ہے' بڑا چالاک آدمی ہے' اپنے دشمنوں سے جنگ کرتا ہوا زخمی ہو گیا تھا۔

[illegible]

تو آپ اسے یہ جواب دیں کہ ہاں آیا تھا۔"

"ارے ہم نے تو اس وقت کسی کو نہیں بتایا جب وہ وہاں موجود تھا' ہم نے تو اس کی بڑی خدمت کی ہے۔"

"اب وہ تمہاری خدمت کرنے کے لئے یہاں لایا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ حسینہ۔"

"پوچھو............"

"کیا کرے گا وہ ہمارے ساتھ۔"

"نہیں اگر تم بری بات سوچ رہی ہو تو ایسی کوئی بات نہیں ہے' یہ بڑا سخت آدمی ہے' یہاں پر باقی سب برائیاں تو ہوتی ہیں لیکن کبھی کوئی بری عورت نہیں آئی۔ دلاور ایسے لوگوں کو بڑی سخت سزا دیتا ہے۔ تمہاری طرف کوئی بری آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ یہ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔"

مگر وہ ہمیں یہاں لایا کیوں ہے؟"

"کہا نا' یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ بات معلوم ہو سکے کہ اس نے تمہارے پاس پناہ لی تھی۔ بس وہ تمہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔"

"ہم تو کسی کو نہ بتاتے اس نے بلاوجہ ہم کو گھر سے بے گھر کر دیا۔" پھر دلاور سے بھی بات ہوئی اس نے کہا۔

"دیکھو کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام رحمانہ ہے۔"

"سنو رحمانہ! تم نے مجھے بھائی کہا ہے اور میں نے تمہیں بہن۔ یہاں آرام سے رہتی رہو مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا اور کون کون ہے۔ میں ان لوگوں کو تسلی دے دوں گا لیکن ابھی تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"مگر بھائی!"

"مجھے بتا دو کسی کو اگر کوئی پیغام بھجوانا ہے تو میرا وعدہ ہے کہ اسے یہ پیغام بھجوا دوں گا لیکن میری مجبوری ہے میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دے سکتا۔"

"نہیں' ہمیں کسی کو کوئی پیغام نہیں دینا۔"

"یہ تمہاری مرضی ہے۔"

اٹھا کر نہیں دیکھا تھا لیکن بہرحال یہ بھی کیا کم تھا کہ ہم کسی ایسی جگہ رہتے تھے جہاں مجرم رہتے ہوں۔

دلاور کے کچھ اصول تھے۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا اور نہ جانے کیا جرائم کرتا تھا' اس کے بہت سے ساتھی تھے' جانے یہاں کیا ہوتا تھا لیکن وہ لوگ امی کو ماں جی اور مجھے بہن جی کہتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ ہمیں یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کھانا کپڑا' عزت ہر چیز میسر تھی لیکن یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ایک دن امی نے دلاور سے کہا۔

"دلاور تمہیں اطمینان ہو گیا ہو گا کہ ہم کسی کے سامنے زبان نہیں کھولیں گے۔ اب ہمیں جانے دو۔"

دلاور امی کو دیکھنے لگا' پھر بولا۔

"ایک بات مجھے بتاؤ کہ باہر کی دنیا میں تمہارا کون کون ہے۔ تمہارا گھر کہاں ہے' تمہارے رشتے ناطے دار کتنے ہیں' اگر تم یہ بات کہتی ہو کہ مجھے تمہاری طرف سے اطمینان ہو گیا ہو گا تو کیا تمہیں آج تک میری طرف سے اطمینان نہیں ہوا۔ یہاں تمہیں ہر طرح کی عزت حاصل ہے۔ مجھے بتا دو کبھی کسی نے تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہو تو اس کی آنکھیں نکال کر تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔ جب یہاں اطمینان اور سکون سے رہ رہی ہو تو کیوں اس گندی دنیا میں جانا چاہتی ہو۔ ویرانے میں بنی ہوئی وہ کوٹھی تو بالکل بیکار ہے کسی ایسے رئیس کی رہائش گاہ تھی کسی زمانے میں وہ جو وہاں صرف عیاشی کیا کرتا تھا۔ وہ کوٹھی بہت بدنام ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں تو جن بھوتوں کا بیرا تھا' کچی بات تو یہ ہے رحمانہ اگر میں تم سے واقف نہ ہوتا یا اتنے دنوں تک تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں سمجھ نہ لیتا تو میں تو یہی سمجھتا کہ تم بھی کوئی جن بھوت ہی ہو۔ بھلا وہ کوئی رہنے کی جگہ تھی اور وہاں تم دونوں کے سوا اور کوئی تھا بھی نہیں۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی رحمانہ بیگم کہ آخر تم اس کوٹھی میں کیوں رہ رہی تھیں۔ میں نے تمہیں آج تک کسی بات کے لئے مجبور نہیں کیا' یہ تک نہیں پوچھا کہ باہر تمہارا کون کون ہے' تمہاری خدمت کرتا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ اگر تمہاری خدمت میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو............"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو' دلاور!"

آؤں گا۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ دیکھو میں بھی انسان ہوں اور انسانوں کو انسانوں سے تھوڑی بہت محبت ہو ہی جاتی ہے۔ میں تمہیں عزت اور احترام کے ساتھ یہاں رکھے ہوئے ہوں اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ کیا کرو گی باہر کی دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے۔ اگر کوئی تمہارا ہوتا تو تم اس ویران عمارت میں کیوں رہ رہی ہوتیں؟" امی سر جھکا کر کچھ سوچنے لگیں پھر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو دلاور! واقعی دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے لیکن ایک بات تو ذرا سوچو' ایک جوان بچی کی ماں ہوں' نہ جانے کیا کیا ارمان ہوں گے میرے دل میں اپنی بچی کے لئے۔ اب تو سب ہی ختم ہو کر رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی خواہش تو ہے میرے دل میں کہ اپنی بچی کو زندگی کی وہ خوشیاں دوں کہ ماں باپ پہ فرض بھی ہوتی ہیں اور بیٹیوں کا حق بھی ہوتا ہے۔" دلاور کچھ سوچنے لگا' پھر بولا۔

"لیکن رحانہ' دینے کو تو میں بھی بہت کچھ تمہیں دے دوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہارا اپنا تو کوئی ہے نہیں' زمانے کے ہاتھوں میں جاؤ گی تو برباد ہو جاؤ گی۔ اس سے بہتر ایک طریقہ میرے پاس ہے۔"

"کیا.........."

"اگر تمہاری بیٹی بہترین کمائی کرنے لگے اور اتنی دولت اکٹھی کرے کہ اس کی باقی زندگی آرام سے گزر جائے تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟ اس کے پاس دولت ہو گی' پھر بہت سے لوگ خود اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے' اس کے علاوہ میرا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا' یعنی ایک طویل وقت تمہارے ساتھ گزر جائے گا اور ہم دونوں کو ایک دوسرے پہ اعتماد ہو جائے گا تو شاید میں تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دوں۔"

امی کچھ دیر سوچتی رہیں پھر آہستہ سے بولیں۔

"لیکن میری بچی تو بالکل ہی معصوم اور دنیا سے ناواقف ہے۔"

"یہ بھی تمہاری ہی غلطی ہے۔ کیا اس وقت یہ دور ہے کہ ایسی بے وقوف سی بچی کو تم کسی کے ہاتھوں میں سونپ دو۔ دیکھو رحانہ' میری تو یہی رائے ہے کہ اسے دنیا دیکھنے کا موقع دو۔"

"میں پھر یہی سوال کروں گی کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

ہو گی اور یہ دنیا کو بھی دیکھ اور سمجھ سکے گی۔"

"کیا مطلب' مجھ سے الگ رہ کر؟"

"ہاں' کچھ عرصے کے لئے تمہیں اس سے الگ رہنا ہو گا۔"

"نہیں' نہیں' میں اس سے الگ کہیں نہیں رہ سکتی۔"

"تمہیں اندازہ ہے شیرانہ! کہ میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اب بھی اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تم خود اچھے لوگ نہیں ہو۔" دلاور نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے دلاور بہرحال اس کا اندازہ تو ہو چکا ہے کہ تم کچھ بھی ہو لیکن ایک شریف ماں کی اولاد ہو۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وقت نے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔"

"ہاں یہ الگ بات ہے کہ وقت نے مجھے بگاڑ دیا ہے۔ میری ماں واقعی شریف تھی اور .... اور میری ہی وجہ سے وہ موت کا شکار ہوئی۔"

"کیا مطلب..........؟"

"بکواس بند کرو۔ میں کسی الجھی ہوئی پرانی کہانی کو اپنے ذہن میں زندہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے میرے دل کو چوٹ پہنچتی ہے۔"

"خیر' میں یہ سب کچھ نہیں کہوں گی۔"

"میرا خیال یہ ہے کہ تم شیرانہ کو گھر سے باہر نکالو۔"

"ارے مگر یہ گھر سے باہر جائے گی کہاں؟"

"اس کا فیصلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"امی میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"نہیں' شیرانہ' میں نے اچانک ہی فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہئے اور اپنی ماں کی کفالت کرنی چاہئے۔ آنے والا وقت تمہارے لئے بھی اچھا ہی ثابت ہو گا۔"

"لیکن میں جاؤں گی کہاں آخر؟"

"تم اس کی بالکل پرواہ نہ کرو۔ میں تمہیں جہاں بھی بھیجوں گا وہاں تمہاری مکمل حفاظت کا بندوبست کیا جائے گا اور پھر تم وہاں جا کر خوشی بھی محسوس کرو گی۔" دلاور نے اچانک ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لئے کہ اسے روکنے والا تو تھا ہی نہیں۔ البتہ میں اور امی

کام لے گا۔ بہرحال ہم اس کے چنگل میں تھے۔ دلاور نے ایک دن مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ امی کو اس نے نہیں بلایا تھا۔ میرے سامنے آ کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

"دیکھو شیرانہ! اس دنیا کو اپنے قابو میں کرنا بے حد ضروری ہے۔ تم ایک شریف بچی ہو۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن دنیا شریف نہیں ہے۔ گھر سے باہر نکلو گی' فرض کرو میں تمہیں یہاں سے باہر جانے کی اجازت دے دیتا ہوں تو جانتی ہو کیا ہو گا؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"تم ایک خوبصورت بچی ہو۔ اتنی خوبصورت کہ کوئی بھی تمہیں دیکھ کر دیوانہ ہو سکتا ہے۔ باہر کی دنیا میں تم اپنی ماں کے ساتھ جاؤ گی اور اپنی ماں کی زندگی کے لئے بھی خطرہ بن جاؤ گی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"کوئی بھی تمہیں لے اڑے گا اور اس کے بعد اگر تم کسی برے کے ہاتھ لگ گئیں تو تمہیں خود اندازہ ہے.........." میں ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گئی۔ یہ بات تو میں نے دیکھ لی تھی کہ ایک ہمدرد خاتون جو چہرے سے نہ جانے کیا معلوم ہوتی تھیں جب اندر سے کھلیں تو ہماری زندگی ہی برباد ہو گئی۔ وہ تو شکر تھا کہ شعبان ہمارے گرد اپنا ایک حصار قائم کئے ہوئے تھا' ایک ایسا نادیدہ حصار جس کے بارے میں کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا لیکن بہرحال یہ حقیقت تھی کہ شعبان نے ہر موقع پر ہماری مدد کی تھی۔ اگر اب میں کسی اور ایسے ہاتھوں میں پہنچ جاؤں تو امی بے چاری میں کیا ہمت ہے کہ وہ میری حفاظت کر سکیں۔ ہم تو بے سہارا ہو چکے تھے۔ ابو کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بہت دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن مجھے کرنا کیا ہو گا آخر..........؟"

"بس یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہاری تیاری ضروری ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن.........."

"نہیں' جب ایک کام کرنے پر انسان تل جاتا ہے تو پھر اس میں لیکن کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"پھر ٹھیک ہے جیسے تم پسند کرو' میں تیار ہوں۔" میں نے کسی خیال کے تحت کہا اور دلاور خوش ہو گیا' اس نے کہا۔

سے نہیں دیکھے گا لیکن جو کچھ بھی تمہیں کرنا ہو گا انتہائی احتیاط کے ساتھ کرنا ہو گا۔"

"مگر کرنا کیا ہو گا؟"

"میں نے کہا نا' میں تمہیں یہ بات ذرا بعد میں بتاؤں گا۔ دو چار دن آرام کرو۔ اپنی امی سے مشورہ بھی کر لینا بلکہ انہیں مشورہ دینا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ کیا فائدہ زمانہ کے ہاتھوں رل جاؤ گی۔" میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ امی نے مجھ سے دلاور سے ملاقات کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں تمام تفصیلات بتا دیں اور امی کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔

"کچھ بھی ہے بیٹی' لیکن بہرحال یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں کہیں تم سے بھی کوئی ایسا ویسا کام نہ لینا چاہتے ہوں؟"

"امی ایک بات بتایئے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"ہمارا نگران ہمارا سرپرست کون ہے؟" امی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

"ہاں جو نگران اور سرپرست تھا وہ تو نہ جانے اس دنیا میں کہاں گم ہو گیا ہے۔"

"جو گم ہو گیا' اسے تلاش کرنا بالکل بے کار ہے۔ امی! اب تو سب کچھ بیکار ہی ہے' ہمارے لئے۔ دلاور ٹھیک کہتا ہے میں دنیا سے ناواقف ہوں' ہم گھر سے باہر نکلے تھے امی آپ کو پتہ ہے' ہم کیسی کیسی مصیبتوں میں پڑے؟ یہ بھی آپ کو پتا ہے' امی میں چاہتی ہوں کہ باہر کی دنیا دیکھنے کے بعد اپنے آپ کو اس قابل بناؤں کہ دنیا کا مقابلہ کر سکوں۔"

"کیا تم یہ کر سکو گی شیرانہ!"

"کروں گی' لازمی طور پر کروں گی۔ آخر کہاں تک ہم زمانے کی ٹھوکروں میں پڑے رہیں گے؟"

"اللہ تمہاری حفاظت کرے! مگر آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"کہتا ہے ابھی کچھ نہیں بتائے گا۔"

"ٹھیک ہے شیرانہ' مجبوری کا نام شکر ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" امی نے جواب دیا۔

"ہاں مجبوری کا نام شکر ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میری مجبوریاں تو

گزرا' حویلی میں ملازموں کی طرح کام کاج کرتی رہی تھی' حالانکہ مقدس تایا اور مشرف تایا کی اور بھی بیٹیاں تھیں جو اب جوان ہو چکی ہوں گی۔ یقینی طور پر انہوں نے زندگی کی وہ تمام آسائشیں پائی ہوں گی جن کی ایک لڑکی کے دل میں آرزو ہوتی ہے لیکن میری جوانی جس انداز میں گزر رہی تھی وہ بھی سامنے تھا اور اب تو سچی بات یہ ہے کہ شعبان بہت زیادہ یاد آتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ خوبصورت خوش شکل' خوش مزاج۔ اس نے کئی بار میری مدد بھی کی تھی۔ اس کی وہ باتیں یاد کر کے مجھے بہت ہنسی آتی تھی اور کبھی کبھی میرا دل خون کے آنسو رونے لگتا تھا۔ اب رات کی تاریکیوں میں وہ میرے دل میں سلگتا تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا لیکن' لیکن اب تو طویل عرصہ ہو گیا۔ پتہ نہیں اسے ہمارے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس حویلی میں پہنچا ہو۔ کیا کچھ نہیں کر دیا تھا اس نے میرے لئے' سب کچھ مہیا کر دیا تھا۔ وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی ہمیں لیکن بہرحال وہ بھی ایک جائز طریقہ کار نہیں تھا۔ دنیا سے دور اس انوکھی عمارت میں آخر کب تک تنہا رہ سکتے تھے۔ آہ! شعبان تم کہاں ہو۔ کیا تم اپنا کیا ہوا وعدہ بھول گئے۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے گرد ہمیشہ حصار قائم رکھو گے۔ تم مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑو گے۔ اب کیوں نہیں آتے شعبان۔ دیکھو ہم کیسی کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ میں راتوں کو اسے یاد کیا کرتی تھی اور اکثر ساری ساری رات میری آنکھیں اسی آرزو میں کھلی رہتی تھیں کہ شاید شعبان آ جائے۔ کہاں چلا گیا وہ۔ کیا وہ مجھے بھول گیا۔ دنیا کسے یاد رکھتی ہے۔ کون کسی کے لئے مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ میری محبت ایک بیکار چیز ہے۔ مجھ سے اسے کیا حاصل ہو گا۔ ایک لاوارث' بیکار سی لڑکی لیکن تھا عجیب۔ بہت ہی عجیب۔ نہ جانے کون لوگ تھے جو اسے بار بار پکڑ کر لے جایا کرتے تھے۔ بیچارہ کہیں میری وجہ سے کسی مشکل کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ نہ جانے کیا کیا سوچیں دامن گیر رہتی تھیں۔ وقت گزرتا گیا۔ پانچویں دن دلاور خود ہمارے پاس آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے امی سے کہا۔

"کہئے رحمانہ' ماں بیٹی میں مشورے ہو گئے؟"

"کیسے مشورے دلاور!"

"میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس کے لئے میں نے تھوڑا سا وقت بھی دیا تھا۔ میں

"لیکن کم از کم ہمیں یہ تو بتا دو کہ آخر تم شیرانہ کو کہاں لئے جا رہے ہو اور اس سے کیا کام کرانا چاہتے ہو؟"

"دیکھو رحمانہ! ہر بات ہر کسی کو بتائی نہیں جا سکتی البتہ میں تم کو یہ گارنٹی دے سکتا ہوں کہ شیرانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم یہ سمجھ لو کہ اس سلسلے میں میرے اور اس کے درمیان باپ بیٹی کا رشتہ ہے۔ میں اس کا باپ تو بے شک نہیں ہوں لیکن اسے تحفظ تو اسی طرح دوں گا جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو تحفظ دے سکتا ہے۔ اس کے بعد میں اگر تمہیں میری باتوں پر یقین نہ آیا تو جہنم میں جاؤ۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن شیرانہ کے لئے جو فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اب اس میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کروں گا۔"

"جب تم فیصلہ کر چکے ہو دلاور! اور تم نے اتنے مضبوط الفاظ میں اس کے تحفظ کا یقین دلایا ہے تو ٹھیک ہے' میں انکار نہیں کرتی۔"

"شکریہ! ویسے ہفتے میں وہ تمہارے پاس ایک بار آ جایا کرے گی۔ تم سے ملاقات کر لیا کرے گی۔ بالکل بے فکر رہو اور جہاں بھی وہ رہے گی اگر وہ خوش نہ ہو تو تم اس سے پوچھ سکتی ہو۔" امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گردن جھکا دی تھی' میں خود امی سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میں نے یہ بات دلاور سے کہی بھی۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے ساتھ امی کو بھی بھیج دو؟"

"نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہو سکتا تو میں پہلے کر دیتا۔ اب تک خاموشی اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔ پھر اس کے بعد دلاور مجھے ایک کار میں لے کر چل پڑا۔ میرے پاس کپڑے وغیرہ بالکل نہیں تھے لیکن بہرحال میں سمجھتی تھی کہ وہ اس کا انتظام بھی کرے گا اور میرا یہ خیال درست نکلا۔ وہ جس عمارت میں مجھے لے کر گیا وہاں فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے کوریڈور جن میں کمروں کے دروازے تھے۔ ان کمروں میں نمبر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے کمرہ نمبر دس کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے آیا۔ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ یہاں بہت خوبصورت فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ میز' کرسی' لکھنے پڑھنے کا سامان ایک طرف بیڈ' عقب میں ایک بڑی سی کھڑکی۔ ماحول بہت صاف ستھرا تھا ایک چھوٹا سا ٹیلی ویژن بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہوسٹل!" میں نے کہا۔
"ہاں۔"
"کیا ہوتا ہے یہاں؟"
"باہر کے شہروں سے آئی ہوئی لڑکیاں یہاں رہتی ہیں اور ان میں مختلف مزاج اور مختلف خیال کی لڑکیاں ہیں' کچھ ایسی ہیں جو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی ہیں' کچھ ایسی ہیں جو ملازمتیں کرتی ہیں اور رات کو یہاں آ کر سو جایا کرتی ہیں۔ پورا ہوسٹل ان لڑکیوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ لڑکیاں شریف خاندان کی بھی ہیں۔ دولت مندوں کی بھی ہیں اور درمیانہ درجے کی بھی ہیں۔"
"مگر وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہاں کیوں رہتی ہیں!"
"ان سے ملو گی تو تمہیں تمام صورت حال کا اندازہ ہو جائے گا۔"
"ٹھیک' مگر مجھے یہاں کیوں رہنا ہو گا؟"
"تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔"
"کیا کام؟"
"تھوڑے دن انتظار کرو۔ میں تمہیں بتا دوں گا"۔ دلاور خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھا رہا۔ میں بھی اس کمرے کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ عقب کی کھڑکی سے دور تک پھیلی سڑک نظر آتی تھی۔ ایک بھرا پڑا بازار تھا۔ جہاں خوبصورت دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ یہاں زندگی رواں دواں تھی۔ ہر قسم کی موٹر گاڑیاں' کاریں' سکوٹریں' آٹو رکشا' زندگی کو اتنی قریب سے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ ایک نگاہ میں بہت اچھا لگا۔ دل میں تجسس پیدا ہوا کہ دیکھوں تو سہی کہ آخر دلاور مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے لیکن بہرحال اس بات کا احساس تو تھا کہ یہاں عزت محفوظ ہے۔ اگر دلاور سچ بول رہا ہے' تھوڑی دیر کے بعد کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی اور دلاور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک درمیانہ قد کا آدمی اندر آ گیا تھا۔ اچھی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر آنکھوں سے بڑی سفاکی ٹپکتی تھی۔ دلاور نے اس کو اندر بلا کر کہا۔
"اس کا نام توفیق ہے اور اب یہی تم سے ملتا جلتا رہے گا۔ تم اسے اپنا بڑا بھائی کہہ سکتی ہو۔ چچا کہہ سکتی ہو۔ جو کچھ بھی چاہو کہو۔ یہ جانتا ہے کہ اس کے اور تمہارے درمیان کیا رشتہ ہے۔ توفیق سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"توفیق تمہیں کچھ لا کر دیا کرے گا۔ دکھاؤ توفیق وہ کیا ہے۔" دلاور نے کہا اور توفیق نے اپنے لباس سے کچھ نکالا۔ یہ ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ اس لفافے میں چھوٹی چھوٹی مختلف سائز کی پڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر نمبر لکھے ہوئے تھے۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' اس طرح سے آٹھ نمبر تک تھے۔ یہ پڑیاں جسامت کے لحاظ سے نمبر رکھتی تھیں جو سیلوفین کی (Packing) سے جھلک رہی تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ پائی۔ دلاور نے کہا۔
"یہ پڑیاں دیکھ رہی ہو؟"
"ہاں۔"
"لڑکیاں تمہارے پاس آئیں گی اور تم سے ایک فقرہ کہیں گی۔"
"فقرہ؟"
"ہاں۔"
"کیا فقرہ ہو گا وہ؟"
"وہ کہیں گی کہ انہیں محبوب درکار ہے۔"
"تو پھر؟"
"تم ان سے پوچھنا کہ کون سے نمبر کا چاہئے۔ میں ان کی قیمتیں بتائے دیتا ہوں۔ ایک نمبر کی پڑیا کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔ اس طرح آٹھ نمبر تک کی پڑیا کی قیمت آٹھ ہزار روپے ہو گی۔ وہ لڑکیاں تمہیں رقم دے کر لے جایا کریں گی۔ خبردار خاموشی کے ساتھ تمہیں یہ کام کرنا ہے۔ فرض کرو کہ اگر تم نے دس ہزار روپے کی پڑیاں بیچیں تو اس میں سے دو ہزار روپے تمہارے ہوا کریں گے۔ یہ رقم تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہو جایا کرے گی اور اس طرح تم ایک اچھی خاصی حیثیت کی مالک بن سکتی ہو۔"
"لیکن ان پڑیوں میں کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔
"خبردار اس کے بعد دوبارہ یہ سوال کبھی نہ کرنا۔ یہاں توفیق تمہاری مدد کرتا رہے گا۔ یہ تمہیں مال لا کر دیا کرے گا۔ مال احتیاط سے چھپا کر رکھنا اور کسی سے اس کا تذکرہ بھی نہ کرنا۔ ویسے یہاں زیادہ لڑکیوں سے دوستی کی ضرورت نہیں ہے۔ سلام دعا ہر ایک سے رکھو۔ خود وہ لڑکیاں تم سے آ کر ملا کریں گی۔ جنہیں ان پڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں تمہیں خالہ سے بھی ملوائے دیتا ہوں۔ یہ خالہ بھی تمہاری رازدار ہیں۔ صرف یہاں تم تین افراد ہو اور سنو ایک بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ دنیا کا کوئی [illegible]

کھولنا۔ میرا نام کبھی اپنی زبان پر مت لانا۔ یہ مت بتانا کہ تم کون ہو اور کہاں رہتی ہو یا کون تم سے یہ کام کراتا ہے۔ چاہے تم پر کتنے ہی ظلم کیوں نہ کئے جائیں۔ ایسا اول تو کبھی نہیں ہو گا۔ میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں لیکن اگر خدا نخواستہ ایسا کبھی ہو ہی جائے تو تم کہو گی کہ یہ سب کچھ تم خود کرتی ہو' تم یہ کہو گی کہ تم اس دنیا میں بے سہارا ہو اور صرف اس طرح اپنا کام چلاتی ہو۔ توفیق یا خالہ کا نام بھی کبھی مت زبان پر لانا۔ یہ سب تمہارے مددگار ہیں اور تمہیں مصیبت سے بچائے رکھیں گے۔

"جاؤ توفیق خالہ کو بلا کر لاؤ۔" خالہ اس ہوسٹل کی آیا تھی۔ ایک موٹی سی کالے رنگ کی عورت چہرے ہی سے خبیث لگتی تھی۔ دلاور نے خالہ سے میرا تعارف کرایا اور اس کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا اور میں اس ہوسٹل میں فروکش ہو گئی۔ توفیق بھی اچھا آدمی تھا۔ کہنے لگا۔

"میں بھی یہاں ہوا کرتا ہوں۔ تمہیں دنیا کی کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ دیا کرو۔ کسی بات کی پرواہ مت کرنا۔ ویسے دلاور دادا مجھ سے کہہ گیا ہے کہ تمہیں بازار لے جا کر خریداری کرا دوں اور تمہیں سارا سامان دلوا دوں۔ وہ پیسے بھی دے گیا ہے مجھے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بہرحال میری تمام ضرورتیں پوری کر دی گئیں اور میں یہاں وقت گزارنے لگی۔ پھر میری پہلی گاہک آئی۔ دبلی پتلی سی نازک اندام لڑکی تھی۔ چہرے پر عجیب سی بے بسی طاری تھی۔ غالباً وہ کسی تکلیف کا شکار تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بولی۔

"محبوب چاہئے۔"

"اندر آ جاؤ۔" وہ اندر آ گئی اور اپنے لباس سے پیسے نکالنے لگی۔ پھر اس نے چار ہزار روپے میرے سامنے رکھے اور میں نے دو نمبر کی پڑیا اس کے حوالے کر دی جب وہ واپس پلٹنے لگی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"سنو کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے بے بسی کی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور خاموشی سے ٹھنڈی سانس لے کر باہر نکل گئی۔ کچھ عجیب سا انداز تھا اس کا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر ایک گھنٹے کے بعد دوسری گاہک آئی اور رات تک میں نے تقریباً چھ پڑیاں بیچیں۔ جن کی کل آمدنی بیس ہزار روپے تھی۔ گویا میرے چار ہزار روپے کھرے ہو گئے۔ یہ کاروبار تو بہت اچھا ہے۔ لوگ اسے کیوں نہیں

میں عادی ہو گئی۔ آٹھویں دن مجھے امی کے پاس لے جایا گیا لیکن کوٹھی کے دروازے پر ہی مجھے دلاور مل گیا۔

"اپنی ماں سے بھی نہیں کہو گی کہ تم کیا کرتی ہو۔ بس یہی کہنا کہ وہاں رہتی ہو اور تمہیں کوئی کام نہیں دیا گیا۔ خبردار! ورنہ اس کے بعد تم اپنی ماں سے نہیں مل سکو گی۔ میں خاموش ہو گئی۔ امی کے پاس پہنچی۔ وہ بیچاری میرے لئے پریشان تھیں لیکن میں نے انہیں تسلیاں دیں اور کہا کہ جہاں مجھے بھیجا گیا ہے وہاں میں خوش ہوں۔ وہاں دوسری بہت سی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور دلاور کہہ رہا تھا کہ مجھے تھوڑی تھوڑی تعلیم دلائے گا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ یہ شخص ابھی تک ہمارے لئے نقصان دہ نہیں ثابت ہوا۔ اچھا ہے تم تھوڑی بہت پڑھ جاؤ۔ نہ جانے قدرت نے اس کے دل میں ہمارے لئے رحم کیوں ڈال دیا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہاں کوئی برا سلوک نہیں ہوتا۔ میں بھی ٹھیک ٹھاک ہی ہوں"۔ امی سے کافی دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر دوسرے دن صبح کو مجھے واپس ہوسٹل پہنچا دیا گیا اور اس کے بعد میری دکانداری شروع ہو گئی۔ توفیق مجھے مال سپلائی کیا کرتا تھا۔ خالہ اکثر میری خبرگیری کر لیا کرتی تھیں۔ یوں زندگی گزرنے لگی۔ ایک مہینہ' دو مہینہ پھر تقریباً چار مہینے مجھے یہاں گزر گئے۔ میں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں ضم کر لیا تھا۔ ویسے بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پھر ایک دن ایک اور لڑکی میرے پاس آئی۔ اس سے پہلے بھی وہ چار بار آ چکی تھی لیکن ان میں سے کوئی اپنا نام نہیں بتاتی تھی۔ ان کی شکلیں دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا اور میں پریشان ہو جاتی تھی۔ لڑکی میرے پاس پہنچ گئی اور اس نے کہا "مجھے آٹھ نمبر دے دو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اسے آٹھ نمبر کی پڑیا دے دی اور اس نے مجھے اس کی قیمت ادا کر دی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ دروازہ چونکہ کھلا ہوا تھا اس لئے دستک دینے والا آسانی سے اندر آ گیا۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بھی کوئی لڑکی ہی ہو گی جو محبوب کی تلاش میں آئی ہو گی لیکن آنے والے کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی ہی رہ گئی تھیں۔ بے شک بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا لیکن فوراً پہچان لیا تھا۔ یہ مقدس تایا تھے۔ میلے کچیلے لباس میں ملبوس' داڑھی بڑھی ہوئی' بال بکھرے ہوئے اندر آ گئے۔ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر اس لڑکی کو دیکھا اور بولے۔

"بدبخت .... بدبخت' ہمارے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر رہے گی تو۔

مقدس تایا کو دیکھ رہی تھی۔ مقدس تایا میری جانب مڑے اور بولے۔

"تُو کس غلاظت کی پیداوار ہے' خدا تجھے غارت کرے۔ کیوں بربادیوں پر تلی ہوئی ہے اس دنیا کی' کیا کر رہی ہے آخر تُو یہ؟ تجھے غیرت نہیں آتی۔ تُو نے کتنے گھر برباد کر دیئے ہیں۔ دیکھ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ کچھ بھی نہیں کروں گا تیرے خلاف۔ کچھ بھی نہیں کہوں گا کسی سے لیکن خدا کے لئے یہ کاروبار بند کر دے۔ تُو نہیں جانتی' تیری اس غلاظت سے دنیا کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ آہ! ہم تو تباہ و برباد ہو گئے۔ میری بات سن' میری بچی! بھول جانا اس بات کو کہ میں تیرے بارے میں اپنی زبان کسی سے کھولوں گا لیکن یہ لڑکی اگر دوبارہ کبھی آئے تو اسے وہ سب کچھ نہ دینا جو اسے برباد کر رہا ہے۔ کم بخت' چل یہاں سے۔ میں تجھے اپنے ہاتھوں سے مارنا پسند کروں گا۔ اس طرح تجھے نہیں مرنے دوں گا۔"

اور پھر مقدس تایا خاموشی سے اس لڑکی کو لے گئے۔ میرے پورے بدن میں سنسناہٹیں دوڑ رہی تھیں۔ مقدس تایا نے مجھے نہیں پہچانا تھا لیکن میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ یہ سارا کیا قصہ ہے اور وہ لڑکی' کیا وہ مقدس تایا کی لڑکی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا تو مجھے یاد آ گیا کہ ہاں وہ تمینہ ہی ہے۔ مجھ سے بڑی تھی لیکن میں نے اسے بہت عرصے پہلے دیکھا تھا۔ ویسے بھی میرے اور اس کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ مغرور لوگ تھے۔ ہمیں کم تر سمجھا کرتے تھے۔ تمینہ' تمینہ' یقیناً یہ تمینہ ہی تھی لیکن مقدس تایا نے اپنا حلیہ کیا بنایا ہوا تھا اور تمینہ کیا کر رہی تھی۔ کیا ہے ان پڑیوں میں اور اس شام میں نے خالہ سے پوچھ ہی لیا۔ خالہ سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اکثر میرے پاس آ بیٹھتی تھی۔ میں اسے تھوڑے بہت پیسے بھی دے دیا کرتی تھی کیونکہ دلاور نے مجھے اخراجات کے لئے اچھے خاصے پیسے دیئے ہوئے تھے۔ میرے پاس تو کوئی خرچ تو تھا ہی نہیں ان کا۔ کھانا پینا سب یہاں سے مل جاتا تھا۔ اس لئے یہ پیسے میرے پاس بیکار ہی پڑے رہتے تھے۔ کئی بار میں نے موٹی خالہ کو یہ پیسے دیئے تھے۔ اس شام بھی خالہ کچھ پیسے مانگنے ہی آئی تھیں۔

"وہ بڑی بی کا بیٹا جو ہے نا.........!"

"ہاں' ہاں......... خالہ! کیا بات ہے اسے؟"

"بیمار ہو گیا ہے کم بخت۔ بری حالت ہے۔ ہسپتال لے جانا پڑا ہے۔ بیٹا کچھ پیسے

"پیسے میں آپ کو دے دوں گی خالہ! کتنے پیسے چاہئیں؟"

"ایک پانچ سو روپے دے دو۔"

"ٹھیک ہے خالہ۔ یہ پانچ سو روپے رکھ لیجئے' خالہ میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں' ہاں پوچھو بیٹا!" خالہ نے کہا۔

"خالہ! ان پڑیوں میں کیا ہوتا ہے؟" میں نے سوال کیا اور خالہ چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"اے خدا کی بندی' تمہیں معلوم نہیں ہے!"

"نہیں خالہ' میں نہیں جانتی۔"

"ہیروئن ہے' بیٹا ہیروئن۔"

"ہیروئن.........!"

"ہاں۔"

"پڑیوں میں.........!"

"تو اور کیا۔"

"وہ تو فلموں میں ہوتی ہے۔"

"اب پڑیوں میں ہوتی ہے۔"

"م......... مگر......... خالہ! آپ مذاق کر رہی ہیں۔"

"نہیں بیٹا! تُو نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ بس اس سے زیادہ نہ تم کچھ پوچھنا' نہ میں تجھے کچھ بتا سکوں گی اور سن آئندہ یہ سوال کسی اور سے مت کرنا۔ سمجھ رہی ہے نا! ورنہ یہ سوال تیرے لئے خطرناک ہو جائے گا۔" خالہ کے جانے کے بعد نہ جانے کتنی دیر تک اس ہیروئن کے بارے میں' میں سوچتی رہی تھی جو فلموں کے بجائے اب پڑیوں میں بند رہا کرتی تھی۔ اس عجیب و غریب واقعے نے میرے ذہن میں بہت بڑا اثر ڈالا تھا لیکن اب میں بہت سمجھدار ہو گئی تھی اور بہت سی باتیں خود بخود سوچ لیا کرتی تھی۔ اگر میں امی سے اس کا تذکرہ کروں گی کہ مقدس تایا مجھے ملے تھے تو امی نہ جانے کیسے کیسے وسوسوں کا شکار ہو جائیں گی۔ دور رہنے کے بعد یہ بڑی مشکل بات ہوتی ہے کہ انسان ذرا ذرا سی چیز کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ امی جس انداز میں مجھ سے ملنے کے بعد میرے

ایسا شک جیسے وہ محسوس کر رہی ہوں کہ میں ان سے کچھ چھپا رہی ہوں لیکن خدا نخواستہ ان کو میرے کردار پر کوئی شک نہیں تھا اور میں جانتی تھی کہ امی کو یہ شک ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ بہرحال بہت دن گزر گئے۔ ایک دن وہی لڑکی پھر میرے پاس آئی۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار تھے۔ اندر داخل ہو گئی اور اس نے درد بھری آواز میں کہا۔

"سنو' میری زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سنو تمہیں خدا کا واسطہ' میری درد بھری فریاد سن لو۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا وہی لڑکی تھی جس کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ وہ تہمینہ ہے۔ مقدس نایاب کی بیٹی۔ تاہم میں نے اس پر اپنا اظہار نہیں کیا میں نے ہمدردی سے کہا۔

"کیا بات ہے کیا چاہتی ہو تم۔"

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"تو پھر۔"

"بس ایک نمبر کی پڑیا دے دو مجھے صرف ایک نمبر کی۔"

"پیسے نہیں ہیں اور میں پڑیا دے دوں تمہیں۔"

"ہاں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے آگے' مر جاؤں گی تمہیں خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو میں مر جاؤں گی۔"

"بیٹھو' بیٹھو ایک منٹ بیٹھو۔"

"نہیں کوئی میرے پیچھے آ جائے گا' مجھے خطرہ ہے۔"

"اگر تم بیٹھو گی نہیں تو میں تمہیں پڑیا بھی نہیں دوں گی۔ ایک منٹ بیٹھ جاؤ' بس میرے پاس۔" وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"میں ابھی آئی۔"

"کیا تم کسی کو اطلاع کرنے جا رہی ہو؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"نہیں۔"

"تو پھر کہاں جا رہی ہو؟"

"بس ایک منٹ یہ بتاؤ تم کوئی چائے وغیرہ پیو گی؟"

"نہیں کچھ نہیں پیوں گی' بس ایک نمبر کی پڑیا دے دو مجھے۔ تمہارا یہ احسان میں

"میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے بعد میں باہر نکل آئی کمرے کا دروازہ میں نے باہر سے بند کر دیا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد میں نے توفیق کو تلاش کیا اور توفیق مجھے مل گیا۔

"توفیق ادھر آؤ۔"

"جی!" اس نے کہا۔

"دیکھو ایک لڑکی میرے پاس آئی ہوئی ہے' ابھی وہ یہاں سے واپس جائے گی تم اس کا پیچھا کرنا۔"

"کیوں؟"

"اس کے بارے میں مجھے معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"ضروری ہے؟"

"بہت ضروری نہ صرف اس کے بارے میں بلکہ جس گھر میں وہ جائے اس کے بارے میں بھی تفصیل معلومات حاصل کر کے آنا کہ وہاں کون کون رہتا ہے' کتنے افراد ہیں' وہاں اور کیا کرتے ہیں وہ.........."

"اوہ' سمجھ گیا۔ کیا دادا کی ہدایت ہے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو لیکن بہت زیادہ سوالات کرنے لگے ہو' اب تم۔ کیا مجھے شکایت کرنی پڑے گی تمہاری؟"

"ارے نہیں بی بی صاحب' میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

"خیال رکھنا کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔"

"ہم تو جاسوس نمبر ایک ہیں' آپ کیا سمجھتی ہو ہمیں۔ ساری کھوج نہ نکال لیں تو توفیق نام نہیں ہے۔"

"ہاں احتیاط رکھنا۔ اس کے بعد میں واپس کمرے میں آ گئی' وہ مجھے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔"

"سنو' سنو تمہیں خدا کا واسطہ میری فریاد سن لو میری بات تو سن لو۔"

"بیٹھ جاؤ میں تم سے کہہ رہی ہوں' بیٹھ جاؤ۔" وہ پھر بیٹھ گئی۔

"میں پڑیا تمہیں بے شک دیئے دیتی ہوں لیکن تمہارا نام کیا ہے؟"

"تہمینہ ہے میرا نام۔"

"اور تمہارا [illegible]؟"

"اوہ' تم .... تم .... شاید میرے خلاف کوئی کارروائی کر رہی ہو۔"
"تمینہ میں تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"
"پوچھو' پوچھو۔"
"یہ لت تمہیں کہاں سے لگ گئی۔"
"کالج سے۔ میں کالج میں پڑھتی تھی' میری دوستوں نے مجھے یہ عادت ڈال دی۔"
"ہوں' تم اب .... اس عادت سے باز نہیں رہ سکتیں۔"
"میرے ابو نے مجھے ایک ہسپتال میں پہنچا دیا تھا۔ میں سولہ دن ہسپتال میں رہی ہوں' وہ میرا علاج کر رہے ہیں لیکن میں برداشت نہیں کر پا رہی۔ میں شاید اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں۔"
"میں تمہیں پڑیا دیئے دیتی ہوں لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو یہ خطرناک چیز ہے آخر کب تک اس کے سہارے زندہ رہو گی؟"
"جب تک زندگی ہے۔"
"تم اس کے بغیر جینے کی کوشش کرو۔"
"ناکام رہی ہوں اس میں۔"
"کوشش کی ہے۔"
"ہاں۔"
"پھر بھی تمینہ تم ایک شریف خاندان کی لڑکی ہو۔"
"میں بہت کوشش کرتی ہوں لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی میرے پاس ہسپتال کا خرچہ بھی نہیں ہے۔ ابو بھی بہت ہی غریب آدمی ہیں ہم لوگ .... ہم لوگ ....؟"
"ہاں تم لوگ۔"
"نہیں مانو گی نا تم .... ٹھیک ہے' نہ دو' میں خودکشی کر لوں گی۔"
"نہیں نہیں پڑیا میں تمہیں دیئے دیتی ہوں۔" میں نے کہا اور ایک نمبر کی پڑیا نکال کر اسے دے دی۔ ایک ہزار روپے کا معاملہ تھا کوئی بھی بات کہہ دوں گی لیکن اب مجھے اس بات کا پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ تمینہ مقدس تایا کی بیٹی ہے۔ یہ لوگ کسی حادثے کا شکار ہو چکے ہیں۔ میں نے اسے پڑیا دے دی اور وہ چلی گئی لیکن یہ حل نہیں تھا۔ ان لوگوں کو کیا ہوا انہوں نے اپنا گھر کیوں چھوڑ دیا پھر توفیق کے آنے پر ہی ساری صورت حال کا علم ہوا تھا۔ توفیق نے آ کر مجھے بتایا۔

"میں معلوم کر آیا ہوں۔ ایک چھوٹے سے محلے میں رہتے ہیں یہ لوگ۔ غریب لوگوں کا علاقہ ہے' لڑکی کا پورا پورا خاندان ہے۔ بہت سے افراد ہیں' اس گھر میں دو بڑے بزرگ ہیں ان میں سے ایک کا نام مقدس اور دوسرے کا مشرف حیات ہے۔ باقی عورتیں وغیرہ ہیں۔ یہ ایک ہی لڑکی ہمارا شکار بنی ہے۔ باقی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ انہوں نے اسے ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا لیکن شاید یہ ہسپتال سے ہی بھاگ کر آئی ہے۔"
"ہوں .... بس ٹھیک ہے' توفیق! بہت بہت شکریہ تمہارا۔ مجھے تم سے یہی معلومات حاصل کرنا تھیں۔" توفیق تو چلا گیا لیکن میرے ذہن میں سینکڑوں کریدیں پیدا ہو گئی تھیں۔ آخر مقدس حیات اور مشرف حیات کے ساتھ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ لوگ اس حال کو کیسے پہنچ گئے۔ اچھی خاصی حیثیت کے مالک تھے۔ ابو کے بارے میں تو خیر کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن بہرحال ان لوگوں کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی سے اس کا تذکرہ کروں یا نہ کروں۔ ایسا کروں گی بھی تو اس سے مجھے کیا حاصل ہو گا۔ ظاہر ہے امی بیچاری اس سلسلے میں کوئی خاص عمل نہیں کر سکتی تھیں۔ بس انہیں زیادہ سے زیادہ افسوس ہوتا لیکن افسوس ہونا نہیں چاہئے تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ کون سا اچھا تھا۔ پر سچی بات تو یہ ہے کہ ایک طرح سے دل میں ٹھنڈک سی اترتی تھی۔ آج یہ لوگ بھی اس حال کو پہنچ گئے کہ ایک لڑکی کس طرح مصیبت کا شکار ہے حالانکہ کسی کی مصیبت سے خوش ہونا میری فطرت میں نہیں تھا لیکن انسان ہوتا ہے بہک جاتا ہے بعض اوقات سوچیں نہ جانے کہاں کہاں سے لے جاتی ہیں۔

ہیروئن پینے والی لڑکیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ میرے سامنے مخصوص چہرے آیا کرتے تھے اور وہ لوگ جانتی تھیں کہ ان کا مقصد یہاں سے حل ہو جائے گا پھر نہ جانے کیوں میرے ذہن میں کرید پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کسی سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور دیکھوں کہ آخر ہیروئن کے نقصانات کیا ہوتے ہیں لیکن پھر راہی دلاور کا خیال آیا امی بہرحال اس کے قبضے میں تھیں حالانکہ دلاور ہماری طرف سے مطمئن تھا پھر بھی میں یہ سوچتی تھی کہ کبھی میری زبان سے ایسا ویسا لفظ نکل گیا تو اور کہیں امی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ چنانچہ میں نے اپنے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی کئی دن پھر گزر گئے معمولات جاری رہے میں اچھی خاصی کمائی کر کے دے رہی

تھی کہ وہ زبان کا پکا تھا۔ یعنی اس نے جو کچھ بھی کہہ دیا اس سے کبھی نہیں ہٹتا تھا۔ ہر اتوار کو وہ مجھے امی کے پاس لے جاتا اور میں پورا دن امی کے پاس رہتی۔ پیر کی صبح کو مجھے واپس ہوسٹل پہنچا دیا جاتا اور میں وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیتی۔ امی نے بارہا مجھ سے پوچھا کہ آخر مجھے کرنا کیا پڑتا ہے۔ ایک بار میں نے امی سے کہا۔

"اصل میں امی میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ دلاور نے مجھے ایک لفظ اِدھر سے اُدھر کرنے سے منع کر دیا ہے۔ آپ سے بڑھ کر اور کون میرے لئے ہو سکتا ہے لیکن میں آپ کی زندگی بھی چاہتی ہوں۔"

"بیٹی کوئی ایسا ویسا کام تو نہیں؟"

"نہیں امی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے ان سے کہا۔ پھر ایک دن مقدس نا پھر میرے پاس آ گئے انہوں نے میرے کمرے میں پہنچنے کے بعد مجھے سلام کیا اور بولے۔

"بیٹی تمہیں اندازہ ہے کہ میں عمر میں تم سے کتنا بڑا ہوں؟"

"فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ اس بات کا مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ مقدس نایا کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوا ظاہر ہے کہ عمر بھی بڑھ گئی تھی اور انہوں نے کون سی کبھی ہم پر توجہ دی تھی جو وہ ہمار' شکلوں اور صورتوں کو یاد رکھتے۔

"فرمایئے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے۔"

"ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

"کیا وہ لڑکی دوبارہ تمہارے پاس آئی تھی؟"

"نہیں۔"

"بیٹی سچ بتا دو مجھے۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتی آپ سے مگر ہوا کیا ہے؟"

"میں نے اسے ہسپتال میں داخل کروایا تھا وہ ہسپتال سے فرار ہو گئی ہے۔"

"یہاں نہیں آئی وہ۔"

"اس دن کے بعد کبھی نہیں آئی جس دن میں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا؟"

"نہیں ایک بار آئی تھی۔"

"جی ہاں۔"

"دی تھی تم نے اسے؟"

"نہیں.........." میں نے صاف جھوٹ بول دیا۔ ظاہر ہے میں ان سے اقرار نہیں کر سکتی تھی۔

"میں ایک ٹیلی فون نمبر تمہیں دیئے دیتا ہوں اگر وہ کبھی دوبارہ آئے تو ٹیلی فون نمبر پر رنگ کر کے مجھے بتا دینا۔"

"دیکھئے جناب میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔"

"آخر کیوں؟"

"بس.........."

"اور تم انسانوں میں زہر تقسیم کر سکتی ہو۔" انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ بیٹھ جایئے یہاں۔"

"میں تو خیر تمہارا کچھ نہیں بگاڑوں گا لیکن تم ایک بات سوچ لو۔ تم .... تم تمہیں تمہارے کئے کی سزا ملے گی۔ کس قدر بھولی بھالی اور معصوم صورت ہو تم لیکن جو کام تم کر رہی ہو تمہیں خدا اس کے لئے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"جناب عالی آپ سے ایک سوال کر سکتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ زندگی میں آپ نے ہمیشہ نیک کام ہی کئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں زیادہ تو کچھ نہیں کہہ سکتی اور آپ کے سامنے بولنا ویسے بھی میرے لئے گستاخی کے مترادف ہے لیکن ایک بات پر ذرا سا غور کر لیجئے۔"

"کون سی بات؟"

"مکافات عمل کے قائل ہیں آپ؟"

"کیا مطلب.........."

"کیا آپ نے زندگی میں کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"نہیں کوئی خاص مطلب نہیں ہے میرا۔ بس صرف آپ سے یہ کہنا چاہتی تھی

دو چار نہیں کیا۔"

"نہیں میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔"

"پھر سوچ لیجئے جناب!"

"تم کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو کیا۔"

"جی نہیں میں تو کوئی خاص بات نہیں کہنا چاہتی' بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا' آپ سے۔ آپ اپنی بیٹی کے لئے کتنے پریشان ہیں ہو سکتا ہے کسی اور کی بیٹی کو آپ نے اس طرح پریشان کیا ہو۔"

"تمہاری باتیں بالکل فضول ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔" مقدس نیا نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے بعد باہر چلے گئے۔ بس زبان پر بات آتے آتے رہ گئی تھی۔ ورنہ میں انہیں بتا دیتی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کیا کیا تھا لیکن پول کھل جاتا اور اس سے بھی ہمیں نقصان پہنچ سکتا تھا البتہ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ یہ کام مخدوش ہے۔ اب اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سارا سب کچھ غلط ہے اور میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ ناجائز ہے۔ اس دن خالہ بھی ذرا موڈ میں تھیں' میرے پاس آ بیٹھیں اور کہنے لگیں۔

"تھک گئی ہوں' بہت زیادہ سوچ رہی ہوں' نوکری چھوڑ دوں۔"

"آپ یہاں نوکری کرتی ہیں خالہ!"

"تو اور کیا مالک ہوں یہاں کی۔"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ ہوسٹل کی ملازم ہیں یا دلاور کی۔"

"ملازمہ تو میں ہوسٹل کی ہوں مگر جانتی ہو کہ ہوسٹل سے مجھے کیا تنخواہ ملتی ہے۔"

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"آٹھ سو روپے مہینہ۔"

"بس.........؟"

"ہاں اور جس گھر میں رہتی ہوں اس کا کرایہ ہی بارہ سو روپے ہے اور بارہ سو روپے بھی ایک ایسے گھر کا کرایہ ہے جس میں صرف ایک کمرہ ہے ایک کچن ہے چار بیٹیاں ہیں میری جوان' چاروں کی شادی کرنی ہے مجھے۔"

"تو پھر خالہ آپ کیا کر رہی ہیں۔"

[illegible]

رشتہ مل جائے تو ایک ایک کے ہاتھ پیلے کرتی رہوں گی۔"

"یہ کہاں سے جمع کیا ہے آپ نے؟"

"لو بی بی ایسے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"نہیں خالہ پلیز آپ بتائیے۔"

"بس دلاور سے مجھے اچھی خاصی تنخواہ مل جاتی ہے' میں خود بھی یہ پڑیاں جگہ جگہ سے لے کر جاتی ہوں بیچتی ہوں۔"

"اچھا آپ یہ بھی کرتی ہیں۔"

"ہاں میں نے کچھ مخصوص اڈے بنا رکھے ہیں وہاں جا کر آدھے آدھے گھنٹے کھڑی رہتی ہوں' ضرورت مند آتے ہیں اور مجھ سے پڑیا لے جاتے ہیں جانتی ہو وہاں میں کیا مشہور ہوں۔"

"کیا مشہور ہو؟"

"وہاں لوگ مجھے فقیرنی سمجھتے ہیں اور میں حلیہ بھی ایسا ہی بناتی ہوں۔"

"خالہ آپ یہ بھی کرتی ہیں۔"

بتا چکی ہوں تمہیں انسان پر جب برا وقت آتا ہے تو پتا نہیں وہ کیا کیا کر لیتا ہے۔"

"خالہ اب تو مجھے بتا دیں کہ آخر یہ ہیروئن ہوتی کیا ہے؟"

"اے لڑکی پاگل ہو گئی ہے کیا؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے چکھ کر دیکھوں۔"

"بس سمجھ لے کہ زندگی بھر کے لئے معذور ہو جائے گی۔ ان لڑکیوں کی طرح دیوانی ہو جائے گی جو تیرے پاس ہیروئن لینے آتی ہیں۔"

"مگر خالہ ایک بات بتائیے اس ہیروئن سے نشہ ہوتا ہے کیا۔"

"تو اور کیا کوئی ایسا ویسا نشہ' بس سمجھ لو انسان ایک بار عادی ہو جائے تو پھر جان لے کر ہی چھوڑتا ہے۔"

"مگر خالہ اسے بیچنا تو جرم ہے نا!"

"نہیں نیکی ہے۔" خالہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اور اگر کبھی پولیس کو پتا لگ جائے تو؟"

"تو جیسے دلاور نے کہا ہے وہی کر سکتے ہیں ہم۔"

"مر جائیں مگر زبان نہ کھولیں۔"

"خالہ تم کیوں اس بات پر آمادہ ہوئیں؟" میں نے سوال کیا اور خالہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں۔

"تُو مجھے مروانے پر تلی ہوئی ہے۔"

"ایک بات ذہن میں رکھیں' خالہ! میری ذات سے آپ کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جس طرح میں نے دلاور سے وعدہ کیا ہے کہ خدانخواستہ کبھی میں کسی جال میں پھنس جاؤں تو میں کبھی کسی سے یہ بات نہیں کہوں گی کہ میرا تعلق دلاور سے ہے' اس طرح میں آپ سے بھی وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کوئی بھی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں بھی آپ کا نام نہیں لوں گی۔ ایک بات کا جواب دیں گی مجھے؟"

"تُو جس قدر معصوم ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تجھے بھی ان لوگوں نے جال ہی میں پھانسا ہے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"ہاں خالہ۔"

"کیا جال ہے وہ؟"

"میری امی ان کے پاس ہیں۔"

"تو بات خود بخود تیری سمجھ میں آجانی چاہئے۔"

"کیا مطلب؟"

"تیری امی ان کے پاس ہیں اور انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ان کا کام نہ کیا ان کا راز کہیں فاش کیا تو میری بیٹیوں کو ہلاک کر دیں گے۔"

"ہوں .... کیا خالہ ان کے چنگل سے چھٹکارا نہیں حاصل کیا جا سکتا؟"

"اب بہت مشکل ہے بیٹی! اب ہم لوگ اتنا آگے نکل آئے ہیں کہ اگر چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں تو نہیں کر سکیں گے۔"

"خالہ ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"بس تقدیر نے ہمیں جس راستے پر لگا دیا ہے ہم بھلا اسے کیسے ٹال سکتے ہیں۔" خالہ خاموش ہو گئیں ان کے لہجے میں افسردگی طاری ہو گئی تھی لیکن میں یہ سوچنے لگی تھی کہ بہرطور برے کام کا برا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک دن ایسا ضرور آجائے گا کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں گے۔ میں تو بس تقدیر پر شاکر تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا میں نے

[illegible]

کھلونا بنی ہوئی تھی لیکن بہرحال اندازے درست ہی نکلتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی شخص غلط کام کرتا رہے اور زندگی اسے مسلسل موقع دیئے جائے۔ وہ ایک دوپہر تھی۔ سنسان اور گرم' باہر کا ماحول بھی کچھ عجیب سا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر معمول کے مطابق دراز تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ گاہک آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ میں نے یہی سوچا کہ اس وقت بھی کوئی گاہک ہی ہو گا اور میرا یہ اندازہ درست تھا۔ وہ بھی ایک جوان لڑکی تھی' اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک اور اس کے چہرے پر اس طرح کے آثار بھی نہیں تھے۔ جس طرح کی لڑکیاں میرے پاس آیا کرتی تھیں۔ ان کے چہرے بے نور ہو چکے تھے آنکھوں کے گرد حلقے ہوتے تھے' ہونٹ خشک' سر کے بال بکھرے ہوئے' دیکھنے ہی سے وہ تباہ حال معلوم ہوتی تھیں۔ آنے والی بھی تھی تو کچھ ایسی ہی لیکن بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ زیادہ عرصے سے یہ زہر استعمال نہ کر رہی ہو لیکن اس وقت اس نے اچھی خاصی پریشانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ میرے قدموں میں گر پڑی۔

"مجھے بچالو خدا کے لئے مجھے بچالو۔"

"ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو تم کیا بات ہے۔"

"آہ مجھے .... مجھے دو .... میں مر رہی ہوں .... مجھے دو۔"

"کیا دوں؟"

"دیکھو' اس وقت میرا ذہن بالکل میرے قابو میں نہیں ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ مر جاؤں گی میں۔ میری عمر ایسی نہیں ہے کہ میں موت کو ابھی سے قبول کر لوں۔ خدا کے لئے مجھے تھوڑی سی دے دو جو رقم مانگو گی میں تمہیں دے دوں گی یہ لو۔" اس نے دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی نکال کر میرے سامنے ڈال دی۔ "پیسوں کی پرواہ مت کرو' بس میری مشکل دور کر دو۔" میں مشکل میں پڑ گئی تھی اس لڑکی نے وہ کوڈ نمبر نہیں دہرایا تھا یہ کوڈ نمبر بھی یہاں آنے والیوں کی شناخت تھا لیکن اس وقت اس نے جس بیچارگی سے میرے ساتھ گفتگو کی تھی اس سے میرے دل میں رحم پیدا ہو گیا' میں نے اس سے کہا۔

"دیکھو کتنے نمبر کی چاہئے' یہ بتاؤ۔"

"آہ' میں تمہیں بتا چکی ہوں چار دن ہو گئے ہیں۔ آج پورے چار دن مجھے بالکل نہیں ملی ہے چار دن میں تو لوگ دیواروں سے سر پھوڑتے ہیں میں نے بڑی مشکل سے

"مگر تم پہلی بار میرے پاس آئی ہو' میں نے اس سے پہلے تمہاری شکل بھی نہیں دیکھی اور تم............"

"دیکھو' دیکھو مجھ پر ظلم نہ کرو' دیکھو مر گئی تو تمہیں افسوس ہوگا۔ تمہارے ہاتھوں ایک زندگی جا رہی ہے' سب سے پہلے تم مجھے دے دو۔" اس نے کہا میں بالکل پیچ گئی چنانچہ میں آگے بڑھی اور اپنی مخصوص جگہ سے جہاں میں ہیروئن کی پڑیاں سنبھال کر رکھا کرتی تھی' ایک پڑیا نکال کر اسے دے دی۔

"یہ چار نمبر ہے' اس کی قیمت چار ہزار روپے ہوتی ہے' تمہاری اس گڈی میں سے چار ہزار روپے نکال لیتی ہوں باقی تم واپس لے جاؤ۔"

"جیسے تم مناسب سمجھو تمہارا شکریہ' بہت بہت شکریہ!" اس نے ہیروئن کی پڑیا کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے بعد خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"ایک گلاس پانی مل جائے گا مجھے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں نے کمرے میں رکھے ہوئے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں انڈیلنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی' وہ ایک دیوار سے جا لگی اور اس کے بعد جب میں نے پانی کا گلاس لے کر واپس پلٹی تو اس کے ہاتھ میں پستول دیکھا۔ پستول کا رخ میری جانب تھا۔

☆------☆------☆

"پانی کا گلاس وہیں رکھ دو اور دونوں ہاتھ بلند کر دو۔ اگر تم نے ذرا بھی جنبش کی تو میرے پستول سے نکلی ہوئی گولی تمہاری پیشانی کے چیتھڑے اڑا دے گی۔" اس کے لہجے میں ایک غراہٹ ایک ایسا خوفناک انداز تھا کہ میرے حواس گم ہو گئے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی پانی کا گلاس خود بخود میرے ہاتھوں سے نیچے گر گیا تھا اور زمین پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ میرے پیروں پر پانی بہہ رہا تھا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے اپنے لباس سے کوئی چیز نکالی پستول کا رخ میری جانب ہی کئے رکھا تھا پھر اس چیز کو منہ کے قریب لے جا کر اس سے کوئی چیز کھینچی یہ ایک لمبا ایریل تھا اور اس کے ہاتھوں میں جو چھوٹا سا ڈبہ تھا اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو وہ وائرلیس تھا۔ اس نے وائرلیس آن کر کے اس سے کہا۔

"ہاں انسپکٹر فریدہ بول رہی ہوں' بالکل صحیح چھاپہ پڑا ہے' بالکل صحیح ہے۔ فوراً ہاں

جاؤ۔"

اس نے کہا اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ انسپکٹر کا نام ہی میرے ہوش و حواس اڑانے کے لئے کافی تھا۔ میں ساکت و جامد اسے دیکھتی رہی دونوں ہاتھ میں نے اٹھا دیئے تھے لیکن اب مجھے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے ہیں' میں تو صرف اسے گھورے جا رہی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ میرا خوف درست نکلا پہلی بات تو یہ کہ وہ ایک اجنبی لڑکی تھی دوسری بات یہ کہ اس نے کوڈ بھی نہیں دہرایا تھا۔ غلطی میری ہی تھی لیکن کیا کرتی اس کی باتوں میں اس طرح آ گئی کہ جو کچھ اس نے کہا وہ میں نے کر دیا۔ پھر زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اچانک ہی دھڑ سے دروازہ کھلا تھا اور چار لیڈی کانسٹیبل اور اس کے پیچھے مرد اور پھر ہوسٹل کے مینجر وغیرہ اندر داخل ہو گئے۔ سب مجھے دیکھ رہے تھے انسپکٹر فریدہ نے کہا۔

"وہ جگہ ہے جہاں اس نے ہیروئن چھپا کر رکھی ہے۔ یہ پڑیا جو میں نے چار ہزار میں اس سے خریدی تھی اس پر چار نمبر پڑا ہوا ہے۔ یہ لڑکی ہیروئن فروخت کرتی ہے۔"

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ لیڈی کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ پیچھے کئے اور انہیں پشت پر کر کے ان میں ہتھکڑی ڈال دی۔ میں یہ سب کچھ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے ایک اجنبی کسی واقعے کو دیکھتا ہے۔ میں پتھرا سی گئی تھی۔ ادھر خاصا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ہوسٹل کی لڑکیاں کوریڈور میں جمع ہو گئی تھیں لیکن بہرحال میں اپنے طور پر ہوش و حواس میں بیٹھی تھی بس ایک غنودگی سی طاری ہو گئی تھی' ان لوگوں نے کمرے کی تلاشی لی سارا سامان اپنے قبضے میں کر لیا۔ ہیروئن کے وہ پیکٹ جو میرے پاس اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے' قبضے میں لے لئے گئے۔ لوگ انسپکٹر فریدہ کو مبارکباد دے رہے تھے۔ ہوسٹل کا مینجر ہکلا ہکلا کر کہہ رہا تھا۔

"نہیں' جناب عالی! ہمارا اس سلسلے میں کوئی تعلق نہیں ہے' ہم تو............ ہم تو بے گناہ ہیں' ہمیں تو پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ بدبخت یہ کام کرتی ہے یہاں پر۔ بی بی جناب معاف کر دیجئے' دیکھئے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"بکواس بند کرو مینجر' چلو انہیں بھی ساتھ لے چلو۔"

"ہم' ہم............" مگر مینجر ہم ہم ہی کرتا رہا پولیس نے اسے بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور چند اور افراد کو بھی قابو میں لے لیا گیا تھا لیکن ان میں نہ تو توفیق تھا اور نہ خالد

ہوا کہ یہ لوگ ان کے قبضے میں نہیں آئے۔ بہرحال میرے پورے بدن کا لہو خشک ہو گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ دیکھو وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ مجھے ہوسٹل سے باہر لائے' پولیس کی گاڑی میں بٹھایا گیا' لیڈی کانسٹیبل میرے ساتھ ساتھ تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد میں پولیس سٹیشن پہنچ گئی۔ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔ جہاں مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ وہاں فوری طور پر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا لیکن میرے ہاتھوں میں اب بھی ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی۔ میں زمین پر بیٹھ گئی اور میں نے دیوار سے پشت لگا لی۔ پورے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ آنکھیں بند کر لوں اور گہری نیند سو جاؤں تاکہ اس خواب سے جاگوں تو ماحول بالکل بدلا ہوا ہو لیکن ایسا نہیں ہوا نہ تو نیند آئی اور نہ ہی ماحول بدلا۔ البتہ اس کے بعد مجھے ایک بڑے کمرے میں پیش کیا گیا۔ جہاں چند خطرناک قسم کے پولیس انسپکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر فریدہ بھی وہاں موجود تھی اور ایک اور پولیس آفیسر موجود تھی جس کا عہدہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا میں نے یہ دیکھا کہ انسپکٹر فریدہ نے اسے سیلوٹ کیا اور پھر اسے بتانے لگی۔

"جی' ایس پی صاحب اس کے علاوہ مجھے وہاں اور کوئی نہیں ملا۔ تلاشی لی تو سامان میں کپڑے وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں' اور اس کے بارے میں کچھ نہیں پتا چل سکا۔"

"ہوں .... ہتھکڑیاں کھول دو اس کی۔" معمر عورت نے کہا جس کے بدن پر پولیس کی وردی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لڑکی تم چہرے سے وہ نہیں معلوم ہوتی جو تم ہو' یا تم وہ نہیں ہو جو چہرے سے نظر آتی ہو۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔

"اب فوری طور پر اپنے گروہ کا نام بتا دو' کون تم سے یہ کام کروا رہا ہے؟" میں نے بمشکل تمام اپنے حواس قابو میں کئے اور آہستہ سے بولی۔

"کوئی نہیں۔"

"دیکھو اچھی شکل و صورت ہے' میں یہ جانتی ہوں کہ تمہاری جیسی عمر کی لڑکی اتنی ہمت کے ساتھ یہ کام نہیں کر سکتی' تمہارے چہرے پر مجھے وہ آثار نظر نہیں آتے جو کچے ہیروئن فروشوں کے چہروں پر ہوتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں کسی نے خاص وجہ

ٹھکانہ بتا دو۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔" میری نظروں میں امی کا چہرہ آ گیا' میں جانتی تھی کہ دلاور نے سب سے پہلی بات یہی کہی ہے کہ اگر میں نے کبھی اس کے بارے میں زبان کھولی تو امی زندہ نہیں رہ سکیں گی۔ میری ماں اس طرح بے موت ماری جائے۔ میں اس پر ہزار زندگیاں قربان کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں جناب! اول تو یہ ہے کہ میں تنہا ہی کام کرتی ہوں۔ جو شخص مجھے ہیروئن سپلائی کرتا ہے میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ کہیں سے ہیروئن حاصل کرتا ہے' اسی نے مجھے اس کام پر لگایا ہے۔"

"گویا تم صحیح بات نہیں بتاؤ گی۔"

"صحیح بات یہی ہے اس کے بعد آپ کا جو دل چاہے میرے ساتھ سلوک کریں۔"

"لڑکی یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے کہنے کو تو انسان بڑے بڑے دعوے کر لیتا ہے لیکن جب تمہارے بدن سے کھال اتاری جائے گی' جب تمہارا بدن جگہ جگہ سے داغا جائے گا سب کچھ اگل دو گی۔" میں کانپ کر رہ گئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ لوگ تو میری صورت ہی بگاڑ دیں گے' میں یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے میری ماں چلی جائے۔ میں نے کہا۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ آپ جو سلوک چاہیں میرے ساتھ کریں۔"

"اچھا یہ بات بتاؤ کہ وہ شخص کون ہے؟"

"نام نہیں جانتی میں اس کا۔"

"تم سے کیسے ملاقات ہوئی تھی؟"

"یہ بھی آپ کو نہیں بتاؤں گی؟"

"ٹھیک ہے انسپکٹر فریدہ یہ تمہارا کیس ہے تم خود ہی سنبھالو اسے۔"

"ایس پی صاحب آپ سوچ لیجئے۔"

"نہیں پوچھنا تو ہے اس سے یہ کیا کرے گی ہیروئن کا کاروبار' یہ تو مجھے ایک بیوقوف سی لڑکی لگتی ہے' سمجھدار ہوتی تو فوراً زبان کھول دیتی' ایک بار پھر تجھے سمجھا رہی ہوں لڑکی! جو جرم تو کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے اس کی سزا موت تک ہو سکتی ہے۔ اپنی زندگی قربان کرنے کے بجائے صرف یہ بتا دے کہ وہ کون لوگ ہیں' اگر انہوں نے تیرے

اس بات کی فکر مت کر ہم تیری مدد کریں گے۔ پوری پوری مدد کریں گے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے تم سے۔"

"بس میری زبان بند ہے میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

"او کے انسپکٹر' لے جاؤ۔" پھر مجھے وہاں سے نکال کر ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ میں جانتی تھی کہ اب مجھ پر مظالم کے پہاڑ توڑے جائیں گے اور یہی ہوا۔ انسپکٹر فریدہ دیکھنے میں تو اچھی خاصی شکل و صورت کی عورت معلوم ہوتی تھی بلکہ اس وقت تو وہ کوئی لڑکی سی لگی تھی۔ جب وہ میرے پاس آئی تھی لیکن اس وقت وہ مجھے ایک خونخوار ناگن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اس قوت سے میرے خوبصورت ریشمی بال پکڑے کہ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

"اذیت برداشت نہیں کر پاؤ گی' سمجھ رہی ہو۔ تم ایسا کرو میں تمہیں سوچنے کا موقع دے دیتی ہوں اور وہ بھی کسی خاص وجہ سے' خاص وجہ یہ سمجھ لو کہ مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔ معصوم لڑکی زندگی اس طرح گنوانے کی چیز نہیں ہوتی ہم ہر قیمت پر تمہاری زبان کھلوا لیں گے چاہے اس کے لئے ہمیں تمہاری زندگی ہی کیوں نہ لینی پڑے یہ بات سمجھ لینا میں تمہیں آٹھ گھنٹے کا وقت دیتی ہوں' فیصلہ کر لینا اور اس کے بعد بتا دینا جو کچھ بھی ہو۔"

میں نے فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن پھر بھی آٹھ گھنٹے کا وقت غنیمت سمجھا' مجھے ایک بار پھر لاکر میں بند کر دیا گیا' بعد کی کہانی سناتے ہوئے میرا دل لرزتا ہے کیا کیا اذیتیں نہیں دی تھیں انہوں نے مجھے۔ میں روتی تھی اور سوچتی تھی کہ دیکھ تقدیر تو نے کیا فیصلہ کیا ہے لیکن یہ بھی میں نے طے کر لیا تھا کہ دلاور کا نام کبھی نہیں لوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ سات دن تک مجھ پر عذاب قبر نازل ہوتا رہا۔ ہاں میں اسے عذاب قبر ہی کہہ سکتی ہوں۔ اس کے نتیجہ میں میرے بدن پر بہت سے داغ پڑ گئے تھے۔ میرے گھٹنے جواب دے گئے تھے۔ میرے تلوے پھوڑے کی طرح دکھ رہے تھے۔ میرے بال جگہ جگہ سے نوچ لئے گئے تھے اور تو شکر ہے کہ انہوں نے میرا چہرہ نہیں بگاڑا تھا لیکن باقی تمام اذیتیں مجھے دے دی گئی تھیں لیکن میں قربانی دے رہی تھی' صرف اپنی ماں کے لئے۔ ہاں میں اپنی ماں کے لئے اپنی زندگی ہزار بار قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔

وہ لوگ بھی مجھے مار مار کر تھک گئے تو فریدہ نے اس دن ایس پی سے حیرت سے کہا تھا۔

زبان کیوں بند کر رکھی ہے۔"

"یقیناً اس کے پس منظر میں کوئی ایسی ہی بات ہو گی۔"

"تو پھر اب ہم کیا کریں۔"

"کچھ نہیں کر سکتے' چالان عدالت میں پیش کر دو۔" ایس پی نے جواب دیا اور اس کے بعد سے مجھ پر مظالم کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مجھے عدالت میں پیش کیا گیا' تمام ثبوت پیش کئے گئے' میں نے وہاں بھی زبان بند رکھی تھی۔ ایک وکیل صفائی جس کا نام شبیر احمد تھا' میرے لئے سرکاری طور پر متعین کیا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ملاقات کر کے میرے بارے میں تمام تفصیلات پوچھیں لیکن میں نے اسے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو بس یہ جانتی تھی کہ اگر میں نے زبان کھول دی تو میری ماں کے ساتھ بہت برا سلوک ہو گا اور اپنی ماں کو میں ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ وکیل صفائی نے کہا۔

"دیکھو میں تمہارا وکیل ہوں' تمہیں مجھ سے نہیں ڈرنا چاہئے۔"

"وکیل صاحب جو کچھ بھی ہو جائے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔"

"ایک بات بتا دوں تمہیں' خبردار کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔"

"جی وکیل صاحب بتایئے۔"

"مجھے دلاور نے یہاں بھیجا ہے' دلاور نے کہا ہے کہ تم نے جس ہمت کا ثبوت دیا ہے اس کا صلہ تمہیں بہت زیادہ ملے گا۔ دلاور تم سے بہت متاثر ہے' اس نے تمہیں سلام کیا ہے۔"

میں خاموش ہو گئی' میں نے وکیل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بہرحال مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ پھر نہ جانے کیا کیا کارروائیاں ہوتی رہیں' یقینی طور پر دلاور نے میری مدد کی تھی ورنہ میرے ساتھ مزید سختی کا سلوک ہوتا اور اس کے بعد کئی پیشیاں ہوئیں پھر جج صاحب نے مجھے دو سال کی سزا سنا دی۔ میں عالم خواب سے گزر رہی تھی' مجھے احساس ہی نہیں کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ بس میں ایک دیدہ ور کی مانند ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پولیس کی خواتین مجھے کمرہ عدالت سے باہر لے آئیں اور اس کے بعد مجھے جیل کی گاڑی میں پہنچا دیا گیا جو مجھے لے کر جیل کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ عورتوں کے لئے جیل میں الگ پورشن بنا ہوا تھا۔ مجھے وہاں پہنچا دیا گیا۔ یہ سب کچھ بھی دیکھنا تھا زندگی میں۔ جیل میں اپنی بیرک میں پہنچ کر دل کی جو

ایک بہت دکھ بھری کہانی میرے سامنے سے گزر رہی ہو۔

یہاں کی زندگی مختلف تھی۔ قیدی عورتیں اور لڑکیاں عجیب و غریب مزاج کی مالک تھیں۔ میں تن بہ تقدیر ہو کر یہاں وقت گزارنے لگی۔ زندگی بالکل بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی شعبان کا خیال آ جاتا تھا اور میں ہنس دیتی تھی۔ دنیا اتنے بڑے بڑے دعوے کرتی ہے لیکن کون کسی کی مشکل میں اس کا ساتھ دیتا ہے اور پھر شعبان کے بارے میں تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کون تھا؟ بس میرے پیچھے لگ گیا تھا مگر کم بخت ایسی یادیں دل میں چھوڑ گیا تھا جو ایک میٹھی میٹھی کسک بن کر رہ گئی تھیں۔ کیا ضرورت تھی اس بے غیرت کو جو مجھ سے اظہار محبت کرتا۔ یہ تھی اس کی محبت' بس چند روز......... فقط چند روز اور اس کے بعد سب کچھ بھول گیا۔ خیر میں اس کے قابل بھی نہیں تھی۔ ساری باتیں اپنی جگہ۔ لیکن میں خود بھی تو اس کے قابل نہیں تھی کہ اس جیسے کسی شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور کر سکوں۔ میری تو کیفیت ہی دوسری تھی کافی دن گزر گئے ایک لڑکی سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ اس کا نام زرقا تھا۔ میرے ساتھ ہی رہا کرتی تھی اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا۔ شوہر کی درندگی کا شکار ہوئی تھی۔ بہت برا انسان تھا۔ شادی کے بعد اس نے زرقا سے اس کی شخصیت چھین لی تھی اور اسے برائی کے راستوں پر لانا چاہتا تھا لیکن وہ ایک عزت دار گھرانے کی لڑکی تھی۔ شوہر نے جب عزت بیچنے پر انتہائی حد تک مجبور کیا تو اس نے اپنے سر کا تاج خود ہی اتار کر زمین میں روند دیا اور شوہر کو زخمی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں چار سال کی سزا بھگت رہی تھی۔ خوش رہتی تھی' ہنستی بولتی رہتی تھی' کہتی تھی اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا کم از کم دل تو ٹھنڈا ہو گیا۔

مجھے سلائی کے شعبے میں بھیج دیا گیا تھا۔ بہت بڑے ہال میں مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ انسٹرکٹرز تربیت دیا کرتی تھیں۔ تھوڑا بہت سلائی کا کام مجھے پہلے بھی آتا تھا۔ میں جیل کے اس شعبے کے لئے ریڈی میڈ کا کام کرنے لگی۔ اس شعبے میں ایک انچارج بھی تھا۔ مدو بابا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لڑکیاں عام طور پر کہا کرتی تھیں کہ کام کرو مدو بابا آ جائے گا۔ پھر ایک دن مدو بابا آ گیا بوڑھا آدمی تھا۔ جیل کے ہی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ چہرے پر سفید داڑھی بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا تو لڑکیاں جلدی سے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ ہنسنے لگا اور پھر اس کی آواز ابھری۔

"پیاری بچیو! کام سے انسان کی زندگی سدھرتی ہے۔ اپنا کام پورا کر لیا کرو' پچھلے کچھ

لیکن یہ آواز میرے لئے ایک بم کا دھماکہ ہی ثابت ہوئی تھی۔ میں سر جھکائے کام میں مصروف تھی لیکن میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ سفید داڑھی لیکن داڑھی کے پیچھے جو چہرہ چھپا ہوا تھا' بھلا میں اسے بھول سکتی تھی۔ وہ میرے ابو تھے۔ میرے ابو میری ساری زندگی کے مالک۔ میرے سارے وجود کے حقدار۔ ہاں وہ کیسے بھی تھے لیکن میرے ابو تھے۔ میں بری طرح کانپنے لگی۔ میرے پورے بدن میں تشنج طاری ہو گیا تھا۔ دیوانی ہو گئی تھی میں لیکن میں بس اپنی جگہ بیٹھی کانپتی رہی۔ اس سے آگے کچھ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ مدو بابا ہمارے قریب آئے مجھے بھی دیکھا لیکن ان کے چہرے پر شناسائی کی کوئی جھلک نہیں ابھری وہ بھی مجھے نہیں پہچان سکے تھے اور پہچاننا بھی نہیں چاہئے تھا۔ کسی زمانے میں تمام تر مشکلات کے باوجود میرے چہرے کی تر و تازگی ایسی ہوا کرتی تھی کہ لوگ اسے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ڈاکٹر عدنان کا بھی یہی کیس ہوا تھا لیکن اب ظاہر ہے زمانے کی صعوبتوں نے مجھے متاثر کیا تھا اور پھر انہوں نے غور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کام کی انجام دہی کے بعد وہاں سے چلے گئے لیکن میں جس عالم سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ صرف مجھے ہی ہو سکتا تھا۔ کوئی اور اس کیفیت کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے کس کس طرح خود کو سنبھالا تھا۔ نہ جانے کیسی کیسی سوچیں دامن گیر ہوئی تھیں۔ زرقا سے رات کو پوچھا۔

"یہ مدو بابا کون ہیں؟"

"بہت پیارا آدمی ہے' لگتا ہی نہیں کہ اس نے کوئی جرم کیا ہو گا۔"

"جرم.........!"

"ظاہر ہے جیل میں ہے لیکن یہ شریف آدمی ہے' بس ہمارے شعبے کی نگرانی کرتا ہے۔"

"قیدی ہے یہ بھی.........!"

"تو اور کیا........."

"کچھ پتہ چلا یہ کس جرم میں یہاں قید ہوا ہے؟"

"نہیں اب اتنی معلومات ہمیں کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ نگرانی کرنے آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بچیو کام کرو کام ہی میں زندگی ہے۔" میں بمشکل تمام آنسوؤں کو روک سکی تھی۔ میں نے زرقا سے پوچھا۔

"یہیں اس شعبے کے باہر اس کی کوٹھری ہے۔ جیلر نے بھی اسے بڑی اجازت دے رکھی ہے وجہ صرف یہی ہے کہ بہت شریف آدمی ہے اور آج تک کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

"کتنے عرصے سے یہاں ہے؟"

"ڈیڑھ سال سے تو میں دیکھ رہی ہوں' اس سے پہلے کب سے یہاں ہو گا مجھے نہیں معلوم۔" میں خاموش ہو گئی' پھر وہ رات ماضی کو یاد کرتے ہوئے گزری۔ ابو کے حالات یاد آنے لگے۔ امی تو خود کہا کرتی تھیں کہ ابو برائیوں کے جال میں پھنسے ہوئے انسان ہیں اور مشکلات کا شکار ہیں۔ ظاہر ہے انہوں نے کچھ کیا ہو گا جس کے نتیجے میں یہ صورت حال پیش آئی لیکن یہ بھی سوچتی رہی تھی میں کہ ابو مجھے نہیں پہچانیں گے۔ میں ان سے اپنا تعارف کراؤں یا نہ کراؤں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر انہیں اس بات کا علم ہو گیا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں تو نہ جانے کیسے اضطراب کا شکار ہو جائیں۔ بہرحال باپ تھے۔ ہماری فکر انہوں نے بے شک نہیں کی تھی لیکن محبت کرتے تھے ہم سے' پھر میں انہیں دیکھ دیکھ کر جیتی رہی۔ ایک دو بار میری ان سے بات چیت بھی ہوئی اور مجھے اس بات کا بالکل شک نہیں رہا کہ مدو بابا اصل میں مدثر حیات ہیں۔ کیا گزر رہی ہو گی ایک بچی پر جو خود بھی ایک مجرمہ تھی اور ایک مجرم باپ کے ساتھ جیل میں وقت کاٹ رہی تھی۔

مدو بابا جب بھی مجھے نظر آتے میرے دل میں محبتوں کے درخت جھومنے لگتے۔ کئی بار مجھے اس کا موقع ملا کہ میں ان کی کچھ خدمت کروں۔ وہ بھی میری جانب متوجہ ہو گئے لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکے۔ ہماری جو بیرک تھی مدو بابا کی بیرک بھی اس کے آخری سرے پر تھی۔ بیرک سے متصل سلائی کا شعبہ تھا اور باہر کا نظام اتنا مضبوط تھا کہ ہم اپنی کوٹھریوں سے نکل کر اس احاطے میں نہیں جا سکتے تھے۔ احاطے کے قریب دیوار کا حصار تھا اور اس حصار کے باہر سنتری ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی جیل میں عورتوں کے شعبے میں مرد بہت کم ہی آیا کرتے تھے۔ یہاں اگر اندرونی طور پر کچھ ہنگامہ ہو جایا کرتا تھا تب پھر جیل کے سپاہی یا جیلر اندر آیا کرتے تھے۔ ورنہ ہمیں صرف اپنے کام سے کام تھا۔ پھر اس دن بھی مدو بابا اندر آئے تھے لیکن بری طرح کھانس رہے تھے۔ ان پر کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں اپنی جگہ سے پھرتی سے اٹھی گلاس میں پانی لیا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"ارے شیری بیٹا!" انہوں نے محبت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو میری بڑی

خدمت کرتی ہے۔" یہاں جیل میں' میں نے اپنا نام شیری ہی بتایا تھا پورا نام بتانے کی اول تو ضرورت نہیں تھی اور پھر ویسے بھی میں اپنے آپ کو چھپانا بھی چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ کو بہت کھانسی ہو رہی ہے۔"

"ہاں بس ہو رہی ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی دوا لے لیں آپ۔"

"دوا لے لی ہے بیٹا! بخار چڑھا ہوا ہے' اصل میں مجھے۔" انہوں نے کہا اور میں نے بے اختیار ہو کر ان کا ہاتھ دیکھا' تیز بخار تھا۔ میں نے کہا۔

"تو آپ نے آرام کیوں نہیں کیا؟"

"نہیں بیٹے' جیل آرام کے لئے کہاں ہوتی ہے؟"

"پھر بھی اگر ہوا لگ گئی تو۔"

"کوئی ہوا نہیں لگتی بیٹا ہم جیسے سخت جانوں کو........" وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور آہستہ سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ رات بھی مجھ پر سخت کٹھن تھی۔ میرا باپ بیمار تھا اور میں اس سے کچھ فاصلے پر یہاں موجود تھی۔ پھر مجھے دور سے کھانسی کی آواز سنائی دی اور میں بے چین ہو گئی' میں نے کہا۔

"زرقا مدو بابا کھانس رہے ہیں۔"

"ہاں بیچارے کو بخار چڑھا ہوا ہے۔"

"زرقا اگر میں وہاں چلی جاؤں تو۔"

"جانا چاہو چلی جاؤ' اس وقت یہاں کوئی ہے بھی نہیں لیکن تم ان میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی نہیں لے رہی۔"

"بزرگ آدمی ہیں اور پھر اتنے اچھے ہیں کہ بے اختیار ان کے لئے دل میں محبت امڈتی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"زرقا کچھ ہو گا تو نہیں؟"

"مطلب!"

"اگر میں وہاں چلی جاؤں۔"

رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ کمبل اوڑھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے اور بری طرح کھانس رہے تھے' میں ان کے پاس بیٹھ گئی' میں نے انہیں پانی پلایا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

"ارے بیٹا تو' رات تو بہت ہو گئی ہے۔"

"آپ کھانس رہے ہیں بابا!"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"آپ کی دوا کہاں ہے؟"

"ایں' دوا' ہاں وہ میں لے لیتا ہوں۔" انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں لٹا دیا۔

"میں لاتی ہوں۔"

پھر میں نے انہیں سہارا دے کر دوا کھلائی اور مدو بابا دوا کھانے کے بعد لیٹ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر وہ مدھم لہجے میں بولے۔

"تیرے برابر میری بھی ایک بیٹی ہے اور میرے پاس اسے دینے کے لئے صرف دعائیں ہیں' اللہ اسے دنیا کی مصیبتوں سے دور رکھے۔"

"آپ کی بیٹی ہے مدو بابا!"

"ہاں' بیوی بھی ہے میری' بس گناہوں کی سزا ہی بھگت رہا ہوں۔ مگر تو یقین کر یہ سارے گناہ میرے اپنے نہیں ہیں۔ میں اپنے باپ کی دوسری بیوی کا بیٹا تھا۔ سوتیلوں کے درمیان پلا اور انہوں نے میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس نے مجھے باغی کر دیا۔ بس برائیوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پھر بیچاری رحانہ کی تقدیر پھوٹ گئی' میرے ساتھ۔ کاش! نہ پھوٹتی۔ میری ایک حویلی تھی یہاں سے دور ایک شہر میں وہاں وہ رہتی تھی۔ برائیوں میں پھنسا ہوا انسان تھا۔ برے لوگوں سے دشمنی ہو گئی تھی۔ کئی سال کی سزا ہو گئی تھی سزا کاٹنے کے بعد یہ سوچ کر باہر نکلا کہ اب زندگی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گزاروں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے' نہ کسی سے لڑوں گا اور نہ کچھ کروں گا' محنت مزدوری کر کے زندگی گزاروں گا لیکن وہ دونوں میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔"

"ساتھ چھوڑ گئیں۔"

"ہاں میں حویلی پہنچا تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ حویلی میں رہنے والے درندوں نے جو میرے سوتیلے بھائی تھے' دونوں ماں بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا۔ عجیب عجیب کہانیاں سننے کو

وہ نہ ملیں تو مجھ پر دیوانگی سوار ہو گئی اور اس کے بعد میں نے نئی حویلی کو آگ لگا دی۔ میں نے ایک حصار بنایا اور پیٹرول چھڑک کر پوری حویلی کو خاکستر کر دیا۔ وہ لوگ جو اس حویلی میں رہتے تھے بس تقدیر تھی ان کی کہ چور دروازے سے نکل گئے لیکن میں نے حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ ان کا سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا تھا اور اس کے بعد میں ان کے سارے اثاثے تباہ کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے انہیں فقیر بنا دیا۔ پولیس میری تلاش میں تھی' مجھ پر مقدمات قائم تھے' وہ تو اتفاق کی بات ہے کہ وہ لوگ حویلی سے زندہ نکل گئے۔ ورنہ میں تو انہیں بھی خاکستر کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پھر اس کے بعد میں آخر پولیس کے جال میں پھنس گیا۔ سزا تو ہونی ہی تھی' بیٹی لیکن سب سے خوفناک بات ایک خیال ہے۔"

"کیسا خیال مدو بابا!"

"سزا ختم ہو رہی ہے میری' بس تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں' میں یہ سزا ختم نہیں کرانا چاہتا۔ جیلر سے بڑی منت سماجت کر چکا ہوں کہ مجھے یہیں میری بچیوں کے درمیان رہنے دیا جائے۔ باہر کی دنیا میں میرا کون ہے لیکن ظاہر ہے جیلر یہ نہیں کر سکتا' اب یہ سوچتا ہوں کہ باہر نکل جاؤں گا تو کیا کروں گا۔"

"مدو بابا! آپ اپنی بیوی اور بیٹی کے ملنے سے مایوس ہو گئے ہیں۔"

"ہاں .... بیٹی مایوس ہو گیا ہوں۔" انہوں نے جواب دیا' میرے دل میں آنسو نکلتے رہے۔ اب ساری کہانی مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ مقدس چاچا فقیروں کی طرح کیوں نظر آ رہے تھے اس کا بھی مجھے پتہ چل گیا تھا۔ ایک طرف دل کو ایک خوشی کا احساس ہوا تھا تو دوسری طرف ابو کے مسئلے پر میں کڑھ رہی تھی۔ دو سال کی سزا ہوئی ہے مجھے' ابو کی سزا پتہ نہیں کتنی باقی ہے۔ میں کشمکش کا شکار رہی۔ صبح فجر کی اذان کے وقت واپس اپنی بیرک میں آئی۔ مجھ سے بات کر کے مدو بابا کی طبیعت بحال ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے خون کے اثرات بھی متحرک ہوں گے لیکن میرے اندر سوچوں کا بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بعد میں مدو بابا سے ملتی رہی۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ہاں جب یہ رہا ہونے لگیں گے تو میں انہیں تفصیل بتا کر کہوں گی کہ ہمارا انتظار کریں۔ میں جانتی ہوں کہ ماں کہاں ہے۔ اس کے لئے میں نے ایک بہترین پروگرام بنا لیا تھا۔ میں وقت سے پہلے انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ تھا تقدیر کا ایک کھیل لیکن

وکیل صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان وکیل صاحب کا نام محمد شبیر احمد تھا اور یہ وہی تھے جنہوں نے سرکاری طور پر میری وکالت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ظاہر ہے میں اقراری مجرم تھی' رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ اس لئے وہ مجھے رہا نہیں کرا سکے تھے۔ شبیر احمد صاحب نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"شیراز! میں تمہارے لئے خوشخبری لے کر آیا ہوں۔"

"کیسی خوشخبری' شبیر احمد صاحب!"

بس یوں سمجھ لو کہ تمہاری رہائی کا وقت قریب ہے۔"

"کیا؟ ابھی تو مجھے چند ماہ بھی نہیں گزرے۔"

"تقدیر نے تمہارے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اصل میں دلاور اور اس کا گروہ گرفتار ہو گیا ہے۔ ان کے قبضے سے تمہاری ماں کو بھی برآمد کر لیا گیا ہے اور تمہاری ماں اب میرے پاس ہیں۔"

"کیا..........؟"

"ہاں' عدالت میں ان کا بیان ہو چکا ہے اور اس بیان میں انہوں نے بتا دیا ہے کہ کس طرح انہیں اپنے قبضے میں لے کر دلاور نے تمہیں منشیات بیچنے پر مجبور کیا تھا۔ بیٹی! میں وکیل ہوں۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو ایسے کام بھی سرانجام دینا ہوتے ہیں جنہیں ہمارا دل ہمارا ضمیر قبول نہیں کرتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی تمہاری ہی طرح دلاور کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ اس لئے میں مجبور تھا۔ بہرحال دو تین دن میں تمہاری رہائی کا پروانہ مل جائے گا۔ اپنے آپ کو تیار کر لو۔"

"امی کہاں ہیں..........؟" میں نے آنسو بھری آواز میں کہا۔

"میرے گھر میں' میرے پاس ہیں۔ تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ بہت کچھ بتا چکی ہیں مجھے بیٹی وہ۔ انہوں نے مجھے تمہارے والد کے بارے میں بھی تفصیل بتا دی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرا دل روتا ہے' تمہارے لئے لیکن بہرحال مجھ سے تمہاری جو بھی خدمت ہو سکی میں کروں گا۔ تم اپنے آپ کو بے کس اور بے سہارا نہ سمجھنا۔"

میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وکیل صاحب مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ اب مجھے شدت سے مدو بابا کی تلاش تھی۔ اب میں انہیں تمام صورت حال بتانا چاہتی تھی۔ مدو بابا کی کوٹھری میں پہنچی تو وہ موجود نہیں تھے۔ میں نے لڑکے سے ان کے بارے میں پوچھا تو

ہوتا رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی چلے جاتے تھے اور کئی کئی دن نہیں آتے تھے۔ غالباً جیلر کہیں ان کی ڈیوٹی لگا دیتا تھا۔ میں بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگی۔ دو چار دن گزر گئے۔ پانچویں دن بھی مدو بابا نہیں آئے تو میں بے چین ہو گئی۔ میں ایک ایک سے ان کے بارے میں پوچھتی پھر رہی تھی لیکن اس سے زیادہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر غالباً دن کے گیارہ بجے کا ٹائم تھا۔ جب میری طلبی ہو گئی۔ مجھے دو کانسٹیبل عورتیں جیلر صاحب کے کمرے کی جانب لے کر چل پڑیں۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ جیلر صاحب کو مدو بابا کے متعلق تفصیل بتا دوں گی۔ شبیر احمد صاحب مجھے لینے ضرور آئیں گے۔ میں ان کے گھر کا پتہ جیلر کو دے دوں گی۔ چنانچہ یہ تہیہ کرنے کے بعد میں ان عورتوں کے ساتھ جیلر کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ جیلر صاحب کے کمرے میں شبیر احمد صاحب موجود تھے لیکن ایک طرف دیوار کے سہارے میں نے مدو بابا کو بھی کھڑے ہوئے دیکھا۔ ہاتھوں میں ایک گٹھڑی لئے ہوئے کھڑے تھے۔ میں اندر داخل ہوئی تو مجھے دیکھ کر چونکے۔

"ارے' بیٹی شیری! تم؟" میں مدو بابا کو دیکھ کر فرط مسرت سے دیوانی ہو گئی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ انہوں نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"مدو بابا! آپ' آپ خیریت سے تو ہیں؟ آپ وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔"

"ہاں بیٹی! خیریت جسے کہا جاتا ہے۔ اس حساب میں خیریت سے ہوں لیکن میرے برے دنوں کا آغاز ہو گیا ہے۔"

"کیوں مدو بابا؟" میں نے سوال کیا۔

"انہوں نے اپنے الفاظ میں مجھے آزادی دے دی ہے۔ میری سزا ختم ہو گئی ہے لیکن باہر کی دنیا میں جینا میرے لئے سب سے بڑی سزا ہے۔ اب میں وہ سزا بھگتنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"آپ.......... آپ رہا ہو گئے مدو بابا؟" میں نے فرط مسرت سے جھومتے ہوئے کہا۔

"یہی کہہ لو بیٹی! بس زندگی کی قید میں گرفتار ہوں' دیکھو اس سے رہائی کب ملتی ہے؟" شبیر احمد صاحب نے مجھے آواز دی۔

دیکھتی ہوئی واپس پلٹی۔ جیلر نے مجھ سے رجسٹروں پر دستخط کرائے اور اس کے بعد بولا۔

"آزادی کی مبارکباد دیتا ہوں۔ بہرحال ایسا ہوتا ہے۔ بے شمار لوگ بے گناہ گرفتار ہو جاتے ہیں اور قانون کچھ بھی نہیں کر پاتا بہرحال.........." اور اس کے بعد اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے مدو بابا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ نہیں چل رہے مدو بابا!"

"بس' ہاں' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' بیٹی کہ تمہیں بھی آزادی مل گئی۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"مدو بابا! آپ ادھر آؤ' اس رجسٹر پر دستخط کرو۔ شبیر احمد صاحب! آپ انہیں لے جایئے۔ ہر جگہ کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔"

جیلر نے کہا اور شبیر احمد صاحب مجھے لے کر چل پڑے۔ میرے قدم کانپ رہے تھے۔ میری زبان شدت مسرت سے بند ہوتی جا رہی تھی۔ بمشکل تمام میں نے شبیر احمد صاحب سے کہا۔

"شبیر احمد صاحب! ذرا سا انتظار کیجئے۔" شبیر احمد صاحب کی کار جیل کے دروازے سے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر مجھے جیل کے بڑے دروازے سے باہر لے آئے' پھر بولے۔

"کون ہیں یہ صاحب جن سے تم مل رہی تھیں؟"

"شبیر احمد صاحب' وہ آتے ہوں گے' ہم .... ہم انہیں ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"کیا مطلب.........؟"

"شبیر احمد صاحب یہ بہت ضروری ہے۔ آپ براہ کرم ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھئے۔ وہ آ جائیں گے تو ہم انہیں ساتھ چلنے پر مجبور کریں گے۔" شبیر احمد صاحب نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔ پھر خاموش ہو گئے۔ ہمیں تھوڑی ہی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ شبیر احمد صاحب کی سفید کار کے ساتھ کمر لگائے کھڑی میں جیل کی ذیلی کھڑکی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر مدو بابا اس سے برآمد ہوئے۔ وہی گٹھری بغل میں دبائے ہوئے ویران ویران چہرہ لئے ہوئے وہ چند قدم آگے بڑھے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گئی۔

"میں آپ کا انتظار کر رہی تھی' مدو بابا!" انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر بولے۔

"آپ کو بھی ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟" انہوں نے حیرانی سے کہا۔

"جہاں میں جاؤں۔"

"ارے نہیں بیٹے! بری بات' ایسی بیکار باتیں نہیں کرتے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں ایک سزا یافتہ مجرم ہوں۔"

"مجھے سب کچھ پتا ہے مدو بابا! آپ بس' آیئے میرے ساتھ۔"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور مدو بابا نے بے بسی سے مجھے دیکھا پھر بولے۔

"چلو میں ان صاحب سے بات کرتا ہوں۔" پھر ہم دونوں شبیر احمد صاحب کے پاس آ گئے جو ہمیں کھڑے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

"وکیل صاحب! میں نے آپ کے بارے میں اندازہ آپ کے اس کالے کوٹ سے لگایا ہے۔ یہ بچی بڑی معصوم سی ہے۔ مجھے جیلر صاحب سے تمام تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔ یہ ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ سب کا نگہبان ہوتا ہے۔ وہ اپنے معصوم بندوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ اگر وہ بے گناہ ہوں تو اور گناہوں کی سزا تو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ گناہوں کی سزا اس دنیا میں بھگت لی جائے۔ میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں یہ بچی مجھے کہاں لے جانے کی ضد کر رہی ہے؟"

"آپ آ جایئے۔ محترم بزرگ' کوئی حرج نہیں' کسی کا دل رکھ لینا بھی بڑی بات ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' وکیل صاحب! لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایک سزا یافتہ مجرم کی زندگی دوسروں کے لئے تکلیف دہ ہی ہوتی ہے۔"

"آپ تھوڑی دیر کے لئے چلئے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کون آپ کو روک سکتا ہے۔" شبیر احمد صاحب کچھ ضرورت سے زیادہ ہی نفیس انسان تھے۔ انہوں نے میری بات مان لی تھی اور اس کے بعد میں مدو بابا کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور شبیر احمد نے سٹیئرنگ سنبھال لیا۔ حالانکہ یہ ایک غیر مناسب بات تھی۔ بہرحال وہ ہمارے وکیل تھے۔ از راہ انسانیت اگر انہوں نے امی کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن کسی اور کا ان کے ساتھ جانا ذرا عجیب تھا لیکن یہ تو میں ہی جانتی تھی کہ وہ

سا صبر اور کر لینا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ابو کو جب اس حقیقت کا علم ہو گا کہ میں ان کی بیٹی ہوں اور رحمانہ زندہ سلامت ایسی جگہ موجود ہیں جہاں وہ مل سکتی ہیں تو بڑی دردناک کیفیت ہو گی۔

بہرحال ان لمحوں کو برداشت کر کے میں ان دونوں کا سامنا کرانا چاہتی تھی۔ یہ تو بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ میں خود جس عجیب کیفیت کا شکار تھی اس کے بارے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ تو مدد بابا کو اگر میں ابھی سے بتا دیتی تو ساری باتیں بڑی مشکل ہو جاتیں۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد شبیر احمد کی کار ایک خوبصورت سے بنگلے کے باہر رکی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ انہوں نے ہم دونوں کو اترنے کے لئے کہا اور پھر ہمیں دونوں کو لے کر اندر چلے گئے۔ مدد بابا کو انہوں نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی ضد نہیں کی۔ پہلے امی کو ذہنی طور پر تیار کرنا تھا۔ شبیر احمد کے ساتھ میں اندر داخل ہوئی۔ ایک کمرے میں امی موجود تھی۔ انہیں ابھی تک میرے آنے کی خبر نہیں ملی تھی۔ میں کمرے میں پہنچی تو وہ حیران ہو کر کھڑی ہو گئیں اور اس کے بعد وہ مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر روئیں تو اس طرح روئیں کہ انسانوں کے کلیجے پھٹ جائیں۔ وکیل صاحب تو باہر نکل گئے تھے۔ غالباً ان سے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ امی مجھ سے لپٹی رہیں اور رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ میں نے بھی انہیں اپنے سینے سے خوب لپٹایا تھا۔ اتنے دن جو کیفیت ہم ماں بیٹیوں میں گزری تھی' اللہ ہی اسے بہتر سمجھتا ہے۔ امی مجھ سے رو رو کر کہنے لگیں۔

"میری بچی' یہ دن بھی تیری تقدیر میں لکھا تھا کہ تُو جیل جائے۔ ہائے کیا کیا نہ ہوا تیرے ساتھ.........."

"امی خود کو سنبھالئے۔ اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا' میں جیل جا کر اتنی خوش ہوں کہ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتی۔" میرے الفاظ پر امی نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔ رو رو کر ان کی آنکھیں سوج گئیں تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہے تُو؟"

"ہاں امی' جیل جا کر میں جتنی خوش ہوں آپ کو بتا نہیں سکتی۔"

"تیری بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جیل بھی کوئی ایسی جگہ ہے جہاں جا کر خوشی ہو۔"

ہیں۔"

"کیا..........!" امی پر ایک بار پھر حیرت کا حملہ ہوا۔

"ہاں' امی مجھے ابو مل گئے۔ امی میرے ابو مجھے مل گئے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ساری دنیا کی مصیبتیں اٹھانے کے بعد بھی اگر مجھے میرے ابو ملتے تو میں ان مصیبتوں کو خاطر میں نہ لاتی۔"

"کہاں ہیں وہ' وہ کیسے ہیں' زندہ ہیں وہ.........."

"امی وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے نہیں پہچانتے وہ۔ میں انہیں مدد بابا کہہ کر مخاطب کرتی ہوں۔"

"مگر ہیں کہاں؟"

"آیئے میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"آیئے ناں!" میں امی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ امی شاید حیران تھیں۔ شاید انہیں میری دماغی حالت پر بھی شبہ ہو رہا تھا لیکن مجھ سے زیادہ خوش اور کون ہو سکتا تھا۔ مدد بابا یا ابو شبیر احمد کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ابھی چند لمحات میں کیا ہونے والا ہے۔ امی نے ابو کو دیکھا اور ابو نے امی کو۔ مجھے تو بے شک وہ نہیں پہچان سکے تھے لیکن امی کو ایک لمحے کے اندر پہچان گئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"رحمانہ..........!" انہوں نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ وکیل صاحب کا چہرہ بھی حیرت کی تصویر بن گیا تھا۔

"آپ .... آپ انہیں جانتے ہیں۔" لیکن امی کی دلدوز چیخ ابھری۔ وہ آگے بڑھیں اور ابو کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد ابو بھی بے اختیار ہو گئے' پھر انہوں نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

"یہ .... یہ..........؟" رخ میری طرف تھا۔ تو امی نے کہا۔

"ہاں' یہ آپ کی شیرانہ ہے۔" بس اس کے بعد واقعات بیان سے باہر ہیں۔ جذبات کے جتنے طوفان نہ اندتے کم تھا اور تو اور شبیر احمد صاحب کی آنکھیں بھی آنسو بہانے لگی تھیں۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ یہاں تھے۔ سب اس طرح خوش ہوئے جیسے کسی بچھڑے ہوئے خاندان سے ملے ہوں۔ بہت ہی اعلیٰ ظرف انسان تھے' کہنے کو تو

لوگ خدا سے واقف ہوں وہ دوسروں کی خوشی میں ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ شبیر احمد صاحب اس طرح خوشیاں منا رہے تھے جیسے خود ان کے گھر کا کوئی مسئلہ نمٹ گیا ہو۔ پھر اس کے بعد انہوں نے ہماری بھرپور مدد کی۔ صاحب جائداد تھے۔ ایک چھوٹا سا گھر ہمیں اپنے طور پر دے دیا۔ ابو کو اپنے ساتھ انہوں نے ملازمت سے لگا لیا تھا اور انتہائی معقول تنخواہ انہوں نے مقرر کر دی تھی تاکہ ابو بھٹکتے نہ پھریں۔ اس طرح ہماری زندگی کو ایک نیا دور ملا تھا لیکن کوئی تین چار مہینے کے بعد کی بات ہے۔ ہم اپنے گھر میں مطمئن اور مصروف تھے۔ جو دال روٹی اللہ دے رہا تھا وہ کھا رہے تھے کہ ایک رات بارہ بجے کا وقت تھا۔ اچانک ہی عجیب سی آوازیں گھر میں ابھریں' ہم حیران رہ گئے۔ میں امی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی' ابو بھی سامنے ہی موجود تھے اور بس سونے کے لئے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ کوئی اندر داخل ہوا۔ ہم سب اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ ایک بزرگ صورت انسان اور امی نے فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ اسی مسجد کے موذن تھے۔ ہمیں ویرانے میں ملے تھے اور انہوں نے حجرے میں ہماری امداد کی تھی۔ مجھے فوراً ہی شعبان یاد آ گیا۔ ابو نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

"محترم' آپ بغیر اجازت اندر کیسے آئے؟"

"میں ایک مشکل میں گرفتار ہوں جناب! اصل میں شعبان.........."

"باہر نکلئے' آپ جائیے باہر جائیے۔" ابو نے اس شخص کے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار کیا اور میں کچھ نہ کر سکی۔ آہ میں' شعبان مجھ سے چھن گیا۔ ماں باپ کبھی کبھی اپنی اولاد سے اپنی محبت کا بہت بڑا قرض وصول کرتے ہیں۔ میری زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی۔ شعبان مجھے دوبارہ کبھی نہیں ملا۔ ماں باپ دنیا سے چلے گئے اور میں .... میں اب تک زندہ ہوں۔ زندگی کے بوجھ کو گھسیٹ رہی ہوں بس۔

سونو کو یہ داستان بڑی عبرتناک لگی تھی۔ کسی کی مدد کتنی کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے جو کر سکتی تھی کیا اور اس کے بعد وہاں سے چل پڑی۔ کسی نئی داستان کی تلاش میں۔ اپنی فطرت کے دوسرے پہلو نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ دولت کا حصول اس کی فطرت کا ایک حصہ تھا۔ ماں باپ کی خدمت بھی کرنا چاہتی تھی لیکن یہ طلسمی ہیرا اسے اب سب سے زیادہ عزیز تھا جو اسے نت نئی کہانیوں سے روشناس کراتا تھا۔ اب اسے اپنی پسند کا ایک چہرہ درکار تھا جس سے وہ کوئی نئی کہانی سنے۔

☆------☆------☆

نئی کہانی سربفلک پہاڑوں کے دامن میں آباد پہاڑ زادوں کی تھی۔ اس سرسبز کائنات میں انسان مختلف قبیلوں کی شکل میں اپنی اپنی روایتوں کے ساتھ آباد ہیں۔ ازل سے آج تک وہ اپنی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے۔ محبت' جرم' حسد اور لالچ' یہ اس کی فطرت کے اجزاء ہیں۔ جس داستان کو منتخب کیا' وہ انہی پہاڑ زادوں کی انوکھی داستان تھی۔

تاحدِ نظر بکھری ہوئی برف پوش پہاڑیوں اور میدانوں کے درمیان پندرہ ہزار افراد کی آبادی نظام پور کہلاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں' کھیتی باڑی اور ایک چھوٹے سے بازار سے زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے والے لوگ یہاں آباد تھے اور آبادیوں میں مسائل ضرور ہوتے تھے۔ کسی آبادی کو مسائل سے دور کی جگہ کہنا دروغ گوئی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی سب کچھ تھا غربت و افلاس' تونگری' نیکیاں' برائیاں' مذہب' لادینیت' قانون' لاقانونیت مختلف مزاج' مختلف عادات' ہر طرح کے لوگ یہاں آباد تھے لیکن اس وقت موسم نے ان سب کے مسائل یکجا کر دیئے تھے۔ سردی صرف سردی۔

گھروں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں لیکن بستی کے آخری سرے پر اللہ کے گھر میں ایک بلند مینار کا چراغ روشن تھا۔ یہ چراغ زندگی کی علامت تھا' یہ چراغ برف کے طوفان کو اشارہ کرتا تھا کہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ یہاں خدا کا نام لینے والے آباد ہیں اور طوفان احتیاط کرتے تھے۔ اگر وہ احتیاط نہ کرتے تو بستی آباد نہ رہتی۔

مسجد کے صحن میں مولوی فیضان علی خاں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ عشاء کی نماز میں صرف ان کے دونوں بیٹے شامل تھے۔ سخت سردی کی وجہ سے آج لوگ مسجد نہیں آئے تھے اور مولوی صاحب حسب معمول آزردہ تھے۔ انہیں لوگوں سے شکایت تھی' بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ تھوڑی سی سردی بڑھ گئی تو مسجد غیر آباد ہو گئی۔ لوگ بھی کتنے کاروباری ہو گئے ہیں۔ وہ نعمتوں کے ڈونگرے برساتا رہے تو عبادت بھی ہو گی اور جہاں بدن کو تکلیف ملی عبادت سے بھی بھاگ گئے۔ خودغرض کہیں کے۔

"ابا! قہوہ لاؤں؟" حجرے سے سنبل کی آواز آئی اور مولوی صاحب نے اس کی آواز سن کر تسبیح چومی اور پھر اسے اپنی عبا کی جیب میں ڈال لیا۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حجرے کی طرف بڑھ گئے۔

"نہیں بیٹی! البتہ مجھے سے تھوڑا سا تیل نکال لاؤ۔ چراغ کو بھر دوں تاکہ وہ رات

کے کسی حصے میں بجھ نہ جائے۔" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

"اچھا ابا!" سنبل نے کہا۔ پھر تیل کا برتن مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے تیرہ سالہ لڑکی نے معصومیت سے پوچھا۔

"ابا! رات بھر چراغ جلا کر کیا کریں گے' خواہ مخواہ تیل خرچ ہو گا۔"

"ارے نہیں بیٹی! پوری بستی تاریک ہے۔ کیا خدا کے گھر کو بھی تاریک کر دو گی۔ کون جانے یہ چراغ کس کی ضرورت ہو۔" مولوی صاحب نے جواب دیا اور تیل لے کر مینار کے چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ان کی جانی پہچانی تھیں۔ تاریکی میں بھی کسی غلط قدم کی توقع نہیں تھی۔ وہ بلندی پر پہنچ گئے۔ اوپر لگے ہوئے شیشوں کے درمیان چراغ روشن تھا۔ مولوی صاحب نے چراغ کی کٹوری میں تیل بھرا اور کپڑے کی موٹی سی بتی کچھ اونچی کر دی تاکہ وہ رات بھر میں جل کر نیچی نہ ہو جائے۔ چراغ کی طرف سے مطمئن ہو کر انہوں نے ایک نگاہ شیشوں سے باہر ڈالی۔ سفید ذرات کی چادر زمین و آسمان کے درمیان تنی ہوئی تھی۔ ہوائیں ان ذرات کو چکر دے رہی تھیں۔ فیضان علی نے ایک گہری سانس بھری اور ان کے منہ سے نکلا۔

"خداوندا! یہ بھی تیری رحمت کا ظہور ہے۔ یہ بھی تیری عظمت کا پرتو ہے' تُو اسے کسی ذی روح کے لئے عذاب نہ بنانا' تُو رحیم مطلق ہے۔" انہوں نے داڑھی پر دونوں ہاتھ پھیرے اور تبھی ان کی نگاہ میں کچھ دھندلائے ہوئے نقش ابھرے۔ دور میدان کے دوسرے سرے پر ایک متحرک سراب محسوس ہوا تھا۔

زندگی بھر نیکیوں اور زندگی کے مخصوص اصولوں نے فیضان علی کو انسانی صفات سے مالا مال رکھا تھا۔ ان کی سماعت' بینائی اور دوسری جسمانی قوتوں میں کوئی اضمحلال نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے ان کی نگاہوں نے برف کی اس دبیز تہہ میں حرکت تلاش کر لی تھی۔ انہوں نے اس تحریک پر آنکھیں گاڑ دیں اور بہت جلد انہیں احساس ہو گیا کہ یہ صرف نظری واہمہ نہیں ہے' کوئی شے برف پر متحرک ہے۔

اس سرد طوفان میں کوئی جانور بھی اپنے ٹھکانے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ قدرت نے ہر ذی روح کو اپنی حفاظت کا شعور بخشا ہے۔ کہیں کوئی مصیبت زدہ نہ ہو' بستی کا کوئی شعور ناآشنا کوئی مسافر۔ اس تصور نے انہیں بے چین کر دیا۔ قدرت کے اس امتحان کو

انداز میں بھاگتے ہوئے اپنے حجرے میں آ گئے۔ ان کے بیٹے لحاف میں گھسے ہوئے سو رہے تھے۔

"کاشف! آصف! ذرا اٹھو میرے بچو! جلدی اٹھو خدائے عظیم نے ہم سے زندگی کا قرض طلب کیا ہے۔ کیا تم اس قرض کی ادائیگی میں غفلت برتو گے؟ جلدی اٹھو برف کے میدانوں میں کوئی طوفان کا شکار ہو گیا ہے۔ میں احسان مند ہوں اپنے خدا کا کہ اس نے یہ کارِ خیر ہمیں بخشا ہے۔ آؤ اس کی مدد کریں۔ شاباش جلدی سے تیار ہو جاؤ اور ہاں اپنا لحاف ساتھ لے لینا۔ سنبل بیٹی ذرا جلدی سے لالٹین جلا دو' میں فرغل پہن لوں اور ہاں قہوہ چولہے پر رکھ دینا خدا کی رحمت گھر میں آ رہی ہے۔"

تینوں باپ بیٹے مسجد سے باہر نکلے اور پھر دوڑنے کے سے انداز میں چل پڑے۔ ہواؤں کا شور اور سردی کی قیامت نے ان کے اعضا شل کر دیئے تھے لیکن ایک جذبہ ان کی روح میں سفر کر رہا تھا اور جذبے ہر موسم کی شدت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ وہ کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتے۔

"کیا ہم صحیح سمت سفر کر رہے ہیں بابا!" آصف نے پوچھا۔

"ہاں مجھے یقین ہے۔ جلدی چلو میں پیچھے رہ جاؤں تو فکر مت کرنا۔ خدا نے تمہیں اسی لئے جوان کیا ہے کہ تم تیز چلو۔"

☆-------☆-------☆

بے خانماں خاندان' تین افراد اور دو خچروں پر مشتمل تھا۔ اٹھارہ انیس سال کا ایک جوان' چالیس پینتالیس سال کا ایک شخص اور سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ایک خچر کی پشت پر چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت دوسرے خچر پر ان لوگوں کے سامان کا انبار تھا۔ فیضان علی نے ساتھ لایا ہوا لحاف عورت کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنے بدن کے گرد سنبھال لو بیٹی! شاباش بس چند گز کا فاصلہ باقی ہے حوصلہ مند رہو۔" عورت نے لحاف سنبھال لیا۔ "سردی تم لوگوں کو بھی لگ رہی ہو گی لو میاں تم فرغل بدن پر پہن لو اور میرا یہ جوان سردی سے جنگ کرے گا۔" انہوں نے شفقت بھری نظروں سے جوان کو دیکھا اور فرغل مرد کی طرف بڑھا دیا۔

"اسے آپ اپنے بدن پر ہی رہنے دیں بزرگ! خدا کے فضل سے ہم جنگ کرنے کے قابل ہیں۔" توانا شخص نے شکر گزاری کے ساتھ فرغل واپس کرتے ہوئے کہا۔

ہونے دو۔ میں اپنے بدن کا یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میری روح اذیت کا شکار رہے گی۔" فیضان علی نے عاجزی سے کہا اور فرغل دوبارہ اس شخص کو دے دیا۔ اس بار اس نے تعرض نہیں کیا تھا لیکن اس کے چہرے سے شدید کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری وجہ سے اس شدید سردی میں یہ تکلیف اٹھانی پڑی۔" تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

"نہیں عزیزم! میں تو اس معبود کا شکرگزار ہوں جس نے مجھے تمہاری خدمت کی توفیق بخشی۔ زندگی کیا شے ہے اس پر غور کیا ہے' تم نے؟ ہم سب مانند حباب ہیں' ابھرتے ہیں ڈوب جاتے ہیں۔ اگر ان ناتواں بلبلوں کو قدرت کسی کی امداد کرنے کی توانائی بخش دے تو انہیں اپنی تقدیر پر ناز کرنا چاہئے۔" فیضان علی نے کہا اور وہ شخص خاموش ہو گیا اس کے توانا بدن میں لرزش پیدا ہو گئی۔ پہلی بار اسے سردی کا احساس ہوا تھا نہ جانے کیوں۔

مولوی صاحب کے دونوں بیٹے خچروں کو مسجد کی پشت پر لے گئے۔ جہاں انہیں باندھنے کے لئے ایک محفوظ جگہ موجود تھی۔ خچر پر لدا ہوا سامان اتنا وزنی تھا کہ تینوں جوانوں نے مل کر اسے نیچے اتارا اور پھر اسے حجرے کے اندر لے گئے۔ سنبل خوش ذائقہ قہوہ لئے مہمانوں کی منتظر تھی۔ اس نے ان کے لئے آگ روشن کر لی تھی۔ پھر مہمانوں کو آگ کے قریب بٹھا کر قہوہ پیش کیا گیا۔

انیس سالہ نوجوان کس قدر سانولاہٹ لئے موٹے اور بھدے نقوش کا مالک تھا۔ اس کا قد خاصا بڑا تھا۔ مرد جس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہو گی پیکر توانائی تھا۔ اس کا چہرہ کرخت اور آنکھیں قاتلوں کی مانند تھیں۔ عورت ایک دبلے پتلے بدن کی مالک تھی اور سب سے زیادہ مضمحل نظر آ رہی تھی۔ فیضان علی کے اصرار پر انہوں نے کئی پیالی قہوہ پی کر خود کو گرم کیا اور پھر فیضان علی نے ان کے لئے سونے کا بندوبست کر دیا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ مہمانوں کو دے دیا تھا اور قوی ہیکل شخص عجیب سی نگاہوں سے اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔

"بس اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح گفتگو ہو گی۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"آپ لوگ کہاں جائیں گے۔" مرد نے پوچھا۔

"باہر مسجد میں' خدا کا گھر بڑا وسیع ہے۔"

"لیکن باہر سردی شدید ہے۔"

"عبادت الٰہی میں یہی تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ ہر احساس سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ ہم شکرانے کے نوافل پڑھیں گے کہ اس نے ہمیں مہمانوں کی نعمت سے نوازا۔" فیضان علی نے مسکراتے ہوئے کہا اور قوی ہیکل مرد فیضان علی کو دیکھتا رہ گیا۔

"آؤ بچو! خدائے بزرگ و برتر کے آگے سر جھکائیں۔" سنبل' آصف اور کاشف اپنی گرم کمین گاہ چھوڑ کر باہر نکل گئے اور تینوں نووارد حیرانی سے خالی دروازے کو دیکھتے رہ گئے۔

پھر نوجوان لڑکے نے نگاہیں گھما کر باپ کو دیکھا اور قوی ہیکل شخص کی آنکھیں جھک گئیں۔ تب نوجوان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ ایک قدم آگے بڑھ کر مرد کے سامنے پہنچ گیا۔

"میرا باپ تجربے کار ہے' اس نے دنیا کے لاکھوں رنگ دیکھے ہیں اور میرے باپ سے معتبر شخصیت دوسری نہیں ہے۔ میں ان عجوبوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں' مجھے ان کے بارے میں بتاؤ بابا!"

"مجھے پریشان مت کرو ندیم!" مرد نے رخ بدل لیا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"میرے بابا کو شدید سردی لگ رہی ہے' شاید میں اس کے کانپتے بدن کو دیکھ رہا ہوں۔ اوہ' یہ گرم لحاف موجود ہے' یہاں بیٹھ جاؤ بابا! میں تمہارے بدن کے گرد لحاف لپیٹ دوں گا۔" نوجوان نے کہا اور مرد کا بازو پکڑ لیا لیکن اس قوی ہیکل شخص نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ اس نے خونی نگاہوں سے نوجوان بیٹے کو دیکھا۔ نوجوان کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گڑ گئیں اور دونوں دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک کی آنکھوں میں خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور دوسرے کی آنکھوں میں ایک پُراسرار چمک چھپی ہوئی تھی۔ خون کے سمندر کی روانی سست پڑ گئی اور بڑی بڑی سرخ آنکھیں جھک گئیں۔

"مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" بالآخر مرد کی تھکی تھکی آواز ابھری۔

"باہر شدید سردی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پوری بستی موت کی نیند سو رہی ہو۔" نوجوان نے کہا۔

"ہاں' یہی لگتا ہے۔" مرد بولا۔

"ان لوگوں کو بھی اندر لے آئیے۔ ہم سب رات آرام سے یہاں بسر کر سکتے ہیں۔ [illegible]

"وہ .... وہ باہر عبادت کر رہے ہیں۔ میں .... میں ان سے یہ کیسے کہوں کہ عبادت ترک کر دیں۔" مرد نے پھسی پھسی آواز میں کہا۔

"جس طرح بھی بن پڑے بابا! جس طرح بھی بن پڑے۔" نوجوان ضد کرنے والے انداز میں بولا اور مرد الجھے الجھے قدموں سے باہر نکل گیا۔ سرد ہوا کے جھونکے اس کے بدن سے ٹکرائے اور اسے بدن سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یخ بستہ دالان میں بزرگ فیضان علی نیت باندھے کھڑے تلاوت کلام پاک کر رہے تھے اور ان کے دونوں بیٹے اور بیٹی نیت باندھے ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ سرد لہروں نے قوی ہیکل مرد کے پورے وجود کو پانی پانی کر دیا۔ نہ جانے اس کے جی میں کیا سمائی کہ وہ صحن میں لگے نل کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے نل کھولا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا اور پھر جمنے کے قریب سرد پانی سے وضو کیا اور شانے پہ پڑے رومال کو سر پہ لپیٹ کر خود بھی خاموشی سے سب سے پیچھے والی صف پر جا کھڑا ہوا۔

اس نے نیت کر کے ہاتھ باندھ لئے تھے۔ عقب کے کھلے دروازے سے عورت اور لڑکے نے یہ منظر دیکھا اور دونوں خوشی سے سرشار ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"بابا واپس آ گئے' ماں! تجھے مبارک ہو .... بابا واپس آ گئے۔" نوجوان کے منہ سے مسرت بھری آواز نکلی اور سردی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں عورت نے کہا۔

"آؤ ندیم! ہم بھی شکرانے کے نفل پڑھیں۔ آؤ میرے بچے آؤ خدا نے اپنے روٹھے ہوئے بندے کو اپنے حضور طلب کر لیا ہے' آؤ اس کی ذات پاک کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔" عورت نے لڑکے کا بازو پکڑتے ہوئے کہا اور دونوں حجرے سے باہر نکل آئے۔ وضو کیا اور مرد کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

مولوی فیضان علی وجد کے عالم میں تلاوت کر رہے تھے۔ کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا' سارے احساسات فنا ہو گئے تھے اور پھر وہ سورت ختم ہو گئی جس کی وہ تلاوت کر رہے تھے' تب انہوں نے رکوع کیا اور پھر سجدے میں چلے گئے۔ سلام پھیر کر انہوں نے پیچھے مڑ کر اپنے بچوں کو دیکھا لیکن نگاہ کچھ اور عقب میں چلی گئی۔ وہ حیران رہ گئے۔ ایک لمحے کے لئے تو ان کے ہونٹوں پر بڑی وجد آفریں مسکراہٹ پھیل گئی لیکن پھر دوسرے لمحے اس کی جگہ تشویش نے لے لی اور وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر مرد کے پاس جا پہنچے۔

"سبحان اللہ' آفریں صد آفریں' بیشک عبادت الٰہی افضل ہے ہر چیز سے لیکن عالم سفر میں کچھ رعایتیں بھی بخشی گئی ہیں۔ تم لوگوں نے یخ بستہ میدان کا طویل سفر کیا ہے میں تو متفکر تھا اس بات سے کہ خدا نخواستہ تم میں سے کوئی بیمار نہ ہو جائے۔ تمہیں اس وقت آرام کرنا چاہئے۔"

"معزز میزبان' باہر سردی میں ہے ہم اس کے بغیر کسی طور اندر قیام نہیں کر سکتے۔ ہم بھی اس نعمت کے حصول کے لئے تمہارے پاس آ گئے جو تم حاصل کر رہے ہو۔" قوی ہیکل مرد نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

"بخدا میں اس نعمت کے حصول سے تمہیں کبھی نہ روکتا لیکن میرا احساس مجھے یہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

"تو پھر آپ بھی مع ان بچوں کے اندر آ جائیں بزرگ! یہ میری خواہش ہے۔" مرد نے کہا۔

"تمہیں تکلیف ہو گی۔"

"نہیں ہمیں راحت ہو گی۔" مرد نے کہا اور مولوی فیضان علی ایک لمحے کے لئے سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر شانے ہلا کر بولے۔

"جیسی تمہاری مرضی اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے گردن جھکا دی اندر آ کر سنبل نے آگ تیز کر دی اور پھر اندر جو کچھ موجود تھا اسے سردی سے بچاؤ کے لئے استعمال کیا گیا۔ سنبل اور عورت کو تخت پر سلا دیا گیا اور وہ سب آگ کے گرد بیٹھ گئے۔

"بڑی سخت سردی ہے خداوند قدوس رحم فرمائے تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"کاغلان سے۔ ہم نے نقل وطن کی ہے۔" مرد نے جواب دیا۔

"معزز مہمان کا نام کیا ہے؟"

"اسلم!" مرد نے جواب دیا اور پھر بولا۔

"یہ میرا بیٹا ندیم ہے اور وہ بیوی مسرت ہے۔"

"خداوند قدوس عمر دراز فرمائے۔ اتنا طویل سفر کیا ہے' تم لوگوں نے۔ میں نے کاغلان کا صرف نام سنا ہے۔ چشم تصور سے بھی اسے دیکھ نہیں پایا کبھی۔ کیسی جگہ ہے؟" فیضان علی نے پوچھا اور جواب میں اسلم کے ہونٹوں پر طنز آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوہ' تمہارے ساتھ شاید وہاں بہتر سلوک نہیں ہوا۔ خیر خداوند تمہیں سکون دے۔ یہاں آرام سے قیام کرو۔ یہ مختصر جگہ تمہارے لئے آرام دہ تو نہیں ہو گی لیکن ہم سب تمہاری خدمت کر کے تمہیں حتی الامکان آرام دینے کی کوشش کریں گے۔"

"کیا ہمیں اس بستی میں زندگی گزارنے کی جگہ مل سکے گی بزرگ!" اسلم نے پوچھا۔

"کیوں نہیں زمین اللہ کی ہے' اس پر تو سب کا حق ہے۔ کوئی تمہیں اس سے نہیں روکے گا۔ جہاں مناسب سمجھو اپنے لئے کوئی ٹھکانہ بنالو۔ رازق خداوند ہے۔ بس تمہاری محنت تمہاری زندگی میں معاون ثابت ہو گی۔" اسلم نے گردن ہلا دی۔ نوجوان بیٹا باپ کے چہرے پر کسی نمایاں تاثر کی تلاش میں تھا لیکن جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اسے دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسرتوں کا طوفان امنڈ رہا تھا۔

رات کے آخری پہر وہ لوگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر سو گئے لیکن مولوی فیضان علی کو سونے کی زیادہ مہلت نہیں ملی۔ انہیں علی الصبح پیام حق دوسروں کے کانوں تک پہنچانا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھے اور وضو کر کے مینار پر پہنچ گئے۔ سردی کا وہی عالم تھا۔ ان کی ٹھٹھری ہوئی آواز فضا میں منتشر ہونے لگی اور رات کی تساہل سے شرمندہ لوگ بارگاہ ایزدی میں شرمسار شرمسار جمع ہونے لگے۔ ان لوگوں میں اسلم خاں بھی تھا۔

نماز فجر کے بعد کچھ لوگ الاؤ سلگا کر آ بیٹھے اور اس شدید سردی پر تبصرے کرنے لگے جو اس وقت ہواؤں کی تندی ختم ہو جانے کے بعد کچھ کم ہو گئی تھی۔ تب مولوی فیضان علی نے لوگوں سے کہا کہ بستی میں ایک اور خاندان کا اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے اسلم کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"مہاجر کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہئے جو اہل مدینہ نے کیا تھا۔"

چند خدا ترس لوگوں نے اسلم سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

"ایک چھوٹا سا قطعہ زمین جہاں میں اپنے رہنے کی جگہ بنا سکوں۔ اس کے بعد میں اپنے لئے روزی کا انتظام خود کر لوں گا۔"

"زمین یقیناً مل سکتی ہے لیکن اگر تمہارے پاس کچھ رقم نہیں ہے تو پھر ہم سب مل کر کوشش کریں گے کہ زمین کی قیمت مہیا کر دیں۔" لوگوں نے کہا۔

"نہیں بھائیو! زمین کی قیمت میں خود ادا کروں گا۔ بس میں آپ لوگوں سے اچھا

"اس بستی میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں' اچھے برے' نیک نفس' جرائم پیشہ' موجودہ زمانے کے اثرات کے شکار اور جدیدیت سے نفرت کرنے والے لیکن جو تمہارے نزدیک ہیں وہ تم سے ہر طرح کا تعاون کریں گے۔ ہم تمہارے لئے آج ہی ایک قطعہ زمین کا بندوبست کر دیں گے۔" ایک شخص نے کہا۔

سورج نکل آیا اور رات بھر کی سردی کے شکار خدا کی اس نعمت سے فائدہ اٹھانے نکل پڑے۔ جو لطف سورج کی حرارت میں ہے وہ آگ کی تمازت میں کہاں۔

بستی کے ایک صاف ستھرے علاقے میں اسلم نے ایک قطعہ زمین دیکھا اور اسے پسند کر کے مہنگے داموں خرید لیا۔ اس طرح جن لوگوں نے اسے ایک قلاش بے خانماں شخص سمجھا تھا انہوں نے اپنا خیال بدل دیا۔ پھر اس قطعہ زمین پر پکی اینٹوں سے ایک مکان تعمیر ہو گیا جو بستی کے معزز لوگوں کے مکانات سے کسی طور کم نہیں تھا اور اسلم حجرے سے مکان میں منتقل ہو گیا۔

خوبصورت مکان میں صرف تین افراد تھے۔ ندیم' مسرت اور اسلم۔ زندگی ابھی کوئی مناسب رخ نہیں اختیار کر پائی تھی۔ اسلم کی کیفیت ایک ایسے انسان کی تھی جو طویل عرصے تک صحراؤں میں بھٹکتا پھرا ہو' اپنوں سے دور ہو گیا ہو اور پھر جب اسے اپنے ملے ہوں تو وہ انہیں صحیح طور سے پہچان نہ پا رہا ہو۔ وہ سوچ رہا ہو کہ اپنوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے کیا ڈھنگ ہوتے ہیں لیکن نوجوان بیٹا اس کا معاون تھا۔ اس کی پرعزم مسکراہٹ اسلم کے لئے سکون کا باعث تھی۔

"ہم اس مکان میں بیٹھ کر باقی زندگی کس طرح گزاریں گے بابا!" ندیم نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچتا ہوں' ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"ہمارے سامنے ہمارا ماضی ہے۔ ہم ماضی کے درمیانی حصے کو ایک بھیانک خواب تصور کر سکتے ہیں۔ اس بھیانک خواب کو پھلانگ کر ہم ذرا پیچھے جا سکتے ہیں۔ نظام پور کی زمین بہت زرخیز ہے۔ میں قرب و جوار میں گھوم پھر کر دیکھ چکا ہوں۔ سونا اگلنے والی ان زمینوں میں ہمارا بھی حصہ ہے کیوں نہ ہم ان میں سے کچھ زمین خرید لیں۔"

"کھیتی باڑی کرو گے۔"

"ہاں یہ وہ کام ہے بابا! جس میں برائیوں سے دور رہنے کے سب سے اچھے مواقع ملتے ہیں۔"

معروف ہوں۔ ابھی میں خود کو عام لوگوں میں ضم نہیں کر سکتا۔ میرے سارے خواب تشنہ رہ گئے ہیں۔ ان کی تکمیل نہ پا کر مجھے جھنجلاہٹ ہو گی۔" اسلم نے کہا۔

"میں تمہارا معاون رہوں گا۔ اب تم سارے کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں بڑا ہو گیا ہوں بابا!" ندیم نے کہا اور اسلم ناقدانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ اس کے بیٹے کا قد اس سے اونچا نکل گیا ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"ارے ہاں تُو تو واقعی بڑا ہو گیا ہے' ندیم! میں نے تجھے غور سے دیکھا ہی نہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ تُو جیسا مناسب سمجھے کر۔" اسلم نے اپنی لگام بیٹے کے ہاتھ میں دے دی اور ندیم مصروف ہو گیا۔

زمین کا ایک ٹکڑا خرید لیا گیا اور پہلی بار ندیم کڑیل جوان ہل اٹھا کر اس زمین پر اترا۔ بستی کے لوگوں نے دونوں باپ بیٹوں کو زمین میں ہل چلاتے دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ بستی میں اچھے لوگوں کے ایک خاندان کا اضافہ ہوا ہے۔

زمینوں پر کام کرتے ہوئے اسلم تھک جاتا تھا لیکن ندیم اپنی جوانی کو پورا پورا خراج دے رہا تھا۔ اس نے زمینوں کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا اور جوش جوانی میں بدست دوشیزہ زمین نے جب ندیم کی جوانی کا رس پایا تو ایک جوان رعنا کے وصال سے سرشار ہو کر اپنا سب کچھ اسے دے دیا۔ اس زمین پر ایک مثالی فصل کھڑی ہو گئی جسے دیکھنے اور سننے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اس زمین کی فصل کسانوں اور زمینداروں کے لئے اتنی دلکش بن گئی کہ وہ اسے دیکھنے دور دور سے آنے لگے۔ وہ اسلم کو اس کی محنت کی مبارکباد دیتے تھے اور اس کی زمینوں کو دیکھ کر رشک کرتے تھے۔ اس طرح ان لوگوں کو خاصی شہرت مل گئی۔ بہت سے زمیندار اور کسان ان سے اپنی زمینوں کے بارے میں مشورہ کرنے آنے لگے۔ جنہیں یہ لوگ بڑے خلوص سے خوش آمدید کہتے تھے۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ اسلم نے اپنی زمین کو تھوڑی سی وسعت دے دی تھی اور اب چند دوسرے لوگ بھی ان کے لئے کام کر رہے تھے لیکن دونوں باپ بیٹے پھر بھی زمینوں پر پائے جاتے تھے اور پورا دن کسانوں کے ساتھ مل کر انتھک محنت کرتے۔ گو ان کے مالی حالات بہت بہتر تھے لیکن ان کے طرز زندگی کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دن

سے اس کی شناسائی بھی تھی لیکن اس کے شناساؤں میں چھچھورے قسم کے لوگ نہیں تھے۔ بلکہ زیادہ تر معتبر زمیندار اور ایسے ہی دوسرے کاروباری تھے۔ بستی کے سب سے خوبصورت قہوہ خانے میں جہاں آسودہ لوگوں کا ہجوم لگا رہتا اور جہاں بستی کی حسین رقاصائیں رقص کرتی تھیں۔ ندیم کو بس دو ایک بار ہی دیکھا گیا تھا۔ بستی میں یہ لوگ ماڈرن کسان کے نام سے مشہور تھے۔

پھر ایک رات بستی میں قیامت آئی۔ اس شام فضا گھٹن آلود تھی۔ لوگ ایک بے چینی سی محسوس کر رہے تھے۔ بس ایک بے نام سا احساس گھٹن ان کے ذہنوں میں تھا۔ آدھی رات گزری تھی اور لوگ گہری نیند سو رہے تھے کہ اچانک زمین ہلکورے لینے لگی۔ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے لوگ جاگ اٹھے۔ فضا میں ایک عجیب سی سنسناہٹ تھی۔ زلزلے کا یہ جھٹکا بے حد خفیف تھا اس کے بعد سکوت طاری ہو گیا۔ رات کو عبادت کرنے والے جاگ رہے تھے۔ انہوں نے حیران پریشان لوگوں کو بتایا کہ ابھی چند ساعت قبل زمین ہلی تھی۔ بہرحال آدھی سے زیادہ آبادی جاگ اٹھی تھی اور پھر ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ایک قیامت خیز زلزلے نے پوری بستی تہ و بالا کر دی۔ زمین کروٹیں بدل رہی تھی اور اس پر بسنے والے بے بسی سے موت کے گھاٹ اتر رہے تھے۔ انسان کے سارے پلان فیل ہو گئے تھے۔ خوبصورت عمارتیں زمین بوس ہو گئی تھیں اور چاروں طرف موت کا شور بلند ہو رہا تھا۔ خوف و ہراس کے شکار دیوانوں کی طرح دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ سینکڑوں انسان اس چند ساعت کے زلزلے کا شکار ہو گئے۔ ان میں اسلم اور اس کی بیوی مسرت بھی تھے۔ وہ دونوں اپنے مکان کے ملبے میں دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ ندیم البتہ زندہ بچ گیا تھا۔ وہ خود ہی وزنی ملبے کو ہٹا کر اس کے نیچے سے نکل آیا تھا اور پھر زخمی ہونے کے باوجود اس نے ماں باپ کی لاشیں ملبے کے نیچے سے نکالیں۔

زلزلہ سینکڑوں کہانیوں کو جنم دے کر ختم ہو گیا اور دوسری صبح بھی اتنی ہی حشر خیز تھی۔ سکون کی بستی غم و اندوہ میں ڈوب چکی تھی۔ چاروں طرف آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کی غمخواری کرتے پھر رہے تھے۔ ندیم مسجد میں فیضان علی کے پاس پہنچ گیا۔ ان کے دونوں بیٹے بستی میں امدادی کارروائی کرنے گئے تھے۔ بیٹی کی شادی ہو گئی تھی اس لئے مولوی صاحب مسجد میں تنہا تھے۔ وہ بوڑھے ہو گئے تھے لیکن ندیم کو انہوں نے فوراً پہچان لیا۔

صاحب نے پوچھا۔

"ابھی نہیں مولوی صاحب! بدقسمتی سے اس وقت مجھے خود امداد کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔" ندیم نے افسردہ لہجے میں کہا اور مولوی صاحب چونک پڑے۔

"تمہارے والدین۔ اسلم اور بیٹی مسرت.........؟"

"میں دونوں سے محروم ہو چکا ہوں۔"

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔ خداوند قدوس تمہیں صبر عطا فرمائے بیٹے! یہ قہر خداوندی ہے جو ہمیں ہماری حیثیت سے آگاہ کرتا ہے۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں' اس وقت تو پوری بستی کی یکساں کیفیت ہے کس کس کا ماتم کریں گے' کس کس کو پرسا دیں گے۔"

مولوی فیضان علی نے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اسلم اور مسرت کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس وقت تو بستی کے لاتعداد گھروں میں یہ رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔ بے شمار لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ لاتعداد زخمی ہوئے تھے' سینکڑوں افراد بے گھر ہو گئے تھے۔

دوسرے دن حکومت کی امدادی پارٹیاں پہنچ گئیں اور بستی کے ایک حصے میں امدادی کیمپ قائم ہو گئے۔ اس پارٹی کے افراد سے معلوم ہوا کہ زلزلہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ سینکڑوں میل کے علاقوں میں تباہی پھیلی تھی اور حکومت کے لئے سخت مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ حکومت نے لوگوں کے لئے ابتدائی سہولتیں تو فراہم کر دیں لیکن اس کے بعد اس نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عمل کریں۔ حکومت اس سے زیادہ ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔

بات ہزاروں خانماں بربادوں کی تھی جن کے وسائل محدود تھے۔ سردیاں اور برف باری بارہ مہینے رہتی تھی۔ اس لئے جن لوگوں کے سروں پر سائبان نہیں تھے وہ سب سے زیادہ مشکلات کا شکار تھے۔ چنانچہ بستی کے زمینداروں اور دوسرے بڑے لوگوں کا ایک اجلاس ہوا جس میں ندیم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

صاف ستھرے لباس میں ملبوس ندیم بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ زمینداروں اور روساء نے مدد کی پیشکش کی۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اپنی کمائی دوسروں پر لٹانے کے لئے تیار ہو۔ ندیم کا شمار بھی بستی کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ سب سے بڑے

"میں جانتا ہوں ندیم کہ تم بھی اس زلزلے میں اپنا بہت کچھ کھو بیٹھے ہو' تمہارا مکان بھی منہدم ہو گیا ہے' تم اپنے وسائل سے اپنا مکان تعمیر کر سکتے ہو۔ خدا کا شکر ہے تمہارے پاس بستی کی سب سے زرخیز زمینیں ہیں۔ کیا تم اپنی محنت کا کچھ حصہ ان لوگوں کو دے سکتے ہو جو اس وقت کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہیں؟" ندیم نے گردن اٹھائی اور شستہ لہجے میں بولا۔

"میں اپنا مکان اس وقت تک تعمیر نہیں کروں گا جب تک بستی کے ہر اس شخص کو سر چھپانے کی جگہ نہیں مل جاتی جو کھلے آسمان کے نیچے ہے۔"

"بڑا مبارک جذبہ ہے خداوند قدوس تمہیں اس کا اجر دے' تم اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو۔"

"میں ان تمام مکانات کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ جو منہدم ہو گئے ہیں۔" ندیم نے سادگی سے کہا اور وہاں موجود تمام لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ تب آفتاب علی نے کہا۔

"تمہارا جذبہ صادق ہے اور قابل آفریں ہے لیکن ان تمام مکانات کی تعمیر کے لئے تقریباً دس لاکھ یا اس سے بھی کچھ زیادہ روپیہ درکار ہو گا۔ تمہاری ساری زمین اور اثاثہ ان میں سے ایک چوتھائی تعمیر بھی نہیں کرا سکتے پھر تم نے اتنی بڑی بات کس طرح کہہ دی ہے۔"

"میرے پاس ایک امانت موجود ہے جس کا اس سے اچھا مصرف اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میری رائے ہے کہ بستی کے بے خانماں لوگوں کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جائے جو مزدور اور دوسری ضروری چیزوں کو مہیا کر کے دن رات کام شروع کر دے اور جس قدر جلد ممکن اس تعمیر کو مکمل کر لیا جائے۔"

"کیا تم پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہے ہو؟" ایک معمر شخص نے پوچھا۔

"ہاں' یہ ان پریشان حال لوگوں کا مذاق اڑانے کا وقت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کمیٹی تشکیل کر دی جائے۔ میں اس کے سربراہ کے لئے مولوی فیضان علی کا نام پیش کرتا ہوں۔"

"ہمیں منظور ہے لیکن یہ دولت تم کب تک فراہم کر دو گے؟"

"آج ہی' دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔" ندیم نے کہا اور پھر لوگوں کو ششدر چھوڑ

بستی کا بڑے سے بڑا آدمی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دس لاکھ روپے فراہم کر سکتا ہے۔ سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے۔ یہ چرچا اس کمیٹی سے نکل کر پوری بستی میں پھیل گیا۔ لوگ اس بڑے آدمی کے بارے میں ساری تفصیلات جاننے کے لئے بے چین ہو گئے۔ آفتاب علی نے کہا۔

"میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آئی۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ نوجوان اپنے والدین کی موت سے ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ یوں تو سوچو کہ یہ لوگ بے خانماں آئے تھے اور مسجد کے حجرے میں ٹھہرے تھے ان کے پاس جو کچھ تھا اس سے انہوں نے ایک اچھا مکان تعمیر کیا۔ زمینیں خریدیں اور اس کے بعد دونوں باپ بیٹوں نے انتھک محنت کر کے ان زمینوں کو مالا مال کر دیا لیکن میرے دوستو! ایک بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے جن لوگوں کے پاس بے پناہ دولت ہو وہ اتنی شدید محنت نہیں کر سکتے۔ جتنی ان لوگوں نے کی ہے۔ دولت انسان کو کاہل بنا دیتی ہے اور کاہل لوگ ٹھٹھرتی سردیوں میں صبح ہی صبح ہل نہیں اٹھاتے۔ پھر ان لوگوں کا طرز زندگی بھی بہت سادہ تھا۔ کہیں سے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ بستی کے بڑے لوگوں میں ہیں۔ زمینوں سے اتنی رقم بھی حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ آدھی بستی تعمیر کرا دے۔ یہ ناممکن ہے۔ ہمیں اس مخبوط الحواس انسان کی بات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے یوں نہ ہو کہ ہم اس کے کہے پر سارے انتظامات مکمل کریں اور اس کے بعد پریشانیوں کا شکار ہو جائیں۔"

"آفتاب علی کا کہنا درست ہے لیکن اب کیا کیا جائے؟"

"اس نے مولوی فیضان علی کو کمیٹی کا سربراہ بنانے کی سفارش کی ہے۔" احسان کل نے کہا۔

"آؤ مولوی صاحب سے بات کریں۔ دیکھیں وہ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔" آفتاب علی نے تجویز پیش کی اور اپنے دو آدمی مولوی فیضان علی کو بلانے کے لئے بھیج دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب پہنچ گئے لیکن وہ اپنے ساتھ ایک نئی کہانی لائے تھے۔

آفتاب علی کی پوری بات سن کر وہ مسکرا دیئے۔

"برف باری کی ایک رات میں باپ بیٹا اور مسجد میں آئے تھے۔ دو خچر تھے ان کے ساتھ۔ سخت سردی تھی اس رات لیکن وہ اصول اور اخلاق کے پابند تھے اور آج بھی

اس دنیا میں نہیں رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا شریف خون کبھی بستی کے لئے ضرر رساں نہیں ہو گا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مولوی صاحب! لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اتنی بڑی دولت اس کے پاس موجود ہے؟"

"وہ مجھے ایک بڑے تھیلے میں اشرفیاں بھر کر دے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ اگر اس کام کے لئے اور ضرورت پیش آئی تو مزید دولت فراہم کر دے گا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ بستی والے اس اندوہناک حادثے کے اثرات سے نکل جائیں تو ان کی فلاح کے لئے کچھ اور کام بھی کرے گا۔ مثلاً ایک ہسپتال اور دو تین مدرسے وغیرہ۔"

"اشرفیاں آپ کے پاس آ چکی ہیں۔" آفتاب علی کا منہ حیرت و تعجب سے کھل گیا۔

"دیر ہوئی۔ میں نے انہیں محفوظ کر لیا تھا۔ تم کام شروع کرا دو آفتاب علی، میں ہر کام کا ذمے دار ہوں۔"

"آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے اس نیک کام میں تاخیر کیسی۔" آفتاب علی نے کہا۔ مولوی فیضان علی چلے گئے تو حیران و پریشان لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

"اتنی بڑی دولت اس کے پاس کہاں سے آ گئی۔"

"ممکن ہے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔"

"لیکن کہاں سے؟"

"یہ تو خدا ہی جانے۔"

"اس کا مقصد ہے بہت بڑا خزانہ ہے۔"

"یقیناً۔"

"ویسے اسلم بے حد پراسرار آدمی تھا زیادہ لوگوں میں وہ کبھی نہیں گھلا ملا۔ بظاہر وہ چہرے سے سخت گیر اور خطرناک انسان نظر آتا تھا لیکن اندر سے بالکل نرم اور پراخلاق آدمی تھا۔"

"یہی کیفیت بیٹے کی ہے۔"

"لیکن خزانہ.........؟"

"بھئی جو کچھ بھی ہے وہ ایک نیک کام کے لئے کھڑا تو ہوا اگر اس کے پاس کوئی

سے کیا تھے ممکن ہے کہ وہ امیر لوگ ہوں اور کسی حادثے کے تحت یہاں آ کر آباد ہو گئے ہوں۔ تمہیں یاد نہیں کہ انہوں نے آتے ہی ایک قیمتی مکان تعمیر کیا تھا اور زمینیں خریدی تھیں۔"

"تب پھر انہیں فرشتہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اتنا بڑا خزانہ رکھتے ہوئے بھی وہ عام کسانوں کی مانند شدید محنت کر کے ہل چلاتے اور فصلیں اگاتے رہے اور اس طرح انہوں نے حلال روزی کمائی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

جتنے منہ اتنی باتیں تھیں لیکن باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ عمل بڑی چیز ہے اور عمل شروع ہو گیا۔ ندیم کی فراہم کی ہوئی دولت نے برباد شدہ انسانوں کو پھر سے آباد کر دیا۔ اس نے لوگوں کو نقد رقم بھی دی تھی اور انہوں نے اس سے نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ حسب وعدہ اس نے ہسپتال اور مدرسوں کے لئے زمین خرید لی اور اس پر تعمیر شروع کرا دی لیکن دیکھنے والے اسے اپنی زمینوں پر دیکھتے تھے۔ وہ اب بھی ہل چلاتا تھا اور دوسرے کسان اس کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ دن بھر شدید محنت کے بعد وہ شام کو تنہا اپنے مکان پر پہنچ جاتا تھا جو اس نے اپنے قول کے مطابق بستی کے آخری آدمی کے آباد ہونے کے بعد تعمیر کرایا تھا۔

پندرہ ہزار کی پوری آبادی میں وہ مشہور تھا اور اب ہر شخص اس کی عزت کرتا تھا لیکن اس کی آج بھی وہی کیفیت تھی۔ نوجوانوں کی محفل میں وہ بہت کم نظر آتا تھا۔ ہاں بزرگوں کی طرف سے جب بھی اسے کوئی دعوت ملتی وہ اس میں شرکت کرتا اور اس کی باتیں بڑی سلجھی ہوئی ہوتی تھیں۔

بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ماحول میں تبدیلیاں لازمی امر ہیں۔ نظام پور کے قرب و جوار میں توسیع ہوئی۔ چند کارخانے بھی قائم ہوئے اور لوگوں کے لئے نئے روزگار کے رستے کھل گئے۔ شہروں سے آنے والوں نے نواحی بستیاں آباد کیں اور نظام پور کی آبادی کافی پھیل گئی۔ چند چھوٹے چھوٹے ہوٹل بھی قائم ہو گئے اور خوبصورت علاقہ اور خوبصورت ہو گیا۔ بستی والوں کو اس کی ترقی سے خوشی تھی' جو پرانے خیالات کے لوگ تھے وہ اپنی ڈگر سے نہیں ہٹے تھے لیکن جو جدت پسند تھے وہ اس نئے ماحول میں داخل ہو گئے تھے۔

انہی میں شبنم تھی۔ بستی کی سب سے خوبصورت لڑکی۔ شبنم کا باپ حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ [illegible]

باپ ایک جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس نے برے وقت کے لئے کچھ پس انداز کر رکھا تھا۔ جس نے وقتی طور پر ان دونوں ماں بیٹی کو سہارا دیا۔ پھر یوں ہوا کہ شبنم کا ایک چچا جو مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں ملازمت کرتا تھا' اپنے بھائی کی موت کی خبر سن کر آ گیا۔ اس نے اس مختصر سے خاندان کو اس طرح سہارا دیا کہ شبنم کی اندھی ماں سے شادی کر لی۔ لوگوں نے اس کے اس اقدام کو سراہا تھا ورنہ ایک بے سہارا اندھی کو کون قبول کرتا ہے۔ یوں اس گھر کو سہارا مل گیا۔ شبنم کا چچا کلیم خان چونکہ غیر ممالک میں رہ آیا تھا اس لئے آزاد خیال تھا اور بستی کی قدیم رسومات کو قبول نہیں کرتا تھا اس کو بڑے لوگوں میں شامل ہونے اور خود کو بڑا کہلانے کا شوق تھا چنانچہ اس نے مشرق وسطیٰ کی کمائی سے دو کام کئے۔ پہلا تو یہ کہ کچے مکان کی توسیع کی اور اسے پکا بنا لیا۔ دوسرے اس نے دو ٹریکٹر خرید لئے اور انہیں کرائے پر چلانے لگا۔ ان ٹریکٹروں سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔

بڑائی کا شوق پورا کرنے کا ایک بڑا سہارا شبنم تھی اس نے شبنم کو تھوڑا بہت پڑھوا لیا اور پھر اس کے لئے شہر والوں کے عمدہ لباس مہیا کر دیئے جنہیں پہن کر شبنم بہت پیاری لگتی تھی۔ شکل و صورت یونہی حسین تھی تراش خراش نے اور اسے نکھار دیا تھا۔ پھر بڑی محفلوں میں آزادانہ شرکت سے وہ درحقیقت مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ خوش نگاہ لوگ اگر کوئی تقریب کرتے تو کلیم احمد کے لئے دعوت نامہ ضرور آتا تھا اور پھر معروف لوگ صرف اس لئے ان دعوتوں میں شریک ہونا فرض سمجھتے تھے کہ شبنم ان محفلوں میں نظر آتی تھی اور محفلوں کے رنگ ہی بدل جاتے تھے۔ شبنم کو بلانے کے لئے دعوت نامہ تو کلیم احمد ہی کو دینا پڑتا تھا۔ اس لئے کلیم احمد بھی ایک معزز شخص کہلوانے لگا لیکن اس معزز شخص کی اپنی حیثیت صرف دو ٹریکٹر تھے اور اسے خدشہ تھا کہ جب یہ دونوں ٹریکٹر ناکارہ ہو جائیں گے تو اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس کا دور رس ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ ان حالات میں اس کی بڑائی قائم رکھنے والی شبنم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ شبنم کی شادی اگر کسی امیر ترین گھرانے میں ہو جائے تو اس گھر کو بھی سہارا مل سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے شبنم کو کافی آزادی دے دی تھی اور وہ ہر محفل میں بلا روک ٹوک شریک ہوتی تھی۔

کسی نے ایک دن شبنم کی اندھی ماں سے اس کے نیم عریاں لباس کے بارے میں گفتگو کی تو شبنم کی ماں پریشان ہو گئی۔

"میں تو اندھی ہوں اس لئے میں نے کبھی اس کے لباس نہیں دیکھے لیکن کیا وہ درحقیقت ایسے ہی لباس استعمال کرتی ہے؟"

"ہاں' ایسے لباس کہ اب بستی کا کوئی شریف گھرانہ تمہیں شریف سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔" اطلاع دہندہ نے کہا۔

"کیا بستی میں دوسرے لوگ ایسے لباس نہیں پہنتے؟"

پہنتے ہیں مگر وہ لوگ نہیں جو بستی کے قدیم باشندے ہیں۔ ہاں شہروں سے آنے والوں کی بات دوسری ہے۔"

"میں اسے منع کروں گی۔ میں اس سے بات کروں گی۔" اور شبنم کی ماں نے اس سے بات کی لیکن اس وقت جب کلیم احمد بھی گھر میں موجود تھا۔ شبنم کی ماں نے اسے قریب بلا کر ٹٹولا اور اس کے ہاتھ شانوں سے پھسلنے لگے۔ یہ پھسلنے والے ہاتھ اس کے گریبان تک آئے اور وہاں بھی کچھ نہ پا کر لرز گئے۔

"شبنم! کیا تو بے لباس ہے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی اور شبنم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

نہیں ماں! یہ دیکھو یہ میرا لباس ہے۔" اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے لباس پر رکھ دیا۔

"کیا .... کیا یہ شرمناک لباس نہیں ہے' کیا تو اپنے باپ کی زندگی میں بھی یہ لباس پہن سکتی تھی؟"

"کون سے باپ کی بات کر رہی ہو شبنم کی ماں! وہ جو مر گیا اور وہ جو زندہ ہے اور تم اسے شبنم کا باپ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو؟" کلیم احمد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ بات نہیں ہے کلیم احمد! لیکن شبنم کا لباس.........؟"

"یہ بڑے لوگوں کا لباس ہے۔" کلیم احمد نے جواب دیا۔

"یہ سارے بڑے لوگ ایسے ہی لباس پہنتے ہیں۔"

"ہاں فیشن بدلتے رہتے ہیں۔ جدید فیشن یہی ہے۔"

"لیکن ہم بڑے لوگ کہاں ہیں' کلیم احمد!" شبنم کی ماں دکھ سے بولی۔

"تمہاری ذہنیت فقیرانہ ہے تو میں کیا کروں ورنہ کیا کمی ہے تمہارے پاس؟ جو کچھ تم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ میں نے تمہارے لئے مہیا کر دیا ہے۔ شبنم شہزادیوں کی طرح پرورش پا رہی ہے اور کیا چاہتی ہو؟"

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے کلیم احمد! جس کا تم برا مانو۔ میں تو اندھی ہوں' میں بھلا شبنم کی دیکھ بھال کیسے کر سکتی ہوں۔ اس کے نگراں تو تم ہی ہو۔ کچھ لوگوں نے اس کے لباس اور فیشن پر اعتراض کیا تھا اس لئے اس بارے میں پوچھ رہی تھی۔" معذور عورت کسی مدافعت کے قابل نہیں تھی۔

"اعتراض کرنے والے وہ پسماندہ ذہن کے لوگ ہوں گے جو کسی کی ترقی برداشت نہیں کر سکتے اور خواہ مخواہ شہر کے ترقی یافتہ لوگوں پر طنز کرتے رہتے ہیں۔ شبنم پوری بستی میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ میں اسے پوری بستی کی سب سے امیر لڑکی بناؤں گا۔"

"مجھے یقین ہے کلیم احمد! تم اس کے لئے جو کچھ کرو گے بہتر کرو گے۔" شبنم کی ماں نے جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔

کلیم احمد' شبنم کو دیکھ کر مسکرانے لگا اور شبنم بھی مسکرا دی۔ کلیم احمد سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اسے بھی جدید انداز کے لباس بہت پسند تھے۔ اسے وہ محفلیں بھی پسند تھیں جہاں ساز و موسیقی' رقص و سرود برپا ہوتا تھا۔ لوگ نت نئے کرتب دکھاتے تھے۔ کلیم احمد نے بڑی محنت سے اس کا ذہن تیار کیا تھا۔

"شہری آبادیاں بے حد حسین ہوتی ہیں۔ ان برف پوش وادیوں میں کیا رکھا ہے۔ زندگی دیکھنی ہے تو شہروں میں دیکھو۔ کاریں' بنگلے' سینما اور نہ جانے کیا کیا لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ شہر کے کسی بڑے آدمی سے شادی کی جائے۔ اب تو اس کے مواقع موجود ہیں۔ خود شہر اپنے قدموں سے چل کر یہاں آ گیا ہے۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟" شبنم نے پوچھا۔

"شہر کے کسی بہت بڑے آدمی سے دوستی لیکن اس دوست کا انتخاب میں خود کروں گا۔ بس انتخاب کر کے میں تمہیں بتا دوں گا اور اس کے بعد تم اس سے پینگیں بڑھانا شروع کر دو گی۔"

آفتاب احمد نے کہا اور شبنم نے گردن ہلا دی۔

اس کا باپ سوتیلا سہی لیکن اس کا کتنا بڑا ہمدرد ہے' وہ سوچتی کلیم احمد سے وہ پوری طرح مطمئن تھی۔

☆-----☆-----☆

پھر ایک دن ایک کارخانے کے مینجر کے ہاں تقریب ہوئی۔ شہری لوگ مقامی لوگوں

سے دوستی رکھتے تھے اور اپنی تقاریب میں نظام پور کے سربرآوردہ لوگوں کو ضرور مدعو کرتے تھے تاکہ ان سے بہتر تعلقات قائم ہوں۔ ان پہاڑوں کی زندگی میں مقامی لوگوں سے الگ رہ کر گزر کرنا بہت مشکل تھا۔ شبنم بھی اس تقریب میں شریک تھی اور وہ تقریب میں آئی تو ساری خواتین کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ سب کی سب اسے دیکھتی رہ گئیں۔ تقریب کے بعد پکچر کا پروگرام تھا۔ چنانچہ ایک خوبصورت فلم دکھائی گئی' جسے دیکھ کر شبنم سحرزدہ رہ گئی۔ فلم بہت پسند آئی تھی اور اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ وہ اسے بار بار دیکھے۔ شبنم تو ان خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر دو آنکھیں کسی اور خیال میں ڈوب گئی تھیں۔ یہ دو آنکھیں زین کی تھیں۔ ایک خوش رو اور دیدہ زیب نوجوان زین جو شبنم کو دیکھ کر سکتے میں رہ گیا تھا۔ ایسا صبیح و ملیح حسن اس نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ شبنم پر مرمٹا تھا۔ زین ایک کارخانے کے مینجر کا اکلوتا اور ناز و نعم میں پلا ہوا بیٹا تھا زندگی کی ہر آرزو پوری ہوئی تھی اس لئے ناکامیوں سے واقف نہیں تھا۔ شبنم بھی اس کی آرزو بن گئی تھی لیکن وہ احمق نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ اس کی یہ طلب اتنی آسانی سے نہیں پوری ہو سکتی جتنی آسانی سے اس کی دوسری خواہشات پوری ہوتی رہی ہیں۔ اس کے حصول کے لئے اسے شدید محنت کرنی ہو گی۔

تقریب کے اختتام پر جب شبنم آفتاب کے ساتھ واپس چلی تو زین پہلے سے جیپ لئے تیار کھڑا تھا۔ اس نے جیپ ان لوگوں کے قریب روک دی۔

"کیا آپ بستی جا رہے ہیں محترم بزرگ؟" اس نے کلیم احمد سے پوچھا۔

"ہاں' وہیں جا رہے ہیں۔"

"تو براہ کرام تشریف رکھئے' میں دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی بستی جانے والا مل جائے۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔"

"کیا تم بستی جا رہے تھے؟" کلیم احمد بے تکلفی سے اس کی جیپ میں بیٹھ گئے۔ شبنم بھی کلیم احمد کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

"جی ہاں' بستی میں کچھ کام تھا۔" زین نے جیپ سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"کیا نام ہے تمہارا بیٹے؟" کلیم احمد نے پوچھا۔

"زین ربانی! میرے ڈیڈی یہاں ایک کارخانے کے مینجر ہیں۔"

"اوہ' اچھا اچھا۔ تم اب یہیں رہتے ہو گے۔"

"جی ہاں۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" کلیم احمد نے کہا۔

عقب سے شبنم بھی اس حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ فلم کا سحر اس پر طاری تھا۔ یہ نوجوان بھی تو بالکل ایسا ہی ہے۔ کتنا حسین لباس ہے اس کا اور کیسے خوبصورت بال ہیں۔ نظام پور میں ایک بھی تو اتنا خوبصورت نوجوان نہیں ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اس نوجوان کو پسند کر لیا۔

جیپ کلیم احمد کے مکان کے سامنے رک گئی۔

"یہ میرا گھر ہے آؤ قہوے کی ایک پیالی ہمارے ساتھ پی لو۔" کلیم احمد نے دعوت دی۔

"آپ اتنی محبت سے کہہ رہے ہیں تو کون انکار کر سکتا ہے۔" زین نے مسکراتے ہوئے کہا اور اندر آ گیا۔

شبنم نے بہت اچھا قہوہ بنایا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے بھنی ہوئی جوار کا حلوہ بھی پیش کیا جس کی زین نے بے حد تعریف کی تھی۔ شبنم کے ہونٹوں پر ایک دلربا مسکراہٹ پھیل گئی اور زین نے محسوس کر لیا کہ اس کا وار خالی نہیں گیا ہے۔ واپس ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ لوگوں نے جس محبت سے میری پذیرائی کی ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میں اکثر بستی آتا رہتا ہوں۔ دوبارہ جب بھی آیا آپ سے ملاقات کروں گا۔"

"ضرور ضرور۔" کلیم احمد نے بے دلی سے جواب دیا۔

یہ نوجوان خوش رو ضرور تھا لیکن اس کے معیار پر ایک فیصد بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ چنانچہ اس کی طرف توجہ دینا بے معنی تھا لیکن شبنم اس کے خواب دیکھنے لگی۔ واقعی شہری لوگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ وہ آرزو کرنے لگی کہ کلیم احمد' زین کے بارے میں اشارہ کرے اور وہ زین سے دوستی کر لے لیکن کئی دن انتظار میں گزر گئے نہ تو کلیم احمد نے اس کے بارے میں کچھ کہا اور نہ ہی زین واپس آیا۔ اس کا انتظار مایوسی میں بدل رہا تھا کہ ایک دوپہر زین کی جیپ اس کے مکان کے دروازے پر آ رکی۔ شبنم نے پورے خلوص دل سے اس کا استقبال کیا تھا۔ کلیم احمد موجود نہیں تھا اس لئے شبنم ہی اس کی میزبان بنی' اس نے اتنے دن تک زین کے نہ آنے کی شکایت بھی کی تھی۔

"آپ میری منتظر تھیں۔" زین نے پوچھا۔

"[illegible] آپ نے وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں! بدقسمتی سے مجھے چند روز کے لئے شہر جانا پڑا۔ میں آج صبح ہی واپس آیا ہوں اور آپ کے لئے یہ حقیر سا تحفہ بھی لایا ہوں۔" زین نے جیب سے ایک خوبصورت بکس نکال کر شبنم کے سامنے کھول دیا۔

سونے کا ایک خوبصورت لاکٹ بکس میں جگمگا رہا تھا۔ شبنم نے شرماتے ہوئے اسے قبول کر لیا۔ پھر وہ گفتگو کرنے لگے۔ شبنم نے اپنی تمام معلومات اس کے سامنے استعمال کیں۔ کلیم احمد نے شبنم کو ایسی باتیں خوب سکھادی تھیں۔ اس نے پیرس' سوئٹزرلینڈ اور ہانگ کانگ جیسے شہروں کی گفتگو کی جسے سن کر زین حیران رہ گیا۔ پہاڑوں میں کھلنے والی کلی اتنی اونچی اڑان رکھتی ہوگی' اس نے سوچا بھی نہیں تھا لیکن یہ کلی اب زین کے دل میں تھی اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

شبنم کی البتہ دوہری کیفیت تھی۔ اسے زین بے حد پسند آیا تھا لیکن وہ صرف اس بات سے پریشان تھی کہ پتہ نہیں زین' کلیم احمد کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ زین اس سے دوسری ملاقات کا وعدہ کر کے چلا گیا اور رات کو کلیم احمد واپس آیا تو شبنم نے سب سے پہلے زین کے آنے کی سنائی تھی کلیم احمد نے اس کا اثر نہیں لیا۔

"اتنے دن وہ شہر میں رہا۔ آج صبح ہی واپس آیا ہے اور ہاں وہ میرے لئے یہ تحفہ بھی لایا ہے۔" شبنم نے لاکٹ کا بکس کھول کر کلیم احمد کے سامنے رکھ دیا۔

"تم نے کیوں قبول کر لیا یہ تحفہ؟ تحفے دوستی کی نشانی ہوتے ہیں اور وہ معمولی نوجوان اس قابل نہیں ہے کہ تم جیسی حسین لڑکی کا دوست بنے۔"

"تو کیا.......... تو کیا.......... وہ ہمارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ایک معمولی سے مینجر کا بیٹا جو بذات خود کچھ بھی نہیں ہے۔" کلیم احمد نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"لیکن یہ تحفہ تو قیمتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے.........."

"قیمتی۔" کلیم احمد منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔

"چند سو روپے کے لاکٹ کو تم قیمتی کہتی ہو' شبنم! میں تمہیں جگمگاتے ہیروں کے درمیان دیکھنا چاہتا ہوں' میں تمہارے گرد آسمان کے ستارے بکھرے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور تم اس معمولی سے لاکٹ کو قیمتی سمجھ رہی ہو۔ اپنی سوچ بلند کرو اپنا معیار بناؤ ورنہ تمہاری زندگی بھی اس اندھی عورت سے مختلف نہیں ہوگی۔"

ستارے بکھرے دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ اس کے لئے تو مجھے آسمان پری جانا

پڑے گا۔ شبنم نے ناگواری سے سوچا۔ اسے کلیم احمد کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی لیکن وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ زین جیسے خوبرو انسان کو کبھی نہیں ٹھکرائے گی۔ خواہ کلیم احمد خوش ہو یا ناخوش اور یہی ہوا۔ کلیم احمد خود ہی اسے شہری لوگوں کی محفل میں لے گیا تھا۔ وہاں زین بھی موجود تھا۔ شبنم نے تقریب کا سارا وقت زین کے ساتھ ہی گزارا اور کلیم احمد دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ واپسی میں زین نے بستی پہنچانے کی پیشکش کی مگر کلیم احمد نے اسے رد کر دیا۔

"نہیں نوجوان! براہ کرم اس حد تک مت بڑھو کہ بات ہماری عزت تک آ جائے۔ ہمیں یقین ہے تم محسوس نہیں کرو گے۔"

زین نے شانے اچکا دیئے لیکن دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس نے سوچا۔

"بڑے میاں! میں تو اس سے بھی آگے بڑھ گیا ہوں تم ہو کس کھیت کی مولی۔"

اور یہ حقیقت تھی۔ شبنم نے کلیم احمد کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اسے کلیم احمد کی خواہش بھی عزیز تھی لیکن وہ زین کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ کلیم احمد نے البتہ ذہانت کا ثبوت دیا۔ وہ فطرتاً بے حد مکار انسان تھا۔ شبنم کی آڑ میں وہ اپنی حیثیت بنانے کا خواہشمند تھا۔ اس نے سوچا جوانی سرکش ہوتی ہے اور سرکشی طاقت سے نہیں مرتی۔ اسے تدبیر سے مارا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے زین اور شبنم پر نگاہ ضرور رکھی لیکن ان کے درمیان نہ آیا۔ البتہ فرصت کے اوقات میں وہ شبنم کے کان ضرور بھرتا رہتا تھا اور بڑے مؤثر انداز میں اسے زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتا تھا۔ شبنم بھی کبھی کبھی اس کی باتوں سے متاثر ہو جاتی تھی لیکن جب زین اس کے سامنے آتا تو وہ سب کچھ بھول جاتی تھی اور اب تو ان کی ملاقاتیں کچھ زیادہ ہی ہونے لگی تھیں۔ کبھی کسی ہوٹل میں کبھی کسی پُرفضا مقام پر۔

بستی کے معزز لوگوں نے عید کے موقع پر ایک خصوصی جشن کا اہتمام کیا۔ اس میں شہری لوگوں کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے مہمانوں کا استقبال ایک پُرفضا مقام پر شامیانوں کے نیچے کیا گیا۔ سب ہی شریک ہوئے تھے۔ معززین کی بیگمات اور صاحبزادیاں بھی تھیں لیکن شبنم سب ہی کے دل کو بھائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اپنی مثال آپ تھی اور اسی محفل میں لوگوں نے دلوں میں فیصلہ کیا کہ زین جیسا نوجوان بھی اس بستی میں دوسرا نہیں ہے۔ گہرے رنگ

چاند اور سورج کی مانند لگ رہی تھی۔ اس صورت حال کو کلیم احمد نے تشویش کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ شبنم بستی میں بھی زین کے ساتھ جس انداز میں پیش آئی اس سے لوگوں نے ان دونوں کے درمیان کسی خاص جذبے کا اندازہ لگایا تھا اور کلیم احمد اس احساس سے تلملا رہا تھا۔ شبنم اس کی امیدوں پر پانی پھیر رہی تھی۔ اس کے بعد لوگ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں گے۔ بھلا اس قلاش نوجوان کے پاس کیا رکھا ہے۔ کچھ کرنا ہو گا۔ کوئی خاص قدم اٹھانا ہو گا۔

پھر اس شامیانے کے نیچے بستی کے سب سے معزز اور روایتی انسان کا ظہور ہوا اس کی شخصیت اب ایسی نہیں تھی کہ بستی کے کسی فرد کے لئے متنازعہ ہو۔ سب ہی بے لوث اور بے لاگ طور پر اس کی عظمت کے قائل تھے۔ انسان اگر خود پر ملمع چڑھائے تو اس کی عمر طویل نہیں ہوتی بالآخر سفید چمک ہی آتی ہے لیکن بستی کے ہر شخص کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اسلم کا بیٹا درحقیقت فرشتہ صفت انسان ہے۔ اس کے جسم میں ایک عظیم روح ہے جو محبت اور اخوت کی علمبردار ہے۔ وہ ایک عظیم خزانے کا مالک ہے لیکن اس نے اپنی ذات پر اس خزانے کی کبھی ایک پائی خرچ نہیں کی۔ اس کی کڑیل جوانی زمین سے سونا وصول کرنا جانتی ہے اور اس کا بدن سیسہ پلایا ہوا ہے جو کبھی نہیں تھکتا۔ بستی میں بڑی بڑی مشقت کرنے والے لوگ تھے لیکن انہوں نے بھی اعتراف کیا تھا کہ ان کی قوتِ برداشت اور مشقت ندیم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی وہ مسلسل ایک ہفتے دن اور رات ہل چلا سکتا ہے۔ وہ شدید سردی اور بارش کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی زمینیں تاحیات سونا اگلتی رہیں گی۔ اس تنہا انسان نے اتنی دولت اکٹھا کر لی ہے کہ اب اس کی پشتوں کو بھی زوال نہیں ہے۔

اور لوگوں کے منہ میں رال بھر آتی تھی۔ بستی کے بے شمار لوگ اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ اپنی بیٹیوں کو اس کی زوجیت میں دے دیں۔ خود لڑکیوں کے لئے وہ اپنی معمولی شکل و صورت کے باوجود بے حد پُرکشش تھا لیکن اس کی فطرت کی سنجیدگی کسی کو یہ جرأت نہیں دلاتی تھی کہ وہ اس سے اس موضوع پر بات کرے۔ غیر متعلق لوگوں نے کبھی اس کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بات کی تو اس نے نہایت نرمی سے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

"شادی مذہب اور فطرت کا ایک اہم تقاضہ ہے میں اسے ضرور پورا کروں گا لیکن

کے بعد کسی تردد کی گنجائش نہیں رہی تھی' کچھ کہنے کا موقع نہیں رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ پنڈال میں داخل ہوا تو گفتگو کرتے ہوئے لوگ رک گئے' اس کی شخصیت کا سحر سب پر طاری ہو گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بستی کے معزز لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور شہر والوں سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ شہریوں میں جو بڑے لوگ شمار ہوتے تھے اسے خاصی وقعت دی اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ وہ آج تک ان محفلوں سے دور رہا۔

آفتاب نے لوگوں کو بتایا کہ کس طرح اس نے آدھی بستی اپنے خزانے سے تعمیر کرا دی لیکن وہ آج بھی کھیتوں میں ہل چلاتا ہے اور شہری لوگ حیران رہ گئے۔

"اس طرح تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک آئیڈیل شخصیت آپ کی بستی میں موجود ہے۔"

"بے شک ہم اسے بستی کی سب سے معزز شخصیت قرار دیتے ہیں۔"

"آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے' ندیم صاحب؟" شہر کے ایک بڑے آدمی نے مسکرا کر کہا۔

"صرف ایک بات عرض کروں گا۔ میں اس بستی میں پیدا نہیں ہوا لیکن میں نے صحیح معنوں میں ہوش یہیں سنبھالا ہے۔ میرے والدین حادثے کی نذر ہو گئے لیکن بستی کے بزرگوں نے کبھی مجھے ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں ان بزرگوں کے زیرِ سایہ زندگی کی ہر نعمت سے مالا مال ہوں۔ جس کے بزرگ اس پر شفقت کی ایسی بھرپور نظر رکھیں۔ اسے دنیا میں کسی اور شے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہی کیفیت میری ہے۔"

"جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا آپ بستی کی پُراسرار اور روایتی شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔"

"ان لوگوں کے پیار نے یہ گل کھلائے ہیں۔" ندیم نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"ایک روایتی خزانہ آپ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کیا آپ کو اس کی حقیقت کا اعتراف ہے؟"

"ہاں' سردی اور برف باری کی رات کو جب ہم اس بستی میں داخل ہوئے تھے تو ہمارے پاس بے پناہ دولت تھی' ہم یہ سوچ کر یہاں آئے تھے کہ ہم اس دولت یا خزانے

ہمارے شانہ بشانہ چلتی رہی تھی اور ہمیں اس خزانے کے ہیچ ہونے کا شدید احساس ہوا تھا جو ہماری حفاظت کرنے سے معذور تھا بلکہ الٹی ہمیں اس کی حفاظت کرنی پڑی تھی۔ بستی میں داخل ہونے کے بعد ایک اور قیمتی خزانہ ہمارا منتظر ملا یہ خزانہ ہمیں مل گیا تو کسی اور خزانے کی طمع نہ رہی۔ یہ عظیم خزانہ مولوی فیضان مرحوم کی ذات اور کردار تھا۔ سخت سردی اور شدید برفباری میں انہوں نے ہمیں مسجد کے مینار سے دیکھا اور اپنی جسم و جان لے کر ہماری مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ انہوں نے اپنا خانہ دل ہمارے لئے وا کر دیا اور ہمیں سبق دیا کہ انسان کے لئے سب سے قیمتی شے انسان کی محبت اور انسانی رشتے ہیں اور ہم اس سبق کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں اس کے بعد ہمیں اور کسی خزانے کی طمع نہیں رہی ہے۔"

"تم واقعی ایک انوکھی روایت ہو ندیم!" لوگوں نے متاثر لہجے میں کہا۔

"یہ صرف آپ لوگوں کی سوچ ہے میں وہ خرچ کر رہا ہوں جو میرے پاس ہے۔"

"کیا تم نے اپنا تمام خزانہ بستی کی فلاح پر خرچ کر دیا۔"

"نہیں' جو خزانہ میرے سینے میں ہے اس میں تو روز افزوں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور جو خزانہ میرے پاس ہے اس کا بہت بڑا حصہ میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ میری بستی کی امانت ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری میرے شانوں پر ہے۔"

"اور اگر کسی صاحب نے اس کے حصول کی کوشش کی؟" کسی نے سوال کیا۔

"بستی کی امانت کی حفاظت کی ذمہ داری میری ہے اسے شکست ہو گی۔" ندیم نے آہنی لہجے میں کہا۔ وہ اس جشن کی سب سے اہم شخصیت بن گیا تھا۔ بہت سے دعوت نامے اسے شہریوں کی طرف سے وصول ہوتے تھے۔ دوسری طرف زین کے دل میں شدید حسد پیدا ہو رہا تھا اس نے جھک کر شبنم سے سرگوشی کی۔

"کیا یہ شخص قابل اعتبار ہے؟"

"کیا مطلب......؟"

"جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔"

"ہاں' اس میں جھوٹ نہیں ہے بستی کے بزرگوں میں وہ مقبول ترین شخصیت ہے اور نوجوان اسے جلن سے سر پھرا کہتے ہیں۔"

"کسی نے اس کے خزانے کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

شکر گزار بھی ہیں۔"

"دلچسپ چیز ہے۔" زین نے عجیب سے انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

تیسری طرف کلیم احمد کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا ہی جوتا اتار کر اپنے سر پر اتنے لگائے کہ بھیجہ مل جائے کہ اس شخص دماغ میں ابھی تک ندیم کا خیال کیوں نہیں آیا۔ دولت کا ڈھیر گھر میں موجود ہے اور وہ باہر جھانکتا پھر رہا ہے۔ لعنت ہے ان قلاش شہریوں پر جو دولت کی تلاش میں ان پہاڑوں پر آ بسے تھے۔ ندیم بستی کا سب سے دولت مند نوجوان ہے اور شبنم تو پیدا ہی اس کے لئے ہوئی ہے۔ حسن اور دولت یکجا ہو جائے تو ایک مثالی جوڑی بن جائے گی۔ اس کی آنکھیں بہت دور تک دیکھ رہی تھیں لیکن پھر اس کی نگاہ شبنم پر پڑی جو اس نامعقول شہری نوجوان کے ساتھ بیٹھی ہوئی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ یہ سلسلہ اب بند ہو جانا چاہئے آج شبنم سے اس بارے میں دو ٹوک بات ہو جائے اور اس رات اس نے شبنم سے بات کی۔

"میں نے بالآخر تمہارے لئے ایک نوجوان کا انتخاب کر لیا ہے۔"

"کس کا؟" شبنم نے پوچھا۔

"میں اپنی حماقت پر حیران ہوں کہ آج تک اس کے بارے میں نہ تم نے سوچا اور نہ میں نے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ ہمارے سامنے رہا ہے۔"

"کون ندیم.........؟" شبنم نے چونک کر کہا۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھی۔"

"نہیں .... میں اس کے بارے میں اس انداز میں کبھی نہیں سوچ سکتی۔" شبنم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" کلیم احمد کی آواز میں غصہ تھا۔

"وہ دولت مند ضرور ہے لیکن میری اور اس کی شکل و صورت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہاں وہ اور کہاں میں' آپ نے ایسی بات کیوں سوچی۔"

"کیا حماقت کی بات کر رہی ہو شبنم! آج تک میں نے تمہیں جو سبق دیا تھا اس کا یہی نتیجہ نکلا ہے۔"

"آپ خود سوچیں میں اس بدشکل انسان کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"تم بستی کی سب سے معزز عورت کہلاؤ گی۔ لوگ تمہارے آگے آنکھیں بچھائیں

بہت کچھ دیکھنے کے لئے موجود ہے۔ اس سے شادی کر کے تم ان پہاڑوں کی قید سے نکل سکتی ہو شبنم! ذرا سوچو تم کتنے بڑے خزانے کی مالک بن جاؤ گی۔"

"ہم دونوں بہت بڑے خزانے کے مالک ہیں اس کے پاس ایک سنہرا ڈھیر ہے لیکن میرے دل میں بھی محبت کا خزانہ چھپا ہوا ہے میں زین کو چاہتی ہوں۔"

"یہ چاہت تمہیں کیا دے گی؟ تمہارے سارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا اور تم کون سے راستے پر چل پڑیں۔ اپنی قدر و قیمت پہچانو شبنم! غور کرو وہ قلاش تمہیں کیا دے گا؟" کلیم احمد نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ میرے لئے سب کچھ کر سکتا ہے وہ میری تمام خواہشات پوری کرنے کا وعدہ کر چکا ہے۔"

"ہوں' یہ بات ہے۔"

"ہاں' میں اس سے بات کر چکی ہوں۔"

"تو ایک بار پھر اس سے بات کرو۔ اس سے کہو کہ وہ اپنی دولت کے بارے میں بتائے۔ ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو کہ اس کی مالی حیثیت کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے میں اس سے بات کر لوں گی۔" شبنم نے کہا اور پھر وہ زین کا انتظار کرنے لگی۔

لیکن زین ان دنوں دوسری ہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ آزاد شہری نوجوان ندیم کی طرح اولوالعزم نہیں تھا۔ دولت کے حصول کے لئے وہ خود کو بے دست و پا پاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حصولِ دولت کے لئے انوکھے خواب تھے۔ اس کی جسمانی قوتیں خود کو اس دولت کے حصول کے لئے کمزور پاتی تھیں اس کے کمزور بازو زمین کے سینے سے سونا نکالنے کے ناقابل تھے۔ بس شیطانی ذہن تھا جو دولت کے حصول کے لئے مکرو منصوبے بناتا رہتا تھا اور آج کل اس کے ذہن میں ایک اور شیطان پرورش پا رہا تھا۔

اس قوی ہیکل روایتی جوان کا خزانہ کس طرح میرے قبضے میں آ سکتا ہے۔ میں اس خزانے کا مالک کس طرح بن سکتا ہوں۔ وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے شبنم ملی۔ حسب وعدہ انہوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کی تھی لیکن شبنم کسی قدر پریشان تھی۔

"کیا بات ہے شبنم! آج تمہاری مسکراہٹ کے پھول مرجھائے مرجھائے ہوئے سے ہیں۔" زین نے پوچھا۔

"کیوں؟ مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"مجھ سے شادی کرنے کے بعد تم کہاں رہو گے زین؟"

"حسین برف پوش پہاڑوں کے کسی حسین دامن میں ہم اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے یا اگر تم چاہو گی تو شہر چل کر رہیں گے۔" زین نے جواب دیا۔

"بس؟" شبنم نے پوچھا۔

"تمہاری کیا خواہش ہے' جانِ من؟"

"میں جس قدر حسین ہوں زین! اس کے تحت میری شادی کسی ایسے دولت مند سے ہونی چاہئے جس کی رہائش سوئٹزرلینڈ میں ہو' جس کا کاروبار امریکہ اور پیرس میں ہو۔ جس نے تبدیلی آب و ہوا کے لئے وینس کی کسی آبی شاہراہ کے کنارے کوٹھی بنوا رکھی ہو۔ تم یہ سب کچھ تو نہیں کر سکتے زین!"

"میں بھی تمہارے لئے یہی کچھ چاہتا ہوں میری روح! لیکن بدقسمتی سے میرے وسائل محدود ہیں۔ ہاں میری عقل ان چیزوں کو حاصل کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو۔" زین نے کہا۔

"میں..........!" شبنم حیرت سے بولی۔

"ہاں شبنم! تم یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھے چاہتی ہو؟"

"ساری دنیا سے زیادہ۔"

"تمہیں یقین ہے کہ میں اپنے سینے میں تمہارے لئے محبت کے حسین جذبات رکھتا ہوں۔"

"ہاں' مجھے یقین ہے۔"

میری بھی خواہش ہے شبنم! کہ میں تمہارے لئے وہ سب کچھ حاصل کروں جو تمہارے دل میں ہے لیکن میرے نزدیک محبت دنیا کی سب سے قیمتی شے ہے' باقی چیزیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ ہمیں اپنی محبت پر اعتماد ہے شبنم! لیکن دولت کے حصول کے لئے ایک منصوبہ بھی میرے ذہن میں ہے۔"

"وہ کیا..........؟" شبنم نے تعجب سے کہا۔

"یہ ابھی نہیں بتاؤں گا پہلے میں اس کے تارو پود مضبوط کر لوں۔ اس کے بعد تمہیں اس منصوبے میں شریک کروں گا۔" زین نے جواب دیا۔

اس کے ذہن و دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا اسے احساس تھا کہ وہ بہت حسین ہے اور اسے عام لڑکیوں سے زیادہ ممتاز ہونا چاہئے اور وہ خود اس بات سے متفق تھی لیکن زین سے ملنے کے بعد وہ کسی قدر الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ زین اس کی پسند تھا لیکن وہ اس کی زندگی کے دوسرے پہلو کو روشن کرنے کے قابل نہیں تھا۔ دونوں حقیقتیں اس کی نگاہ میں برابر تھیں۔ دولت اور محبت وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

کلیم احمد اس ملاقات کا منتظر تھا۔ وہ مسکراتا ہوا شبنم کی الجھنوں میں اضافہ کرنے آ گیا۔

"بات ہوئی زین سے۔"

"ہاں۔"

"کیا کہتا ہے؟" کلیم احمد نے شبنم کی شکل سے اندازہ لگا لیا تھا کہ بات کیا ہوئی ہے۔

وہ خود بھی انتہائی پریشان تھا۔ جوانی کی سرکشی کو دبانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شبنم کو کسی طور اپنی مرضی کا تابع نہیں بنایا جا سکتا اگر وہ زین کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہے تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ کون اسے اس سے باز رکھ سکتا ہے۔ بس کوئی ایسی چال ہی ہو سکتی ہے جس سے شبنم کو باز رکھا جائے لیکن ایسی کوئی چال اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"اس کے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ وہ ہماری طلب پوری کر سکے لیکن اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ ضرور ہے جس کے بارے میں وہ بہت جلد مجھ کو بتائے گا۔"

"منصوبہ؟" کلیم احمد نے دہرایا۔

"اس کا خیال ہے کہ وہ اس منصوبے کے سہارے یہ دولت حاصل کر لے گا۔"

کلیم احمد چند ساعت سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔

"اور اگر اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو؟"

"میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔" شبنم نے جھنجلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"میری مانو شبنم! ساری الجھنوں کو چھوڑو۔ تم کسی طرح ندیم سے ملاقات کرو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ تم اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس لو اور اسے شادی کے

"لیکن میں زین کو چاہتی ہوں۔"

"تو اس چاہت سے تمہیں کون منع کرتا ہے۔ میں تمہارے آڑے نہیں آؤں گا۔ محبت زین سے اور شادی ندیم سے۔ پھر جب تم اپنی چالاکی سے ندیم کو اپنے جال میں پھانس لو تو اسے دنیا کی سیر کرنے پر مجبور کر دینا اور زین بھی تمہارے تعاقب میں ہو گا۔ کسی مناسب جگہ پر تم ندیم سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے بعد دولت بھی تمہاری ہو گی اور تمہارا محبوب بھی تمہارے قدموں میں ہو گا۔"

شبنم حیران رہ گئی۔ کیا یہ بھی ہو سکتا ہے؟ ندیم شادی کرتے ہی تو نہیں مر جائے گا۔ کچھ لمحات ندیم کی آغوش میں گزارنے ہوں گے۔ کیا زین اسے برداشت کر لے گا؟

کیا وہ یہ بات سن کر غصے سے پاگل نہیں ہو جائے گا اور پھر یہ کتنی نفرت انگیز بات ہے۔ کیسا منحوس ہے یہ کلیم احمد۔ کیسی غلیظ گفتگو کرتا ہے۔ "چھی کمینہ کہیں کا" اس نے نفرت بھری نگاہوں سے کلیم احمد کو دیکھا۔

"تم میرے بزرگ ہو کر مجھ سے اس غلاظت کے خواہاں ہو۔" اس نے نفرت سے کہا۔

"یہ سب کچھ میں تمہارے لئے ہی سوچ رہا ہوں' شبنم! میں تمہارا سرپرست ہوں اور تمہارے لئے بہتر زندگی کا خواہاں ہوں۔ مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ میں تمہیں کسی غلط اقدام سے روک دوں۔"

"اور تمہیں اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ تم مجھے کسی غلط قدم کے لئے مجبور کرو۔" شبنم نے کہا۔

اس کے ان الفاظ سے کلیم احمد سنبھل گیا۔ جو مجرمانہ تجویز اس نے پیش کی تھی اگر شبنم کی زبان سے کسی اور کو معلوم ہو گئی تو پھر کلیم احمد کو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً پینترا بدلا۔

"نہیں شبنم! مجھے اس کا حق حاصل نہیں ہے اگر تم زین کے ساتھ معمولی سی زندگی گزار کر خوش رہ سکتی ہو تو میں افسوس کرنے کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں۔ تمہاری مرضی ہے۔ ویسے زین کا منصوبہ سن لو دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں غلط حرکت کے لئے تیار نہیں ہوں۔" شبنم نے کہا۔

کلیم احمد خاموش ہو گیا لیکن اس دن کے بعد سے وہ زین کی تاک میں لگ گیا اور سارے دوسرے کام چھوڑ کر اس کام میں مصروف ہو گیا کہ زین اور شبنم کی ملاقات کب

اور کہاں ہوتی ہے۔

اس دن بھی زین حسب معمول کلیم احمد کے گھر آیا۔ اس دن کلیم احمد گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ گئی اندھی عورت تو اس کا وجود عدم وجود برابر ہوتا تھا۔ شبنم نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ کلیم احمد بھی چھپ کر اندر داخل ہو گیا ہے اور اس وقت اس کمرے سے زیادہ دور نہیں ہے جہاں وہ موجود ہیں۔ وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پر کان لگائے ہوئے تھا۔ ابتدائی گفتگو ایسی تھی جو اسے نہیں سنی چاہئے تھی لیکن وہ اس گفتگو سے اتنی گہری دلچسپی رکھتا تھا کہ اس کا کوئی حصہ حذف کرنے کے لئے تیار نہیں تھا چنانچہ وہ اس گفتگو پر کان لگائے رہا۔

"میرا چچا اور باپ تمہارے حق میں نہیں ہے زین! میں اس کی مخالفت سے سخت پریشان ہوں۔" شبنم نے کہا۔

"لیکن اسے مجھ سے کیا دشمنی ہے؟" زین نے پوچھا۔

"اس کے ذہن میں دولت بڑی حیثیت رکھتی ہے وہ کسی دولت مند سے میری شادی کا خواہاں ہے۔"

"خود تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے شبنم!"

"دیکھو زین میں اس خیال کی مخالف نہیں ہوں۔ درحقیقت میری دلی خواہش ہے کہ میری زندگی آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والے پنچھی کی مانند ہو۔ چہرے کے نقوش اسی وقت تک تر و تازہ رہتے ہیں جب تک ان پر فکر کی پرچھائیاں نہ پڑیں۔ میں فکر کی زندگی میں نہیں رہنا چاہتی اس لئے تمہیں میرے لئے خود کو مضبوط کرنا ہو گا۔"

"تمہیں معلوم ہے شبنم! کہ میں اتنا صاحب حیثیت نہیں ہوں۔ میرے ساتھ تم ایک عام زندگی گزار سکتی ہو۔ میں ساری زندگی بھی کوشش کرتا رہوں تو اتنی دولت نہیں کما سکتا جتنی کی خواہاں تم ہو۔ چنانچہ شبنم! آج ہمیں دو فیصلوں میں سے ایک فیصلہ کرنا ہو گا۔"

"کون سے دو فیصلے' مجھے اس کے بارے میں بتاؤ؟"

"شبنم! پہلا فیصلہ تو بحالتِ مجبوری یہی ہے کہ آئندہ تمہارے سامنے آنے کی کوشش نہ کروں بلکہ بہتر یہ ہو گا کہ میں اس بستی سے ہی چلا جاؤں اور یہ میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ میں تعلیم کے بہانے یہ ملک چھوڑ دوں گا جس کے لئے میرے والد مجھ سے کئی بار کہہ چکے ہیں۔ کیونکہ دیارِ محبوب میں رہ کر محبوب سے دوری سب سے مشکل کام ہے۔ تمہاری خوشبو سے معطر ہوائیں مجھے تم تک پہنچنے کے لئے اکسائیں گی اور میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ اس عالم میں نہ جانے کیا کر گزروں۔ دوسرا فیصلہ بھی انتہائی غم اور مجبوری کے تحت ہے لیکن اس کے بعد ہماری زندگی میں کبھی خزاں نہیں آئے گی۔"

"دوسرا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتے ہوئے خوفزدہ ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی غلط تاثر نہ پیدا ہو جائے۔"

"کہو زین! تمہاری مایوس کن گفتگو نے مجھے یاس کا شکار بنا دیا ہے۔ تمہیں چھوڑ کر میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ زین! میں نے تمہیں دل کی آخری گہرائیوں سے چاہا ہے۔"

"میں تمہارے لئے سماج اور اخلاق کے سارے بندھن توڑ دینا چاہتا ہوں۔ میں وہ سب کچھ کر گزرنا چاہتا ہوں شبنم! جو بے شک معاشرے کی نگاہ میں ایک جرم ہو گا لیکن یاد رکھو محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ دل جب دیوانہ ہو جائے تو وہ ہوش مندوں کے سماج سے بہت دور نکل جاتا ہے۔ مجھے اجازت دو شبنم! کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں بے جھجک کہہ دوں اور وعدہ کرو کہ اس کے بارے میں غلط انداز سے نہیں سوچو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں زین! براہ کرم جلدی بتاؤ۔ دوسری کیا بات سوچی ہے تم نے؟"

"تمہاری بستی کا سب سے بڑا آدمی جسے تم ندیم کہہ کر پکارتے ہو' میری نگاہ میں انتہائی احمق انسان ہے' وہ ایک اتنا بڑا خزانہ دبائے بیٹھا ہے اور ہم دولت کے لئے پوری زندگی کو آہوں اور کراہوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ خزانہ اس شخص کی ضرورت نہیں لیکن ہماری ضرورت ہے۔ کیوں نہ ہم اس کا خزانہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔" زین نے کہا۔

شبنم ساکت رہ گئی۔ یہی تجویز تو کلیم احمد کی تھی' اس کے ذہن میں بھی یہی خزانہ آیا تھا اسے اس بات کی حیرت تھی کہ ان دونوں کی نگاہ ایک ہی جانب کیوں اٹھی؟ کیا دونوں کی فطرت یکساں ہے لیکن یہاں اسے اپنی ہی ذات قصور وار نظر آئی۔ کلیم احمد بھی غلط نہیں تھا۔ وہ شبنم کے لئے ایک اچھی زندگی کا خواہاں تھا اور زین بھی یہی چاہتا تھا۔ نہ جانے یہ دولت میری ذات سے اس قدر منسلک کیوں ہو گئی ہے کیا ساری دنیا میں خوبصورت لڑکیاں صرف دولت کے سہارے ہی اپنا حسن برقرار رکھتی ہیں؟ کیا اس کے

بغیر نہیں گزر سکتی لیکن زین زیادہ قابل رحم تھا۔ یہ شرط خود شبنم کی عائد کی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ تو اسے یوں بھی اپنانے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ اس کے لئے اس کے دل میں نرمی پیدا ہو گئی۔ تب اس نے کہا۔

"لیکن زین! کیا یہ کام اتنا آسان ہے کہ تم اسے بخوبی انجام دے سکو؟"

"غم کی بات تو یہی ہے' شبنم! کہ میں تمہاری مدد کے بغیر یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر میں تنہا اس کام کو سرانجام دے سکتا تو یقین کرو تم سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہ پیش آتی۔ زندگی کے کسی مرحلے میں شاید میں تمہیں بتا دیتا کہ میں نے یہ دولت کہاں سے حاصل کی ہے؟"

شبنم کا دل پھر دھڑکنے لگا کیا اس کے بعد زین بھی یہی الفاظ کہے گا کہ میں ندیم سے شادی کر لوں اور اس کے بعد زین کے ساتھ زندگی گزاروں' اس نے سوچا اور پھر لکنت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"مگر میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں زین!"

"شبنم! تمہیں چند لمحات کے لئے مصنوعی طور پر مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑے گی۔ تم اپنے طور پر ندیم سے محبت کا کھیل رچاؤ گی اور اسے اپنی محبت کے جال میں اتنا جکڑ لو گی کہ اس کی زندگی کا کوئی راز تم سے راز نہ رہے اس میں خزانے کا راز بھی شامل ہو گا۔ تم اس سے اس خزانے کے بارے میں معلوم کرو گی اور پھر میں اسے وہاں سے حاصل کر لوں گا۔ شبنم! اس خزانے کو حاصل کرنے کے بعد ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے اور دنیا ہمیں کبھی تلاش نہیں کر سکے گی۔ ہم سوئٹزرلینڈ کی وادیوں میں ہوں گے۔ امریکہ' پیرس' وینس ہماری دسترس سے دور نہیں ہو گا۔ حسین فضاؤں میں ہماری محبت کے گیت ہوں گے اور چڑیوں کے چہچہے۔ زندگی ایک سنہرا آبشار بن جائے گی۔ خوشیوں کا آبشار جہاں ہم کائنات کو بھول کر ایک دوسرے سے پیار کریں گے۔" زین کی آنکھیں بند ہو گئیں لیکن شبنم کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ گہری نگاہوں سے زین کو دیکھ رہی تھی۔ وہی بات' وہی الفاظ جو کلیم احمد نے کہے تھے۔ بہت معمولی فرق تھا ان دونوں میں۔ اس نے اس فرق کو ختم کرنے کے لئے کہا۔

"اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی زین؟"

"نہیں جانِ من! میں نے بہت کچھ سوچا ہے لیکن کوئی اور حل میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔"

"لیکن زین میں جھوٹی محبت کا کھیل کس طرح کھیلوں گی مجھے تو یہ سب کچھ نہیں آتا اور پھر مجھے اس کھیل میں ندیم کے بہت قریب آنا پڑے گا۔ شاید اتنا قریب اتنا قریب جتنا میں تمہارے قریب ہی ہو سکتی ہوں۔"

"لوگ محبت کے حصول کے لئے نہریں کھود دیتے ہیں نجد کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ فریب کی زندگی کے چند لمحات ایک ابدی محبت کا بدل ثابت ہوں تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے شبنم!" زین نے کہا۔

شبنم کے سارے چراغ ایک تیز جھونکے سے بجھ گئے۔ اس کا پندار حسن ٹوٹ گیا۔ دنیا کی کوئی محبت پائیدار نہیں ہے۔ ماں اندھی ہے' باپ سوتیلا ہے' دولت اس سے بڑی چیز ہے' اس کے چمکتے ہوئے شفاف بدن کا سونا کھرا نہیں ہے۔ یہ کھوٹا سونا اس سونے کے قابل نہیں ہے جو ندیم کے پاس موجود ہے۔ اس سونے کے حصول کے لئے اس سونے کو قربان کیا جا سکتا تھا۔ ہاں ٹھیک تو ہے عورت سونے کے لئے بکتی ہے' سونا عورت کے لئے نہیں بکتا۔ اس کے پورے وجود میں شیشے چٹختے رہے۔ ذہن میں آندھیاں چلتی رہیں اور زین بھکاریوں کے سے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ دیر تک کچھ نہ بولی تو زین نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا جانِ من؟"

"اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں زین؟ میں تمہاری امانت ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری سانسیں تمہارے علاوہ اور کسی کی سانسوں سے ٹکرائیں۔ مجھے غیرت محسوس ہوتی ہے زین! کیا میں کسی اور سے محبت کے جھوٹے بول بولوں۔"

"یہ سب کچھ میرے لئے ہو گا' میری مرضی میری خواہش سے ہو گا۔ میں عمر کے کسی حصے میں تمہیں اس کے لئے مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا۔"

"میرے ذہن میں ایک اور خیال ہے زین!" اس نے ٹوٹی ہوئی روح کو جوڑنے کی آخری کوشش کی۔

"وہ کیا جانِ عزیز!"

"زین! کیوں نہ ہم دونوں خاموشی سے یہاں سے نکل چلیں جو کچھ تمہارے پاس ہو گا میں اسی میں گزارہ کر لوں گی' میں کسی چھوٹے سے مکان کو ہی اپنا مقدر سمجھ لوں گی' میں تم سے سمجھوتہ کر لوں گی' زین! میں تقدیر سے سمجھوتہ کر لوں گی۔" اس نے کہا۔

زین کا چہرہ لٹک گیا پھر اس نے کہا۔

"جن خوابوں نے تمہارے وجود میں بسیرا کر لیا ہے شبنم! وہ تم سے کبھی دور نہیں ہوں گے۔ میں یہ سب تمہارے وجود کی بہتری کے لئے چاہتا ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے میں تمہیں کہاں لے جاؤں گا اگر ہماری شادی ہمارے والدین کی مرضی سے باقاعدہ ہو تو شاید ہمیں اتنی مشکلات نہ پیش آئیں لیکن تب تو صورت حال دوسری ہو جائے گی۔"

"اور اگر میں اپنے سوتیلے باپ کو اس بات کے لئے مجبور کروں کہ وہ بغیر کسی مطالبے کے مجھے تمہارے حوالے کر دے تو کیا تم میرا ہاتھ تھام لو گے؟" شبنم نے آنسو بھری آواز میں کہا۔

زین نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"شبنم! میری زندگی' میری روح' میں تمہارے بے داغ چہرے پر تفکر کی ایک لکیر بھی نہیں دیکھنا چاہتا' میں نہیں چاہتا کہ تم ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی کے مسائل سے دوچار رہ کر گزر کرو۔ میری جان! صرف ذرا سی کوشش سے ہم یہ عظیم خزانہ حاصل کر سکتے ہیں تو پھر کیوں نہ اپنی پوری زندگی میں سونا بکھیرنے کے لئے یہ تھوڑی سی محنت کر لیں۔" شبنم خاموش ہو گئی کچھ سوچنے لگی پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو زین صرف تھوڑی سی کوشش سے اگر زندگی میں سونا بکھر جائے تو کیا حرج ہے لیکن زین! مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے؟"

"ہوں' یہ ہوئی کام کی بات۔ شبنم! ندیم لوگوں کی تقریب میں تو بہت کم آتا ہے لیکن سنا ہے وہ اپنے کھیتوں میں بڑی باقاعدگی سے جاتا ہے۔ تم وہاں اس سے ملاقات کرو اور پھر اپنی کوششوں سے اسے اپنی جانب مائل کر لو۔"

"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گی لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟" شبنم نے پوچھا۔

"بس تھوڑا سا وقت گزرے تو تم اسے اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کرنا میں درمیان میں تمہیں ہدایات دیتا رہوں گا اور پھر تم چالاکی سے اس خزانے کے بارے میں پوچھ لینا' پھر کسی رات بھی خزانہ غائب کر دوں گا۔

"اب مجھے اجازت دو جانِ من! میں چاہتا ہوں کہ تم فوراً اپنا کام شروع کر دو۔ ہاں ملاقاتوں میں اب احتیاط رکھنا ہو گی۔ مجھے وہ شخص بھی خاصا چالاک معلوم ہوتا ہے یوں کرتے ہیں ہفتے میں ایک بار ملا کریں گے اور جگہ .... ہاں جگہ بابا کی حویلی کیسی جگہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس سے مناسب جگہ دوسری نہیں ہے۔ اچھا پھر خدا حافظ۔"

"خدا ہی حافظ۔" کلیم احمد نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ "تو مجھ سے بھی بازی لے جانا چاہتا ہے شہری چوہے لیکن یہ تیرے لئے آسان نہیں ہو گا' میں نے جس سونے کی کان کو اتنی احتیاط سے پرورش کیا ہے تو اسے اس طرح اڑا کر نہ لے جا سکے گا۔ گدھا کہیں کا۔"

☆------☆------☆

تنومند کڑیل جوان ایک ہاتھ میں سانٹا لئے اور دوسرے ہاتھ سے ہل کا پھل دبائے بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کا اوپری بدن برہنہ تھا اور چوڑے سینے پر گھنے سیاہ بال پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے پورے بدن کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور دیکھنے والوں کی نگاہ ان پر قائم نہیں رہ سکتی تھی لیکن شبنم اسے دیکھ رہی تھی۔

پھر جب اس نے کھیت کا چکر پورا کیا اور اپنے انہماک سے چونکا تو اس کی نگاہ شبنم پر پڑی اور وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس نے ہل چھوڑ دیا اور دوڑ کر قریب ہی کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے سے ایک گرم شال اٹھا کر بدن کے گرد لپیٹ لی۔ آہستہ آہستہ شبنم کے پاس آگیا۔

"تم' خیریت تو ہے؟ کیا تم کسی کام سے میرے پاس آئی ہو؟" اس نے پوچھا۔ شبنم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں' بس آج ان روایات کو دیکھنے آگئی جو بستی کے کونے کونے میں مشہور ہیں اور انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بڑا اچھا ہوا ہے۔"

"روایات.........؟"

"ہاں جو تمہارے بارے میں مشہور ہے' تم بستی کے سب سے بڑے آدمی ہو لیکن ایک معمولی کسان کی طرح کام کرتے ہو۔ آخر کیوں؟"

"اوہ' لیکن تمہیں اس تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آگئی شبنم؟"

"میرا نام جانتے ہو؟"

"یہ کیا بات ہوئی؟ کیا میں بستی سے دور رہتا ہوں یا یہاں اجنبی ہوں۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دونوں باتیں نہیں ہیں لیکن کیا تم بستی کے تمام لوگوں کو اسی طرح جانتے ہو؟"

"ہاں' یہ درست ہے کہ میں زیادہ تر اپنی زمین پر مصروف رہتا ہوں لیکن بہرحال' سب میرے اپنے لوگ ہیں' میرے دکھ سکھ کے ساتھی' مجھ سے محبت کرنے والے' میں

اپنے خاندان کے لوگوں کو نہیں جانوں گا شبنم؟" ندیم کی مسکراہٹ میں بے حد خلوص تھا۔

"اتنا پیار ہے تمہیں ان سب سے؟"

"اپنے خاندان کو کون پیار نہیں کرتا۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ شبنم! اگر صرف مجھ سے ملنے آئی ہو تو آؤ بیٹھو یا کوئی اور کام ہے؟"

"میں صرف تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ اتنی کہانیاں سناتے ہیں لوگ تمہارے بارے میں کہ اپنا تجسس نہیں روک سکی۔" شبنم اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور وہ دونوں درخت کے نیچے آ بیٹھے۔

"لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا ندیم! میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ تم بستی کے سب سے بڑے آدمی ہونے کے باوجود کسان کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"بستی کے سب سے بڑے آدمی تو بابا کرم دین ہیں جن کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ لوگ مجھے بڑا آدمی کہتے ہیں تو اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے کسی سے فرمائش نہیں کی کہ وہ مجھے بڑے آدمی کے نام سے پکاریں۔ رہ گئی کسانوں کی طرح کام کرنے کی بات تو شبنم! یہ زمینیں ہی ہماری بڑائی کا مظہر ہیں۔ میں اس لحاظ سے واقعی بڑا آدمی ہوں کہ مجھے میری بستی کے لوگوں کی اور میری زمینوں کی محبت حاصل ہے میری زمینیں میری ماں کی مانند ہیں جو میرے پیار میں ڈوب کر اپنی چھاتی سے سارا دودھ اگل دیتی ہیں تاکہ میں طاقتور توانا ہو جاؤں۔ دیکھ لو میری زمینوں پر اگنے والی فصل ساری بستی میں سب سے زیادہ ہوتی ہے' یہ میری ماں کی محبت ہی تو ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔

"بستی کے عام لوگ بھی آج کل ٹریکٹر استعمال کرتے ہیں تم اگر چاہو تو دس ٹریکٹر خرید سکتے ہو۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے ندیم؟"

"بس یہ میرا احساس ہے' میں محسوس کرتا ہوں کہ زمینوں کو مشینوں کے حوالے کر دینے سے ان سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے' جگہ جگہ ماں کی خدمت کا درس دیا گیا ہے' یہ خدمت جنت کے راستے کھولتی ہے' اگر ہم یہ کام نوکروں کے حوالے کر دیں اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں تو مناسب نہیں ہے۔ جو لطف ماں کی خدمت خود کرنے سے ملتا ہے' وہ دوسری طرح نہیں ملتا۔ میری زمینوں سے میرا واسطہ یوں براہ راست ہے۔ سارے معاملے میرے اور ان کے درمیان طے ہو جاتے ہیں۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔
"تم پہلے کبھی ندیم سے ملی بھی تو نہیں۔"
"تمہیں میرا آنا ناگوار تو نہیں گزرا ندیم!"
"ہرگز نہیں۔"
"میں آئندہ بھی تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔"
"جس وقت چاہو۔"
"تم میرا انتظار کرو گے۔" غرور حسن ابھر آیا۔
"اگر تم وعدہ کرو گی۔" وہ سادگی سے بولا۔
"تو میں کل پھر آؤں گی۔"
"کس وقت؟" ایک انجانے جذبے نے پوچھا۔
"بس اسی وقت۔" شبنم نے کہا۔
"میں انتظار کروں گا۔"
"خدا حافظ۔"
"خدا حافظ۔" اور شبنم وہاں سے چلی آئی۔

ذہن میں چھریلے تاثرات لئے' عجیب سی کشمکش کا شکار ہو کر وہ اپنی شخصیت کے پرزوں کو اٹھا کر لائی تھی انہیں جوڑنے کے لئے سہارا تو ملا تھا لیکن کون جانے کہ یہ سہار پائیدار ہے یا صرف سراب۔ وہ سراب جس کی نشاندہی کلیم احمد نے کی تھی۔ جس نے اُس کے ذہن کو جانے کون سے راستوں پر لا ڈالا تھا ورنہ وہ بھی بستی کی ایک عام لڑکی تھی او عام لڑکیاں کتنی پُرسکون رہتی ہیں۔ کتنی پُرسکون؟

☆-------☆-------☆

کلیم احمد بہت خوش تھا۔ وہ ان دنوں شبنم کا تعاقب کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہ زین پر بھی تھی۔ شبنم روز باہر ندیم کے کھیتوں پر چلی جاتی تھی' دو ایک بار اسے ندیم کے مکا میں بھی داخل ہوتے دیکھا گیا اور دو بار زین نے بھی ان دونوں کا تعاقب کیا۔ کلیم احم سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ کام اس سے چھپ کر ایک دوسرے پروگرام کے تحت ہو رہا تھ لیکن کلیم احمد نے اس سلسلے میں ایک اور پروگرام بھی ترتیب دے لیا تھا۔ یہ شہری لونڈ اگر میرے تجربے کو دھوکہ دے گیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ کلیم احمد نے دل میں فیصلہ ک

شبنم حسب وعدہ زین سے نہ ملی تو وہ بے چین ہو گیا۔ اسے آنا چاہئے تھا' وہ کیوں نہیں آئی۔ سارے کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہے تھے لیکن یہ ایک خامی کیوں رہ گئی؟ چنانچہ اس دن صبح ہی صبح شبنم کے مکان پر جا پہنچا۔ کلیم احمد نے دروازہ کھولا تھا۔
"میں شبنم سے ملنے آیا ہوں۔"
"اوہ' اچھا بیٹھو میں اسے اطلاع دے دیتا ہوں۔" کلیم احمد نے اس کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا۔ زین شبنم کا انتظار کرنے لگا' شبنم آئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔
"تم مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں شبنم!"
"میں جانتی تھی کہ تم پریشان ہو گے زین! لیکن یہ سب کچھ میں تمہاری ہدایت پر ہی تو کر رہی ہوں۔"
"ٹھیک ہے لیکن.........."
"بستی کا سب سے بڑا آدمی سب سے بے وقوف آدمی نہیں ہے۔ وہ طویل عرصے سے یہاں رہتا ہے لیکن آج تک اس نے کسی لڑکی کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ اس کو اپنی قدر' اپنے انوکھے ہونے کا احساس ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کی دولت بے شمار لوگوں کے لئے پُرکشش ہے۔ چنانچہ وہ پرکھنے والوں میں سے ہے اور مجھے پرکھ رہا ہے۔ ایسے کام دیر طلب بھی ہوتے ہیں زین! اور احتیاط طلب بھی۔ میں اس وقت تک تم سے ملاقات نہیں کروں گی جب تک اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔ میری خواہش ہے کہ اس وقت تک تم بھی مجھ سے دور رہو ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔" شبنم نے زین کو آگے بولنے نہ دیا اور زین کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ چند ساعت خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔
"تم اندازاً یہ کام کب تک ختم کر لو گی شبنم؟"
"وقت کا تعین میں نہیں کر سکتی زین! ممکن ہے بہت جلد' ممکن ہے زیادہ وقت لگ جائے۔ یہ صرف تمہاری ضد رہ گئی ہے۔ میں خود بھی تم سے دور نہیں رہنا چاہتی زین! مجھے تو یہ بھی خطرہ ہے کہ اسے اپنی محبت کے جال میں پھانستے ہوئے اپنے خلوص کا ثبوت دینے کے لئے کہیں میں اپنی عزت نہ گنوا بیٹھوں۔ زین! میری رائے ہے کہ ہم اس مسئلے کو یونہی چھوڑ دیں اور خاموشی سے یہاں سے نکل جائیں۔"
"اوہ شبنم! میری زندگی' تم میرے لئے ایثار کر رہی ہو' تم مجھے ہر حال میں قبول ہو

سنہری دنوں کے لئے ہم سب کچھ بھول جائیں گے جو ہماری زندگی میں آنے والے ہیں۔" زین جلدی سے بولا۔

"تو ٹھیک ہے زین! انتظار کرو۔" شبنم نے پتھریلے لہجے میں کہا۔

زین کے چلے جانے کے بعد شبنم دیر تک ایک عجیب سی کیفیت کا شکار رہی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اسی وقت کلیم احمد اندر آ گیا اور وہ چونک پڑی۔

"اوہ' کیا زین چلا گیا؟ تم نے اسے قہوے یا چائے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔"

"وہ جلدی میں تھا۔" شبنم آہستہ سے بولی۔

کلیم احمد نے شانے ہلا دیئے۔ وہ ایک نگاہ شبنم کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی تجربہ کار آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔

☆------☆------☆

ندیم نے اپنی مخصوص سیراب مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک لہرا رہی تھی' شبنم بھی مسکرا دی۔

"میں تمہارا بہت وقت برباد کرتی ہوں ندیم! تمہاری زمینوں کو مجھ سے شکایت پیدا نہ ہو جائے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' میں اپنی زندگی میں اصولوں کا قائل ہوں۔ میری زمینوں میں بوائی ہو چکی ہے اور وقت پر ہوئی ہے۔ تمہارے لئے میں نے جو وقت نکالا ہے وہ صرف تمہاری ذات کے لئے ہے۔"

"میری ذات کا تمہاری زندگی میں کتنا دخل ہے ندیم!" شبنم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرے الفاظ کو میری صاف گوئی اور صاف دلی کے سوا کچھ نہ سمجھنا شبنم! میرا ماضی تم سے ہی نہیں بستی کے کسی شخص سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرے نام کے ساتھ کوئی گھناؤنی داستان وابستہ نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ ہمیں ایک ایسا مہربان ملا تھا جس نے ہماری زندگی میں گلزار کھلا دیئے ہیں۔ ہم اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر زندگی بسر کرتے رہے اور خدا کا احسان ہے کہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں۔ شبنم! میں جوان ہوں' شکل و صورت جیسی بھی ہے میں اس سے شرمندہ نہیں ہوں' جوانی کے تقاضے میرے ذہن میں بھی ابھرتے ہیں لیکن میں شاکر ہوں۔ ان تقاضوں کی جائز تکمیل کرنے والے والدین ہوتے ہیں لیکن وہ میرے درمیان نہیں ہیں۔ بہت سے کام جو

چمکدار اور دلنشیں ہوتے ہیں۔ تم میری زندگی میں پہلے پھول کی مانند کھلی ہو۔ تم نے جو میری پذیرائی کی تو میں تمہیں چاہنے لگا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم میری زندگی پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لو۔ میں اپنی ذات کے ایک ایک ذرے کو تمہارے حوالے کر کے سکون حاصل کروں لیکن اس کے لئے میں اپنے ماضی' حال' مستقبل میں کوئی دھبہ قبول نہیں کروں گا۔ اگر تم اجازت دو گی تو میں بستی کے بزرگ آفتاب صاحب کے پاس جا کر اپنی خواہش کا اظہار کروں گا اور وہ تمہیں عزت سے تمہارے والدین سے میرے لئے مانگ لیں گے۔"

"تم مجھ سے مطمئن ہو ندیم!" شبنم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں تمہاری ذات میں حسن کے علاوہ بھی بے شمار خوبیاں ہیں جو مجھے تمہاری طرف مائل کرتی ہیں۔"

"لیکن اس کے باوجود تمہاری ذات کے بہت سے راز میرے لئے ابھی تک راز ہیں۔" شبنم نے کہا۔

"ہاں' میری زندگی کی کچھ باتیں ابھی تک کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکیں۔ مولوی فیضان علی بھی نہیں جانتے تھے لیکن میں یہ باتیں تم سے نہیں چھپاؤں گا شبنم! بلکہ میری زندگی میں صرف تم محرم کی حیثیت سے آئی ہو اور تمہارے بعد بھی میرا کوئی محرم نہ ہو گا۔ خود تمہارے ذہن میں میری ذات کا کون سا پہلو یا راز پوشیدہ ہے؟"

"تمہارا پُراسرار خزانہ۔" شبنم نے کہا۔

"اسے میرا خزانہ مت کہو شبنم! میں پورے اعتماد سے کہتا ہوں ہم نے آج تک اس میں سے خود کچھ نہیں لیا۔ ابتدا میں ہم نے اس خزانے کا جو حصہ خود استعمال کیا تھا یعنی وہ مکان بنایا تھا اور زمین خریدی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ہم نے وہ قرض خود پر سے اتار دیا۔ خزانہ ہمارا نہیں ان ضرورت مندوں کی ملکیت ہے جو اپنی کسی ضرورت میں پھنس کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں' تب یہ امانت ہم ان لوگوں کو دے دیتے ہیں۔"

"لیکن وہ خزانہ تمہارے پاس کہاں سے آیا۔"

"قاقلان کے خون میں جا کر اسلم نے نام کا نعرہ لگا دیا ہو۔ وہ لوگ دہشت سے ساکت ہو جاتے تھے۔ ڈاکو اسلم خان قاقلان کا زندہ علامت تھا۔ اسے ڈاکو بنانے والے چند ظالم لوگ تھے ورنہ وہ تو پشتوں سے ایک محنتی کسان تھا اور اپنی مختصر زمینوں سے اپنے

لئے روزی حاصل کرتا تھا لیکن جب اس کی روزی چھین لی گئی جب ارباب اقتدار نے اس کی آبرو پہ حملہ کیا تو وہ ڈاکو بن گیا اور پھر اس نے خود پر ظلم کرنے والوں سے چن چن کر انتقام لیا اور لوگ اسلم کے نام سے کانپنے لگے۔ اسلم کے پورے گھر کو پھونک دیا گیا تھا۔ اس جلتے ہوئے مکان سے صرف وہ مجھے اور میری ماں کو نکال سکا تھا۔ ہمیں ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر اس نے سینکڑوں مکان پھونک دیئے' ہزاروں کو قلاش کر دیا۔ یہ ساری دولت انہی لوگوں کی ہے لیکن میں اور میری ماں اس کی ان باتوں سے خوش نہیں تھے۔ اس کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔ اب وہ کیوں لوگوں کو ستاتا ہے؟ میری ماں اس سے اکثر سوال کرتی لیکن اسلم اب اچھا انسان نہیں بن سکتا تھا۔ اس کی بقا اسی میں تھی کہ وہ لوگوں کو دہشت زدہ رکھے۔ اگر لوگ اس کی دہشت کے اثر سے نکل جاتے تو پھر وہ اسلم کو اس کے پورے خاندان سمیت زندہ دفن کر دیتے۔ میری ماں کے مجبور کرنے پر اسلم نے نقل وطن فیصلہ کیا اور پھر ایک رات ہم اپنی دولت خچروں پر لاد کر چل پڑے۔ راتوں رات ہم نے طویل سفر طے کیا۔ دوسرے دن صبح سے برف باری شروع ہو گئی۔ ہمارے پاس خزانے کے انبار تھے لیکن ہم سردی سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں رکھتے تھے۔ برف کے طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔ ہماری ہر سانس موت کے قریب تر تھی اور میرے باپ کو خزانے کی بے وقعتی کا احساس ہو رہا تھا جو عظیم مالیت کا تھا لیکن ہمارے لئے بے مصرف ہو کر رہ گیا تھا۔

"اور پھر اس وقت جب موت سے چند قدم دور تھے' ہمیں ایک روشن نقطہ نظر آیا' یہ اس بستی کی مسجد کے بلند مینار کا جلتا ہوا چراغ تھا جس نے ہمیں زندگی کا پیغام دیا۔ ہم نے تین انسانوں کو دیکھا جو جذبہ اخوت سے سرشار موسم کی شدت بھول کر ہماری مدد کے لئے دوڑ پڑے تھے۔ [illegible] مولوی فیضان علی اور ان کے دونوں بیٹے ہمارے پاس آ گئے تھے اور اس بات نے میرے باپ کی فطرت کو بدل دیا۔ مولوی صاحب نے ہی انکار نہیں کیا بلکہ خود اپنے بال بچے سمیت حجرے سے نکل گئے اور ہمیں وہاں جگہ دے دی۔ تب میرے باپ کو احساس ہوا کہ خزانہ وہ نہیں جو سونے چاندی کے سکوں پر مشتمل ہوتا ہے بلکہ خزانہ وہ ہوتا ہے جو انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہم اس خزانے سے محروم تھے۔

"چنانچہ سنہری خزانہ پوشیدہ کر دیا گیا اور ہم دوسرے خزانے کو فروغ دینے لگے جو مولوی فیضان نے ہمیں دیا تھا۔ میرے باپ نے زمین خریدی' مکان بنایا اور ہم نے محنت

اور جانفشانی سے اپنا ایک مقام بنا لیا۔ آج میرے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں' مولوی فیضان علی بھی مالک حقیقی کے پاس جا چکے ہیں لیکن ان کا سبق زندہ ہے۔ یہ سنہرا خزانہ صرف ایک جذبہ ہے جو ان ضرورت مندوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جو اس کے طالب ہوتے ہیں۔ میری نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے شبنم! خدا کی قسم کسی ضرورت مند کو لے آؤ اور اس سے کہو کہ سونے کے یہ ڈھیر اٹھا کر لے جائے' مجھے ذرا بھی تردد نہیں ہو گا۔" ندیم کے لہجے میں حقارت تھی۔

شبنم کی پُرسکوت نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں' پھر اس نے کہا۔

"ندیم! اگر کوئی ضرورت مند مجھے تم سے مانگے۔" ندیم عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سوچتا رہا پھر بولا۔

"نہیں شبنم! میں انسان ہوں اور انسان کمزوریوں کا مرقع ہوتا ہے۔ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں شبنم! تم میری زندگی میں اتنا بڑا مقام حاصل کر چکی ہو کہ تمہیں کھونے کے بعد میں اپنی سانسوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکوں گا' میں کسی ضرورت مند کے لئے یہ ایثار نہیں کر سکتا۔" ندیم نے کہا۔

"میری عزت و عظمت کی کیا قیمت ہے ندیم!" شبنم نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"ندیم کے بدن میں دوڑتا ہوا سارا لہو اس کے آگے بے وقعت ہے۔"

"کیا تم خلوص دل سے یہ بات کہہ رہے ہو ندیم!"

"ہاں شبنم! پورے اعتماد سے پورے خلوص سے۔" ندیم کی آواز میں ٹھہراؤ تھا' عزم تھا۔

"تب ندیم آج میں بھی تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں۔" شبنم نے سرسری آواز میں کہا اور ندیم ہمہ تن گوش ہو گیا۔

☆------☆------☆

زین نے وفور انبساط سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اس نے شبنم کو آغوش میں لینے کی کوشش کی لیکن شبنم پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں زین! میں تمہارے نزدیک نہیں آؤں گی۔ میری اپنی بھی کوئی قدر و قیمت ہے' تم مجھے باعزت طور پر حاصل کرو۔"

"اوہ شبنم .... شبنم! تم نے وہ کام کیا ہے کہ بس میں کیا کہوں۔ شبنم! تم نے میرے سارے خوابوں کی تکمیل کر دی ہے۔ اب دنیا ہمارے قدموں کے نیچے ہو گی۔ میں

ساری دنیا دیکھوں گا.......... ساری دنیا۔"

"اور میں؟" شبنم نے پوچھا۔

"ہاں' تم بھی میرے ساتھ ہو گی۔ بے شک تم میرے ساتھ ہو گی۔ تو شبنم! تم کب مجھے وہاں لے چلو گی' کس وقت؟ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"آج ہی رات' میں بابا پیر کی پہاڑیوں میں مشعل جلاؤں گی۔ تم اس مشعل کو دیکھ کر چلے آنا۔" شبنم نے جواب دیا۔

"بابا پیر کی پہاڑیاں۔" کلیم احمد نے مونچھیں مروڑتے ہوئے زیر لب کہا اور پھر مسکرانے لگا۔

"وہاں میں بھی تم لوگوں کو ملوں گا میرے بچو! بڑوں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی نگرانی کریں؟" اس نے پھر زیر لب کہا اور پھر وہاں سے کھسک آیا تاکہ کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑنے پائے۔

☆------☆------☆

شام ڈھلے وہ بابا پیر کی پہاڑیوں میں اپنے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا' ایک بلند جگہ اس نے اپنے لئے پسند کی اور وہاں پوشیدہ ہو گیا لیکن جب رات گہری ہوئی تو اس نے دور بہت دور مشعل کی روشنی دیکھی اور حواس باختہ ہو گیا۔

"اوہ.......... اوہ یہ تو بہت فاصلہ ہے کہیں وہ لوگ اپنا کھیل مکمل نہ کر لیں۔ کہیں میں پیچھے نہ رہ جاؤں۔" وہ بادل ناخواستہ اپنی جگہ سے نکلا اور برق رفتاری سے راستہ طے کرنے لگا۔

مشعل کی روشنی زین نے بھی دیکھی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ روشنی کی سمت بڑھنے لگا۔ یہ روشنی اس کی تقدیر کا ستارہ تھی جو پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس کے بعد.......... اس کے بعد اس کی حیثیت ہی بدل جائے گی۔ وہ نہ جانے کیا بن جائے گا۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ روشنی کے قریب پہنچ گیا۔ مشعل شبنم کے ہاتھ میں تھی۔ وہ نزدیک پہنچا تو شبنم مسکرانے لگی۔

"تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہوئی زین!"

"نہیں' میری زندگی' میری روح! تم رہبر تھیں' دقت کیسے ہوتی۔ خزانہ کہاں ہے؟" زین نے بھنچی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" شبنم نے کہا۔

"وہ زین کو ساتھ لئے ہوئے ایک غار میں داخل ہو گئی۔ تاریک غار میں مشعل کی روشنی ناکافی تھی۔ غار وسیع تھا لیکن شبنم نپے تلے قدموں سے' زین کو غار کے ایک کونے میں لے گئی اور پھر اس نے مشعل نیچے جھکا دی۔

کافی بڑا چوبی صندوق کھلا ہوا تھا۔ اس کی نچلی سطح میں کافی اشرفیاں بھری ہوئی تھیں اور ان کے اوپر سونے کے بیش قیمت زیورات جگمگا رہے تھے۔ زین کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ کافی دیر تک تو اس کی آواز ہی نہیں نکل سکی' پھر وہ بمشکل تمام بولا۔

"میں نے.......... میں نے اتنے بڑے خزانے کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے.......... میں نے.......... لیکن.......... لیکن ہم اسے یہاں سے کس طرح لے جائیں گے؟ شبنم!"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے زین!" شبنم نے جواب دیا۔

زین پریشان ہو گیا لیکن ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ غار کی دیوار میں ایک اور مشعل روشن ہو گئی پھر اس مشعل سے دوسری اور بہت سی مشعلیں جگمگانے لگیں۔ یہ مشعلیں غار کی دیواروں میں نصب تھیں اور ایک فولادی وجود بڑے اطمینان سے ان مشعلوں کو روشن کر رہا تھا۔ زین نے اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔ یہ ندیم تھا۔ آخری مشعل روشن کرنے کے بعد وہ پلٹا اور کسی آہنی ستون کی مانند زین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے پہچانتے ہو زین! اس خزانے کا رکھوالا ہوں۔ آگے بڑھو مجھ سے جنگ کرو اور اس خزانے کو یہاں سے لے جاؤ۔" اس کی آواز گونجی اور زین کے پیروں کی جان نکل گئی۔ اس کا دل حلق میں آ رہا تھا۔

"اگر مجھ سے جنگ نہیں کر سکتے تو ایک دوسری ترکیب بھی میرے ذہن میں ہے۔ تم شبنم کو چاہتے ہو' وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے لیکن شبنم میری بھی آرزو ہے' اگر تم اسے ہمیشہ کے لئے میرے حوالے کر دو تو.........." ندیم خاموش ہو گیا۔

زین کے بدن میں جیسے زندگی بھر گئی۔

"ہم.......... میں تیار ہوں' خدا کی قسم میں تیار ہوں۔"

"زین! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمہیں چاہتی ہوں' میں تمہیں یہاں تک لائی ہوں۔" شبنم نے کہا لیکن زین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوبارہ ندیم سے بولا۔

"میں بالکل تیار ہوں۔ میں تیار ہوں ندیم! فیصلہ کرو۔"

شبنم نے اپنے ہاتھ کی مشعل نیچے پھینک دی۔ آگے بڑھی اور پھر اس نے زین کے منہ پر تھوک دیا۔

"ذلیل نوجوان! تُو میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا کیا حق رکھتا ہے؟ میں تیری کون لگتی ہوں؟ میرا اپنا وقار ہے' اپنا مقام ہے' میں اس مشعل سے تیرا منہ جھلسا دیتی لیکن تیرا ایک احسان بھی ہے مجھ پر۔ تُو نے ہی مجھے ندیم تک آنے کی تحریک دلائی تھی۔ ندیم سے محبت کر کے' اس سے شادی کر کے اس کے خزانے کو حاصل کرنے کا لالچ مجھے میرے چچا کلیم احمد نے بھی دیا تھا لیکن میں نے سوچا' کلیم احمد ایک لالچی انسان ہے اور پھر میں تو اس کی بیٹی بھی نہیں ہوں۔ تاہم اس کے الفاظ سے میرا بھرم ٹوٹا تھا۔ میں نے پہلی بار سوچا کہ دولت مجھ سے زیادہ قیمتی شے ہے۔ میرا حسن میرا پندار کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن میں نے اپنی اس شکست کو اس لئے برداشت کر لیا کہ یہ الفاظ ایک لالچی بوڑھے نے ادا کئے تھے۔ پھر میں نے تجھے آزمایا اور جب تُو نے بھی میری عزت اور عصمت کے عوض اس خزانے کو ترجیح دی تو میں ریزہ ریزہ ہو گئی۔ میں نے اپنا مضحکہ اڑایا۔ میں نے مرنے کی ٹھان لی' تب میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک ایسے شخص کو آزماؤں جو خود ہی خزانے کا مالک بھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس کے دل میں جھانکوں اور اگر ہو سکے تو اس کے وجود میں اپنے پندار حسن کی زندگی تلاش کروں۔ میں اس کے سامنے بکھر گئی' جب اس نے میرے ریزہ ریزہ وجود کی کرچیاں بڑے احترام سے چنیں اور انہیں سینے میں چھپا لیا' اس نے مجھے نئی زندگی دے دی' اس نے مجھے موت سے بچا لیا اور میں نے سوچا کہ اب تک میں کتوں کے درمیان زندگی بسر کر رہی تھی۔ میں خود ہی انسانوں سے دور تھی۔ زین! میں اپنے سارے وجود کو دنیا کے اس حسین ترین نوجوان کے قدموں پر نچھاور کرتی ہوں جس نے مجھ ٹوٹی ہوئی عورت کو جوڑا ہے۔ مگر تیری سمجھ میں یہ باتیں کہاں آئیں گی۔ مجھے تیری اصلی تصویر دیکھنی تھی' اب تُو اپنا عبرتناک انجام دیکھ۔"

زین نے خوفزدہ نگاہوں سے اس سنگی ستون کو دیکھا جو اس کے سامنے تنا ہوا کھڑا تھا۔ اس ستون کے سامنے کھڑے ہونے کی سکت اس میں نہیں تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے موت نظر آ رہی تھی۔

"ندیم! اسے سزا دو' اسے ایسی عبرتناک سزا دو کہ یہ موت کے بعد بھی یاد رکھے۔"

شبنم بولی۔

ندیم اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس نے غار کے ایک حصے میں کچھ ٹٹولا اور پھر ایک بریف کیس اس کے سامنے کھول دیا۔ سنہرے سکے اس بریف کیس میں اوپر تک بھرے ہوئے تھے۔

"نوجوان تم خزانوں کے خواہاں ہو۔ لو یہ خزانہ موجود ہے۔ میں نے اس بڑے خزانے سے تمہارے حصے کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ یہ دولت تمہاری جوانی کا سہارا بن سکتی ہے اور اس کے بعد ایک عبرتناک بڑھاپا تمہارے سامنے ہو گا۔ جس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہی دوسرے کو دیا جاتا ہے۔ تمہاری فطرت میں لالچ مکاری اور عیاری تھی جو تم نے شبنم کو دی۔ میرے پاس محبت اور عفو ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔" اس نے بریف کیس بند کر کے زین کی طرف بڑھا دیا اور پھر شبنم کی طرف رخ کر کے بولا۔

"تم اس سزا کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو شبنم!"

"یہ انوکھی سزا ہے۔" شبنم بے اختیار بولی۔

"ہاں' لیکن ایسی ہی سزا جسے یہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے۔ شبنم! یہ دولت بہت بڑی ہے اس کے سہارے یہ لالچی انسان اپنی جوانی رنگین بنا سکتا ہے۔ یہ اس دولت کے سہارے عیش کی زندگی گزار لے گا اور اس کی ساری جوانی اکارت ہو جائے گی۔ دولت کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتی' ایک دن یہ اس کے پاس ختم ہو جائے گی لیکن اس کے قویٰ جس سہل پسندی کے عادی ہو چکے ہوں گے' وہ ساری عمر اسے مار مار جلائیں گے' جلا جلا کر ماریں گے' انسان کے پاس اس کی سب سے بڑی دولت .... اس کے بازو اور اس کے بازوؤں کی جدوجہد ہوتی ہے۔ میں نے اس کے بازو ناکارہ کر دیئے ہیں۔ جاؤ جوان یہ بریف کیس یہاں سے لے کر چلے جاؤ اور سنو آئندہ اس علاقے میں اور بستی میں نظر نہیں آنا۔ یہ خزانہ چونکہ تمہاری نگاہوں میں آ چکا ہے اس لئے اب یہ یہاں نہ ہو گا۔ جاؤ کہیں شبنم کی توہین مجھ سے میری ریاضت نہ چھین لے۔" ندیم کی آواز غراہٹ میں بدل گئی۔

زین جیسے کسی کے سحر سے آزاد ہو گیا۔ اس نے بادل ناخواستہ وزنی بریف کیس اٹھایا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ تاروں کی چھاؤں میں وہ چھوٹی چھوٹی چٹانیں پھلانگتا ہوا دوڑ رہا تھا اور اس کے قدموں کی آواز نے ہی پہاڑوں میں سرگرداں کلیم احمد کو اس کا نشان

بتایا۔

"اوہ۔" کلیم احمد کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

"تو یہ دولت لوٹ کر یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا زین! میں نے بھی اس کے حصول کے لئے بڑی جدوجہد کی ہے' میں بھی اسی کا طلبگار ہوں۔"

اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول سے دو گولیاں نکلیں اور زین کی چیخ پہاڑوں میں لہرائی۔ کلیم احمد دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا اور پھر اس نے سنہرے سکوں سے بھرا ہوا بریف کیس اپنے قبضے میں کیا اور تاریکی میں بے تحاشا دوڑنے لگا۔ اس کے ذہن میں شبنم کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے راتوں رات اس بستی سے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گولیوں کی آواز پر شبنم اور ندیم باہر نکل آئے تھے۔ نیچے پستیوں میں انہوں نے ایک پست انسان کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھا۔ دوسرا بریف کیس لئے دوڑ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زین کے نزدیک پہنچ گئے جو دم توڑ چکا تھا۔

"یہ خدا کا فیصلہ ہے شبنم! جو اس دوسرے کے ساتھ بھی ہو گا۔ آؤ بستی چلیں اور سنو! اب تم مجھ سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ میں آفتاب بابا کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گا۔ آؤ' ہمیں بستی والوں کو اس سانحے کی اطلاع بھی دینی ہے۔" ندیم نے اسے سہارا دیا اور وہ کپکپاتے ہوئے بدن کی لرزشیں سنبھالے اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

☆-------☆-------☆

قدرت کے عمل ناقابل فہم ہوتے ہیں اور سچ بھی ہے' اس چھوٹے سے دماغ والے انسان کو اس کی وسعتوں کے مطابق ہی تو دیا جا سکتا ہے۔ زیادہ اس میں سما ہی نہیں سکتا۔

سونو کا آغاز جیسے ہوا تھا وہ ایک الگ داستان ہے۔ برائی اچھائی کا الٹ ہوتی ہے اور وہ ایک بدکردار تھی لیکن ایک خوبی تھی اس کے اندر' اس نے اپنے باپ کی برائیاں جاننے کے باوجود اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا جبکہ وہ ایسا کر سکتی تھی۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی اور دوسرے باپ نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن اس نے اپنے سوتیلے باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ کبھی برا سلوک نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی کوئی ادا قدرت کو پسند آ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے ایک کھلونا مل گیا تھا اور اس کھلونے نے اسے خود میں لپیٹ کر جرم کی زندگی سے دور کر دیا تھا۔

پراسرار بھرے کے اندر دوسری کیا صفات تھیں ... کا تجزیہ کرنے کا موقع ہی نہیں

ملا تھا۔ اپنی عمر کے خوابوں میں کھو گئی تھی۔ یہ خواب ایک نشہ آور کیفیت رکھتے تھے اور وہ ان سے تھکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی اور پراسرار داستان کی خواہش کی اور قصر سنبل اس نئی داستان کا مرکز تھی۔

قصر سنبل کیا ہے۔ ایک بوسیدہ اور کہنہ سالہ عمارت۔ شاید سو سال' شاید اس سے بھی زیادہ پرانی جس سے داستانیں منسوب تھیں۔ ایسی داستانیں جو اس طرح کی عمارتوں سے منسوب ہوتی ہیں۔ قصر سنبل کی دیواریں بھوری تھیں اور ان میں جابجا دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ سارا صحن اونچی اونچی گھاس جھاڑ جھنکار کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔

کسی زمانے میں وہ ایک خوبصورت باغ ہو گا لیکن اب وہ صرف ایک ویران باغ تھا۔ بدصورت اور بدنما۔ دائیں بائیں بلند قامت درخت ایستادہ تھے جنہیں اکاس بیل نے جکڑ رکھا تھا۔ دائیں جانب دور افتادہ کونے میں نیم شکستہ چھپر کے اوپر انگور کی بیلیں بھی نظر آ رہی تھیں لیکن سوکھی ہوئی۔

سونو نے دلچسپ نظروں سے اس پراسرار ماحول کو دیکھا پھر ایک مرسڈیز قصر سنبل کے سامنے آ کر رکی تھی۔ کار کا انجن بند ہوتے ہی ماحول گہرے سناٹے میں ڈوب گیا۔ کار کے اندر صرف دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بیس بائیس سالہ خوش شکل اور صحت مند نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں کونوں سے خفیف سی اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے آسودگی اور امارت جھلک رہی تھی۔ اس کی ساتھ والی سیٹ پر ایک سولہ' سترہ سال کی دبلی پتلی اور خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

"یہاں کتنی خاموشی ہے؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ "یہ کون سی جگہ ہے ظہیر!"

"اس عظیم عمارت کو قصر سنبل کہتے ہیں۔" ظہیر نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ "اسے تقریباً نصف صدی قبل میرے دادا جان نے خریدا تھا۔ دیکھ کیا رہی ہو؟ باہر آؤ۔"

"لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اف! یہاں کتنی ویرانی ہے۔" ظہیر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور بولا۔ "تم نے خود ہی کہا تھا کہ کسی ایسی جگہ چلیں جہاں کوئی نہ ہو۔"

"اور تم مجھے ایک ایسی جگہ لے آئے۔" لڑکی نے کہا اور کار سے باہر آ گئی ...

گلابی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرس پکڑا ہوا تھا۔ جسم متناسب اور پرکشش تھا۔ وہ اردگرد نظر دوڑاتی ہوئی بولی۔ "کتنی عجیب بات ہے؟"

"کیا عجیب بات ہے؟"

"یہاں درخت اور پودے تو بے شمار ہیں لیکن پرندہ ایک بھی نظر نہیں آیا بلکہ جھینگروں کی آواز بھی نہیں آ رہی۔"

"تمہارا مشاہدہ کافی تیز ہے۔" ظہیر کار بند کرتا ہوا بولا۔ "واقعی یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔" وہ پھر خودکلامی کے انداز میں بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ افواہوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔"

"کون سی افواہیں؟"

"کک .... کچھ نہیں .... یونہی ایک بات منہ سے نکل گئی تھی۔ آؤ اندر چلیں۔" لیکن لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس کے چہرے پر تشویش نمودار ہو گئی۔ سائے لمبے ہو رہے تھے اور سورج غروب ہونے کو تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے عمارت کے اندر ابھی سے تاریکی پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔

"صفو!" ظہیر نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ "کیا سوچنے لگیں؟"

"تمہاری نیت تو ٹھیک ہے نا ظہیر!"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" ظہیر مکاری سے آنکھیں گھماتا ہوا بولا۔ "میری نیت بالکل ٹھیک ہے۔"

"تو پھر تم مجھے اس ویرانے میں کیوں لائے ہو؟"

"صفیہ! تم اس سے پہلے تو کبھی سنجیدہ نہیں ہوئی تھیں۔ یہ عمارت بہت محفوظ اور پرسکون ہے۔ ذرا اندر سے تو دیکھ لو۔ یہاں ہم بڑے آرام سے بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔ میں نے پورے دو دن لگا کر چند کمرے صاف کئے ہیں۔ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔"

"دیکھو میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کرنا' ورنہ میں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔"

"سچ پوچھو تو میں تمہیں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ پہلے کبھی بدتمیزی کی ہے' جو آج کروں گا۔ آؤ اندر چلیں۔"

اس نے جیب سے چابی نکالی اور عمارت کے داخلی دروازے پر پڑے ہوئے بھاری

قفل کو کھولنے لگا۔ اسی لمحے عقب میں پتوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے ایک ساتھ پیچھے گھوم کر دیکھا۔ ایک معمر شخص جھاڑ جھنکار سے بھری روش پر چلتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی نظر آ رہی تھی۔ جس کے کچھ بال سفید تھے۔ عمر پچپن برس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ صحت اچھی اور جسم مضبوط نظر آتا تھا۔ وضع قطع سے کوئی ذمہ دار شخص معلوم ہوتا تھا۔ ظہیر نے تالا کھول کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور استفہامیہ نظر سے نووارد کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے کرم علی!" اس نے پوچھا۔

بوڑھا کرم علی صفیہ پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔ "کچھ نہیں چھوٹے سرکار! آپ کی کار دیکھی تو سلام کرنے آ گیا۔ آپ کتنی دیر یہاں ٹھہریں گے؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" ظہیر نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"اگر زیادہ دیر ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو آپ کے لئے کھانے پینے کا کچھ انتظام کروں۔"

"ہاں! خوب یاد دلایا۔ کھانے کا انتظام کر دو۔ یہ رکھ لو۔" جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس نے کرم علی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "صرف کھانے کا انتظام' پینے کا انتظام ہے ہمارے پاس۔"

"بہت بہتر سرکار! لیکن یہ پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟"

"رکھ لو۔" ظہیر نے رعونت سے کہا۔ "کام آ جائیں گے۔"

کرم علی تامل کرتا ہوا بولا۔ "سرکار! ایک بات عرض کرنا چاہتا تھا۔"

"کہو کیا کہنا ہے؟"

"ذرا اس طرف آ جائیں۔"

وہ ظہیر کو ایک طرف لے گیا۔ صفیہ کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں تاہم وہ خاموش کھڑی رہی۔

"چھوٹے سرکار!" کرم علی نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔"

"جو کچھ پوچھنا ہو' جلدی پوچھو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے اور دیکھو اپنی حیثیت میں رہ کر بات کرنا۔"

"میں آپ کا نمک خوار ہوں سرکار!" کرم علی نے چالاکی سے کہا۔ "حیثیت سے باہر کیسے جا سکتا ہوں .... م .... میں اس لڑکی کے بارے میں عرض کرنا چاہتا تھا۔

آپ کو اسے یہاں نہیں لانا چاہئے تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"بڑے سرکار کا یہی حکم ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ چند سال پہلے آپ کے بڑے بھائی اس عمارت میں مردہ پائے گئے تھے۔"

"ہاں' مجھے اچھی طرح یاد ہے کسی نے ان کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔ پولیس قاتل کا پتا چلانے میں ناکام رہی تھی اور بعض جاہلوں نے مشہور کر دیا تھا کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے اور یہ کہ نصیر بھائی کی موت میں کسی بدروح کا ہاتھ تھا۔"

"یہ بات سچ ہے چھوٹے سرکار!" کرم علی نے کہا۔ "اس واقعے کی ایک بات ایسی ہے جو میرے اور بڑے سرکار کے سوا کوئی نہیں جانتا' نہ پولیس اور نہ کوئی اور۔"

ظہیر نے آنکھیں جھپکائیں۔ "کون سی بات' تم نے وہ بات پولیس کو کیوں نہیں بتائی؟"

"بڑے سرکار نے منع کر دیا تھا۔"

"تم نے میرا تجسس بیدار کر دیا ہے۔ بتاؤ وہ کیا بات تھی؟" کرم علی صفیہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "جس رات نصیر میاں کی موت واقع ہوئی اس رات ان کے ساتھ بھی ایک ہی ایک لڑکی تھی۔"

"کون تھی وہ لڑکی' تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟ ضرور اس لڑکی نے نصیر بھائی کا گلا گھونٹا ہو گا۔"

"نہیں وہ لڑکی تو مکھی بھی نہیں مار سکتی۔ وہ تو خود بھی بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"کیا؟ اس کا مطلب ہے کہ وہ قتل کی عینی گواہ تھی۔ اس نے یقیناً قاتل کو دیکھا ہو گا؟"

"شاید لیکن اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ قاتل اس دنیا کا باشندہ نہیں تھا۔"

"او میرے خدا! اس ملک سے توہم پرستی اور جہالت کب دور ہو گی۔ اگر وہ اس دنیا کا باشندہ نہیں تھا تو کون تھا؟ کہہ دو کہ کوئی بھٹکی ہوئی روح تھی۔"

"اس نے جو بات بتائی تھی اسے یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے آتشدان میں جلنے والی آگ سے ایک بچے کو نکلتے دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ سخت دہشت زدہ ہو گئی تھی اور فوراً ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ بچہ آگ سے نکل کر نصیر میاں کی طرف بڑھا تھا۔"

"ناممکن' قطعی ناممکن۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے یا تو اس لڑکی نے خود نصیر بھائی کو قتل کیا ہو گا یا اس کے کسی ساتھی نے یہ حرکت کی ہو گی۔ بعد میں اس نے اپنی جان بچانے کے لئے من گھڑت قصہ سنا دیا۔ کیا تم نے ابا کو یہ بات بتائی تھی؟"

"کیوں نہیں۔" کرم علی نے کہا۔ "بڑے سرکار رات ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس وقت وہ لڑکی میرے کوارٹر میں موجود تھی۔ انہوں نے خود اس کے ساتھ بات بھی کی تھی۔ جب لڑکی نے آگ سے نکلنے والے بچے کی تفصیل بتائی تو ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے کسی نے ان کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ کرم علی! تم ہمارے وفادار ملازم ہو۔ یہ بات جو تم نے سنی ہے' آگے نہیں جانی چاہئے اور دیکھو پولیس کو اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ عزت دار گھر کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ پھر ان کے حکم پر میں لڑکی کو شہر چھوڑ آیا تھا۔ یہ راز میں پہلی مرتبہ آپ کو بتا رہا ہوں۔ صرف اس لئے کہ آپ بھی وہی غلطی کر رہے ہیں جو نصیر میاں نے کی تھی۔"

"میں ان فضول باتوں پر یقین نہیں رکھتا کرم علی!" ظہیر نے کہا۔ "اور اب تو میں یہاں ضرور رکوں گا۔ جنوں' بھوتوں اور روحوں کے بہت قصے سنے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟"

"میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ آپ واپس چلے جائیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ برسوں سے بڑے سرکار نے کبھی اس حویلی کے اندر قدم نہیں رکھا۔ ایک دفعہ اتفاق سے انہیں رات رہنا پڑ گیا تھا۔ میرے اصرار کے باوجود وہ حویلی میں نہیں گئے۔ میرے کوارٹر میں رات گزاری۔ اس رات حویلی کے اندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی رہی۔ بڑی دردناک آواز تھی۔"

"کیا تم نے اپنے کانوں سے وہ آواز سنی تھی؟"

"جی' بالکل۔"

ظہیر چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ "ہو سکتا ہے کہ کوئی خانہ بدوش رات گزارنے کے لئے یہاں ٹھہر گئے ہوں اور ان کا بچہ رو رہا ہو۔"

"سرکار! یہ آواز اکثر راتوں کو سنائی دیتی ہے۔ میرے علاوہ بھی کئی لوگوں نے سنی ہے۔"

"سب بکواس ہے۔" ظہیر نے کہا۔ تاہم اس کے چہرے سے تشویش نظر آ رہی تھی۔ "فکر نہیں کرو میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ تم جا کر کھانا تیار کرو۔ اگر حویلی کے

اندر واقعی کوئی روح رہتی ہے تو آج اس کی آخری رات ثابت ہو گی۔ بشرطیکہ وہ میرے سامنے آ گئی۔"

کرم علی واپس چلا گیا اور ظہیر پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہوا صفیہ کے قریب آ گیا۔

"معاف کرنا صفو!" اس نے کہا۔ "بات ذرا لمبی ہو گئی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" صفیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تھوڑی دیر اور باتیں کر لیتے اپنے پرانے نمک خوار سے۔"

"دراصل اس نے بات ہی کچھ ایسی چھیڑ دی تھی۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

ظہیر گہرا سانس لیتا ہوا بولا۔ "یہ دیہاتی انتہائی توہم پرست ہوتے ہیں۔ آؤ اندر تو چلیں۔"

اس نے بھاری دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔ اندر پہنچتے ہی سب سے پہلے غیر معمولی ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ ظہیر راہنمائی کرتا ہوا ہال کمرے سے گزر کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ ٹھوس اور سیاہ لکڑی کے بنے ہوئے بھاری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ چھت عام چھتوں سے دو گنی اونچی تھی۔ داہنی جانب بہت بڑا آتشدان بنا ہوا تھا۔ جس میں خشک لکڑیوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ظہیر نے آتشدان پر رکھی ہوئی لالٹین روشن کی اور پھر لکڑیوں پر تیل ڈال کر انہیں بھی آگ لگا دی۔

"اس حویلی میں کتنے کمرے ہیں؟" صفیہ کمرے کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔

"کبھی گننے کا اتفاق نہیں ہوا ایک درجن سے کم کیا ہوں گے!"

"معلوم نہیں کیا بات ہے۔ کمرے میں آتے ہی عجیب سا احساس ہونے لگا!" صفیہ صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جیسے کوئی دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہو۔"

ظہیر نے ہنس کر بات ٹال دی۔ حالانکہ وہ خود بھی ویسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا اور یہ بات اس کے لئے باعث حیرت تھی۔ وہ ایک بے فکرا اور رنگین مزاج رئیس تھا اس پر شاعرانہ قسم کی اداسی کبھی طاری نہیں ہوئی تھی لیکن آج پہلی مرتبہ اس نے گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کی تھی۔ جیسے کمرے کی فضا میں موت منڈلا رہی ہو۔ ا[illegible]

سے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نہیں مانتی یہاں کچھ اور بات معلوم ہوتی ہے۔ میں اس سے بھی پرانے مکانوں میں رہ چکی ہوں۔ تمہارا ملازم کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی چند باتیں میرے کان میں بھی پڑی تھیں۔"

"اس کا کہنا ہے کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔"

"اوہ نہیں۔" صفیہ کمرے کی دیواروں کو گھورتی ہوئی بولی۔

"کیا تم بھی روحوں پر یقین رکھتی ہو؟"

"یقین رکھتی ہو سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ روحوں سے کون انکار کر سکتا ہے؟"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن میری مراد ان روحوں سے ہے جو لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے قبرستانوں اور پرانے مکانوں میں بھٹکتی پھرتی ہیں اور جن کی طرف عجیب و غریب باتیں منسوب کی جاتی ہیں۔"

"دراصل روح کا لفظ اصطلاحاً کہا جاتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ مافوق البشر ہستیاں ایسی ضرور موجود ہیں جو غیر معمولی قوتوں کی حامل ہیں۔ انہیں جن بھوت یا روح وغیرہ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔" ظہیر نے کہا۔ "یہ سب جاہلوں اور توہم پرست لوگوں کی خیال آرائیاں ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان ہستیوں کی تصدیق ابھی کسی سائنسدان نے نہیں کی؟"

"خیر جو کچھ بھی ہے' میں اس جگہ پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حویلی ویرانے میں بنی ہوئی ہے۔ پھر برسوں سے خالی پڑی ہے اور اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بھی مشہور ہیں۔ تم ایسا کرو کہ ملازم کو کھانا تیار کرنے سے منع کر دو۔"

"عجیب بات کرتی ہو۔" ظہیر نے کہا۔ "ہم اس لئے یہاں آئے تھے کہ تنہائی میں بیٹھ کر کچھ راز و نیاز اور .... اور کچھ پیار و محبت کی باتیں کریں گے۔ یوں بھی تمہارا جلدی گھر جانا مناسب نہیں۔ تمہاری امی تو یہی سمجھ رہی ہیں کہ تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ آخری شو دیکھنے گئی ہو اور آخری شو رات کے بارہ بجے ختم ہوتا ہے۔ ہم یہاں سے ٹھیک گیارہ بجے روانہ ہوں گے اور سوا بارہ تک گھر پہنچ جائیں گے۔"

"اوہو' ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ فلم کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔ یا ٹکٹ نہیں ملا تھا۔ زیادہ سے زیادہ فالتو وقت کسی ہوٹل میں گزار سکتے ہیں لیکن اس ماحول سے مجھے

وحشت ہو رہی ہے۔"

"وحشت ماحول سے نہیں' ان باتوں سے ہو رہی ہے جو تم نے خواہ مخواہ چھیڑ دی ہیں۔ بس اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم بیٹھو میں ذرا ساتھ والے دو کمروں میں بھی لالٹین روشن کر دوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور قالین پر بے آواز چلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک کشادہ خوابگاہ تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ظہیر نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی بستر پر لیٹا ہوا ہو اور گہرے گہرے سانس لے رہا ہو۔ وہ ٹھٹکا اور جیب سے ماچس نکال کر تیلی روشن کی۔ کمرے میں پیلی سی روشنی تھرتھرانے لگی۔ تب اس نے دیکھا کہ ڈبل بیڈ کے عین وسط میں ایک سیاہ رنگ کی بڑی سی بلی سو رہی تھی۔ ظہیر کے چہرے پر خجالت آمیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس نے خود سے کہا۔ میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ خواہ مخواہ ڈر گیا تھا۔ اس نے لالٹین روشن کی اور بلی کو بھگانے کے لئے ہشت کیا۔ بلی نے اپنی چمکدار آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی میاؤں کی لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس نے یہ سوچ کر بلی کو کچھ نہیں کہا کہ وہ پالتو ہو گی۔ جب وہ واپس آیا تو صفیہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف پایا جاتا تھا۔

"یہ آواز کس کی تھی؟" اس نے پوچھا۔ "یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عورت درد سے کراہ رہی ہے۔"

"بلی تھی۔"

"ناممکن۔" صفیہ نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ "بلی نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں؟"

"تم نے دیکھا نہیں کہ حویلی کے باغ میں ایک پرندہ تک نظر نہیں آیا کہاں دیکھی تم نے بلی؟"

"خوابگاہ میں بستر پر لیٹی ہے۔ آؤ خود آ کر دیکھ لو۔" پھر وہ صفیہ کی راہنمائی کرتا ہوا خوابگاہ میں داخل ہوا اور بولا۔ "وہ دیکھو۔" لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہو گئی۔ کیونکہ اب وہاں بلی موجود نہیں تھی۔

"کہاں ہے بلی؟"

"ابھی ایک منٹ پہلے میں نے دیکھی تھی۔ شاید باہر نکل گئی ہے۔" صفیہ کمرے

میں نظر دوڑاتی ہوئی بولی۔

"یہاں تو باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوائے اس دروازے کے۔ اگر وہ یہاں سے باہر جاتی تو نظر آ جاتی۔"

"بخدا! میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ اس جگہ پر بیٹھی تھی۔ ایک منٹ' ابھی تصدیق ہو جاتی ہے۔" اس نے اس جگہ پر ہاتھ رکھا جہاں اس نے بلی کو بیٹھے دیکھا تھا۔ "ذرا یہاں ہاتھ لگا کر دیکھو۔ یہ جگہ ابھی تک گرم ہے۔" صفیہ نے بستر پر ہاتھ لگایا۔ وہ جگہ واقعی گرم تھی۔ تاہم اس نے مزید تصدیق کے لئے دوسری جگہ پر ہاتھ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر غایت درجہ حیرت نمودار ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی مختلف جگہوں پر ہاتھ لگا کر دیکھنے لگی۔ "اوہ میرے خدا!" اس نے کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "ظہیر! اس بستر پر ضرور کوئی انسان سویا ہوا تھا۔ یہ دیکھو' بستر یہاں سے لے کر یہاں تک گرم ہے۔ کوئی بلی اتنی جگہ نہیں گھیر سکتی۔"

ظہیر نے بستر پر ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر بھی حیرت نمودار ہو گئی۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف گیا اور اس کا بولٹ چیک کیا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکیاں اور روشندان بھی بند تھے۔ "اگر کوئی شخص بستر پر لیٹا ہوا تھا تو اسے کمرے کے اندر ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ کھڑکیاں اور دروازے بند ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ بلی کہاں چلی گئی۔"

اس نے لالٹین اٹھائی' پہلے بستر کے نیچے دیکھا۔ پھر لکڑی کی الماری میں اور پھر پردوں کے پیچھے' دیکھا۔ نہ تو سیاہ بلی کا پتا چلا اور نہ ہی اس پُراسرار شخص کا جو بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

"ظہیر آؤ یہاں سے نکل چلیں!" صفیہ اس کا بازو پکڑتی ہوئی بولی۔ "یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔"

"اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" ظہیر مٹھیاں بھینچتا ہوا بولا۔ "اگر روح والی بات سچ ہے تو میں ضرور اس سے ملاقات کروں گا۔" دونوں واپس نشست گاہ میں آ گئے۔ ظہیر کی پیشانی پر نظر آنے والی لکیروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

"صفیہ! تم یہیں ٹھہرو۔" اس نے کہا۔ "میں کار میں سے ایک چیز لے آؤں۔"

"کون سی چیز؟"

"کوئی خاص نہیں بس ابھی آیا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

باہر تاریکی گہری ہو گئی تھی۔ درختوں کے نیچے پُراسرار سناٹا طاری تھا۔ خشک پتے ان کے قدموں کے نیچے چرچرا رہے تھے۔ ظہیر نے کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور دستانوں کے خانے سے اعشاریہ بور کا پستول نکال لیا۔ صفیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اس کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ خاندانی دشمن بھی ہیں۔" ظہیر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ روحوں کا چکر انہوں نے چلایا ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس وقت کوئی شخص اس عمارت کے اندر ہو سکتا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تم نے پستول کیوں نکالا ہے؟"

"اوہو' تم خواہ مخواہ بات کو طول دے رہی ہو۔ انسان کو کسی وقت بھی اپنی حفاظت سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔"

"اللہ! میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اگر معلوم ہوتا کہ تم ایسی ویران جگہ پر مجھے لانا چاہتے ہو تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ آتی۔"

دونوں اندر آ کر بیٹھ گئے۔ ظہیر کو کرم علی کی بے موقع مداخلت پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ روحوں کا ذکر نہ چھیڑتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔ سارے رومانی موڈ کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ وہ بہت دنوں سے آج کی رات کا پروگرام بنا رہا تھا۔ صفیہ اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ دونوں کی دوستی کو صرف چند ہفتے ہوئے تھے۔ صفیہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد ایک چھوٹی سی ریڈیو الیکٹرک شاپ کے مالک تھے۔ واجبی سی آمدنی تھی۔ جس سے ان کی سفید پوشی برقرار تھی۔ چند ملاقاتوں کے بعد جب ظہیر نے صفیہ کو اپنی محبت کا یقین دلایا تو وہ اسے اپنی ماں سے ملانے لے گئی۔ ماں نے بظاہر بیٹی کو برا بھلا کہا لیکن دل میں خوش ہوئی کہ چلو بیٹھے بٹھائے بیٹی کے رشتے کا مسئلہ حل ہو گیا اور لڑکا بھی لاکھوں میں ایک رئیس ابن رئیس۔ رنگ روپ' حسن دولت اور عزت آبرو والا۔ اگر وہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈتی تو ایسا بر نہ ملتا۔

اس کے بعد ظہیر آزادی کے ساتھ ان کے گھر آنے جانے لگا۔ چند ہی دنوں کے اندر اس نے تحفے دے کر گھر کے ہر فرد کا دل موہ لیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے صفیہ کے ساتھ محبت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کے خیال میں محبت صرف وہ لوگ کرتے

ہیں جن کے پاس بجز دل کی دولت کے اور کچھ نہیں ہوتا اور آج وہ اپنے تحفوں کی قیمت وصول کرنے صفیہ کو قصر سنبل میں لایا تھا اور وہ آسانی کے ساتھ شکست ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ نو بجے کرم علی کھانا لے کر آ گیا۔ ظہیر نے پوچھا۔ "کرم علی! کیا تم نے کوئی بلی پال رکھی ہے؟"

"نہیں جی' میرے پاس کوئی بلی نہیں ہے۔ اس علاقے میں کبھی کوئی بلی نظر نہیں آئی۔ کیا آپ کو پالتو بلی کی ضرورت ہے؟"

"نہیں' تھوڑی دیر پیشتر میں نے خوابگاہ میں ایک سیاہ بلی دیکھی تھی۔ پھر پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی؟"

"جی' کیا کہا سیاہ بلی!" کرم علی کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کچھ اور دیکھا ہو گا سرکار! مجھے یہاں بیس برس ہو گئے ہیں۔ میں نے تو کبھی کوئی بلی نہیں دیکھی۔"

"مجھ سے دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بلی دیکھی تھی۔ خیر کوئی ایسی حیرت کی بات بھی نہیں' ہو سکتا ہے کہ کہیں سے راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلی ہو۔"

تاہم وہ خود بھی اپنی بات سے مطمئن نہیں تھا۔ ایک منٹ پہلے اس نے بلی کو بستر پر لیٹے دیکھا تھا اور دوسرے ہی منٹ وہ غائب ہو چکی تھی۔ پھر بستر کا گرم ہونا بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چونکہ وہ کوئی مافوق البشر توجیہہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس لئے اس کے ذہن میں ایک ہی بات آئی تھی اور وہ یہ کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے جس میں کرم علی بھی شامل ہو سکتا تھا۔

کھانے کے بعد جب کرم علی برتن لے کر واپس چلا گیا تو ظہیر نے بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ پھر اندر آ کر نشست گاہ کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ صفیہ واپس چلنے پر اصرار کرنے لگی لیکن اس نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے شراب کی بوتل اور دو گلاس نکال لئے۔

"یہ کیا!" صفیہ دنگ رہ گئی۔

"یہ غم غلط کرنے والا ٹانک ہے۔"

"ظہیر!" صفیہ چلائی۔ "کیا تم شراب بھی پیتے ہو؟"

"بہت قدامت پسند معلوم ہوتی ہو۔" ظہیر اس کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔ "شراب تو [illegible] سے ڈرتی ہو' جیسے [illegible] تمہیں [illegible] دیکھا ہے۔ آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ آج ہم [illegible]

کر سکیں گے۔" صفیہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "ظہیر! میں اپنے آپ کو تمہاری امانت سمجھتی ہوں۔ میں مکمل تمہاری ہوں۔ کیا تم کچھ دن صبر نہیں کر سکتے؟"

"انسان کئی دن کا بھوکا ہو اور سامنے گرما گرم کھانا رکھا ہو' تو پھر صبر نہیں ہو سکتا۔ آ جاؤ' آج کی رات بہک جانے دو۔" وہ اٹھا اور آگے بڑھ کر صفیہ کو بازوؤں میں دبوچنے کی کوشش کی لیکن صفیہ مچل کر نکل گئی۔ "میرے دل میں تمہارے لئے بہت احترام ہے ظہیر!" اس نے کہا۔ "مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور نہ کرو۔"

ظہیر نے قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر صفیہ کو دوبارہ پکڑ لیا۔ اس دفعہ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

"ذلیل' وحشی!" صفیہ چلائی۔ "چھوڑ دو مجھے' چھوڑ دو ورنہ میں چیخنا شروع کر دوں گی۔"

"کر دو شروع' انتظار کس بات کا ہے۔ ان دیواروں کے سوا کوئی تمہاری چیخیں نہیں سن سکتا۔"

صفیہ پوری طاقت سے ہاتھ پیر مارنے لگی لیکن اس مچھلی کی طرح بے بس تھی۔ جو جال میں پھنس چکی ہو۔

"خدا کے لئے چھوڑ دو' آرام سے بات کرو۔"

"چلو آرام سے بات کر لیتے ہیں۔" ظہیر نے کہا۔ "لیکن اپنی طاقت ضائع نہ کرو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔" ظہیر نے اسے صوفے پر بٹھا دیا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ صفیہ نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی' مگر اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ "اگر تم طاقت استعمال کرو گی تو مجھے بھی طاقت استعمال کرنی پڑے گی۔"

صفیہ نے بے چارگی کے ساتھ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر بولی۔ "ظہیر! تم چاہتے کیا ہو؟"

"بعض خواہشوں کا اظہار مناسب الفاظ میں نہیں ہوتا ویسے تم میرا مدعا سمجھ چکی ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی پست ذہنیت کے انسان ہو۔"

"اچھے ڈائیلاگ بول لیتی ہو۔ جب میں تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو قیمتی تحفے لا کر دیتا تھا تو اس وقت تو تم نے کبھی یہ بات نہیں کی تھی۔"

"وہ تم اپنی خوشی سے لا کر دیتے تھے۔"

"اب بھی میں اپنی خوشی کر رہا ہوں۔ کیا تم صرف تحفے لیتے وقت دوسروں کی خوشی کا خیال رکھتی ہو؟ یہ تو بڑی خود غرضی ہے۔"

"ظہیر! خدا کے لئے ہوش میں آؤ' ورنہ مجھے کبھی نہیں پا سکو گے۔"

ظہیر نے قہقہہ لگایا۔ "تم لڑکیاں بھی بڑی جلدی خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہو۔ تمہیں تھوڑا سا حقیقت پسند ہونا چاہئے۔ ذرا سوچو۔ میں ایسی لڑکی کو کس طرح اپنی شریک حیات بنا سکتا ہوں جو بغیر کسی رشتے کے میرے ساتھ یہاں تک چلی آئی ہے۔ ویسے ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی۔"

"اف ظہیر! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارے خیالات اتنے گھٹیا ہو سکتے ہیں۔ یقین رکھو آج کے بعد تم میری شکل نہیں دیکھ سکو گے۔"

اس نے ایک بار پھر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔

"اگر میں تمہاری شکل نہ دیکھ سکا تو پھر کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا۔" ظہیر نے کہا۔ اس کے لہجے میں دھمکی پائی جاتی تھی۔ "تم اس قابل ہی کہاں رہو گی کہ کسی کو شکل دکھا سکو!"

صفیہ کا دل ڈوب گیا۔ ظہیر اپنی اصلیت کے ساتھ کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ گویا وہ شروع سے اسے بے وقوف بناتا رہا تھا۔ اب یہ بھی امید نہیں رہی تھی کہ وہ اسے اپنا کر بدنامی کا داغ دھو ڈالے گا۔ کشمکش کرتے ہوئے دونوں قالین پر گر گئے۔ عین اس وقت ان کے کانوں میں کسی عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ آواز اتنی واضح تھی کہ دونوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو۔

"یہ آواز کیسی ہے؟" صفیہ نے کہا۔

ظہیر نے صفیہ کو چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا اس کا ہاتھ خود بخود پستول والی جیب میں پہنچ گیا تھا۔ کراہٹ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ انتہائی دردناک آواز تھی۔ جیسے کوئی عورت درد زہ میں مبتلا ہو۔ کبھی وہ آواز مدھم ہو جاتی اور کبھی تیز۔ سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ خوابگاہ سے آ رہی تھی۔ صفیہ بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر دہشت نظر آ رہی تھی۔ ظہیر نے پستول نکال لیا اور آہستہ آہستہ خوابگاہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ صفیہ نے لاشعوری طور پر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"رک جاؤ ظہیر!" اس نے کہا۔ "یہ انسانی آواز نہیں ہے۔"

"تم فکر نہیں کرو صفو!" ظہیر اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ "اندر جو کوئی بھی ہے میرے

ہاتھ سے نہیں بچ سکتا۔" کتنی عجیب بات تھی۔ ایک بڑے خطرے کو دیکھ کر دونوں آپس کی نفرت بھول گئے تھے۔ ظہیر نے جیسے ہی خوابگاہ کے دروازے میں قدم رکھا' آواز بند ہو گئی۔ کمرے میں لالٹین کی روشنی مدھم ہو گئی تھی اور بستر خالی پڑا تھا۔

"کون ہے؟" ظہیر گرجا۔ "جو کوئی بھی ہے سامنے آ جائے ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔" اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ اس نے لمحہ بھر انتظار کرنے کے بعد نادیدہ دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لئے ایک ہوائی فائر کر دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ صفیہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

"ظہیر! یہاں کوئی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "کرم علی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ کسی بھٹکی ہوئی روح کا مسکن ہے اور تم روح کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"روح وغیرہ سب فراڈ ہے۔" ظہیر غرایا۔ "آج میں اس فراڈ کا راز فاش کر کے رہوں گا۔" وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ پستول والا ہاتھ نصف دائرے کی شکل میں دائیں بائیں گھوم رہا تھا۔ انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ ظہیر نے ایک ایک کر کے کمرے کا کونا کونا چھان مارا۔ انسان تو کجا کوئی بلی کا بچہ بھی نظر نہیں آیا۔ بالآخر اس نے باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول کر دیکھا۔ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا اور اجڑا ہوا باغ پُراسرار سکوت میں لپٹا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا پتوں میں سرسراہٹ پیدا کرتی گزر رہی تھی' درخت اور پودے کسی مجبور کی طرح اداس کھڑے تھے۔

"کوئی ہے؟" ظہیر نے آواز لگائی۔ "کرم علی!"

اس کی آواز رات کے سناٹے میں تحلیل ہو گئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ کوئی شخص اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دفعتاً رات کا سناٹا کسی بچے کے رونے کی آواز سے درہم برہم ہو گیا۔ وہ آواز کسی نوزائیدہ بچے کی آواز سے ملتی جلتی تھی اور حویلی کے اندر سے آ رہی تھی۔ صفیہ کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔

"اوہ' کوئی بچہ رو رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"نہیں' یہ کسی بلی کی آواز ہے۔" ظہیر نے کہا۔ "بلی جب روتی ہے تو اس کی آواز بچے کی سی لگتی ہے۔"

آواز بڑی واضح اور پُر سوز تھی۔

"غالباً یہ وہی بلی ہے جسے تم نے بستر پر بیٹھے دیکھا تھا۔"

"یقیناً وہی ہو گی' پستول کی آواز سن کر ڈر گئی ہے۔"

دونوں اندر آ گئے۔ ظہیر نے دروازہ بند کیا لیکن گھبراہٹ میں بولٹ لگانا بھول گیا اور خوابگاہ سے ہوتا ہوا نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ صفیہ نے اس کی تقلید کی۔ بچے کے رونے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ پھر جیسے ہی ان کی نظر آتشدان میں جلتے والی آگ پر پڑی' ان کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ انتہائی پُرہیبت اور ناقابلِ یقین تھا۔

شعلوں کے اندر ایک نوزائیدہ بچہ دونوں ہاتھ پھیلائے رو رہا تھا۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر دونوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ بت کی مانند اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ انہیں ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ظہیر!" ایک طویل وقفے کے بعد صفیہ کے منہ سے مدھم آواز نکلی۔ "کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟ مجھے شعلوں میں ایک بچہ نظر آ رہا ہے۔"

ظہیر تھوک نگلتا ہوا بولا۔ "ہم .... میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ شش .... شاید ہم اجتماعی فریب نظر کا شکار ہو گئے ہیں۔ کسی نے .... ہم پر جادو کر دیا ہے۔ شاید........"

اس لمحے ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی وہ بچہ آگ سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ظہیر کی طرف بڑھا۔ صفیہ نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے اور ہسٹریائی انداز میں چیخی۔ ظہیر نے اپنی پوری زندگی میں اتنی دہشت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے دوڑنا چاہا مگر ٹانگوں نے اس کے ارادے کا ساتھ نہیں دیا۔ بچہ کسی سحرزدہ مخلوق کی مانند اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے اور چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ معاً کمرے کی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج گئی۔ ظہیر نے بچے پر اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ دو گولیاں بچے کے جسم میں پیوست ہو گئیں اور تین خطا ہو گئیں لیکن اس مافوق البشر اور پُرہیبت بچے پر گولیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ رہا تھا۔ پستول کی گولیاں ختم ہو گئیں اور ایک ناقابلِ بیان دہشت نے ظہیر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ برآمد ہوئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ زندگی کے ان آخری لمحات میں اسے نادیدہ ہستیوں کے بارے میں سنی ہوئی تمام باتوں پر یقین آ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ قالین پر گر گیا۔ پھر گرتے ہی سربجود ہو کر

خلوص دل سے خدا کو پکارنے لگا' توبہ کرنے لگا' اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا لیکن موت سامنے ہو تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

وہ پُراسرار بچہ ظہیر کے اوپر چڑھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کی آہنی گرفت شکنجے کی مانند تھی۔ چند لمحوں بعد یہ خونی ڈرامہ ختم ہو گیا۔ ظہیر مر چکا تھا اور صفیہ قالین پر بے ہوش پڑی تھی۔ کمرے کی فضا گرم تھی اور آتشدان سے لکڑیوں کے چٹخنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ اب وہاں نہ کوئی بچہ تھا' نہ چیخوں کی آواز۔

گولیوں کی آواز سن کر بوڑھا کرم علی دوڑتا ہوا حویلی میں پہنچا۔ اسے اندر داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ کیونکہ خوابگاہ کا دروازہ کھلا تھا۔ ظہیر کی لاش دیکھ کر اس نے پُرتاسف انداز میں سر ہلایا۔ کاش' یہ خودپسند احمق نوجوان اس کے مشورے پر سنجیدگی سے غور کرتا لیکن جس بات کا اوپر فیصلہ ہو چکا ہو اسے کون ٹال سکتا ہے۔ اس نے پہلے ظہیر کا خالی پستول اٹھایا پھر ہلکی پھلکی صفیہ کو اٹھا کر بازوؤں پر ڈال لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ظہیر کے والد ملک ناظم الدین جوان بیٹے کی لاش کے پاس کسی لڑکی کی موجودگی کی تشہیر پسند نہ کریں گے۔ یقیناً اس لڑکی نے بھی وہی منظر دیکھا ہو گا جو ظہیر کے ساتھ آنے والی لڑکی نے دیکھا تھا۔ لہٰذا اس کا منہ بند رکھنا ضروری تھا۔

☆------☆------☆

سردی اپنے عروج پر تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور سورج غروب ہوتے ہی ماحول پر تاریکی چھا گئی تھی۔ باہر یخ کر دینے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ڈاکٹر عذرا گل نے آخری مریضہ کو رخصت کیا اور نرس کو بلا کر کہا کہ اب وہ کسی مریض کو اندر نہ بھیجے۔ پھر وہ ٹرے میں رکھی ہوئی ڈاک دیکھنے لگی۔ پہلا خط اس کی بیوہ ماں کی طرف تھا۔ خط پڑھ کر اس کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کی ماں نے لکھا تھا کہ لڑکے والے شادی کی تاریخ کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔ اس لئے کم از کم ایک مہینے کی چھٹی لے کر وہ فوراً لاہور پہنچ جائے تاکہ وہ اس فریضے سے سبکدوش ہو سکے۔ عذرا نے دوسرا خط اٹھایا تو اس کی مسکراہٹ مزید کشادہ ہو گئی۔ وہ اس کے منگیتر کیپٹن شاہ نواز کی طرف سے تھا۔ اس نے خط کھول کر جلدی جلدی چند سطریں پڑھیں اور پھر اسے تہہ کر کے پرس میں رکھ دیا۔ شاہ نواز کا خط وہ ہمیشہ اپنی رہائش گاہ پر جا کر کمرے میں بند ہو کر پڑھتی تھی اور یوں بھی وہ خاصا طویل خط تھا اور چند منٹوں میں نہیں پڑھا جا سکتا تھا۔ تیسرے خط میں اس کے لئے مزید خوشخبری تھی۔ وہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی

طرف سے تھا۔ اس خط کے مطابق نہ صرف ایک ماہ کی چھٹی منظور کر لی گئی تھی بلکہ اس کا تبادلہ بھی لاہور کر دیا گیا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد اس نے حساب لگایا کہ اسے عادل نگر کے اس چھوٹے سے ہسپتال میں پورے سات ماہ ہو چکے تھے۔ اسے جون میں ایک فوری حکم نامے کے تحت عادل نگر بھجوا دیا گیا تھا۔ اس نے اس تبادلے پر بہت احتجاج کیا تھا مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس نے عادل نگر پہنچ کر چارج سنبھال لیا اور ساتھ ہی واپس تبادلے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جب میٹرک میں پڑھتی تھی تو باپ کا انتقال ہو گیا۔ گو اس کے رشتہ دار خاصے صاحب حیثیت لوگ تھے۔ مگر کسی نے دست تعاون نہیں بڑھایا بلکہ اکثر نے اس کی ماں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسے اپنی بیٹی کی تعلیم ختم کر کے شادی کر دینی چاہئے۔ جوان بیٹی کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو تو وہ غلط راستوں پر چل نکلتی ہے لیکن اس کی ماں نے رشتہ داروں کے مشوروں کی پرواہ نہیں کی اور اس کی تعلیم جاری رکھی۔ اس کے لئے اسے بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے پہلے زیور بیچا' پھر جائیداد کا کچھ حصہ فروخت کیا۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں سے قرض بھی لیا جو عذرا کے باپ کی زندگی میں ان کے برابر بیٹھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر اس کی قربانیاں رنگ لائیں اور عذرا نے ایم بی بی ایس پاس کر لیا۔

عذرا کو چھٹی ملنے کی اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے فوراً لاہور جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس نے نرس کو بلا کر بتایا کہ اس کی چھٹی منظور ہو گئی ہے اور وہ فوراً لاہور جانا چاہتی ہے۔

"اس وقت تو آپ کو کوئی ٹرین نہیں ملے گی؟" نرس نے کہا۔ "پھر آپ نے چارج بھی تو نہیں دیا۔"

"چارج کی فکر نہیں کرو۔ وہ تو میں آدھے گھنٹے میں دے دوں گی۔"

"ایک ٹرین رات کے ڈیڑھ بجے تک جاتی ہے۔" نرس نے کہا۔ "لیکن میں آپ کو اتنی سردی میں سفر کرنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ کل صبح چلی جائیں۔ پہلی ٹرین آپ کو گیارہ بجے ملے گی اور شام پانچ بجے تک لاہور پہنچا دے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ رات ڈیڑھ بجے والی ٹرین صبح ساڑھے سات بجے لاہور پہنچا دے گی۔ میں اسی ٹرین پر جاؤں گی۔ تم ایسا کرو کہ کسی کو بھیج کر میرے لئے فرسٹ کلاس

میں ایک سیٹ بک کروا دو۔" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھتی ہوئی بولی۔ "ساڑھے چھ بج رہے ہیں' میں چل کر اپنا سوٹ کیس پیک کر لوں۔" وہ ہسپتال کی رہائش گاہ میں مقیم تھی جو وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا' رات کا کھانا کھایا اور چائے کی پیالی لے کر وہ اپنی خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ اسے شاہنواز کا خط پڑھنے کی جلدی تھی۔ ابھی اس نے خط پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ "ضرور کوئی ایمرجنسی کیس ہو گا۔" وہ بڑبڑائی اور ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر عذرا گل؟"

"جی فرمایئے۔"

"کیا آپ اس وقت فارغ ہیں؟" اجنبی نے پوچھا۔

"اگر آپ کسی مریض کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر جمال سے بات کریں اور یوں بھی کل سے میری چھٹی شروع ہو گئی ہے؟"

"ڈاکٹر جمال میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" اجنبی نے کہا۔ "مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ کیا اس اسپتال میں کوئی اور لیڈی ڈاکٹر بھی ہے؟"

"لیڈی ڈاکٹر تو اور کوئی نہیں ہے۔ کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

"ڈلیوری کیس ہے اور زچہ کی حالت بہت نازک ہے۔"

"کیا آپ نے پہلے سے کسی ڈاکٹر کا انتظام نہیں کیا تھا؟"

"انتظام تو کیا تھا لیکن آج اس لیڈی ڈاکٹر کی اپنی طبیعت خراب ہے۔ وہ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتی۔" اجنبی نے کہا۔

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔ میرا آنا تو بہت مشکل ہے۔"

"میں نے فون کرنے سے پیشتر ڈرائیور کو گاڑی دے کر آپ کی طرف بھیج دیا تھا۔" اجنبی عذرا کی بات نظرانداز کرتا ہوا بولا۔ اس کا طرز تکلم ظاہر کرتا تھا کہ وہ دوسروں کو حکم دینے کا عادی تھا۔

"وہ پہنچنے ہی والا ہو گا۔"

"دیکھئے' میں مجبور ہوں۔ میں آج رات کی ٹرین سے لاہور جا رہی ہوں۔"

اجنبی نے ایک بار پھر اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ "میں نے ڈرائیور کے ہاتھ ایک ہزار روپے بطور پیشگی بھجوائے ہیں مزید رقم کیس کے بعد پیش کر دوں گا۔"

"کک .... کیا کہا؟" عذرا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "آپ نے کتنے پیسے بھیجے ہیں؟"

"ایک ہزار روپے۔" اجنبی نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ عذرا دیکھے بغیر بتا سکتی تھی کہ اجنبی یہ بات کہتے ہوئے پُرتمکنت انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "اور مزید ایک ہزار روپے کیس کے بعد۔"

دو ہزار روپے عذرا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چند گھنٹوں کی محنت کا معاوضہ دو ہزار روپے۔

اتنی بڑی رقم سے اس کی شادی کے تمام جوڑے تیار ہو سکتے تھے۔ پھر فوراً ہی وہ بھنویں سکیڑ کر سوچنے لگی۔ اتنی بڑی رقم کوئی یونہی نہیں دیتا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گی۔ کوئی کنواری ماں بننے والی ہو گی۔

"ہیلو ڈاکٹر!" اس کے کان میں اجنبی کی آواز آئی۔ "میں سمجھتا ہوں آپ نے میری مدد کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اپنا سامان بھی گاڑی میں رکھ لیں اور یہیں سے سیدھی سٹیشن چلی جائیں۔ ڈرائیور آپ کو پہنچا دے گا۔"

"میں آپ کے خیال میں کتنی دیر میں فارغ ہو جاؤں گی؟"

"مجھے اس قسم کے معاملات کا کوئی تجربہ تو نہیں ہے لیکن زچہ کی حالت دیکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین گھنٹے میں کام ختم ہو جائے گا۔"

عذرا گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ "تو پھر سامان رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹرین رات کے ڈیڑھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ اگر میں دس بجے تک فارغ ہو گئی تو واپس آ کر تھوڑا سا آرام کر لوں گی۔"

"بہت خوب!" اجنبی نے کہا۔ "تو گویا آپ آ رہی ہیں۔ اس معاملے میں آپ کو چھوٹی سی زحمت کرنا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"آپ کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں تک آنا پڑے گا۔" عذرا نے آنکھیں جھپکائیں۔ گویا اس کا خدشہ صحیح تھا۔

"یہ تو آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں۔"

"دیکھیں جی' غلطیاں انسان ہی سے تو ہوتی ہیں۔ ہم عزت دار لوگ ہیں اور معاملے کی تشہیر نہیں چاہتے۔ میں جو دو ہزار روپے فیس آپ کو دے رہا ہوں' وہ بھی اسی سبب

ہے۔ جو ہو چکا ہے اس کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا لیکن کم از کم ہم پردہ پوشی تو کر سکتے ہیں۔"

اسی لمحے ایک خادمہ کمرے میں آئی اور ایک بند لفافہ عذرا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لفافہ ایک صاحب نے دیا ہے' وہ گیٹ پر کھڑے ہیں۔" عذرا نے لفافہ لے کر خادمہ کو رخصت کر دیا اور فون میں بولی۔

"غالباً آپ کا ڈرائیور پہنچ گیا ہے۔ اس نے ایک لفافہ اندر بھیجا ہے۔"

"خوب! اس لفافے میں ایک ہزار روپے ہیں۔ اب آپ جلدی سے آ جائیں۔ زچہ کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔"

عذرا نے فون بند کر دیا اور لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں سو سو روپے کے دس نوٹ تھے۔ اس نے نوٹ پرس میں رکھے۔ دوائیوں کا بیگ تیار کیا اور کندھوں پر شال ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گیٹ کے پاس درختوں کے سائے میں ایک سیاہ مرسڈیز کار کھڑی تھی۔ کار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک درمیانے قد کا شخص کھڑا تھا۔ اس نے سر اور منہ پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔

"لفافہ تم نے اندر بھجوایا تھا؟"

"آہو جی ڈاکٹر صاحب!" ڈرائیور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتا ہوا بولا۔ "تشریف رکھو۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"یہ بات نہ پوچھو جی' صاحب نے منع کیا ہے اور ہاں جی صاحب نے آپ کے ساتھ فون پر بات کی ہے؟"

"ہاں' انہوں نے بات کی۔"

"تو پھر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لو جی!" ڈرائیور ایک سیاہ کپڑا اسے دیتا ہوا بولا۔ "صاحب بڑے رئیس آدمی ہیں' آپ کو خوش کر دیں گے' جی!"

عذرا نے کچھ تامل کرتے ہوئے کپڑا آنکھوں پر باندھ لیا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی روانہ ہوتے ہی اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں یہ سب کچھ فریب نہ ہو۔ یہ شخص اسے اغوا نہ کر لے۔ کیسی حماقت ہو گئی۔ اس نے فون کرنے والے سے نام بھی نہیں پوچھا تھا۔

"ڈرائیور!" اس نے کہا۔ "تمہارے صاحب کا نام کیا ہے؟"

"او جی نام میں کیا رکھا ہے؟"

"کم از کم مجھے یہ تو پتا چلے کہ کس شخص کے پاس جا رہی ہوں۔"

"صاحب نے منع کیا تھا جی' نام بتانے سے۔ ویسے آپ کوئی فکر نہیں کریں جی' صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

عذرا خاموش ہو گئی۔ گاڑی چلتی رہی۔ شروع میں عذرا نے سمتوں کا تعین کرنے کی کوشش کی مگر گاڑی نے اتنے موڑ کاٹے کہ وہ بالکل الجھ کر رہ گئی۔ غالباً ڈرائیور دانستہ چکر دے رہا تھا۔ تاکہ وہ کوئی حساب نہ رکھ سکے۔ پندرہ منٹ بعد اس نے محسوس کیا کہ گاڑی کسی ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ کیونکہ آس پاس کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اگلے پندرہ بیس منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر کار کی رفتار کم ہو گئی عذرا نے اندازہ لگایا کہ کار کسی نیم پختہ سڑک پر مڑ گئی تھی۔ کیونکہ نہ صرف جھٹکے لگ رہے تھے۔ بلکہ گرد بھی اڑ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد کار رک گئی۔ انجن بند ہو گیا اور ماحول پر گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔

"لو جی پہنچ گئے!" ڈرائیور نے کہا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ "اب آپ آنکھوں سے کپڑا اتار دیں جی!"

عذرا نے کپڑا کھول دیا اور شال سنبھالتی ہوئے باہر آ گئی۔ اس کے سامنے تاریکی میں لپٹی ہوئی ایک پرانی وضع کی حویلی تھی۔ آس پاس کسی آبادی کے نشان نہیں تھے۔ حویلی کی دو کھڑکیاں روشن تھیں اور اندر سے کسی عورت کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ آواز سن کر عذرا نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اس کے وسوسے صحیح نہیں تھے۔ ایک عورت واقعی اس کی منتظر تھی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا جی۔ صاحب نے زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا تھا۔"

"تمہارے صاحب کدھر ہیں؟"

"آپ ادھر سے اندر چلی جائیں۔ صاحب اندر ہی ہیں۔ میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ ابھی تو آپ کو واپس بھی چھوڑنے جانا ہے۔" پھر اس نے بیگ نکال کر عذرا کو تھما دیا۔ "یہ لیں جی اپنا بیگ!" عذرا نے دیکھا کہ عمارت کی دو کھڑکیاں روشن تھیں۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سامنے

جیسے ہی عذرا نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب!" اس نے پیچھے دیکھے بغیر کہا تھا۔ عذرا نے اندازہ لگایا کہ وہ چہرہ نہیں دکھانا چاہتا۔ اس نے قراقلی ٹوپی اور سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی۔ وضع قطع سے کوئی خاندانی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ آواز وہی تھی جو عذرا ٹیلی فون پر سن چکی تھی۔

"اس طرف آجائیں!" وہ عذرا کی راہنمائی کرتا ہوا سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نشست گاہ تھی۔ آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور کمرہ خوب گرم تھا۔ خاصا کشادہ کمرا تھا۔ ملحقہ کمرے سے آنے والی آوازیں ہونے والی ماں کے کراہنے کی تھیں۔ "آپ کی مریضہ اس کمرے میں ہے!" اس کا میزبان بائیں طرف کے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "اندر چلی جائیں!" حسب سابق اس نے اپنا منہ دوسری طرف رکھا تھا۔

"کیا یہاں کوئی عورت نہیں ہے؟" عذرا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟"

"آپ کے لیے ہمارا نام جاننا ضروری نہیں ہے۔ ویسے آپ ہمیں رئیس کہہ کر مخاطب کر سکتی ہیں!" اس کا انداز تحکمانہ اور بڑی حد تک ذلت آمیز تھا۔ عذرا خاموشی سے دروازہ کھول کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ ایک وسیع خواب گاہ تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا۔ آتشدان کے اوپر لالٹین جل رہی تھی۔ بستر پر ایک دبلی پتلی لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ تکلیف کی وجہ سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔ عذرا کو دیکھتے ہی اس نے سیاہ شال سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ عذرا نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور اندر سے ضروری سامان نکال کر لڑکی کا معائنہ کرنے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" عذرا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں بہت بری لڑکی ہوں۔"

"یہ اچھی بات ہے!" عذرا نے کہا۔ "تمہیں اپنی برائی کا احساس تو ہے۔ وہ شخص جو

نے بھی چھپایا ہے۔" پھر وہ لڑکی کی ٹانگوں کو صحیح پوزیشن میں کرتی ہوئی بولی۔

"اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دو۔ ذہن کو پُر سکون رکھنے کی کوشش کرو اور ہاں یہ شال منہ سے ہٹا دو تاکہ سانس لینے میں آسانی ہو!"

"نہیں' نہیں ڈاکٹر! میرے منہ کو چھپا ہی رہنے دو۔" لڑکی چلائی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ دیے۔ "میرا منہ دیکھنے کے قابل نہیں ہے۔"

"مجھے اپنا ہمدرد سمجھو۔ میں آج لاہور جا رہی تھی لیکن صرف تمہاری وجہ سے یہاں آگئی ہوں۔ اگر تمہیں برا سمجھتی تو تمہاری مدد پر تیار نہ ہوتی!"

"مجھے مجبور نہیں کرو ڈاکٹر!"

"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی مجبور نہیں ہوں۔ تم کسی اور ڈاکٹر کا انتظام کر لو۔"

"اوہ نہیں ڈاکٹر' خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہیں جانا۔ درد کی وجہ سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

"اپنے منہ سے شال ہٹا دو۔" ڈاکٹر عذرا نے حکم دیا۔ "ورنہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

لڑکی نے قدرے تذبذب کے بعد شال ہٹا دی۔ عذرا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بمشکل سولہ سترہ برس کی نازک سی لڑکی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ "اوہ میرے خدا! تم تو بہت چھوٹی ہو۔ یہ تم نے کیا کر ڈالا۔ کیا تمہارے ماں باپ کو اس بات کا علم ہے؟"

"مم......... ماں کو ہے باپ کو نہیں!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ڈاکٹر!" دروازے کی طرف سے رئیس کی گونجدار آواز سنائی دی۔ "حد سے زیادہ تجاوز نہیں کریں۔ آپ کو جس کام کی فیس دی جا رہی ہے صرف وہ کام کریں۔ نجی نوعیت کے سوالات نہیں کریں۔ ایسی معلومات آپ کی سلامتی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں!"

ڈاکٹر عذرا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ رئیس دروازے میں دوسری طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ اس کی گردن حسب معمول تنی ہوئی تھی۔ عذرا نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد کمرے میں ایک خوب صورت بچے کا اضافہ ہو

نازک سے پھول کو نہایت احتیاط کے ساتھ کپڑے میں لپیٹا اور دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ اس وقت کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی اور رئیس آتش دان کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ سامنے کی دیوار پر اس کا دیو ہیکل سایہ شعلوں کے بھڑکنے کی وجہ سے عجیب انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ اس نے عذرا کے ہاتھ سے بچہ لیا اور چند لمحوں تک آتشدان میں بھڑکنے والے شعلوں کو گھورتا رہا۔ اچانک وہ دو قدم آگے بڑھا اور بچے کو کسی ناکارہ شے کی مانند آتشدان میں اچھال دیا۔ یہ بہیت منظر دیکھ کر عذرا کے رگ و پے میں ناقابل بیان دہشت طاری ہو گئی۔ آواز حلق میں اٹک گئی۔ آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اور جسم کسی بت کی مانند ساکت ہو گیا۔

آگ میں پڑتے ہی بچے کے جسم پر لپٹا ہوا کپڑا جلنا شروع ہو گیا۔ کپڑا جلتے ہی وہ نرم و نازک بچہ حیرت انگیز انداز میں سیدھا ہوا اور دونوں ہاتھ سامنے پھیلا دیے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی چلتا ہوا باہر آجائے گا لیکن نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ آگ کی تپش کے سبب اس کے پٹھوں میں کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ سیدھا ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کا گوشت جلنے لگا اور ہڈیاں نمایاں ہونے لگیں۔

"یہ رہی آپ کی بقایا فیس!" رئیس عذرا کے ہاتھ پر نوٹوں کی گڈی رکھتا ہوا بولا۔ "اور یاد رکھیں میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اگر آپ نے یہاں پیش آنے والے واقعات کا کسی سے ذکر کیا تو آپ خود اپنی موت کو دعوت دیں گی۔ اس علاقے کی پولیس اور انتظامیہ میری مٹھی میں ہے اور ہاں جب آپ فارغ ہو جائیں تو ڈرائیور کو خبر کر دیں۔ وہ آپ کو واپس چھوڑ آئے گا۔" پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوا اور زور دار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا کمرے میں گوشت جلنے کی سڑاند پھیلنے لگی۔ ڈاکٹر عذرا نے ایک جھرجھری لی اور بوجھل قدموں سے خواب گاہ کی طرف چل پڑی۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔ وہ اسے تاقیامت نہیں بھول سکتی تھی۔ اس نے دل میں عہد کیا کہ وہ اس بچے کا انتقام ضرور لے گی۔ خواہ اسے پوری زندگی کیوں نہ انتظار کرنا پڑے۔

خواب گاہ میں ایک حیرت انگیز منظر اس کا منتظر تھا۔ بچہ بدستور لڑکی کی ٹانگوں کے پاس موجود تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں لیکن فوراً ہی اس پر حقیقت منکشف ہو گئی۔ لڑکی نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا اور جب وہ بچے کو لے کر رئیس کے پاس چلی [illegible]

اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "دیکھو' میری بات سنو۔" اس نے لڑکی سے سرگوشی میں کہا۔ "اس وحشی نے تمہارے ایک بچے ہلاک کر دیا ہے لیکن میں اس بچے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہونے دوں گی۔ کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے؟"

لڑکی نے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

بچے کی ہلاکت کی خبر سن کر اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں ظاہر ہوئی تھی۔ نہ اسے اس بات کی کوئی پروا تھی کہ اس کے دوسرے بچے کا کیا حشر ہو گا' اسے صرف اس بات کی فکر تھی کہ کسی طرح وہ اس بحران سے نکل جائے۔

"کیا تم اپنی ماں کا پتا بتا سکتی ہو؟" ڈاکٹر عذرا نے پوچھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ بچہ کہیں رونا نہ شروع کر دے!

"نہیں ڈاکٹر صاحب' اس بچے کو میری ماں کے پاس لے کر نہیں جائیں۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں گی!"

"کم از کم مجھے اس بچے کے باپ کا نام تو بتا دو!"

"آپ اسے دیکھ چکی ہیں۔"

"لیکن اس نے اپنا نام نہیں بتایا!"

"اس نے نام بتانے سے منع کیا تھا۔"

"میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ خدا کے لیے جلدی کرو ورنہ وہ اس بچے کو بھی آگ میں پھینک دے گا۔"

"تک .... کیا آگ میں .... کیا اس نے میرے بچے کو آگ میں ڈال دیا ہے۔"

"ہاں اس وحشی نے تمہارے پہلے بچے کو آگ میں زندہ جلا دیا ہے۔ آتشدان کے اندر ڈال دیا ہے اور تم اس کا نام بتانے میں پس و پیش کر رہی ہو۔"

یہ سن کر لڑکی بری طرح بے چین ہو گئی اور رونے لگی۔

"خدا کے لیے جلدی کرو میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔"

"اس وحشی کا نام ملک نظام الدین ہے اور وہ اس علاقے کا بہت با اثر اور دولت مند شخص ہے۔"

رئیس کا نام سنتے ہی ڈاکٹر عذرا گل نے اپنا [illegible]

لگائے عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اور کائنات سردی میں ٹھٹھری ہوئی تھی۔ حویلی کے سامنے ایک سرسبز باغ تھا۔ جس کی صاف ستھری روشیں چاندنی میں بھلی لگ رہی تھیں۔ ڈاکٹر عذرا کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی اور اسے کہاں جانا تھا۔ فی الوقت وہ اس حویلی سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ بچے نے اپنی مخصوص آواز میں رونا شروع کر دیا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ عذرا گھبرا گئی تھی۔ شاید بچہ بھوک کی وجہ سے رو رہا تھا۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ جلدی سے ایک گھنے درخت کے سائے میں چلی گئی اور تذبذب کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے اپنا انگوٹھا بچے کے منہ میں دے دیا اور اس کے ساتھ ہی بچے کی آواز ختم ہو گئی۔ خاموشی ہوتے ہی اس کے کانوں میں پتوں کے چرمرانے کی آواز آئی۔ آواز حویلی کے صدر دروازے کی طرف سے آ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد حویلی کے کونے سے ایک ہیولہ نمودار ہوا اور رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ واضح طور پر اس نے بچے کے رونے کی آواز سن لی تھی اور تحقیق کرنے اس طرف آیا تھا۔ "کون ہے؟" اس نے باغ کی منہ کر کے آواز لگائی۔

عذرا نے فوراً ہی آواز پہچان لی تھی۔ وہ ڈرائیور تھا۔ اس لمحے اس کے پیچھے ایک اور ہیولہ نمودار ہوا۔ "او طفیل!" نووارد نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "کیا ہے؟ کس کو آوازیں دے رہے ہو؟"

طفیل نے سر کھجلایا اور بولا۔ "ملک جی! باغ سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تھی۔"

"بچے کی رونے کی آواز؟" ملک جی گرجے۔ "اوئے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔" پھر انہوں نے کچھ سوچا اور بولے۔ "اچھا دیکھ ادھر ہی کھڑا رہ! اگر کوئی نظر آئے تو اسے جانے نہیں دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔" پھر وہ تیزی سے واپس مڑے۔ عذرا کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اب کسی بھی لمحے اس کے فرار کا انکشاف ہو سکتا تھا۔ وہ درختوں اور پودوں کی اوٹ میں احتیاط کے ساتھ پیچھے ہٹنے لگی۔ باغ کے اختتام پر قد آدم جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جھاڑیوں میں پہنچ کر اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ انتہائی ڈراؤنی اور پُرخطر جگہ تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایسی پُرخطر جگہ پر قدم بھی نہ رکھتی لیکن اس وقت موت کا خوف ہر قسم کے خطرات پر حاوی تھا۔ وہ بچے کو سینے سے چمٹائے جھاڑیوں

سے بچتی بچاتی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ چند ساعتوں کے بعد حویلی کی طرف سے شور کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ غالباً ملک نظام الدین نے حویلی کے تمام ملازموں کو جگا دیا تھا۔ ان آوازوں کے درمیان کار اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔ رات سنسان تھی اور ہوا بالکل ٹھہری ہوئی تھی۔ آسمان پر ہزاروں ستارے چمک رہے تھے۔ مشرق کی طرف سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اس طرف کوئی آبادی تھی لیکن وہ اس طرف جانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ آبادی کے قریب گئی تو بستی کے تمام آوارہ کتے اسے گھیر لیں گے۔

اچانک اسے عقب میں کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ آواز اگرچہ کافی دور تھی لیکن بتدریج قریب ہو رہی تھی۔ وہ یقیناً ملک نظام الدین کا کوئی آدمی تھا اور اسی طرف آ رہا تھا۔ عذرا نے پہلے تو اپنی رفتار تیز کر دی لیکن پھر سوچا کہ اس طرح وہ تعاقب کرنے والے کی نظر میں آ جائے گی اور بچنا محال ہو گا۔ اس لیے کہیں چھپ کر بیٹھ جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ دوسرا ڈر یہ بھی تھا کہ کہیں بچہ رونا نہ شروع کر دے۔ پس اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور ایک بڑی سی جھاڑی کے اندر گھس گئی۔ اس نے نہ تو جھاڑی میں چھپے ہوئے زہریلے کیڑے مکوڑوں کی پرواہ کی اور نہ ہی ان خراشوں کا خیال کیا جو اس کے چہرے اور بازوؤں پر آئیں۔ اس کا اندازہ بہت صحیح نکلا۔ تعاقب کرنے والا چند ساعتوں میں قریب پہنچ گیا۔ وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ عذرا دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے دیکھ نہ لے۔ وہ اس کے قریب سے گزرتا ہوا آگے گزر گیا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ کچھ دور جا کر وہ رک گیا اور اپنی داہنی طرف دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر کے بعد اس طرف سے ایک دوسرا آدمی دوڑتا ہوا آیا تھا اور اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"کچھ پتا چلا؟" آنے والے نے پوچھا۔ اس کی آواز بلند تھی اور رات کے سناٹے میں دور دور تک سنی جا سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے وہ دریا کی طرف گئی ہے۔" دوسرے نے کہا۔ کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر عذرا کے کانوں میں پہلے شخص کی آواز ابھری۔ "کیا کریں۔" پھر اس نے کہا۔

"کرنا کیا ہے؟ واپس چلتے ہیں۔" دوسرے نے بیزاری سے کہا۔ "ملک صاحب بھی عجیب ہیں۔ خواہ مخواہ آدھی رات کو دوڑ لگوا دی۔"

"اوئے سارا قصور اس ناک کے بال طفیل کا ہے۔ اچھا ہی ہوا نہیں ملی۔ ورنہ اسی وقت قبر کھودنی پڑتی۔" عذرا کے بدن میں جھرجھری آ گئی۔ اس نے سوچا انسان کتنا خود غرض ہے۔ اپنے عیش و آرام کے لیے دوسروں کی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

"یار! یہ لڑکی تھی کون؟" پہلے نے پوچھا۔ دونوں واپس چل پڑے تھے۔

"تو کیا کرے گا جان کر۔ لڑکیاں تو یہاں آتی ہی رہتی ہیں!" وہ باتیں کرتے ہوئے دور نکل گئے۔ تب عذرا بچے کو لے کر پناہ گاہ سے نکلی اور ایک طرف چل پڑی۔ جب بڑا خطرہ ٹل جائے تو چھوٹے خطرے انسان کو پریشان کرنے لگتے ہیں۔ اب عذرا کو یہ بات پریشان کرنے لگی کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ سردی کی وجہ سے وہ رات ویرانے میں نہیں گزار سکتی تھی۔ پھر جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک کچے راستے پر پہنچ گئی۔ دوسری طرف سرسبز کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کھڑی ہو کر سوچنے لگی۔ اچانک بائیں طرف اسے ایک ٹمٹماتی سی روشنی نظر آئی۔ روشنی کے ساتھ ایک بیل گاڑی کا ہیولا بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ پہلے تو وہ ڈر رہی تھی لیکن پھر کنارے پر بیٹھ کر بیل گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔ گاڑی بان دھیمے سروں میں کوئی گیت الاپ رہا تھا۔ اس نے عذرا کو بالکل نہیں دیکھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو عذرا اپنی جگہ سے اٹھی اور گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی بان رات کے ویرانے میں ایک خوب صورت عورت کو دیکھ کر بالکل بوکھلا گیا۔ اسے وہ تمام قصے یاد آ گئے جو چڑیلوں کے بارے میں مشہور تھے کہ کس طرح چڑیلیں نوجوان اور خوب صورت عورتوں کا روپ دھار کر چاندنی راتوں میں اکیلے دکیلے مسافروں کو اپنے پیچھے لگا کر لے جاتی ہیں۔ قریب تھا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ اٹھتا لیکن عذرا کی گود میں بچہ اچانک رونے لگا۔ بچے کی آواز سن کر دیہاتی رک گیا۔

"کون ہو تم؟" اس نے رعب دار آواز میں پوچھا لیکن وہ رعب در حقیقت خوف کا ردعمل تھا۔

"بھائی میں ایک پریشان عورت ہوں!" عذرا نے کہا۔ "راستہ بھٹک گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں!" پھر وہ بچے کو تھپکنے لگی۔

"راستہ بھٹک گئی ہو۔" دیہاتی نے حیرانی سے کہا۔ "لیکن کیسے راستہ بھٹک گئی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ تم اتنی دور کیسے آ گئیں؟ اس علاقے میں نہ تو کوئی پکی سڑک ہے اور [illegible]"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ یوں سمجھو کہ قسمت یہاں لے آئی ہے۔ یہاں سے عادل نگر کتنی دور ہے؟"

"عادل نگر! یہی کوئی بیس پچیس میل دور ہو گا۔"

"کیا وہاں جانے کے لیے کوئی بس وغیرہ مل جائے گی!"

"اس وقت تو بہت مشکل ہے۔ ویسے پکی سڑک یہاں سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ رات کے وقت ٹرک چلتے رہتے ہیں!" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "لیکن ٹرکوں کے ڈرائیور کچھ اچھے لوگ نہیں ہوتے۔ تم اکیلی ہو' ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔" عذرا نے دیکھا کہ دیہاتی گہری نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"وہ بتیس چونتیس برس کا صحت مند شخص تھا۔

"یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے؟"

"تھوڑی دور ہمارا گاؤں ہے!"

"کیا وہاں رات گزارنے کا کوئی ٹھکانہ مل جائے گا؟ میرا مطلب ہے کہ وہاں کوئی سرائے وغیرہ ہو گی؟"

"ان دیہاتوں میں کوئی سرائے ورائے نہیں ہوتی جی لیکن تم ہو کون؟ کہیں چڑیل تو نہیں ہو؟" پھر وہ بیل گاڑی سے نیچے اتر آیا اور ڈرتے ڈرتے عذرا کے گرد گھوم کر اس کے پیروں کو دیکھنے لگا۔ "پیر تو سیدھے ہی ہیں۔ یہ بچہ تمہارا ہے؟"

"یہ بچہ! آں ہاں ہم .... میرا ہی ہے!"

"سمجھ گیا!" دیہاتی بولا۔ "تیرے خصم نے تجھے گھر سے نکال دیا ہے' یہ نا یہی بات؟" لیکن پھر وہ فوراً ہی چونک سا گیا ہے۔ بولا۔ "میں بھی کتنا بدھو ہوں۔ اتنی دیر لگا دی بات سمجھنے میں۔ تو شہر کی رہنے والی ہے نا! شہروں میں تو ایسے کام ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہوتے تو دیہاتیوں میں بھی ہیں پر ذرا کم کم! آ جا بیٹھ جا بیل گاڑی پر کتنے دن کا ہے یہ تیرا بچہ؟"

عذرا اس کی بے تکلفی دیکھ کر سہم گئی۔ بولی۔ "جو کچھ تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ ہم دیہاتی لوگ سیدھے ضرور ہوتے ہیں۔ پر احمق نہیں ہوتے۔ بس اب پردہ رہنے دو۔ لاؤ یہ بچہ میں اٹھا لیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں یہ تم سے نہیں سنبھالا جائے گا۔" عذرا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ اچانک

دیہاتی نے عذرا کو بچے سمیت اٹھا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ عذرا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ "تم بچے کی بات کرتی ہو۔ میں تمہیں بھی سنبھال سکتا ہوں۔" دیہاتی نے کہا اور خود بھی چھلانگ لگا کر گاڑی پر چڑھ گیا۔ "دیکھ اب کسی قسم کی فکر نہیں کرنا۔ جب تک جی چاہے میرے پاس رہ سکتی ہو۔ میرا نام چوہدری رجب علی ہے اور تیرا نام کیا ہے لاڈو! ذرا میرے قریب آجا تجھے سردی لگ رہی ہو گی!"

دیہاتی جس نے اپنا نام چوہدری رجب علی بتایا تھا' بڑی تیزی سے بے تکلف ہو رہا تھا۔ عذرا ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ دست درازی پر نہ اتر آئے۔

"میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" عذرا نے کہا۔ "میں ایک شریف لڑکی ہوں۔"

"گھبراؤ نہیں' میں بھی شریف آدمی ہوں۔ تمہاری قسمت اچھی تھی جو آج مجھے منڈی میں دیر ہو گئی۔ ورنہ اگر تم آوارہ لڑکوں کے ہاتھ لگ جاتی تو نہ تمہاری خیریت ہوتی نہ تمہارے بچے کی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

عذرا نے اپنا اصلی نام بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے تھوڑا سا سوچا اور جو پہلا نام اس کے ذہن میں آیا وہی بتا دیا۔ "م .... میرا نام جمیلہ ہے!" بیل گاڑی کے پہیے چرچرائے اور وہ آگے روانہ ہو گئی۔

"ہونہہ! جمیلہ نام تو ٹھیک ٹھاک ہے۔" وہ سوچتا ہوا بولا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ گاؤں والوں کو تمہارے بارے میں کیا بتایا جائے۔ یہ سیدھے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں تمہیں اغوا کر لایا ہوں!"

"مجھے صرف رات گزارنی ہے۔ صبح صبح واپس چلی جاؤں گی۔ بلکہ اگر تم میرا ایک کام کر دو تو میں صبح ہونے سے پہلے ہی واپس چلی جاؤں گی!"

"کیسا کام؟"

"تم نے عادل نگر کا سرکاری ہسپتال دیکھا ہے۔"

"بالکل دیکھا ہے!" رجب علی نے کہا۔ "میری زنانی اسی ہسپتال میں اللہ کو پیاری ہوئی تھی!"

"اچھا کیا بیماری تھی اسے؟"

"بیماری وماری کوئی نہیں تھی گھوڑوں کی طرح ہٹی کٹی تھی۔ اپنے بھائی کو ملنے

مری۔ اچھی عورت تھی ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"تمہیں ہسپتال جانا پڑے گا۔ میں تمہیں رقعہ لکھ دیتی ہوں اسے ہسپتال کی نرس کے پاس لے جانا۔ وہ تمہیں ایک سوٹ کیس دے گی اسے لے کر واپس آجانا۔"

"اس وقت جانا تو مشکل ہے۔"

"سفر خرچ کے علاوہ سو روپے دوں گی اور ساری عمر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی!"

سو روپے کا نام سنتے ہی رجب علی آمادہ ہو گیا۔ تاہم اس نے فوراً ہی آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ بولا۔ "بڑے گھر کی معلوم ہوتی ہو کتنا خرچہ آیا تھا؟"

"کیا؟ کیسا خرچہ؟"

"بھولی نہ بن۔ میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ یہ بچہ اور ہسپتال اور سامان! ایک بیوقوف بھی ساری بات سمجھ جائے گا۔ خیر یہ تیرا ذاتی معاملہ ہے۔ اچھا سن' اس بچے کو کہیں پھینک نہ دینا۔ اگر ایسا خیال ہو تو مجھے دے دینا۔ میری بیٹی چودہ سال کی ہے۔ وہ اسے پال لے گی۔ بوڑھی ماں بھی ہے' اسے بچوں کا بہت چاؤ ہے۔"

عذرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ رجب علی برا آدمی نہیں تھا۔ بس وقتی جذبے کے تحت بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی چاندنی میں ایک گاؤں کے دھندلے نقوش نمایاں ہونے لگے۔ کہیں کہیں مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ زیادہ مکانات کچے اور تاریک تھے۔

"گاؤں قریب آگیا ہے!" رجب علی نے کہا۔ "یہ لے' یہ کھیس اوڑھ لے اور چپ سادھ کے بیٹھی رہنا۔ اول تو اس وقت کوئی باہر نہیں ہو گا۔ اگر ہوا بھی تو کہہ دوں گا میری ماں ہے!"

گاؤں کی گلیاں بالکل سنسان پڑی تھیں۔ بیل گاڑی رجب علی کے گھر کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ نیچے اترا بیل کھولے' انہیں کھرلی میں باندھا اور دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ عذرا اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی آنکھیں جھپکاتی ہوئی باہر دیکھنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑی ہوئی تھی۔ خاصی صحت مند اور مضبوط قسم کی لڑکی تھی۔ جب اس کی نظر عذرا پر پڑی تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا "ابا! یہ کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

گرم کردے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے!"

لڑکی بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ عذرا رجب علی کے پیچھے چلتی ہوئی ایک صاف ستھری بیٹھک میں پہنچ گئی۔ اس میں دو پلنگ بچھے تھے اسی لمحے دوسرے دروازے سے ایک بوڑھی عورت آنکھیں ملتی ہوئی کمرے میں آئی اور جھک کر عذرا کو گھورنے لگی۔ عذرا نے اسے سلام کیا لیکن جواب سے محروم رہی۔

"او رجب علی!" بوڑھی نے کہا۔ "اسے کہاں سے اٹھا لایا ہے؟"

"جنگل سے!"

"ہائے ہائے' یہ ہے کون؟"

"اسی سے پوچھ لے۔ مجھے تو نہیں بتاتی۔ میں تو اسے چڑیل سمجھ کر ڈر گیا تھا۔"

"ہائے میری توبہ! تُو اس چڑیل کو کیوں یہاں لایا ہے!"

"اب تو لے آیا ہوں۔ تیرا دل کرے تو نکال دے باہر! ٹھنڈ میں اکڑ کر مر گئی تو اس کی روح مجھ سے چمٹ جائے گی!"

"جاؤ کبھی تو اچھی بات منہ سے نکال لیا کرو۔ اگر گاؤں والوں کو پتا چل گیا تو وہ ہماری ننھی بڈھی اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔"

"کوئی ہاتھ تو لگا کر دیکھے میری ننھی بڈھی کو۔ ہاتھ نہ توڑ دیے اس کے۔ اب چھوڑ ان باتوں کو۔ رجو کو کہہ جلدی سے کھانا لائے۔ مجھے عادل نگر بھی جانا ہے!"

"اس وقت؟"

"ہاں وہاں سے اس کا سامان لانا ہے!"

پھر وہ اپنی ماں کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ عذرا کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ بچے نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا انگوٹھا بچے کے منہ میں دے دیا۔

اس کے ساتھ ہی اسے آتشدان میں جلنے والے بچے کا خیال آ گیا۔ اس کا جسم بری طرح کانپ گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا میں ایسے سنگ دل لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ ماں جب اندر آئی تو عذرا نے اس سے بچے کے لیے تھوڑا دودھ مانگا۔ بچہ چند چمچے دودھ پی کر سو گیا۔

کھانے کے بعد رجب علی نے عذرا سے کہا۔ "تم نرس کے نام رقعہ لکھ دو میں اپنے چھوٹے بھائی کرم علی کو عادل نگر بھیج دیتا ہوں۔" عذرا نے ایک مختصر سا رقعہ نرس [illegible]

کے نام لکھ کر دیا۔ جسے لے کر رجب علی چلا گیا۔ اس کی ماں عذرا سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اب اس کا رویہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد رجب علی نے آ کر بتایا کہ اس نے کرم علی کو عادل نگر روانہ کر دیا ہے۔ "امید ہے کہ وہ دو گھنٹے تک واپس آ جائے گا۔" اس نے مزید کہا۔

"کیا وہ کسی ٹیکسی پر گیا ہے؟" عذرا نے پوچھا۔

"دیہاتوں میں ٹیکسیاں کہاں؟ ملک نظام الدین کے ٹریکٹر پر بھیجا ہے!"

ملک نظام الدین کا نام سنتے ہی عذرا بری طرح چونک گئی تاہم وہ کچھ نہیں بولی۔

"ٹریکٹر کا ڈرائیور بھی ساتھ گیا ہے!" رجب علی بات جاری رکھتا ہوا بولا۔ "مان نہیں رہا تھا۔ میں نے جب سو روپے دینے کی بات کی تو فوراً راضی ہو گیا۔ سب ملا کر دو سو روپے خرچ ہو جائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔" عذرا نے کہا اور پرس میں سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر رجب علی کو دے دیے پھر بولی۔ "صبح لاہور جانے والی بس کتنے بجے ملے گی؟"

"پہلی بس سات ساڑھے سات بجے جاتی ہے۔" رجب علی نے کہا۔ "لیکن پکی سڑک یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے اور صبح صبح تانگہ ملنا مشکل ہے۔"

رجب علی کی ماں نے اپنے کمرے میں عذرا کا بستر لگا دیا اور اسے سونے کی تلقین کرتی ہوئی بتی بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اگرچہ عذرا کا جسم تھکا ہوا تھا اور اسے نیند کی سخت ضرورت تھی لیکن ذہن پراگندہ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ تاریکی ہوتے ہی اس کا تصور حویلی میں ہونے والے خونیں ڈرامے کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کے کانوں میں بچے کی چیخیں گونجنے لگیں۔ پتا نہیں وہ لڑکی کس حال میں ہو گی۔ جس نے ان دو بچوں کو جنم دیا تھا۔ اگر اس کے پاس اقتدار ہوتا تو وہ ملک نظام الدین کو اسی آتشدان میں جلا کر بھسم کر دیتی۔ ایسے وحشی' درندے اور نفس کے بندے کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ معلوم نہیں وہ اب تک کتنی معصوم لڑکیوں کی زندگی سے کھیل چکا ہے۔ سوچتے سوچتے اس کے سینے میں آگ سلگنے لگی۔ اس کا خیال پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف چلا گیا۔ اس نے خود سے کہا۔ میں اس بچے کو انتقام کے لیے تیار کروں گی۔ اس کی ایسی تربیت کروں گی کہ یہ بڑا ہو کر اپنے ناجائز باپ سے اپنے معصوم بھائی کا ناقابل فراموش انتقام لے۔ ایسا بھیانک انتقام کہ حویلی کے در و دیوار بھی کانپ اٹھیں۔

اچانک ایک سوال [illegible]

بھائی کو ملک نظام الدین کے ڈرائیور کے ساتھ عادل نگر بھیجا تھا لیکن یہ ایک فریب بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ ڈرائیور اس کے فرار کی بات جانتا ہو اور عادل نگر جانے کی بجائے ملک نظام الدین کو خبر کرنے اس کی حویلی گیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے رجب علی کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہو۔ اگر وہ نظام الدین کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ایسی صورت میں اس کا وہاں رہنا خطرناک تھا۔

☆-------☆-------☆

عادل نگر کا سول سرجن ڈاکٹر عرفان عباسی ایک ہمدرد اور محنتی انسان تھا۔ اسے عادل نگر کے سول ہسپتال میں کام کرتے ہوئے دس برس سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس کی رہائش گاہ ہسپتال سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ رات کے وقت اگر ایسا ایمرجنسی کیس آجاتا جو ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے نہ سنبھلتا تو اسے جاگنا پڑتا۔ اس بات پر اس نے کبھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اگر اسے بلا ضرورت جگا دیا جاتا تو پورے ہسپتال کی شامت آجاتی۔ آج بھی جب نرس رضیہ اور ڈاکٹر جمال نے اسے نصف رات کے وقت جگا دیا تو اس نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا کوئی ایمرجنسی کیس ہے؟

"جی نہیں!" ڈاکٹر جمال نے کہا۔ "ہم نے ایک دوسرے مسئلے پر بات کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔"

یہ سنتے ہی ڈاکٹر عباسی کا پارہ چڑھ گیا۔ "ڈاکٹر جمال!" اس نے غرا کر کہا۔ "میں تمہیں باشعور اور ذمہ دار انسان سمجھتا ہوں۔ یہ کون سا وقت ہے مسائل پر بات کرنے کا!"

"شاید مسئلہ کچھ سنگین نوعیت کا ہے!" ڈاکٹر جمال نے کہا۔ وہ ایک دراز قد اور نوجوان ڈاکٹر تھا۔ کھلتا ہوا رنگ اور اچھے خدوخال تھے!

"رضیہ کا خیال ہے کہ ڈاکٹر عذرا گل کو کسی نے اغوا کیا ہے۔"

"اوہ نہیں!" ڈاکٹر عباسی ایک دم رضیہ کی طرف مڑا۔ "نرس! تم نے تو بتایا تھا کہ ڈاکٹر عذرا ٹرین سے لاہور جا رہی ہیں!"

"جی جناب!" نرس رضیہ نے کہا۔ "ان کی ریزرویشن میں نے ہی کرائی ہے۔ وہ ڈیڑھ بجے کی ٹرین سے لاہور جانا چاہتی تھیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

تھی۔ البتہ اس کا سامان تیار رکھا تھا۔ میں نے خادمہ سے پوچھا۔ تو پتا چلا کہ وہ ایک نامعلوم شخص کے ساتھ سیاہ رنگ کی کار میں بیٹھ کر غالباً کسی مریض کو دیکھنے گئی ہے۔"

"تو پھر، اس میں تشویش کی کیا بات ہے؟"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد میرے کزن نے فون پر بتایا کہ اس نے ڈاکٹر عذرا کو سیاہ مرسڈیز میں دیکھا تھا اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔"

"ہو سکتا ہے تمہارے کزن کو دھوکا ہوا ہو۔ ممکن ہے وہ تاریکی کی وجہ سے اچھی طرح نہ دیکھ سکا ہو۔"

"میں نے بھی اس اندیشے کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے کہا کہ جس وقت اس نے ڈاکٹر عذرا گل کو کار میں بیٹھے دیکھا تھا۔ اس وقت سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا۔ جس کی ہیڈلائٹس کی روشنی کار کے اندر پڑ رہی تھی!"

"ہونہہ!" ڈاکٹر عباسی نے کہا اور چند لمحوں تک خاموشی سے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "کار میں کتنے آدمی تھے؟"

"اس نے صرف ایک آدمی کو دیکھا تھا۔ یعنی ڈرائیور کو جس نے منہ اور سر پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ اس لیے وہ اس کی شکل اچھی طرح نہیں دیکھ سکا!"

"کیا اس نے ڈاکٹر عذرا کو کشمکش کرتے دیکھا تھا۔ یا وہ آرام سے بیٹھی تھی؟"

"یہ بات میں نے نہیں پوچھی۔"

"ممکن ہے ایک آدمی سیٹ کے پیچھے چھپا ہوا ہو۔" ڈاکٹر جمال نے خیال ظاہر کیا۔ "اور یقیناً اس کے پاس پستول وغیرہ ہو گا۔ ورنہ اتنے آرام سے کوئی شخص اغوا نہیں ہوتا!"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر عذرا گل کو دھوکے سے اغوا کیا گیا ہے۔" نرس نے کہا۔ "خادمہ نے بتایا ہے کہ ڈرائیور نے اس کے ہاتھ ایک لفافہ اندر بھیجا تھا، اس کا خیال ہے کہ لفافے میں نوٹ تھے۔"

"عجیب بات ہے!" ڈاکٹر عباسی نے کہا۔ "اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی تھی۔ "ڈاکٹر جمال! تم فوراً پولیس میں رپورٹ درج کروا دو۔"

اسی لمحے وارڈ بوائے وہاں پہنچا اور نرس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"[illegible]"

"اس وقت؟ کون ہیں وہ؟"
"خود ہی جا کر پوچھ لو۔ ٹریکٹر پر آئے ہیں شاید کسی گاؤں سے آئے ہیں!"
"ڈاکٹر جمال! آپ بھی میرے ساتھ آئیں!" نرس نے کہا۔
"کیا ان کے ساتھ کوئی مریض بھی ہے؟" ڈاکٹر عباسی نے وارڈ بوائے سے پوچھا۔
"مریض تو کوئی نہیں ہے جی!"
ڈاکٹر جمال اور نرس رحیمہ وارڈ بوائے کی رہنمائی میں اس جگہ پر پہنچ گئے۔ جہاں ایک ٹریکٹر کے سامنے دو دیہاتی کھڑے تھے۔ ایک جو ٹریکٹر کا ڈرائیور لگتا تھا' لاپرواہی سے سگریٹ پی رہا تھا۔
"کس سے ملنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر جمال نے پوچھا۔
"یہ رقعہ دینا ہے جی نرس کو!"
"کس نے دیا ہے؟" نرس رقعہ لیتی ہوئی بولی۔ وہ بچوں کی کاپی کے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔
"پڑھ کے دیکھ لو جی' خود ہی پتا چل جائے گا!"
نرس نے رقعہ کھولا اور اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں اسے پڑھنے لگی۔ ڈاکٹر جمال اس کے پیچھے کھڑا ہو کر پڑھنے لگا۔
نرس!
مجھے یہاں دیر ہو گئی ہے۔ میرا سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ حامل رقعہ ہذا کے ہاتھ بھیج دو!
ڈاکٹر عذرا گل۔
"تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟" ڈاکٹر جمال نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ ڈاکٹر عذرا اس وقت کہاں ہیں؟"
"او جی ہمیں کسی ڈاکٹر واکٹر کا نہیں پتا۔ میرا نام کرم علی ہے۔ یہ رقعہ میرے بڑے بھائی رجب علی نے دیا ہے۔ کوئی عورت راستہ بھول کر ہمارے گاؤں پہنچ گئی تھی۔ اس نے یہ رقعہ دیا ہے۔"
"کوئی عورت! لیکن اس پر عذرا کا نام لکھا ہوا ہے اس عورت کا حلیہ کیسا تھا؟"
"میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ رجب علی بتا رہا تھا کہ اس کا نام جمیلہ ہے اور اس کی گود میں بچہ بھی ہے!"

ڈاکٹر جمال نے معنی خیز نظر سے نرس کی طرف دیکھا اور بظاہر لاپرواہی سے بولا۔
"کس گاؤں کے رہنے والے ہو۔"
"بسنت پور کے!"
"اور یہ عورت' جس کا نام تم نے جمیلہ بتایا ہے کس کے گھر ٹھہری ہوئی ہے۔"
"میرے بڑے بھائی کے گھر میں۔ میرا مطلب ہے کہ چوہدری رجب علی کے گھر میں گاؤں کا بچہ بچہ اس کا گھر جانتا ہے۔"
"یہ جمیلہ اکیلی ہے یا اس کے ساتھ کوئی دوسری عورت بھی ہے؟"
"او جی' آپ تو پولیس والوں کی طرح جرح کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو سامان دینا ہے تو دیں۔ نہیں تو خدا حافظ!"
ڈاکٹر جمال خشش و پنج میں پڑ گیا۔ کرم علی کی باتوں میں کوئی ہیر پھیر نظر نہیں آتا تھا۔ یا تو واقعی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ یا بہت زیادہ ہوشیار تھا۔ "اچھا تو تم ہمارے ساتھ آؤ۔" ڈاکٹر جمال نے کہا۔ "سامان اندر رکھا ہے!"
"اکیلا ہی آجاؤں یا نذیر کو بھی ساتھ لے لوں؟" اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "سامان زیادہ وزنی تو نہیں ہے۔"
"تم اکیلے ہی آجاؤ۔" ڈاکٹر جمال نے کہا۔ "زیادہ سامان نہیں ہے۔"
کرم علی ڈاکٹر جمال اور نرس کے ساتھ چل پڑا ان کا رخ ڈاکٹر عباسی کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو تاریکی سے ایک شخص نکل کر نذیر ڈرائیور کے قریب پہنچا اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آخر اللہ کر چونک کر اس کی طرف مڑا۔
"او خیر ہو۔" نووارد کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو طفیل!"
"آہستہ!" طفیل نے انگلی سے اشارہ کیا۔ پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "یہ کس عورت کے بارے میں بات کر رہے تھے؟"
"پتا نہیں کون ہے؟ رجب علی منڈی سے واپس آ رہا تھا کہ اسے راستے میں کہیں مل گئی۔"
"وہی لگتی ہے!" طفیل اپنا جوش دباتا ہوا بولا۔ "تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

آگیا۔ اچھا دیکھ ملک جی کو نہیں بتانا!"

"ملک جی بتانا تو ضروری ہے۔"

"نہ یار!" نذیر نے منت کی۔ "مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا۔" طفیل ہنسا اور نذیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "تجھے انعام ملے گا۔ فکر نہیں کرو۔ جس لڑکی کا تو سامان لینے آیا ہے' وہ اس ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہے۔ ملک جی نے اسے ایک کام کے لیے حویلی بلایا تھا!"

"کس کام کے لیے؟"

"تھا ایک کام۔ چل تجھے بتا ہی دیتا ہوں۔ وہ ایک کالج کی لڑکی سلمیٰ تھی نادی جو شہر سے کبھی کبھی ملک جی کے ساتھ حویلی آیا کرتی تھی' وہ بیمار تھی۔ اس کے لیے اس لیڈی ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ یہ علاج کرنے کے بجائے اس کا بچہ لے کر بھاگ گئی۔"

"بچہ! وہ کہاں سے آگیا؟"

"جہاں سے ساری دنیا کے بچے آتے ہیں' وہیں سے آگیا!" طفیل نے [illegible] "میرا خیال ہے کہ یہ وہی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ یہ اس وقت رجب علی کے گھر میں ہے نا؟"

"بس تو ٹھیک ہے!" طفیل نے چٹکی بجائی۔ "میں ملک جی کو لے کر بسنت نگر پہنچ رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے وہ کسی کو معلوم نہ ہو!"

"کیسی بات کرتے ہو طفیل! مجھے ملک سے اپنی گردن کٹوانی ہے؟"

"اچھا میں چلتا ہوں۔ ذرا مزے مزے سے واپس آنا تمہارے پہنچنے تک میدان صاف ہو چکا ہوگا۔" پھر وہ تیزی سے تاریکی میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد رات کے سناٹے میں کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ نذیر نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ پتا نہیں کرم علی کہاں مر گیا تھا۔ اس نے غصے سے سوچا۔ رات سرد اور سنسان تھی۔ سردی کی وجہ سے ہر شے سمٹی اور سکڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور ہولے ہولے کش لینے لگا۔ چند ساعتیں یونہی گزر گئیں۔ تھوڑی دیر بعد گلی میں ایک جیپ داخل ہوئی اور نرسنگ ہوم کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اندر سے ایک پولیس انسپکٹر اور دو باوردی سپاہی باہر آئے۔ ان کا رخ نذیر کی طرف تھا۔

"کون ہو تم؟" انسپکٹر نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

نذیر نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر بولا۔ "میں جی؟"

"اور تیرا باپ ہے یہاں!" انسپکٹر گرجا اور نذیر کے پیٹ میں رول سے ٹھوکا دیا!

"یہاں [illegible] رہے ہو؟"

"کک۔۔۔ [illegible] نہیں جی۔ وہ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کرم علی کا انتظار کر رہا تھا۔"

"پکڑ لو اسے۔۔۔۔۔۔۔!" انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا۔ "بدمعاش کہتا ہے کچھ نہیں کر رہا' لے آؤ اس کو اندر ابھی سارا پتا چل جائے گا کہ کیا کر رہا تھا!"

"ایمان سے میں نے کچھ نہیں کیا تھانیدار جی۔ ہم میں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"چپ رہ!" ایک سپاہی پیچھے سے اس کا کالر پکڑتا ہوا بولا۔ "چل آگے چل!"

انسپکٹر نے تفریحاً ایک رول اس کی پیٹھ پر جما دیا۔ پھر وہ اسے لیے ہوئے ڈاکٹر عباسی کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ وہاں ڈاکٹر جمال اور نرس رقیہ کے علاوہ کرم علی بھی موجود تھا۔ پولیس کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

"اچھا تو یہ اس کا ساتھی ہے!" انسپکٹر کرم علی کو گھورتا ہوا بولا۔

"جی ہاں!" ڈاکٹر جمال نے کہا۔ "یہ دونوں ڈاکٹر عذرا گل کا سامان لینے آئے ہیں!"

"بیٹھیں انسپکٹر صاحب!" ڈاکٹر عباسی صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"تم دونوں ادھر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ!" انسپکٹر نے کرم علی اور نذیر کو حکم دیا۔ پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہمارا قصور کیا ہے داروغہ جی!" کرم علی نے کہا۔ وہ کسی حد تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"رضا خان!" انسپکٹر نے ایک سپاہی سے کہا۔ "ذرا اسے قصور تو بتانا!" رضا خان نے آگے بڑھ کر کرم علی کی کمر پر ایک لات رسید کی اور بولا۔ "یہ بھی لاتوں کا بھوت معلوم ہوتا ہے مجھے۔"

انسپکٹر ڈاکٹر عباسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوا بولا۔ "اب آپ شروع سے ساری تفصیل بتائیں۔"

ڈاکٹر جمال! تم تفصیل بتاؤ!" ڈاکٹر عباسی نے کہا۔

ڈاکٹر جمال نے گلا صاف کیا اور شروع سے آخر تک ساری تفصیل بیان کر دی۔ گاہے بگاہے نرس بھی تصدیق کرتی رہی۔ ساری بات سننے کے بعد انسپکٹر نے سر ہلایا اور اس رقعے کو گھورنے لگا جو ڈاکٹر عذرا گل نے بھجوایا تھا۔

"تو آپ کے خیال میں ڈاکٹر عذرا گل کو اغوا کر لیا گیا ہے اور یہ رقعہ اس سے زبردستی لکھوایا گیا ہے۔"

"کچھ ایسی ہی بات معلوم ہوتی ہے!"

"اغوا کا محرک کیا ہو سکتا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"سردست کچھ نہیں کہا جا سکتا!"

انسپکٹر کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کرم علی اور نذیر کو گھورنے لگا۔ "لیڈی ڈاکٹر کہاں ہے؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"داروغہ جی ہم کسی لیڈی ڈاکٹر کو نہیں جانتے!" نذیر نے کہا۔

"اوئے زیادہ بک بک نہیں کرو۔ یہ رقعہ کس نے دیا تھا؟"

"یہ جی رجب علی نے دیا تھا!"

"ارے کم بخت میں لڑکی کی بات کر رہا ہوں!"

"لڑکی رجب علی کے گھر میں ہو گی جی! ہم نے تو نہیں دیکھی' اس نے یہ رقعہ لا کر دیا تھا۔"

"کون سے گاؤں کے رہنے والے ہو!"

"بسنت نگر کے جی!"

رضا خان اور اس کا ساتھی دونوں کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ "آپ کوئی فکر نہیں کریں ڈاکٹر صاحب!" انسپکٹر اٹھتا ہوا بولا۔ "صبح ہونے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر واپس پہنچ جائے گی!" باہر دونوں سپاہی نذیر اور کرم علی کو پچھلی سیٹ پر بٹھا رہے تھے۔ انسپکٹر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو بسنت نگر چلنے کا حکم دیا۔

"میرا ٹریکٹر جی!" نذیر گڑگڑایا۔

"خاموش بیٹھا رہ' ٹریکٹر بھی آ جائے گا۔" جیپ تیزی سے آگے روانہ ہو گئی۔

"مروا دیا مجھے بھی اپنے ساتھ!" نذیر نے روہانسی آواز میں کرم علی سے کہا۔ "اچھا خاصا بستر میں پڑا سو رہا تھا!"

کرم علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر عجیب سی الجھن طاری تھی' وہ اپنے بھائی رجب علی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا تھا لیکن جو باتیں اب تک اس کے کان میں پڑی تھیں۔ اس سے یہی لگتا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر اغوا کی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کسی اور نے اسے اغوا کیا ہو اور وہ بچ کر بھاگ نکلی ہو۔ نصف گھنٹے بعد جیپ

بسنت نگر پہنچ کر رجب علی کے دروازہ کے سامنے رک گئی۔

انسپکٹر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لمحہ بھر کے بعد دروازہ کھلا اور رجب علی نے باہر جھانکا۔ انسپکٹر نے کچھ کہے بغیر اسے گریبان سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

"اوہ اوہ' تھانیدار جی! کیا بب...... بات ہے!"

"لڑکی کہاں ہے؟" انسپکٹر غرایا۔

"لل...... لڑکی؟" رجب علی گھبرایا۔ "وہ تو نہیں ہے!"

انسپکٹر نے اسے دو چار جھٹکے دیئے اور سرکاری زبان بولتا ہوا اسے لیے ہوئے اندر پہنچ گیا۔ شور سن کر رجب علی کی ماں اور بیٹی بھی جاگ گئیں۔ جب انہوں نے تھانیدار کو دیکھا تو واویلا کرنے لگیں۔

انسپکٹر نے سارا گھر چھان مارا۔ مگر ڈاکٹر عذرا گل نظر نہیں آئی۔

"کہاں گئی لڑکی؟"

"ہم...... مم کچھ نہیں جانتا جی...... میں نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ میری ماں سے پوچھ لو۔"

"ہاں جی' رجب علی نے اسے کچھ نہیں کہا۔" رجب علی کی ماں نے کہا۔ "کوئی مصیبت کی ماری ہوئی تھی۔ اسے راستے میں ملی تھی!"

"ملی تھی تو پھر گئی کہاں؟" انسپکٹر گرجا۔

"وہ جی اس چارپائی پر سوئی تھی!" رجب علی نے کہا۔ "ہم سب سو گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے آنکھ کھلی تو وہ غائب تھی!"

"کرم علی اور نذیر کو تم نے عادل نگر بھیجا تھا؟"

"وہ جی' جمیلہ کے کہنے پر ہی بھیجا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ میرا سامان منگوا دو۔ اس نے رقعہ بھی لکھ کر دیا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں جی! مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم!"

"کیا اس نے تمہیں جمیلہ نام بتایا تھا؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے جی!"

"جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا' چلو باقی باتیں تھانے میں ہوں گی!"

"یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا!" رجب علی نے کہا۔ "تھانیدار صاحب مجھ پر رحم کرو' میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

تیری چارپائی پر سوئی تھی' پھر تُو نے اسے غائب کر دیا۔ اب کہتا ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اوئے ہمیں اُلو بناتا ہے؟"

رجب علی کی ماں اور بیٹی چیختی چلاتی رہ گئیں۔ انسپکٹر ان کی کوئی پرواہ کیے بغیر رجب علی کو باہر لایا اور جیپ میں بٹھایا۔ "یہ لو ایک اور شکار!" اس نے سپاہیوں سے کہا۔ "اس نے پوری لڑکی غائب کر دی ہے۔ کہتا ہے کہیں چلی گئی ہے۔ غضب خدا کا اس وقت کہاں جائے گی لڑکی! اوئے کہیں اسے قتل تو نہیں کر دیا تم نے؟"

"میں بالکل سچ کہتا ہوں تھانیدار جی!" رجب علی نے کہا۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ کر اپنے بھائی کرم علی اور اور نذیر ڈرائیور کو گھورنے لگا۔ "تم دونوں بھی یہاں بیٹھے ہو!"

"مروا دیا تم نے!" نذیر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پتا نہیں کون سے گناہوں کی سزا ملی ہے!"

"گاڑی بڑھاؤ!" انسپکٹر نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی گیئر میں ڈال دی۔ جب وہ گلی کے کونے پر پہنچا تو داہنی طرف سے کسی کار کی ہیڈ لائیٹس دکھائی دیں۔ "یہ کون ہے گاؤں میں گاڑی والا!" انسپکٹر نے کہا۔ "گاڑی روکو!"

ڈرائیور نے جیپ روک دی دوسری گاڑی جیپ کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی جیپ کے اندر بیٹھے ہوئے افراد پر پڑ رہی تھی لیکن گاڑی والے تیز روشنی کے پیچھے ہونے کی وجہ سے بالکل نظر نہیں آتے تھے۔

"کون ہو تم؟" انسپکٹر اپنے مخصوص میں بولا!

"اوئے تھانیدار!" گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "ذرا سامنے تو آ۔" اس کی آواز میں تحکم پایا جاتا تھا۔ آواز سنتے ہی انسپکٹر جیپ سے باہر نکلا اور انکساری سے ہنستا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔

"خیر ہوئے ملک صاحب ہیں!" اس نے کھڑکی کے سامنے جا کر کہا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ ایک جابر حکمران کی طرح بول رہا تھا۔ اب وہ ایک دم فرمانبردار اور مسکین بن گیا تھا۔

"اس وقت کہاں کی سیر ہو رہی ہے جناب!" کار کی پسنجر سیٹ پر سیاہ شیروانی اور قراقلی ٹوپی پہنے ملک نظام الدین بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا اور گردن اکڑی ہوئی تھی۔ اس نے انسپکٹر کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور تلخ لہجے میں پوچھا۔

"اوئے تھانیدار! میرے آدمی کب سے پکڑنے شروع کر دیے تم نے؟"

"اوہ نہیں جی! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کے آدمیوں کی طرف تو ہم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے!"

"اچھا تو یہ نذیر کیا کر رہا ہے تیری جیپ میں؟ اسے دعوت کھلانے لے جا رہے ہو؟"

"یہ آپ کا آدمی ہے؟" انسپکٹر نے حیرانی سے کہا۔ "اس نے بتایا ہی نہیں!"

"اور تم نے پوچھا ہی نہیں!" ملک نظام الدین نے کہا۔ "اور یہ دوسرے دو آدمی کون ہیں؟"

"یہ دونوں بھائی ہیں رجب علی اور کرم علی انہوں نے عادل نگر کے ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر کو کہیں غائب کر دیا ہے!" ملک نظام الدین نے ہولے سے سر ہلایا۔ اس کی گردن تنی ہوئی تھی اور چہرہ سخت تھا۔ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔

"اوئے نذیرے! اِدھر تو آ!" اس نے آواز لگائی۔ نذیر ڈرتا ڈرتا کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اوئے تُو عادل نگر کیا کرنے گیا تھا؟"

"او جی..........میں.......... مجھے کرم علی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کوئی سامان لانا ہے!"

انسپکٹر نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔ "ملک صاحب! آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ عادل نگر گیا تھا!"

"ہماری انٹیلیجنس سروس تم سے بہت تیز ہے تھانیدار! ہمیں ہر بات کی خبر رہتی ہے۔ ہمیں یہ بھی پتا ہے کہ ٹریکٹر پر گیا تھا اور تم نے اسے ٹریکٹر ساتھ نہیں لانے دیا!"

"بس جی غلطی ہو گئی۔ مجھے کیا پتا کہ ٹریکٹر آپ کا ہے؟"

"اب ایسا کرو کہ اسے ساتھ لے جاؤ تاکہ یہ عادل نگر سے ٹریکٹر واپس لے آئے۔"

رجب علی سامنے آ کر بولا۔ "ملک جی! ہماری بھی سفارش کر دیں ہم غریب لوگ ہیں!"

"چپ رہ!" انسپکٹر نے اسے ڈانٹا۔ "تیری کس بات کی سفارش کریں۔"

"ان دونوں کو چھوڑ دو!" ملک نظام الدین نے کہا۔

"بہت بہتر سرکار!" انسپکٹر نے کہا۔ پھر رجب علی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "جاؤ دفع

ہو جاؤ دونوں میں صبح تم دونوں کا بیان لینے آؤں گا۔"

"رجب علی!" ملک نظام الدین نے کہا۔ "اپنے بھائی کو لے کر صبح حویلی پر آنا۔ جاؤ.........اب جا کر سو جاؤ۔" پھر اس نے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ پھر بظاہر کسی فوری خیال کے تحت بولا۔ "تھانیدار! تو ابھی کسی لیڈی ڈاکٹر کی بات کر رہا تھا۔ اس کا کچھ پتا چلا؟"

"ابھی تک کچھ نہیں پتا چلا جی معلوم نہیں انہوں نے اسے کہاں غائب کر دیا ہے؟"

"ٹھیک ہے تلاش جاری رکھو!" ملک نظام الدین نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆-------☆-------☆

افسری بیگم ان عورتوں میں سے تھی جو کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ ذرا سی بات کو افسانہ بنانے اور بستے بستے گھروں میں پھوٹ ڈالنے میں ماہر تھی۔ وہ رشتے میں عذرا کی پھوپھی تھی اور ہر وقت ان کی ٹوہ میں رہتی تھی۔ جہاں کہیں کوئی ایسی ویسی بات دیکھتی تھی' فوراً محلے میں پراپیگنڈا شروع کر دیتی تھی۔ جب اسے عذرا کی اچانک گمشدگی کی اطلاع ملی' تو اس نے عجیب عجیب قصے مشہور کرنے شروع کر دیے ادھر عذرا کی ماں فضیلت بیگم کا' جس نے اپنی بیٹی کو خون جگر دے کر پروان چڑھایا تھا' بُرا حال تھا۔ عذرا کی گمشدگی کو ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا لیکن ہنوز کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ تاہم فضیلت بیگم کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔ اسے اس کی پاکدامنی پر کوئی شبہ نہیں تھا لیکن افواہیں پھیلانے والوں کی زبانیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ فضیلت بیگم سب کچھ سنتی اور صبر کرتی۔ اسے یقین تھا کہ عذرا واپس آ کر سارے داغ دھو ڈالے گی لیکن جب برا وقت آتا ہے تو انسان کی ساری تدبیریں رائیگاں جاتی ہیں۔

ایک رات وہ اداس بیٹھی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ دستک کی آواز سن کر بتا سکتی تھی کہ باہر کون ہے؟ وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی۔ دستک دینے کا وہ انداز عذرا کا تھا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کی توقع کے عین مطابق باہر' سیاہ شال میں لپٹی ہوئی عذرا کھڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ فضیلت بیگم "میری بیٹی" کہہ کر اس سے لپٹ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ بیٹی کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ بچہ نہیں سانپ تھا!

"اجو! یہ کیا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں پوچھو ماں! مجھے ذرا سنبھل لینے دو!"

"ہائے میری قسمت!" فضیلت بیگم نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "کیا میں نے اسی دن کے لیے تمہیں لکھایا پڑھایا تھا!"

"ماں مجھے آرام کر لینے دو۔ میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں!"

"اب تو کیا بتائے گی؟ میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔ اتنی بھی اندھی نہیں ہوں!"

"اوہ میرے خدا!" عذرا نے کہا۔ "یہ تو سن لو کہ میں کس عذاب سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں! پھر جو مرضی کہنا!"

"کاش تو مر جاتی!" فضیلت بیگم اس کی بات سنی ان سنی کرتی ہوئی بولی۔ "اور کچھ نہیں تو اس حرام کے پلے کو ہی ٹھکانے لگا کر آتی۔ اب تو مجھے ہی موت آجائے تو اچھا ہے اب لوگوں کے طعنے نہیں برداشت کر سکوں گی۔"

عذرا کا جی چاہا کہ پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دے لیکن اس کے چیخنے سے پہلے بچے نے چیخنا شروع کر دیا۔ ادھر فضیلت بیگم کی حالت بگڑنی شروع ہو گئی وہ کسی جنونی انسان کی طرح بے تحاشا بولتی چلی جا رہی تھی۔ بچے نے پیشاب کر دیا تھا عذرا اسے لیے ہوئے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔

"کم بخت! اس کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتی ابھی سارا محلہ اکٹھا ہو جائے گا۔ اس کی آواز سن کر۔"

ابھی وہ بات ہی کر رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "لو آئے گئے محلے والے!" فضیلت بیگم نے کہا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا گیا۔ عذرا خاموشی سے بچے کو صاف کرتی رہی۔ البتہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب اس کی سگی ماں نے بات نہیں سنی تھی تو دوسرے کیا سنیں گے! اگر قدرت نے اس کی قسمت میں بدنامی لکھی تھی تو یونہی سہی۔

فضیلت بیگم نے بالآخر دروازہ کھول ہی دیا۔ جب عزت لٹنے لگتی ہے تو دروازے بند کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ باہر افسری بیگم کھڑی تھی۔

"سلام آپا!" وہ اندر آتی ہوئی بولی۔ "کس سے باتیں ہو رہی تھیں؟"

فضیلت بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ بند کر کے کمرے میں چلی گئی۔ افسری بیگم کان کھڑے کرتی ہوئی بولی۔ "ہائے یہ بچے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ کیا

گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

تاہم اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور آواز کی سمت میں چلتی ہوئی باتھ روم میں پہنچ گئی۔ اس لمحے عذرا بچے کو اٹھائے باہر نکل رہی تھی۔ افسری بیگم کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔ "ہائے میں مر گئی۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ "میں بھی کہوں آپا کیوں پریشان ہیں ہائے اللہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ ہونہہ تو یہ بات تھی۔ ہم سمجھے کسی نے اغوا کر لیا ہے تمہیں۔ تو یہ بچے کا چکر تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ سوا مہینہ نہا کر آئی ہے!"

"پھوپی جان! آپ غلط سمجھی ہیں' یہ میرا بچہ نہیں ہے!"

افسری بیگم نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور جوتیاں چٹخاتی کمرے میں پہنچ گئی۔ "اور پڑھاؤ اپنی لاڈلی کو!" اس نے فضیلت بیگم سے کہا۔ "میں نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ زمانہ اچھا نہیں ہے۔ لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دو!"

"کہہ لو جو مرضی ہو!" فضیلت بیگم نے کہا۔ "تمہاری زبان تو پہلے بھی کبھی نہیں رکی تھی' آج کیا رکے گی؟"

"لو اور سنو! مجھ ہی پر ناراض ہو رہی ہو۔ میری زبان سے کیا ہوتا ہے فضیلت آپا! اب تو سارے محلے کی زبان چلے گی۔ ارے غضب خدا کا' لڑکی نے سارے خاندان کی ناک کاٹ دی ہے اور تم کہتی ہو زبان بھی نہیں کھولوں۔ سچ کہتی ہوں' اگر بھائی صاحب زندہ ہوتے تو لڑکی کو گھر میں قدم نہ رکھنے دیتے' اولاد تو آخر میرے بھائی کی ہے۔ مجھے دکھ نہیں ہو گا اور کیسے ہو گا؟"

"پھوپی جان!" عذرا نے کمرے میں آ کر کہا۔ "آپ بلاوجہ بات کو طول دے رہی ہیں۔ یہ بچہ میرا نہیں ہے!"

"ہائے سبحان اللہ اگر بچہ تیرا نہیں ہے تو اتنا عرصہ چھپی کیوں پھری۔ جا لڑکی کسی اور کو بیوقوف بنانا!"

"آپ ذرا اطمینان سے بیٹھ جائیں تو میں پوری بات بتاؤں۔"

"ایسی کہانیاں بہت سنی ہوئی ہیں اور میں اندھی تو نہیں ہوں' اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہوں!"

"آپ بیٹھیں تو سہی!"

"نہ لڑکی میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے!"

"کس کس کو بٹھا کر سناؤ گی!" فضیلت بیگم نے کہا۔ "اس سے تو اچھا تھا کہ کنویں

میں چھلانگ لگا کر مر جاتیں!"

"اچھا آپا میں چلتی ہوں۔" افسری بیگم جاتی ہوئی بولی۔ "خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔ دروازہ بند کر لینا۔" فضیلت سکتے میں رہ گئی تھی۔ یہ کیا ہو گیا اس نے سوچا۔

☆-------☆-------☆

اگلی صبح یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ عذرا بدحواس ہو گئی اگر اس معصوم بچے کی کفالت کا مسئلہ نہ ہوتا جس کا نام اس نے میاد رکھا تھا تو وہ ضرور خودکشی کر لیتی۔ یہ نام اس نے خاص مقصد کے تحت رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میاد بڑا ہو کر اپنے ناجائز باپ سے انتقام لے۔ ناجائز باپ کی اصطلاح بھی اسی کی ایجاد کردہ تھی۔ اس کے خیال میں اصل قصور مرد یا عورت کا ہوتا ہے جو اپنی سفلی خواہشات کے جنون میں ایک بچے کی دنیا میں آمد کا سبب بنتے ہیں اس لئے ناجائز کا لفظ ان کے ساتھ استعمال ہونا چاہئے۔

تین روز انتہائی کرب میں گزرے۔ اس کی ماں نے اس سے مکمل قطع تعلق کر لیا۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی تھی۔ عذرا کو صرف ایک ہی روشنی کی کرن نظر آتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے منگیتر کیپٹن شاہ نواز کو ساری بات سمجھانے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن چوتھے دن کیپٹن شاہ نواز کے گھر والوں نے منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ اس کا جی چاہا کہ خودکشی کر لے یا اس محلے کو بلکہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلی جائے۔ وہ سارا دن اس مسئلے پر سوچتی رہی لیکن کوئی حل نظر نہیں آیا۔

بالآخر اس نے شاہ نواز سے بالمشافہ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اسے فون کیا اور کہا کہ وہ چند منٹ کے لئے تنہائی میں اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ شاہ نواز نے پہلے تو صاف انکار کر دیا تاہم عذرا کی منت سماجت سے متاثر ہو کر ملنے پر آمادہ ہو گیا۔

دونوں مال روڈ پر واقع ایک ریستوران میں اکٹھے ہوئے۔ "میں تمہارے ساتھ کوئی لمبی بات نہیں کر سکتا۔" شاہ نواز نے سخت لہجے میں کہا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور نہ بات کرنے کا کوئی فائدہ ہے۔ جو بات ختم ہو چکی ہے وہ دوبارہ شروع نہیں ہو سکتی۔"

"میں بے گناہ ہوں شانی!" عذرا نے کہا۔ "مجھ پر جھوٹے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ وہ بچہ میرا نہیں ہے۔"

"تو پھر کس کا ہے؟"

"وہ ایک مظلوم لڑکی کا بچہ ہے۔ مجھے کیس کرنے کے لیے بلایا گیا تھا اور.........."

"اور کیس کرنے کے بعد اس مظلوم لڑکی نے اپنا بچہ تمہیں دے دیا۔ یہی کہنا چاہتی ہو؟ میرا خیال ہے جھوٹ بولنے کے لئے بھی عقل چاہئے۔"

"خدا کے لئے شانی' مجھے بات تو کر لینے دو۔"

"بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اپنی باتوں سے قائل بھی کر لو تو صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ اگر میں شادی پر راضی ہو بھی جاؤں تو میرے رشتے دار راضی نہیں ہوں گے۔ اگر میں سب کو نظرانداز کر کے تمہارے ساتھ شادی کر لوں تو وہ لوگ مجھے بھی مجرم سمجھنے لگیں گے۔"

عذرا کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ "کیپٹن شاہ نواز!" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "میں تمہیں دوسروں سے مختلف سمجھتی تھی مگر تم بزدل ہو۔ رشتے داروں سے ڈرتے ہو۔ تم ایک کمزور عورت کی حفاظت نہیں کر سکتے' ملک کی کیا حفاظت کرو۔"

شاہ نواز کو عذرا سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ قدرے سکتے میں آ گیا۔

"لیکن جانے سے پہلے میں صرف تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" عذرا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں بے گناہ ہوں اور تم مجرم ہو تم اور تمہارے جیسے اور بہت سے لوگ.........."

عذرا کا جوش اور پر یقین انداز تکلم دیکھ کر شاہ نواز کو اپنے خیال میں ترمیم کرنی پڑی۔ اس نے سوچا کہ کوئی مجرم ضمیر انسان اتنے جذبے کے ساتھ بات نہیں کر سکتا۔ "مم.......... میرا خیال ہے کہ تمہاری بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں۔" اس نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ عذرا! شروع سے ساری بات بتاؤ۔"

"نہیں' اب کوئی بات نہیں ہو گی۔" عذرا نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔ "میں چوبیس گھنٹے کے اندر یہ شہر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ یہ نہیں بتاؤں گی کہ کہاں بلکہ ابھی مجھے خود بھی پتا نہیں کہ کہاں جانا چاہئے۔ اگر تمہارا جذبہ سچا ہوا تم مجھے تلاش کر لو گے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"عذرا! میری بات تو سنو۔ مم.......... مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے' بیٹھ تو جاؤ۔"

"نہیں بیٹھوں گی۔ تم نے مجھ پر بہتان لگایا ہے۔ میرے جذبات مجروح کئے ہیں۔ منگنی توڑ کر مجھے بے آبرو کیا ہے۔ اس وقت میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی لیکن میں تمہارا انتظار کروں گی۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"عذرا پلیز رک جاؤ۔"

لیکن عذرا نہیں رکی۔ کیپٹن شاہ نواز کسی تھکے ہوئے انسان کی طرح سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆-------☆-------☆

قصر سنبل بھیانک سکوت میں لپٹا ہوا تھا۔

دور آسمان پر چمکنے والا چاند عبرت کی نظر سے اس کہنہ عمارت کو گھور رہا تھا۔ اجڑے ہوئے باغ میں ہوا کی ہلکی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ گویا رات گہری سانس لے رہی ہو۔ قصر سنبل سے ڈیڑھ فرلانگ دور دریا کے کنارے کرم علی کا نیم پختہ مکان تھا۔ مکان کے ایک کمرے میں چارپائی پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ظہیر کی لاش پڑی تھی۔

ملک نظام الدین سخت کشیدہ چہرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور بیٹے کی لاش سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اعصاب بری طرح تن گئے۔ ظہیر کی گردن پر ننھی ننھی انگلیوں کے واضح نشانات نظر آ رہے تھے۔ ظہیر اس کا دوسرا اور آخری بیٹا تھا۔ چند سال پہلے اس کے بڑے بیٹے نصیر کا یہی حشر ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ اب اس کی جائیداد کا کوئی وارث نہیں رہا۔ کیا وہ اتنی بڑی جائیداد غیروں کے لئے چھوڑ کر جائے گا۔ اس کی پہلی بیوی عرصے سے بیمار تھی اور اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کا خیال فوراً دوسری شادی کی طرف چلا گیا۔ بیٹے کی لاش کے پاس دوسری شادی کا خیال اس کے مزاج کی پستی پر دلالت کرتا تھا۔ اس نے بیٹے کی لاش کو ڈھانپ دیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دوسرے کمرے میں ایک چارپائی پر صفیہ بے ہوش پڑی تھی اور کرم علی کی بیوی صغریٰ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کرم علی!" ملک نظام نے کہا۔ "میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ ظہیر کو حویلی میں نہ جانے دینا۔ خصوصاً کسی لڑکی کے ساتھ۔"

"سرکار! میں نے اسے روکنے کی پوری کوشش کی تھی مگر اس نے میری بات نہیں سنی بلکہ میرا مذاق اڑایا۔ بہرحال جو مقدر میں لکھا ہو' وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔"

"مقدر و قدر سب بکواس ہے۔ اگر انسان احتیاط کرے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ کتنے بجے پیش آیا تھا؟"

"تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کی بات ہے۔ ہم سونے کے لئے بستر پر لیٹ چکے تھے۔ اچانک ہمارے کانوں میں گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ میں بھاگتا ہوا حویلی پہنچا۔ بڑا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دوسرے دروازے دیکھے تو سونے والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر جا کر دیکھا تو ظہیر میاں مر چکے تھے اور یہ لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ دونوں کے قریب خالی پستول پڑا تھا میں دونوں کو باری باری اٹھا کر یہاں لے آیا۔"

"پستول کہاں ہے؟"

"صغریٰ نے کپڑے میں لپیٹ کر صندوق میں رکھ دیا ہے۔"

"تم نے کسی اور کو تو اس معاملے کی خبر نہیں کی۔"

"نہیں سرکار!" کرم علی نے کہا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ایک بات بڑی عجیب ہوئی تھی۔ پہلے میں لڑکی کو اٹھا کر لایا تھا۔ دوسری دفعہ جب میں ظہیر میاں کی لاش اٹھا کر لا رہا تھا تو حویلی کے اندر سے کسی بچے کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔"

یہ بات سن کر ملک نظام نے دوسری طرف منہ کر لیا اور اس کے بدن میں بجلی سی جھرجھری آ گئی۔ بات بدلتا ہوا بولا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

"معلوم نہیں' پہلی دفعہ یہاں آئی ہے۔ غالباً منیبہ نام ہے۔"

"کرم علی! یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہئے۔"

"جو حکم سرکار کا لیکن کچھ تو بتانا ہی پڑے گا۔"

"کہہ دیں گے کہ گھوڑے سے گر کر مر گیا ہے۔ شکار کھیلنے کے لئے آیا تھا اور ہاں اس لڑکی کا ذکر بالکل نہیں آنا چاہئے۔"

"بہت بہتر سرکار۔" کرم علی نے کہا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

"جناب میری بات مانیں تو اس حویلی کو بیچ ڈالیں' یہ ہمارے کسی کام کی نہیں رہی۔"

"کرم علی! میں تو اسے بہت عرصے سے بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی خریدنے پر تیار نہیں ہوتا۔ جو بھی خریدار آتا ہے گاؤں والوں کی باتیں سن کر ڈر جاتا ہے۔ اب تو

اس کے بارے میں دور دور تک مشہور ہو چکا ہے۔ تم بھی خیال رکھنا۔ اگر چند مہینوں تک کوئی خریدار نہ ملا تو میں اسے گرا دوں گا۔"

اسی لمحے کمرے سے صغریٰ نے لڑکی کے ہوش میں آجانے کی خبر سنائی۔ ساتھ ہی لڑکی کے کراہنے کی آواز بھی آئی۔ ملک نظام الدین اور کرم علی کمرے میں پہنچ گئے۔ لڑکی نے آنکھیں کھول دی تھیں اور وحشت زدہ نظر سے چھت کو گھور رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی چیخنا شروع کر دے گی۔ اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"نن .... نہیں! نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے گویا کسی حملہ آور کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ "مجھے کچھ نہیں کہو' ہٹاؤ اسے۔" اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔

"گھبراؤ نہیں بیٹی۔" صغریٰ اسے لپٹاتی ہوئی بولی۔ "یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"یہ بچہ .... یہ بچہ میرا گلا گھونٹ ڈالے گا۔ اسے .... اسے روکو۔"

ملک نظام کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کا تصور ایک دم بائیس سال پیچھے چلا گیا۔ وہ معمہ آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے سلمیٰ کے نوزائیدہ بچے کو آتش دان میں پھینک دیا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد طفیل نے باغ میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنی تھی اس کے بعد وہ لیڈی ڈاکٹر بھی غائب ہو گئی تھی اور ہزار کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔

"یہاں کوئی بچہ نہیں ہے بیٹی۔" صغریٰ کہہ رہی تھی۔ "اور بچے تو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔"

"ہاں .... ہاں!" منیبہ نے کہا۔ "بچے کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ بچے تو بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ تو کوئی شیطان تھا۔ اف میرے خدا! میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ مجھے گھر پہنچا دو۔"

"صغریٰ!" ملک نظام نے کہا۔ "جا دودھ کا گلاس بنا لا!"

صغریٰ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ملک نظام چارپائی پر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ منیبہ کے کندھے پر رکھا تاکہ اسے تسلی دے لیکن منیبہ تڑپ کر پیچھے ہو گئی۔ "تت .... تم اس ذلیل شخص کے باپ ہو۔" اس نے ہسٹریائی انداز میں کہا۔ "وہی جو مجھے بے آبرو کرنے کے لئے حویلی میں لایا تھا۔ مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ۔ اگر قدرت بروقت میری حفاظت نہ کرتی تو میں زندگی بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔"

"لڑکی!" ملک نظام غرایا۔ "زیادہ زبان درازی نہیں کر۔ جانتی نہیں ہم کون ہیں۔ ہم اس علاقے کے بادشاہ ہیں۔ ادب سے بات کر۔"

صفیہ کی بات سے اس کی انانیت مجروح ہو گئی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر دوبارہ ایک متکبر اور جابر شخص بن گیا تھا لیکن صفیہ پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔

"تُو کیسا بادشاہ ہے۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "کہ تجھے اپنے بیٹے پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ کیا تُو نے اسے یہی سکھایا تھا کہ دوسروں کی بیٹیوں کی عزت و آبرو لوٹتا پھرے۔"

"زبان کو لگام دے لڑکی! ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس دولت اور عزت ہے۔"

"اگر تجھے اتنا ہی اختیار ہے تو ذرا اپنے بیٹے کو زندہ تو کر کے دکھا۔"

"سرکار! لڑکی ہوش میں نہیں ہے۔" کرم علی نے کہا۔ "اس کی بات پر دھیان نہ دیں۔"

"کرم علی ہم اس کے ہوش ٹھکانے لگانے کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں۔"

"تُو کیا بگاڑ لے گا میرا۔" صفیہ کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ملک نظام پر جھپٹی۔ "بول کیا کر لے گا تُو میرا' بولتا کیوں نہیں' عزت اور دولت والے۔"

ملک نظام ایک دم چارپائی سے اٹھ گیا اور کسی وحشی کی طرح غرایا۔ "لڑکی۔ ہم تجھے زندہ زمین میں دفن کرا دیں گے۔ کوئی ہم سے جواب طلبی نہیں کر سکتا۔ اس پورے علاقے کے سرکاری افسر ہمارے وظیفہ خوار ہیں۔ سب ہمیں جھک کر سلام کرتے ہیں۔"

"سرکار! سرکار! لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔" کرم علی نے کہا۔ "اس سے الجھنا بے کار ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں یہ کیا بک رہی ہے اور کس سے مخاطب ہے۔"

"تُو چپ رہ بڈھے بگلے۔" صفیہ چلائی۔ "میں تم دونوں سے زیادہ ہوش میں ہوں اور تُو مجھے قتل نہیں کر سکتا۔ تیرے بیٹے نے بھی تکبر کیا تھا۔ دیکھ اب وہ کہاں ہے۔ انگلی بھی نہیں ہلا سکتا۔ زیادہ بڑی بڑی باتیں نہ کر۔ اگر بادشاہوں کے بادشاہ' میرے مالک خدا کی غیرت جوش میں آگئی تو تُو اپنے پیروں پر چل کر اس کمرے سے باہر نہیں جا سکے گا۔ [illegible] بیٹے کو خدا نے ایک بچے کے ہاتھوں ہلاک کروا دیا۔ اگر تُو نے اپنے ناپاک

ہاتھ میری طرف بڑھائے تو تیرا بھی یہی حشر ہو گا۔"

ملک نظام غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر کرم علی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کرم علی! اب کمرے سے باہر چلا جا اور باہر سے کنڈی لگا دے۔"

"سرکار! اس وقت مناسب نہیں۔"

"نکل جا کرم علی۔" ملک نظام غرایا۔ "ہمیں مت بتا کہ کس وقت کیا مناسب ہے۔"

کرم علی نے بے بسی کے ساتھ صفیہ کی طرف دیکھا اور افسردگی کے ساتھ سر ہلاتا ہوا اور دروازے کی طرف مڑا۔ عین اسی وقت کسی بچے کی دردناک آواز رات کے سناٹے میں ہوا کے دوش پر آتی سنائی دی۔ انتہائی واضح اور پُرسوز آواز تھی۔

"کک .... کرم علی! .... یہ .... یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔" ملک نظام الدین کی آواز کانپ رہی تھی۔ کرم علی نے دروازہ کھولا اور باہر پھیلی ہوئی چاندنی میں گھورنے لگا۔ آواز دوبارہ سنائی دی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دوسری مرتبہ وہ آواز نسبتاً زیادہ قریب سے سنائی دی تھی۔

"مجھ سے پوچھو یہ آواز کس کی ہے؟" صفیہ چلائی۔ "یہ خدا کے غضب کی آواز ہے۔ یہ اس بچے کی آواز ہے جس نے تیرے بدکردار بیٹے کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔ اس نے بھی بری نیت سے میری طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور اب تُو نے بھی وہی قصد کیا ہے۔ ذرا ٹھہر جا! ابھی تجھے پتا چل جائے گا کہ کون بااختیار ہے' تُو یا اس کائنات کا مالک خدا۔"

ملک نظام الدین کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بلکہ وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ اس کی ٹانگیں جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ "کرم علی! یہ دروازہ بند کر دے۔"

کرم علی نے دروازہ بند کر دیا لیکن بچے کے رونے کی پُرسوز آواز بدستور آ رہی تھی۔ چاندنی رات کے سناٹے میں وہ آواز پوری کائنات پر محیط معلوم ہوتی تھی۔ اس آواز میں ایک فریاد تھی' کرب اور بے چینی تھی۔ انتقام کی بے چینی۔ چند لمحے تک کمرے میں مکمل سناٹا چھایا رہا۔ صفیہ بستر پر لیٹ گئی تھی اور لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ آواز سن کر اسے حویلی میں رونما ہونے والا خوفناک منظر یاد آگیا تھا۔

"لڑکی! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔" ملک نظام نے کہا

تاہم اس کے لہجے میں نخوت کی جھلک بدستور موجود تھی۔ "میں تمہیں گھر پہنچانے کا انتظام کر دیتا ہوں لیکن پہلے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور دوسری بات یہ کہ حویلی میں جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے بھول جاؤ۔ اگر تم نے کسی سے اس بات کا ذکر کیا تو تمہیں بہت سارے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے جو تم نہیں دے سکو گی۔"

صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صغریٰ جو دودھ کا گلاس لئے دیر سے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ آگے بڑھی اور سہارا دے کر صفیہ کو اٹھانے لگی۔

نظام پیلس ایک پرانی وضع کا بنگلہ تھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن کے نواحی علاقے میں واقع تھا اور تمام جدید سازو سامان سے آراستہ تھا۔ اس کے باوجود وہ سونا سونا لگ رہا تھا۔ درحقیقت گھر کی رونق سامان سے نہیں، مکینوں سے ہوتی ہے۔ جہاں بچوں کی چیخ و پکار اور بڑوں کے قہقہے نہ ہوں وہاں کوئی شے خوشگواری پیدا نہیں کر سکتی۔ خواہ اس میں دنیا کی تمام چیزیں ہی کیوں نہ سجا دی جائیں۔ وہ ایک عجائب گھر تو بن سکتا ہے۔ خوش و خرم گھر نہیں بن سکتا۔

ملک نظام الدین کشادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس عجائب گھر کو گھر بنانے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ بظاہر اس کی دوسری شادی میں کوئی بات مانع نہیں تھی۔ اس کے پاس دولت، عزت اور اختیار سب کچھ تھا۔ وہ جس عمر کی لڑکی سے چاہتا شادی کر سکتا تھا لیکن گزشتہ دو ہفتوں سے وہ مسلسل ایک پریشان کن خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب میں وہ کیا دیکھتا تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ ہر طرف دھوم دھام اور شادیانے بج رہے ہیں۔ پھر وہ ایک دم دیکھتا ہے کہ تمام رسومات ختم ہو چکی ہیں اور وہ حجلۂ عروسی میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ وہ انتہائی حسین اور کم عمر لڑکی ہے۔ وہ بڑے شوق کے ساتھ لڑکی کا گھونگھٹ اٹھاتا ہے۔ اچانک وہ کیا دیکھتا ہے کہ دلہن کی گود میں ایک نوزائیدہ بچہ ہے جیسے ہی وہ گھونگھٹ اٹھاتا ہے۔ دلہن بچے کو ہاتھوں پر اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتی ہے اور کہتی ہے۔ "لیجئے یہ تحفہ، بہت عرصے سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔" بچے کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

وہ معمولی کی بیشی کے ساتھ یہ خواب کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا اور یہی بات اس کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ ملازم نے اندر

آ کر کسی ملاقاتی کی خبر دی۔

"کون ہے وہ؟"

"جی، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" ملازم نے کہا۔ "اس نے یہ کارڈ دیا ہے اور کہتا ہے کہ وہ حویلی خریدنا چاہتا ہے۔" ملک نظام نے کارڈ لے کر دیکھا اس پر "صیاد گل، آرکیٹکچرل انجینئر" لکھا تھا۔ "اندر بھیج دو۔" اس نے ملازم سے کہا۔

چند لمحوں بعد ایک دراز قد، وجیہہ اور پُروقار نوجوان نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ چاکلیٹی رنگ کے صاف اور بے داغ سوٹ میں ملبوس تھا۔ سیاہ بوٹ پالش سے چمک رہے تھے۔ ان پر ذرا سی بھی گرد نہیں تھی۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس، آنکھوں پر پتلے فریم کا چشمہ، پیشانی کشادہ اور چہرے پر گہری متانت، مجموعی طور پر وہ ایک متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ عمر بائیس تیئیس برس کے لگ بھگ تھی۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا اور جسم مضبوط تھا۔ وہ دروازے میں رکا اور بولا۔ "میں اندر آ سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ شستہ اور اثر انگیز تھا۔

ملک نظام الدین کو وہ نوجوان عجیب اور حیرت انگیز محسوس ہوا۔ وہ کبھی کسی شخص سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا جتنا اس نوجوان سے۔

وہ لاشعوری طور پر اس نوجوان کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "تشریف لائیے۔" اس نے سلام کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آئیے، بیٹھئے۔"

نوجوان شکریہ ادا کرتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا اور بریف کیس سامنے میز پر رکھ دیا۔ ملک نظام الدین کو اپنے رویے پر حیرانگی بھی ہوئی۔ وہ عام طور پر تُو تڑاک سے بات کیا کرتا تھا۔ "آئیے بیٹھئے۔" اس کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ پھر اس نوجوان کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن کوئی اندرونی جذبہ اسے نوجوان کی تکریم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ نوجوان نے کمرے کی آرائش پر ایک پُرستائش نظر ڈالی اور بولا۔ "آپ کا ذوق عمدہ ہے لیکن ایک چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔"

"کس چیز کی کمی؟"

"خیر، مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔" نوجوان بات بدلتا ہوا بولا۔ "آپ میرا نام تو جان ہی چکے ہیں۔ مجھے صیاد گل کہتے ہیں۔ میں آج ہی کراچی سے آیا ہوں۔" اس نے جیب سے ایک اخباری تراشا نکالا جو بڑی صفائی کے ساتھ تہہ کیا ہوا تھا۔ اسے کھولا اور ملک نظام کی طرف بڑھایا۔ "یہ اشتہار آپ ہی نے دیا تھا؟"

ملک نظام نے دور ہی سے اشتہار پہچان لیا تھا۔ وہ اشتہار قصر سنبل کی فروخت کے سلسلے میں تھا۔ "جی ہاں! یہ اشتہار ہم نے ہی دیا تھا۔"

"میں یہ عمارت خریدنا چاہتا ہوں۔" صیاد گل نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "اس کی قیمت کتنی ہے؟"

ملک نظام نے تعجب سے صیاد گل کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ عمارت کو دیکھے بغیر سودا کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "یا آپ اسے دیکھ کر آئے ہیں؟"

"جی نہیں! میں نے ابھی تک عمارت نہیں دیکھی' لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ قیمت بتائیں۔"

ملک نظام نے اتنی سیدھی بات کرنے والا شخص آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ قدرے تامل کرتا ہوا بولا۔ "شروع میں ہم اسے پچاس ہزار میں فروخت کرنا چاہتے تھے لیکن اب بعض وجود کی بنا پر اس کی قیمت کم کر دی ہے۔ عمارت اور باغ کا ملا جلا رقبہ دو ایکڑ کے قریب ہے۔"

"تقریباً تیس ہزار کی تو خالی زمین ہی ہے۔"

"یقیناً ہو گی۔" صیاد گل نے کہا اور ملک نظام کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

ملک نظام کو اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ چھتیس ہزار میں قصر سنبل اور اس سے ملحقہ زمین فروخت کرنے پر تیار تھا۔ یہ نوجوان عجیب تھا۔ ابھی تک اس نے قیمت کے بارے میں ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا تھا۔ شاید اسے یہ نہیں معلوم کہ عمارت آسیب زدہ ہے۔

"اگر آپ واقعی اسے خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کے لئے اس کی قیمت چالیس ہزار ہو گی۔" ملک نظام نے کہا۔

"چالیس ہزار۔"

"جی ہاں چالیس ہزار۔"

صیاد گل نے کچھ کہے بغیر بریف کیس کھولا۔ اندر سے چیک بک اور طلائی بال پین نکالا چیک لکھنے لگا۔ ملک نظام دم بخود رہ گیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"چیک کس کے نام بناؤں؟" صیاد اس کے سوال کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

"اگر میں آپ کی جگہ پر ہوتا تو عمارت کے بارے میں تحقیقات ضرور کر لیتا۔ بہر حال جیسے آپ کی مرضی۔ چیک میرے نام کا بنائیں یعنی ملک نظام الدین کے نام کا۔ ایک بات اچھی طرح واضح کر دوں کہ سودا ہو جانے کے بعد میں آپ کی کوئی شکایت نہیں سنوں گا۔ کوئی اور ہوتا تو میں اتنی بات بھی نہ کہتا لیکن معلوم نہیں کیا بات ہے' آپ کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ جیسے آپ کے ساتھ پہلے بھی کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔"

صیاد گل نے چیک پھاڑ کر ملک نظام کی طرف بڑھا دیا۔ ملک نظام نے چیک لے کر اس پر سرسری سی نظر ڈالی اور اسے میز پر رکھ دیا۔ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

"اچھا ملک صاحب!" صیاد بریف کیس بند کرتا ہوا بولا۔ "یہ چیک کراچی کے بینک کا ہے۔ ایک ہفتے سے پہلے کیش نہیں ہو گا۔ لہٰذا کاغذات بھی اسی وقت بنائے جائیں گے۔"

"ٹھہریں صیاد صاحب۔" ملک نظام اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "آپ یہ حویلی نہ خریدیں' اپنا چیک اٹھا لیں۔"

"کیوں! کیا چالیس ہزار کم ہیں؟"

"نہیں' بلکہ زیادہ ہیں۔ عجیب بات ہے' آپ سے کچھ چھپانے کو جی نہیں چاہتا اور دراصل حویلی رہائش کے قابل نہیں ہے۔"

"آپ نے میرے کارڈ کو غور سے نہیں دیکھا۔ میں آرکیٹکچرل انجینئر ہوں اور ناقابل رہائش عمارتوں کو رہائش کے قابل بنانا میرا پیشہ ہے۔ میں حال ہی میں امریکہ سے آرکیٹکچرل انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آیا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ ہرگز کوئی فکر نہ کریں۔"

"دراصل بات یہ ہے کہ .... عمارت آسیب زدہ ہے۔"

"بس اتنی سی بات ہے؟ میں سمجھا کوئی خطرناک معاملہ ہے۔ اطمینان رکھیں اگر ضرورت پڑی تو ہم آسیب کے ساتھ دوستی کر لیں گے۔ چیک رکھ لیں اور ایک چھوٹی سی رسید بنا دیں۔"

ملک نظام چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "اگر آپ سب کچھ جاننے کے باوجود حویلی خریدنے پر مصر ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تب بھی آپ ایک دفعہ حویلی ضرور دیکھ لیں۔" وہ اٹھا اور الماری کی دراز سے چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ "یہ حویلی کی چابیاں رکھ لیں اور کسی وقت حویلی دیکھنے جائیں۔"

صیاد چابیاں لیتا ہوا بولا۔ "میں حویلی ضرور دیکھنے جاؤں گا لیکن سودا پکا ہی سمجھیں۔" وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "مجھے اجازت ہے؟"

ملک نظام الدین اس کے چہرے کو گھورتا ہوا بولا۔ "آپ کا چہرہ کچھ مانوس سا لگتا ہے۔ کیا ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ امید ہے آئندہ بھی ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔" اس نے بریف کیس اٹھایا اور باوقار انداز میں چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ملک نظام الدین بھنویں سکیڑ کر سوچنے لگا کہ وہ اس نوجوان سے کب اور کہاں مل چکا ہے۔

☆--------☆--------☆

"لیجئے ممی!" صیاد گل نے کہا۔ "ہر چیز آپ کی مرضی کے مطابق تیار ہے۔" دونوں قصر سنبل کے اس وسیع ہال میں کھڑے تھے جو تین کمروں کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔

جس خاتون کو صیاد گل نے ممی کہہ کر مخاطب کیا تھا وہ سینتالیس برس کی ایک پُروقار اور متین خاتون تھی۔ چہرہ گول اور بھرا بھرا سا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں عزم اور خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ اس کے بال گو جزوی طور پر سفید ہو چکے تھے لیکن خوبصورت لگتے تھے۔ وہ جارجٹ کی پھولدار ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک پُر اثر اور پُر کشش شخصیت کی مالک تھی۔

وہ ڈاکٹر عذرا گل تھی۔

وقت نے اس کی شخصیت میں زبردست نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ تیئس سال بعد ایک بار پھر اس کمرے میں کھڑی تھی جہاں صیاد گل کے جڑواں بھائی کو اس نے آتش دان میں جلتے دیکھا تھا۔ پھر وہ آگ انتقام بن کر اس کے سینے میں بھڑک اٹھی تھی اور گزشتہ تیئس برس سے بھڑک رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے شادی نہیں کی۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ صیاد جسے وہ پیار سے سعید کہا کرتی تھی' کی تربیت اور ملک نظام الدین سے انتقام! اس پورے عرصے میں گمنام زندگی گزارتی رہی۔ کراچی میں اس کا اپنا کلینک تھا جو خوب چل رہا تھا۔ صیاد کو ابھی تک اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ عذرا گل اس کی ماں ہے اور اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔

عذرا گل کے انتقام کا منصوبہ اب تکمیل کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ قصر سنبل کی خریداری بھی اس منصوبے کی ایک کڑی تھی ....

"ممی! آپ کی ہدایت کے مطابق ...." صیاد بات جاری رکھتا ہوا بولا۔ "آتش دان کو توڑ کر بڑا کر دیا گیا ہے۔ کمرے کے پرانے دروازے نکال کر اسٹیل کے مضبوط دروازے لگا دیئے ہیں۔ یہ بائیں طرف جو اسٹیج بنا ہوا ہے' پہلے یہاں خواب گاہ تھی۔"

"مجھے معلوم ہے بیٹے!" عذرا گل نے کہا۔ اسے وہ جگہ کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں صیاد اور اس کے جڑواں بھائی نے جنم لیا تھا۔ وہاں اب ایک فٹ اونچے اسٹیج کے اوپر ایک بڑی سی میز اور میز کے پیچھے اونچی پشت والی کرسی رکھی تھی۔ میز کے سامنے دس فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر دو قطاروں میں بارہ سیدھی پشت والی کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں کے پیچھے دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے کے سامنے کی دو دیواروں کی جگہ پر لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ اس گرل پر سیاہ پینٹ کیا گیا تھا۔ کمرے کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور آرام دہ صوفہ سیٹ لگا تھا۔ میز کے داہنے ہاتھ والے کونے میں بھی ویسا ہی ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ تاہم اس کمرے کی گرل پر سیاہ پینٹ کیا گیا تھا اور وہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف فرش پر ایک سستی قسم کی دری بچھی ہوئی تھی۔ کمرے پر نظر پڑتے ہی یہ گمان گزرتا تھا کہ وہاں کسی عدالت کا سیٹ لگایا گیا تھا۔ ہال کمرے میں دیوار سے دیوار تک سرخ قالین بچھا تھا اور آتش دان والے حصے میں نرم اور آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے۔

"سعید بیٹے' یہ گرل کمزور تو نہیں۔" عذرا گل سیاہ پینٹ والی گرل کو ہاتھ لگاتی ہوئی بولی۔

"ایسا کریں اس گرل کے ساتھ ایک مضبوط اور لمبی زنجیر باندھ دیں۔ زنجیر کے ساتھ دو مضبوط گھوڑے باندھ دیں۔ پھر ان گھوڑوں کو چابک دکھائیں۔ زنجیر ٹوٹ جائے گی' گھوڑے نیڑھے ہو جائیں گے' پر گرل میں خم نہیں آئے گا۔"

"بہت خوب!" عذرا گل آتش دان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئی بولی۔ "سارا کام میری مرضی کے مطابق ہو گیا ہے اب آخری مرحلہ باقی ہے۔"

صیاد صوفے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ کہنیاں صوفے پر اور ٹھوڑی عذرا کے سر پر ٹکا دی۔ "ممی!" اس نے کہا۔ "ویسے تو آپ بہت اچھی ہیں۔ بڑا پیار کرتی ہیں لیکن آپ کی بعض باتیں بہت الجھن میں ڈالنے والی ہوتی ہیں۔" اس کی بات سن کر عذرا نے ایک گہرا سانس لیا اور آتش دان کو گھورنے لگی۔ اس کے چہرے پر کرب ناک تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

"ہاں سعید بیٹے" بالآخر اس نے کہا۔ "میں تم سے بہت کچھ چھپاتی رہی ہوں لیکن

آج میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔"

صیاد صوفے کے اوپر سے گھوم کر سامنے آگیا اور عذرا کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"بیٹے!" عذرا بات جاری رکھتی ہوئی بولی۔ "میں نے جس انداز میں تمہاری پرورش کی ہے اس کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ تمہیں بڑی سے بڑی بات بھی متزلزل نہیں کر سکتی۔ تب بھی بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے لئے سخت صدمے کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لئے میری بات سننے سے پہلے اپنا دل مضبوط کر لو۔"

"مجھے اپنے دل پر پورا اعتماد ہے۔"

"میرے بیٹے! جو کچھ میں تمہیں بتانے والی ہوں اس سے موجودہ صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ صرف تمہارے علم میں اضافہ ہوگا۔ چند چھپی ہوئی تلخ حقیقتیں تمہارے سامنے آجائیں گی۔"

"ممی! آپ نے اتنی لمبی تمہید کبھی نہیں باندھی آپ تو سیدھی اور دو ٹوک بات کیا کرتی ہیں۔ مجھے بھی آپ نے یہی بات سکھائی ہے۔"

عذرا نے گلا صاف کیا اور سامنے رکھی ہوئی میز کو گھورتی ہوئی بولی۔ "جہاں پر میز رکھی ہے۔ پہلے وہاں ایک خواب گاہ تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تمہاری ولادت اس خواب گاہ میں ہوئی تھی۔" عذرا نے کہا۔ "اور میرے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں' ممی!"

"ہاں بیٹے! میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔"

یہ بات تیر کی مانند صیاد کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ تاہم اس نے چہرے سے اندرونی کیفیت کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔

"لیکن!" عذرا بات جاری رکھتی ہوئی بولی۔ "جیسا کہ میں نے ابھی کہا' اس بات سے صرف تمہارے علم میں اضافہ ہوگا۔ صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

"اوہ ممی! یہ ناممکن ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ آپ میری ماں نہیں ہیں؟"

"دیکھو بیٹا! ماں دو وجوہ کی بنا پر ماں کہلاتی ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ وہ بچے کو دنیا میں لاتی ہے اور دوم اس وجہ سے کہ وہ بچے کی پرورش اور تربیت کرتی ہے۔ یہ [illegible]

کرے تو وہ ماں کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ وہ ظالم ہے۔ کیونکہ اس نے ایک معصوم بچے کو پیدا کر کے دنیا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ چونکہ میں نے تمہاری تربیت اور پرورش کی ہے اس لئے تمہاری اصل ماں میں ہوں۔"

"اوہ ممی! آپ نے میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔"

"تمہارے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑنا چاہئے' میرے بیٹے! کیونکہ میں نے تمہیں جو تربیت دی ہے اس کے پیش نظر میں تم سے جذباتی رد عمل کی توقع نہیں رکھتی۔ مجھے فخر ہے کہ تم حقائق کا سامنا کر سکتے ہو اور دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہو۔"

"ممی! کیا آپ میرے ماں باپ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

"کیوں نہیں۔" عذرا نے کہا۔

پھر وہ تیئیس سال قبل شروع ہونے والے ڈرامے کی تفصیلات بیان کرنے لگی۔ کس طرح ملک نظام الدین نے جو صیاد کا ناجائز باپ تھا' اسے قصر سنبل میں بلایا اور کس طرح اس کے جڑواں بھائی کو آتش دان میں پھینک دیا اور پھر وہ کہاں کہاں چھپتی پھری اور کیسے کیسے الزامات اپنے سر لئے۔

صیاد خاموشی کے ساتھ ساری بات سنتا رہا۔ جب عذرا نے بات ختم کی تو اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "آپ واقعی عظیم ہیں ممی! اگر میں آپ کی خاطر خود کو قربان بھی کر دوں تو آپ کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکوں گا۔"

"یہ کمرہ!" عذرا ہاتھ سے اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ "بہت سے لوگوں کے لئے میدان حساب ثابت ہوگا اور اس یوم الحساب کے لئے میں تیئیس سال سے انتظار کر رہی ہوں۔" وہ توقف کرتی ہوئی بولی۔ "میں اس ضمن میں کچھ کام تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔"

عذرا نے پرس کے اندر سے ایک فہرست نکالی اور صیاد کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ "اس فہرست میں چند افراد کے نام اور پتے لکھے ہیں۔ انہیں 3 دسمبر کے دن یہاں بلاؤ گے! تمہیں یاد ہی ہوگا کہ 3 دسمبر تمہاری سالگرہ کا دن ہے۔ میں یہ سالگرہ اس ہال میں منانا چاہتی ہوں اور یہ ایک یادگار سالگرہ ہوگی۔"

"اوہ' میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی بہت مشکل کام میرے سپرد کرنا چاہتی ہیں۔ چند آدمیوں کو سالگرہ پر بلانا بھی کوئی کام ہے۔ سب کو دعوتی کارڈ بھیج دوں گا اور سالگرہ

والے روز خود جا کر ان لوگوں کو میں لے آؤں گا۔ اگر کوئی خوشی سے آنے پر راضی نہ ہوا تو اسے زبردستی اٹھا لاؤں گا۔"

"یہ اس کام کا آسان حصہ ہے۔" عذرا نے کہا۔ "اصل کام سالگرہ کے دن شروع ہو گا۔"

سالگرہ کی دعوت میں وہ تمام لوگ شریک تھے جن کی فہرست عذرا گل نے صیاد کو دی تھی۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جسے لانے کے لئے اسے خاصی محنت کرنی پڑی تھی اور وہ تھا ملک نظام الدین۔ صیاد کے اصرار پر وہ بمشکل آنے پر تیار ہوا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ سورج غروب ہونے سے پہلے اسے فارغ کر دیا جائے گا۔

وہ ایک منفرد قسم کی سالگرہ پارٹی تھی کیونکہ اس میں صیاد کے علاوہ تمام افراد معمر تھے۔ اگرچہ قصر سنبل میں نیا رنگ و روغن کرالیا گیا تھا اور اب وہاں بجلی بھی آچکی تھی لیکن اس کے باوجود وہاں کی فضا کچھ بوجھل بوجھل سی تھی۔ ہر چہرے پر سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کسی کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے اکٹھے ہوئے ہوں۔ اگر کوئی قہقہہ لگاتا تو بڑا کھوکھلا سا معلوم ہوتا تھا۔

حسب پروگرام سورج غروب ہونے سے پیشتر پارٹی ختم ہو گئی۔ ملک نظام، صیاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں اب اجازت چاہوں گا۔"

"ایک چھوٹا سا پروگرام باقی ہے۔" صیاد نے کہا۔

"اس کے بعد آپ کو........" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک معمر شخص کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے میر صاحب سے آپ کا تعارف نہیں کرایا۔"

معمر شخص کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے موٹے شیشوں کا چشمہ پہن رکھا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے اور چہرے سے حکمت و دانائی ٹپکتی تھی۔ صیاد تعارف کرواتا ہوا بولا۔ "آپ ریٹائرڈ جسٹس میر سجاد علی صاحب ہیں اور میر صاحب! آپ اس علاقے کے رئیس ملک نظام الدین صاحب ہیں۔"

دونوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

"میرا خیال ہے کہ ملک صاحب سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔" جسٹس سجاد علی نے کہا۔ "ملک صاحب! غالباً آپ کو یاد ہو گا کہ آپ ایک مقدمے کے سلسلے میں میری عدالت میں آئے تھے۔"

"ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔" ملک نظام نے کہا۔ "ہم لوگ تو ہر وقت کسی نہ کسی مقدمے میں الجھے رہتے ہیں۔"

حالانکہ اسے مقدمے کے بارے میں فوراً ہی یاد آگیا تھا۔ وہ ایک اغوا کا مقدمہ تھا جس میں وہ ملزم کی حیثیت سے پیش ہوا تھا۔ مقدمہ اگرچہ سچا تھا لیکن وہ وکیلوں کی مدد سے باعزت بری ہو گیا تھا۔

"عدالت کے ذکر سے یاد آیا کہ آج ہم یہاں بھی ایک چھوٹی سی عدالت لگانا چاہتے ہیں۔" صیاد نے کہا۔ "اور ہم سب اس عدالتی کارروائی میں شریک ہوں گے۔"

"مجھے تو اس بچگانہ ڈرامے سے معاف ہی رکھیں۔" ملک نظام نے کہا۔

"معافی تو عدالت ہی دے سکتی ہے۔" صیاد نے بظاہر مزاح کے رنگ میں کہا۔

"کیسی عدالتی کارروائی کی بات ہو رہی ہے؟" ایک دراز قد شخص نے پوچھا۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ بال جزوی طور پر سفید ہو چکے تھے اور صحت بہت اچھی تھی۔

"آیئے کرنل شاہ نواز صاحب!" صیاد نے کہا۔ "ہم ایک چھوٹا سا عدالتی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یقیناً ہونا چاہئے۔" ریٹائرڈ کرنل شاہ نواز نے کہا۔ "محفل میں کچھ گہما گہمی نہیں ہے۔ ابھی میں دو وکیلوں سے بات کر رہا تھا۔ جسٹس صاحب بھی موجود ہیں۔" پھر وہ داہنی طرف رکھی ہوئی بڑی سی میز اور اونچی سی پشت والی کرسی کو گھورتا ہوا بولا۔ "اس طرف تو عدالت کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ غالباً آپ نے پہلے سے تیاری کر رکھی ہے۔"

ملک نظام نے آنکھیں گھما کر ایک فٹ اونچے اسٹیج پر رکھی ہوئی میز کی طرف دیکھا۔ ہولے سے سر ہلایا اور کسی سے کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف چل دیا۔

کرنل شاہ نواز بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ملزم کون ہو گا؟"

صیاد نے کنکھیوں سے ملک نظام کو دروازے کی طرف جاتے دیکھا اور کہا۔ "ملزم کا انتخاب بہت آسان ہے۔ جو اس کھیل سے بھاگنے کی کوشش کرے گا وہی ملزم ہو گا۔" پھر وہ جسٹس سجاد کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "کیوں نہ کارروائی شروع کی جائے۔ یہ کوئی سوچنے کی بات نہیں کہ اس عدالت کا جج کون ہو گا۔ اس منصب کے لئے آپ سے بہتر کوئی شخص نہیں ہو سکتا لہذا میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ کرسی عدالت پر تشریف

لے جائیں۔ آیئے۔"

جسٹس سجاد نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ صیاد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں نے نوجوانوں کو کبھی مایوس نہیں کیا۔" پھر وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا اسٹیج پر گیا اور اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" اچانک دروازے کی طرف سے ملک نظام کی آواز گونجی۔ وہ دروازے کے ہینڈل کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔ "یہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا۔"

باتوں کا شور تھم گیا اور سب لوگ ملک نظام کی طرف دیکھنے لگے۔ "غالباً دروازہ جام ہو گیا ہے۔" صیاد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اس طرف سے چلے جائیں ملک صاحب۔" اس کا اشارہ سیاہ گرل والے کمرے کی طرف تھا۔ "اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا ہے۔"

ملک نظام نے شک آمیز نظر سے گرل والے کمرے کی طرف دیکھا۔

"جی تشریف لایئے۔" صیاد نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ملک نظام تامل کرتا ہوا آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر اس سامنے نظر آنے والے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور زور سے جھٹکا دیا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ "اوہ، لعنت ہو۔" ملک نظام تیزی سے پیچھے گھومتا ہوا بولا۔ "یہ کیا مذاق ہے۔" اتنے میں صیاد سیاہ گرل والے اندرونی دروازے کو تالا لگا کر چابی جیب میں ڈال چکا تھا اور اب ملک نظام سیاہ گرل والے دروازے میں بند ہو چکے تھے۔

"کوئی مذاق نہیں ہے ملک صاحب!" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "ابھی میں کرنل شاہ نواز سے کہہ رہا تھا کہ جو شخص اس کھیل سے بھاگنے کی کوشش کرے گا وہی ملزم ہو گا اور مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آپ نے جلد ہی میرا مسئلہ حل کر دیا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ دروازہ فوراً کھولو۔" ملک نظام دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو پکڑتے ہوئے بولا۔ حاضرین میں تین افراد ایسے تھے جن سے وہ مدد حاصل کر سکتا تھا۔ ایک اس کا ڈرائیور محمد طفیل تھا دوسرا اس کا ملازم کرم علی تھا اور تیسرا ریٹائرڈ ڈی ایس پی منظور شاہ تھا۔ وہ کسی زمانے میں عادل نگر میں تھانیدار رہ چکا تھا۔ اس پر ملک نظام کے بڑے احسانات تھے۔ "او طفیل!" ملک نظام چلایا۔ "کرم علی! کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، پکڑو اس کو اس کی جیب سے چابی نکالو اور دروازہ کھولو۔"

طفیل اور کرم علی صیاد کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ طفیل کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ اور کرم علی تقریباً ساٹھ سال کا تھا۔ اس کے چہرے پر خشخشی داڑھی نظر آ رہی تھی۔ "یہ مذاق اچھا نہیں ہے جی۔" طفیل نے کہا۔ "دروازہ کھول دیں۔"

"میں نے کوئی مذاق نہیں کیا۔" صیاد نے کہا۔ "اگر تم لوگ بیٹھ جاؤ تو عدالت کی کارروائی شروع کی جائے۔"

دیگر افراد کے چہروں پر اب حیرت نظر آ رہی تھی۔ ابھی تک وہ پوری طرح صورت حال کو نہیں سمجھ پائے تھے۔

"اوئے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" ملک نظام پنجرے میں بند شیر کی طرح غرایا۔ "یہ چیز کیا ہے تم لوگوں کے سامنے۔"

"ملک جی ہم فساد نہیں کرنا چاہتے۔" طفیل نے کہا۔ "ذرا آرام سے بات کرنے دیں۔"

"اوئے منظور شاہ۔" ملک نظام بے چینی سے چیخا۔ "تو کیوں چپ بیٹھا ہے۔ اٹھ کر اپنی تھانیداری تو دکھا۔"

منظور شاہ اٹھ کر صیاد کے قریب آ گیا۔ اس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی اور چہرے پر داڑھی نظر آ رہی تھی۔

"دیکھو برخوردار!" اس نے کہا۔ "یہ بڑی نامناسب بات ہے دروازہ کھول دو۔ ملک صاحب تمہارے باپ کے برابر ہیں اگر تم عدالت کا کھیل کھیلنا چاہتے ہو تو اس میں کسی کی دل آزاری نہیں ہونی چاہئے۔"

"یہ کیا معاملہ ہے صیاد!" جسٹس سجاد نے پوچھا۔

"حضرات!" صیاد نے جملہ حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہ نہ تو مذاق ہے اور نہ کوئی کھیل۔ یہ شخص قاتل ہے۔ اس نے اسی کمرے کے اندر ایک معصوم اور بے گناہ کو قتل کیا تھا لیکن نہ تو اس پر کوئی مقدمہ کیا گیا اور نہ ہی اسے سزا ملی۔" یہ سنتے ہی ملک نظام کسی وحشی درندے کی طرح شور مچانے لگا طفیل اور کرم علی اچانک صیاد پر جھپٹ پڑے۔ دو افراد دروازے کی طرف بڑھے اور اس پر زور آزمائی کرنے لگے۔ صیاد نے طفیل کے پیٹ میں زوردار گھونسا ماری وہ پیٹ پکڑ کر جھکتا چلا گیا۔ پھر اس نے کرم علی کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کیا اور اسے منظور شاہ کی طرف دھکیل دیا۔ دھکا خاصا زوردار تھا دونوں کا توازن بگڑ گیا اور وہ کراہتے ہوئے فرش پر گر گیا۔

جسٹس سجاد علی کرسی سے اتر کر نیچے آگئے۔ "صیاد!" انہوں نے کہا۔ "میں اس ہنگامے میں فریق نہیں بن سکتا۔ دروازہ کھولو تاکہ ہم جائیں۔ اگر یہ شخص واقعی قاتل ہے تو تمہیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے قانون اپنے ہاتھ میں لینا بھی جرم ہے۔" وہ یہ بات ہی کر رہے تھے کہ کرنل شاہ نواز خاموشی سے صیاد کے پیچھے پہنچا اور نہایت تیزی کے ساتھ اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"کرم علی!" اس نے کہا۔ "اس کی جیب سے چابیاں نکالو۔" کرم علی ہاتھ ملتا ہوا آگے بڑھا۔ صیاد نے کرنل شاہ نواز کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور دونوں پیروں کے ساتھ کرم علی کے سینے پر ٹھوکر لگائی۔ چوٹ خاصی زور دار تھی۔ کرم علی قالین پر گرا اور گرتے ہی واویلا کرنے لگا۔ ادھر دہرے دباؤ کی وجہ سے کرنل شاہ نواز کے پیر اکھڑنے لگے اور وہ صیاد سمیت قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی صیاد اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے کمرے کی فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ لمحے بھر کے لئے ہر شخص اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا اور یہ دیکھنے لگا کہ یہ گولی کہاں سے آئی ہے؟

"اب کوئی شخص ہنگامہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔" اچانک سلور گرل والے کمرے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ہر نظر متکلم کی طرف گھوم گئی۔ کمرے کے اندر انھوں نے ایک پُر وقار اور حسین خاتون کو کھڑے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اڑتیس بور کا آٹومیٹک پستول نظر آرہا تھا جس کی نال سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر نکل رہی تھی۔ "یہ میں نے ہوائی فائر کیا تھا۔" اس نے کہا۔ "لیکن بوقت ضرورت میں تم میں سے کسی کو بھی نشانہ بنا سکتی ہوں۔"

کرنل شاہ نواز اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ "عذرا گل تم!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ لمحہ بھر کے بعد ملک نظام اور اس کے ڈرائیو طفیل نے بھی اسے پہچان لیا۔ سردی کے باوجود ملک نظام کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ صورت حال سنگین ہے۔

"جسٹس سجاد علی صاحب!" عذرا گل نے واضح آواز میں کہا۔ "آپ سے گزارش کروں گی کہ کرسی عدالت پر تشریف رکھئے تاکہ مقدمہ پیش کیا جا سکے۔"

جسٹس سجاد گلا صاف کرتا ہوا بولا۔ "میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ معاملہ کیا

"آپ ہر چیز بخوبی سمجھ جائیں گے۔" عذرا گل نے کہا۔ "آپ تشریف رکھئے تو معاملہ پیش کروں۔"

"اگر آپ اس بات پر مصر ہیں تو میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔" جسٹس سجاد نے کہا اور جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لیجئے اب بتایئے کہ معاملہ کیا ہے۔"

ڈاکٹر عذرا گل ان دو افراد کی طرف دیکھنے لگی جو بیرونی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دونوں فوجداری مقدمات کے وکیل تھے۔ دونوں میں سے ایک سیاہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا اس کا نام انصار برنی تھا۔ وہ دبلا پتلا آدمی تھا اور عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ دوسرا وکیل سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب تھی۔ اس کا نام کمال احمد تھا اور شکل و صورت سے خاصا تیز و طرار نظر آتا تھا۔

"جناب والا!" عذرا گل نے کہا۔ "میں آپ کے سامنے ایک فوجداری مقدمہ پیش کرنا چاہتی ہوں اور جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے سعید میرا مطلب ہے صیاد نے کہا ہے کہ اس مقدمے کا بڑا ملزم ملک نظام الدین ہے۔ لہٰذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقدمے کی کارروائی میں مدد دینے کے لیے دو وکیل مقرر کر لئے جائیں۔ ایک وکیل استغاثہ اور ایک وکیل صفائی۔"

"نہیں۔" انصار برنی نے کہا۔ "یہ ایک نامعقول بات ہے۔ کوئی قانون ایسے قانون نافذ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"یہاں قانون کی نہیں انصاف کی بات ہو رہی ہے۔" عذرا گل نے کہا۔ "اگر آپ لوگ تعاون نہیں کریں گے تو اس حویلی کے دروازے کبھی نہیں کھلیں گے۔"

"کیوں نہیں۔" کمال احمد نے کہا۔ "اس وقت ہم ایک ناگوار صورت حال سے دوچار ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ خاتون کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ملک صاحب امید ہے کہ آپ بھی ہماری مدد کریں گے۔" انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ گلے میں پڑی ہوئی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بات کر رہا ہو۔ ملک نظام الدین اتنی آسانی سے بات ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ کافی دیر تک ہنگامہ کرتا رہا۔ جسٹس سجاد علی نے علیحدگی میں اسے سمجھایا کہ اگر وہ یونہی ہنگامہ کرتا رہا تو نہ تو وہ خود ہی یہاں سے نکل سکے گا اور نہ دوسرے افراد۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ وہ بات سن لی جائے۔ تب وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔

جسٹس سجاد علی کرسی عدالت پر بیٹھ گیا۔ دونوں وکیل جج کی میز کے سامنے کھڑے ہو

گئے۔ صیاد سلور گرل والے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دیگر افراد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

عذرا گل نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "قبل اس کے کہ عدالت کی کارروائی شروع ہو' ملزم ملک نظام الدین سے استدعا کروں گی کہ وہ اپنی مرضی کا وکیل منتخب کرے۔"

"مجھے اس بے ہودہ کارروائی سے کوئی سرو کار نہیں ہے۔" ملک نظام نے کہا۔ "اور نہ ہی مجھے کسی وکیل کی ضرورت ہے۔ آپ لوگ جو چاہیں کریں' میری بلا سے۔"

"ایسی صورت میں۔" عذرا گل نے کہا۔ "عدالت اپنی صوابدید سے جسے چاہے وکیل مقرر کرے۔"

"میں مسٹر کمال احمد کو وکیل صفائی مقرر کرتا ہوں۔" جسٹس سجاد نے عدالتی لہجے میں کہا۔ "مسٹر کمال احمد آپ ملزم کے پاس آجائیں اور اپنی پوری صلاحیتوں سے اس کا دفاع کریں۔"

کمال احمد' ملک نظام کے کمرے کی گرل سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ انصار ہمنی عذرا کے کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ صیاد نے دونوں وکیلوں کو کاغذات اور قلم مہیا کر دیئے۔

"جناب اعلیٰ!" عذرا گل نے اپنے بیان کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ڈاکٹر عذرا گل ہے اور میں مستغیث کی حیثیت سے اس عدالت کے سامنے پیش ہو رہی ہوں۔ میں جس جرم کی تفصیل آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں وہ آج سے ٹھیک تیئس برس قبل آج کے دن اسی حویلی کے اندر کیا گیا تھا۔ ان دنوں میں عادل نگر کے سرکاری ہسپتال میں متعین تھی۔ شام کے وقت ملزم نظام الدین نے مجھے فون کیا اور ایک ڈلیوری کیس کے سلسلے میں میری خدمات طلب کیں۔ اس نے اپنے ڈرائیور طفیل کو جو اس وقت عدالت میں موجود ہے مجھے لینے کے لئے بھیجا تھا۔ میں اس کے ساتھ اس حویلی میں آئی۔ جس لڑکی کے بچہ پیدا ہونے والا تھا میں نے اس کا معائنہ کیا اور اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ کیس کیا اور نومولود کو ملزم کے پاس لے گئی۔ ایک ضمنی بات عرض کر دوں کہ جب میں اس حویلی میں پہنچی تو رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے۔ یہاں ملزم اور مذکورہ لڑکی جس کا نام بعد میں سلمیٰ اویس معلوم ہوا تھا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ بات میرے لئے حیرت انگیز تھی اور ملزم کا رویہ بھی ناخوشگوار تھا۔ جب میں نومولود کو لے کر ملزم کے پاس پہنچی تو کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی اور وہ ایک آتش دان کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس

نے بچے کو میرے ہاتھ سے ...."

"بند کرو یہ بکواس!" ملک نظام چلایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گرل کو پکڑ رکھا تھا اور غصے سے کانپ رہا تھا۔ "اس عورت کی زبان بند کرو' یہ جھوٹ بک رہی ہے۔"

"آرڈر۔ آرڈر۔" جسٹس سجاد نے اپنے سامنے رکھا ہوا ہتھوڑا اٹھا کر بجایا۔ صیاد نے واقعی عدالت سے متعلقہ ہر چیز وہاں مہیا کر رکھی تھی۔

ملک نظام بدستور چیختا رہا۔ جب بھی عذرا بات کرنے لگتی وہ شور مچانا شروع کر دیتا۔ یہ بات جج اور حاضرین کے لئے دلچسپی کا باعث بن گئی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایسی کون سی بات ہے جو ملک نظام کو خوفزدہ کر رہی ہے۔ کافی دیر چیخنے کے بعد اس کا حلق خشک ہو گیا اور وہ دری پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ جج نے عذرا کو بیان جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

"جناب اعلیٰ! میں جب بھی اس منظر کو یاد کرتی ہوں تو میرے بدن پر لرزا طاری ہو جاتا ہے۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل صفائی نے پہلی بار آواز بلند کی۔ "ڈاکٹر عذرا سے کہا جائے کہ وہ صرف حقائق بیان کریں۔ جذباتی ڈائیلاگ اور اپنے تاثرات سے عدالت پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کریں۔"

"اعتراض منظور کیا جاتا ہے۔ بیان جاری رہے۔"

"جناب اعلیٰ! ملزم نے سلمیٰ اویس نامی لڑکی کے نوزائیدہ بچے کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور میری آنکھوں کے سامنے آتش دان میں پھینک دیا۔"

یہ سنتے ہی حاضرین نے کلمات حیرت ادا کئے اور خوفزدہ نظروں سے ملک نظام کو گھورنے لگے۔

"جناب والا! اس مرحلے میں' میں اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتی تھی مگر وکیل صفائی کے اعتراض کی بنا پر انہیں حذف کرتی ہوں اور اپنے بیان کو حقائق تک محدود رکھتی ہوں۔ بچہ میری آنکھوں کے سامنے جل کر خاک ہو گیا۔ اس کے بعد ملزم نے بقیہ فیس میرے ہاتھ پر رکھی اور اس دروازے میں داخل ہو گیا جو آتش دان کے داہنی طرف نظر آرہا ہے۔"

"جناب والا! اس وقت جس جگہ آپ تشریف فرما ہیں وہاں پہلے خواب گاہ تھی۔ جسے میں نے تڑوا کر اس کمرے میں شامل کرا دیا۔ جب میں خواب گاہ میں سلمیٰ کے پاس واپس آئی تو مسہری پر مجھے ایک اور بچہ نظر آیا۔ پہلے تو میں حیران ہوئی کہ یہ کہاں سے

آگیا لیکن غور کرنے پر مجھے سمجھ میں آیا کہ سلمیٰ نے جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے۔ میں ڈری کہ کہیں ملزم اس بچے کو بھی آگ میں نہ جھونک دے لہٰذا میں نے سلمیٰ کو جلدی جلدی ساری صورت حال سنائی اور بچے کو لے کر اس دروازے سے جو آپ کے عقب میں نظر آرہا ہے' باہر نکل گئی' تھوڑی دیر کے بعد ملزم کو میرے فرار کا علم ہو گیا اور اس نے میرے پیچھے اپنے ملازم دوڑائے۔ بہرحال قسمت اچھی تھی کہ میں اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ پھر میں ڈیڑھ مہینے تک مختلف جگہوں پر پھری۔ مجھے ڈر تھا کہ ملزم میرے گھر کا پتا معلوم کر کے مجھے اور اس معصوم بچے کو قتل نہ کروا دے۔ جب میں اپنے گھر پہنچی تو مجھ پر ایک نئی افتاد آن پڑی۔ میری ماں ایک بچے کو میری گود میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ یہی سمجھی کہ وہ میرا ناجائز بچہ ہے۔ اگلے روز سارے محلے میں یہ جھوٹی خبر مشہور ہو گئی۔ یہاں تک کہ میرے منگیتر نے منگنی توڑ دی اور میری بات سننے سے انکار کر دیا۔ میرے منگیتر کا نام شاہ نواز ہے اس وقت وہ کیپٹن تھا اب کرنل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہو چکا ہے اور اس وقت آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔"

اس مقدمے کی کارروائی لمحہ بہ لمحہ سنسنی خیز ہوتی جا رہی تھی۔ عذرا گل ہر بار ایک نیا انکشاف کر رہی تھی۔ سب لوگ دم بخود بیٹھے تھے کہ دیکھیں آگے آگے یہ کیس کیا رخ اختیار کرتا ہے!

☆------☆------☆

ہوئی۔ ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ پورا کلب پولیس کے قبضے میں ہے۔ سبھوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

ستیہ جیت کمار نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور بولا۔ "اور اس لڑکی کے بارے میں پتہ چلا ہے؟"

"وہی میں آپ کو خاص طور سے دکھانے آیا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک پراسرار لڑکی پہلی بار کلب میں آئی، وہ حسن و جمال میں یکتا تھی۔ دیوا سر خود اٹھ کر اس کی میز پر پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی وہاں سے اٹھ گئی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی انجکشن کا نشان نہ ملا ہے نہ کھانے پینے کی کوئی ایسی چیز جسے اتنا زہریلا کہا جا سکے۔"

"اور تو کوئی خاص بات نہیں؟"

"نہیں مہاراج۔"

"چلو فیصل جلدی سے ست رانی کے چہرے میں تبدیلی کرا دو اور اسے اصلی شکل میں لے آؤ۔"

سارے کام ہو گئے، پھر کئی دن اسی طرح خاموشی سے گزر گئے۔ دوسرا اہم ترین سرکاری عہدیدار زہر خورانی کا شکار ہوا تھا۔ اخبارات نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی تھیں لیکن ابھی تک ست رانی کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی تھی۔

ست رانی بڑی خوش دلی سے یہاں رہ رہی تھی۔ کئی بار وہ سیر کے لئے بھی نکلی تھی، لیکن اس کے لئے ستیہ جیت کمار نے بہترین انتظامات کر دیئے تھے۔ کالے شیشوں کی ایک قیمتی کار ست رانی کو سیر و سیاحت کے لئے دی گئی تھی۔ اور اس کے بعد ستیہ جیت کمار کا آخری شکار تھا بابو پرشانت لعل۔ وہ ستیہ جیت کے بڑے مخالفوں میں سے تھا اور ستیہ جیت کو اس سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔

بابو پرشانت لعل پر بھی جال پھینک دیا گیا۔ ست رانی ایک بالکل ہی انوکھی شکل اور انوکھے انداز میں اس سے ملی تھی اور پرشانت لعل تو زخمی ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے سلسلے میں ست رانی نے کچھ وقت لگایا اور آخر کار اسے موقع مل گیا اور اس نے پرشانت لعل کا بھی کریا کرم کر دیا، لیکن اس کے بعد ایک دم ہنگامہ آرائی ہو گئی تھی کیونکہ بابو پرشانت لعل کے رشتے داروں نے ایک ایسی خوبصورت لڑکی کا تذکرہ کیا تھا جو اچانک کہیں سے نمودار ہوئی تھی اور بابو پرشانت لعل اس کے دیوانے ہو گئے تھے۔

جس رات بابو پرشانت لعل کا دیہانت ہوا اس رات وہ لڑکی آدھی رات تک بابو پرشانت کے ساتھ ان کے فارم ہاؤس پر رہی تھی اور وہیں سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے لڑکی کا حلیہ بھی بتایا اور پولیس نے باقاعدگی کے ساتھ ان تمام چیزوں کو نوٹ کیا۔ بڑے بڑے پولیس آفیسرز کے بیانات آئے اور ان میں سب سے اہم بیان پولیس آفیسر رگھبیر سنگھ ساگا کا تھا،

جس نے انکشاف کیا تھا کہ تین بڑے نامور سیاستدان اور سرکاری عہدے دار یعنی کاشی ناتھ ورما، دیوا سر اور پرشانت لعل زہر خورانی کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں اور تینوں ایک ہی طرح کی موت کا شکار ہوئے، لیکن یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ان کی موت سے کسی لڑکی کا کیا تعلق ہے۔

تینوں کے ساتھ الگ الگ لڑکیاں دیکھی گئی تھیں اور ڈاکٹروں سے تجزیے کرائے جا رہے تھے کہ آخر ایسا کون سا مشترکہ زہر ہے جو ان کے جسموں میں داخل ہوا ہے۔ ڈاکٹروں کا پینل اس سلسلے میں تحقیقات کر رہا تھا۔

ستیہ جیت کمار جانتا تھا کہ اس پر بہت سی ذمہ داریاں مسلط کی جائیں گی۔ آخر کار اخباری رپورٹر اس کے پاس پہنچ گئے۔ ستیہ جیت کمار اپنے لئے آئندہ کا لائحہ عمل طے کر چکا تھا۔ وہ اخباری نمائندوں کو انتہائی نڈھال اور نروس ملا۔ اس نے نحیف اور کمزور لہجے میں کہا۔

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ کوئی پراسرار قوت سرکاری عہدیداروں کے پیچھے لگ گئی ہے۔ اپوزیشن کو ٹٹولا جائے اور تفتیش کی جائے کہ ان تینوں میں کون سی چیز مشترک تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ میں اپنے گرد سیکیورٹی چاہتا ہوں کیونکہ اس کے بعد مجھے بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور میرے جیسے اور بھی سرکاری عہدیداروں کو۔"

ستیہ جیت کمار کے خصوصی گروپ نے حکومت سے ان کی حفاظت کے لئے زبردست سیکیورٹی مہیا کرنے کی درخواست کی تھی اور اس کے بعد بہت سے ایسے کام ہوئے جن میں ستیہ جیت کمار کی زندگی کا تحفظ کئے جانے کی کارروائیاں شامل تھیں۔ ان کے کھانے پینے کا بھی الگ انتظام کیا گیا تھا، غرض ایک لمبا ڈرامہ چل رہا تھا اور اس وقت ستیہ جیت کمار خاصے پریشان ہو گئے، جب رگھبیر ساگا ان سے وقت لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

ستیہ جیت کمار نے فیصل سے بات کی۔ "فیصل! یہ ایک مشکل پہلو ہے جس پر ہم نے ذرا بھی غور نہیں کیا۔ رگھبیر ساگا خطرناک آدمی ہے۔ ہم نے جہاں اتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں، ہمارے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ساگا کو بھی راستے سے ہٹا دیا جائے کیونکہ وہ ست رانی کے سلسلے میں ہمارے راز دار ہیں۔"

"جی مہاراج۔"

"خیر میں ان سے مل لوں پھر دیکھتے ہیں کہ اس اس کے بعد ہمارے لئے کون سا راستہ بہتر ہے۔"

رگھبیر سنگھ ساگا وقت کے مطابق ستیہ جیت کمار کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"آیئے ساگا جی، بڑا نام ہے آپ کا، بڑے بڑے کام کر رہے ہیں، کہئے ہم آپ کی کیا

کہ معاملہ کہیں سنگین نوعیت نہ اختیار کر جائے۔ کام بھی بس اس کا اتنا ہی تھا۔ اس سے زیادہ اسے ست رانی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ ان تینوں کی طرح عاشق مزاج نہیں تھا جو اپنی عاشق مزاجی کا آسانی سے شکار ہو گئے تھے اور ستیہ جیت کے لئے راستہ خالی ہو گیا تھا اور اب امید کی جا سکتی تھی کہ وہ چیف منسٹر بن جائے گا۔ ان لوگوں کے راستے سے ہٹ جانے کی خوشی تو ستیہ جیت کمار کے دل میں تھی ہی، لیکن پولیس کو اب شبہ ہو گیا تھا کہ ان تینوں وزیروں کی موت سے ست رانی کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ رنبیر سنگھ سا کا ایک ذہین پولیس آفیسر تھا اور اس کا ستیہ جیت کمار سے ملنا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ اسے تھوڑا بہت شبہ ضرور ہے۔ ستیہ جیت کمار نے بادل نخواستہ یہ کہہ تو دیا تھا کہ ست رانی کو اس کا پتہ لے گیا ہے۔ ایک طرف اس نے کہا تھا کہ وہ اس کے دوست کی بیٹی تھی تو اس نے اسے کیو ولین کے پاس ماڈل بننے کے لیے کیوں بھیج دیا تھا۔ پھر اس نے اسے ماڈلنگ کرنے سے روکنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ ان تمام باتوں میں تضاد تھا اور اگر رنبیر سنگھ گہرائیوں میں جھانکنے کے لئے مستعد ہو جائے تو یہ تضاد بہت سے شبہات کا باعث بنتا تھا اور ستیہ جیت کمار اس کی زد میں آ سکتا تھا۔ جنسل سے اس موضوع پر بات ہوئی تو جنسل نے کہا۔

"میں بتاؤں مہاراج اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے لندن ڈاکٹر شوراج کے پاس بھجوا دیں۔ ڈاکٹر شوراج بھی خوش ہو جائیں گے اور ہمارا کام بھی بن جائے گا۔"

"نہیں جنسل! یہ بیوقوفی کی بات ہوئی۔ ہم کسی ایسے کردار کو جیون ہی کیوں دیں جس کے بارے میں ہمیں یہ خطرہ لاحق رہے کہ اگر کبھی اس کی زبان کھل گئی تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں مہاراج تو پھر..."

"جنسل، بہت کچھ کیا ہے تو نے ہمارے لئے۔ کیا تجھے ست رانی کو ختم کرنے میں کوئی بڑی مشکل پیش آئے گی؟"

"نہیں مہاراج۔ بھلا اس میں کیا مشکل ہے۔ آج کل جمنا بھی باڑھ پر ہے۔ ست رانی کو جمنا جی کے اشنان کے لئے چھوڑ دیں گے۔"

"یہ تو بہتر جانتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب تو یہ کام کر ڈال۔"

"ہو جائے گا مہاراج، اوش ہو جائے گا۔"

دوسرے دن پورن ماشی کی رات تھی چندرما آسمان پر چڑھا ہوا تھا۔ جنسل نے آج کا دن جمنا کنارے والی کوٹھی ہی میں گزارا تھا۔ وہ کچھ تیاریاں کرتا رہا تھا۔

ست رانی نے اس سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو جنسل مہاراج؟"

"رانی جی! آج رات چندرما آسمان پر چڑھا ہو گا۔ یہ کشتی میں نے خاص طور سے بنائی

ہے۔ پورن ماشی کی رات میں جمنا کی سیر خاص طور سے کرتا ہوں۔ آپ یقین کریں آج کی رات جل پریاں نظر آتی ہیں۔"

"جل پریاں! یہ کیا ہوتی ہیں؟"

"جمنا جی کی سیر کے دوران ایسی ایسی سندر ناریاں جن کا اوپر کا بدن انسانوں جیسا ہوتا ہے نیچے کا مچھلی جیسا، وہ پانی میں تیرتی ہیں، تو بھگوان کی سوگندیوں لگتا ہے جیسے آکاش پر چمکنے والی کوئی انسانی روپ دھار کر جمنا کے شرن میں آ جاتی ہوں۔"

ست رانی کے چہرے پر بچوں جیسی دلچسپی پیدا ہو گئی اس نے کہا۔ "اور وہ نظر بھی آتی ہیں۔"

"ایسی ویسی، کبھی کبھی تو وہ میری اس کشتی کو جمنا کے دھارے پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں صبح تک جمنا دھارے پر رہتا ہوں۔ کشتی کتنی بھی دور نکل جائے، پھر اسے کنارے پر لے جاتا اور کشتی وہیں چھوڑ دیتا ہوں اور خود واپس آ جاتا ہوں۔"

"میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟"

"چلیے مہارانی جی آپ کو کون روک سکتا ہے؟" جنسل نے کہا اور ست رانی تیار ہو گئی۔

رات کو بارہ بجے جب آسمان پر چاند چڑھ چکا تھا، ست رانی نے ایک خوبصورت لباس پہنا اور جنسل کے ساتھ جمنا کنارے چل پڑی۔ جنسل نے دو تین بار اسے دیکھا اور دل ہی دل میں کہا، ست رانی جی کے لئے تو سو جیون وار جا سکتے ہیں، پر فائدہ کچھ بھی نہیں۔ آپ وش بھری ہیں یہ تجربہ مجھے ہو چکا ہے اور کسی وش کنیا سے پریم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور ویسے بھی میں نے راج ستیہ جیت کا نمک کھایا ہے۔ ان سے نمک حرامی تو نہیں کر سکتا۔

خوبصورت کشتی جمنا کی لہروں پر ہچکولے لے رہی تھی۔ جنسل نے سہارا دے کر ست رانی کو کشتی پر چڑھایا اور خود کھونٹے سے رسی کھول دی۔ رسی کھول کر اس نے کشتی میں پھینکی اور خود بھی کشتی میں سوار ہو گیا اور پھر اس نے پتوار سنبھال لئے۔ کشتی جمنا کی لہروں پر آہستہ آہستہ بہنے لگی۔ جنسل اسے بڑی احتیاط سے آگے بڑھا رہا تھا اور ست رانی چاندنی کو جمنا کے پانی پر دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے بہت سے چندرما جمنا میں اتر آئے ہوں۔ اس کی آنکھیں ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کشتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جنسل کام کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی بات نہیں تھی، لیکن اس کے اندر تو جرم بھرا ہوا تھا۔ ستیہ جیت کے اس طرح کے بہت سے کام سرانجام دیئے تھے۔ اس کے لئے یہ کام کون سا مشکل تھا۔

ست رانی نے کہا۔ "جنسل جی ابھی تک تو مجھے ایک بھی جل پری نظر نہیں آئی۔"

"بس تھوڑی دور اور ست رانی جی۔ آپ دیکھیں گی بس تھوڑی دیر کے بعد منظر شروع ہو جائیں گی۔ ان کے سندر سندر چہرے پانی کی سطح پر اُبھرنے لگیں گے تو آپ خود انہیں دیکھ لیں گی۔"

ست رانی کی نگاہیں پانی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ متجسس انداز میں چاروں طرف نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ ہنسل اپنے کام کے لئے بھرپور طریقے سے تیار تھا۔ اس نے چپو سنبھالی ہوئی تھی اور ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے کہا۔ "وہ دیکھئے ست رانی جی وہ جل پری۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے اشارہ کیا اور ست رانی کشتی کے بالکل کنارے پر پہنچ کر جمنا میں جھانکنے لگی۔

اسی وقت ہنسل نے پوری قوت سے اسے آگے دھکیل دیا۔ ست رانی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور وہ چھپاک سے پانی میں جا گری تھی۔

ہنسل نے کشتی کا رُخ کاٹنا شروع کر دیا۔ ست رانی بار بار پانی پر ابھر رہی تھی اور مدد کے لئے چیخ رہی تھی، لیکن ہنسل نے اپنے کان بند کر لئے تھے اور آنکھیں بھی۔ وہ بے شک ست رانی کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہا تھا اس وقت وہ ایک ظالم درندے کی حیثیت رکھتا تھا جسے صرف اپنا کام سرانجام دینا تھا۔ ست رانی کے بارے میں بس اسے یہ خطرہ تھا کہ وہ تیراک نہ ہو کیونکہ بہت سی قوتوں کی مالک تھی، لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ست رانی تیرنا نہیں جانتی اور ابھی تھوڑی دیر کے بعد وہ ڈوب جائے گی اور ایسا ہی ہوا، جمنا کی لہریں ست رانی کے بھاری وجود کو اپنے ساتھ بہا لے جانے تیزی سے آگے بڑھتی رہیں۔ اس کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ آن کی آن میں ست رانی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو ہنسل نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کنارے کی طرف کشتی کھینے لگا۔

☆ ☆ ☆

پورن ماشی کی رات تھی، پربھودیال ساری رات تپسیا کرتے رہے تھے اور اس سے پہلی دو ... جمنا کنارے آدھے بدن سے ننگے جنیو پہنے، آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھ جوڑے سورج نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ رات بھر کا جاپ پورا ہونے کو تھا۔ جونہی سورج دیوتا کی پہلی کرن جمنا کی لہروں کو چھوتی ان کا جاپ ختم ہو جاتا۔ ہر مہینے چودھویں رات کو وہ یہ جاپ کرتے تھے اور مہینے بھر تندرست رہتے تھے۔ اس سے بھی وہ اپنے جاپ میں مصروف تھے کہ اچانک ہی کوئی وزنی چیز ان کے پیروں سے ٹکرائی اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ جمنا کی لہروں نے نجانے کیا ان پر پھینک دیا تھا۔ آنکھیں کھلیں تو سورج کی پہلی کرن نظر آئی۔ اسی کے انتظار میں تو وہ تھے، لیکن پیروں سے ٹکرانے والی چیز کو دیکھا تو سب کچھ بھول گئے۔

وہ ایک انسانی بدن تھا اور غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ کسی نوجوان لڑکی کا جسم ہے۔ جلدی

سے اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا کہیں جمنا کا بہاؤ اسے آگے نہ لے جائے۔ وہ نجانے کس طرح یہاں آ لگی تھی اور اب تک پانی میں تھی کہ اگر پربھودیال اسے نکالنے کی کوشش کرتے تو انہیں وقت لگ جاتا حالانکہ اچھی خاصی عمر کے آدمی تھے اور متھرا کے ایک مندر کے بڑے پجاری تھے، لیکن تندرست و توانا تھے۔ چنانچہ اس جسم کو پکڑ لیا جو آگے جانے کا منتظر تھا اور جمنا کی لہروں پر چکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر انہیں احساس ہو گیا کہ نوجوان لڑکی جیوت ہے۔ انہوں نے ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے کنارے کی طرف دوڑے۔ تھوڑے فاصلے پر دوسرے پجاری بھی موجود تھے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر انہیں آوازیں دیں اور تھوڑی ہی دیر میں دو تین نوجوان اور بڑے پجاری جو مندر کے تھے وہاں پہنچ گئے۔

"ہے بھگوان، یہ کیا ہے مہاراج؟"

"مہاراج کے بچے سنبھالو اسے اور لے کے مندر چلو۔" پنڈت جی نے لڑکی کو زمین پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ساری رات کھڑے رہنے سے ان کے پاؤں بھی شل ہو گئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس لڑکی کو مندر تک لے جانا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن پجاریوں نے فوراً ہی اسے اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا اور اسے لے کر مندر کی جانب چل پڑے۔

پربھودیال خود بھی ان کے پیچھے پیچھے قدم اٹھا رہے تھے حالانکہ ان کے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ لیکن اپنی قوت ارادی سے کام لے کر وہ تیز تیز ان نوجوان پجاریوں کے پیچھے چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مندر میں داخل ہو گئے۔ پربھودیال نے انہیں اپنے کمرے کی جانب لے جانے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ مندر کے ایک اندرونی حصے میں کسی قدر گرم جگہ پہنچ گئے۔

"یہ جیوت ہے۔ تم ایسا کرو وید شنکر ناتھ کو بلا لاؤ، جلدی بلا کر لاؤ۔"

دو تین نوجوان پجاری برق رفتاری سے باہر کی جانب دوڑ گئے۔ دو تین وہیں کھڑے رہے تھے۔ پنڈت جی نے کہا۔ "جلدی جاؤ بیوقوفو! کچھ اوڑھنے کے لئے لاؤ اس کے لئے۔"

فوراً ہی ایک کمبل لا کر لڑکی کے بدن پر ڈال دیا گیا۔ پنڈت جی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد وید جی آ گئے اور انہوں نے لڑکی کو دیکھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہے، تندرست ہے، پانی میں بے ہوشی کے عالم میں بہتی رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے تلووں اور ہتھیلیوں کی مالش کریں۔"

"کوئی دوا دارو؟"

"نہیں بس جاگ جائے تو تھوڑا سا گرم دودھ پلائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" پنڈت جی نے کہا۔ پوجا پاٹھ کا سے ختم ہو گیا تھا۔ سورج نکل آیا تھا، اس

لئے فرصت تھی۔ چنانچہ پنڈت جی نے لڑکی کی تیمارداری شروع کردی۔ تھوڑی دیر کے بعد اچانک ہی لڑکی نے اپنی خوبصورت آنکھیں کھول دیں۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھول کر پنڈت جی کو دیکھا پنڈت جی کی آنکھوں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کی آنکھوں کو کرنٹ لگا ہو۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ یہ صرف ان کا وہم ہے۔ پھر انہوں نے پیار سے لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا کیسی ہے تو؟"

لڑکی پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، پھر اس نے کہا۔ "مم۔۔۔ میں کہاں ہوں؟"

"میری رانی بیٹیا، بالکل چنتا نہ کر میں سادھو پربھودیال ہوں اور یہ مندر ہے۔ کسی بات کی چنتا مت کر، دودھ پیئے گی۔"

"دودھ۔۔۔" لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا پھر بولی "ہاں پیوں گی۔"

"ابھی منگواتا ہوں میری بٹیا رانی۔" پربھودیال نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور نوجوان پجاریوں کو آواز دی۔

پھر انہوں نے لڑکی کو سہارا دے کر بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے اسے دودھ پلانے لگے۔ ان کے انداز میں بہت زیادہ پیار تھا۔ لڑکی تھی بھی ایسی ہی من موہنی صورت کی مالک کہ ایک نگاہ دیکھ کر ہی اس پر پیار آئے۔

آنکھوں کو لگنے والا وہ جھٹکا انہیں اب بھی یاد تھا۔ پتہ نہیں کیوں ایسا ہوا تھا لیکن اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ انہوں نے بار بار لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ان آنکھوں میں انہیں کوئی ایسی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک سادگی ایک بھولا پن، انہوں نے ان آنکھوں میں پایا تھا۔

"بٹیا کہاں سے آئی ہے۔ جمنا میں بہتی ہوئی ملی تھی مجھے۔ وہیں سے نکال کر لایا تھا تجھے جمنا میں کیسے گر پڑی تھی۔"

لڑکی پُرخیال نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد بولی "مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"نام بھی یاد نہیں ہے اپنا"

"ست رانی، ست رانی ہے میرا نام"۔

"جے بھگوتی، کیسا اچھا نام رکھا ہے تیرے ماتا پتا نے۔ ذرا یاد کر کے مجھے بتا ست رانی تو جمنا میں کہاں سے آ گئی؟"

لڑکی نے ایک بار پھر ایک دیوار پر نگاہیں جما دیں۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ اسے یاد تھا رات کو وہ کشتی کی سیر پر نکلی تھی۔ جسل اسے جل پریاں دکھانے کے لیے کشتی میں بٹھا کر لایا تھا پھر اس نے اسے جمنا میں دھکا دے دیا تھا، لیکن وہ کسی کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی

بعد کی باتیں ہیں کہ وہ اس بارے میں سوچے اور فیصلہ کرے کہ اب اسے آگے کیا کرنا ہوگا۔ پربھودیال کو ساری تفصیل بتا کر وہ اس معصوم سادھو کو الجھنوں کا شکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بہتر سمجھا کہ اپنے بارے میں ناواقفیت کا اظہار کرے۔ البتہ اس نے بھولی بھالی باتیں ضرور کی تھیں اور پربھودیال سے پوچھا تھا۔

"مہاراج ایک بات بتایئے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"کیا پورن ماشی کی رات جمنا جی کے پانی میں جل پریاں تیرتی ہیں۔"

بڑا معصومانہ اور بچوں جیسا سوال تھا۔ پربھودیال مسکرا دیئے۔ یہ اندازہ انہیں ہو گیا تھا کہ یہ چھوٹے ذہن کی مالک ہے اور شاید اپنے ماضی کو بھول گئی ہے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بیٹا! جمنا میں کبھی جل پریاں نہیں ہوتیں اور جل پریاں کہیں بھی نہیں ہوتیں۔"

"اچھا۔" ست رانی نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ پربھودیال جی پھر بولے۔

"کیوں بیٹا تجھے ان جل پریوں کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"نہیں بس میں نے سپنے میں دیکھا تھا کہ میں جمنا جی میں بہہ رہی ہوں اور میرے آس پاس جل پریاں تیر رہی ہیں۔ سندر سندر مکھڑوں والی جل پریاں۔"

"کیا تو ان جل پریوں کے پیچھے ہی پانی میں کودی تھی۔"

"نہیں مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"بھگوان نے چاہا تو آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آ جائے گا تو چنتا مت کر، تو تھوڑے دن آرام کر، جیسے ہی پتہ لگا کہ تیرے ماتا پتا کہاں ہیں؟ میں تجھے ان کے پاس بھجوا دوں گا۔"

ست رانی نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

☆ ... ☆ ... ☆

مندروں کی یہ دنیا بڑی انوکھی تھی، یہاں لوگ پوجا پاٹھ کرنے آتے تھے۔ پرجودیال جی ایک شریف النفس انسان تھے اور اپنے عقیدے کے مطابق پوجا پاٹھ اور انسان دوستی میں مصروف رہا کرتے تھے، وہ ست رانی کو بھگوان کی دین سمجھتے تھے اور انہوں نے اسے ایک خاص مقام دے کر نوجوان پجاریوں سے کہا تھا کہ اس کی دیکھ بھال ایک اہم شخصیت کی حیثیت سے کی جائے۔ ست رانی خوش نصیب تھی کہ ہر جگہ اسے عزت مل رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے ساتھ کچھ دشمنیاں بھی ہو گئی تھیں لیکن وہ پروہ یہاں مندروں کی اس دنیا میں وہ بڑی آسانی سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کی معصوم فطرت، معصوم مسکراہٹ اور معصوم معصوم باتوں نے سب کے دل موہ لئے تھے۔

مندر کی اس دنیا کے جو ریت رواج تھے ست رانی ان کی پابندی کرتی تھی، صبح کو گھاٹ پر اشنان، اس کے بعد پوجا پاٹھ، پھر شام کو مندر کی داسی کا روپ دھار کر لوگوں کے بیچ آنا اور انہیں خو حیرت کر دینا، یہ ساری باتیں اسے پسند تھیں اور اسے یوں لگتا تھا جیسے اب زندگی کے بہت سے ملے ہوئے مناظر سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی ہو اور مندروں کی یہ دنیا اس کے لئے انتہائی خوشگوار ہو۔

یہاں جگہ جگہ مندر ہی مندر پھیلے ہوئے تھے، بہت سی جگہوں پر ایسے پُراسرار ویرانے بھی نظر آتے تھے جنہیں دیکھ کر احساس ہوتا کہ وہاں کچھ ہے، جگہ جگہ مٹھ بھی بنے ہوئے تھے اور سنتوں میں اپنے طور پر پوجا پاٹھ کرنے والے رہا کرتے تھے، کون کس رنگ میں ہے، سب کو معلوم نہیں تھا۔ بس کوئی کوئی جانتا تھا کہ کہاں کون کیا کر رہا ہے۔

مندروں کی دیواروں پر اور آس پاس کی جگہوں پر بندروں کے ڈیرے تھے اور ست رانی کو بندروں کی حرکات بہت پسند آتی تھیں۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ بندر جو اپنی الٹی حرکات قائم کئے ہوئے تھے، کہیں تو یہ انسان کے لئے کافی خطرناک ثابت ہوتے تھے اور کہیں وہ انسانوں میں اس طرح گھلے ملے ہوتے تھے کہ یقین آ جائے کہ ان کا قدیم خونی رشتہ انسانوں سے ہے۔ ست

رانی کسی گوشے میں جا کر بیٹھ جاتی تھی اور بندروں کی دلچسپ حرکات کا جائزہ لیتی رہتی تھی، یہ بندر اس کے قدموں میں بھی آ کر بیٹھ جاتے تھے لیکن زیادہ تر اس سے دور ہی رہا کرتے تھے، شاید انسانوں سے زیادہ جانوروں کو اس بات کی شناخت تھی کہ اگر وہ ست رانی کے بہت قریب ہو گئے تو اس کی سانسوں کا زہر ان سے زندگی چھین لے گا۔

اس دن بھی وہ ایک بڑے سے مندر کے عقبی حصے میں ایک پتھر پر بیٹھی نجانے کن سوچوں میں گم تھی۔ ماضی کے واقعات تھے ہی کتنے جن کے بارے میں بہت زیادہ سوچتی۔ اس نے مندروں کے کھنڈرات میں زندگی گزاری اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے دوچار ہوئی۔ پھر اس کے بعد اس کی کو نیا سنسار دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ اس کا تو خیر ایک الگ مسئلہ تھا، رادھیکا کو پانے کے لئے جس نے اپنا جیون وقف کر دیا تھا لیکن ست رانی کو اس سنسار سے دلچسپی بجرنگی ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد یہ سنسار اسے برا نہیں لگا تھا۔ پتہ نہیں کیسے کیسے واقعات اس سنسار میں پیش آئے ہوئے تھے اور اب وہ یہاں موجود تھی۔

صبح ہی سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، گو سخت گرمیوں کے دن تھے اور آسمان پر جب بدلیاں چھا جاتیں تو زمین بہت خوبصورت لگنے لگتی تھی۔ وہ اپنے مندر سے کافی دور نکل آئی تھی اور یہاں بیٹھی ہوئی چھا جانے والی گھٹاؤں کے سائے میں موجود پرندوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ سامنے والے مندر کی دیوار کے عقب میں دو خوفناک آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔

اس نے ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک عجیب سا چہرہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ ست رانی کی نگاہیں ادھر تکتی رہیں۔ کون ہے وہ؟ تجسس بھری نگاہوں سے ادھر دیکھتی رہی۔ اچانک وہ چہرہ پھر نمودار ہوا، گہرا کالا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، سفید دانت، لیکن سب سے زیادہ خوفناک اس کی آنکھیں تھیں جن کی چمک بڑی انوکھی تھی۔

جیسے ہی ست رانی کی نگاہ ان پر دوبارہ پڑی وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ست رانی تجسس میں ڈوبی ہوئی ہوئی اور پھر وہ تیز قدموں سے مندر کی دیوار کے پاس پہنچ گئی، لیکن مندر کے آخری سرے پر اس نے ایک انسانی وجود کو گم ہوتے ہوئے دیکھا۔

ست رانی مندر کی اس بغلی دیوار کے سرے پر کھڑے ہو کر ادھر دیکھنے لگی، کچھ لمحے وہ اسی طرح کھڑی رہی، ایک بار پھر کافی فاصلے سے اس نے اس چہرے کو جھانکتے ہوئے دیکھا، لیکن اسے دیکھتے ہی وہ پھر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

ست رانی کا منہ بن گیا، نجانے کون ہے اور اس طرح اسے چھپ چھپ کر کیوں دیکھ رہا

ہے۔ اس نے سوچا اور اپنا تجسس ختم کرکے وہاں سے واپس پلٹ پڑی۔ بادلوں بھرے اس مست موسم سے اب اسے کچھ اکتاہٹ سی ہو گئی تھی۔ وہ واپس اپنے سرنواس مندر کی طرف چل پڑی۔ اس کے ذہن میں کچھ عجیب سی کڑواہٹ پھیل گئی تھی۔ کافی دور چلنے کے بعد اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو بہت دور سے وہی بدن نظر آیا جسے وہ دیوار کے دوسری طرف غروب ہوتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ کوئی پاگل ہی معلوم ہوتی ہے، واہیات ہوگی۔

وہ تھوڑی ہی اور آگے بڑھی کہ اچانک اس کے کانوں میں کچھ دلکش قہقہے گونج اٹھے، بائیں جانب اس بادلوں بھرے موسم میں اسے کچھ رنگین لباس نظر آئے تھے، یہ وہ تین لڑکیاں تھیں جو ہنسی بولتی آ رہی تھیں ابھی تک ان کی نگاہ ست رانی پر نہیں پڑی تھی، لیکن جونہی انہوں نے ست رانی کو دیکھا وہ ٹھٹھک کر رک گئیں۔

فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ ایک دوسرے کے چہرے نہ دیکھ پاتیں، لڑکیاں اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک تھیں، عمدہ لباس پہنے ہوئے تھیں۔

عمریں بھی ست رانی کے برابر ہی تھیں، پھر وہ خود ہی ست رانی کی جانب بڑھ آئی تھیں، ست رانی انہیں دیکھ کر رک گئی۔

"ہائے رام کتنی سندر ہے، دیکھو تو بالکل اپسرا لگ رہی ہے۔"

"اکیلی ہی ہے، آس پاس تو کوئی نہیں۔" لڑکیاں اس کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ ست رانی خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آگے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ان لڑکیوں میں سے ایک کی آواز ابھری "سنو" اور ست رانی کے قدم رک گئے۔ لڑکیاں تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئیں اور پھر ان میں سے ایک نے کہا..... "بھگوان کی سوگند تم بہت سندر ہو، کہاں رہتی ہو، مندروں کی یاترا کے لئے آئی ہو، ماتا پتا کہاں ہیں بتاؤ گی؟"

ست رانی انہیں دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں مر جاؤں، بھگوان نے ساری سندرتا اس پر ختم کر دی ہے۔" ایک اور لڑکی نے کہا۔

"تم لوگ کون ہو اور کہاں رہتی ہو؟" ست رانی نے پوچھا۔

"آؤ بیٹھ کر باتیں کریں۔ اگر جلدی نہ ہو تمہارے ساتھ کوئی ہے؟"

"ہاں ہے۔"

"کون ہے؟ کہاں ہے؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

ست رانی نے شرارت سے اس طرف اشارہ کر دیا جدھر اس نے اس بوڑھی بھیانک شکل کی عورت کو دیکھا تھا لیکن اب وہاں اس عورت کا کوئی وجود نہیں تھا۔

"ادھر تو کوئی نہیں ہے۔"

"تھی..... غائب ہو گئی۔"

"تمہارے ساتھ نہیں تھی۔"

"نہیں، میرے پیچھے آ رہی تھی۔" ست رانی بولی۔

"ہوگی کوئی، آؤ یہاں بیٹھیں۔ ہے بھگوان بارش ہو جائے تو مزہ آ جائے!" ایک لڑکی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بادل خوب گھرے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر تینوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔ ایک کا نام سدھا تھا، دوسری پشپا اور تیسری کا کرن۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"ست رانی" ست رانی نے سادگی سی جواب دیا۔

"ست رانی تم کہاں رہتی ہو؟"

"مندر میں۔"

"مندر میں رہتی ہو، میرا مطلب ہے یاترا کے لئے آئی ہو؟"

"نہیں، میں مندر میں ہی رہتی ہوں، سرنواس مندر میں۔"

"اچھا، جوگنیا ہو؟"

"نہیں، جوگنیا ہوں۔" ست رانی بولی اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔

"ہونا تو تمہیں جوگنیا ہی چاہیے تھا، انگ انگ میں بھگوان کی سوگندھ سی بھرا ہوا ہوگا۔ تمہیں جو دیکھتا ہوگا گھائل ہو جاتا ہوگا، اب بتاؤ گی نہیں اپنے بارے میں، دیوداسی ہو، مندر میں رہتی ہو؟"

"نہیں..... بس وہاں رہتی ہوں، تم لوگ کون ہو؟"

"بتایا نا، میرا نام سدھا ہے، یہ پشپا اور یہ کرن۔ ہم اپنے تاؤجی کے ساتھ یہاں آئے ہیں، یہ کرن جو ہے نا یہ ہمارے تایا جی کی بیٹی ہے اور ہم دونوں ان کے چاچا کی بیٹیاں ہیں۔ یہاں کشن بھیا کو لے کر آئے ہیں۔ ارے واہ تم ہو گئیں ست رانی اور کشن بھیا سات مندروں کی پوجا کے لئے آئے ہیں، یہ کیسی بات ہی ہے، کیوں سدھا؟" پشپا نے کہا اور ہنس پڑی۔

وہ جوانی کی دین سے سرشار تھیں جو ہمیشہ انسانی وجود میں گدگدی بھرتی رہتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ کسی کو کوئی دکھ ہی کوئی دکھ، لیکن جوانی ان دکھوں کو خاطر میں کہاں لاتی ہے، وہ تینوں ہنستی بولتی رہیں اور ست رانی کو تروید کے گھر کا ماحول یاد آ گیا، جہاں اس کی بیٹیاں بھی

اس کے ساتھ ایسے ہی ہنستی بولتی رہتی تھیں۔

"ست رانی تم ہماری سہیلی بن جاؤ۔ ابھی ہم کافی دن یہاں رہیں گے۔ ہم سے روز ملا کرو۔"

"اس کے بعد تم چلی جاؤ گی؟" ست رانی نے پوچھا۔

"ایں ... ہاں جانا تو ہوگا۔"

"پھر ہماری دوستی ختم ہو جائے گی۔" اس بات کا تینوں لڑکیاں کوئی جواب نہیں دے سکی تھیں۔

"چلو ٹھیک ہے، جب تک تم یہاں ہو، ہم روز ملا کریں گے۔ میرا تو جب دل چاہتا ہے نکل آتی ہوں۔ پنڈت جی مجھے کبھی منع نہیں کرتے۔"

"بس تو کل اسی سمے اسی جگہ ہم سب جمع ہو جائیں گے۔" کرن نے کہا۔

کافی دیر تک یہ سب اسی جگہ بیٹھی باتیں کرتی رہیں، اس کے بعد وہاں سے چل پڑیں۔ لڑکیاں ادھر ادھر چلی گئیں جہاں ان کی رہائش تھی۔

ست رانی سر نوواس مندر کی طرف چل پڑی۔ لیکن اب وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہی پُراسرار وجود اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

☆..... ☆..... ☆

کشن داس، رانا اودت نارائن کا بیٹا تھا۔ اودت نارائن جی بڑے رئیس تھے۔ کانپور میں ان کی کپڑا بنانے کی کئی ملیں تھیں۔ بھرا پرا پریوار تھا۔ خود بہت اچھے مزاج کے آدمی تھے لیکن پچھلے کچھ عرصے سے ان کے پریوار پر اُداسی کے بادل چھا گئے تھے۔ اس کی وجہ کشن داس تھا...... ! بھرے بھرے بدن اور گورے چہرے پر حسین نقوش بہت جاذب نگاہ نظر آتے تھے۔

اودت نارائن جی نے بیٹے کو نو سال سے ملک سے باہر بھیجا ہوا تھا۔ وہ وہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا، لیکن پھر تھوڑا سا معاملات میں الجھاؤ پیدا ہوا۔ کشن داس کو بیرون ملک رہنے والی ایک ہندوستانی لڑکی سے محبت ہو گئی اور اس نے شرلین کے ساتھ پھیرے کر لئے۔ شرلین کے ماتا پتا آگرے میں رہتے تھے اور انہوں نے اسے بھی تعلیم کے لئے بیرون ملک بھیجا ہوا تھا۔ دونوں گھرانوں میں سے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ جوان نسل کے دو افراد نے نئے دور کی آزادی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ آخرکار وہ اپنے ماتا پتا کو اس بات پر راضی کر لیں گے کہ اپنی خوشی سے ان کا گونا کر دیا جائے اور جب تک ان کا گونا نہ ہو جائے وہ ایک دوسرے سے صرف دوستی رکھیں گے اور یہی سلسلہ انہوں نے جاری رکھا تھا۔

دونوں ہی کی تعلیم مکمل ہونے کو تھی، بس شرلین کا کچھ سے رہ گیا تھا جو اسے پورا کرنا تھا جبکہ کشن داس اپنا آخری امتحان بھی دے چکا تھا اور اس کے بعد اسے وطن واپس آنا تھا۔ چنانچہ دونوں کی بات ہوئی۔ کشن داس کو پتہ تھا کہ اودت نارائن اس کا بُری طرح انتظار کر رہا ہے اور اسے بھی پتہ ہے کہ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے اور ... کا بدیس میں رہنا کسی بھی طرح ممکن نہیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

جب اودت نارائن کی طرف سے کشن داس کی واپسی کے لیے سختی ہونے لگی تو مجبوراً کشن داس نے شرلین سے واپسی کے بارے میں کہا اور ... کہ جیسے ہی شرلین کی تعلیم مکمل ہوگی وہ گھر واپس آ جائے گی اور دونوں اپنے ماتا پتا کو بتا دیں گے کہ وہ ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے ہیں۔

شرلین نے آنسو بھری آنکھوں سے کشن داس کو وطن روانہ کیا تھا اور یہاں اودت نارائن نے بیٹے کے سواگت کے لئے نجانے کیا جشن کروائے تھے، دولت کی کوئی کمی نہیں تھی، شاندار کنگاوں میں بڑے اعلیٰ درجے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

کئی دن تک خوب ہنگامہ رہا تھا، بس دو بہن بھائی تھے، بیٹی کرن اور بیٹا کشن داس۔ بیٹی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، لیکن اودت نارائن طے کر چکے تھے کہ سب سے پہلے بیٹے کا گھر بسا دیں گے اور اس کے بعد باقی کام کریں گے۔

اودت نارائن کو لڑکی کی تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، ان کا ایک پرانا دوست تھا جس کی بہن ساوتری دیوی سے بہت عرصے پہلے یہ طے پایا تھا کہ کشن داس کی شادی ان کی بیٹی پونیتا سے کی جائے گی اور ساوتری دیوی متھرا ہی کی رہنے والی تھی۔ کشن داس بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا جب اودت نارائن جی نے کھل کر اس سے بات کی۔

"اور اب میں چاہتا ہوں کہ تیری شادی کر دوں تاکہ میرے گھر میں بھی روشنی آ جائے۔"

"پتا جی! آپ پورے گھر میں بجلی کے بلب لگوا لیجئے، روشنی ہی روشنی ہو جائے گی، بھلا شادی سے روشنی کا کیا تعلق؟" کشن داس نے بات مذاق میں ٹالنا چاہی۔

اودت نارائن سنجیدہ ہو کر بولا۔ .. "تمہیں ساوتری دیوی سے میری بات چیت ہو چکی ہے۔ ... بیچاری، ایک بیٹی کے سوا ان کا سنسار میں کوئی نہیں ہے اور وہ جس آدمی کی بہن تھیں ان کی سوگند میرا اتنا اچھا دوست تھا کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی موت کے بعد ساوتری دیوی کا میرے سوا اور کوئی سہارا نہیں رہا تھا۔ میں نے اسی سمے ان سے وعدہ کر لیا تھا اور وہ اپنے دوست کی ارتھی پر کہ میں ساوتری کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا۔ بیٹا ماں باپ اپنی اولاد پر ہی ... تے ہیں، اب سمے آ گیا ہے کہ میں اپنا وچن پورا کر دوں۔"

کشن داس بُری طرح بے چین ہو گیا تھا، اس وقت اس نے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں باپ بیٹے ساتھ دوسری نشست میں اس نے کہا۔

"پتا جی! بات وہی قصے کہانیوں والی ہو گئی ہے کہ ماتا پتا نے اولاد کے جیون بھر کے فیصلے کر دیئے اور اولاد پر بڑے داری ڈال دی کہ وہ ان کی آگیا کا پالن کرے، پر پتا جی سے بڑا بدل گیا ہے، ہم اپنے جیون کے لئے جو بھی فیصلے کرتے ہیں، ان میں ہماری مرضی کا بھی تو دخل ہونا چاہئے۔"

"بیٹا بات واقعی قصے کہانیوں جیسی ہے، لیکن تم یہ جملے کیوں کہہ رہے ہو مجھے یہ بتاؤ۔"

"پتا جی اس لئے کہہ رہا ہوں میں نے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کر لیا ہے۔ لندن میں ایک لڑکی شرلین نام کی ہے، بہت اچھے گھرانے کی ہے اس کے ماتا پتا آگرے میں ہوتے ہیں اور وہاں ان کے بڑے کاروبار ہیں۔ پتا جی ..... میں نے شرلین کے ساتھ پھیرے لے لیے ہیں۔ ہم دونوں نے یہ طے کیا ہے کہ ہم اگر ناہمارے ماتا پتا ہی کریں گے۔"

ادت نارائن دھک سے رہ گئے تھے۔ خوفزدہ لہجے میں بولے۔ "مگر بیٹا، ہم نے تو بہت سوں سے یہ بات کہہ دی ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں پتا جی، یہ ایک ایسی غلطی ہے جس کے لئے میں اپنی غلطی نہیں دے سکتا۔ آپ کو اپنا یہ ارادہ بدلنا ہوگا۔" کشن داس کا لہجہ بہت مضبوط تھا، ادت نارائن نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ برداشت کیا تھا۔

اس کے بعد ایک خاموشی سی طاری ہو گئی، ادت نارائن اُداس رہنے لگے، انہوں نے شرلین کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا، ادھر یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جب تک شرلین کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔"

ادت نارائن کو سب سے زیادہ ساوتری دیوی کا خیال تھا۔ جنہوں نے بیٹی کے لئے شوہر کشن داس ہی سے آس لگا رکھی تھی، بہر حال یہ سارے مسئلے چلتے رہے اور پھر اچانک ہی کشن داس ڈھ گیا، وہ بستر پر پہنچ گیا، یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس سے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت ہو، لیکن اس کے بدن پر عجیب سے پیلے پیلے نشان اُبھر آئے تھے اور یہ نشان آبلوں جیسی شکل اختیار کر گئے تھے، جو اس طرح پکتے رہتے تھے جیسے پانی میں بلبلے بنتے ہیں۔

عجیب بیماری تھی۔ علاج شروع ہو گیا، بڑے ڈاکٹر نے تحقیق کر لی لیکن مرض کا پتہ نہ چل سکا۔

ادت نارائن جی بے حد پریشان تھے، ساوتری دیوی بھی متھرا سے آ گئی تھی، ان کے ساتھ ان کی بیٹی یوگیتا بھی تھی، اسی لڑکی سے کشن داس کی شادی کا فیصلہ ہوا تھا، یوگیتا بہت ہی مغرور قسم کی لڑکی

کسی سے وہ مختلف سے بات نہیں کرتی تھی۔ لیکن کشن داس کے گرد وہ ہر وقت چکراتی رہتی تھی۔

کشن داس کے علاج کے لئے ہر ممکن کوشش کر لی گئی، چار مہینے بیت گئے، لیکن اس کے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں رونما ہوئی، تیز بخار کے درمیان یہ آبلے بنتے اور پھوٹتے رہتے تھے۔ حکیموں، ویدوں اور دوسرے ہر طرح کے علاج کرائے گئے تھے۔

پھر ایک سنت مہاراج بالکل اتفاقیہ طور پر آئے اور انہوں نے ان لوگوں کو آگاہ کیا کہ کشن پر جادو کرایا گیا ہے اور یہ جادو بہت خطرناک ہے، اس کے توڑ کے لئے کسی بڑے عمل کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس کے لئے علاج کرا لئے جائیں، دنیا بھر میں اسے گھما لیا جائے، جب تک اس جادو کا توڑ نہیں ہوگا یہ ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔

ادت نارائن جی کو اس طرح کی باتوں پر بہت یقین تھا، بہت سے ایسے واقعات انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ کچھ لوگوں نے مخالفت بھی کی، خاص طور سے ساوتری دیوی نے کہ جادو وادو کے چکر میں نہ پڑا جائے اور اگر ہو سکے تو اسے ملک سے باہر لے جایا جائے، لیکن ادت نارائن جی نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ نہیں ساوتری دیوی میرے بیٹے پر واقعی جادو کرایا گیا ہے اور مجھے اس جادو کا توڑ چاہئے۔

بہر حال بڑی مشکل آ پڑی تھی ان پر۔ ادت نارائن کے گھر میں ان کے بھائی کی بیٹیوں اور بہو بھی رہا کرتی تھیں اور دوسرے بھی کئی لوگ ان کے ساتھ موجود تھے، سب کے سب پریشان تھے، ان کی بیٹی کرن جی ہر وقت اداس رہنے لگی تھی۔ بھائی کے لئے اس کا بھی دکھ رہا تھا۔ کسی سنت مہاراج نے کہا کہ کشن داس کو سات مندروں کی سیر کرائی جائے، سات مندروں میں جا کر وہ پوجا پاٹھ کرے تو شاید اس کے جادو کا کچھ توڑ ہو سکے۔

ادت نارائن نے فوراً ہی انتظامات کئے، ہر جگہ وہ کشن داس کو مندروں کے درشن کراتے رہے، بہت سے شہروں میں گئے جہاں مشہور مندر تھے۔ مندروں میں پوجا پاٹھ کرائی گئی، بھینٹیں منگوائی گئیں اور اس کے بعد اس طرح مندروں کے درشن کرتے ہوئے وہ متھرا پہنچے، جہاں ساوتری دیوی کا شاندار گھر تھا۔ انہوں نے کہا کہ متھرا میں انہی کے گھر ڈیرہ لگایا جائے لیکن ایک بات بھی سنت جی نے ہی کہی تھی کہ کہیں بھی دولت کا مظاہرہ نہ کیا جائے اور جس طرح یاتری لوگ جاتے ہیں اسی طرح سات مندروں کی یاترا کی جائے۔ چنانچہ متھرا آنے کے بعد بھی ڈیرے لگائے گئے اور مندروں کی پوجا کی جانے لگی۔

ادت نارائن جی نے بے شک ساوتری دیوی کے ہاں قیام نہیں کیا تھا، لیکن وہ جس طرح ان پر اپنی سیوا کر رہی تھیں۔ نوکر چاکر گھر سے کھانا بنا کر لاتے۔ بستر وغیرہ بھی سب

ساوتری دیوی جی کے ہاں سے آئے ہوئے تھے اور کشن داس کو مندروں کی سیر کرائی جا رہی تھی۔ کشن داس بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی دماغی حالت بھی متاثر ہوئی تھی۔ بس کسی کو دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے بسی اور بے بسی چھائی رہتی تھی۔ کوئی بات کرتا تو جواب نہ دیتا۔ ماتا پتا بے حد پریشان تھے۔

کرن سب سے زیادہ اداس تھی۔ پشپا اور سدھا بھی مندروں میں ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ لڑکیاں تھیں۔ سیر و سیاحت سے انہیں دلچسپی تھی اور وہ گھر آ کر بھی خوب گھوم پھر رہی تھیں۔ یو گیتا یہاں بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ بس وہ جب بھی جمنا کے پاس آتی وہیں کشن داس کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس سے باتیں بھی کرتی تھی وہ، لیکن بڑے ہی سرسری انداز میں۔ اس نے ماں کے ساتھ بات چیت میں بھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ کشن داس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔

یہاں لوگوں کی کہانی تھی۔ پشپا، سدھا اور کرن کو ست رانی ملی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ بہت دیر تک وہ اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں۔

"عجیب نہیں تھی وہ... میں تمہیں ایک بات بتاؤں بڑی انوکھی۔"

"کیا؟"

"ایک بار میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے پورے شریر کو بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو، حالانکہ اس کی آنکھیں بڑی سندر تھیں پر نجانے کیوں مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا تھا۔"

"وہ جس طرح ہمیں ویرانے سے آتی ہوئی ملی تھی اس سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی جنگلی ہوتی آ رہی ہے، پر جب قریب آ کر اس نے ہم سے باتیں کیں تو بھگوان کی سوگند اتنی پیاری تھی وہ کہ میں تو بتا ہی نہیں سکتی۔" پشپا نے کہا۔

"مجھے تو اچھی لگی تھی بڑی کیسے لگی وہ؟" کرن بولی۔

سدھا کہنے لگی۔ "کشن بھیا کو آج بھی مندر لے جانا ہے، کیوں نہ ہم انہیں سرنواس مندر لے چلیں، ابھی تک ہم وہاں گئے ہیں یا نہیں۔"

"پتہ نہیں، میں پتاجی سے کہوں گی کہ آج کشن بھیا کو سرنواس مندر لے چلیں۔"

"ٹھیک ہے۔" تینوں نے یہ بات طے کر لی اور پھر جب وہ خیموں میں واپس پہنچیں تو وہاں کا ماحول وہی کا وہی تھا۔ کشن داس اپنے خیمے کے اندر بستر پر بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اودت نارائن کافی غمزدہ نظر آ رہا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر وہ خیمے سے باہر نکل آیا۔

"تم لوگ کدھر چلی گئی تھیں؟"

"بس یہیں ہی مندروں کے بیچ دور تک چلے گئے تھے تایا جی۔" سدھا نے کہا۔

"بیٹا ذرا خیال رکھا کرو، نئی جگہ ہے، پھر یہاں بندر بھی بہت ہیں اور سنا ہے کبھی کبھی ناگ بھی پہنچا دیتے ہیں۔"

"آئندہ خیال رکھیں گے تایا جی... ایک بات بتایئے کیا آپ سرنواس مندر گئے ہیں؟"

"نہیں... لیکن تم نے کیوں یہ سوال کیا؟"

"پتاجی آج ہم وہیں چلیں گے۔"

"اتفاق سے رام سرن بھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ سرنواس مندر بہت اچھا ہے، وہاں بڑے پنڈت پروہت یاں بڑے سدھا تو آدمی ہیں اور سنا ہے کچھ پہنچے ہوئے بھی ہیں۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے آج وہیں چلیں گے۔" کرن بولی اور اودت نارائن نے گردن ہلا دی۔ تو کسی نہ کسی مندر میں جانا تھا سرنواس ہی سہی۔

☆ ... ☆ ... ☆

شام کو لڑکیوں نے خاص طور سے تیاریاں کی تھیں، ساوتری دیوی اور یو گیتا بھی مندر ساتھ تھیں۔ اودت نارائن بھی تیار تھے۔ ان کا خاص آدمی رام سرن جو ان کا معتمد خاص تھا، بھی ساتھ تھا۔ اس طرح یہ پوری منڈلی سرنواس مندر چل پڑی۔ مٹھائی، پھول اور دوسری چیزیں ساتھ لے لی گئی تھیں۔

مندر میں پوجا پاٹ کرنے والوں کی بھیڑ تھی۔ انہوں نے بھی اپنا ٹھکانا ایک جگہ بنایا، پھر پجاری پر بھو دیال جی نے پوجا کرائی۔

کام کاج سے فراغت ہوئی۔ سدھا، پشپا اور کرن کی نظریں مندر کی ان داسیوں پر لگی تھیں جو پوجا پاٹ کے لئے آنے والوں کو پرشاد دے رہی تھیں۔ انہیں پانی وغیرہ بھی پلا رہی تھیں۔ ان میں انہیں ست رانی نظر نہیں آئی۔

تب پجاری سے سدھا نے ست رانی کے بارے میں پوچھا۔ "مہاراج یہاں ایک سندر سی رانی بھی ہوتی ہے کیا؟ نظر نہیں آئی، ہماری سہیلی بنی ہے وہ۔ کہہ رہی تھی کہ سرنواس میں

ہاں... ہاں... ست رانی ادھر پیچھے کے باغ میں ہیں۔"

"ہم ان سے مل سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں... آپ اس طرف چلے جایئے۔"

مندر کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ ست رانی اس باغیچے میں سفید پھولوں کے درمیان ست رانی کے بجائے، پھولوں کی رانی لگ رہی تھی، حالانکہ شام کے جھٹ پٹے، بلکہ ایک طرح سے رات کا ہلکا ہلکا اندھیرا فضاؤں میں اتر آیا تھا لیکن ست رانی چاندنی کی طرح ان پھولوں کے درمیان چمک رہی تھی۔

اس نے ان تینوں کو دیکھا تو خود ہنستی ہوئی آگے آ گئی۔ ''ارے تم لوگ... ؟ کیا میری تلاش میں یہاں آئی ہو؟''

''تو اور کیا ست رانی... ہم نے تم سے کہا تھا کہ ہم تم سے مندر میں ملنے آئیں گے۔ ہمیں تو یوں لگا جیسے تم نے ہمیں دھوکا دیا ہو اور تم یہاں نہ رہتی ہو۔''

''لو... تو پھر میں کہاں رہوں گی... ؟'' ست رانی نے پیار بھرے لہجے میں کہا، وہ ان تینوں کو لے کر گھاس پر بیٹھ گئی۔

''تم دوسری دیوکنیاؤں کی طرح یاترا کرنے والوں کی سیوا نہیں کرتی ہو؟'' سدھا نے پوچھا۔

''مہاراج پرتھودیال نے مجھ سے کہا ہی نہیں۔ جب وہ کہیں گے تو میں بھی ایسا کروں گی ویسے مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔''

''ست رانی کیا تم نئی نئی یہاں آئی ہو؟''

''تو اور کیا... تھوڑے ہی تو دن ہوئے ہیں۔''

''کہاں سے آئی ہو؟''

''جمنا جی سے۔'' پرتھودیال مہاراج نے مجھے جمنا سے نکالا تھا۔''

''کیا مطلب... ؟'' وہ تینوں حیرت سے بولیں۔

''تم پرتھودیال مہاراج سے پوچھ لینا۔''

''تم بھی تو کچھ بتاؤ... ؟''

''بس میں کیا بتاؤں، چھوڑو ان باتوں کو۔ مجھے تمہارا یہاں آنا بہت اچھا لگا ہے۔''

''تو تم بھی ہمارے ڈیرے پر آؤ نا کسی دن۔''

''آ جاؤں گی۔ مجھے کوئی مناہی تھوڑی ہے۔'' ست رانی نے کہا۔ یہ چاروں باتیں کرتی رہیں۔

ادھر پوجا ختم ہوئی تو اودت نارائن جی نے لڑکیوں کو تلاش کیا، جس پجاری نے لڑکیوں کو ست رانی کا راستہ بتایا تھا اسی نے انہیں بتایا کہ لڑکیاں اس طرف گئی ہیں۔

''آؤ ذرا دیکھیں کیا کر رہی ہیں وہ وہاں... ؟'' بڑی دیر ہو گئی انہیں وہاں گئے ہوئے۔ اودت نارائن نے کہا اور سب لوگ اٹھ کر اس طرف چل پڑے۔

باغ میں روشنی ہو رہی تھی، اس روشنی میں انہوں نے چاروں لڑکیوں کو بیٹھے باتیں کرتے دیکھا تو اودت نارائن جی مسکراتے ہوئے اس طرف چل پڑے، اس سے داس اور رام سرن بھی ساتھ ہی تھے، جبکہ دوسری بزرگ عورتیں پیچھے تھیں۔

یوگیتا اپنے مزاج کے مطابق الگ تھلگ سی تھی۔ اودت نارائن وہاں پہنچے، پھر انہوں نے لڑکی کو دیکھا جو ان کی بیٹیوں سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اودت نارائن جی کو بہت ہی ... لگا۔

''ارے یہ بٹیا کون ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''ست رانی ہے پتا جی... ہماری دوست، یہیں اس مندر میں رہتی ہے۔ مہاراج پرتھودیال جی، جو یہاں کے بڑے پجاری ہیں اسے اپنی بیٹی مانتے ہیں۔''

اتفاق سے کشن داس نے اسی سے نگاہیں اٹھا کر ست رانی کو دیکھا، ست رانی نے بھی کشن کو بالکل اتفاقیہ طور پر دیکھا۔ کشن داس کو اچانک ہی ایک جھٹکا سا لگا اور وہ ڈگمگا کر گرتے گرتے بچا، اسے بہت عجیب سا لگا تھا جب کہ ست رانی نگاہیں جمائے مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کشن داس سے نگاہیں ہٹا لیں۔

اودت نارائن نے ست رانی کے سر پر پیار بھرے انداز میں ہاتھ پھیرا اور بولے۔ ''بیٹا تم کیسی ہو؟''

ست رانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ اس کے مزاج کے مطابق تھا۔ جسے چاہتی اور پسند کرتی جواب دے دیا کرتی، ورنہ خاموش رہا کرتی۔ اس وقت بھی وہ خاموشی سے ان لوگوں کو دیکھ رہی۔

اودت نارائن نے دو چار باتیں کیں اس کے بعد بیٹیوں سے بولا...

''چلیں بیٹا؟ سمے زیادہ ہو گیا ہے۔''

''چلیں پتا جی... ہم ست رانی سے کہہ رہے تھے کہ یہ ہمارے ڈیرے پر آئے۔''

''تو کہنے کی کیا بات ہے بیٹا، جیسے تم میری بیٹیاں ہو ویسے ہی یہ بھی ہے۔ بیٹا! اگر مہاراج پرتھودیال تمہیں آ گیا دیں تو تم ضرور ہمارے پاس آؤ۔ بھوجن کرو ہمارے ساتھ۔''

ست رانی نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ دو تین بار اس نے کشن داس کو دیکھا تھا، پھر تھوڑی دیر بعد یہ لوگ چلے گئے لڑکیاں مسکرا رہی تھیں۔

پشپا نے کرن سے کہا۔ "بھگوان کرے میرا بھیا ٹھیک ہو جائے، اب بھی جبکہ اس کی حالت بُری ہو گئی ہے، لڑکیاں اسے دیکھ کر من ہار بیٹھتی ہیں۔ تم نے دیکھا کہ ست رانی کشن بھیا کو کس طرح بار بار دیکھ رہی تھی، مجھے لگتا ہے کہ کشن بھیا اسے بھی بہت پسند آ گئے ہیں۔"

"کشن بھیا ہیں ہی ایسے، پر اس بیچاری کو کیا معلوم وہ شادی شدہ ہیں اور پونیتا جی ان کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں۔"

"ہونہہ پونیتا! بیٹھی ہیں تو بیٹھی رہیں، بس میرا بھائی ٹھیک ہو جائے۔" کرن نے منہ سکوڑ کر کہا۔

پھر دوسرے دن صبح دس بجے کا وقت تھا، سدھا ہی باہر نکلی تھی۔ وہ اپنے خیمے سے نکل کر دوسرے خیمے میں جا رہی تھی کہ اس نے ست رانی کو دیکھا جو اسی سمت آ رہی تھی، سدھا خوش ہو کر اس کی طرف بڑھی اور جلدی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔

"تم میرے پاس آ رہی تھیں نا۔" اس نے خوشی سے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں ادھر ہی آ رہی تھی۔"

"آؤ میرے ڈیرے پر آؤ۔" سدھا بولی اور ست رانی کو لے کر اپنے خیمے میں پہنچ گئی، پھر اس نے کہا۔ "تم ذرا بیٹھو، میں پشپا اور کرن کو بھی بلا لاؤں۔"

"سنو میری بات سنو کل جب تم مندر آئی تھیں تو تمہارے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا، وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"وہ میرے کشن بھیا ہیں، انہی کو لے کر تو ہم یہاں آئے تھے، میں نے تمہیں بتایا تھا نہ کہ وہ بیمار ہیں؟"

"ہاں... کہاں ہیں وہ؟"

"کیوں پوچھ رہی ہو؟" سدھا نے مسکراتی نگاہوں سے ست رانی کو دیکھتے ہوئے کہا، لیکن ست رانی کا چہرہ سپاٹ رہا، اس نے خاموشی اختیار کی تھی۔

"چلو ان سے بھی ملا دیں گے تمہیں، ذرا سب کو بتا تو دوں کہ ہماری مہارانی ست رانی آئی ہیں۔" سدھا نے کہا اور تیزی سے خیمے سے باہر نکل گئی۔

ست رانی مسکرانے لگی تھی تھوڑی دیر کے بعد پشپا اور کرن بھی دوڑتی ہوئی اندر آ گئیں، وہ سب بہت خوش تھیں، لیکن ست رانی کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ ان کے ساتھ باہر نکل آئی، سدھا وغیرہ نے کہا تھا کہ وہ تاؤ جی کو ست رانی کی آمد کے بارے میں خبر دیتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سب بھی باہر نکل آئے۔ چار پانچ خیمے لگا رکھے تھے انہوں نے، بیچ کا حصہ نشست گاہ بنائی گئی تھی۔ کسی ایک خیمے میں تو سارے لوگ نہیں آ سکتے تھے۔ نشست گاہ طرح سے انتظامات کر لیے گئے تھے، چنانچہ ست رانی وہاں بیٹھ گئی، کشن کو بھی باہر لے آیا کام شرارت سے بھری لڑکیوں نے کیا تھا۔

کشن واقعی بہت کمزور ہو گیا تھا، چلتے چلتے لڑکھڑا جاتا تھا، اسے سہارا دے کر لایا گیا تھا، رانی کو دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ پتہ نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا۔ وہ ست رانی دیکھنے لگا، ست رانی نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

اتنی دیر میں پونیتا اور ساوتری دیوی بھی آ گئیں۔ ست رانی نے سر گھما کر ان کی طرف اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پتہ نہیں کسی دوسرے نے محسوس کیا نہیں، لیکن ساوتری دیوی کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ ست رانی کی آنکھوں سے نظریں ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی، ست رانی مسکراتی ایک بار پھر اس نے کشن کو دیکھا تو کشن نے سر جھکا لیا۔

سدھا اور پشپا، ست رانی اور کشن کا جائزہ لے رہی تھیں، بہرحال اوت نارائن نے ست رانی کی خاطر مدارات کرنے کے لیے کہا، اس سے اس کے بارے میں پوچھنے لگے۔

"بس میں پربھو دیال جی کے ساتھ رہتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میرے ماتا پتا کون ہیں، بہتی ہوئی آئی تھی۔ اوت نارائن جی نے مجھے نکال لیا، مجھے نہیں معلوم کہ اس سے پہلے میں کہاں تھی، کیا کرتی تھی، آپ لوگ مجھ سے بار بار یہ سوال نہ کریں۔"

"نہیں بیٹا کوئی بات نہیں ہے، شاید ہم سے بھول ہو گئی۔" اوت نارائن نے کہا۔ اب وہ ذرا ان نگاہوں سے رانی کو دیکھ رہے تھے، لیکن ان نگاہوں میں کوئی بُرائی نہیں تھی، بس ایک حیرانی تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی۔

ست رانی کو کھانے پینے کے لیے کچھ چیزیں دی گئیں جنہیں اس نے بڑی بے رغبتی سے کھایا پھر بولی۔ "میں چلتی ہوں... شام تک تم کیا کرو گی؟"

"کچھ نہیں، تم رہو نا ہمارے ساتھ پورا دن گزارو، ہمیں تو کوئی کام نہیں ہوتا کہو تو گھومنے

"نہیں سورج چھپنے سے پہلے تم اسی جگہ آ جانا جہاں ہم لوگ پہلے ملے تھے۔"

"چلو ٹھیک ہے، اگر تمہیں وہ جگہ پسند ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اس طرح ست رانی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی، پھر وہی شام چار بجے کے قریب، وہ اسی جگہ پہنچ

گئی جہاں پچھلے دن ان لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سدھا، کرن اور پشپا وہاں موجود ہیں، وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور ان کے پاس پہنچ گئی۔

"تم لوگ جلدی آ گئیں۔"

"کیا کریں ست رانی، تم نے ہم پر جادو ہی ایسا کیا ہے کہ ہمیں لگتا ہے کہ تمہارے پاس سے جا کر ہمارا من ہی نہیں لگے گا۔"

چاروں وہاں موجود پتھروں پر بیٹھ گئیں، تھوڑے فاصلے پر بہت سے بندر بیٹھے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"اچھا ست رانی ایک بات بتاؤ تم نے کبھی کسی سے پریم کیا ہے؟"

ست رانی نے خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھا، پھر سرد لہجے میں بولی۔ "نہیں۔"

"بالکل نہیں۔"

"بس... بجرنگی بابا مجھے بہت یاد آتا ہے اور کوئی نہیں۔"

"یہ بجرنگی بابا کون ہے، کیا تمہارا پریمی؟"

"ہاں، وہ میرا سب کچھ ہے، میرا مان سمان، میرا پتا، میری ماتا، میرا بھائی، میری بہن سب کچھ ہے۔"

"ارے... ہم نے اس رشتے کے بارے میں تھوڑی پوچھا ہے تم سے..."

"تو پھر...؟"

"اچھا ایک بات بتاؤ، کشن بھیا تمہیں کیسے لگتے ہیں، سچ سچ بتانا؟"

ست رانی نے نگاہیں اٹھا کر کرن کو دیکھا جس نے سوال کیا تھا پھر بولی۔

"میں تمہیں انہی کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں، کیا تم نے یہ پوچھا کہ انہیں کیا بیماری ہے؟"

"لو... ہمارے پوچھنے سے کیا ہوتا ہے، بس وہ بیمار ہیں، بڑا علاج ہوا ہے ان کا پر ٹھیک ہی نہیں ہوتے، پتہ نہیں کیا ہوا ہے بیچاروں کو، میرا اکلوتا بھائی ہے، بھگوان کی سوگند اگر کوئی مجھ سے میری جان بھی مانگے تو میں اس کے لئے دے دوں۔ بھگوان کرے میرا بھائی ٹھیک ہو جائے۔ ست رانی تم مندروں میں رہتی ہو، تمہارا تو سب سے واسطہ رہتا ہے۔ میرے بھیا کے لئے کرو نا، کوئی کچھ کرے ان کیلئے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

ست رانی کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے، پھر اس نے کہا...

"ان کے بارے میں مجھے کچھ اور بتاؤ۔"

"کشن بھیا ملک سے باہر پڑھنے گئے تھے وہاں انہوں نے کسی لڑکی سے پریم کیا اور اس سے شادی کر لی، پھیرے کرنے کے لئے انہوں نے پروہت تو ماتا پتا کرتے ہیں۔ لڑکی آ کر رہے گی۔ بہنے ہے، کشن بھیا یہاں آئے اور انہوں نے پتا جی اور ماتا جی سے بات کی لیکن سب ان کے خلاف ہو گئے کیونکہ پتا جی نے اپنی بہن ساوتری دیوی کی بیٹی یوگیتا سے ان کا رشتہ بچپن سے طے کیا تھا۔"

ست رانی چونک پڑی۔ "ساوتری دیوی وہی ساڑھی والی عورت؟"

"ہاں۔"

"اور یوگیتا وہ جو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔"

"ہاں۔"

"ہوں، مجھے پتہ چل گیا تھا۔"

"کیا؟" سدھا حیرت سے بولی۔

"یہی کہ اس عورت کے من میں کھوٹ ہے۔"

"کس کے؟"

"ساوتری دیوی... یہی نام بتایا تھا تم نے۔"

"ہاں مگر وہ تو ہماری پھوپھی ہے، بوا ہے ہماری تو۔"

"اور اس کی بیٹی سے کشن داس کا رشتہ طے ہوا تھا۔"

"بچپن سے طے تھا۔"

"اور اب کشن داس نے شادی کر لی۔"

"ہاں پتہ نہیں تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"بتا دوں تمہیں۔" ست رانی پراسرار لہجے میں بولی۔

"بتاؤ۔"

"کشن پر جادو کیا گیا ہے، بہت سخت جادو اور وہ اسی جادو کے زیر اثر ہے اور جانتی ہو یہ کس نے کرایا ہے؟"

"کس نے کرایا ہے؟" کرن حیرانی سے بولی۔ ست رانی مسکرانے لگی۔ اس نے کچھ لمحے آنکھیں بند کر لی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔

"تمہاری بوا ساوتری نے اور وہ اس لئے کہ یوگیتا کی شادی ان سے کر دے۔ کشن بیمار رہ کر کچھ عرصے کے بعد اسے دورے پڑنے لگیں گے اور پھر وہ لڑکی کو بھول جائے گا جس سے

''ہائے رام! مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے، چلو واپس چلتے ہیں، یہ جو کوئی بھی ہے، بھاڑ میں جائے، ہم کوئی اسے پکڑ تھوڑی لیں گے۔'' پشپا نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''تھوڑا اور آگے چلو، پتہ چلے کہ ہے کون!'' کرن بولی۔

''میری بات مانو واپس چلو، یہ جو کوئی بھی ہے، کوئی مصیبت نہ بن جائے۔'' پشپا بولی۔

سدھا نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''خاموش ہو جا پشپا! سناٹا پھیلا ہوا ہے، ہماری سرگوشی بھی دور تک سنی جا سکتی ہے۔''

پشپا خاموش ہو گئی۔ وہ لوگ اور آگے نکل آئیں۔

آسمان پر بادل مسلسل چھائے ہوئے تھے۔ اچانک ہی زوردار کڑاکا ہوا اور تینوں لڑکیاں سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ سایہ ابھی تک ان کی موجودگی سے ناواقف تھا۔ وہ لوگ فاصلے طے کرتی ہوئی آخرکار مٹھ تک پہنچ گئیں۔ کالے رنگ کے اس مٹھ میں چراغ جل رہا تھا جس کی ٹمٹماتی روشنی تھوڑے فاصلے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول انتہائی خوفناک اور پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

یہ تینوں بے آواز چلتی ہوئی اس مٹھ سے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے دوسرے مٹھ کی آڑ میں پہنچ گئیں۔ یہاں سے اس مٹھ کا فاصلہ کوئی دس گز کے قریب تھا اور وہ اس سائے کو مٹھ کے چھوٹے سے دروازے کے پاس دیکھ رہی تھیں۔ پھر دوبارہ تڑاخا ہوا اور ساتھ ہی بجلی بھی چمکی۔ اس روشنی میں انہیں سائے کا چہرہ نظر آ گیا اور ان کے دل دھک سے ہو گئے۔

ساوتری دیوی کو تینوں نے ایک لمحے میں پہچان لیا تھا۔ کالے لباس میں ملبوس ساوتری دیوی نے اپنے سر پر ایک کنٹوپ چڑھا رکھا تھا۔ بجلی دوبارہ چمکی اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ان کی پھوپھی ساوتری دیوی ہی ہیں۔ تبھی ساوتری دیوی کے منہ سے آواز نکلی۔

''مہا متی کلیانی دیوی! میں آپ سے ملنے آئی ہوں، کلیانی دیوی! میں آپ سے ملنے آئی ہوں، باہر آ جائیے۔''

تینوں لڑکیاں پتھر کے بتوں کی مانند خاموش کھڑی ادھر دیکھ رہی تھیں۔ کچھ ہی لمحوں کے

انہوں نے مٹھ کے چھوٹے دروازے سے ایک چہرہ نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایک خوفناک وجود کچھ لمحوں کے بعد پورے کا پورا باہر نکل آیا تھا۔

یہ ایک عمر رسیدہ عورت تھی لیکن اس کا چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ دیکھ کر دل دھڑکنا چھوڑ دے۔ ساوتری دیوی دونوں ہاتھ سامنے کر کے اس کے سامنے جھک گئیں۔

''کہو کیسے آنا ہوا ...؟''

''ماتا جی! ان دنوں میں جتنی پریشان ہوں، آپ کو تو پتہ ہی ہے جو کام آپ نے کیا ہے، اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آ رہا، میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد یہ کام مکمل ہو جائے، وہ یہاں آ جائے اور اپنا ماضی بھول جائے، کم از کم اس لڑکی کو ضرور بھول جائے جس کے ساتھ اس کے پھیرے ہوئے ہیں، مہا متی کلیانی جی! میرا کام کر دیجئے، آپ مہان ہیں، آپ چاہیں تو میری یہ منتوں میں حل ہو جائے، آپ جو مانگیں گی، وہ میں آپ کو دوں گی، بات میری بچی کے جیون کی ہے، ہمارے جیون کی ڈور الجھ گئی ہے، یہ گیتا راتوں کو سو نہیں پاتی، دیوی جی! میرا کام جلد کریں، نجانے کیوں میرا من ڈرتا ہے، بھائی جی مہاراج مندروں کی یاترا کر رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ دینا پڑتا ہے، میرا من ڈرتا ہے کہ کہیں بھگوان میرے اس دہرے کام سے ناراض نہ ہو جائیں۔''

''بک بک کر چکی ہے تُو، خاموش ہو جا!'' عورت کی کڑک دار آواز ابھری۔ ''پہلے بھی میں نے کہا تھا، ہر کام کا ایک سمے ہوتا ہے، ابھی تھوڑا سمے لگے گا اس کام کے پورا ہونے میں، سمے سے پہلے تُو نے اگر اپنی بک بک جاری رکھی تو میرا دماغ خراب بھی ہو جائے گا۔''

''نہیں مہا متی جی! بس کچھ ایسی ہی باتیں ہیں جن سے میرے من میں ڈر کروٹ جاگ اٹھی ہے، نجانے کیوں میرے من میں ایک ڈر سا بیٹھ گیا ہے، تھوڑے سمے پہلے ہم سرتوا اس مندر گئے تھے، سرتوا اس مندر میں ایک پجارن رہتی ہے، ست رانی ہے اس کا نام ..... کلیانی جی! نجانے کیوں اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''ڈر کا کارن؟''

''وہی تو من میں نہیں آتا، کوئی کارن ضرور ہے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سمے لگے گا، کل کا کام آج نہیں ہو سکتا، کل کا کام کل ہی ہو گا، میں نے تجھے پہلے بھی کہا ہے کہ میرے پاس زیادہ آنا تیرے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''جے مہا کلیانی! یہ تھوڑی سی دکھشنا لائی ہوں ساتھ، سو یہ سویکار کر لیں۔'' ساوتری دیوی نے اپنے ڈھیلے لباس سے کوئی چیز نکال کر چڑیل نما عورت کو دی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ

پنجے سے اس نے اپنے لباس میں پوشیدہ کرلی۔

"جا بارش ہونے والی ہے۔" یہ کہہ کر وہ واپس اپنے مٹھ کے دروازے کی جانب چل

پڑی۔ ساوتری دیوی نے بھی آگے کا راستہ اختیار کیا تھا۔

سدھا، پشپا اور کرن سکتے کے عالم میں کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جو منظر دیکھا تھا اس

نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔ ساوتری دیوی کافی دور نکل گئیں تو سدھا نے کچھ کہنا چاہا لیکن کرن نے

اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں بولی۔ "جلدی سے یہاں سے نکل چلو، کوئی بات کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔"

سدھا بھی ایک دم خاموش ہو گئی اور اس کے بعد وہ سہمی ہوئی آگے بڑھنے

لگیں۔ کوئی فاصلے پر انہیں ساوتری دیوی سائے کی شکل میں جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ان

کے اور دور نکل جانے کا انتظار کرتی رہیں اور جب ساوتری دیوی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں تو

انہوں نے بھی جلدی جلدی آگے قدم بڑھا دیئے۔ فاصلہ کافی تھا۔

وہ یہ فاصلہ طے کرتی ہوئی آخر کار اپنے خیموں تک پہنچ گئیں۔ کرن کے خیمے میں داخل

ہو کر پشپا اور سدھا بھی کرن کے ساتھ زمین پر لیٹ گئیں۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں وہ بری طرح

تھک گئی تھیں اور اس کے علاوہ وہ کافی خوفزدہ بھی تھیں۔ جب تھوڑی دیر آرام کر چکیں تو تینوں اٹھ

کر بیٹھ گئیں۔

"ہو نہ ہو ایسی ہو سکتی ہیں، کشن بھیا پر جادو انہوں نے کرایا ہے۔ کیسی چونکا دینے والی بات ہے، ہم

انہیں 'بواجی بواجی' کہتے نہیں تھکتے اور بواجی نے ہی کشن بھیا پر یہ ظلم توڑا ہے۔ بھگوان جانے

کیسے ہوتے ہیں وہ ... یہ سب ساوتری دیوی کی وجہ سے ہوا ہے، یہ اچھا نہیں ہوا، ساوتری دیوی

اگر یہ چاہتی ہیں کہ اس طرح کشن بھیا کو قابو میں کر لیں گی تو بھگوان کی سوگند میں ایسا نہیں ہونے

دوں گی۔ میں ان کے جادو کا توڑ تلاش کروں گی۔"

"ایک بات یاد نہیں۔ تجھے، ست رانی نے کیا کہا تھا۔ کیا یہ سب کچھ ست رانی نے

تمہیں نہیں بتا دیا تھا؟" کرن بولی اور ایک بار پھر ان سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

پھر کرن نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ ست رانی بڑی مہان ہے، میرے من میں ایک

بات آئی ہے کہ میں ست رانی سے کہوں کہ وہ اس جادو کا توڑ تلاش کرے۔ بھگوان کی سوگند جب اس

نے پہلی بار میری آنکھوں میں دیکھا تھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے پورے شریر کو کرنٹ لگا ہو، وہ

مہا گیانی ہے، دوسری بات یہ کہ میں پتا جی کو بھی اس بارے میں بتاؤں گی، تم لوگ میرا ساتھ دینا۔"

"کیوں نہیں دیں گے۔ کشن بھیا کے پیارے نہیں ہیں۔" وہ تینوں بہت دیر تک باتیں

رہیں پھر دونوں سونے لیٹ گئیں لیکن ان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ باہر ان کے خیمے سے

لگا سے ساوتری دیوی کھڑی ہے۔

ساوتری اپنا کام کر کے اپنے خیمے میں آئی تو یوگیتا گہری نیند سو رہی تھی۔ ساوتری دیوی

اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس اتار کر ایک محفوظ جگہ رکھا پھر اسے کچھ کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں اور وہ

چونک پڑی۔ نجانے یہ آوازیں کیسی تھیں؟ خیمے سے باہر نکلی تو برابر کے خیمے میں جو کرن کا تھا، اسے

خیموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ صورتحال جاننے کے لئے بے چین ہو گئی اور خیمے سے کان لگا

کر کھڑی ہو گئی۔

ان کی باتیں سن کر ساوتری دیوی کے ہوش اڑ گئے۔ بات بالکل سچ تھی۔ ساوتری نے

یہ باتیں جاننے کے بعد کہ کشن نے شادی کر لی ہے۔ بڑی بے چینی سے سوچا کہ اب کیا کرنا

چاہئے؟ نتیجے میں وہی جادو ٹونے والی بات سامنے آئی اور انہوں نے کسی ایسی ہستی کو تلاش کرنا

شروع کر دیا جو کام کر دے اور کسی نے مہا مٹھ کے پاس رہنے والی کلیانی کا پتہ بتا دیا جو ایک بڑی

پہنچے ہوئے جادو کی ماہر تھی، وہ بہت سوں کا خانہ خراب کر چکی تھی۔

ساوتری دیوی، کلیانی سے ملیں اور انہوں نے اپنی مشکل کلیانی کو بتائی تو کلیانی نے انہیں

ایسے جادو منتر دیئے جن کے ذریعے کشن بیمار ہو جائے، کچھ عرصے بیمار رہنے کے بعد اس کے

توازن میں فرق آ جائے۔ وہ اس لڑکی کو بھول جائے جس نے اس سے شادی کی ہے اور اس

کے بعد صحت یاب ہو جائے، ٹھیک ہونے کے بعد وہ خوشی کے ساتھ یوگیتا کو سوئیکار کرے گا۔ اس

سلسلے میں بھاری معاوضہ طے ہوا تھا جو ساوتری دیوی قسطوں میں ادا کر رہی تھی۔

یہ لوگ مندروں میں یاترا کرتے ہوئے متھرا آ گئے جہاں ساوتری دیوی رہا کرتی تھی۔

کلیانی نے ساوتری کی میزبانی بھی قبول نہیں کی تھی لیکن ساوتری دیوی خود ان کے پاس یہیں

مکان میں رہتی تھی، بس کبھی کبھی اپنے گھر کا چکر بھی لگا لیتی تھی۔ وہ صورتحال سے آگاہ رہنا چاہتی

تھی لیکن آج کی رات اس کے لئے غضب کی رات بن گئی تھی۔ وہ اپنی دانست میں بڑی احتیاط

کے ساتھ کلیانی سے ملنے پہنچی تھی۔ اصل میں نجانے کیوں اس کا من بھی اندر سے ڈر رہا تھا اور اس

کے من میں بھی وہی لڑکی آئی تھی جس کا نام ست رانی تھا۔ اس نے اس کو یہاں خیموں میں بھی

دیکھا تھا اور اس سے پہلے سرنو اس مندر میں بھی اس نے اسے دیکھا تھا۔ نجانے کیوں اسے یہ لگا تھا

کہ یہ لڑکی اس کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے اور اب وہی بات اسے سامنے آ گئی تھی۔ وہ لڑکیاں جو

باتیں کر رہی تھیں، وہ انتہائی بھیانک تھیں اور ساوتری یہ سوچ رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا۔

دوسرے ہی دن اس نے ادت نارائن سے اجازت مانگی۔

"بھائی جی! ذرا گھر کا چکر لگا لوں، دیکھ لوں کہ نوکر چاکر کیا کر رہے ہیں، دوپہر یا شام تک واپس آ جاؤں گی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے؟"

"سب کچھ ہی تو تم نے یہاں ڈھیر کر دیا ہے ساوتری، ضرورت اور کس چیز کی ہو سکتی ہے۔ جاؤ تم گھر کو دیکھو، اگر ایک آدھ دن نہ بھی آ سکو تو کوئی بات نہیں، ہم تو ابھی یہاں کئی دن رہیں گے۔"

"جی.... !" ساوتری نے کہا اور اس کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل دی۔ یوگیتا بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

یوگیتا نے ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا بات ہے ماتا جی! کچھ پریشان پریشان سی ہیں؟"

"نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہے۔" ساوتری نے کہا اور یوگیتا کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ مطلب یہ تھا کہ ڈرائیور کی موجودگی میں اس طرح کی کوئی بات کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔

یوگیتا خاموش ہو گئی۔ ماں کی طرح وہ بھی سخت دل اور تھوڑی سی کینہ پرور لڑکی تھی۔ ساری باتیں اسے معلوم ہو چکی تھیں، یہ تب پتہ تھا کہ ماں نے کشن داس پر جادو کرایا ہے اور اس کے لئے بھاری رقم خرچ کر رہی ہے۔

آخرکار دونوں گھر پہنچ گئیں۔ بڑی خوبصورت کوٹھی تھی۔ ساوتری دیوی بیوہ تھیں، پتی بہت کچھ چھوڑ گیا تھا جس سے عیش کر رہی تھیں اور پھر ادت نارائن کی اکیلی بہن تھی اس لئے ادت نارائن بھی ان کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور ہر طرح سے ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔

گھر پہنچنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئیں۔ یوگیتا ان کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ انہوں نے یوگیتا سے کہا۔ "بڑا غضب ہو گیا ہے یوگیتا! پرسوں تم نے خیموں میں اس لڑکی کو دیکھا تھا جو بہت خوبصورت سی تھی اور سدھا اور پشپا وغیرہ سے ملنے آئی تھی؟"

"ہاں، بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی اس کی، شاید کسی مندر کی داسی ہے، ماما جی بھی بڑے پریم سے اس سے مل رہے تھے، پر نجانے کیوں میرا من جل رہا تھا۔"

"تم گئی تھیں اس کے پاس؟"

"میں نہیں جاتی، ایسے کام میں نہیں کرتی۔" یوگیتا نے ناک چڑھا کر کہا۔

"یوگیتا! ذرا سا کھیل بگڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر ساوتری دیوی نے بیٹی کو ساری کہانی سنا دی اور یوگیتا کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے کہا۔ "مگر چنتا کس بات کی ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ بھائی جی کو یہ ساری باتیں نہیں معلوم ہونی چاہئیں تھیں، حالانکہ وہ مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں اور انہیں خود اس بات کا پتہ ہے کہ [illegible] کشن نے ایسا کام کر ڈالا، وہ

یہی چاہتے ہیں کہ کشن کسی طرح اپنی سوچ سے باز آ جائے پر یہاں وہ اپنے آپ کو ناکام سمجھتے ہیں پھر بھی کم از کم یہ بات ان کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے تھی کہ میں نے کشن پر کچھ کرایا ہے۔ بات جب ہو تو میں کسی طور پر سنبھال لوں گی پر وہ لڑکی ست رانی مجھے بڑی خطرناک لگتی ہے، بعض وقت میں سوچتی ہوں کہ وہ انسان ہے بھی یا نہیں .... کہیں کوئی دیوی نہ ہو۔"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں ماتا جی! دیویاں اس طرح آکاش سے اتر کر مندروں میں رہتی ہیں، ہونہہ.... اب ایسی بھی کوئی خاص بات .... ہے، میں آپ کو ایک مشورہ دوں؟"

"تو پھر تجھے یہاں بٹھایا کس لئے ہے میں نے میرا دماغ تو کام نہیں کر رہا۔" ساوتری نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

"اپنا دلارے کام نہیں آئے گا کیا؟" یوگیتا نے کہا۔

ساوتری دیوی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔ "کیا مطلب! میں سمجھی نہیں؟"

"بدمعاش ہے ایک نمبر کا، آپ کو پتہ ہے کہ گیراج پر آنے والوں کو اس نے ٹھیک کر رکھا ہے، آس پاس کے سارے لوگ اس کی بات مانتے ہیں اور پھر گیراج پر کام کرنے والے "استاد استاد" کہہ کر اس پر اپنی جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔"

"ارے باپ رے تو کچھ بول۔" ساوتری دیوی، یوگیتا کی بات نہیں سمجھ سکی تھیں۔

"ذرا ان ست رانی جی کے ہاتھ، پاؤں تڑوا دیں دلارے سے کہہ کر، دلارے یہ کام بھی سے کر سکتا ہے، ایسا کر دیں کہ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہی نہ رہے، پہلے تو ہم ایک دشمن کو رستے سے ہٹا دیں، ویسے بھی وہ لڑکی نجانے کیوں مجھے بڑی چالاک .... سی لگی تھی۔"

ساوتری دیوی سوچ میں ڈوب گئیں۔ دلارے ان [illegible] گیراج پر کام کرتا تھا۔ یہ موٹر گیراج ساوتری دیوی کی زمین پر قائم تھا اور دلارے سے کرایہ لیتی تھیں۔ دلارے تھا بھی بدمعاش آدمی مگر ساوتری دیوی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ اس کی ویسے بھی مدد کرتی رہتی تھیں۔ موٹر کا ماہر تھا اور اس نے وہاں اپنا گیراج بنا رکھا تھا، چار چھ لڑکے اس کے ساتھ کام کرتے تھے اور وہ غنڈے .... تھے۔ بات سوچنے سمجھنے والی تھی۔ کم از کم ست رانی کے تو دو ہاتھ ٹھیک کرا دیئے جائیں، کوئی اس سیدھی بات نہ کرے، بعد میں دیکھا جائے گا، کوشش کی جائے گی کہ ادت نارائن تک ایسی کوئی بات پہنچنے نہ دی جائے اور سارا کام بھی ہو جائے۔

وہ ایک دم مسکرا پڑیں پھر انہوں نے کہا۔ "تیری کھوپڑی تو مجھ سے بھی تیز کام کرتی ہے۔" یوگیتا مسکرانے لگی تھی۔

☆....☆....☆

"ہوں ۔۔ ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی نے یہ آگ کیوں لگائی ، ویسے میں تم کو ایک بات کہوں ، خبردار ! اس سے دوبارہ مت ملنا ، وہ ہمارے کسی دشمن کی ایجنٹ معلوم ہوتی ہے جو ہمارے گھر میں پھوٹ ڈلوانا چاہتی ہے ، یقیناً ایسی ہی بات ہے اور میں تجھ سے کہے دیتا ہوں کرن ! دوبارہ اس سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔"

"پتا جی ! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ایک بات آپ ذہن میں رکھئے ، جس طرح ساوتری دیوی آپ کی بہن ہیں ، ہماری پھوپھی بھی ہیں ، ہمارا من انہیں برا کہتے کہتے نہیں سوکتا ، دوسری بات یہ پتا جی کہ یہ گیتا بڑی گہری لڑکی ہے ، آپ نے دیکھا ہوگا وہ ہمارے ساتھ کبھی نہیں بیٹھتی اٹھتی ، بھگوان نہ کرے اگر کشن بھیا سے اس کی شادی ہو بھی جاتی تو آپ یوں سمجھئے کہ سب کی چھٹی ، وہ ہمیں چھوڑ دیتے ، دونوں ماں ، بیٹیاں ایک جیسی ہیں۔"

"کرن ۔۔ ! باز نہیں آئے گی تو ؟"

"نہیں پتا جی ! باز نہیں آؤں گی ، جہاں بات آپ کی بہن کی ہے ، وہاں میرے بھائی کی بھی ہے۔"

"میں نے تجھ سے کہہ دیا ہے خبردار ! دوبارہ ست رانی سے مت ملنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

کرن خاموشی سے اٹھ کر باپ کے خیمے سے باہر چلی آئی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اوت نارائن جی ، ساوتری دیوی کے بارے میں کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔

پھر اس نے سدھا اور پشپا کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ "سنو ! میرا خیال تھا پتا جی میری بات پر غور کرکے کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کریں گے اور کچھ نہیں تو کم از کم معلومات ہی حاصل کریں گے لیکن وہ سرے سے اس بات کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں کہ ان کی بہن ایسا کوئی کام کرسکتی ہے۔"

سدھا اور پشپا بھی سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر انہوں نے بے بسی سے کہا۔ "تو پھر اب کیا کرنا ہے کرن ۔۔ ؟"

"پتا جی سے بھی کہہ دیا تھا میں نے کہ جس طرح پتا جی کو اپنی بہن سے پریم ہے ، اسی طرح مجھے اپنے بھائی سے بھی ہے ، کشن بھیا تو بالکل آؤٹ ہوچکے ہیں اور جیسے جیسے سمے بیت رہا ہے یوں لگتا ہے جیسے ان کا دماغ گم ہوتا جارہا ہو ، میں اپنے بھیا کا یہ حال کبھی نہیں ہونے دوں گی چاہے اس کے لئے مجھے پتا جی سے بغاوت ہی کیوں نہ کرنی پڑے ، کیا کریں گے زیادہ سے زیادہ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے گھر میں ڈال دیں گے ، پر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی ، انہوں نے مجھے ست رانی سے نہ ملنے کے لئے کہا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ وہی ہمارے دکھوں کا مرہم بنے گی ، ارے ، ساری باتیں اپنی جگہ ۔۔۔ اس نے تو کھل کر ساوتری دیوی کا نام لے لیا تھا ، الجھن مگر

لوگ تھے کہ پتہ نہیں ہوائی ایسا کام کرسکتی ہیں یا نہیں لیکن اب تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اب ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔"

اور اسی شام وہ اسی طرف چل پڑیں جہاں ست رانی اور ان کے درمیان ملاقات طے تھی۔ انہیں امید نہیں تھی ست رانی کے آجانے کی لیکن جب انہوں نے دور سے اسے آتے ہوئے دیکھا تو ان کے چہرے کھل اٹھے۔ ست رانی اس وقت بھی ایک سادہ سے لباس میں ملبوس تھی لیکن یہ لباس جس قیامت کی تھی ، اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ تینوں اسے دور سے دیکھتی رہیں اور چند لمحوں کے بعد وہ ان کے قریب پہنچ گئی۔

"تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ ہم یہاں آنے والے ہیں ؟"

"ہاں ۔۔ ! پتہ تھا مجھے۔"

"بات تو نہیں ہوئی تھی تم سے ؟"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ست رانی پر اسرار لہجے میں بولی اور ان کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"ست رانی ! ویسے تو کرنے کو بہت سی باتیں ہیں ، ہمارا من چاہتا ہے کہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھیں جبکہ تم نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ تم زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اس مندر میں پہنچی ہو ، اس سے پہلے تم کہاں تھیں ؟"

"لمبے کھیل ہوتے ہیں جیون کے اور سچی بات یہ ہے کہ تمہارا سنسار بڑا انوکھا ہے ، جب میں تمہارے سنسار میں آئی تھی تو میرا واسطہ بس چند پکھیرو وں سے تھا اور وہ مجھے آکاش بانیاں سناتے تھے ، انسانوں کے بارے میں بتاتے تھے ، منش کے بارے میں بتاتے تھے ، میں سوچتی تھی کہ میرے جیسے ہی ہوں گے اور سچی بات یہ کہ جب بجرنگی بابا مجھے اس جنگل سے نکال کر انسانوں کی دنیا میں لائے تو مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا ، میں نے سوچا کہ لو میں نے تو ایک بڑا حصہ جیون کا تنہا گزار دیا ہے۔ پر آہستہ آہستہ پتہ یہ چلا کہ انسان بہت خطرناک ہیں ، وہ ایک دوسرے کو دکھ دیتے ہیں ، انہیں کھا جاتے ہیں ، کبھی کبھی تو بھگوان کی سوگند مجھے ان انسانوں سے ڈر لگنے لگتا ہے ، لیکن یہاں تم جیسی پریمکائیں بھی ہیں ، تم تینوں بہت اچھی ہو ، مجھے اور بہت اچھی اچھی لڑکیاں مل جاتیں مگر بس مل کر دور ہو جاتی ہیں وہ اور یادیں رہ جاتی ہیں ، میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیا ہے کہ جو بیت گیا ، اسے بھول جاؤں اور یادوں کو اپنے من سے نکالوں ، میرا سنگا بجرنگی بابا ایک بار کھو گئے تھے ، نجانے کیسے مجھے ملے ، اب پھر کھو گئے ہیں ، میں تمہیں سچ بتا رہی ہوں بڑا پریم ہے مجھے ان سے ، میں نے جب آنکھ کھولی تو بجرنگی بابا کو ہی دیکھا۔"

"کہاں چلے گئے وہ...؟"

"یہ تو نہیں معلوم، پھر کبھی ان کا پتہ نہیں دیتے۔" ست رانی کے لہجے میں ایک درد سا ابھر آیا۔

تینوں لڑکیاں خاموشی سے اس حسین عورت کو دیکھ رہی تھیں۔ کرن نے کہا۔ "ست رانی ایک بات بتانا چاہتی ہوں میں تمہیں؟"

"ہاں بولو، خواہ مخواہ میرا من میلا ہو گیا۔" ست رانی نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ست رانی! تم نے میری بوا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا!"

"یہی کہا تھا نا کہ اس نے تمہارے بھیا پر جادو کرایا ہے اور اس کے من میں تمہارے لئے کرودھ ہے وہ من کی اچھی نہیں ہے۔"

"ست رانی! بالکل ٹھیک کہا تھا تم نے۔ تم یہاں رہتی ہو، کیا تم نے کبھی اس چڑیل عورت کو دیکھا ہے؟"

"چڑیل عورت...؟"

"ہاں بھیانک سا چہرہ ہے اس کا، مڑی ہوئی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بکھرے ہوئے بال!"

"ارے ہاں، دیکھا تو ہے میں نے اسے، ایک بار میں ایسے ہی دور نکل آئی تھی تو میں نے اسے اپنا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا، وہ چھپ کر میرا پیچھا کر رہی تھی پھر پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی، یہ اس دن کی بات ہے جب تم لوگ مجھے پہلی بار ملی تھیں۔"

"وہ بہت دور ایک مٹھ میں رہتی ہے۔"

"کہاں، کس طرف...؟" ست رانی نے سوال کیا تو پشپا نے اشارے سے وہ جگہ بتائی جہاں انہوں نے ساوتری دیوی کا پیچھا کیا تھا اور اس کا پیچھا کرتی ہوئی اس مٹھ تک پہنچی تھیں۔

"ہوں...! میں نے دور سے یہ مٹھ دیکھے ہیں، کبھی ادھر گئی نہیں، میں نے بتایا نا تمہیں کہ بہت دن نہیں ہوئے مجھے ادھر آئے ہوئے پھر بھی میں پربھو دیال جی سے پوچھ کر ہی کہیں جاتی ہوں، وہ بہت اچھے انسان ہیں، میں کوئی کام ان سے پوچھے بغیر نہیں کرتی۔"

"ادھر ہی رہتی ہے وہ... ست رانی! ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہماری بوا نے اس عورت کے ذریعے کشن بھیا پر جادو کرایا ہے۔ کشن بھیا کے بارے میں مختصر میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پتا جی اور ساوتری دیوی اپنی بیٹی یوگیتا سے ان کا وواہ کرنا چاہتے تھے پر انہوں نے بیرون ملک ثریا نامی ایک لڑکی سے پھیرے کر لئے، وہ آگرے کی رہنے والی ہے، ابھی پڑھ رہی ہے، وہ اپنی آ

ن بھیا کا کونا ہوگا پر بوا جی نے یہ بات من سے نہیں مانی، انہوں نے فوراً ہی عمل کر ڈالا اور ب یہ عمل اس سے ختم ہوگا جب کشن بھیا سب کچھ بھول جائیں گے، تم نے بھی تو یہی کہا

..

"ہوں!" ست رانی نے کہا اور چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سب ست رانی کو دیکھ رہی تھیں پھر ست رانی نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔ "چنتا مت کرو، ٹھیک ہو جائے گا، وں کی تمہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"ست رانی! میرے بھیا...!"

"ٹھیک ہو جائے گا، چنتا مت کرو۔" ست رانی نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

☆ ☆ ☆

ساوتری دیوی نے دلارے کو بھیجا۔ دلارے متھرا کے بدمعاشوں میں شمار ہوتا تھا اور بہت سے بڑے بڑے کام کر چکا تھا جو پولیس کی نگاہوں میں کھٹکتے تھے لیکن چالاک آدمی تھا، ہمیشہ اپ کو بچائے رکھتا تھا۔ ساوتری دیوی کے بلانے پر وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔

"سلام کرتے ہیں ستی ساوتری دیوی!" وہ ساوتری دیوی کو ہمیشہ ستی ساوتری کہتا تھا۔

"دلارے! بیٹھ جاؤ، مجھے تم سے ایک کام ہے۔"

"ں میں دیوی جی! دلارے کوئی اچھا آدمی نہیں ہے، جب کوئی اس سے کہتا ہے کہ اسے کوئی کام ہے تو دلارے ایک ہی بات سوچتا ہے کہ کسی کی ناک، چوٹی کٹوانی ہے، کسی کے ں چھری اتارنی ہے یا کوئی اور بات... اب آپ ٹھہریں سیدھی سادھی اور شریف، کیا آپ سے؟"

"تو بکواس بند کرے گا یا نہیں؟" ساوتری دیوی نے کہا اور دلارے ہنسنے لگا۔

"اچھا بولئے، کیا بات ہے؟"

"دلارے.....! ایک ایسا دشمن ہے میرا جو میرے پر کاٹ رہا ہے، مجھے نقصان پہنچا رہا ں چاہتی ہوں تو اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دے۔"

"کون ہے وہ، بتا دو، ٹوٹ جائیں گے ہاتھ پاؤں اس کے!"

"لڑکی ہے وہ ایک اور بہت خوبصورت۔"

"ارے... خوبصورت لڑکی کے ہاتھ پاؤں توڑنے ہیں، ارے نہیں ستی ساوتری جی! آپ کے دھرم کے مطابق بھگوان کی دین ہوتی ہے۔"

"نہیں باز آئے گا تو دلارے! اگر میرا کام نہیں کرتا تو جا بھاگ جا، میں تو یہ سوچ رہی تھی

کہ تجھے ایک اچھی خاصی رقم دے دی جائے۔"

"تو اب کہی نا آپ نے کام کی بات، جب کوئی سودا ہوتا ہے نا کسی چیز کا تو پہلے خریدار ایک روپیہ نکال کر سامنے والے کو دیتا ہے، اس کے بعد سودے کی بات ہوتی ہے۔"

"بڑا ہی کمینہ انسان ہے تُو، یہ لے!" ساوتری دیوی نے یہ کہہ کر کئی بڑے بڑے نوٹ نکال کر دلارے کے سامنے رکھے۔

دلارے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "ارے باپ رے باپ! ای لیں جلدی بولیں، یہ ہم اپنے ہاتھ میں لے لیں؟"

"ہاں لے لے۔"

دلارے نے جلدی سے ساوتری دیوی کے ہاتھ سے نوٹ لے لئے تھے۔ "جی اب کام بتا ڈالئے، ہمارا تو سانس پھول رہا ہے۔"

"لڑکی ہے، مرنو اس مندر میں رہتی ہے، لوگ اسے ست رانی کہتے ہیں، بہت خوبصورت ہے پر میرے ایک بہت بڑے کام میں آڑے آ رہی ہے، میں چاہتی ہوں کہ اس کی صحیح طرح ٹھکائی کر دی جائے۔"

"کام بہت چھوٹا سا ہے لیکن بہت بڑا بھی ہے مندر کی ایک داسی آپ نے کہا ہے۔ مندر ہی میں رہتی ہے، ایک بات بتا دیں آپ کو، کہیں کسی کو کانوں کان بھنک بھی لگ گئی تو ہندو مسلم فساد ہو جائے گا۔"

"کچھ بھی ہو جائے دلارے! تم یہ کام ضرور کرو، رقم یہیں تک محدود نہیں ہے، میں تمہیں دس ہزار روپے اور دوں گی اس کے علاوہ۔"

"ان کے علاوہ...؟" دلارے نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ دیکھ کر کہا جو کم از کم تین ہزار روپے تھے۔

"ہاں! ان کے علاوہ۔"

"ہو جائے گا، ہم آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کام کریں گے، آپ چنتا مت کرو۔"

"تم ہوش و حواس کے عالم میں یہ کام کرو گے، سمجھے؟"

"پر ایک بات بتائیے، مندر میں گھس کر یہ کام کرنا تو بڑا مشکل ہے۔"

"نہیں، وہ مندر میں ہر وقت نہیں رہتی، تمہیں اس کا پیچھا کرنا پڑے گا، وہ باہر جاتی ہے گھومتی ہے ادھر اُدھر!"

"تب پھر ٹھیک ہے، کسی سنسان سی جگہ لے آتے ہیں اسے اور اس کے بعد ہر یا کی

ہیں گے اس کا!"

"جتنی جلدی ہو سکے، یہ کام کر دو۔"

"ٹھیک ہے جی! آپ چنتا نہ کریں۔" دلارے رخصت ہو گیا اور اس کے جانے کے بعد ساوتری دیوی نے یوگیتا کو بلایا۔

"چلو تیاریاں کرو، زیادہ وقت ہمیں یہاں گھر میں نہیں گزارنا چاہئے، بھائی جی سوچیں گے پتہ نہیں کیوں وہاں جا کر بیٹھ گئی، میرا خیال ہے دلارے یہ کام آسانی سے کر دے گا۔"

"چھنا ہوا بدمعاش ہے ماتا جی! ضرور کر دے گا، مجھے بھی ست رانی کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پیر بہت اچھے لگیں گے۔" یوگیتا نے کہا اور دونوں ماں بیٹیاں ہنسنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

شام ہوئی تو ست رانی اس طرف چل پڑی جہاں لڑکیوں سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اسے اب ان لڑکیوں سے ملنے کی عادت پڑ گئی تھی اور اب وہ شوق سے ادھر جاتی تھی جبکہ سدھا، پشپا اور نرملا تو اس کی دیوانی ہو گئی تھیں۔ وہ اس سے پہلے ہی وہاں موجود تھیں۔ ست رانی مسکراتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔

"کیسی ہو تم لوگ؟ میں تمہیں سچ بتاؤں، میں ترویدی مہاراج کے پاس رہتی تھی، ان کی بیٹیاں مجھے بہت اچھی لگی تھیں اور پھر سچی بات یہ ہے کہ سنسار میں سب سے پہلے میری سہیلیاں وہی تھیں، پر بابا ترویدی مجھے لے کر کرشن سنگھ مہاراج کے پاس پہنچ گئے، کرشن سنگھ جی کے بیٹے کی سیوا کی تھی، میں نے وہ ٹھیک ہو گیا مگر کرشن سنگھ نے خود ہی اسے مروا دیا، میرا مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد میں نے کوئی سہیلی نہیں بنائی، پھر نجانے کون کون میرے جیون میں آیا، پر ترویدی جی کا گھر آج تک یاد ہے، چلو چھوڑو تم لوگ بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو، جب تم چلی جاؤ گی یہاں سے تب مجھے بڑا دکھ ہو گا۔"

"ہم بھی تمہیں چھوڑ کر خوش نہیں رہیں گے ست رانی! پر تم ہماری سہائتا کرو، ہمارا بھیا ٹھیک ہو گیا ہے۔"

"ہاں، وہ ٹھیک ہو جائے گا تم اس کی چنتا مت کرو۔"

"تم نے کچھ کیا ست رانی...؟"

"کہاں؟ ابھی تو مجھے اس کی ساری باتیں معلوم ہوئی ہیں، مجھے بتاؤ کہ وہ مٹھ کون سا ہے، کہاں ہے وہ؟"

"ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں، چلو ہمارے ساتھ چلو گی نا؟"

"ہاں، کیوں نہیں، مجھے دوری سے دکھا دینا، پاس نہیں جاؤں گی میں!"

"بابا پاس تو ہم بھی نہیں جائیں گے، وہ عورت چڑیل لگتی ہے مجھے، پوری چڑیل!"

"میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ وہ کون ہے اور اس نے میرا پیچھا کیوں کیا تھا۔" ست رانی نے کہا۔

چاروں وہاں سے اُٹھ گئیں۔ سدھا، پشپا اور کرن، ست رانی کو راستے بتاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔

دوسری طرف دلارے اور اس کے آدمی سر تو اس مندر سے ست رانی کا پیچھا کر رہے تھے۔ دلارے نے جب ان تینوں لڑکیوں کو دیکھا تو کسی قدر متفکر ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یار نندے! یہ تینوں لڑکیاں بھی ساتھ ہیں، اب کیا کریں؟"

"تو استاد ہم بھی تو چار ہیں، وہ چار ہو گئیں تو کیا، ایک ایک سنبھال لیں گے۔" اس کے ساتھی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بکواس مت کرو، تیس ہزار روپے کی رقم ہاتھ آ رہی ہے، بیس ہزار یہ ہیں، دس ہزار اور ملیں گے۔"

"ہمیں کتنے دو گے استاد...؟" جیسے خدا کہا گیا تھا، اس نے اپنے خلیفہ دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"نندے! تیرے بارے میں بہت کچھ سوچنا پڑے گا مجھے، پیسوں پر ہی مرتا رہتا ہے، کیا نہیں دیتا تجھے، کبھی تیرا حصہ رکھا ہے میں نے؟"

"سوری، سوری استاد!"

"سوری کا بچہ... میں کہہ رہا ہوں کریں کیا؟"

"استاد! کون سے ہمیں پہچاننے والے موجود ہیں پھر منہ ڈھک لو، کھیل ختم ہو جائے گا، اس کو مارنا ہے، مار دیتے ہیں، ویسے ہے بڑی سندر... ایسی کسی لڑکی کو مارنا ہی دل گردے کا کام ہے، تم نے صحیح پیسے لئے ہیں استاد!" تیسرے آدمی نے کہا۔

"اچھا فضول باتیں مت کرو، چلو چہرے ڈھک لو، آگے جو جگہ آ رہی ہے، وہ ہمارے کام کی ہے، ہمیں پھپائی پلہ سنبھال کر ادھر پہنچ جانا چاہیے باقی تینوں لڑکیوں کو ہاتھ مت لگانا، ویسے بھی ڈرپوک سی لگتی ہیں، صرف اپنا کام کرنا، چلو کم از کم اتنا تو ہے کہ وہ تینوں کی تینوں زخمی لڑکی کو اٹھا کر لے جائیں گی، بیچاری باتھوں، پیروں سے محروم ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے استاد!" انہوں نے اپنے چہرے نقابوں سے ڈھکے اور پھر فاسد ارادوں کے

تھ ایک لمبا چکر کاٹ کر ان لوگوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

کلیانی کا منہ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس سے تھوڑے پہلے ہی دلارے اور اس کے ساتھی منہ چھپائے ہوئے لڑکیوں کے سامنے آ گئے۔ لڑکیاں اس کے حلیے دیکھ کر بُری طرح خوفزدہ ہو گئیں۔ ست رانی انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

"اے لڑکی! آگے آ!" دلارے نے ست رانی کو اشارہ کیا اور دو قدم آگے بڑھا۔

لڑکیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ ان لوگوں کے ارادے صاف ظاہر تھے۔ ست رانی نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ قرب و جوار میں مٹھوں اور مندروں کی عمارتوں پر بہت سے بندر بھاگتے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ ست رانی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بھونپو بنایا اور پھر اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔

دلارے ٹھٹھک کر رک گیا تھا۔ ست رانی کا یہ عمل اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن لڑکیوں نے یہ ضرور دیکھ لیا کہ قرب و جوار میں دوڑتے بندر رک کر ادھر متوجہ ہو گئے تھے۔

دلارے یا اس کے ساتھیوں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رک گئے تھے لیکن اس کے بعد وہ پھر آگے بڑھے، پھر اس وقت ایک انوکھی بات ہوئی۔ بندروں کا غول بھرا مار کر آگے بڑھا اور ان لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ یہاں عام طور سے بندر انسانوں پر حملے نہیں کرتے تھے۔ یہ بات دلارے جانتا تھا۔

بندروں کے اس حملے نے چاروں ہی کو حواس باختہ کر دیا۔ بات یہیں تک محدود رہتی تو ٹھیک تھا، انہوں نے پیچھے سے کچھ اور بندر آتے ہوئے دیکھے، ان کے ہاتھوں میں درختوں کی شاخیں تھیں جو اچھی خاصی موٹی اور مضبوط تھیں، ان ڈنڈے بردار بندروں نے چاروں نقاب پوشوں پر حملہ کر دیا اور دلارے اور اس کے ساتھیوں کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

بندر انہیں نوچ کھسوٹ رہے تھے، کاٹ رہے تھے اور ڈنڈوں سے پٹائی کر رہے تھے۔ دلارے کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ست رانی نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ لڑکیاں پہلے تو بہت خوفزدہ تھیں لیکن بندروں نے جس طرح ان نقاب پوشوں کی پٹائی کی اور جس طرح وہ چیختے ہوئے جوتے چھوڑ کر بھاگے، وہ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا اور لڑکیوں کے بے اختیار قہقہے گونج اٹھے تھے۔ بندر جو تماشے کر رہے تھے، انہیں دیکھ کر لڑکیوں کو ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہی تھیں۔

نقاب پوش گر رہے تھے، اٹھ رہے تھے، ان کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور جسم کے کھلے حصوں سے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔ وہ حشر کیا تھا بندروں نے نقاب پوشوں کا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

پھر حیرت انگیز کچھ ہوا۔ بہت سارے بندر لڑکیوں کے گرد گھیرا باندھ کر کھڑے ہو گئے، دوسرے بندر نقاب پوشوں کو بہت دور تک پہنچا آئے تھے۔ جن بندروں نے گھیرا ڈالا تھا، وہ دونوں پاؤں آگے کر کے جھکے اور انہوں نے اس طرح سر زمین پر ٹکایا جیسے ست رانی کو تعظیم دے رہے ہوں۔

آہستہ آہستہ بندر پیچھے ہٹے اور پھر سارے کے سارے غائب ہو گئے۔ اچانک ہی سدھا، پشپا اور کرن کو کچھ خیال آیا۔ ان کی ہنسی رک گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ست رانی کو دیکھنے لگیں۔

کرن کے منہ سے نکلا۔ "ہے بھگوان! یہ کیا تماشا تھا، یہ کیا ہوا ست رانی! کیا تم نے ان بندروں کو آواز دی تھی، ارے ہاں تم نے منہ سے آگے بھونپو بنا کر منہ سے آوازیں تو نکالی تھیں مگر یہ کیا کھیل تھا!؟"

"ہماری ست رانی کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے، وہ سرنواس میں رہتی ہے اور بھگوان نے پتہ نہیں اسے کیا کیا قوتیں دی ہیں، ہم لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔" پشپا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

سدھا اور کرن بھی ست رانی کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ "بتاؤ گی نہیں ست رانی! یہ سب کیا تھا؟"

"میں نے اپنے دشمنوں کو بھگا دیا، بات ختم ہو گئی۔" ست رانی لاپرواہی سے بولی۔

"مگر کیسے.....؟ آخر یہ بندر کیسے تمہاری سہائتا کے لئے آ گئے؟"

"بس میری انسانوں سے زیادہ جانوروں سے دوستی ہے، تم جب بھی ہو گی، میں بہت سے جانوروں کو آواز دے کر اپنے پاس بلا سکتی ہوں۔"

تینوں لڑکیاں جو اس منظر کو دیکھ کر کافی قہقہے لگا چکی تھیں، اب حیران نگاہوں سے ست رانی کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں پہلے بھی یہی خیال تھا کہ ست رانی عام لڑکیوں سے ہٹ کر کوئی اور ہی ہستی ہے لیکن اب انہیں یقین ہو گیا تھا۔

سدھا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا تم ہنومان جی کی داسی ہو؟"

"پتہ نہیں۔" ست رانی کا لہجہ کچھ خشک سا ہو گیا۔ شاید وہ سوالات برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

"آؤ چلو، وہ تو سب بھاگ گئے، پتہ نہیں کون تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مجھے تم وہ مٹھ دکھاؤ جہاں وہ عورت رہتی ہے۔"

"ہاں چلو" لڑکیوں نے اب ہمت سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا لیکن اچانک ہی کوئی مٹھ کے پیچھے جا کر انہیں جھانکنے لگا۔ بس کسی انسانی جسم کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔

پشپا ایک دم بول پڑی۔ "ارے دیکھو وہ..... وہ..... کوئی ہے۔"

ست رانی نے مٹھ کی جانب دوڑ لگائی اور کچھ ہی لمحوں کے بعد یہ سب مٹھ کے قریب

...ں لیکن انہوں نے دیکھا کہ کافی فاصلے پر دوسرے کچھ مٹھوں کے درمیان ایک عورت بھاگی ...ی ہے۔ وہ سفید رنگ کی دھوتی باندھے ہوئے تھی اور بھاگتے ہوئے اس کی دھوتی کا پلو پیچھے ... رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

سدھا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بھگوان کی سوگند یہ وہی تھی، میں نے اس کی صورت ...یں دیکھی لیکن جتنا اسے دیکھا ہے، اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ وہی عورت تھی جس ... ملنے کے لئے ہوا یہاں آئی تھی۔"

"ہوں..... بھاگ گئی اور یقیناً مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ وہی تھی جس سے ...کے لئے ہوا یہاں آئی تھی۔"

"ہوں..... بھاگ گئی اور یقیناً مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ وہی تھی جس نے ...ون میرا پیچھا کیا تھا، چلو بعد میں دیکھ لیں گے اسے، تم نے مجھے اس کا مٹھ تو دکھا ہی دیا ہے۔"

کرن کہنے لگی۔ "کیا خیال ہے کیوں نہ ہم مٹھ کے اندر جا کر دیکھیں؟"

"نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہوگا، وہ اس کا گھر ہے اور کسی کے گھر میں گھسنا پاپ ہے، آؤ واپس ...ں" ست رانی نے کہا اور وہ چاروں کی چاروں وہاں سے واپس پلٹ پڑیں۔

حیرتوں کا طوفان اٹھ رہا تھا لیکن لڑکیوں کے دل میں ایک اطمینان بھی تھا کہ انہوں نے ...ت ایسا سہارا حاصل ہو گیا ہے جو کافی طاقتور ہے، جسے پرندوں اور جانوروں کی حمایت حاصل ...۔ وہ ان لمحوں پر غور کر رہی تھیں جب بندر ان چاروں کی پٹائی کر رہے تھے اور انہوں نے مار مار ...ن کا حلیہ خراب کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تینوں لڑکیاں بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتی جا رہی تھیں، لیکن اب نہ وہاں بندر موجود تھے اور نہ وہ جن کی پٹائی ان بندروں نے کی تھی، لیکن وہ منظر یاد کر کے انہیں بڑی ہنسی آ رہی تھی۔ راستے میں سدھا کہنے لگی۔ "پر ایک بات بتاؤ ست رانی۔ آخر وہ تھے کون؟ کیا وہ برے لوگ تھے جو ہم لڑکیوں کو اکیلا دیکھ کر ہمارے پیچھے لگ گئے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی؟"

"مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمیں نقصان پہنچانا چاہتے ہوں۔ ایسا لگا جیسے وہ ہمیں مارنے کے لیے آئے ہوں۔ انہوں نے اپنے چہرے بھی تو چھپا رکھے تھے۔"

"بھگوان جانے کون تھے۔ پر بندروں نے ان کی خوب پٹائی کی۔"

ست رانی نے کچھ دیر کے بعد ان سے کہا۔ "تم لوگ اپنے ڈیرے پر جاؤ، میں مندر جا رہی ہوں۔"

سدھا نے کہنا چاہا کہ ست رانی ہمارے ساتھ ہمارے ڈیرے تک چلو۔ لیکن پھر اسے یاد آ گیا کہ اوت نارائن نے انہیں منع کیا تھا کہ دوبارہ ست رانی سے نہ ملا جائے چنانچہ وہ خاموش ہو گئیں۔

ست رانی اپنی منزل کی جانب چلی گئی اور لڑکیاں اپنے خیموں تک پہنچ گئیں، لیکن نجانے کتنی دیر تک وہ اس بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں۔

☆...☆...☆

پربھودیال نے اس چڑیل نما بوڑھی عورت کو دیکھا جس کے بارے میں انہیں معلوم تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے اور مندروں سے پیچھے دور ایک مٹھ میں رہتی ہے۔ اس عورت کا نام کلیانی تھا۔ کلیانی کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ وہ کبھی کبھی مندر میں بھی آ جاتی تھی، لیکن اسے پوجا پاٹھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا جبکہ وہ خود کو کالی کی داسی کہتی تھی۔ بہر حال لوگوں کے متضاد خیالات تھے کلیانی کے بارے میں۔ لیکن اسے مندر آنے جانے سے کوئی نہیں روکتا تھا۔ وہ سرنواس مندر کے دروازے پر پہنچی تو پربھودیال خود ہی اسے دیکھ کر باہر نکل آئے۔ کلیانی نے اپنے

دانت نکال دیئے تھے۔ "جے مہاکالی۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پربھودیال کو پرنام کیا۔

پربھودیال جی اسے دیکھنے لگے، پھر بولے۔ "کیا سرنواس میں پوجا کرنے آئی ہو کلیانی؟"

"ارے نہیں، ہمارے ایسے بھاگ کہاں؟"

"تو پھر ادھر کیسے نکل آئیں؟"

"آپ سے باتیں کرنے کو من چاہا تھا پربھودیال مہاراج۔" کلیانی نے کہا۔

"تو پھر آؤ ادھر چل کر بیٹھتے ہیں۔" پربھودیال نے کہا اور تھوڑے فاصلے پر پتھر کی بنی ہوئی بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔

کلیانی پربھودیال کے چرنوں میں زمین پر بیٹھ گئی۔

"ہو کلیانی کیا کام ہے ہم سے۔ کیسے آنا ہوا؟"

"ایک لڑکی کے بارے میں بات کرنی ہے آپ سے۔"

"کون لڑکی؟" پربھودیال نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج بڑی سندری ہے اور ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کے مندر میں ہے۔ پر مندر کی داسی نہیں ہے۔ اس نے اپنا ڈیڑھ اینٹ کا مکان الگ ہی بنا رکھا ہے۔"

"سمجھ گیا میں تم کس کی بات کرتی ہو؟ ست رانی ہے اس کا نام۔ جمنا میں بہتی ہوئی آئی تھی۔ اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے۔ پر ہے بڑی اچھی۔ آج تک کبھی کسی کو اس نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ پر کلیانی تمہیں اس کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"میرا اس سے سمبندھ کرا دیں مہاراج۔"

"کیا؟"

"ہاں مہاراج وہ میرے کام کی ہے۔ آپ کہتے ہو کہ وہ مندر کی داسی نہیں ہے۔ دیوکنیا نہیں ہے اور اتھ پر ھدتی بھی نہیں ہے، جب وہ کچھ نہیں ہے مہاراج تو پھر اس سے میرا بندھن ہے۔"

"کلیانی... وہ ایک پوتر لڑکی ہے اور تم ٹھہری جادو ٹونے والی۔ تیرا اور اس کا کیا سمبندھ ہے۔"

"پر مہاراج میں اس کے بارے میں جاننا ضرور چاہتی ہوں۔ کون ہے؟ کہاں سے ہے اور اگر اس کے بارے میں آپ کو نہیں پتہ تو آپ کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔"

"تو... وہ کیسے؟"

"آپ کے چرنوں کی یہ دھول تھوڑا بہت گیان رکھتی ہے مہاراج۔"

"پر ہم اسے تیرے حوالے نہیں کر سکتے۔ وہ مندر میں رہتی ہے اور بڑی پوتر لڑکی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ہمارا اس سے من کا رشتہ ہوگیا ہے۔ بہت اچھی ہے۔ سب سے پریم کرتی ہے۔ مجال ہے جو اس نے کبھی کسی کا دل دکھایا ہو۔"

"ہم بھی اس کا دل تھوڑی دکھائیں گے مہاراج۔ آپ سوچ لیں ہم آپ کو بتائیں گے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ البتہ ایک بات ہم آپ کو ضرور بتا دیں مہاراج۔ وہ گیانی ہے، اختر گیانی ہے۔"

عجیب سی بات ہے جو بات ہمیں آج تک نہیں معلوم ہو سکی وہ تجھے معلوم ہوگئی۔ یہ بات سن لے، اگر وہ خود تیرے پاس آنا چاہے گی بھی، تو دوسری بات ہے، مگر ہم اسے تیرے پاس نہیں بھیج سکتے۔"

"من توڑ دیا آپ نے مہاراج ہمارا۔ کبھی ہم سے کوئی بات کہہ کر دیکھئے۔"

"تجھ سے ہم کیا کہیں گے سوائے اس کے کلیانی کہ اپنے کلیان کی فکر کر۔ بھگوان سے لڑائی اچھی نہیں ہوتی، تُو بھگوان سے لڑ رہی ہے۔"

جواب میں کلیانی ہنستی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ "بھگوان سے لڑائی بھی کوئی آسان بات نہیں ہوتی، پربھو مہاراج ..... چلو ٹھیک ہے ہم خود ہی کوشش کر لیں گے۔" کلیانی وہاں سے آگے بڑھ گئی اور پربھو دیال تشویش بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔

☆.....☆.....☆

گنگوتری نے کتنی ہی بار بجرنگی کو اس غار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا جہاں چندر رکھا کا مجسمہ موجود تھا، حالانکہ قبیلے کے کسی فرد کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اس غار کی طرف جائے۔ گنگوتری اپنے آنسو اور آہیں اپنے آپ تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا، لیکن نجانے کیوں وہ بجرنگی کو منع نہیں کر رہا تھا۔ یہ بات آج تک اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ بجرنگی کا چندر رکھا سے کیا تعلق تھا۔ کھوئی ہوئی یادداشت کا یہ مریض اپنے آپ ہی میں الجھا ہوا تھا، لیکن اس کے الفاظ بڑے تاثر انگیز تھے جب اس نے کہا تھا کہ میں نہیں جانتا سردار گنگوتری کہ میرے من کے تار اس مجسمے سے کیوں بندھے ہوئے ہیں۔ جس دن مجھے کوئی اپنا یاد آ گیا تو یہ بھی یاد آ جائے گا کہ اس سے میرا کیا سمبندھ تھا۔

نجانے کیوں گنگوتری اس دن کے بعد سے بجرنگی کے سلسلے میں کافی نرم ہو گیا تھا۔ اس نے لوگوں کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ اس کھوئی ہوئی یادداشت کے مریض کو کوئی نقصان نہ پہنچے، پھر ایک دن سردار گنگوتری غار کی جانب جا رہا تھا۔ اس کا کوئی دن یا وقت مقرر نہیں تھا۔ جب بھی اس کے من میں بیٹی کی آگ بھڑکتی تھی، وہ غار میں داخل ہو کر چندر رکھا کے مجسمے کے سامنے بیٹھ جاتا تھا اور آنسو بہاتا رہتا۔

اس دن اسے نہیں معلوم تھا کہ بجرنگی بھی غار کے اندر موجود ہے۔ وہ غار کے قریب پہنچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے اندر سے تیز چیخوں کی آوازیں سنیں اور بُری طرح چونک پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ آوازیں بجرنگی کی ہیں۔ وہ رو رہا تھا۔ چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور بول رہا تھا۔

"میری بچی، میری بیٹی، میرے من کی رانی ست رانی۔ رانی یہ سب کیا ہوگیا۔ میں کہاں تھا؟ ست رانی یہ تُو پتھر کیسے بن گئی ہے۔ ہے بھگوان، کیا ہوگیا یہ؟"

گنگوتری اندر داخل ہوگیا اور حیرت سے بجرنگی کو دیکھنے لگا۔ بجرنگی بھی یہ احساس کر کے کہ کوئی اور بھی اس غار میں آیا ہے، چونک کر پلٹا۔ گنگوتری کو دیکھتا رہا اور پھر اس کے بعد شاید اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ "وہ کہاں ہے؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھا۔ "میں نے اسے پہچان لیا ہے مہاراج۔ مجھے یاد آ گیا ہے کہ میرے من کے تار اس سے کیوں بندھے ہوئے ہیں؟ مہاراج۔ یہ میری رانی ہے ست رانی ہے مہاراج۔"

"کون ست رانی، تجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے کیا؟ کون ست رانی۔ میں تجھے بتا چکا ہوں اس کے بارے میں کہ یہ میری چندر رکھا ہے۔"

"بھگوان کی سوگند مہاراج۔ بھگوان کی ساگھی مان کر کہہ رہا ہوں کہ یہ ست رانی ہے مہاراج۔"

"ست رانی نہیں چندر رکھا۔ اب تُو یہ بھی کہے گا کہ یہ تیری بیٹی ہے۔"

"نہیں مہاراج! ان دونوں کا آپس میں کوئی سمبندھ ضرور ہے۔ آپ کی چندر رکھا اور میری ست رانی بالکل ایک جیسی ہیں۔ آپ نے مجھے پہلے بھی چندر رکھا کے بارے میں بتایا تھا۔ اب میں آپ سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں مہاراج۔ مجھے یہ بتایئے کہ چندر رکھا کو آپ سے دور ہوئے کتنا سمے بیت گیا۔ جب مجھے اپنی ست رانی یاد آ گئی ہے تو اور بھی بہت سی باتیں یاد آ گئی ہیں۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے مجھے مہاراج۔"

"چندر رکھا میری بیٹی تھی۔ جان سے زیادہ چاہتا تھا میں اسے۔ بہت ہی چہیتی تھی میری۔ دیوا میرا سائیس تھا اسے چاہنے لگا، مگر قبیل میں نات کا پیوند نہیں لگتا۔ دیوا، چھوٹے اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کی تھی۔ میں نے اسے قید میں ڈال دیا اور اپنی چندر رکھا کا وواہ کر دیا میں نے ایک اچھے لڑکے سے۔ پر وہ جیتا نہ رہ سکا۔ ہم لوگ ناگوں کا وش نکال کر اسے شہروں میں بیچتے

ہیں۔ چندر مکھ کے پتی کو بھی ناگ نے ڈس لیا تھا۔ اس سے میری چندر مکھ کے ہاں اولاد ہونے والی تھی کہ دیوالا چھو قید سے نکل بھاگا۔ ایک خوفناک رات کو اس نے میرے گھر میں گھس کر جبکہ میں اپنے گھر میں موجود نہیں تھا، میری چندر مکھ کو اغوا کر لیا اور اسے گھوڑے پر بٹھا کر راتوں رات وہاں سے دور نکل گیا۔ اس کے من میں بدلے کی بھاونا تھی۔ پتہ نہیں کہاں لے گیا میرے کلیجے کے ٹکڑے کو۔ بس پھر مجھے اپنی چندر مکھ کا پتہ نہیں لگا۔"

"آگے کی کہانی میں آپ کو سناتا ہوں مہاراج۔" بجرنگی بولا۔

"کیا مطلب؟"

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا نام بجرنگی ہے، لیکن اس سے پہلے میرا نام کچھ اور تھا۔ کچھ دشمنوں نے ہماری غربت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور میرے پتا پر ایک الزام لگا کر جیل میں بند کرا دیا۔ میرا پتا ایک نیک آدمی تھا۔ جھوٹے الزام کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے آتم ہتھیا کر لی۔ میں اور میری بہن رادھیکا اکیلے رہ گئے۔ پھر ان دولت والوں نے میری رادھیکا کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور جب مجھے پتہ چلا تو میں نے بدلہ لینے کی کوشش کی۔ میں نے اس عزت دار آدمی کے گھر پر حملہ کیا اور کئی بندے مار دیئے۔ پھر مجھے سزا ہو گئی اور میری رادھیکا نجانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھری۔ مہاراج جس طرح آپ کی چندر مکھ کھو گئی اسی طرح میری رادھیکا بھی مجھے نہیں ملی۔ مگر چندر مکھ کے بارے میں آپ کو مزید باتیں بتا سکتا ہوں۔"

کنگوتری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے آگے بڑھ کر بجرنگی کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔ "بتا بتا مجھے میری چندر مکھ کے بارے میں بتا۔ کیا جانتا ہے تو اس کے بارے میں۔ بتا دے مجھے میرے بھائی بتا دے۔" سردار کی آواز رندھ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور بجرنگی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔ "مجھے بتا میرے بھائی، مجھے بتا بجرنگی آگے کیا ہوا؟"

"دیوالا چھو چندر مکھ کو لے کر دور نکل گیا۔ میں ان دنوں ایک ٹوٹے مندر میں شیش ناگ کو جگانے کی تپسیا کر رہا تھا۔ منتر پڑھ رہا تھا۔ اس دن میں پڑوس کی ایک بستی گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ ٹوٹے مندر کی ایک دیوار کے ساتھ ایک لڑکی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے ایک بچی کو جنم دیا تھا اور ناگوں نے ماں بیٹی کو بری طرح ڈس لیا تھا۔ بچی بھی نیلے رنگ کی ہو رہی تھی۔ بھگوان ہی جانتا ہے کہ اس ماحول میں اس کی پیدائش کیسے ہوئی۔ پر بچی جیتی تھی اور ماں مر چکی تھی۔ مہاراج میرا من تڑپ کر رہ گیا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے اس سندر لڑکی کی جلائی اور اس بچی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسی کو میں نے ست رانی کا نام دیا اور اس کی پرورش

بچی لے لی اور وہ شخص جو چندر مکھ کو لے کر وہاں پہنچا تھا، وہ ایک زہریلے پھل کا شکار ہو گیا۔ اور اس کے گھوڑے کی لاش مجھے تھوڑے فاصلے پر ہی مل گئی تھی۔ بہرحال مہاراج ست رانی کو میں نے پروان چڑھایا۔ وہ جوان ہونے تک وہیں ٹوٹے مندر میں میرے ساتھ رہی اور پھر اسے سنسار دکھانے کے لئے مندر سے دور لے آیا۔ مجھے اپنی رادھیکا کی بھی تلاش تھی۔ مہاراج اس کے بعد بہت سے مرحلے آئے۔ ست رانی نے سنسار دیکھا۔ اس کے پورے شریر میں وش اترا ہوا تھا۔ اس کی نس نس میں زہر بھرا ہوا تھا اور جب بھی کسی ایسے شخص کا اس سے سامنا ہوا جس نے اس کے بارے میں برے انداز میں سوچا وہ اس کے وش کا شکار ہو گیا۔ مہاراج اسی طرح چلتے چلتے ہم دلی پہنچ گئے۔ دلی میں ہمیں کچھ لوگ ملے۔ کیرولین نامی ایک عورت نے ہماری مدد نبھائی اور آخرکار ان کی کوششوں سے میری رادھیکا کا پتہ چل گیا۔ میں رادھیکا کی تلاش میں گیا تو وہاں ہمارا ایک ایسا دشمن جس کا بھائی ست رانی کے وش کا شکار ہو گیا تھا مجھے پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا۔ دھوکے سے بڑا یا تھا اس نے مجھے اور آخرکار غصے میں اس نے مجھے ایک کشتی سے سمندر میں پھینک دیا۔ بس مہاراج سمندر میں نجانے کتنا سمے گزارا اور آخرکار میرے دم خم کی قوتیں ختم ہو گئیں اور پھر اس ساحل پر آ گیا جہاں گنگا دھرن نے مجھے دیکھا۔ وہ مجھے یہاں قبیلے میں لے آیا۔ یہ ہے میری کہانی۔ مہاراج! ست رانی بالکل اپنی ماں جیسی ہے۔ آپ کی بیٹی بھگوان کے چرنوں میں پہنچ چکی ہے۔ پر آپ کی نواسی ست رانی زندہ ہے اور دلی میں موجود ہے۔" بجرنگی نے ساری کہانی سنا دی۔

کنگوتری بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ "تو میری چندر مکھ ختم ہو گئی۔ پتہ نہیں غلط کیا ٹھیک؟ دیوالا چھو اگر جیت ہوتا تو میں اس کے پورے بدن پر سانپ لپیٹ دیتا۔ پانی پانی کر دیتا۔ اس طرح کہ اس کی ہڈیاں بھی نہ بچتیں۔ پر سسرا مر گیا۔ میری بیٹی کو بھی لے گیا۔ میرے بھائی میں اپنی ست رانی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے روپ میں اپنی بیٹی چندر مکھ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ بجرنگی مجھے اپنے ساتھ لے چل۔"

"چل سکتے ہیں مہاراج تو دیر کیجئے۔ میرے من میں آج بھی اپنی بہن کی بھاونا ہے۔"

"میری بیٹی، میری بچی اور میری ست رانی۔"

"میری بیٹی میری بچی۔" کنگوتری نے فوراً ہی کہا اور ایک بار پھر آگے بڑھ کر بجرنگی سے

☆...☆...☆

ست رانی کا پیچھا کر رہی تھی۔ ست رانی معمول کے مطابق اس طرف جا رہی تھی

جہاں اسے سدھا، کرن اور پشپا سے ملنا تھا۔ یہ جگہ کافی دور اور کسی حد تک ویرانے میں تھی۔ ست رانی ہنستی کھیلتی اسی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک کلیانی اس کے سامنے آ گئی۔

ست رانی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ کلیانی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے سامنے پہنچ گئی۔ ست رانی کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نمودار نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ لمحوں کے بعد وہ مسکرا دی اور اس نے کلیانی سے کہا۔

''کون ہو تم؟ کیا وہی نہیں جس نے اس دن میرا پیچھا کیا تھا، جب میں پشپا اور کرن سے ملی تھی، کیا تم وہی نہیں ہو جو کشن داس کو جادو کا شکار بنا رہی ہو، ہیں وہی ہو نا تم؟''

کلیانی منہ پھاڑ کر ہنس دی۔ ''ٹھیک پہچانا تم نے۔ میں وہی ہوں مگر تم کون ہو؟ کیا تمہیں اپنے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

''میں ست رانی ہوں۔ سرنواس مندر میں پربھودیال مہاراج کے پاس رہتی ہوں۔ وہ میرے پتا سمان ہیں۔''

''بہت اچھے منش ہیں وہ۔ پر ست رانی تم وہاں کیا کرتی ہو؟''

''رہتی ہوں وہاں۔ پوجا پاٹھ کرتی ہوں۔''

''مجھے ایک بات بتاؤ؟ کیا مہاراج پربھودیال نے تمہیں تمہارے بارے میں کچھ بتایا ہے۔''

''ہاں بس یہ بتایا ہے کہ ان کے لئے بیٹیوں جیسا مقام رکھتی ہوں۔''

''ست رانی آؤ میرے ساتھ مٹھ میں چلو۔ میں تمہیں تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گی، وہ جو کسی نے تمہیں نہیں بتایا۔ آؤ میرے ساتھ۔''

''وہ میرے پاس آنے والی ہیں، میری سکھیاں۔''

''وہیں مٹھ میں آ جائیں گی۔ میں بلا لوں گی انہیں وہاں۔ تم چلو۔''

کلیانی نے کہا اور ست رانی شانے ہلا کر وہاں سے چل پڑی۔ اس کے انداز میں ذرا سا خوف نہیں تھا حالانکہ کلیانی چڑیل جیسی شکل کی مالک تھی لیکن اس کے سامنے جو لڑکی تھی نجانے کون سی شکتی لے کر اس سنسار میں آئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اس مٹھ کے پاس پہنچ گئی۔ کلیانی پوری طرح ست رانی کو اپنے بس میں جکڑنا چاہتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سامنے کئے تو سامنے ہی دو سنگھاسن آ گئے جو خوبصورت تھے۔

ست رانی نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا تو کلیانی بولی۔ ''بیٹھو ست رانی! تم

رانی نہیں بلکہ مہارانی ہو۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ آج تک کسی نے تمہیں صحیح راستہ نہیں دکھایا۔ یہاں تم دیویوں کی طرح پوجی جا سکتی ہو۔ تمہیں وہ ملے گا جو تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتی پر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس سنسار میں تم کچھ بن کر آئی ہو۔''

سنگھاسن پر بیٹھ کر ست رانی نے کلیانی کو دیکھا اور بولی۔ ''مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''دیکھو، میں سب سے پہلے تم سے تمہارے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''میرا من کہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتاؤں۔''

''تو میں تمہارے من سے ساری باتیں خود نکال لوں گی۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے، اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں تمہاری داسی ضرور بن جاؤں گی۔ چلو میرے من سے جو نکال سکتی ہو نکال لو۔''

کلیانی مسکرائی۔ اس نے زمین سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی۔ اس پر پڑھ کر کچھ پھونکا اور ست رانی پر اچھال دی۔ ست رانی مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ تب کلیانی نے ست رانی کی آنکھوں میں جھانکا۔ ست رانی اسے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً یوں لگا جیسے کسی نے کلیانی کو سنگھاسن سے نیچے پھینک دیا ہو۔ کلیانی بہت زور سے نیچے گری تھی۔ اتنی زور سے کہ ہڈیاں کڑکڑا گئیں۔ وہ بری طرح خوفزدہ ہو کر ست رانی کو دیکھنے لگی اور ایک ہاتھ اٹھا کر پیچھے ہٹنے لگی۔

ست رانی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھی۔ اس نے کلیانی کو سہارا دیا اور بولی۔ ''اٹھو..... تم گر گئی ہو۔ تم نے وہ کیا جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس میں میرا دوش نہیں ہے۔''

کلیانی ایک ہاتھ سے اپنا منہ پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دوسری بار ست رانی کی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا بلکہ کافی حد تک خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

ست رانی پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تم نے ان لڑکیوں کو نہیں بلایا۔''

''آ گئی ہیں وہ۔ دیکھو ان کے سامنے میرا اپمان مت کرنا'' وہ بولی اور سنگھاسن پر بیٹھ گئی۔ سدھا، کرن اور پشپا اسی طرف آ رہی تھیں۔ وہ کلیانی کے مٹھ سے تھوڑے فاصلے پر جا کر رک گئیں۔ ست رانی انہیں دیکھ رہی تھی۔ جب وہ کئی منٹ تک وہاں سے آگے نہ بڑھیں تو ست رانی نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ یہاں کیوں نہیں آ رہیں؟''

''میں نے انہیں وہیں روک دیا ہے کیونکہ ابھی مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔''

''روک دیا ہے۔'' ست رانی حیرت اور دلچسپی سے بولی۔ ''یہ سب تم کیسے کر لیتی ہو کلیانی؟''

''تمہاری آنکھوں سے آنکھیں تو نہیں ملاؤں گی کیونکہ جو میرے ساتھ بیت چکی ہے وہ

میری عقل ٹھیک کرنے کے لیے کافی ہے۔ پر تم سوال کر رہی ہو تو مجھے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ خیر جواب دینا میرے لئے ضروری ہے۔ میں کالا جادو جانتی ہوں اور اپنے کالے گیان سے سارے کام کرتی ہوں۔"

"واہ! تم نے یہ سنگھاسن اس طرح منگوائے میں حیران ہوئی۔ تم نے کوشش ... کر دیا۔ مجھے تعجب ہوا۔ تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ کالے علم یا کالے گیان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن سنسار کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا من کرتا ہے اس لئے تم سے یہ ساری باتیں پوچھ رہی ہوں۔"

کلیانی نے واقعی ست رانی سے آنکھیں نہیں ملائی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔ "ست رانی تم نے سچ مچ مجھے حیران کر دیا ہے۔ گیان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کالا گیان اور ایک دیوتاؤں کا گیان۔ میرے جیون کی کہانی بہت لمبی ہے اور مجھے حکم بھی نہیں ہے کالی ماتا کا کہ میں وہ کہانی کسی کو سناؤں۔ اپنے بارے میں تو تمہیں نہیں بتا سکوں گی، لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ دیوتاؤں کا گیان بڑا ہوتا ہے اور کالے گیان والے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ گیان تمہیں کہاں سے ملا؟ پر ایک بات ہے تمہارا گیان مجھ سے بڑا ہے۔ اگر تم نے دیوتاؤں کا گیان حاصل کیا ہے ست رانی تو میں تمہیں تمہارے اسی گیان کی سوگند دے کر کہتی ہوں کہ مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنے کالے گیان سے تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گی۔ ویسے مجھے تھوڑا سا یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ایک مہان شکتی اس طرح تمہارے اندر بھر رہی ہے اور سنسار باسی اس سے بے خبر ہیں۔ کالی ماتا کی سوگند تم اگر چاہو تو تمہیں ایک دیوی کی طرح پوجا جا سکتا ہے۔"

ست رانی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا

"مگر مجھے ایک بات بتاؤ کلیانی۔ دیوی بن کے مجھے ملے گا کیا؟"

"دولت کے انبار، سونا نگری کی رانی ہو گی تم۔ سونے کے محل میں رہتی ہو اگر تم چاہو تو۔ بڑا گیان تمہارے پاس ہے اس سے تم نجانے کیا کیا حاصل کر سکتی ہو۔ دیکھو ست رانی میں ایک بات بتاؤں۔ یہ سنسار بڑا لوبھی ہے اور جس کے پاس مایا ہے وہ سنسار کا سب سے بڑا مان ہے۔ تمہیں حسن بھی ملا ہے اور گیان بھی۔ اتنی حسین ہو تم کہ اگر چاہو تو آدھا سنسار تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔ جیون چار دن کا ہے ست رانی۔ چار دن کے اس جیون کو اگر سندر بنانے کا موقع ملتا ہے تو تم اسے کیوں چھوڑتی ہو؟"

ست رانی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اسے یہ باتیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس

"تم مجھے بہت تجربہ کار دکھائی دیتی ہو کلیانی۔ بجرنگی بابا نے مجھے پہلے دن سے پروان چڑھایا اور وہ مجھے سنسار دکھانے لے چلے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ سنسار بڑا الجھا ہوا ہے اور اسے سمجھنا سب سے مشکل کام ہے۔ کلیانی تم مجھے سنسار کے بارے میں بتاؤ۔ میں تمہیں اپنا گرو بنانے کو تیار ہوں۔ تمہارے پاس علم کالا ہے۔ وہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اسے جیسے چاہو استعمال کرو۔ میرے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ تم نے مجھے سوگند دی ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتی ہوں اور ابھی تفصیل سے بتاتی ہوں۔ پر ایک شرط پر۔ تم مجھے سنسار کے بارے میں سب کچھ بتاؤ گی۔"

"ارے کیسی باتیں کرتی ہو۔ سنسار کے بارے میں تمہیں اتنا بتا دوں گی کہ تم سنسار کی سب سے سمجھدار عورت بن جاؤ گی۔ مان لو میری بات۔ جو میں کہہ رہی ہوں سمجھ لو۔ وہ تمہارے ... امرت ہوگا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتی ہوں کہ میں نے ایک مندر میں آنکھ کھولی۔ ٹوٹا پھوٹا مندر تھا جو سنسار کی آبادیوں سے بہت دور تھا۔" ست رانی نے اسے مختصر الفاظ میں اپنے بارے میں تفصیل بتائی اور پھر بولی۔ "اور میرا کوئی گیان نہیں ہے میں نہیں جانتی کہ بھگوان نے میرے اندر کیا کیا اتار دیا ہے۔ جن پنکھ پکھیرو میرے دوست رہے ہیں وہ سنسار میں رہنے والے کیڑے مکوڑے جو بس کی گانٹھ ہوں یا معصومیت سے جیون بتانے والے۔ سب کے سب میرے دوست ہیں۔ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو یہ پنکھ پکھیرو مجھے اس کا علاج بتاتے ہیں چونکہ یہ جنگل کی جڑی بوٹیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ میری طلب کردہ چیزیں مجھے لا کر بھی دیتے ہیں بس یوں سمجھ لو کہ یہ میرے ساتھی ہیں۔ باقی بھگوان نے میرے من میں جو کچھ اتار دیا ہے۔ یہ ساری چیزیں میرے ساتھ ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میں وش کنیا ہوں۔ بڑے بڑے ناگوں نے اپنا وش میرے شریر میں اتارا ہے۔ میرا جھوٹا پانی کبھی مت پینا۔ میں زہر کی پوٹ ہوں۔ سمجھ رہی ہو؟ میری نس نس میں زہر بھرا ہوا ہے۔" ست رانی نے کہا۔

کلیانی کا چہرہ سکڑ گیا۔ پھر وہ بولی۔ "تو کیا تمہارا جھوٹا پانی کسی کو نقصان پہنچا دیتا ہے؟"

"ہاں اگر کچھ ... دیتا ہے منش کو۔ اس کے بہت سے تجربے ہو چکے ہیں۔"

"جے مہا کالی، جے مہا کالی پھر تو تم بہت بڑی ہو ست رانی۔ میں تمہارے چرنوں کی داسی ہوں۔"

"اب تم میری دوست بن چکی ہو۔ کیا سمجھیں؟"

"ہاں ... اور مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہوگا۔ پر ست رانی میں یہ چاہتی ہوں کہ سنسار

ہے۔ آپ کے من کی آگ ابھی نہیں بجھے گی۔" گووند داس نے کہا۔
"ایسا ہی ہے گووند داس۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو اس کی موہنی صورت آنکھوں کے
سامنے آجاتی ہے اور من بے چین ہو جاتا ہے۔ میں کیا کروں، مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔"
گربچن سنگھ نے کہا۔
گووند داس نے فوراً ہی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "مہاراج ہمارا منہ چھوٹا ہے، بڑی بات
کہتے ہوئے من ڈرتا ہے۔"
"تمہیں میں نے دوستوں کا درجہ دیا ہے۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"مہاراج! اصل تو خیر بجرنگی ہی تھا جسے موت کے گھاٹ اترنا تھا اور بدھائی ہو مہاراج
کو مہاراج نے اس سے اپنا بدلہ لے لیا۔ پر وہ ناگن ابھی جیتی ہے۔ کیا آپ اس ناگن کو چھوڑ
دیں گے؟"
"بھگوان کی سوگند ہرگز نہیں۔ میرے بھائی کی موت کا ذریعہ تو وہی بنی ہے۔ میرا
من کیسے ہرا ہوگا اس کے وش کو پی کر۔"
"جی مہاراج۔ تو پھر کیا حکم ہے اس کے لئے؟"
"مجھے بتاؤ کیا کیا جائے؟"
"مہاراج! اگر مناسب سمجھیں تو دلی چلیں جہاں سے وہ اشتہار چھپا تھا اور جہاں سے
بجرنگی ہمارے پاس آیا تھا۔ ست رانی وہیں ہوگی۔ ہم دلی چل کر کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں اور ست
رانی کو تلاش کرتے ہیں۔ بس مہاراج اس کے بعد آپ کے ان داسوں کا کام ہے کہ وہ ست رانی
کے ساتھ کیا سلوک کریں۔"
"میں اسے گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ اتنے زخم لگاؤں گا اس کے شریر پر کہ گنے نہ
جا سکیں۔ اس کے شریر کا سارا خون زمین پر بہا دوں گا۔" گربچن سنگھ کی آنکھیں خون اگلنے لگیں
پھر اس نے کہا۔ "تیاریاں کرو دلی چلنے کی۔"
گربچن سنگھ، گووند داس اور ہری رام کے ساتھ دلی آ گیا۔ دلی کے ایک ہوٹل میں قیام
کرنے کے بعد تھوڑا سا بھیس بدل کر اس پتے پر پہنچ گیا جہاں کا پتہ اخبار میں چھپنے والی خبر میں
دیا گیا تھا، لیکن وہاں پہنچ کر اسے عجیب سی کہانی معلوم ہوئی۔
اسے پتہ چلا کہ کسی نے کیرولین اور اس کے دست راست حسن شاہ کو قتل کر دیا اور ست
نامی کسی لڑکی کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ ایک دکھ بھری خبر تھی، لیکن یہ لوگ کیا کر سکتے تھے۔ ہر
ممکن ذریعے سے انہوں نے پتہ لگایا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی ست رانی کے بارے

باتیں حاصل کیں اور بڑی چالاکی سے ساری باتیں معلوم کر کے وہ گربچن کے پاس پہنچ گئے۔
انہوں نے یہ دکھ بھری خبر گربچن کو دی کہ ست رانی کے بارے میں اب کسی کو پتہ نہیں معلوم کہ وہ
کہاں ہے۔ گربچن ان دونوں کی صورت دیکھتا رہ گیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ ہم پیاسے کے پیاسے رہ گئے۔ ہم اپنے بھائی کی آتما کو کوئی
شانتی نہیں پہنچا سکے۔"
گووند داس اور ہری رام نے گردن جھکا لی۔ پھر وہ لوگ سہارن پور واپس چل پڑے، لیکن
گربچن کی بے چینی ختم نہ ہوئی۔ وہ بیمار ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا وزن کم ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے
کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ ایسا روگ لگا تھا اسے کہ کسی طور دور نہیں ہو رہا تھا۔
گھر والے بھی سخت پریشان تھے۔ کچھ بزرگوں نے مشورہ دیا کہ وہ یاترا کو نکل جائے۔
پنڈتوں، منیوں اور جوگیوں سے رابطے کرے کہ وہ اس کے من کی شانتی کے لئے دعائیں کریں۔
بزرگوں کے مشوروں کو گربچن نے قبول کر لیا اور اس کے بعد کنیا کماری، ہردوار، اشودیہ اور
دوسرے مندروں میں جا جا کر پراتھنائیں کی گئیں۔ پھر اس کے بعد اس کا رخ متھرا کی
طرف ہو گیا۔
متھرا کے بعد اس کا ارادہ بندرا بن جانے کا تھا۔ متھرا پہنچنے کے بعد اس نے جمنا کنارے
ڈیرہ ڈال دیا جہاں بہت سے یاتری اپنے اپنے خیمے لگائے یاترا کے لئے آئے ہوئے تھے۔
گربچن سنگھ بہت بڑا آدمی تھا۔ زندگی میں نجانے کیا کیا کچھ کر چکا تھا۔ بے شمار لوگ اس
کے ظلم کا شکار ہوئے تھے، لیکن آخر کار انسان پر ایک ایسا وقت ضرور آ جاتا ہے جب وہ خود
اتنا بے بس ہو جاتا ہے جتنا بے بس وہ دوسروں کو کر دیتا ہے۔ گربچن سنگھ بھی اس وقت بے بسی
کا شکار تھا۔
بھائی کی موت نے اس پر اتنا اثر ڈالا تھا کہ ایک طرف اس کی دیوانگی عروج پر پہنچی ہوئی
تھی تو دوسری طرف اس کا دل سینے میں ہر وقت پھڑ پھڑاتا رہتا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ
اسے بہلانے کے لیے کیا کرے؟ ہری رام اور گووند داس نے گربچن سے بہت دولت کمائی تھی
اور اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ اس سے مخلص بھی تھے اور چاہتے تھے کہ گربچن سنگھ کا غم دور ہو۔
بہر طور اس کے بعد مندروں کی یاترائیں شروع ہو گئیں۔ گربچن سنگھ کے ساتھ پورا وفد
آیا ہوا تھا جن میں اس کے خاندان کی عورتیں بھی تھیں۔
بہر حال وہ اس خاندان کا سربراہ تھا اور سب ہی اس کے جیون کا سکھ چاہتے تھے۔
یاترائیں جاری رہیں۔ متھرا تو مندروں اور بندروں سے بھرا ہوا ہے۔ کئی مندروں کی

پوجائیں کرنے کے بعد آخر وہ کربچن سنگھ معمول کے مطابق ایک مندر میں پہنچا اور وہاں پاٹھ کرنے لگا۔

آج درگا پوجا تھی اور پورے متھرا کے مندروں میں اس دن خاص پوجا ہوا کرتی تھی۔

کربچن سنگھ اداس چہرہ لئے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی نگاہ درگا مائی کے مجسمے کی جانب اٹھ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بڑی حسرت و یاس تھی۔ درگا مائی کا قد آدم مجسمہ ایستادہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی باندھے ایک دیوکنیا کھڑی ہوئی تھی۔ یہ دیوکنیا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کربچن سنگھ نے پہلے تو اس پر توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر اس کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور دوسرے لمحے اس کے پورے بدن کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ دیوکنیا ... یہ تو اس کی جانی پہچانی ہے۔

☆ ... ☆ ☆

سدھا، کرن اور پشپا تینوں ست رانی کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے دور سے ست رانی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہی مست چال، وہی دلکش انداز، مسکراتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ان کے پاس پہنچ گئی۔

"خیر تو ہے ست رانی! آج کچھ دیر ہو گئی تمہیں؟" سدھا بولی۔

"کہاں۔ میں تو سب سے پہلے آ گئی تھی۔ تم لوگ ہی یہاں موجود نہیں تھیں۔ میں تمہیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔"

"ارے نہیں۔ ہم تو ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ تم کہاں سے آگے بڑھ گئیں۔ تم خود دیر سے آ گئی ہوگی۔"

"ہاں شاید ایسا ہو سکتا ہے۔"

"تب چلی گئی تھیں؟"

"ہاں... آگے چلی گئی تھی۔ کلیانی کے مٹھ کے پاس۔"

"کلیانی کے مٹھ کے پاس؟" تینوں لڑکیاں خوفزدہ لہجے میں بولیں۔

"ہاں کیوں؟ وہ کوئی چیتا ہے جو مجھے کھا جائے گی۔"

"نن... نہیں۔ وہ جگہ تو بڑی خوفناک ہے۔ وہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ تم وہاں چلی گئی تھیں؟"

"میں نے تمہیں وچن دیا تھا نا کہ کلیانی، کشن داس پر آئندہ اپنا جادو نہیں چلا سکے گی، اسے ہمت ہارنی پڑے گی۔"

"تو پھر؟" کرن جلدی سے بولی۔

"پھر کیا۔ جو میں چاہتی تھی وہ ہو گیا۔"

"ست رانی! تمہیں بھگوان کی سوگند جلدی بتاؤ۔ تم جانتی ہو کہ ہمیں کشن بھیا سے کتنا پیار ہے اور ہم اس سے بڑے پریشان ہو گئے ہیں۔ پتا جی ہیں کہ کوئی بات ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔"

"مان جائیں گے۔ اب سب کچھ مان جائیں گے۔ میری ایک بات سنو۔ ساوتری دیوی کے خیمے میں پانی کی ایک بوتل ہے جس میں پڑھا ہوا پانی موجود ہے۔ یوگیتا یہ پانی کشن داس کو پلاتی ہے اور کشن داس جادو کے زیر اثر آتا جا رہا ہے۔ تمہیں یہ کام روکنا ہوگا۔ میں تمہیں اس کا طریقہ بتاتی ہوں۔ کسی بھی طرح یوگیتا اور ساوتری دیوی کو ان کے خیمے سے نکال لاؤ، پھر وہ پانی کہیں لے جا کر خالی کر دو اور اس کی جگہ اتنا ہی سادہ پانی بھر دو۔ اس طرح کہ یوگیتا کو پتہ نہ چلے۔ پانی کے ضائع ہونے سے سارے اثرات ختم ہو جائیں گے اور کشن کی حالت بہتر ہوتی چلی جائے گی۔"

"ہم کر دیں گے۔ یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔ پر میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ساوتری دیوی کسی طرح پتا جی کی نگاہوں میں آ جائیں۔ وہ جو کچھ کر رہی ہیں اس کا پتا جی کو پتہ چل جائے۔"

"تم ایک کام کرو ساوتری دیوی کے بارے میں ایک بار پھر ادت نارائن جی کو بتاؤ اور جو کچھ نتیجہ نکلے وہ مجھے بتاؤ۔ پھر میں دیکھتی ہوں کہ میں کیا کر سکتی ہوں بلکہ ایک اور کام کرو۔ تم ادت نارائن جی کو بتاؤ کہ رات کی تاریکی میں ساوتری دیوی ایک کالے جادو کی ماہر کے پاس جاتی ہے اور کشن داس پر کالا جادو کرا رہی ہے۔ وہ اس کا پیچھا کریں تو سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ پھر بھی انہیں اگر یقین نہ آئے تو وہ جانیں اور ان کا کام۔"

پشپا گھبرا کر سدھا کی طرف دیکھنے لگی، لیکن کرن بولی۔ "یہ کام میں کروں گی۔ آخر میرا بھائی ہے وہ۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

"اگر یہ کام ہو جائے ست رانی تو ہم جیون بھر تمہیں دعائیں دیں گے۔"

"ہو جائے گا جیسا میں نے تم سے کہا یہ کام ہو جائے گا۔" ست رانی نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ کافی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ سب وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

یوں تو کشن داس سب کا چہیتا تھا لیکن کرن نے دل میں جتنا کی [illegible] سب سے زیادہ تھی۔ وہ خود کو بڑا نڈر رکھتی اور باپ کے پاس پہنچ گئی۔

"پتا جی۔ آپ نے کشن بھیا کے لئے کچھ کیا؟"

"کیا مطلب؟" ادت نارائن نے کہا۔

"میں نے آپ کو بوا جی کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اپنا کام مسلسل کر رہی ہیں۔" کرن نے کہا۔

نارائن غصے سے کرن کو دیکھنے لگا پھر بولا۔ "میں نہیں جانتا تمہیں اچانک ساوتری سے اتنی دشمنی کیوں ہو گئی ہے۔ کیا تم پھر اس لڑکی سے ملی تھیں؟"

"پتا جی۔ بوا جی کی میں اب بھی عزت کرتی ہوں لیکن وہ اپنے مقصد کے لئے میرے بھائی کی دشمن بن گئی ہیں۔ میں انہیں اس دشمنی میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ بس اب جو مجھ سے ہو سکے گا میں کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ خیمے سے نکل گئی۔

ادت نارائن پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس بات کی گہرائی تک جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوسری طرف کرن، سدھا اور پشپا کی مدد سے اپنا کام کر رہی تھی۔ جیسے ہی موقع ملا انہوں نے پانی کی بوتل میں پانی بدل دیا۔

شام کو وہ ست رانی کے پاس گئیں اور اسے ساری بات بتائی۔ ست رانی نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ آنکھیں کھول کر ان تینوں کو دیکھنے لگی۔ پھر پراسرار لہجے میں بولی۔ "رات کو ساوتری، کلیانی کے پاس جائے گی۔ تم ادت نارائن جی کو اس کا پیچھا کرنے پر مجبور کر دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن لڑکیوں کو کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ادت نارائن بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ رات کو اسے نیند نہ آئی اور جب ساوتری اندھیرا ہونے کے بعد پراسرار طریقے سے چھپتی چھپاتی خیمے سے نکل کر کلیانی سے ملنے چلی تو ادت نارائن بھی خاموشی سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔

* * *

وہ ساوتری دیوی کا پیچھا کرتا رہا۔ روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ مندروں کی روشنیاں دیسے ہی جگی تھیں۔ دور جتنا کنارے مٹھ چھپے ہوئے تھے اور ان مٹھوں کے درمیان ایسا بھیانک سماں تھا کہ دل دہشت سے کانپ اٹھے۔ آخرکار ساوتری دیوی ایک ایسے مٹھ کے سامنے رک گئی، جس کے اوپری حصے میں دیا روشن تھا۔ اس نے مٹھ کے دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔ "کلیانی، ..... باہر آؤ کیا تم جاگ رہی ہو؟"

ادت نارائن نے ایک مٹھ کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا لیا تھا جہاں ساوتری دیوی کھڑی تھی، وہاں اس مٹھ کا فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ تمام آوازیں آسانی سے سن سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر کچھ آہٹیں ہوئیں اور پھر مٹھ کے چھوٹے سے دروازے سے ایک بھیانک سی عورت باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں دیا تھا جسے وہ اپنے چہرے کے قریب کئے ہوئے تھی۔ اس نے ساوتری کو دیکھا اور بولی۔

"جب تمہارا دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چلی آتی ہو، کم از کم آنے کی خبر تو دی ہوتی۔"

"میں تمہارے پاس بہت ضروری کام سے آئی ہوں کلیانی۔"

"ہاں بولو۔"

"بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ... پہلے تم یہ پیسے سنبھالو۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں باقی رقم ادا کر دوں گی۔"

"احسان مت کرو مجھ پر، بتاؤ مشکل کیا پیش آئی ہے؟"

"تم ست رانی کو جانتی ہو؟"

"میں نہیں جانتی بس یوں سمجھو کہ تھوڑے ہی سے پہلے میں نے اس کا نام سنا ہے۔"

"وہ مجھے کافی خراب لڑکی لگتی ہے۔ اس نے کچھ ایسا چکر چلا رکھا ہے کہ میں بھی چکرا کر رہ گئی۔"

"اب میں تمہیں بتاؤں ست رانی کے بارے میں، مندروں کی داسی ہے۔ ...

پر مجھ دیاں اس سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کروا لے کم ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ" ساوتری نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ میں اس سے زیادہ تمہاری اور کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اب تمہیں اپنے سو۔۔۔ دیکھتا ہوں گے۔"

"لیکن بھیانی تم نے کہا تھا کہ جب تک کشن داس کے ذہن سے وہ لڑکی نہیں نکل جائے میری مدد کرتی رہو گی۔ یہاں تک کہ وہ میری یوگیتا سے شادی کرے گا۔"

"ارے بابا! ایسے معاملات میں تو کالی دیوی بھی کچھ نہیں کر سکتی، کیا سمجھیں تم؟"

"تم کالی کی داس ہو"

"میں کالی کی داسی ہوں، کالی کی ماں نہیں ہوں کیا سمجھیں تم؟" کلیانی نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور ساوتری کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کلیانی! کیا تمہارے اندر کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہو گئی ہے؟"

"ہاں ہو گئی ہے، پھر۔"

"میری جو تم سے بات ہوئی تھی۔"

"اب تو جا ورنہ تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا اور میں تمہیں بتاؤں تیرا بھائی تیرے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تو نے خود ہی اپنی رام کہانی اسے سنا دی ہے۔ جا ساوتری جا اور اس کے بعد میرے پاس کبھی مت آنا۔" یہ کہہ کر کلیانی واپس اپنے مٹھ میں چلی گئی۔

لیکن ساوتری کے لئے یہ الفاظ بم کے دھماکے سے کم نہیں تھے جو کلیانی نے کہے تھے۔ اس نے پلٹ کر خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، اور پھر آواز دی۔ "بھیا جی۔ بھیا جی تم یہاں ہو؟"

ادت نارائن مٹھ کے پیچھے سے نکل آیا اور پھر اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں میں یہاں ہوں، کاش میں یہاں نہ ہوتا، بھگوان نے جو کچھ مجھے سنایا ہے کیوں سنایا ہے، آ ساوتری، واپس چلتے ہیں، آج میں نے اپنا بہت کچھ کھو دیا ہے یہاں، بہت کچھ کھو دیا ہے یہاں، اپنی بہن کھو دی ہے تو میری بہن کہاں ہے ساوتری، تو نے میرے جیتے جی مجھے مار دیا ہے، مرتے دم تک میں اس کی تکلیف سے نجات نہیں حاصل کر پاؤں گا۔ مان تو بڑا ہے میرا، میں اکیلا رہ گیا ہوں ساوتری۔"

"بھیا۔۔۔ بھیا جی میں۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اب بھی مجھ سے یہ پوچھ رہی ہے ساوتری۔ مان ہے۔" ادت نارائن نے کہا۔ وہ پلٹا اور

ساوتری بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

"میری بات تو سنو بھیا جی۔"

"میرے کشن کا کیا حال کر دیا تو نے، مجھے دھوکا دے کر اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتی رہی۔ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتی رہی۔ ارے وش تو تو ہی دے رہی تھی اُسے ساوتری۔ یوگیتا میری بھی بیٹی تھی۔ اب تم دونوں میری کچھ نہیں رہیں، اس لئے تھی کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ میں بھی اس کے لئے پریشان تھا۔ میرے من میں بھی یہی آشا تھی کہ یوگیتا میرے گھر میں بہو بن کر آئے۔ ساوتری کیا کیا تو نے۔۔۔ کیا حال ہو گیا ہے میرے بیٹے کا۔ تو نے اس کا مان ہی اُلٹ دیا۔ میں کتنا پریشان تھا تیری بچی کے لئے۔ میں بھی اسے چاہتا تھا مگر کیا کروں جس نے میرا مان ہی نہیں، من بھی توڑ دیا، بھگوان تمہیں سکھی رکھے، ساوتری ایک بات کروں تم سے، مجھے اور شرمندہ مت کرنا۔ صبح کو تم اپنے خیمے سے گھر چلی جانا یوگیتا کو لے کر اور پھر میرے پاس مت آنا۔ میں بچوں سے کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ میں خود بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔ مگر ابھی رہ کر میں کیا کروں گا۔" ادت نارائن کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ اس نے آنسو پونچھے۔

ساوتری اس سے کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ دوسری صبح وہ خاموشی سے یوگیتا کو لے کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ ادت نارائن بھی اپنے خیمے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ صبح کرن اور پشپا کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ساوتری دیوی اپنا سامان اٹھا کر منہ اندھیرے چلی گئی ہیں، لیکن لڑکیوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف حیرت انگیز طور پر کشن داس کچھ بہتر نظر آ رہا تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ ہوئی کہ ست رانی بغیر کسی اطلاع کے وہاں آ گئی۔ اس کے چہرے پر پُراسرار تاثرات تھے۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں، لیکن انہیں خوف ہوا کہ کہیں ادت نارائن اس کے خلاف کوئی بات نہ کہیں۔

یہ چاروں لڑکیاں خیموں سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ بیٹھیں تو کشن داس وہاں پہنچ گیا، حالانکہ وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اب تیز رفتاری سے چل پھر نہیں سکتا تھا، لیکن اس وقت وہ بالکل درست نظر آ رہا تھا۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا اور مسکرا کر بولا۔

"کیا مشکلیں ہو رہی ہیں لڑکیو!"

"بھیا جی آپ کیسے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں یار، میں تو حیران رہا ہوں کہ آج طبیعت حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہو گئی ہے یہ کون ہیں؟" کشن داس نے ست رانی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ لیکن اچانک ہی اس نے کرنے سے

بچنے کے لیے سدھا کا سہارا لیا۔ اس کی آنکھیں ست رانی کی آنکھوں میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں اور ست رانی اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

کچھ لمحے تک وہ اسے دیکھتی رہی اور اس کے بعد ایک دم اس نے نگاہیں ہٹا لیں۔ کشن داس بھی بُری طرح چونک پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کئی بار گردن جھٹکی اور بولا۔

''یہ... یہ کون ہیں؟''

''بھیا جی یہ ست رانی ہیں، ہماری دوست ہماری محسن۔''

''پتہ نہیں کیا ہو گیا مجھے، میں چلتا ہوں تم لوگ باتیں کرو۔'' کشن داس نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔

ست رانی مسکرا رہی تھی۔ اس نے کرن، سدھا اور پشپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بدھائی ہو تمہیں، تمہارے کشن بھیا ٹھیک ہو گئے۔ اب اگر چاہتی ہو کہ ساوتری دیوی کوئی اور کھیل نہ کھیلیں تو جلدی سے ان کا ''وِواہ'' کرا دو۔''

''ہم لوگ کشن بھیا کو لے کر کاشی جا رہے ہیں۔ مرنے جانے کہاں کہاں پھرے پر متھرا میں ہمارا کام ہو گیا۔ بھگوان تمہیں سُکھی رکھے ست رانی۔''

دو تین دن کے بعد اوت نارائن اپنے پریوار کو لے کر متھرا سے چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

بات بہت پرانی تھی، لیکن گر بچن کی بینائی اور عقل دونوں ٹھیک تھے۔ اس نے جرگی کی بہن رادھیکا کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ رادھیکا کی عمر بے شک آگے بڑھ گئی تھی، لیکن خوبصورتی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ جوان اور سندر لگ رہی تھی۔ گر بچن کے ذہن میں ریل سی چل رہی تھی۔ بے شک جرگی مر چکا تھا لیکن یہ اس کے بدترین دشمن کی بہن تھی اور اس کے من کی آگ کسی طور بجھ نہیں رہی تھی۔ اس وقت گوبند داس پاس موجود تھا، اس نے سوچنا کے عالم میں کہا۔

''گوبندے...! اس دیو کنیا کو دیکھ رہا ہے وہ جو مورتی سے لگی کھڑی ہے۔''

''جی مہاراج، کیوں؟'' گوبند داس نے تیکھی نگاہوں سے گر بچن کو دیکھ کر کہا۔

''جانتا ہے یہ کون ہے؟'' گر بچن سنگھ سانپ کی طرح پھنکارا۔

''بس اتنا جانتا ہوں مالک کہ وہ دیو داسی ہے۔''

''میرے سینے کی آگ ہے وہ۔ اسی کی وجہ سے سارے کھیل شروع ہوئے تھے، یہ جرگی کی بہن رادھیکا ہے، سمجھا، یہ میرے دشمن کی بہن ہے۔''

''اوہ...!'' گوبند داس کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

''مجھے یہ عورت چاہیے گوبند داس، میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اسے کتیا بنا کر رکھوں گا۔ اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر اسے اپنے کمرے کے دروازے پر باندھوں گا تاکہ جرگی کی آتما تڑپ تڑپ کر رہ جائے۔ تو نہیں جانتا میرے من میں کیسی آگ سلگ رہی ہے۔ وہ کمبخت پتہ نہیں کہاں روپوش ہوئی ہے۔ جیتا رہوں گا میں اس سے تک۔ جب تک مجھے ست رانی کا پتہ نہ مل جائے، جیتا جلاؤں گا اس کو۔ سارا وش دھرے کا دھرا رہ جائے گا، ایسا ماروں گا اسے گوبند داس کہ جرگی کی آتما شانت ہو جائے اور میرا بھائی خوش ہو جائے۔''

''جی مہاراج۔''

''تو تجھے گوبند داس یہ کام تجھے کرنا ہے، اس مندر کا نام کیا ہے؟''

''رام کلی مندر کہلاتا ہے مہاراج۔''

''ہری رام کے ساتھ بیٹھ کر بات کر، بلکہ تھوڑی دیر کے بعد ہم تینوں یہ مشورہ کریں گے کہ کس طرح اسے یہاں سے سہارن پور لے جایا جا سکتا ہے۔''

رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گوبند داس، ہری رام اور گر بچن سنگھ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہری رام نے کہا۔ ''مہاراج! دیو کنیا ئیں بڑی پوتر ہوتی ہیں۔ ان کا احترام کرنا پڑتا ہے اگر کبھی کسی کو پتہ چل جائے کہ کسی نے کسی دیو کنیا پر بُری نگاہ ڈالی ہے تو دیوتاؤں کا شراپ تو ملتا ہے پر ساتھ ہی پجاری بھی جیتا نہیں چھوڑتے۔ ایسے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں مہاراج۔''

''کسی بھی قیمت پر یہ کام کرنا ہے ہری رام، مجھے لے یہ بہت ضروری ہے، اگر تم لوگ میرا من چاہتے ہو تو یہ کام کرو۔''

''ٹھیک ہے مہاراج میں دیکھتا ہوں۔''

ہری رام نے تین دن تک گوبند داس کے ساتھ رام کلی مندر تک پوچھ پاچھ کی تھی اور اس کے آدمی آدھی رات تک یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ مندر میں رہنے والی دیو کنیا ئیں کہاں رہتی ہیں، کہاں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ صبح کو جب وہ اشنان کرنے جمنا کنارے جاتی ہیں تب بھی اتنا پہرہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔

تین دن تک کوشش کرنے کے بعد ہری رام نے گر بچن سے کہا۔

''مہاراج! ہم اکیلے کوئی کام نہیں کر سکتے، اتنا سخت پہرہ ہوتا ہے کہ کسی دیو کنیا کو نکال لے جانے کی کوئی ترکیب نظر نہیں آتی۔ میرے من میں ایک بات ہے مہاراج۔ دلی جانا پڑے گا، وہاں ہمارے ایسے بندے موجود ہیں جو ہمارے لئے بندوبست کر سکتے ہیں۔ وہی

وہ آدمی نہیں وہاں سے لانے ہوں گے جو پجاری لگیں گے، پر مہاراج وہ پجاری نہیں ہوں گے بلکہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے من میں دیویوں اور دیوتاؤں کا کوئی خوف نہ ہو۔ وہی اتنا بڑا کام کر سکتے ہیں۔''

ٹھیک ہے، روپے پیسے کی چنتا مت کرنا، جتنا بھی خرچ ہو جانے میں دوں گا، پر میرے دشمن کی بہن میرے جوتوں میں ہونی چاہئے۔''

''ٹھیک ہے مہاراج! آپ جو حکم دیں گے میں اس کا پالن کروں گا۔'' ہری رام نے جواب دیا۔

☆ .. ☆ ☆

گنگوتری تیاریاں کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں گنگا دھرن اس کا دست راست تھا۔ سب سے زیادہ بہادر اور سب سے اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا گنگا دھرن اور گنگوتری اس پر بہت اعتبار کرتا تھا۔ پہلے تو یہ سوچا گیا کہ زیادہ لوگوں کو ساتھ لے کر دلی چلا جائے پھر یہ فیصلہ ملتوی کر دیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ پجاریوں کے روپ میں گنگوتری، بجرنگی اور گنگا دھرن دلی جائیں اور ست رانی کو حاصل کر لیں۔ گنگا دھرن ایک دو بار زہر بیچنے کے لئے دلی جا چکا تھا، اس لئے اسے راستوں وغیرہ کی معلومات تھیں۔ آخر کار تیاریاں مکمل ہوئیں اور یہ لوگ ریل میں بیٹھ کر چل پڑے۔ مختلف راستے اختیار کئے گئے تھے یہاں تک کہ وہ دلی پہنچ گئے۔

بجرنگی کا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا، دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کیرولین کے ٹھکانے پر پہنچا تھا مگر یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ کیرولین کا بنگلہ ویران نظر آ رہا تھا اور بڑے گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ دوسرا ٹھکانہ حسن شاہ کا اسٹوڈیو تھا لیکن اسٹوڈیو پر بھی تالا نظر آیا تو اس نے آس پاس کے لوگوں سے رابطہ کیا۔ کافی دن یہاں رہ چکا تھا اس لئے کچھ تعلقات بھی ہو گئے تھے۔ ایک بنگلے کے چوکیدار سے ملا تو چوکیدار نے کہا۔

''ارے بابو صاحب! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ بیچاری کیرولین اور حسن شاہ کا تو خون کر دیا گیا۔ ڈاکہ پڑا تھا ان کے گھر میں۔ ڈاکوؤں نے مال بھی لوٹا اور انہیں قتل بھی کر دیا۔''

بجرنگی پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ گنگوتری اور گنگا دھرن ساتھ ہی تھے، بمشکل تمام بجرنگی نے خود کو سنبھالا اور بولا۔ . .

''اور بنگلے کے نوکر چاکر کہاں گئے؟''

''تو جب مالکن ہی نہ رہیں تو نوکر چاکر بیچارے کیا کرتے؟''

''نہیں، میرا مطلب ہے ایک لڑکی بھی تو یہاں رہتی تھی، ست رانی تھا اس کا نام۔''

''ہاں جی وہ بھی یہاں سے چلی گئی، کچھ پتہ نہیں ہے ہمیں اس سے زیادہ۔''

بجرنگی پاگلوں کی طرح گنگوتری کو دیکھنے لگا گنگوتری کا چہرہ بھی غمزدہ ہو گیا تھا۔ پھر بجرنگی نے سوچ لیا، ست رانی بہر طور زندہ تھی اور ہو سکتا ہے وہ دلی میں ہی کہیں مل جائے، اپنے طور پر وہ حاصل کرتا رہا، ایک دو جگہ سے پوچھ گچھ کی، ایک ایسی جگہ ان لوگوں نے اپنا ڈیرہ لگا لیا تھا جہ بدوش کبھی کبھی آ کر ٹھہر جاتے تھے اور پھر وہ دلی کی خاک چھاننے لگے۔ گنگوتری اور گنگا الگ الگ ست رانی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

پھر اچانک ہی ایک دن اسے ہری رام نظر آ گیا۔ ہری رام کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا ساتھی تھا اور اس سے بھی وہ وہیں موجود تھا، جب گرجنون نے بجرنگی کو سمندر میں پھینکا تھا۔ کو دیکھ کر بجرنگی کی آنکھوں میں خون اتر آیا چونکہ وہ پیچھے سے کے راپ میں تھا، اس لئے امکان تھا کہ ہری رام آسانی سے نہیں پہچان سکے گا۔ ویسے بھی قبیلہ کو تقریباً میں رہ کر بجرنگی کا لباس کافی بدل چکا تھا۔

بجرنگی احتیاط سے ہری رام کا پیچھا کرتا رہا، ہری رام پتہ نہیں کس چکر میں پھر رہا تھا۔ پھر وہ سامنے در سے ہوٹل میں داخل ہو گیا اور بجرنگی کو پتہ چلا کہ وہ اسی ہوٹل کی پہلی منزل پر کمرے میں مقیم ہے۔ بجرنگی کے دل میں طرح طرح کے منصوبے بننے لگے۔ پھر اس نے گنگوتری اور گنگا دھرن کو ہری رام کے بارے میں خبر دی۔

''اس بات کے امکانات ہیں کہ ہری رام سے ست رانی کا کچھ پتہ چل سکے، ہمیں اس کے کرنا ہوگا۔''

وہ جگہ جہاں ان لوگوں نے ڈیرے ڈالے تھے کافی سنسان تھی۔ آس پاس کچھ بھی نہیں انہوں نے اپنا ایک ایسا ٹھکانہ بنا لیا تھا جہاں وہ رات گزار سکیں، پہلے انہوں نے اس جگہ کو اس قابل بنایا کہ اگر کسی کو اغوا کر کے وہاں لایا جائے تو دقت نہ ہو اور اس کے بعد وہ اس جگہ گئے جہاں ہری رام مقیم تھا۔

اس وقت شام کو پہنچے تھے وہ اس میں اترے ہوئے تھے، جب ہری رام اپنے ہوٹل سے باہر نکل ہی ایک طرف چل پڑا، یہ تینوں اس کے پیچھے تھے۔ منصوبہ بنایا گیا تھا کہ ہری رام کو اغوا کرنا ہے۔ گنگا دھرن اس منصوبے میں پیش پیش تھا۔ اپنے ساتھ وہ طرح طرح کے لایا تھا تاکہ پجاریوں کا روپ برقرار رہ سکے۔ پھر جب ایک ایسی سنسان جگہ نظر آئی دور تک کوئی نہیں تھا تو گنگا دھرن اور گنگوتری آگے بڑھ کر ہری رام کے سامنے پہنچ گئے۔ ٹھٹک کر رک گیا۔

''نمستے ہو مہاراج جی، آپ کا نام ہری رام ہے نا؟'' ہری رام نے چونک کر ان پجاریوں کو

دیکھا جن کے پاس پٹکیاں تھیں اور وہ مکمل سپیرے نظر آ رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ ان سپیرے کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا۔

"ہاں ہے، مگر کیا بات ہے؟"

"مہاراج! ہم اپنی زبان میں نہیں بولتے ناگوں کی زبان میں بولتے ہیں، یہ دیکھئے ناگ آپ کو کچھ دینا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر گنگا دھرن نے اپنی پٹکی سے ایک کوڑیالہ کالا سانپ نکال لیا اور ہری رام دہشت زدہ ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تم کیا چاہتے ہو، کیا تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو؟"

"نہیں مہاراج، ہم تو ناگوں کی اچھا پر آپ کے پاس آئے ہیں۔ آئیے! ذرا ہمارے ساتھ چلئے ہم آپ کو وہ دیں گے جو جیون میں کبھی آپ کو نہ ملا ہوگا۔ سونے چاندی کے انبار۔ ایک ایسا تعویذ جو آپ کو راجہ بنا دے۔ آئیے، ناگ یہی چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر گنگا دھرن نے کوڑیالہ کالا سانپ زمین پر چھوڑ دیا اور سانپ ہری رام کی طرف لپکا۔

"ارے پکڑو اسے۔ ارے یہ کہیں مجھے کاٹ نہ لے۔"

"ضرور کاٹ لے گا مہاراج، آپ ہمارے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔ آپ نے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر رکھنے کی کوشش کی تو یہ آپ کو جیتا نہیں چھوڑے گا۔"

ہری رام نے حیرت سے سانپ کو دیکھا۔ وہ کوئی ایک گز کے فاصلے پر ہری رام کے پیچھے پھن اٹھائے کھڑا تھا۔ بجرنگی کافی پیچھے تھا اور اس دلچسپ کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ گنگا دھرن اور گنگو تر آگے بڑھے تو سانپ نے ایک پھنکار ماری اور ہری رام نے آگے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

"ارے پکڑو، تمہیں بھگوان کا واسطہ اسے پکڑو، کہیں یہ مجھے کاٹ نہ لے۔"

"آپ ہمارے پیچھے پیچھے چلے آیئے مہاراج، یہ آپ کا بال تک بیکا نہیں کرے گا، پر جیسے ہی آپ نے اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی سمجھ لیجئے یہ آگے بڑھ کر آپ کی پنڈلی میں کاٹ لے گا۔"

ہری رام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان سپیروں کا پیچھا کرے۔ عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا، یہاں آنے کے بعد اس نے رادھیکا کے اغوا کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور اس کا کام ایک دو دن میں مکمل ہونے والا تھا مگر اس وقت یہ انوکھی اُلجھن پڑ گئی، نجانے اس کا کیا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ سب سے پریشانی کی بات یہ تھی کہ اسے ان سپیروں کا مقصد نہیں معلوم ہو سکا تھا، اگر وہ اسے لوٹنا چاہتے ہیں تو یہاں بھی جو کچھ اس کے پاس تھا اس سے چھین سکتے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد سپیرے اُسے لئے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے اپنا

ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گنگا دھرن نے کہا۔

"اگر جینا چاہتا ہے تو جیسا ہم کہہ رہے ہیں ویسے ہی کرنا، کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے موت واقع ہو جائے۔ یہ سانپ تیرا چوکیدار ہے اور تجھے ایک پل نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔"

"مگر مہاراج، مجھے اتنا تو بتا دو کہ آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ہری رام نے پریشانی سے کہا۔ تھوڑی دیر میں بجرنگی بھی ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہری رام اسے پہچان نہ سکا، اسے اس نئے آدمی کے آ جانے پر حیرت ہوئی تھی جو خود بھی سپیرا ہی لگ رہا تھا۔

کوڑیالہ سانپ بیچ میں کسی چوکیدار کی طرح تھوڑے فاصلے پر جا کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ بجرنگی ہری رام کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور ہری رام کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس چہرے سے کچھ جان پہچان سی ہو، وہ اسے غور سے دیکھتا رہا، تب بجرنگی نے کہا۔

"مجھے پہچانا ہری رام۔"

"ارے باپ رے... تُو بجرنگی ہے نا؟" ہری رام کے حلق سے حیرانی کے لہجے میں نکلا۔

"دیر سے پہچانا ہری رام اور پہچاننا بھی کیسے تُو، تم لوگ تو میرا کریا کرم کر چکے تھے، اب تم بتاؤ گے ہری رام کہ تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟"

"پر اس سے پہلے اتنا تو بتا دے کہ تُو جیتا کیسے ہے؟"

"تمہاری موت سے پہلے میرا مرنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا، تُو مجھے ساری باتیں بتائے گا ہری رام۔" بجرنگی نے کہا۔

"یہ چکر کیا چلایا ہے تُو نے بجرنگی، ان سپیروں سے تیرا سمبندھ کیسے ہو گیا؟"

"اتنا مجھ سے سوالات کر رہا ہے تُو، دیکھو گنگا دھرن اسے، یہ ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ گنگا دھرن نے اپنی پٹکی سے دو چھوٹے سانپ نکالے اور ان میں سے ایک ہری رام کی طرف اچھال دیا۔

ہری رام سانپ سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا اور گرتے گرتے بچا، اس کا پیر دوسرے والے سانپ نے ایک پھنکار ماری تھی، جس سے ہری رام اپنی اوقات میں آ گیا۔ دوسری گنگا دھرن نے وہ سانپ پھینکا تھا وہ ہری رام کے گلے سے لپٹ گیا اور ہری رام کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

گنگا دھرن بولا۔ "جب تک تیرے منہ سے آوازیں نکل سکتی ہیں چیختا رہ، پہلی بات تو یہ کہ یہاں دور دور تک کسی انسان کا کوئی پتہ نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ جب تیری چیخیں اس

دھنک پوری کی برداشت سے باہر ہو جائیں گی، یہ تجھے ڈس لے گا۔"

"ارے تمہیں بھگوان کا واسطا اسے میری گردن سے نکالو۔"

"ایک شرط پر ہری رام، اب تُو آرام سے بیٹھے گا اور بیکار باتیں کرنے کے بجائے صرف وہ باتیں کرے گا جو بجرنگی تجھ سے پوچھے گا۔ بھگوان کی سوگند اگر تُو نے اس سے الگ کیا تو پھر میں بھی ان دونوں ناگوں کو نہیں روک سکوں گا یہ تیرے شریر کو ڈس لیں گے اور تُو پانی ہو کر بہہ جائے گا۔

گنگا دھرن کے الفاظ اتنے خوفناک تھے کہ ہری رام کا بدن پسینہ پسینہ ہو گیا، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بجرنگی عجیب و غریب پُراسرار قوتیں حاصل کر چکا ہے۔ پہلی بات تو یہی اس کے لیے حیران کن تھی کہ بجرنگی کو کھلے سمندر میں پھینکا گیا تھا، جہاں کسی کے جیتا بچ جانے کا کوئی امکان نہیں تھا، پر وہ جیتا جاگتا اس کے سامنے موجود تھا، حلیہ بے شک بدل گیا تھا، پر دیسے کا ویسا ہی تھا، لیکن یہ پُراسرار بھید بے مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ ہری رام نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تو بجرنگی نے کہا۔

"پہلے مجھے یہ بتا ہری رام کہ مجھے بمبئی بلانے کی سازش کیا تھی؟"

ہری رام نے خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا، وہ سانپ ابھی تک اس کی گردن سے لپٹا ہوا تھا، اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "بھگوان کی سوگند! سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا، مجھے اس سانپ سے نجات دلاؤ۔"

اس سے پہلے کہ بجرنگی کچھ بولتا گنگوتری نے کہا۔ "تجھے جیون بھی مل سکتا ہے ہری رام اسی شکل میں جب تُو ہر بات سچائی سے بتا دے۔"

"بتا دوں گا مہاراج اوش بتا دوں گا۔" ہری رام نے کہا۔ گنگا دھرن نے منہ سے ایک آواز نکالی اور سانپ ہری رام کی گردن سے نکل کر گنگا دھرن کے کندھوں پر چڑھ گیا۔ دوسرے سانپ نے بھی اپنی جگہ سنبھال لی تھی۔

ہری رام کی قوتیں اب جواب دے گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ "جی مہاراج اخبار میں رادھیکا کی تصویر چھپی تھی، گربچن مہاراج نے دیکھ لی، پھر ان کے کہنے پر گوونداس اور میں بمبئی پہنچ گئے مطلب تمہیں مارنا تھا، گربچن سنگھ مہاراج نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے تمہیں سمندر میں پھینک دیا۔"

"ہوں پھر اس کے بعد کی بات بتاؤ، تم لوگوں نے ست رانی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"بھگوان کی سوگند کچھ نہیں کیا، وہ ہمیں ملی ہی نہیں۔"

"کیا ہیرو لین اور حسن شاہ کا خون تم نے نہیں کیا؟"

"ارے نہیں ہمیں اس بارے میں بالکل نہیں معلوم، ہم تو خود ست رانی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے وہ تو خود ہی مارے گئے اور ست رانی غائب ہو گئی، گربچن سنگھ مہاراج ... تھے، ان سے اپنے بھائی کی موت برداشت نہیں ہو پا رہی تھی، انہیں مندروں کی یاترا ... پھر رہے ہیں اور ہم اسی یاترا کے دوران ...." ہری رام خاموش ہوا۔

وہ لوگ اس کے آگے بولنے کا انتظار کر رہے تھے، جب ہری رام نے منہ سے کچھ نہ کہا تو ...ن بولا۔

"آگے نہیں بولو گے ہری رام؟"

"ہم... مہاراج بس اتنی ہی کہانی تھی۔"

اچانک ہی گنگا دھرن کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے دونوں سانپ نیچے اُترنے لگے تو ...ن نے مسکرا کر کہا۔ "ہم سے زیادہ یہ تمہارے جھوٹ کے بارے میں جانتے ہیں، پر اس ... معاف نہیں کریں گے۔ مجبوری ہے، جو کچھ تمہارے من میں ہے صاف صاف بول دو، ...بول دو، بچ جاؤ گے، ورنہ یہ تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہے بھگوان کس مصیبت میں ڈال دیا مجھے، ادھر یہ نہیں چھوڑیں گے ادھو گربچن مہاراج کو ...ل گیا تو وہ مجھے جیتا نہیں چھوڑیں گے۔"

"دیکھ لو ابھی مرنا چاہتے ہو یا تھوڑی دیر کے بعد۔"

"ان دنوں گربچن مہاراج متھرا میں ہیں، وہ متھرا کو گئے تھے لیکن وہاں ایک ایسا کام ہو گیا ...الگ تھا۔"

"کیا؟" بجرنگی نے پوچھا۔

"وہاں رادھیکا مل گئی۔" ہری رام نے کہا اور بجرنگی کے دماغ میں بم پھٹ گیا۔ اس کا پورا ...زرد ہو گیا تھا۔

گنگوتری اور گنگا دھرن اس کی کیفیت سے واقف تھے، گنگا دھرن نے کہا۔ "آگے بول، ...ی رام خاموش مت رہو۔"

"رادھیکا اس وقت رام کلی مندر میں ایک داسی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ گربچن سنگھ جی ... کے خون کے بدلے کی بھاؤنا میں پاگل ہو رہے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ رادھیکا کو ...خواہ کر کے سہارن پور لے جائیں گے اور اس کی بے عزتی کریں گے، اسے دروازے ...ں پٹہ ڈال کر باندھ دیں گے لیکن رادھیکا رام کلی مندر میں ایک عزت دار دیو کنیاؤں کی

حیثیت رکھتی ہے۔ اسے وہاں سے نکالنا آسان کام نہیں ہے کیونکہ دیوکنیاؤں کی بڑی حفاظت ہوتی ہے۔ میں یہاں دلی آیا تھا۔ ایسے لوگوں کو ساتھ لے جانے کے لئے جو رادھیکا کو اغوا کرنے میں ہماری مدد کر سکیں۔"

بجرنگی کا پورا جسم بدستور کانپ رہا تھا، کشوتری نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شانت ہو جاؤ بجرنگی۔ دیوتاؤں نے جب ہمیں رادھیکا کا پتہ دیا ہے تو اس سہاتا کرنے کی شکتی بھی دیں گے۔ شانت کرو اپنے آپ کو، بدھائی دیتے ہوں تمہیں کہ تمہاری بہن کا پتہ چل گیا، اب اسے متھرا جا کر حاصل کرنا مشکل کام نہیں ہوگا خود کو شانت کرو بجرنگی، خود کو شانت کرو۔

بجرنگی روتا ہوا کشوتری سے لپٹ گیا۔ "آخر کار میری بہن کا پتہ چل ہی گیا۔ بھگوان لوگوں کو جیون کی ہر خوشی دے، بھگوان تمہارے من کی آگ بھی ٹھنڈی کر دے، کشوتری مہاراج۔"

"ہاں ست رانی کہاں ہے، ہری رام ست رانی کہاں ہے؟" اس بار کشوتری نے براہ راست ہری رام سے سوال کیا تھا۔

بھگوان کی سوگند وہ ہمیں نہیں ملی، ہم نے خود اسے دلی میں تلاش کیا، وہ ہمیں نہیں ملی، ہمیں اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔" ہری رام نے جواب دیا اور خوفزدہ نگاہوں سے گنگا دھرن کے شانوں پر براجمان ناگوں کو دیکھنے لگا، ناگ پرسکون تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ ہری رام سچ بول رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، اب ہم تیرے ساتھ متھرا چلیں گے، تو مجھے کرشن سنگھ تک پہنچائے گا اور کرشن سنگھ سے بدلہ لوں گا، سمجھا۔" بجرنگی نے کہا۔

"اب تو میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے مہاراج، یہ بھی بتا دیا ہے کہ رادھیکا کالی مندر میں دیوداسی کی حیثیت سے موجود ہے۔ اب تو مجھے چھوڑ دیجئے۔"

"تم کیا تو دوڑا دوڑا متھرا جائے اور وہاں جا کر کرشن سنگھ کو سب کچھ بتا دے، دیکھ ہری رام، میں تیرے ساتھ متھرا چلوں گا، تیرا مجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن کرشن سنگھ کو میں اب نہیں چھوڑوں گا، انہی ناگوں سے اسے ڈسوا دوں گا۔" بجرنگی نے کہا۔

"مہاراج! مجھے جانے دو۔"

"کیوں نہ ہم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں؟" بجرنگی نے کہا۔

"نہیں بجرنگی! مجھے ان ناگوں پر پورا وشواس ہے، یہ اسے نہیں جانے نہیں دیں گے، ہری رام کو اسی طرح رہنے دو، وہ یہاں سے بھاگ نہیں سکے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

[illegible]لا۔

بجرنگی خاموش ہو گیا۔ رات گہری ہو گئی تھی، سپیروں نے کچھ کھایا پیا اور تھوڑا سا ہری رام کو۔ ہری رام بار بار خوفزدہ نگاہوں سے سانپوں کو دیکھ لیتا تھا پھر گنگا دھرن وہاں سے ہٹ گیا، [illegible] بھی ہٹ گئے تھے، صرف وہ ایک کوڑیالا سانپ کنڈلی مارے پیچھے ہوشیار بیٹھا ہوا تھا۔ یہ [illegible]ریب چوکیدار تھا۔

ہری رام کے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ وہ کافی خطرناک آدمی تھا۔ یہاں وہ کئی [illegible]ں کا اختتام کر چکا تھا اور دوسرے کچھ ایسے کام بھی جن کی مدد سے رادھیکا کو رام کلی مندر تک [illegible] رات اٹھا کر وہاں سے دور نکل جا سکتا تھا، لیکن یہ جو کچھ ہو گیا تھا وہ اس کے خواب و خیال [illegible] میں بھی نہیں تھا، پھر وہ لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کھلی جگہ، کھلا علاقہ تھا۔ چاروں طرف ویرانہ [illegible]ہوا تھا۔ دور دور تک کسی انسانی وجود کا پتہ نہیں تھا۔ صرف وہ ایک خطرناک کوڑیالا سانپ تھا [illegible] طرف سے ہری رام کو خوفزدہ کر دیا گیا تھا اور اب اتنی رات گئے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کالا [illegible] اسے نقصان پہنچا سکے گا۔

دوسری طرف اس کے ذہن میں بجرنگی کے خلاف ایک لاوا پک رہا تھا۔ اس بجرنگی کو ختم [illegible] ہی یہاں سے بھاگنا چاہئے طریقہ کیا ہو۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں، پھر اسے تھوڑے فاصلے پر پڑی ہوئی ایک بہت پرانی اینٹ نظر آ گئی جسے وہ ہاتھ بڑھا کر اٹھا سکتا تھا۔

اینٹ کو دیکھتے ہی اس کے ذہن میں منصوبے بننے لگے۔ یہ اینٹ اٹھا کر تاک کر کوڑیالے پر ماری جائے تو بجرنگی جاگ جائے گا اور وہ بھی جو بڑا سپیرا معلوم ہوتا ہے یعنی گنگا دھرن اور [illegible]کے پاس وہ نوکھے سانپ موجود تھے جو انسان سے سچائی اگلوا لیتے تھے۔ دونوں میں سے کون [illegible] کرے، یا تو یہ اینٹ اٹھا کر بجرنگی ہی کا بھیجا پاش پاش کر دے جو اس سے چند گز کے فاصلے پر [illegible]ے زمین پر لیٹا سو رہا تھا، یا سانپ کو مار کر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی جائے۔ آخر کار [illegible]ے فیصلہ کیا کہ بجرنگی کو ہلاک کر دے اور اس کے بعد یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے جو ہوگا [illegible]ائے گا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اینٹ اٹھائی اور پھر اسے مضبوطی سے اپنی گرفت میں [illegible] کیا اور پوری قوت سے بجرنگی کے سر پر مارنے کی کوشش کی لیکن اس کے خواب و خیال میں [illegible] تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔

اچانک ہی پیچھے بیٹھے ہوئے خوفناک سانپ نے فضا میں اڑ کر ہری رام کے ہاتھ کو [illegible] میں لے لیا اور پھر ہاتھ پر اپنے بدن کو لپیٹتے ہی اس نے ہری رام کی آنکھ کے نیچے [illegible] پھن مارا۔ ہری رام کے حلق سے دلخراش چیخ نکل گئی تھی۔ اینٹ اس کے ہاتھ سے گر

ی اور سونے والے تینوں افراد چونک گئے۔ ہری رام بُری طرح سانپ کو اپنے چہرے سے
الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سانپ نے زخم کے بعد اس کی گردن پر پھن مارا اور اس
کے بعد سینے پر۔

گنگوتری، گنگا دھرن اور بجرنگی کھڑے ہوگئے اور ہری رام کو زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھتے
رہے، پھر گنگوتری نے کہا۔

"ختم ہوگیا۔ یہ ختم ہوگیا۔"

بجرنگی یا گنگا دھرن نے گنگوتری کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ ساری صورتحال ان کے
سامنے تھی۔ بہت دیر کے بعد وہ سنبھلے، گنگا دھرن نے جھک کر ہری رام کو دیکھا پھر بولا۔ "اب کیا
کریں مہاراج؟"

"کرنا کیا ہے، اسے یہیں پڑا رہنے دو، ہمیں کس نے یہاں دیکھا ہے اور ہمیں کون جانتا
ہے۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

"اس کی جیبیں تلاش کرو..... " بجرنگی بولا۔

"ہمیں اس کی جیبوں سے کیا لینا ہے۔ چھوڑو۔ آخر ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔"

"اب کہاں جائیں گے؟"

"سیدھے متھرا...." گنگوتری بولا۔

"اور ست رانی ....؟" گنگا دھرن نے کہا۔

"کسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟ ہمارے بھاگوں میں ہوگا تو ہمیں مل جائے گی۔
دیوتاؤں نے بجرنگی کی بہن کا پتہ بتایا ہے۔ ہمیں دیوتاؤں پر وشواس رکھنا چاہئے۔ وہ میرے من کی
منوکامنا اوش پوری کریں گے۔ میری چندر لکھا کی بیٹی جسے بھگوان نے چندر لکھا ہی کا روپ دیا ہے
مجھے مل جائے۔ اس کے سوا جیون میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ چلتے ہیں۔ باقی وقت
ریلوے اسٹیشن پر گزاریں گے۔ جیسے ہی متھرا کی ریل آئے گی ہم چل پڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے مہاراج۔" گنگا دھرن نے کہا۔ اپنے سانپ کو اس نے ٹوکری میں بند کر لیا تھا
اور اس کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن چل پڑے۔

☆ ☆ ☆

ادھر متھرا میں کرشن سنگھ اور گووند داس [illegible] ہری رام کا انتظار کر رہے تھے۔ ہری رام کو
خاصا وقت لگ گیا تھا اور کرشن سنگھ تھا کہ غصے میں آ جاتا تھا اور گووند داس سے کہتا تھا۔

"یہ ہری رام بھی بس نکما ہو کر رہ گیا ہے۔ تم مجھے بتاؤ" [illegible]

ل لیتے اور اسے دھوکا دے کر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیتے تو یہ کون سی بڑی بات تھی؟"

"کام بہت مشکل ہے مہاراج! آپ کے حکم پر میں برابر رام کلی مندر کے دروازے پر
جاتا رہا ہوں، کوئی ایسی ترکیب نہیں ہے کہ کسی دیو کنیا سے اکیلے میں ملا جا سکے، بس پوجا کے
سمے کسی ایسے سمے جب دیو کنیائیں مورتیوں کے سامنے رقص کر رہی ہوتی ہیں، اسے دیکھا
جا سکتا ہے۔ دیو کنیاؤں کے معاملے میں یہ پجاری بڑے چوکس رہتے ہیں اور اس کی طرف نظر
اٹھانے والے کو کبھی نہیں چھوڑتے، مہاراج اتنا آسان کام نہیں ہے، آپ تھوڑا سا دھیرج
رکھیں ہری رام معمولی بندہ نہیں ہے، کوئی بڑا ہی کام کر کے آئے گا۔ پر ایک سوال میرے من میں
کھٹکتا ہے، اگر آپ کو برا نہ لگے تو پوچھ لوں۔"

"ہاں بول کیا سوال ہے؟"

"مہاراج میں نے جیون کا بڑا حصہ آپ کے ساتھ گزارا ہے۔ آپ شیروں کے شیر ہیں،
آپ نے اپنے من پر کوئی بوجھ نہیں رکھا، پر عجیب سی بات ہے آپ نے اپنے من کو اتنا گہرا
روگ لگا لیا ہے۔ اپنی انہی قوتوں سے کام لیجئے جنہوں نے آپ کو شیر بنا رکھا تھا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے گووند داس، بھگوان کی سوگند مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اور میرا
بھائی دونوں مل کر ایک بنتے تھے اور اب میرے شریر سے میرا بھائی نکل گیا ہے، میری آتما میرا
[illegible] اسے تلاش کرتا ہے۔ بہن بھائیوں کے رشتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں، پر اس
[illegible] بھائی کا دیوانہ کوئی نہیں ہوتا، میں خود بھی اپنے من کو سمجھاتا ہوں کہ اس کی جگہ میں بھی
ہوتا تھا۔"

"آپ کو جگن راج کو بھولنا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اب چارہ کار کیا ہے، رادھیکا بجرنگی کی
بہن ہے جسے وہ جیون بھر تلاش کرتا رہا ہے۔ اب اگر وہ آپ کے ہاتھ لگ بھی جائے تو فائدہ کیا،
بجرنگی تو اس سنسار میں نہیں کہ رادھیکا کو آپ کے شکنجے میں دیکھ کر اسے دکھ ہو۔"

"جس طرح میرا من اپنے بھائی کو تڑپ رہا ہے گووند داس میں چاہتا ہوں کہ بجرنگی کی آتما
بھی اپنی بہن کے لئے اسی طرح تڑپے، بھگوان کی سوگند میرے من میں کوئی اور بات نہیں ہے۔
بس رادھیکا کو اتنے برے حال میں رکھنا چاہتا ہوں کہ بجرنگی کی آتما چتا پر سلگتی رہے، وہ آتما
آنکھوں سے بہن کا حال دیکھے اور تڑپتا رہے، تو دیکھنا تو سہی رادھیکا کو اپنے ساتھ لے جا کر
اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں اور اگر ست رانی بھی مجھے مل جائے تو سمجھ لے دشمن یا یہ سمجھ
لے کہ میں بالکل پہلے جیسا ہی بن جاؤں گا۔ بھول جاؤں گا میں اپنے بھائی [illegible]
کو میں زندہ جلا دوں گا، تو دیکھنا میرے من میں جو کچھ ہے میں اسے کر کے ماروں گا، پر یہ بری

رام... بھگوان اس کا ناس کرے جا کر بیٹھ گیا ہے کوئی اتہ پتہ نہیں ہے، مجھے تو یہاں مندروں میں بھی سکون نہیں مل رہا۔"

اس دوران گریجن نے گووند داس کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ رام کلی مندر کے آس پاس ہی رہے تاکہ رادھیکا کہیں اور نہ چلی جائے۔ گووند داس رادھیکا کے سلسلے میں مکمل معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ رادھیکا برسوں سے اس مندر میں ہے اور یہاں کی بڑی دیولیا مانی جاتی ہے۔ وہ مندر میں رہنے والی دوسری دیویوں کی نگرانی بھی کرتی ہے اور انہیں مورتیوں کے سامنے رقص کی تربیت بھی دیتی ہے۔ ایک طرح سے وہ رام کلی مندر میں بڑے پجاری مہا نند کے بعد بڑی پجارن بھی جاتی تھی۔ یہ ساری معلومات گووند داس نے حاصل کی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی یہاں اس کی اچھی خاصی واقفیت ہو گئی تھی اور وہ متھرا کے آس پاس کے مندروں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر رہا تھا۔

پھر اسے کلیانی کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوئیں۔ کلیانی کے بارے میں یہاں طرح طرح کے خیالات تھے، کچھ لوگ اسے کالے علم کی ماہر سمجھتے تھے۔ مندروں میں اس کا داخلہ بند تھا۔ ہاں مندروں کے آس پاس وہ بھٹکتی نظر آ جاتی تھی۔ اس کے بارے میں یہی سنا گیا تھا کہ وہ چھپے سے کالے کام بھی کر دیا کرتی ہے، بہت سی باتیں معلوم کرنے کے بعد گووند داس نے ایک شام گریجن کو اس بارے میں بتایا۔

"مہاراج! یہاں ایک کالے جادو کی ماہر عورت بھی رہتی ہے جس سے بہت سے لوگ اپنا کام کراتے ہیں۔ کیا خیال ہے کیوں نہ ہم اس سے ملیں۔ آپ ست رانی کے بارے میں اس سے معلومات کریں، ہو سکتا ہے وہ آپ کے کام آ جائے۔"

"چل ملتے ہیں، کہیں تو من کو شانتی ملے۔"

گووند داس نے کلیانی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں تو اسے کلیانی کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ وہ گریجن سنگھ کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ فاصلہ خاصا طویل تھا لیکن وہ کسی مٹھ کے پاس پہنچ ہی گئے۔ ابھی وہ مٹھ کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ انہوں نے اس بدصورت چڑیل نما عورت کو مٹھ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، وہ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

گووند داس آگے بڑھا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جے مہا کالی۔"

کلیانی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"کون ہو تم، کیا میرے پاس آئے ہو؟"

"ہاں، تم کلیانی ہو؟"

"ہاں ہوں، کون نہیں جانتا مجھے۔"

"ہمیں تمہی سے کام ہے کلیانی دیوی۔"

"بیٹھ جاؤ، میرے پاس ان پتھروں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے جن پر میں اپنے مہمانوں کو بٹھاتی ہوں۔"

گریجن سنگھ اور گووند داس مٹھ کے سامنے پڑے ہوئے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ کلیانی ان کے سامنے زمین پر براجمان ہو گئی تھی۔

"ہاں بولو۔"

"ایک بات صاف صاف بتاؤ، کیا تم کالا جادو کرتی ہو؟"

"کالی کے داس، کالے منتروں کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہمیں ایک لڑکی کا پتہ چاہئے، ہمیں من کی شانتی چاہیے کلیانی دیوی۔"

"پتہ چل جائے گا، لیکن سنسار میں ایک بہت بڑی چیز نے اپنا اثر جما رکھا ہے اور وہ ہے دولت، جس کے پاس دولت ہے سمجھو ہر طرح کا جادو اس کے لئے ہے اور جس کے پاس دولت نہیں ہے اسے کچھ نہیں ملتا، تم من کی شانتی چاہتے ہو تو بتاؤ کتنا مال ہے تمہارے پاس۔"

"کلیانی! جتنا چاہیے تو خود بتا دے، لیکن کام ہونا چاہئے، کام نہ ہوا تو تجھے کچھ نہیں دے گا۔"

"ٹھیک ہے، پر یہ بتاؤ زبانی جمع خرچ کرو گے یا تھوڑی اور بنتی کرو گے۔"

"یہ گریجن مہاراج ہیں، مہاراج پور کے سب سے بڑے زمیندار، جاگیردار، دولت کی کوئی کمی نہیں ہے ان کے پاس۔"

"تب پھر تم سے ایک بات کہوں، اگر من کو شانتی مل جائے تو کالی دیوی کے نام پر ایک مندر بنوا دو، چاہے چھوٹا سا ہی سہی۔" کلیانی نے بہت بڑی بات کر ڈالی۔

گووند داس نے منہ کھول کر گریجن سنگھ کو دیکھا تو گریجن سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"مجھے اگر من کی شانتی مل جائے کلیانی تو میں کالی کا مندر بھی بنوا دوں گا۔ میرا وچن ہے تجھے۔"

"اور جب کوئی کالی کا وچن توڑتا ہے تو کال ہی کال ہوتا ہے اس کے لئے، یہ بات معلوم ہے۔"

"ہاں معلوم ہے، لیکن تجھے بھی اپنا کوئی چمتکار دکھانا ہوگا۔"

"گویا تم نے وچن دے دیا، کالی کا مندر بنوانے کیلئے۔"

"کہا نا تجھ سے، جہاں تو کہے گی وہاں تیرے لئے کالی کا مندر بنوا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" کلیانی نے کہا اور پھر اپنے گیان سے کام لینے لگی۔

کرپچن سنگھ اسے دیکھ رہا تھا، کچھ ہی لمحوں کے بعد کلیانی بری طرح چونک پڑی۔ اسے گیان سے اس نے جو کچھ معلوم کیا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس شخص کو ست رانی کی تلاش تھی، لیکن کلیانی کا گیان اتنا نہیں تھا کہ وہ یہ پتہ چلا سکتی کہ اسے ست رانی کی تلاش کیوں ہے؟ وہ پریشان سی ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سامنے رکھے اور بولی۔

''وہ آجائے گی، وہ بے شک آجائے گی، پر تجھے یہ بتانا پڑے گا کہ تُو ست رانی کو کیوں تلاش کرنا چاہتا ہے؟''

''کلیانی، ہر کام تیری مرضی سے نہیں ہوسکتا، پہلے تُو ست رانی کو بلا، یا مجھے بتا کہ وہ مجھے کب اور کہاں مل سکتی ہے، اس کے بعد میں تجھے اس کے بارے میں بتاؤں گا۔'' کرپچن سنگھ نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا اور کلیانی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگی۔

☆......☆......☆

کلیانی تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''ٹھیک ہے تم دونوں کل تین بجے کے بعد میرے پاس آجانا، میں تمہیں بتادوں گی کہ وہ لڑکی جسے تم تلاش کر رہے ہو کہاں مل سکتی ہے اگر میرے گیان نے صحیح کام کیا تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں اسے بلوا ہی لوں۔''

''کیا وہ مندر میں ہی موجود ہے؟'' گووندداس نے حیرانی سے سوال کیا۔

کلیانی اسے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''یا تو تُو پاگل ہے، یا پھر ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہے، جو بھاگ جی وچن دے چکا ہے اور میں نے بھی وچن دیا ہے، میں بھی اپنے وچن کا پالن کروں گی اور تُو بھی ایسا ہی کرنا، مگر مجھے یہ بتا کہ تُو اپنے وچن کا پالن کرے گا؟''

''تُو نے ایک مندر بنانے کی بات کی ہے، مجھے بھگوان نے بہت کچھ دیا ہے، میں نے کہا ہے اُسے پورا کروں گا تو چنتا مت کر، اب ہم چلتے ہیں کل تین بجے تیرے پاس آئیں گے۔''

کلیانی نے گردن جھٹکی اور واپس مٹھ میں چلی گئی۔ کرپچن اور گووندداس تھوڑی دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے بھی واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔

☆......☆......☆

ست رانی ذرا الگ مزاج کی لڑکی تھی۔ مزاج کے ماحول میں ضم ہوجانا اس کی فطرت کا حصہ تھا، لیکن آج کل وہ اُداس تھی، کرن وغیرہ بھی چلی گئی تھیں۔ ویسے تو سبھی اس کا خیال رکھتے تھے اور اس سے پیار بھی کرتے تھے۔ اس کی موہنی صورت اور ہر ایک کے ساتھ اس کا انداز سبھی کو پسند تھا اور سر تو اس مندر میں اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پوجا پاٹ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے من میں بھی کسی دیوی یا دیوتا کے لئے کوئی خاص احساس نہیں جاگا تھا۔

لے دے کے کلیانی رہ گئی تھی جو دنیا جہاں کی باتیں بتا رہی تھی۔ یوں تو بہت سے لوگ

ست رانی کو ہو چکے تھے لیکن کلیانی نے اسے سنسار کی جو صورت دکھائی تھی وہ بڑی انوکھی تھی۔ ست رانی کو پتہ چل گیا تھا کہ اس سنسار میں انسان، انسان پر اپنی بڑائی قائم کرنے کے لئے کیسی کیسی جگتیں کرتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ دولت اس سنسار کی رس ہے، سارے دیوی دیوتا اس کے سامنے نیچ ہیں، جس کے پاس دولت کے انبار وہی سب سے مہان۔ کلیانی کہتی تھی کہ اس سنسار میں دولت کا حصول ہی سب سے بڑا کام ہوتا ہے۔ ست رانی بھی اس انوکھی چیز کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ لے دے کر اگر اسے کسی کی یاد آتی تھی تو وہ بجرنگی تھا۔ ہوش کے پہلے دن سے بجرنگی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ اس کے سینے سے لگ کر اپنے آپ کو اس سنسار میں سب سے زیادہ محفوظ سمجھتی تھی۔ اس کے بعد پنکو، پھیرو تھے، کیزے، گوزے تھے، لوگ تھے جو ان کے بچپن کے ساتھی تھے لیکن اب ان سے ذرا کم ہی ملاقات ہوتی تھی۔ ہاں اس کی آواز پر یہ سب دوڑ پڑتے تھے اور اس کا تجربہ اس دن بندروں سے ہو گیا تھا جنہوں نے اس کے دشمنوں کو اس طرح دوڑایا تھا کہ جیون بھر وہ اس دن کو یاد رکھیں گے، جب بھی کبھی ست رانی اس کے بارے میں سوچتی اسے ہنسی آ جاتی تھی۔

اس وقت وہ کلیانی کی جانب جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کلیانی کے پاس پہنچ گئی۔ کلیانی نے اپنی مخصوص پر اسرار مسکراہٹ سے اس کا سواگت کیا۔

"دیوی ست رانی، جے مہا ست رانی۔ ست رانی کل کے دن یہ آوازیں نجانے کتنوں کی ہوں گی۔"

"تم عجیب باتیں کرتی ہو کلیانی، جب میں تمہاری باتوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔"

اور جب تو وہ بن جائے گی جو میں چاہتی ہوں تو پھر تیری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں ہوگا۔ شانتی بڑا اچھا کیا تو نے۔ میں تجھے ایک عجیب بات بتانا چاہتی ہوں۔" دونوں منہ کے سامنے بنے ہوئے پتھروں پر بیٹھ گئیں۔ ست رانی مسکراتی نگاہوں سے کلیانی کو دیکھ رہی تھی، جب بھی وہ کلیانی کے سامنے آتی اسے لطف آنے لگتا تھا، کلیانی نے کہا۔ "جیسا کہ میں نے تجھ سے کہا کہ مجھے دولت کی ضرورت ہے تاکہ میں کالی کا مندر بنا سکوں اور کالی کے مندر کی دیوی ہوگی ست رانی، مہا ست رانی جس کے سر پر کالی دیوی کا ہاتھ ہوگا۔ وہ جو کہے گی، وہ پورا ہو جائے گا اور سنسار بھر میں۔ صرف ہندوستان کی بات نہیں کر رہی، تو دیکھنا ہندوستان سے باہر بھی لوگ تیرے درشن کرنے آیا کریں گے۔"

"کیسا لگے گا مجھے؟" ست رانی نے مسکرا کر کہا۔

"تو دیکھنا تو سہی، اچھا چل چھوڑ ایک انوکھی بات بتاؤں تجھے۔ میرے پاس کل دو آدمی آئے تھے، انہوں نے مجھے بڑی دولت کی پیشکش کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں ایک لڑکی کی تلاش ہے، اگر اس لڑکی کا پتہ چل جائے تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے لئے وہ میرے جادو کا سہارا لینا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا میں ان کی منوکامنا پوری کر دوں گی۔ اپنے گیان سے کام لے کر اس لڑکی کا پتہ چلا لوں گی کہ وہ کہاں ہے۔ پر انہیں اس کے بدلے میں کالی دیوی کا مندر بنوانا ہوگا اور وہ آدمی تیار ہو گیا، وہ کوئی بہت ہی دولت مند آدمی ہے، وہ سہارن پور کا بہت بڑا جاگیردار ہے، کرپچن ہے اس کا نام؟"

کلیانی نے کہا اور ست رانی چونک پڑی۔

"کیا نام بتایا تم نے اس کا؟"

"کرپچن سنگھ۔"

"اور اس کی نگری کا کیا نام ہے؟"

"سہارن پور... کیوں؟"

"میں اسے جانتی ہوں۔" ست رانی نے کہا۔

"جانتی ہے؟" کلیانی بولی۔

"ہاں۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا، میں سمجھ گئی تھی کہ اس کا تجھ سے ضرور کوئی سمبندھ ہے۔ وہ جس لڑکی کو تلاش کرنا چاہتا تھا وہ تو ہے تو۔"

"ہیں۔" ست رانی حیرانی سے کلیانی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا یہ بتا کہ تو اسے کیسے جانتی ہے؟"

"بس جانتی ہوں یہ سوال مت کر مجھ سے، وہ میری تلاش میں ہے چل ٹھیک ہے میں اس سے مل لوں گی۔"

"ایک بات بتا، کیا وہ تجھ سے پریم کرتا ہے، کیا وہ تیرا پریمی ہے، ویسے تو بوڑھا ہے، پر اس سنسار میں عمر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ست رانی تو اتنی ہی سندر ہے کہ انسان تیرے لئے اپنی عمر بھول جائے۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں کلیانی، مجھے سنسار میں صرف ایک شخص سے پریم ہے اور وہ بجرنگی بابا۔ اس کے سوا مجھے کسی سے کوئی پریم نہیں ہے۔ کرپچن سنگھ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک کیوں آیا ہے، میں نہیں جانتی۔"

"وہ آنے والا ہے، اچھا ہوا تو آ گئی، ہم ایسا کریں گے کہ تو میرے مٹھ میں چلی جانا۔ میں اسے بیوقوف بنا کر اس سے رقم وصول کروں گی اور اس سے کہوں گی کہ ست رانی اسے اسی وقت نظر آ سکتی ہے اور میرا گیان اتنا ہی بڑا ہے کہ میں اسے جادو کے زور سے کھینچ بلایا۔ کیا کہتی ہے تو؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" ست رانی نے غیر متوقع جواب دیا اور کلیانی عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا تیرا من بدل رہا ہے ست رانی؟"

"صرف اتنی بات کرو مجھ سے کلیانی جتنی میں کہوں، مجبوری ہوتا۔ میرا من بدلا تو تم اسے روک تو نہیں سکو گی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ پجن میرے پاس کیوں آ رہا ہے، یہ جاننا بڑا ضروری ہے۔" ست رانی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"جا رہی ہو تم؟"

"نہیں، مجھے کچھ کام کرنا ہے۔" ست رانی بولی اور اٹھ کر مٹھ کے پچھلے حصے کی جانب چل پڑی۔

کلیانی کچھ دیر تو حیران حیران بیٹھی رہی، اس کے بعد وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

☆...☆...☆

بجرنگی متھرا پہنچ گیا، اس کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اگر کوئی اس سے اس کی کیفیت کے بارے میں معلوم کرتا تو وہ صحیح الفاظ میں جواب نہیں دے سکتا تھا۔ ایسا ہی دیوانہ ہو رہا تھا وہ بہن کی صورت دیکھنے کے لئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گنگوتری اور گنگا دھرن اس کے ساتھ بہترین تعاون کر رہے تھے۔ گنگوتری اپنے جگر گوشے کی تلاش میں نکلا تھا، لیکن اس نے بہت بڑا ہونے کا ثبوت دیا تھا، یہ معلوم ہونے کے بعد کہ رادھیکا متھرا میں موجود ہے، اس نے ست رانی کی تلاش کا ارادہ فوری طور پر ملتوی کر دیا تھا اور بڑے خلوص سے کہا تھا کہ بھگوان نے جب رادھیکا کا پتہ بتا دیا ہے جو برسوں سے بچھڑی ہوئی ہے تو اسے اپنی نواسی ست رانی کا پتہ بھی چل جائے گا، جس کے بارے میں بجرنگی نے کہا تھا کہ وہ چندر مکھی کی ہمشکل ہے بلکہ چندر مکھی کا دوسرا روپ تھی ہے۔ اس وقت گنگوتری کے دل میں ست رانی کو دیکھنے کا جوالا مکھی پھٹ رہا تھا۔

بہرحال متھرا کے اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ مندروں کی جانب چل پڑے۔ جمنا کنارے ایک جگہ استھان بنا کر گنگوتری نے بجرنگی سے کہا۔ "دیکھ بجرنگی تجھے ایک بات بتاؤں۔ جلد بازی سنسار کی سب سے بڑی بھول ہوتی ہے، بھگوان نے تجھے تیری بہن کا پتہ بتایا ہے تو وہی تیری رہنمائی بھی کرے گا، میں تجھ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فوراً رادھیکا کے سامنے مت آ جانا۔ ذرا سا دھیرج رکھنا، اتنے عرصے وہ تجھ سے بچھڑی ہوئی ہے۔ وہ تجھے مشکل سے پہچانے گی، ذرا احتیاط

ویسے بھی تیرا حلیہ بدلا ہوا ہے۔"

"میں جانتا ہوں مہاراج اچھی طرح جانتا ہوں، آپ چنتا نہ کریں، میں پورا پورا خیال رکھوں گا۔" بجرنگی نے جواب دیا۔

بہرحال پہلی رات بتائی گئی، جگہ جگہ بے شمار یاتریوں کے ڈیرے لگے ہوئے تھے۔ دوسرے دن رام گلی مندر کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں اور پھر اسی شام پوجا کرنے کے لیے رام گلی مندر چل پڑے اور مندر میں داخل ہو گئے۔

بہت سے یاتری اپنے اپنے طور پر پوجا پاٹھ کر رہے تھے، سے آنے پر مندر کے بوڑھے پجاری نے پوجا کرائی اور اس کے بعد چاروں طرف دیپ جل اٹھے۔ بڑے ہال میں ایک ایک کر کے چودیو کنیائیں داخل ہوئیں۔ بجرنگی کی ترستی ہوئی نگاہوں نے رادھیکا کو دیکھا اور بجرنگی کا جی چاہا کہ جا کر بہن کو گلے لگا لے۔ سارے ریت رواج توڑ دے، زیادہ سے زیادہ لوگ کیا کریں گے اسے ماریں گے، پر جب رادھیکا کو پتہ چلے گا کہ وہ اس کا بھائی ارجن سنگھ ہے تو وہ اس کے لیے ڈھال بن جائے گی اور چیخ چیخ کر لوگوں سے کہے گی کہ لوگو! یہ میرا بھائی ہے۔ بجرنگی کے من میں طوفان اٹھ رہے تھے اور اس کے اعصاب کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

اسی وقت پاس بیٹھے ہوئے گنگوتری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "نہیں بجرنگی، یہ اصول کے خلاف ہے۔ ہمارے تمہارے بیچ بات ہو چکی ہے اس وقت تمہیں ابھی اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہے، سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

بجرنگی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے گردن ہلائی اور محبت بھری نگاہوں سے رادھیکا کو دیکھنے لگا جو اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ اس کا بھائی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود ہے۔ شاید اس نے بھی اپنے بھائی کو زندگی کی آخری سانس تک تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسی کے لئے جی رہی تھی۔

پوجا ختم ہوئی دیو کنیائیں ایک ایک کر کے اپنی رہائش گاہوں میں چلی گئیں۔ گنگوتری نے بجرنگی کو اٹھایا اور اس کے بعد وہ اپنے ڈیرے پر واپس آ گئے۔ بجرنگی مسلسل روئے جا رہا تھا۔

"کتنی سندر لگ رہی ہے وہ۔ کتنی سندر لگ رہی ہے، میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی مندر میں ایک عزت دار لڑکی کی حیثیت سے جیون بتا رہی ہوگی تو نے وہ کام کیا ہے بھگوان جو کسی اچھے کرموں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا جیون میں، میں نے کبھی کوئی اچھا کرم کیا ہے، پر تو نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔"

"تمہیں رادھیکا سے ملنے سے روکنے کا ایک اور بھی کارن تھا، تم نے جذبات میں آ کر اس

بات پر غور نہیں کیا۔" کشوتری نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور بجرنگی سوالیہ نگاہوں سے کشوتری کو دیکھنے لگا۔

"میں جانتا ہوں برسوں کے بعد بہن کو جیتا جاگتا دیکھ کر تمہارے من میں جو آس بندھی ہوگی وہ سنساری بر سوچ کو بھسم کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بجرنگی میرا من جو کچھ ہے وہ عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ ہے۔"

"مانتا ہوں کشوتری مہاراج۔ اچھی طرح مانتا ہوں۔" بجرنگی نے گردن جھکا کر کہا۔

"تم بھول گئے برنی رام اس لئے دلی آیا تھا کہ کچھ لوگوں کا بندوبست کرکے متھرا پہنچے اور ایک دیوکنیا کو اغوا کرنے کا بندوبست کر کے آئے۔ اس کا مطلب ہے کہ کریچن بھی مندر کے کہیں آس پاس ہوگا اور تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہو۔ کیا تم جان لینے کی کوشش کرنے والے دشمن کو ایسے ہی چھوڑ دو گے۔ دوسری بات یہ کہ وہ ابھی رادھیکا کو لے جانے کے چکر میں ہے۔ تم کوئی اندھا قدم اٹھاؤ گے تو اس کے نقصانات بھی ہو سکتے ہیں۔ رادھیکا تو مندر میں محفوظ ہے اور تم دیکھ چکے ہو کہ آسانی سے اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ پجاری اتنے بے بس نہیں ہوتے کہ ان حسین دیوکنیاؤں کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ وہ ان کی بھرپور حفاظت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں رادھیکا کو کریچن سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن کریچن متھرا اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے تو تم ضرور اس کی نگاہوں میں آ جاؤ گے۔"

"جے ہو مہاراج کی۔ سچ ہے، میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔ آپ کی سوچ تجربے سے بھری ہوئی ہے۔"

"شش... یہ بجرنگی، ہمیں سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔ ہمارے روپ تو بدلے ہوئے ہیں۔ کریچن متھرا آسانی سے ہمیں نہیں پہچان سکے گا، لیکن ہم اسے مندر کے آس پاس ضرور تلاش کریں گے اور پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں اپنے دشمن کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔"

"جو حکم مہاراج۔" بجرنگی نے سر جھکا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کلیانی اس طرف پہنچ گئی جہاں ست رانی گئی تھی۔ کلیانی کو اب یہ بھرپور طریقے سے احساس ہو چکا تھا کہ جس لڑکی کو وہ صرف ایک سیدھی سادی لڑکی سمجھتی ہے، وہ لڑکی نہیں زیادہ پُراسرار ہے، اس کے پاس کون سی قوتیں ہیں، کلیانی جیسی کم عقل عورت کو کچھ نہیں پتہ چل سکا تھا۔

ست رانی ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے اردگرد پرندے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک عمر رسیدہ گدھ بھی ست رانی کے بالکل سامنے اس طرح گردن جھکائے ہوئے بیٹھا تھا جیسے پوجا

...ف۔ کلیانی یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ ست رانی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کسی گہری ...ی۔

...لمحوں کے بعد اس نے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے کسی کی بات کو سمجھ رہی ہو اور اس ...ار کر رہی ہو کہ وہ اس کی بات سمجھ گئی ہے۔ اس نے گردن اٹھائی تو گدھ نے بھی اپنی جھکی ...سیدھی کر لی اور پھر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

...لیانی عجیب سے احساس کا شکار ہو گئی۔ گدھ تھوڑا سا پیچھے ہٹا، اس کے بعد اس نے زخ ...وں نیچے زمین پر دبا کر فضا میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اڑتا ہوا نگاہوں ...یا تھا۔

...ر ست رانی نے ہنستے ہوئے دوسرے پرندوں کو بھی اڑایا اور تھوڑی دیر کے بعد سارے ...فضا میں پرواز کر گئے۔ تب ست رانی نے گردن جھٹکی اور پھر اس کی نگاہیں ایک دم کلیانی پر ...تھ کے پاس کھڑی تھی۔ ست رانی کی مترنم ہنسی ابھری اور کلیانی چونک پڑی۔ ست رانی کا ...ماز دیکھ کر کلیانی کی ہمت بڑھ گئی اور وہ آگے بڑھ گئی۔

"وہاں کیوں کھڑی تھیں کلیانی میرے پاس آ جاتیں؟"

"کیسے ہمت کرتی ست رانی، تمہیں دیکھ کر تو میرے ہوش و حواس ہی گم ہو گئے تھے۔ یہ ...ہارے پاس کیا کر رہے تھے؟"

"باتیں کر رہے تھے، یہی تو میرے دوست ہیں، یہی تو ہر جگہ میرا من بہلاتے ہیں۔ میرا ...ا پریم ہے، یہ مجھے ساری باتیں بتاتے ہیں اور انہوں نے مجھے کریچن کے بارے میں بھی ...تمہارے پاس میری تلاش میں آیا تھا۔"

"پرندے تمہیں یہ بات بتاتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"تو انہوں نے تمہیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ کریچن تمہیں کیوں تلاش کر رہا ہے، کیا وہ تم سے پریم ...ا ہے؟" کلیانی نے کہا۔

ست رانی پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ "ہاں ایسا پریم جو خاص ہی لوگ سنسار میں کسی سے ...یں۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا ہے۔"

"کیا؟" کلیانی چونک پڑی۔

"دشمن ہے وہ میرا اور اس کی کچھ وجہ ہے۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"نہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کلیانی جو کسی کو بتانے کے لئے نہیں ہوتیں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی، پر کیا تم مجھے اتنا بتا دو گی کہ تم اس کے سامنے پسند کرو گی یا نہیں۔"

"جیسے تم کہو گی ویسے کروں گی۔ اب تو تم میری گہری دوست ہو۔ اگر تمہیں میری وجہ سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو میں اس کے لئے تمہیں کبھی انکار نہیں کروں گی۔"

"بہت پیاری سکھی بن گئی ہو تم میری، پر اب یہ بتاؤ کریں کیا؟"

"وہ آج آئے گا؟"

"ہاں۔"

"تو پھر تم ایسا کرو اسے کل بلاؤ، ہم اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھے چھپ کر تو نہیں پڑے گا، کچھ بندوبست کر لیں گے ہم اس کا۔ بس جیسا کہ تم نے کہا ہے کہ تم اس گیان سے مجھے بلا لو گی اور میری ایک جھلک اسے دکھاؤ گی وہ تمہیں تمہاری ضرورت کی چیز دے گا یعنی وہ دولت جس کے لئے تم نے اس سے کہا ہے۔ ایسا کریں گے کل میں پر جو دیال سے کہہ دوں گی کہ میں رات کو سیر کے لئے نکلوں گی اور جمنا کنارے دور تک جاؤں گی۔ وہ مجھ سے بہت پریم کرنے لگے ہیں، بڑا دھیان رکھتے ہیں میرا۔ اس لئے میں ضروری سمجھتی ہوں انہیں بتا کر آؤں ورنہ میں آج ہی تم سے کہہ دیتی کہ انہیں بلا لو اور میرا سامنا کرا دو۔ پر ذرا کھیل کھیلتے ہیں کل رات جب آسمان پر چندرما نکلے گا تو میں مندر سے کچھ دور جا کر ایک جگہ جاؤں گی اور تم انہیں میری جھلک دکھا دینا میں وہاں سے غائب ہو جاؤں گی اور اگر وہ تم سے پوچھیں کہ اب میں انہیں کہاں ملوں گی تو تم بتا دینا کہ یہیں اسی جگہ تم میرا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دو گی۔"

کلیانی کسی سوچ میں ڈوب گئی، ست رانی کی باتوں کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی پھر بھی وہ ہنس پڑی۔ "یہ تو تم نے خوب سوچا ست رانی! چلو ایسا ہی کروں گی۔"

ست رانی نے گردن جھکا دی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی شرارت کھیل رہی تھی۔ بہرحال یہ شرارت کیا تھی اور دلچسپیاں اختیار کرنے والے تھے۔

☆.....☆.....☆

اور یہی ہوا، گربچن سنگھ رادھیکا کو تو پا ہی چکا تھا۔ اسے ہری رام کی آمد کا انتظار تھا اور اس کے بعد وہ رادھیکا کو لے کر وہاں سے سہارن پور چل پڑتا۔ بعد میں جو کچھ بھی ہوتا دیکھا جاتا لیکن اب اسے ست رانی کے ملنے کی آس بھی ہو گئی تھی، ہری رام پر وہ بہت زیادہ غصہ کر رہا تھا۔

"میں نے اس کو خود ہی ضرورت سے زیادہ دے دیا ہے۔ اب دلی جا کر بیٹھ گیا ہے کمینہ کہیں ناچ رنگ میں مست ہو گا، بدکردار آدمی ہے، نمک کے کھائے کا کون پاس کرتا ہے آج کل۔ اسے دیکھ لوں گا اس کو، چلو گووندا اس کمینی سے مل لیں۔ میں نے خاصی بڑی رقم لے لی اپنے ساتھ۔ رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اپنے ایک رشتہ دار کو بھیج کر مزید رقم منگوا لیتا ہوں۔" گربچن نے کہا، یہاں اس کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ آئے تھے جو گربچن نے الگ خیموں میں بسا دیئے تھے۔ آیا تو وہ یہاں یاترا کے لئے تھا، لیکن رادھیکا کو دیکھ کر ایک بار پھر اس کی سازشی فطرت اُبھر آئی تھی اور اب اسے ست رانی کو مل جانے کی بھی امید بندھ گئی تھی۔ وہ وعدے کے مطابق کلیانی کی جانب چل پڑا اور لمبے فاصلے طے کر کے آخرکار کلیانی کے مٹھ کے سامنے پہنچ گیا۔ کلیانی کو اس کا انتظار تھا، ایک آواز میں وہ باہر نکل آئی۔

"آؤ گربچن سنگھ مہاراج! پہلے یہ بتاؤ میری دچھنا لائے ہو؟"

"ہاں کلیانی، میرے پاس موجود ہے اور اب تم مجھے بتاؤ کہ تم اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوئیں یا نہیں۔"

کلیانی نے شعلہ بار نگاہوں سے گربچن کو دیکھا اور بولی۔

"کیا تم میرا اپمان کرنے آئے ہو گربچن سنگھ میں اس دولت پر لعنت بھیجتی ہوں جو اپمان کے نتیجے میں ملے۔"

"کیا پوچھا ہے تم نے مجھ سے، یہی نا کہ میں اپنے کام میں کامیاب ہوئی یا نہیں، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں کالی کی داسی اتنی کچی ہوں کہ کوئی کام پورا نہ کر سکوں۔"

"تمہاری مہربانی کلیانی، اگر میری باتوں سے تمہیں اپمان محسوس ہوا ہے تو میں تم سے شما چاہتا ہوں، اب تم مجھے یہ خوشخبری سنا دو کہاں ہے ست رانی؟"

"کل، کل رات وہ تم سے میرے پاس پہنچنا جب چندرما نکلنے والا ہو۔ میں تمہیں ست رانی کی ایک جھلک دکھا دوں گی۔ پہچان لینا کہ وہی ہے یا نہیں اور یہ کتنی رقم لائے ہو تم مندر بنانے کیلئے کیا کچھ چاہتے ہو کہ تمہیں اس کا اندازہ ہے؟"

دیکھو کلیانی جب میں نے کالی کے نام کا مندر بنوانے کا وعدہ کر لیا ہے تو سمجھ لو کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وچن پورا نہ کرنے پر مجھے مہا کالی کا کرودھ بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے تم اس بات کی چنتا نہ کرو، یہ بہت بڑی رقم ہے اور دو چار دن کے بعد میرا آدمی اور رقم لے کر آئے گا وہ میں تمہیں دے جاؤں گا، تم بالکل چنتا مت کرو، اگر میں اپنے گھر واپس پہنچ گیا تب بھی اپنے آدمی بھیج کر یہاں کالی دیوی کے مندر کی تکمیل کراؤں گا اور اس کے لئے میں کالی دیوی کی ہی قسم کھا کر کہتا ہوں

کہ میں کوئی دھوکے بازی نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر کل آ جاؤ۔ تم ست رانی کی ایک جھلک دیکھ لو گے، بعد کی باتیں بعد میں کریں گے۔" کلیانی نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔

گرپچن اور گووند داس کچھ دیر وہاں خاموش کھڑے رہے تھے۔ پھر گرپچن نے گووند داس سے واپسی کے لئے کہا اور دونوں وہاں سے چل پڑے۔

"مہاراج! میں تو بڑی عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔" گووند داس نے کہا اور گرپچن چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا؟"

مہاراج کتنے کمزور ہو گئے ہیں اس کا آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، جو بھگوان کی مرضی ہوگی وہی ہوگا، ہم اس میں کوئی ترمیم تو نہیں کر سکتے۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے گووند داس؟"

"مہاراج کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیا آپ کو اس عورت پر بھروسہ ہے؟"

"یار مجھے یہ بتا کس پر بھروسا کروں اور کس پر نہ کروں۔ ہے کوئی ایسی ترکیب جو کسی پر بھروسہ کروں۔" گرپچن نے مایوس لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے مہاراج! یہ عورت جو کچھ کہہ رہی ہے کر کے دکھا دے گی، یہ خود بھی تو کالی کی پجارن ہے، اگر کالی کے نام پر ہمیں دھوکہ دے گی تو اسے خود بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"ہاں ایک بات بتایئے مہاراج۔ اگر ست رانی کا پتہ چل جائے تو آپ کیا کریں گے؟"

"اس کا پیچھا کروں گا، یہ معلوم کروں گا کہ وہ یہاں ٹھہر اسے کہاں رہتی ہے اور جب وہ کمینہ ہری رام آدمیوں کو لے کر آ جائے تو دونوں کام ایک ساتھ ہی کر لئے جائیں گے۔ ست رانی کو میں یہیں ختم کر کے اپنے من کی پیاس بجھاؤں گا یا پھر اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"یہ خطرہ بھی مول نہ لیں مہاراج۔ آپ کو پتہ ہے کہ وہ ایک زہریلی ناگن ہے۔ جس کی نس نس میں زہر بھرا ہوا ہے اسے یہیں ختم کر دیں تو اچھا ہوگا۔"

"نظر تو آ جانے میں اسی سے فیصلہ کروں گا کہ آگے مجھے کیا کرنا ہے۔" گرپچن سنگھ نے کہا اور گووند داس گردن ہلانے لگا۔

☆.....☆.....☆

گنگوتری کا کہنا بالکل سچ نکلا۔ اس شام بھی وہ رام کلی مندر کے سامنے ہی موجود تھے۔ ... بھی دیوکنیاؤں کا رقص ہوا تھا اور رادھیکا بھی اپنی اسی سج دھج میں نظر آئی تھی۔ ایک خا...

مسکراہٹ رادھیکا کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، لیکن یہ بات بجرنگی ہی محسوس کر سکتا تھا کہ رادھیکا خوش نہیں ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی ایک کرب نمایاں تھا۔ بہر حال رادھیکا کو دیکھ کر بجرنگی کی آنکھوں میں سکون اترنے لگا تھا۔ گنگوتری کے کہنے کے مطابق وہ صبر کئے ہوئے تھا، ورنہ دل تو یہی چاہتا تھا کہ دوڑ کر رادھیکا سے لپٹ جائے، لیکن حالات کا علم ہونے کے بعد گنگوتری نے صبر کی ہدایت کی تھی اور صبر کا بالآخر نتیجہ نکل ہی آیا۔

بجرنگی نے گرپچن اور گووند داس کو پہچانا تھا، پوجا کے بعد دونوں باہر نکلے تھے۔ مندر کے احاطے کے باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا، لیکن احاطے میں ہی بجرنگی نے گرپچن سنگھ کو دیکھ لیا تھا اور ساتھ ہی گووند داس کو بھی۔ پاس کھڑے ہوئے گنگا دھرن کا شانہ دبا کر اس نے کہا۔

"گنگا! وہ گرپچن سنگھ ہے۔"

گنگا دھرن جو اس سارے معاملات میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا، ایک دم چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔

"کون سا؟"

"وہ جو دھوتی کرتے میں ہے اور اس نے گلے میں چمکدار ہار ڈال رکھا ہے۔"

"دیکھ لیا میں نے اور اس کے ساتھ یقیناً گووند داس ہوگا، جس کا ذکر ہری رام نے کیا ہے۔"

گنگوتری بھی ان دونوں کو گھسر پھسر کرتے دیکھ کر ان کی جانب متوجہ ہو گیا اور ٹھٹک کر بولا۔

"کیا بات ہے؟"

"مہاراج وہ۔ وہ گرپچن اور اس کا ساتھی گووند داس۔"

"ہوں۔ وہ سفید دھوتی کرتے والا۔"

"ہاں۔"

"ٹھیک کہا تھا نا میں نے کہ وہ تمہیں رام کلی کے آس پاس ہی ملے گا۔"

"جی مہاراج۔"

"ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ بے شک تمہارا حلیہ بدلا ہوا ہے، لیکن مجھے وہ چہرے سے چالاک معلوم ہوتا ہے، تمہیں پہچان لے گا۔"

"اب ہم کیا کریں مہاراج؟"

"اس کا پیچھا کرو۔ اس نے یقیناً کچھ منصوبے بھی بنائے ہوں گے۔ اس کے ساتھیوں میں کون ہے، ہر چیز کا بھرپور طریقے سے جائزہ لو۔"

"ٹھیک ہے مہاراج۔" بجرنگی نے کہا اور وہ گرپچن سنگھ کی تاک میں لگ گئے۔

آنے والی ایک بے نام سی عورت انسانی شکل و صورت اختیار کر گئی ہو۔ اچانک ہی گر بچن اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کلیانی میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، بھگوان کی سوگند میں اتنی دولت دوں گا کہ تیرے سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔ ایک مندر کیا تو اس دولت سے چھ مندر بنوا لے، اسے میرے حوالے کر دے، اسے میرے حوالے کر دے کلیانی۔''

گر بچن میں وعدوں پر نہیں جیتی، جب تُو اتنی دولت مجھے دے دے گا تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر تیرے ہاتھ میں دے دوں گی۔''

''میں تجھے وچن دیتا ہوں کہ ....'' گر بچن اپنی جگہ سے اٹھ کر ست رانی کی جانب لپکا اچانک ہی کلیانی آگے بڑھی۔ اس نے اپنی مٹھی میں پکڑی ہوئی کوئی چیز زمین پر دے ماری، ایک تڑاخا ہوا اور فضا میں دھوئیں کا گہرا سفید بادل چھا گیا۔ یہ بادل گر بچن اور ست رانی کے درمیان حائل ہوا تھا، گنگوتری، بجرنگی اور گنگا دھرن بھی چونک کر سنبھل گئے تھے۔

ادھر گر بچن اس تڑاخے کے خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا، کلیانی تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی غضب ناک نگاہوں سے گر بچن کو دیکھ رہی تھی، آہستہ آہستہ دھوئیں کا بادل چھٹا تو وہاں اس جگہ جہاں ست رانی بیٹھی ہوئی تھی، کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''گووند، دیکھ اسے کدھر گئی وہ؟'' گر بچن سنگھ دھاڑا اور گووند داس ادھر اُدھر گردن گھمانے لگا۔ اس کی ہمت آگے بڑھنے کی نہیں ہوئی تھی۔

تبھی کلیانی کی غضب ناک آواز ابھری۔

''یہ میرا اچھت منڈل ہے گر بچن، کوئی ایسا کام مت کرنا کہ جیون بھر کو پچھتاوا رہے۔ تیرے پورے بدن کو مٹی کا ڈھیر بھی بنا سکتی ہوں، ایسا کر سکتی ہوں کہ تُو اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے، کیا سمجھتا ہے تُو، میں نے جو کچھ کیا ہے وہ کافی نہیں تھا تیرے لئے؟ تیرا سپنا پورا کر دیا ہے میں نے اور وچن بھی دیا ہے کہ اگر تُو میرا سپنا پورا کرے گا تو میں بھی تیرا سپنا پورا کر دوں گی، کیا سمجھا۔''

''میں تیری ہر خوشی پوری کر دوں گا کلیانی، تُو جس طرح چاہے مجھ پر وشواس کرنے کا وقت دے دے مجھے۔ میں تیرے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دوں گا۔ بہت کچھ ہے میرے پاس وہ لڑکی مجھے دے دے اسے میرے حوالے کر دے۔''

''کہا نا ہو جائے گی وہ تیرے حوالے، دے دوں گی میں تجھے۔ پر اس سے پہلے نہیں جب تک تُو اپنا کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کر دے۔''

''ارے بیوقوف! مندر ایک رات میں تو نہیں بن جاتے، سے چاہئے ہوتا ہے ان کے لئے۔ میں تجھے تیری منہ مانگی دولت دے دوں گا، وعدہ کیا ہے میں نے تجھ سے۔''

''تو میں نے بھی تجھ سے وعدہ کیا ہے گر بچن کہ جب تُو وہ دولت میرے حوالے کر دے گا اور میں مندر کے لئے جگہ لے لوں گی تو ست رانی تجھے مل جائے گی، جا اب یہاں سے چلا جا ورنہ میرا غصہ تیز ہوتا جا رہا ہے۔''

''تُو اچھا نہیں کر رہی کلیانی۔''

''دیکھ، میں تجھے بتائے دیتا ہوں اگر میں نے اپنے بیروں کو آواز دے لی تو پھر میں خود بھی تجھے بچا نہیں سکوں گی ان سے۔''

جو منظر گر بچن نے دیکھا تھا اور ست رانی جس طرح غائب ہوئی تھی اس سے اس نے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ کالے جادو کی ماہر یہ عورت جو ست رانی کو اس طرح یہاں بلا سکتی ہے اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔

ادھر گووند داس جو گر بچن سنگھ کا مشیر خاص تھا، گر بچن سنگھ کا شانہ دبا کر بولا۔

''اچھا نہیں ہوگا مہاراج، یہ سب کچھ اچھا نہیں ہوگا، ایسا نہ کریں، اعتبار کریں اس پر جو عورت ست رانی کو اس طرح بلا سکتی ہے وہ......''

''تُو ٹھیک کہہ رہا ہے گووند داس، لیکن کہیں یہ اس کا کوئی جادوئی چمتکار نہ ہو۔''

''جو کچھ بھی ہے مہاراج ہمیں اس پر بھروسہ تو کرنا ہی ہوگا۔''

گر بچن سنگھ آہستہ آہستہ اعتدال پر آتا چلا گیا، اس نے کہا۔

''کلیانی! صرف دو دن کا سمے دے دے، میں کل سے تیرے لئے کالی کے مندر کا بندوبست کرنا شروع کرتا ہوں، کہاں بنوائے گی کالی کا مندر؟''

''یہیں اسی جگہ۔ جہاں میرا استھان ہے، یہ میرا بہت بڑا سپنا ہے، اگر تُو نے اسے پورا کر دیا تو میں تیرے سارے سپنے پورے کر دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، بس دو دن کا سمے، تیسرے دن تجھے سب کچھ مل جائے گا۔''

''اور تجھے ست رانی۔'' کلیانی نے کہا، پھر کو وہ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہوئے تھی جو فی تھی اور رومال میں بندھی ہوئی تھی۔

گر بچن سنگھ نے گووند داس سے کہا۔

''چلیں گووند داس؟''

''اوش مہاراج اوش۔'' گووند داس بولا اور وہ دونوں وہاں سے واپس چل پڑے۔

ادھر گنگوتری کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھارا بہہ رہی تھی، وہ چونکہ یہاں سے زیادہ

قریب تھا اس لئے بجرنگی نے عقل سے کام لیا اور مٹھوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے وہ اس مٹھ سے تھوڑی دور نکل آئے۔ یہ تو وہ دیکھ ہی چکے تھے کہ ست رانی اپنی جگہ سے غائب ہو چکی ہے۔ کھیانی کے بارے میں بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کالے علم کی ماہر عورت ہے جس جگہ یہ لوگ کھڑے تھے وہاں سے گربچن اور گووند داس دور جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

گربچن کو دیکھ کر بجرنگی کے دل میں نفرت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ اس شخص نے بڑی بے دردی سے اسے سمندر میں پھینک دیا تھا، اس شخص سے انتقام لینے کا تصور بجرنگی کے ذہن میں تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''سردار کنگوتری! میں آپ کو اس کے بارے میں بتا چکا ہوں، یہ وہی گربچن ہے جس نے مجھے بے دردی سے سمندر میں پھینک دیا تھا، وہ تو جیون باقی تھا کہ میں ساحل پر جا لگا۔ میرے من میں بدلے کی آگ سلگ رہی ہے اور پھر آپ نے یہ بھی سن لیا کہ وہ... ست رانی کو حاصل کرنے کے لئے کالے جادو کا سہارا لے رہا ہے۔ اگر آپ آ گیا دیں تو اس کا کریا کرم میں راستے میں کر دوں۔''

کنگوتری نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم سے بس ایک بات کہوں گا بجرنگی۔ ہمیں گربچن سنگھ کا ٹھکانہ معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ست رانی کو حاصل کرنے کے لئے اس عورت کے پاس آتا ہے اور اسے بھاری رقمیں دے رہا ہے، وہ ہماری نگاہوں سے دور نہیں ہے تم بدلے کی بھاؤنا پوری کر سکتے ہو۔ پر اگر تھوڑا صبر کرو تو کوئی حرج نہیں ہے میں اس وقت بالکل نڈھال ہو رہا ہوں۔ میں نے برسوں کے بعد اپنی چندر مکھی کو دیکھا ہے، تم یقین نہیں کر سکتے کہ میرے دل میں کیا کیا اُبھر رہا ہے۔ آ دیکھی عجیب بات ہے، میری چندر مکھی دوبارہ جی اٹھی ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے روپ میں جنم لے لیا ہے، میرے من میں کیا کیا ہے بجرنگی۔ بھگوان کے لئے اس سے میری مدد کرو، میں تمہارا یہ احسان جیون بھر نہیں بھولوں گا، میں تمہیں ہتھ جوڑتا ہوں۔''

بجرنگی کو کنگوتری کی کیفیت کا پورا احساس ہو گیا تھا، اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''آیئے مہاراج ادھر بیٹھتے ہیں۔''

اس کا اشارہ مٹھ سے کافی فاصلے پر ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں کسی قدیم مندر کے کھنڈرات بکھرے ہوئے تھے۔ یہ تینوں اس طرف چل پڑے۔ اور کھنڈر کے ایک گوشے میں ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ایک ڈھیر پر جا بیٹھے۔

کنگوتری نے کہا۔

''ہے بھگوان! میں تو سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کبھی اس طرح میری چندر مکھی کے درشن ہو سکتے ہیں، ست رانی ہے اس کا نام، پر میں تو اسے چندر مکھی کہہ کر پکاروں گا۔ ایک بات بجرنگی، تمہارے خیال میں یہ عورت کون ہو سکتی ہے، کیا اس نے ست رانی کی جو جھلک دکھائی وہ اپنے گیان سے دکھائی ہے یا پھر سچ مچ ست رانی کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے؟''

بجرنگی کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''نہیں مہاراج! ست رانی یقیناً اس کے پاس موجود ہے۔''

''ہم اسے تلاش کریں، چلیں اس عورت کے پاس۔''

''ویسے تو مہاراج کی سمجھ ہم سب سے زیادہ ہے، پر میرا خیال ہے اس کے لئے اگر دن کا انتظار کر لیا جائے تو اچھا ہے۔''

''بیسے بھنور میں پڑ گئے ہم لوگ، ایک طرف تمہیں تمہاری رادھیکا مل گئی ہے تو دوسری طرف مجھے میری ست رانی۔ کیسا اچھا لگے گا مجھے اس کے پاس جا کر اور وہ پہچان نہیں سکے گی مجھے، تا سونیکار ہے کہ نہیں؟ تم کیا کہتے ہو بجرنگی؟''

''صرف ایک بات کنگوتری مہاراج، بجرنگی اس سے جو کچھ بھی کہے گا وہ آنکھیں بند کر کے مان لے گی۔ آپ اس بات پر وشواس کریں جتنا مجھے رادھیکا کے مل جانے سے خوشی ہے اتنی ست رانی کے یہاں موجود ہونے سے۔ یوں لگتا ہے جیسے بھگوان نے ہمارے سارے کشٹ دور کیے ہیں۔ ایک طرف رادھیکا کا سر میرے سینے سے لگا ہو گا تو دوسری طرف ست رانی آپ کے سینے سے لگی ہوگی۔ ہم دونوں کو بھگوان نے خوشیوں سے بھر دیا ہے۔'' بجرنگی کی آواز لرز رہی تھی کنگوتری بھی اس کے جذبات کو محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی تھی۔ رات آہستہ آہستہ آگے کا سفر کر رہی تھی۔ ایک طرف کنگوتری جذبات میں ڈوبا ہوا تھا تو دوسری طرف بجرنگی بھی ایسی ہی کیفیات کا شکار تھا بلکہ اسے دہری خوشی تھی۔ رادھیکا کی تلاش میں اس نے ایک عمر بتا دی تھی، شیش ناگ تو نہیں جاگے تھے لیکن رادھیکا مل گئی تھی۔

وہ بے حد خوش تھا کہ آخرکار اس کی بہن اس کے پاس آنے والی ہے۔ رادھیکا اگر خود یہ بات کہہ دے کہ اس کا کھویا ہوا بھائی مل گیا ہے تو پھر مندر والے بھی اسے نہیں روکیں گے۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھے کہ اچانک انہوں نے دور سے ایک سائے کو آتے ہوئے دیکھا۔ یہ سایہ مندروں کی جانب سے ہی آ رہا تھا اور ستاروں کی مدھم روشنی میں انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہے۔ کیا ست رانی ہے۔۔۔ بجرنگی اور کنگوتری کے دل میں یہی ایک خیال ابھرا اور کچھ ہی لمحوں کے بعد بجرنگی نے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی۔

"ست رانی آ رہی ہے مہاراج وہ ست رانی ہی ہے، میں اس کے چلنے کے انداز کو پہچانتا ہوں۔"

کنگوتری کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا کریں اب ہم کیا کریں، آؤ اُسے روکتے ہیں۔"

"نہیں مہاراج! اگر آپ آگیا دیں تو میں کچھ بولوں۔" گنگا دھرن اپنی سوچ کے مطابق بولا۔

"ہاں کہو۔"

"میرا خیال ہے ہم خاموشی سے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ دیکھیں تو سہی کہاں جاتی ہے۔"

"مگر کیوں؟" کنگوتری نے سوال کیا۔

"اس طرح اچانک ہم اس سے ملیں گے مہاراج تو اس پر نجانے کیا اثر ہو۔ تھوڑا سا انتظار اور کر لیجئے۔"

"گنگا دھرن ٹھیک کہہ رہا ہے مہاراج! ہم خاموشی سے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔" بجرنگی

نے گنگا دھرن کی بات کی تائید کی۔

ست رانی ان سے کافی فاصلے سے گزر رہی تھی، کیونکہ کھنڈر اس راستے سے ہٹ کر تھا جو کنارے بنے ہوئے مندروں کی طرف جاتا تھا، جب وہ آگے نکل گئی تو وہ لوگ احتیاط سے اس کا پیچھا کرنے لگے اور پھر انہوں نے اُسے سرنواس مندر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔

مندر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پجاری آرام کرنے لیٹ گئے تھے۔ ست رانی جب داخل ہو گئی تو کنگوتری، گنگا دھرن اور بجرنگی مندر سے کچھ فاصلے پر ہی رک گئے۔

"ایک بات کہوں بجرنگی؟" کنگوتری بولا۔

"جی مہاراج کہیے۔"

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، ہو سکتا ہے رات کے کسی سمے وہ یہاں سے نکل کر کہیں اور چلی جائے، اب میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔"

بجرنگی نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔ "کھونا تو میں بھی نہیں چاہتا مہاراج، پر آپ کی مرضی۔"

"نہیں تم دونوں جاؤ آرام کرو۔ میں صبح کو تمہارا انتظار کروں گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں مہاراج میں نے اسے اس سمے سے پالا ہے جب اس کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر میں اپنی بہن کو اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہوں تو ست رانی بھی اس کی مالک ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ یہیں رہوں گا۔"

پھر ان لوگوں نے مندر سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں تو جگہ جگہ یاتری ایسے ہی پڑے ہوئے تھے۔ کچھ نے خیمے لگائے ہوئے تھے۔ کچھ کھلے آسمان کے نیچے پڑے تھے۔ انہوں نے بھی سرنواس مندر سے تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال لیا تھا اور نیند کسی کی آنکھوں میں آ گئی۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے جب پجاریوں نے پوجا شروع کی، یاتری بھی اٹھ کر مندر میں پوجا کے لئے جانے لگے تو کنگوتری نے کہا۔ "میں بھی پوجا کو جاؤں۔ ذرا معلوم تو کریں ہم کہ ست رانی یہاں کہاں رہتی ہے۔"

"آپ اور گنگا دھرن چلے جائیے مہاراج، وہ میری بو سونگھ کر مجھے تلاش کر لیتی ہے، بس پتہ چل جائے کہ وہ اس مندر میں رہتی ہے یا نہیں۔"

گنگا دھرن اور کنگوتری نے آخرکار یہ پتہ لگا لیا کہ ست رانی اسی مندر کی داسی ہے اور یہیں مہاراج کے چرنوں میں رہتی ہے۔ اس طرح انہیں اطمینان ہو گیا تھا۔

☆ … ☆ … ☆

ست رانی کو اس طرح کے کھیلوں میں مزہ آتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کسی بھی شخص سے اس کے دل میں خوف کا کوئی تاثر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ گربچن اس کی تلاش میں تھا اور کلیانی گربچن کو اس کے حوالے سے بیوقوف بنا رہی تھی۔ ست رانی سب کچھ سمجھ رہی تھی لیکن اسے بڑی اس بات کا لطف آ رہا تھا کہ گربچن بیوقوف بن رہا ہے وہ کیا چاہتا ہے اور اسے کیا کرنا چاہئے، اس بارے میں اس نے نہیں سوچا تھا۔ اس وقت بھی کلیانی کے منصوبے کے مطابق وہ چاند تھے، وہ گربچن کے سامنے آئی تھی اور پھر وہاں سے اس خالی مٹھ میں چلی گئی تھی جس کا انتخاب کلیانی نے پہلے ہی کر لیا تھا۔

حویلی کی دیوار کے پیچھے گربچن اور گووندا اس کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ست رانی وہاں سے اٹھ کر کہاں گئی ہے اور یہ گویا کلیانی کے جادو کی تصدیق تھی۔ جب تمام امور سے فارغ ہو کے بعد گربچن اور گووندا اس کلیانی کو تیسرے دن بڑی رقم دینے کا وعدہ کر کے چلے گئے اور کلیانی دیکھ لیا کہ وہ دور نکل گئے ہیں تو اس نے ست رانی کو آواز دے دی۔

"آ جاؤ رانی وہ لوٹ چلے گئے۔"

ست رانی خود مٹھ سے باہر نکل آئی تھی۔ کلیانی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی مشکل تو نہیں پیش آئی تمہیں؟"

"لو... سارے کام تو تم خود کر رہی ہو کلیانی۔ مجھے بھلا کیا مشکل پیش آتی؟"

"میں تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں تم اس سے ہمت (متفق) ہو یا نہیں"

"جب میں نے تمہارے ساتھ دوستی کر لی ہے تو سمجھ ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے"

"آخر یہ گربچن چاہتا کیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔"

"کلیانی، مجھے یقین ہے کہ جب میں اس کے قریب جاؤں گی تو وہ مجھے لے جانے کی کوشش کرے گا۔"

"جبکہ تم یہ بھی کہہ چکی ہو کہ وہ تمہیں ایک لڑکی کی حیثیت سے پسند کرتا ہے اور نہ ہی ایسی بات تمہارے سامنے ہے جس کی وجہ سے گربچن تمہیں لے جانا چاہتا ہے۔"

"بتا تو چکی ہوں تمہیں کہ وہ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لئے در بدر پھر رہا ہے"

"ارے ہاں تم نے بتایا تھا، خیر چھوڑو اب یہ بتاؤ کرنا کیا ہے، کیا تم اس سے ڈر رہی ہو"

ست رانی کسی سوچ میں ڈوب گئی، پھر اس نے کہا۔ "ایک بار اس سنسار سے مجھے لوگ

مجھے بے ہوش کر کے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ستیہ جیت نے مجھے وہاں سے رہائی دلائی تھی۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ وہ ایسا کوئی طریقہ نہ استعمال کریں۔ ویسے من تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس سے معلوم کروں کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"اس کی بات چھوڑو۔ تم کیا چاہتی ہو، مجھے یہ بتاؤ؟"

"میں کچھ نہیں۔ تم مجھے اس کے حوالے کر دینا، میں خود دیکھ لوں گی۔" ست رانی سوچ کر بولی۔

"اور اگر اس نے تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو؟"

"اس کی ذمہ داری میں خود لیتی ہوں وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

"نہیں ست رانی، یہ غلط ہوگا، بھلا میں تمہیں اس کے حوالے کیوں کروں، کوئی اچھی نیت تو نہیں ہوگی اس کی۔"

"کہا نا تم سے اور جو کچھ میں کہتی ہوں بس اس میں گڑبڑ مت کیا کرو، یہی چیز مجھے ناپسند ہے۔" ست رانی نے خشک لہجے میں کہا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا۔ "مہاراج پربھو دیال نے ابھی تک مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا کہ میں اپنی مرضی سے کہاں چلی جاتی ہوں۔ بہت بڑے انسان ہیں وہ، اتنا ہی بڑا ان کا دل بھی ہے۔ مجھ پر مکمل اعتبار کرتے ہیں۔ اس لئے میں بہت زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی، چلتی ہوں۔" ست رانی نے کہا اور کلیانی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

کلیانی نے جلدی سے دو قدم اس کا پیچھا کیا اور کہنے لگی۔ "تو پھر میں نے اسے جب بلایا ہے تمہیں! نا ہے اور یہ مجھے بتانا ہے کہ تم نے ان سے بچاؤ کا کیا طریقہ سوچا؟"

"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں خود اپنے آپ کو بچا لوں گی تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ تم مجھے اس کے حوالے کر دینا، کیا سمجھیں؟"

"ہوں" کلیانی نے خیالی انداز میں گردن ہلا کر کہا۔

"چلتی ہوں۔" ست رانی بولی اور وہاں سے واپسی کے لئے چل پڑی، یہی وہ وقت تھا جب بجرنگی، کشوری اور ننگا دھرن نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆ … ☆ … ☆

کشوری نے گہری نگاہوں سے بجرنگی کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے آخری بار بتاؤ بجرنگی تم ...ن سنگھ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"مہاراج! آپ کو پوری کہانی سنا چکا ہوں، بدلے کی بھاؤنا میرے من میں ہے۔ اس

نے مجھ سے میرا جیون چھین لیا تھا، وہ دھیکا کس طرح اس مندر تک پہنچی میں نہیں جانتا، پر مہاراج میرے من میں اس کے لئے اتنا غصہ ہے کہ میں اس کا جیون چھین لینا چاہتا ہوں۔"

"سوچ لو ایسا کرنا ٹھیک بھی رہے گا یا نہیں۔"

"مہاراج! یہ کمینہ اگر جیتا رہا تو ہمیں بھی چین سے نہیں رہنے دے گا۔ وہ رادھیکا کو ہی نہیں ست رانی کو بھی اپنے چنگل میں لینا چاہتا ہے۔ آپ بتائیے کیا اس کا جیون ہمارے لئے ٹھیک رہے گا۔"

گنگوتری نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر بولا۔ "خیر تمہارا اس کا بہت پرانا ادھار چل رہا ہے۔ میں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق ہی کام کرنے دوں گا۔ پھر یوں کرتے ہیں کہ گربچن کو اسے دیکھیں گے جب وہ ست رانی کو حاصل کرنے کے لیے اس بوڑھی عورت کے پاس جائے گا۔"

"ٹھیک ہے مہاراج، لیکن ہمیں ست رانی پر بھی نگاہ رکھنا ہوگی۔"

"وہ تمہارا نہیں میرا کام ہے۔" گنگوتری نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور پھر گنگادھرن کی طرف دیکھ کر بولا۔

"انتظار میں بہت مزہ ہے گنگا، میری چندرکھا مجھے واپس مل رہی ہے۔ انتظار کرلیں گے اور جس کی نیچ بھی نگاہ چندرکھا کے لئے ہو، اس کے ساتھ بھلا رعایت اور ہمدردی کیسے کی جاسکتی ہے؟"

گنگادھرن نے گردن ہلا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دوران گربچن کچھ انتظامات کرتا رہا تھا۔ اپنے آدمیوں سے اس نے کافی رقم منگوائی تھی۔ تیسرے ہی دن صبح دس بجے کے قریب کچھ لوگ اس کے پاس پہنچے تھے۔

چونکہ یہ لوگ مسلسل گربچن سنگھ کی نگرانی کر رہے تھے، اس لئے انہوں نے بھی آنے والوں کو دیکھ لیا تھا، البتہ یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کون تھے اور کیوں آئے تھے۔

پھر آخرکار گربچن تیار ہو کر چل پڑا۔ آج اسے کلیانی سے مل کر ست رانی کے بارے میں فیصلہ کن بات کرنی تھی۔ ست رانی کا حصول بھی اس کی زندگی کا بہت بڑا مرحلہ تھا اور وہ یہ سوچتا تھا کہ بجرنگی کی موت کے بعد اگر ست رانی اس کے ہاتھ آجائے تو وہ اسے بھی موت کے گھاٹ اتار کر اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے گا۔ ممکن ہے اسے سکون مل جائے اور اب ست رانی کا حصول اس کے لئے ممکن ہوگیا تھا۔ دولت کی اول تو کوئی کمی نہیں تھی۔ ست رانی کی ہر قیمت وہ ادا کرسکتا تھا۔ چنانچہ تمام تر تیاریاں کرنے کے بعد وہ مقررہ وقت پر کلیانی کے مٹھ کی جانب چل پڑا۔

...اس بھی اس کے ساتھ تھا۔ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کچھ ایسے لوگ اس کا تعاقب ...ہے ہیں جن کے ہاتھوں اس کی زندگی کی شام ہونے کو ہے۔

آخرکار یہ سفر ختم ہوا۔ گربچن رقم کا تھیلا لئے ہوئے تھا اور خاصا تجسس محسوس ہو رہا تھا۔ ...رانی کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ ایک زہریلی لڑکی ہے، اپنی دانست میں اس نے ...انی کو کلیانی سے خرید لیا تھا اور اب وہ کچھ دیر بعد اس کا مالک بننے والا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد وہ کلیانی کے مٹھ کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے آواز دی۔ "کلیانی میں ...ہوں، باہر نکلو اور مجھ سے بات کرو۔"

کچھ ہی لمحوں کے بعد کلیانی باہر نکل آئی۔ ست رانی سے اسے کوئی خطرہ تو نہیں ہے، ورنہ ...بندوبست بھی کیا جائے، تب ست رانی نے جواب دیا تھا کہ میں صرف ایک بار جو کچھ کہتا ہو ...ہوں، بار بار یہ سوال کرکے میرا دماغ مت خراب کرو۔

کلیانی کو اس بگڑے دماغ کی لڑکی کا اچھی طرح احساس تھا، البتہ وہ اس بات کی خواہش ...ی کہ کانی کا مندر بنا کر ست رانی کو مہا کالی کا روپ ثابت کرسکے اور اس کے بعد وہ جانتی تھی کہ ...ہندوستان اس کے دروازے پر ہوگا اور وہ دولت کے انبار جمع کرلے گی۔ بہرحال ست رانی ...نے اطمینان دلایا تھا کہ وہ چنتا نہ کرے۔ اپنا کھیل وہ خود کھیلے گی، تب، کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ ...گئے اور کلیانی ان کے آواز دینے پر باہر نکل آئی۔

"میں آگیا ہوں کلیانی دیوی اور اتنی دولت لایا ہوں کہ تُو اپنا مندر بنانا شروع کردے، یہ ...ہیں جو کچھ تجھے دے چکا ہوں، بھگوان کی سوگند وہ بھی میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ...جو کچھ لایا ہوں وہ تیری تمام خواہشوں کی تکمیل کردے گا۔ بتا ست رانی کہاں ہے، تُو نے ...ف مجھے اس کی ایک جھلک دکھائی مگر وہ صرف تیرا گیان ہوسکتا تھا۔ آج مجھے ست رانی ...ہے، کیا تُو اسے میرے حوالے کرسکتی ہے؟"

کلیانی نے ست رانی سے طے شدہ منصوبے کے مطابق تھوڑی سی اداکاری کی۔ دونوں ...ہاتھ فضا میں بلند کئے اور منہ میں کچھ بدبدا کر انہیں نیچے جھٹکا یا تو ایک ہلکی سی آواز ہوئی۔ ساتھ ہی ...دھوئیں کا ایک بادل اٹھا اور اس کے بعد ست رانی مٹھ کے دروازے سے نکل کر اس جگہ آ کھڑی ...ہوئی جہاں دھوئیں کا بادل آہستہ آہستہ نیچے بیٹھتا جا رہا تھا۔

گربچن اور گووندداس اس کے ساتھ ہی تھوڑے فاصلے پر ایک مٹھ کے پیچھے چھپے ہوئے ...اور گنگوتری نے بھی ست رانی کو دیکھا۔ گربچن کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"اب بول ست رانی، کہاں جائے گی تو اب؟ میرے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار نے کے بعد کیا تو میرے ہاتھ سے بچ سکتی تھی؟"

"گربچن مہاراج! مجھے بتائیں میں کیا کروں؟"

"گووند داس" گربچن نے گووند داس کی طرف دیکھا اور گووند داس نے بھرا ہوا پستول گربچن کے حوالے کر دیا۔

"مجھے صرف اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینا تھا، ست رانی اور آج بھگوان نے میری منو کامنا پوری کر دی ہے، میں بے چین ہو چکا ہوں اور اب چین حاصل کرنا چاہتا ہوں، میں نے تیری قیمت ادا کر دی ہے، میں، میں۔۔۔"

گربچن نے پستول سیدھا کیا اور ست رانی کے سینے کا نشانہ لے لیا۔ ست رانی تو شاید مکمل صورتحال سے واقف نہیں تھی، مگر کلیانی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ گربچن پستول کا ٹریگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ گنگا دھرن نے صورتحال کو بھانپ کر اپنا سانپ گربچن پر اچھال دیا۔

سانپ نے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا اور گربچن سنگھ کی کلائی پر کاٹ لیا۔ شدید زہریلا سانپ تھا۔ گربچن سنگھ کا نشانہ غلط ہو گیا اور گولی کلیانی کی پیشانی میں لگی، جس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی تھی۔ دوسری چیخ گربچن کے منہ سے نکلی تھی چونکہ سانپ کے زہر نے اس کے پورے شریر کو انگارہ بنا دیا تھا۔ گووند داس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن دوسرا سانپ اس کے اوپر پڑا اور اس نے گووند داس کی گردن میں کاٹ لیا۔ گربچن سنگھ کی کلائی پر گرنے والے سانپ نے دوبارہ گربچن سنگھ پر حملہ کیا اور اس بار اس کی ران میں کاٹ لیا۔ گربچن سنگھ ہائے رام ہائے رام چیختا ہوا نیچے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

ادھر ست رانی دنگ تھی اس کی ساری صلاحیتیں اس وقت بے اثر ہو گئی تھیں اور وہ حیرت سے منہ کھولے گربچن اور گووند داس کو دیکھ رہی تھی جبکہ اس کی نگاہ ابھی گنگوتری، گنگا دھرن یا بجرنگی پر نہیں پڑی تھی۔ کلیانی تو ایک لمحے کے اندر ہی اندر ٹھنڈی ہو گئی۔ گربچن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ جدھر سے سانپ اس پر پھینکے گئے تھے۔

تبھی بجرنگی آگے آیا اور اس نے کہا۔ "میں جیتا ہوں گربچن! تو نے اپنی دانست میں مجھے سمندر میں پھینک کر ختم کر دیا تھا۔ پر دیکھ لے میں جیتا ہوں اور تیرا کیا انجام ہو رہا ہے۔ ست رانی کو مارنے آیا تھا کمینے۔۔۔"

بجرنگی آگے بڑھا تب ہی گربچن کے منہ سے کالا کالا خون بہہ نکلا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن خون کی بوچھاڑ اس کے منہ سے پھوٹی اور دوسرے لمحے اس کی گردن ٹیڑھی ہو گئی۔

ادھر ست رانی نے بجرنگی کی آواز پہچان لی تھی۔ اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ بجرنگی بابا کہتی ہوئی آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔

گنگوتری اپنی چندر مکھی کو دیکھ رہا تھا اور کسی پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ست رانی کس طرح بجرنگی کو چاہتی ہے اور یہ بھی سوچ رہا تھا وہ کہ اس نے بجرنگی کے ساتھ برا سلوک کر کے خود اپنے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا ہے، ست رانی کبھی روتی نہیں تھی لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی اور وہ بجرنگی کے سینے سے بڑے پیار سے لپٹی ہوئی تھی۔

اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

"تم مل گئے بجرنگی بابا۔۔۔ تم مل گئے۔ مجھے سنسار میں تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہیے، تم ہی سب کچھ ہو بجرنگی بابا، اس طرح گم نہ ہو جایا کرو۔ اس طرح کھو نہ جایا کرو۔"

بجرنگی بھی رو رہا تھا اور ست رانی کو بڑی طرح لپٹائے ہوئے تھے۔ ادھر کلیانی کا کلیان ہو گیا گربچن سنگھ اور گووند داس بھی ختم ہو گئے تھے۔

بجرنگی نے ست رانی سے کہا۔ "ست رانی! یہ جگہ ساری باتیں بتانے کے لیے اچھی نہیں آؤ چلیں میرے ساتھ چلو۔"

"یہ یہ اسے کیا ہو گیا؟" ست رانی نے کلیانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ بھی اپنا کھیل ختم کر چکی ہے، جیون کا کھیل ایسے ہی ختم ہو جاتا ہے ست رانی آؤ۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"آؤ میں تمہیں ان کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

ست رانی، بجرنگی کے مل جانے سے خوشی سے پاگل ہو رہی تھی، بجرنگی اسے وہاں سے لے چلا تو اس نے اپنا سارا بوجھ بجرنگی پر ہی ڈال دیا تھا اور گنگوتری حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گنگا دھرن نے اپنے دونوں سانپ اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ درحقیقت یہ سانپ اس کے کارآمد ہتھیار تھے اور وہ اپنے سارے کام ان کے ذریعے کر لیا کرتا تھا۔ رات کی تاریکی میں اس نے سانپوں سے جو کام لیا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔

طویل فاصلہ طے کر کے یہ لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ ست رانی خوشی سے سرشار تھی، چنانچہ سرنواس اور پربھو دیال کو بھی بھول گئی تھی۔ ادھر گنگوتری اور گنگا دھرن بھی خوش تھے، گنگوتری جس کام کے لئے نکلا تھا آخرکار اس کی تکمیل ہو گئی تھی۔ حالانکہ

ابھی خاصی رات ہو چکی تھی اور یاتری آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے تھے، ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا لیکن یہ لوگ جو یہاں موجود تھے ان کے دل خوشی سے سرشار تھے۔

بجرنگی نے کہا۔ "تو یہاں کب اور کیسے پہنچ گئی ست رانی؟"

ست رانی بجرنگی کو اپنے اوپر بیتنے والی داستان سنانے لگی اور بجرنگی حیران رہ گیا۔ پھر بجرنگی نے اسے بتایا کہ کس طرح رادھیکا کے سلسلے میں دھوکا دے کر اسے بلایا گیا تھا اور اس کے بعد تریجن نے اسے اپنی دانست میں سمندر میں پھینک کر ختم کر دیا تھا، بجرنگی نے آگے بتایا۔

"ہاں، بھگوان میری مدد کر رہا تھا۔ میں سمندر میں بہتا ہوا کسی ساحل پر جا نکلا۔ وہاں گنگا دھرن نے مجھے دیکھا اور اپنے قبیلے میں لے گیا۔ ست رانی اس قبیلے کا نام گوتم سری ہے اور وہ دور دراز علاقے میں آباد ہے۔ وہاں ست رانی میں نے تمہیں دیکھا تم وہاں موجود تھیں۔"

"مجھے!" ست رانی حیرت اور دلچسپی سے بولی۔

"بھگوان کی سوگند وہ تم ہی تھیں۔ میں اس قبیلے میں بڑی عزت و آبرو کے ساتھ رہ رہا تھا۔ قبیلے کے سردار کنگوتری کو ایک بار میں نے غاروں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک پہاڑی غار میں ایک سنگی مجسمہ نصب تھا اور جب میں نے اس سنگی مجسمے کو دیکھا تو دنگ رہ گیا کیونکہ ست رانی وہ تمہارا مجسمہ تھا۔ پھر میں نے سردار کنگوتری سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ ان کی بیٹی چندر رکھا کا بت ہے جو انہوں نے بڑے پیار سے بنوایا ہے کیونکہ چندر رکھا ان سے بچھڑ گئی تھی۔ چندر رکھا کو ایک آدمی دیوا ما چھو نے اغوا کیا تھا کیونکہ وہ اسے چاہتا تھا۔"

بجرنگی نے پھر چندر رکھا اور دیوا ما چھو کی کہانی سنائی اور بولا۔ "اور چندر رکھا اس وقت ماں بننے والی تھی۔ دیوا ما چھو اسے لے کر قبیلے سے بہت دور ایک ٹوٹے مندر میں پہنچا اور یہاں اس مندر میں اسے چھوڑ کر کسی کام سے باہر گیا۔ پر وہاں وہ ایسے زہریلے پھلوں کا شکار ہو گیا جو دیکھنے میں تو اچھے لگتے ہیں پر ان کا زہر انسان کو چند لمحے بھی جینے نہیں دیتا۔ ادھر ٹوٹے مندر میں سانپوں کا بسیرا تھا۔ وہیں چندر رکھا نے ایک بچی کو جنم دیا۔ وہ بچی کو جنم دیتے ہوئے جیون ہار بیٹھی۔ وہاں ایک درد کا مارا موجود تھا جو اپنی بہن کو حاصل کرنے کے لیے شیش ناگ کی تپسیا کر رہا تھا کہ ناگ دیوتا جاگ جائیں تو وہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکے، پر ناگ دیوتا نے ایک سندری بچی جو چندر رکھا کی اولاد تھی، اس کی گود میں ڈال دی اور اس نے اس کی پرورش شروع کر دی۔ اس نے اس کا نام ست رانی رکھا۔ من رہی ہو ست رانی وہ بچی تم ہو اور تم جانتی ہو کہ تمہارا بابا بجرنگی کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ چندر رکھا تمہاری ماں تھی جوان کھنڈرات میں مر گئی۔ تمہارا پتا پہلے ہی مر چکا تھا۔ دیوا ما چھو بھی مر گیا

اور میں نے تمہیں پروان چڑھایا۔ تم پنگو پھیروؤں کے ساتھ پلی بڑھیں۔ پھر جب میں نے سردار کنگوتری کو بتایا کہ یہ ان کی بیٹی چندر رکھا کا نہیں بلکہ ست رانی کا بت ہے تو کنگوتری جو تمہارے نانا ہیں، تمہیں پانے کی آرزو میں دیوانے ہو گئے اور تمہاری تلاش میں نکل پڑے۔"

اچانک ہی ست رانی کی گردن گھومی۔ اس نے پہلے گنگا دھرن پھر سردار کنگوتری کو دیکھا۔ کنگوتری اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے ست رانی اس کے دماغ میں داخل ہو گئی۔ کنگوتری کوشش کے باوجود ست رانی کی آنکھوں سے آنکھیں نہیں ہٹا سکا تھا۔ تبھی ست رانی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور نانا جی کہہ کر کنگوتری سے لپٹ گئی۔

کنگوتری زار و قطار رونے لگا۔ بجرنگی بھی رو رہا تھا، گنگا دھرن بھی متاثر تھا۔

پھر کنگوتری نے کہا۔ "میری چندر رکھا نے مجھے پہچان لیا۔ بجرنگی تمہارا یہ احسان میرے سارے جیون پر بھاری رہے گا۔ تم نے ایک بار پھر میری چندر رکھا مجھ سے ملا دی ہے۔ بھگوان نے تمہیں تمہاری رادھیکا دے دی اور مجھے میری چندر رکھا۔"

ست رانی ایک دم حیران ہو گئی۔ اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر بجرنگی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کیا کہا نانا جی نے، رادھیکا، رادھیکا موسی۔"

"ہاں..... میں ابھی اس سے ملا نہیں ہوں۔ پر رادھیکا یہیں متھرا میں موجود ہے اور رام گلی مندر کی دیو داسی ہے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے، بہت ہی خوشی کی۔ ہم ابھی چلتے ہیں، میں مہاراج پر بھو دیال سے ملتی ہوں۔ ہم ان کے ساتھ جا کر رادھیکا موسی کو لے آتے ہیں۔"

"کل دن کی روشنی میں ہم یہ کام کریں گے ابھی نہیں۔" بجرنگی نے کہا۔

بہر طور ست رانی یہ معلوم ہونے کے بعد کہ کنگوتری اس کا نانا ہے، کنگوتری کے سینے سے لپٹی رہی تھی۔ پھر اس نے بجرنگی کو دیکھا اور اپنا دوسرا ہاتھ بجرنگی کی گردن میں ڈال دیا۔

☆.....☆.....☆

بجرنگی اعلیٰ ظرف انسان تھا۔ آدھی عمر بہن کی تلاش میں طرح طرح کے جتن کر کے گزری تھی۔ رادھیکا اس کے سامنے آ چکی تھی لیکن وہ صبر سے کام لے رہا تھا۔ ست رانی اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھی۔

دوسری صبح وہ اس وقت اٹھ کھڑی ہوئی جب پوجا اور اشنان کا وقت ہوا تھا۔ اس نے کنگوتری اور گنگا دھرن کو بھی جگا دیا تھا۔

"کوئی خاص وجہ ہے تمہارے جاگنے کی؟" گنگوتری نے پوچھا۔
"ہاں نانا جی۔ سورج نکلنے تک سب جاگتے ہیں۔ پھر سو جاتے ہیں۔ ہم رادھیکا موسی سے سورج نکلنے سے پہلے ہی ملیں گے۔ پھر چونکہ میں پربھودیال جی کی آگیا کے بنا مندر سے غائب رہی ہوں، وہ میرے لئے پریشان بیٹھے ہوں گے۔"
ست رانی ان لوگوں کو پربھودیال کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس نے بجرنگی کو اس سے ملاتے ہوئے کہا۔
"یہ میرے بجرنگی بابا ہیں اور یہ میرے نانا جی، یہ مجھے مل گئے ہیں، میں نے آپ سے بھی کہا تھا کہ اگر مجھے میرے بجرنگی بابا مل گئے تو میں مندر سے چلی جاؤں گی۔"
فراخ دل پربھودیال نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بھگوان نے مجھے بہت بڑی عزت دی ہے، بجرنگی مہاراج کہ میں آپ کی ست رانی کی کچھ سیوا کر سکا اور اب یہ آپ کے حوالے ہے۔"
ست رانی نے پربھودیال سے کہا۔ "اور میں نے آپ کو یہ بھی بتا دیا تھا پربھودیال مہاراج کہ بجرنگی بابا کی بہن رادھیکا موسی بہت پہلے گم ہو گئی تھی۔ وہ رام گلی مندر میں موجود ہیں اور وہاں دیوداسی بنی ہوئی ہیں، بجرنگی بابا نے انہیں دیکھ لیا ہے، ان سے ملے نہیں ہیں لیکن اب ہم انہیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"
پربھودیال نے کسی قدر تشویش زدہ نگاہوں سے ست رانی کو دیکھا اور بولا۔ "کیا رادھیکا مہاراج کو پہچان لے گی؟"
"وہ میری بہن ہے مہاراج، بہن بھائی کو نہیں پہچانے گی تو میں سمجھوں گا کہ خون کا رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوگا، ساری من گھڑت کہانیاں ہیں۔"
"رام گلی مندر کے مہنت جے چرن بھگوت ہیں۔ آؤ میں تم کو ان کے پاس لے چلتا ہوں، پوجا ختم ہو چکی ہوگی پر وہ ابھی باہر ہی ہوں گے۔"
چنانچہ تمام لوگ رام گلی مندر پہنچ گئے۔ پوجا ختم ہو گئی تھی اور یاتری باہر نکل رہے تھے۔ پجاری مندر کے کاموں میں مصروف تھے۔
جے چرن بھگوت نے ان سب کا سواگت کیا تو پربھودیال نے انہیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! آپ کے مندر میں رادھیکا نامی ایک دیوداسی ہیں۔"
"ہاں رادھیکا دیوی ہمارے مندر کی بہت بڑی شخصیت ہے۔"

"وہ بجرنگی مہاراج کی کھوئی ہوئی بہن ہیں، جسے یہ برسوں تلاش کرتے رہے ہیں اور اب انہوں نے اسے دیکھ لیا ہے، مہاراج یہ اسے لینے آئے ہیں۔"
"کیا رادھیکا بجرنگی مہاراج کو پہچان لے گی؟"
"یہی میں نے بھی کہا تھا، اگر وہ بجرنگی مہاراج کو پہچان لیتی ہے تو مہاراج پھر تو ہم اسے ان مہاراج کے حوالے کر دیں گے جیسے میں نے اپنی بہت ہی سندر بیٹی ست رانی کو بجرنگی کے حوالے کر دیا۔"
"میں رادھیکا کو بلاتا ہوں۔" جے چرن بھگوت نے کہا اور ایک پجاری کو اشارہ کر کے قریب بلایا پھر رادھیکا کو بلانے کی ہدایت کر دی۔
بجرنگی کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ حد درجہ جذباتی ہو رہا تھا۔
پھر رادھیکا دروازے سے نمودار ہوئی۔ وہ اس طرح بلاوے پر حیران سی تھی۔ جے چرن بھگوت، پربھودیال، گنگوتری اور گنگا دھرن ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ بجرنگی دروازے کے بالکل سامنے پتھر کے بت کی طرح ایستادہ تھا۔
رادھیکا اندر آئی۔ اس نے حیران نگاہوں سے یہاں کے ماحول کو دیکھا، سرسری نگاہ تمام لوگوں پر ڈالی۔ پھر اس نے بجرنگی کو دیکھا لیکن بجرنگی سے نظریں ہٹاتے ہی اس نے اچانک ایک جھٹکا سا لیا اور دوبارہ بجرنگی کو دیکھا، پھر اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی اور اس کے منہ سے ایک دلدوز آواز نکلی۔
"بھیا جی، بھیا جی۔" پھر وہ لہرائی اور زمین پر گرنے لگی، تبھی بجرنگی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ رادھیکا بے ہوش ہو گئی تھی۔ بھیا جی کا لفظ اور پھر رادھیکا کی جذباتی کیفیت سب نے دیکھی اور محسوس کی تھی۔ رادھیکا جیسے ہی بے ہوش ہوئی بجرنگی نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔
"آؤ اسے لے کر اندر آ جاؤ، یہ بھائی کے مل جانے کا ذہنی جھٹکا برداشت نہیں کر سکی ہے۔ ابھی ہوش میں آ جائے گی۔" جے چرن بھگوت نے کہا۔
اور رادھیکا کو یہاں سے ایک دوسری جگہ لے جایا گیا جہاں اسے ایک سنگھاسن پر لٹا دیا گیا اور جے چرن بھگوت ایک پنکھے سے اسے ہوا دینے لگے۔
پھر بھگوت نے مدھم لہجے میں کہا۔ "بجرنگی مہاراج! آپ کو بہن مل جانے کی بدھائی ہو۔ ہمارے لئے بھی وہ ہنگی بیٹیوں جیسا درجہ رکھتی ہے۔ ہم مندروں کے باسی ایک دوسرے کو بھگوان کی

دین سمجھتے ہیں، لیکن بہرحال اس نے آپ کو پہچان لیا اور جس طرح وہ آپ سے جدا ہوئی ہے اس کے بعد ہم کسی بھی طرح اسے مندر میں رکھنے کے حقدار نہیں ہیں، وہ ہوش میں آ جائے تو آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔"

بجرنگی سسک سسک کر رو رہا تھا اور ست رانی اس کے شانے سے رخسار لگائے کھڑی ہوئی تھی۔ بہت دیر تک یہ جذباتی کیفیت چلتی رہی۔

رادھیکا تھوڑی دیر کے بعد پھر ہوش میں آئی اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ بجرنگی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔

"تم میرے بھیا جی ہی ہو نا، میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں، تم میرے بھیا جی ہی ہو چاہے یہ سپنا ہو یا میں جاگ رہی ہوں، تم میرے بھیا ہی ہو۔" وہ مجنونانہ انداز میں بولی اور ایک بار پھر بجرنگی سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔

بہرحال یہ بات سبھی محسوس کر رہے تھے کہ یہ اٹوٹ رشتہ بہت ہی مضبوط ہے، حالانکہ بجرنگی کا حلیہ اتنے عرصے میں کافی بدل گیا تھا اور اب تو وہ گوتم سری کا بہروپ اپنائے ہوا تھا لیکن بہن نے دل کی آنکھوں سے اسے پہچان لیا تھا۔

جئے چرن بھگوت نے خوشدلی سے رادھیکا کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ رادھیکا نے شاید بہت زیادہ طویل وقت یہاں گزارا تھا۔ دیو کنیائیں اور پجاری اس کے جانے کی خبر سن کر رو رو کر مرے جا رہے تھے۔ آنسوؤں اور آہوں کے درمیان انہوں نے رادھیکا کو رخصت کیا اور رادھیکا اپنے بھائی سے لپٹی ہوئی ان کے ساتھ چل پڑی اور پھر یہ لوگ اس جگہ گئے جہاں انہوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا۔

سارے کے سارے خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے، یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ گربچن اور گووند داس کی لاشیں کسی نے دیکھیں یا نہیں، کلیانی کو بھی بالکل اتفاقیہ طور پر ہی دیہانت ہوا تھا، ورنہ شاید وہ ست رانی کو اتنی آسانی سے نہ چھوڑتی اور گربچن سنگھ اور گووند داس کی موت کے بعد انہیں دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پڑاؤ پر آ کر بھی یہ جذباتی کیفیت طاری رہی، ایک طرف گنگوتری ست رانی پر نثار ہو رہی تھی تو دوسری طرف یہ بہن بھائی اتنے عرصے کے بعد ایک دوسرے سے مل جانے کی خوشی سے نہال تھے۔ بہت سی باتیں ہوتی رہیں، یہ سوچا جانے لگا کہ اب کرنا کیا ہے، اس سلسلے میں گنگا دھرن نے مشورہ دیا کہ سب سے پہلے متھرا چھوڑا جائے۔ یہ طے کیا جانے لگا کہ متھرا سے نکل کر پہلے

کہاں ہو، اصل میں گربچن سنگھ وغیرہ کی موت کے سلسلے میں تھوڑا سا تردد تھا اور یہ لوگ کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، حالانکہ کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا تھا انہوں نے جس سے ان کی جانب توجہ جائے لیکن ان کا بہروپ جیسا حلیہ، گنگا دھرن کے زہریلے سانپ اور گربچن سنگھ وغیرہ کی سانپوں کے ذریعے موت الجھن کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ آج کا دن یہاں بتا لیا جائے کل یہاں سے روانگی ہو جائے گی اور متھرا چھوڑنے کے بعد یہ لوگ سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔

غرضیکہ ایک ایک لمحہ دلچسپی سے بھرپور رہا تھا۔ ست رانی گنگوتری کو بھرپور محبت دے رہی تھی، پتہ نہیں اس کے اندر کیسے جذبے ابھر آئے تھے۔ ادھر رادھیکا اپنے بھائی کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ دن گزر گیا کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ یاتری مندروں میں آتے جاتے رہے، کسی نے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ رات کو کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گنگوتری نے ست رانی سے اس کی رام کہانی پوچھی۔ بجرنگی نے دریافت کیا کہ اس کے جانے کے بعد ست رانی پر کیا بیتی، کیرولین اور حسن شاہ کس طرح قتل ہوئے اور ست رانی انہیں اپنی معلومات کے مطابق تفصیل بتانے لگی۔

پھر رادھیکا کی باری آئی تو رادھیکا نے بجرنگی کو بتایا کہ گربچن سنگھ نے اسے قید کر دیا تھا۔ وہ برا انسان تھا لیکن قید خانے کا محافظ گرد لعل ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے رادھیکا کو قید خانے سے فرار ہونے میں مدد دی اور رادھیکا ایک بس میں بیٹھ کر چل پڑی۔ پہلے ایک شہر اور پھر دوسرے شہر یہاں تک کہ اسے کچھ ایسے لوگ مل گئے جو یاترا کے لیے متھرا آ رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ جمنا کی بستی پہنچ گئی اور جمنا نے اسے اپنے چرنوں میں جگہ دے دی۔ مہاراج جئے چرن بھگوت نے اسے سویکار کر لیا اور اس کے بعد سے وہ یہاں جیون بتا رہی رہی۔ اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو اپنی رام کہانی سنائی جو اس سے ہمدردی رکھتے تھے اور کہا کہ اس کے بھائی ارجن سنگھ کو تلاش کریں، لیکن کہیں سے ارجن سنگھ کا پتہ نہیں چل سکا اور وہ مندر میں جیون بتانے لگی۔

اس نے کہا۔ "رام گلی مندر میں دیوتی کی ایک مورتی ہے۔ دیوتی کی مورتی کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ اماوس کی رات کو ہنستی ہے۔ اگر کوئی اس کی ہنسی کو پا لے اور اس کے سامنے کوئی منوکامنا بیان کرے تو وہ اوش پوری ہوتی ہے۔"

رادھیکا نے بتایا کہ ایک رات اماوس کی رات تھی۔ وہ ایسے ہی بھٹکتی ہوئی دیوتی کے بت کے پاس جا نکلی اور اس نے اچانک ہی بت کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو وہ ڈر گئی پھر اسے دیوتی کے بارے میں داستانیں یاد آ گئیں اور اس نے یہ پرارتھنا کی کہ دیوتی میرا بھیا جی مجھے مرنے سے پہلے

ایک بار ضرور مل جائے اور یہ یونہی نہ کی رہی۔ اس دن سے اسے وشواس تھا کہ اس کا بھائی ضرور ملے گا۔

بجرنگی نے ایک بار پھر محبت سے بہن کو گلے لگا لیا تھا۔

دوسرے دن انہوں نے متھرا چھوڑ دیا۔ پہلے بندراون پہنچے۔ پھر سانسی اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

بجرنگی نے گنگوتری سے کہا۔ ''گنگوتری مہاراج بھگوان نے آپ کو آپ کی چندر مکھ دے دی۔ ست رانی کو اس کے جیون کے پہلے دن سے میں نے پروان چڑھایا، اسے چھوڑنے کو من تو نہیں چاہتا، پر مجھے تپسیا نہ کہیں سر تو چھپانا ہے، بہن مل گئی ہے۔ اب ہم دونوں بہن بھائی اس سنسار میں اپنا ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں۔'' گنگوتری نے حیرت سے بجرنگی کو دیکھا اور بولا۔ ''میری کوئی بات تجھے بری لگی بجرنگی؟ کیا گوتم سری میں کبھی کسی نے تجھ سے کوئی غلط بات کہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے میرے بھائی تو پھر ہمیں کیوں چھوڑنا چاہتا ہے۔''

بجرنگی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے کہا۔ ''مجھے بہن مل گئی ہے اور بیٹی بھی، پر میں اس لئے سوچتا ہوں مہاراج کہ آپ کو میری وجہ سے کوئی کشٹ نہ ہو۔''

''دوبارہ ایسی بات مت کہنا، میرا قبیلہ مجھے اوتار کا درجہ دیتا ہے۔ میں پورے قبیلے کو بتا دوں گا کہ بجرنگی کو میرا استر سمجھا جائے اور میرے سنسار سے جانے کے بعد بھی اسے قبیلے میں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔''

بجرنگی مطمئن ہو گیا تھا۔ ست رانی نے کہا۔ ''ایک بار پھر مجھے چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے بجرنگی بابا، پر اب تمہیں کبھی نہیں جانے دوں گی۔''

☆.....☆.....☆

سفر جاری رہا اور آخر کار یہ لوگ خوبصورت پہاڑیوں میں آباد قبیلہ گوتم سری پہنچ گئے۔ گوتم سری میں کافی کافی عمروں کے لوگ تھے۔ انہوں نے ست رانی کو دیکھا تو ہر طرف شور مچ گیا کہ چندر مکھی واپس آ گئی۔ سب لوگ ششدر رہ گئے تھے کہ چندر مکھ کو تو گوتم سری سے گئے ہوئے عرصہ بیت گیا تھا۔ یہ ویسی کی ویسی کیسے آ گئی۔ بعد میں گنگوتری نے سب کو جمع کر کے ست رانی کے بارے میں تفصیل بتائی اور لوگوں نے ست رانی کے نام کے نعرے لگانے شروع کر دیئے، یہاں ان لوگوں کے لئے ہر طرح کی آسائش کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔ گنگوتری ست رانی کو چندر مکھ کا مقام دے چکا تھا، چنانچہ اس نے ایک دن قبیلہ گوتم سری میں اعلان کیا۔

''سجنو! میں اپنے بعد اپنی ست رانی کو گوتم سری کا سردار بنانا چاہتا ہوں۔ میں اسے ایسی

...ت دوں گا کہ اس پر سرداری سجے، کسی کو کوئی اعتراض ہو تو مجھے بتا دے۔''

چاروں طرف سے شور مچ گیا کہ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ایک چہرہ اس اعلان پر ...دم بجھ سا گیا تھا اور یہ گنگا دھرن تھا۔ گنگا دھرن جس کے بارے میں پورے قبیلے نے پیشگوئی ...ندی تھی کہ گنگوتری کا کوئی بیٹا تو ہے نہیں اور پھر بیٹا ہوتا بھی تو گنگا دھرن جیسی خصوصیات کسی میں ...ں تھیں، وہ قبیلے کا سب سے شاندار انسان ہے اور وہی آئندہ سردار ہو گا لیکن اس اعلان نے ...س کو حیرت میں ڈال دیا تھا، البتہ گنگوتری انہیں اتنا پیارا تھا کہ اعتراض کسی نے نہیں کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ست رانی یہاں آ کر بہت خوش تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خمیر یہیں سے اٹھا تھا۔ ...روں کی یہ بستی اس کی ماں کی بستی تھی، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں سے اس کا پیار بے مثال تھا۔ ...ی نے خاص طور سے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا کہ ست رانی میں کیا کیا خصوصیات ہیں، اس ...کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی اور اب ست رانی یہاں بڑے ناز و نعم سے رہ رہی تھی۔ ...وتری اس پر نثار ہوا جاتا تھا۔ اس نے اسے سردار بنانے کے سارے انتظامات شروع کر دیئے ... رادھیکا عام طور سے ست رانی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ بجرنگی اور رادھیکا کو بڑی عزت اور ...ام دیا جاتا تھا اور وہ دونوں بھی یہاں خوش تھے بلکہ رادھیکا نے بجرنگی سے کہا تھا۔ ''ارجن بھیا ...ت یہ ہے کہ شہری آبادیوں سے دور اس معصوم سی بستی میں جیون بڑا سکھی ہے۔ میں تو یہاں ...بہت خوش ہوں۔''

''تو پھر رادھیکا میں انہی میں سے کسی اچھے سے نوجوان سے تیری شادی کرا دوں گا۔''

''ارے نہیں بھیا جی، شادی کا سمے بیت گیا ہے۔ بجری عمر اب اس قابل کہاں ہے؟''

''پگلی مجھے تو تو اتنی ہی چھوٹی لگتی ہے جتنا میں نے تجھے چھوڑا تھا۔''

رادھیکا کی ست رانی سے اس سلسلے میں بات چیت ہوئی تو رادھیکا نے پوچھا۔ ...رانی! سچ بتانا، کبھی کوئی تیرے من کو بھی بھایا؟''

ست رانی نے سادہ سی نگاہوں سے رادھیکا کو دیکھا پھر بولی۔ ''نہیں رادھیکا موسی، شاید ...دوں سے بہت الگ ہوں اور پھر بھگوان نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے، پر بھگوان کچھ لیتا ...ہے، سو اب میں اس کی داسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں۔''

...بات رادھیکا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، وقت گزرتا رہا، ایک طرح سے زندگی ٹھہر گئی تھی۔ ...ایک اچھی رہائش گاہ دے دی گئی تھی۔ گنگوتری نے جو احکامات دیئے تھے، ان کی بھرپور

قبیلہ ہوئی تھی اور بجرنگی یہاں بڑی آزادی سے رہ رہا تھا لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ گنگا دھرن کافی کھنچا کھنچا سا ہے۔ بات بجرنگی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور وہ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا، البتہ بہت سے لوگوں کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوا تھا کہ سرداری کا حق صرف گنگا دھرن کو تھا جو ست رانی کی وجہ سے اس سے چھن گیا، لیکن سردار سنگوتری نے فیصلہ کر دیا تھا اور یہاں یہی ہوتا تھا کہ جو فیصلہ سردار سنگوتری کا وہ سبھی کا۔

گنگا دھرن عام طور سے اب آبادی سے دور پہاڑوں میں گھومتا پھرتا تھا اور ایک دن جب وہ بستی سے تھوڑی دور ایک خاص علاقے سے گزر رہا تھا تو اسے پورن ساگا نظر آیا۔ پورن ساگا ایک بوڑھا آدمی تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دیوا ماچھو کا دور کر رشتے دار تھا، اسے دیوا ماچھو کی ماں کا بڑا دکھ تھا، ویسے تو بستی کے اور بھی لوگ دیوا ماچھو کی ماں کے لیے افسردہ تھے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو اس وقت خوش ہوئے تھے، جب دیوا ماچھو، چندر مکھو کو لے کر فرار ہو گیا تھا کیونکہ بہر حال سردار سنگوتری ایک انتہائی سخت گیر آدمی تھا اور خاص طور سے اپنی جوانی کے زمانے میں اس نے لوگوں کے ساتھ کافی سختیاں برتی تھیں۔ اس لئے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کی سختیوں کے خلاف رہے تھے۔ انہی میں پورن ساگا بھی تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سنگوتری کا مخالف ہے، ویسے بھی بوڑھا ہو چکا تھا اور کچھ جوگی ٹائپ کا آدمی تھا، اس لئے زیادہ تر پہاڑوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ اس وقت اس نے گنگا دھرن کو دیکھا تو گنگا دھرن کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں، تب ساگا نے زور سے گنگا دھرن کو آواز دی۔ ”کیا بات ہے گنگا، ادھر آ میرے پاس!“

”گنگا دھرن، پورن ساگا کی جانب بڑھ گیا، پورن ساگا ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا، اس نے گنگا دھرن کو دیکھا اور بولا۔ ”یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ تیری حق تلفی ہوئی ہے، بھلا گوتم سری میں تیرے علاوہ اور کون سردار بن سکتا ہے، تو نے ہمیشہ اپنی طاقت دکھائی ہے، پر گنگا دھرن کبھی کبھی حق چھیننا بھی پڑتا ہے۔“

گنگا دھرن نے سوالیہ نگاہوں سے ساگا کو دیکھا تو ساگا بولا۔ ”ہاں ٹھیک ہے ہم مانتے کہ سنگوتری سردار ہے، پر کیا سردار کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ گنگا دھرن تجھے ہمت سے کام ہوگا، جا سردار سنگوتری سے اپنی سرداری مانگ، میں تیرے ساتھ ہوں۔“

یہ پہلا شخص تھا جس نے آگے بڑھ کر گنگا دھرن کو حق دلوانے کے لیے اپنا ہاتھ پیش کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تو میرے ساتھ سردار سنگوتری کے سامنے چلے گا؟“

”ہاں میرا کیا ہے، اپنا جیون بتا چکا ہوں، اب تو تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں جیون سردار مجھ سے ناراض ہو کر اگر میرے خلاف کوئی کام کرتا بھی ہے تو میں تیار ہوں، تجھے تو سر

جائے گی۔“

پھر اس سے گنگا دھرن اور ساگا سنگوتری کے سامنے پہنچے جب سنگوتری اپنے معاملات کے سلسلے میں بہت سے فیصلے کر رہا تھا۔

گنگا دھرن نے کہا۔ ”سردار سنگوتری! میں ہمیشہ آپ کے چرنوں کی دھول بنا رہا ہوں، پر آج میں آپ سے اپنا حق مانگنے آیا ہوں۔“

سنگوتری نے حیران نگاہوں سے گنگا دھرن کو دیکھا۔ یہ سچ تھا کہ گنگا دھرن اس کے سب سے زیادہ اعتماد کا آدمی تھا، لیکن اس وقت اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے گنگا، کچھ مانگتا ہے ہم سے؟“

”ہاں سردار، یہ بات بہت پہلے سے طے تھی کہ تمہارے بعد مجھے قبیلے کا سردار بنایا جائے گا۔ مجھ سے یہ حق چھین لیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہو میں نے ہمیشہ آپ کے ساتھ وفاداری کی ہے اور اب تک کا جیون میں نے اسی خیال کے ساتھ گزارا ہے کہ مجھے سرداری ملے گی لیکن اب مجھے اپنا سب کچھ چھنتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔“

سنگوتری کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اس نے کہا۔ ”سارا جیون سرداری کی ہے میں نے، میری مخالفت میں کبھی ایک آواز نہیں ابھری، سرداری میں ست رانی کو دے چکا ہوں۔“

”غلط ہے۔ قبیلہ جب سے یہاں آباد ہے اس کی پوری تاریخ میں کوئی عورت کبھی قبیلے کی سردار نہیں بنی۔ اصول اصول ہوتے ہیں سنگوتری، تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا غلطی کر بیٹھے ہو۔“ اس بار پورن ساگا نے بے خوفی سے کہا۔

تمام لوگ ساکت رہ گئے، سنگوتری کے سامنے اس طرح کی بات کبھی کسی نے نہیں کی تھی، پورن ساگا پھر بولا۔ ”جب کسی کو سرداری کے لیے نامزد کر دیا جاتا ہے تو اس کا امتحان ہوتا ہے۔ ست رانی ان پہاڑوں میں سانپوں کے بیچ نہیں پلی، اسے سانپوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، تم نے اس کے جیون پر ایک بوجھ ڈال دیا۔ اب اسے لازمی طور پر وہ رسم پوری کرنا پڑے گی جو سرداری کے لیے نامزد ہونے والوں کو پوری کرنی ہوتی ہے اگر اس پر کوئی اعتراض ہو جائے تو تم اس رسم کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو جب ایک بند جگہ سرداری کے امیدوار کو خطرناک سانپوں کے بیچ چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ ان سانپوں کو قابو میں کر لیتا ہے، یہ رسم صدیوں پرانی ہے سنگوتری، ہم بھی اسے نہیں ٹال سکتے۔“

سنگوتری کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

پورن ساگا نے کہا۔ "اور اب تم یہ نامزدگی واپس بھی نہیں لے سکتے، مجبور ہے ہونا میری بات، دوستو! ہم سب سردار گنگوتری کو اپنا سردار مانتے ہیں، لیکن قبیلے کی رسمیں ہمارا جیون ہیں، بولو! کوئی اعتراض ہے؟"

سب کی گردنیں جھک گئیں، سردار گنگوتری سخت پریشان تھا، بجرنگی سے بھی مشورہ کیا لیکن بجرنگی بھی کوئی صحیح بات نہ بتا سکا، البتہ اس نے بڑے احترام سے ایک بات کی۔ "آپ یہ رسم پوری کر دیجئے سردار۔"

"مگر ست رانی۔"

"اتنا ہی کہوں گا کہ آپ یہ رسم پوری کر دیجئے۔"

اور ست رانی کو ایک ایسے کمرے میں چھوڑ دیا گیا جہاں سے آنے جانے کا بس ایک ہی راستہ تھا، سانپوں کا انتخاب ہوا تو گنگا دھرن نے اپنے دونوں سانپ پیش کر دیئے اور یہ سانپ انتہائی خطرناک تھے اور گنگا دھرن کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتے تھے۔

سردار گنگوتری کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس رسم کا شکار ہو گیا، اب کنواری ست رانی کو کوئی نہیں بچا سکے گا لیکن آدھے گھنٹے تک گنگا دھرن کے خوفناک سانپوں کے درمیان رہنے کے بعد جب دروازہ کھولا گیا تو ست رانی مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔ دونوں سانپ اس کی گردن میں جھول رہے تھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا، ست رانی کنواری جیت گئی تھی۔

گنگا دھرن کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ سارا جیون سانپوں نے اس کے ساتھ وفاداری کی تھی، لیکن یہ اس کے خلاف کیسے ہو گئے، سانپ گنگا دھرن کو واپس کر دیئے گئے اور گنگا دھرن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دونوں سانپوں کو پتھروں سے کچل کر مار دیا۔ پورن ساگا بھی حیران ہو گیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے گنگوتری نے اپنا کام بھی کچا نہیں چھوڑا تھا اور اب بس ایک ہی ترکیب جاتی ہے گنگا دھرن، وہی پرانی ترکیب، ست رانی ایک نوجوان اور نوخیز لڑکی ہے تو اسے اپنی محبت کے جال میں پھانس لے، اگر وہ تیری پریمیکا بن گئی تو پھر سرداری تیرے پاس ہی رہے گی۔"

گنگا دھرن نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ پوری طرح ہوس کے جال میں گرفتار ہو گیا تھا پھر اس کے بعد اس نے ست رانی کا پیچھا شروع کر دیا۔ کئی بار تنہائیوں میں ست رانی سے ملا، ہر بار اس نے محسوس کیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے، یہاں تک کہ اس نے پورن ساگا کو یہ بات بتائی کہ ست رانی کسی جال میں نہیں آ رہی اور جو کام اس نے سوچا ہے شاید کسی طور ممکن نہ ہو پائے

پورن ساگا کے سینے میں انتقام کی آگ تھی۔ ایک موقع ملا تھا اسے کہ برسوں پہلے کی اس آگ کو بجھائے جو اس کے اندر سلگ رہی ہے، یعنی دیوا ماچھو کا انتقام اور اس نے وہی کہانی دہرانے کی بات کی جو پرانی تھی۔ اس نے کہا کہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر وہ ست رانی کو یہاں سے لے جائے اور کہیں ایسی جگہ لے جا کر رکھے جہاں اسے تلاش کرنے والے تلاش نہ کر پائیں۔

اور گنگا دھرن اتنا ہی بے اختیار ہو گیا تھا کہ اس نے پورن ساگا کی یہ بات بھی مان لی اور ایک بارش والی رات جب آسمان سے بجلیاں برس رہی تھیں گنگا دھرن اس جگہ پہنچ گیا جہاں ست رانی محو خواب تھی۔

اس وقت جب وہ ست رانی کو یہاں لے کر آئے تھے گنگا دھرن کے دل میں احترام کا سمندر موجزن تھا، لیکن زر، زن، زمین کی کہانی ہمیشہ یکساں رہی ہے۔ اب اس کے دل میں دوسرا ہی خیال تھا۔ اس نے طاقت کے زعم میں ست رانی کو بے ہوش کرنا ضروری نہ سمجھا اور جب اس نے ست رانی کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا تھا تب ہی اسے اپنی گردن کے پچھلے حصے میں ایک جلتی ہوئی آگ کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے تپتے ہوئے لوہے کی سرخ سلاخ اس کی گردن میں داخل کر دی ہو۔

اس کے حلق سے ایک دھاڑ نکل گئی۔ بمشکل اس نے ست رانی کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی گردن کے پچھلے حصے سے ہٹایا۔ ست رانی کے دانت اس کی گردن کے پچھلے حصے میں پیوست ہو گئے تھے اور ایسا اس نے اپنے بچاؤ کے لیے کیا تھا۔ لیکن گنگا دھرن کے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ وش کنیا ہے جس کی نس نس میں زہر بھرا ہوا ہے۔

ست رانی اس کی گرفت سے نکل کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی اور گنگا دھرن زمین پر بیٹھا جا رہا تھا اس وقت اور کوئی دیکھنے والا نہیں تھا لیکن ست رانی دیکھ رہی تھی کہ گنگا دھرن کا بدن پانی بن کر بہہ رہا تھا۔

ایسا منظر شاید ہی کسی نے دیکھا ہو کہ ایک انسان کے بدن کا سارا گوشت پانی بن کر بہہ گیا اور صرف ہڈیوں کا پنجر سامنے پڑا رہ گیا۔ یہ عبرتناک منظر دن کی روشنی میں بے شمار لوگوں نے دیکھا۔ ست رانی نے گنگوتری کو بتایا کہ کس طرح گنگا دھرن اسے زبردستی لے جانا چاہتا تھا۔ وہ بھی مل گیا تھا جو گنگا دھرن نے فرار کے لیے تیار کیا تھا۔

بستی کے لوگوں نے کہا۔ "کہانی ہر بار ایک جیسی نہیں ہوتی، دیوا ماچھو نے بھی یہی کیا تھا،

لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔"

اور گنگوتری کی موت کے بعد ست رانی نے جب سرداری سنبھالی تو وہ ایک انوکھی ہی سردار تھی۔ پہلے لوگوں کو سانپوں کو پکڑنے میں کچھ دشواریاں پیش آتی تھیں، لیکن اب کبھی کبھی سردار ست رانی جب پہاڑوں میں نکل جاتی تو واپس آتے ہوئے اس کے پاس زہر کے بڑے بڑے ذخیرے ہوا کرتے تھے جو انتہائی خوفناک سانپ اسے بطور تحفہ دے جاتے تھے۔

ست رانی سے زیادہ کامیاب سردار گوتم سری میں اس سے قبل اور کوئی نہیں ہوا تھا۔ قبیلہ خوشحال تر ہوتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف بجرنگی نے اپنی بہن رادھیکا کی شادی گوتم سری ہی کے ایک خوبصورت جوان سے کر دی تھی اور وہ ایک خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے۔

(ختم شد)

کالی قبر
ایم اے راحت
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

بار اول ـــــــــ ۲۰۰۲ء
مطبع ـــــــــ یو اینڈ ی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــــ الحرم کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ـــــــــ ۲۰۰ روپے

ISBN 969-517-078-1

اہتمام
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

چند لمحوں تک ہال میں مکمل خاموشی چھائی رہی پھر جج نے وکیل صفائی سے کہا۔
"اگرچہ میرے مؤکل نے مقدمے کا بائیکاٹ کر رکھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مقدمے میں کوئی جان نہیں ہے۔ مدعیہ کا سارا بیان جھوٹ پر مبنی ہے۔ غالباً اسے میرے مؤکل سے کوئی ذاتی عناد ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی نیک شہرت کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب والا۔" وکیل استغاثہ نے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے وکیل صفائی نے میری مؤکلہ کے ایک جملے پر اعتراض کیا تھا کہ وہ صرف حقائق بیان کرے۔ جذباتی ڈائیلاگ اور اپنے تاثرات سے عدالت پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ کیا یہ اصول وکیل صفائی پر لاگو نہیں ہوتا۔"

"اعتراض منظور کیا جاتا ہے۔ وکیل صفائی کو جذباتی باتوں سے احتراز کرنا چاہئے۔"

"ڈاکٹر عذرا گل صاحبہ۔" وکیل صفائی نے کہا۔ "آپ کے بیان کی رو سے اس مقدمے کی سب سے اہم گواہ سلمیٰ اویس نامی ایک خاتون ہیں لیکن عدالت میں مجھے صرف ایک ہی خاتون نظر آرہی ہے۔ وہ آپ ہیں لہٰذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ اس اہم گواہ کی عدم موجودگی کی بنا پر مقدمہ خارج کردے۔"

"ایک منٹ جناب والا!" عذرا گل نے کہا اور پچھلا دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ لمحہ بھر کے بعد ایک چالیس بیالیس سالہ عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ درمیانے قد کی ایک فربہ اندام عورت تھی۔ اس نے خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کرنل شاہ نواز کھڑا ہو گیا۔ "اوہ سلمیٰ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کرنل شاہ نواز۔" عذرا گل طنزیہ لہجے میں بولی۔ "آپ عدالت کی کارروائی میں مخل ہو رہے ہیں۔ ہاں!"

"عذرا کیا تم کسی اور طریقے سے مجھ سے بدلہ نہیں لے سکتی تھیں۔" کرنل شاہ نواز نے بڑے کرب سے پوچھا۔

"فکر نہیں کرو شاہ نواز! ابھی تمہاری باری نہیں آئی۔"

"آرڈر پلیز۔" جج نے ہتھوڑا اٹھایا۔

"جناب والا .... یہ سلمٰی اویس ہے۔" ڈاکٹر عذرا گل نے کہا۔ "اسے کچھ عرصے تک سلمٰی شاہ نواز بھی رہنے کا اعزاز حاصل ہے۔"

"جی ہاں جناب والا!" سلمٰی نے کہا۔ "اس بیان کا جو حصہ میرے ساتھ تعلق رکھتا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔"

"وکیل صفائی۔" جج نے کہا۔

"محترمہ سلمٰی اویس ...." وکیل نے کہا۔ "ڈاکٹر عذرا نے کہا ہے کہ آج سے ٹھیک تیئس سال قبل آپ نے اس حویلی میں دو بچوں کو جنم دیا تھا جن میں سے ایک بچے کو میرے مؤکل نے مبینہ طور پر آتش دان میں پھینک دیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ دوسرا بچہ اس وقت کہاں ہے؟"

سلمٰی نے صیاد کی طرف دیکھا جو کسی سرو کی مانند سیدھا کھڑا ہوا تھا' پُر وقار اور وجیہہ۔ "دوسرا بچہ آپ کے سامنے کھڑا ہے' صیاد گل۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ادھر ملک نظام پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس شاندار اور پُرکشش شخصیت کے مالک اس نوجوان کو گھورنے لگا جو درحقیقت اس کا اپنا بیٹا تھا۔

"جناب والا۔" وکیل صفائی نے کہا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہ بچہ ہے جسے سلمٰی اویس نے جنم دیا تھا۔"

"ثبوت آپ کے سامنے موجود ہے جناب والا۔" ڈاکٹر عذرا گل نے کہا۔ "سلمٰی اویس اور صیاد گل کو ساتھ ساتھ کھڑا کر کے دیکھ لیں۔ دونوں کے ناک نقشے میں غایت درجہ مشابہت پائی جاتی ہے اور دوسرا ثبوت یہ کاغذات ہیں۔" اس نے چند کاغذات نکال کر صیاد کو دیئے جو اس نے لے جا کر جج کی میز پر رکھ دیئے۔ عذرا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"ان کاغذات میں صیاد کا برتھ سرٹیفکیٹ' اسکول اور کالج کی اسناد' شناختی کارڈ اور بچپن کی چند تصاویر موجود ہیں۔"

جج نے کاغذات کو ملاحظہ کیا اور پھر بولا۔ "ولدیت کے خانے میں ملک نظام الدین کا نام لکھا ہے۔"

"جی ہاں' ملک نظام الدین اس کا ناجائز باپ ہے۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی اچھلا۔ "میں نے آج تک ناجائز باپ قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی۔"

"غالباً مدعیہ ناجائز بیٹا کہنا چاہتی ہیں۔" جج نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں جناب والا۔" عذرا گل نے کہا۔ "میں ناجائز باپ ہی کہنا چاہتی ہوں۔ ناجائز کا لفظ اس کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے جس نے غلطی کی ہو۔ جب ملک نظام نے سلمٰی اویس کو ورغلایا تھا اس وقت صیاد اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا وہ نہ تو نفرت کے قابل ہے اور نہ ماں باپ کی غلطی کے سبب اسے برا کہا جا سکتا ہے۔"

صیاد نہایت متانت کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن یا ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"میں نے بہت محنت سے صیاد کی تربیت کی ہے۔" عذرا گل نے مزید کہا۔ "آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے چہرے پر کتنا وقار' اعتماد اور اطمینان پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر جھوٹی حمیت اور بے جا انانیت نہیں پائی جاتی۔ جناب والا! انسان کو وہی کچھ حاصل ہوتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔ کوئی انسان اپنے باپ دادا کی غلطیوں کے سبب مطعون اور ملعون نہیں ہوتا اور نہ ان کی کامیابیوں و کامرانیوں کے باعث سرفراز قرار پاتا ہے۔"

"یور آنر!" وکیل صفائی نے کہا۔ "مدعیہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کوئی مجلس علم و عرفان نہیں ہے۔ اسے اپنا بیان واقعات اور حقائق تک محدود رکھنا چاہئے۔"

"میں وکیل صفائی کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔" جج نے کہا۔ "بیان مختصر اور حقائق پر مبنی ہونا چاہئے۔ اب میں صیاد گل سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ عدالت کے روبرو اپنا بیان دے۔"

"یس سر!" صیاد گل گلا صاف کرتا ہوا بولا۔ "مجھے کوئی لمبا چوڑا بیان نہیں دینا۔ جو کچھ میری ممی نے کہا ہے میں اس کی تائید اور تصدیق کرتا ہوں۔"

"ممی سے تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

"یور آنر! میری دو مائیں ہیں۔" صیاد نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "ایک وہ ماں ہے جو مجھے اس عالم رنگ و بو میں لانے کا باعث بنی اور دوسری ماں کو ممی کہتا ہوں اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ ایک عظیم ماں ہے۔"

سلمٰی اویس دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ کمرے میں چند لمحوں نے

لئے خاموشی چھائی۔ اس کے بعد دیگر افراد کو گواہی کے لیے بلایا گیا۔ طفیل ڈرائیور نے اس بات کا اقرار کیا کہ تیئس سال قبل وہ ایک لیڈی ڈاکٹر کو عادل نگر کے ہسپتال سے حویلی تک لایا تھا۔ کرم علی نے اپنے بیان میں کہا کہ تیئس سال پہلے ایک نوجوان عورت جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ بھی تھا اس کے مرحوم بھائی رجب علی کے گھر میں پناہ گزین ہوئی تھی اور رجب علی کے کہنے پر وہ اس عورت کا سامان لینے عادل نگر کے ہسپتال گیا تھا۔

ریٹائرڈ ڈی ایس پی منظور شاہ نے اپنے بیان میں کہا کہ جن دنوں وہ عادل نگر میں متعین تھا ان دنوں تھانے میں ڈاکٹر عذرا گل کے اغوا کا کیس درج کروایا گیا تھا لیکن وہ مغویہ کو برآمد نہیں کر سکا تھا۔

کرنل شاہ نواز نے اپنے بیان میں کہا کہ تیئس سال قبل وہ فوج میں کیپٹن تھا اور عذرا گل کا منگیتر تھا۔ پھر اسے عذرا کے رشتے داروں کے ذریعے پتا چلا کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بن گئی ہے۔ اس پر اس نے منگنی توڑ دی۔

آخر میں جج ملک نظام کی طرف متوجہ ہوا۔ "ملک صاحب! اب آپ بیان دیں۔"

ملک نظام جو مسلسل صیاد کو گھور رہا تھا چونک سا گیا۔ اب وہ ایک شکست خوردہ اور تھکا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔

"جناب میں کوئی بیان نہیں دینا چاہتا۔"

"کیا جو کچھ اس عدالت میں بیان کیا گیا ہے' آپ اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں۔"

"جناب اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنے پر تیار ہوں۔"

"اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"اگر سلمٰی راضی ہو تو میں اس کے ساتھ شادی کر کے اپنی تمام جائیداد صیاد کے نام منتقل کرنے پر تیار ہوں۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" صیاد نے کہا۔ "اگرچہ یہ شخص میرا باپ ہے مگر میں اس کے منہ سے بیٹے کا لفظ سننا پسند نہیں کرتا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں یہاں زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ میری ہڈیاں آتش دان میں راکھ ہو چکی ہوتیں۔"

"میرے بیٹے!" ملک نظام گڑگڑایا۔ "مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

"خبردار' مجھے بیٹا نہیں کہو۔ آج یوم الحساب ہے۔ جائیدادیں منتقل کرنے اور شادیاں کرنے کا دن نہیں ہے۔ آج معصوم بھائی کی بھٹکتی ہوئی روح کی تسکین کا سامان [کرنا] چاہتا ہوں جو اس آتشدان میں زندہ جلایا گیا تھا۔ جناب والا! ملزم کو وہی سزا ملنی چاہئے جو اس نے میرے معصوم بھائی کو دی تھی۔ اسے اس آتشدان میں زندہ جلایا جائے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آتش دان خاصا کشادہ ہے۔ پہلے یہ چھوٹا تھا۔ اسے میں نے ممی کی ہدایت پر بڑا کروایا ہے۔"

"نہیں' نہیں' میرے بیٹے! مجھ پر رحم کرو۔"

اسی لمحے کسی ہوائی جہاز کی تیز آواز سنائی دی جو بہت نیچی پرواز کرتا ہوا قصر سنبل کے اوپر سے گزرا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک زور دار دھماکہ ہوا جس سے پوری عمارت لرز گئی۔

"او میرے خدا! یہ کیا ہوا؟" کسی نے ہذیانی آواز میں کہا۔ عذرا گل نے قریب ہی رکھا ہوا ریڈیو کھول دیا۔ چند لمحوں بعد نیوز ریڈر کی آواز سنائی دی۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ بھارت نے مغربی پاکستان کے تمام محاذوں پر حملہ کر دیا ہے۔ پورے پاکستان میں بلیک آؤٹ کا حکم دیا گیا ہے۔ شہریوں سے استدعا ہے کہ وہ بلیک آؤٹ کی سختی سے پابندی کریں۔

"سعید بیٹے!" عذرا گل نے کہا۔ "جلدی سے تمام بتیاں بجھا دو اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ دو۔" صیاد نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اب ہال کمرے میں صرف آتش دان میں جلنے والی آگ کا ہلکا سا اجالا باقی تھا۔

"جناب والا!" وکیل صفائی نے کہا۔ "ہمیں یہ فضول کارروائی ختم کر کے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

"نہیں!" کرنل شاہ نواز نے کہا۔ "ہوائی حملے کے دوران باہر نکلنا خطرناک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہ رات حویلی کے اندر ہی گزارنی پڑے۔"

ہوائی جہازوں کی تیز آواز دوبارہ سنائی دی۔ سب سہم گئے۔ لمحہ بھر کے بعد دھماکوں کی دو تین آوازیں سنائی دیں۔ وکیل استغاثہ' عذرا گل سے سرگوشیوں میں کوئی مشورہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز کمرے کے سکوت کو توڑتی سنائی دی۔ "جناب والا! مقدمے کے تمام حقائق اب آپ کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملک نظام الدین نے اپنے معصوم بچے کو زندہ آگ میں جلا دیا تھا لہٰذا اس کے لئے ویسی ہی سزا تجویز کرتا ہوں۔ اسے اس آتش دان میں زندہ جلا دیا جائے۔ وہ دوسری ملزمہ سلمٰی ادریس ہے اس کے لئے میں سو کوڑوں کی سزا تجویز کرتا ہوں۔ تیسرا ملزم محمد طفیل

ڈرائیور ہے۔ اسے ملزم کی اعانت کے جرم میں پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی جائے۔ چوتھا ملزم ریٹائرڈ ڈی ایس پی منظور شاہ ہے۔ اسے اپنے فرائض میں کوتاہی کی بنا پر تین سال قید بامشقت کی سزا دی جائے۔ پانچواں ملزم شاہنواز ہے۔ اس نے مدعیہ پر لگائے گئے بہتان کو سچ سمجھا اور منگنی توڑ کر اسے ذہنی اور روحانی اذیت پہنچائی۔ پھر اس نے سلمٰی اویس سے شادی کرلی جو درحقیقت اس بچے کی ماں تھی جس کا الزام میری موکلہ پر لگایا گیا تھا لہٰذا میں کرنل شاہ نواز کے لیے پانچ سال قید بامشقت تجویز کرتا ہوں۔"

"ہم نے مدعیہ سمیت تمام گواہوں کو سنا۔" جج نے کہا۔ "اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ملک نظام الدین نے اپنے نوزائیدہ بچے کو آگ میں جلا کر ہلاک کر دیا تھا۔ اسی طرح دوسرے ملزموں پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بھی درست معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی بااختیار عدالت نہیں ہے اس لئے سزا کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں سنایا جا سکتا۔ لہٰذا عدالت برخاست کی جاتی ہے۔"

ابھی اس نے بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ کمرہ کسی بچے کی چیخوں سے معمور ہو گیا۔ حاضرین لرزہ براندام ہو گئے۔ ایک انجانے خوف نے انہیں اپنی اپنی جگہوں پر ساکت کر دیا۔ ملک نظام الدین کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ دفعتاً آتش دان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ایک بچے کی شبیہہ نمایاں ہونے لگی۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ساکت وصامت آتش دان میں نظر آنے والے بچے کو گھورنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نادیدہ قوت نے حاضرین کو سحرزدہ کر دیا ہو۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچہ آگ سے باہر نکلا اور ملک نظام کے کمرے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو دروازہ آرام سے کھل گیا حالانکہ ہر شخص جانتا تھا کہ دروازہ مقفل تھا۔ اندر جا کر اس نے ملک نظام کی انگلی پکڑی اور اسے آتش دان کی طرف لے چلا۔ پھر وہ سب کی نظروں کے سامنے ملک نظام سمیت آتش دان میں داخل ہو گیا۔ ملک نظام کو ایک دم شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اس کے ساتھ ہی اس کی کربناک چیخیں کمرے کی فضا میں گونجنے لگیں۔ چند منٹوں کے اندر اس کا جسم سیاہ ہو گیا اور بالآخر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا جو سوکھی لکڑیوں کی مانند چخ چخ کر جلنے لگا۔

معاً کمرے کا بیرونی دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ بچہ جو اب ایک شفاف دھوئیں کی شکل اختیار کر چکا تھا' فضا میں تیرتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔

اسی لمحے فضا ایک بچے کے مترنم قہقہے کی آواز سے معمور ہو گئی۔ سلمٰی اویس اس پُرہیبت منظر کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ عذرا گل اسے ہوش میں لانے کی

کوشش کرنے لگی اور دونوں وکیل اور جسٹس سجاد علی کمرے کے اندر جا کر اس کی مدد کرنے لگے۔

ریٹائرڈ ڈی ایس پی منظور شاہ' طفیل' کرم علی اور کرنل شاہ نواز ہنوز کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر ابھی تک خوف پایا جاتا تھا۔ اچانک کسی ہوائی جہاز کی تیز آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک زبردست ہوائی دھماکہ ہوا اور قصر سنبل کا درمیانی حصہ منہدم ہو گیا۔ جب گرد و غبار چھٹا تو عذرا کے کمرے میں موجود تمام افراد سلامت تھے۔ ان کو خراش تک نہیں آئی تھی لیکن ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے چاروں افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔ قدرت نے ان کے اعمال کی سزا انہیں دے دی تھی۔

☆------☆------☆

زندگی سے اس قدر آشنائی ہو گئی تھی کہ اب ساری دنیا کھلی کھلی لگتی تھی۔ ہر شخص اندر سے نظر آتا تھا لیکن ایک کمی ہو گئی تھی۔ انسان کا انسان سے ایک رشتہ ہوتا ہے اور یہی رشتہ رابطہ بنتا ہے۔ یہ رابطے ٹوٹ گئے تھے۔ سونو کی سیماب صفت فطرت ہو گئی تھی۔ ہیرے کے سحر نے اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ ان اجنبی کہانیوں میں کھو گئی تھی حالانکہ یہ کہانیاں بے حد دلکش ہوتی تھیں۔ ایک سے ایک سحر انگیز اور دنیا کو منکشف کرنے والی لیکن بات وہی تھی۔ ماں' سوتیلے بہن بھائی۔ اپنا عمل۔

جو سنسنی خیز داستان اس کے ذہن سے گزری تھی اس نے اسے اعصابی کھچاؤ میں مبتلا کر دیا تھا اور ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کی لابی میں بیٹھی وہ اس داستان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پُراسرار ہیرا اس کے پاس تھا۔

اچانک اس کی نظر ایک شخص کی طرف اٹھ گئی۔ عمر رسیدہ انسان تھا۔ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آ رہا تھا لباس اور چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دولت تو ہے لیکن چہرے پر غم کے سائے کھنڈے ہوئے تھے۔ اعصابی کھنچاؤ سے فوری نجات حاصل کرنے کے لیے سونو نے اسے دیکھا اور اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ یہ کون ہے۔ ایک بہت بڑے کاروبار کا مالک۔ بے شمار آدمی کام کرتے تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی لیکن شادی کو سترہ سال گزر چکے تھے اور اولاد کے آثار نہیں تھے۔ حکیم' ڈاکٹر' تعویذ' گنڈے کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سنبل صاحب نے صبا بیگم کو پوری آزادی دے دی تھی حالانکہ وہ فقیروں کے قائل نہیں تھے لیکن بیگم کی تسلی کے لئے انہوں نے یہ کڑوا گھونٹ بھی پیا تھا۔ صبا بیگم نے تو کئی بار رندھی آواز میں کہا تھا۔

"سہیل! اللہ قسم دوسری شادی کرلو۔ اف نہ کروں گی جی' اگر باندیوں کی طرح خدمت نہ کروں تو چوٹی پکڑ کر گھر سے نکال دینا۔ گھر میں شہنائیاں تو گونجیں گی۔ یہ سونا پن تو کم ہو جائے گا۔"

"توبہ! توبہ!" سہیل صاحب کان پکڑ کر کہتے۔

"اس چاند کو گہنانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ سوکن کا جلاپا کتنا کٹھن کام ہو گا۔ تم نہیں جانتیں' دوسری آئے گی تو اپنا حق جتائے گی اور بھلا میں برداشت کر سکوں گا کہ میری روح تڑپے۔ توبہ! توبہ!" ان الفاظ سے صبا بیگم کا خون سیروں بڑھ جاتا۔ شوہر کی محبت سے سرشار ہو جاتیں لیکن پھر اس محرومی کا شکار ہو جاتیں۔ سوچتیں کہ سہیل صاحب مثالی شوہر ہیں لیکن اولاد کے لئے ان کا دل بھی تڑپتا ہے۔ اس تڑپ کو کیسے دور کریں۔ کوئی بس نہیں چلتا۔

ابتدا میں یہ ناامیدی نہیں تھی۔ دیر ضرور ہو گئی تھی۔ نہ تو شوہر میں کوئی نقص تھا نہ وہ اپنے اندر کوئی کمی پاتی تھیں خود چھ بہنیں اور پانچ بھائی رکھتی تھیں اس لئے کسی موروثی بیماری کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ دونوں میاں بیوی پہلے بچے کے بارے میں اپنی پسند کا اظہار کر چکے تھے۔ سہیل صاحب لڑکے کے خواہشمند تھے اور صبا لڑکی پہ جان دیتی تھیں۔ دونوں میں اس معاملے میں شدید اختلاف تھا اور شاید یہی اختلاف بڑھ کر موجودہ شکل اختیار کر گیا تھا۔ بات لڑکا اور لڑکی میں ایسی اٹکی کہ بس اٹک کر رہ گئی اور اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اب لڑکا اور لڑکی پر بحث نہیں ہوتی تھی بلکہ دلوں میں مایوسی جاگزیں ہو گئی تھی۔ سترہ سال گزر گئے تھے جو کچھ ہونا ہوتا ہو چکا ہوتا۔ اب تو لکیر پیٹنے کی بات تھی۔ دونوں اپنی دانست میں تھک کر ہار چکے تھے۔ سہیل صاحب کہتے۔

"ارے چھوڑو۔ ہم دونوں ہی کافی ہیں۔ کیا کمی ہے زندگی میں' عیش کر رہے ہیں۔ کوئی غم' کوئی فکر نہیں ہے۔ یونہی کھاتے پیتے مرجائیں گے۔ خواہ مخواہ کا روگ کیوں دل کو لگایا جائے۔" لیکن صبا بیگم ایسے اوقات میں ان کی آواز اور الفاظ کے پس پشت پن کو صاف محسوس کرتیں اور دل مسوس کر رہ جاتیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شوہر کی اس محرومی کو کیسے دور کریں۔

اس شام اچانک بادل گھر آئے اور بارش شروع ہو گئی۔ سہیل صاحب جلدی دفتر سے گھر آ گئے۔ صبا بیگم نے پکوان چڑھا دیئے۔ برسات کا اہتمام ہونے لگا اور پھر انہوں نے گرما گرم پکوان ساتھ کھائے۔ چند لمحات کے لئے ذہن سے یہ خیال نکل گیا تھا پھر رات ہو گئی اور بارش نہ تھمی۔ سہیل صاحب باذوق آدمی تھے سرہانے کی کھڑکی کھول دی تھی اور بارش کے پانی کی پھوار جدوجہد کے بعد اندر آجاتی تھی۔ اس پھوار سے ذہن میں امنگیں جاگ رہی تھیں۔ سترہ سال پیچھے کھسک گئے تھے۔ سہیل صاحب نے مسکراتی نگاہوں سے صبا بیگم کی طرف دیکھا اور صبا بیگم کی انگڑائی ادھوری رہ گئی۔

"خدا خیر کرے۔" سہیل صاحب شرارت سے بولے اور صبا بیگم بری طرح شرما گئیں۔

"سترہ سال قبل کی وہ رات آپ کو ضرور یاد آگئی ہو گی۔" سہیل صاحب نے پوچھا۔

"کون سی رات؟" صبا بیگم نے انجان بن کر پوچھا۔

"بننے کی کوشش نہ کریں۔ میں اس رات کی بات کر رہا ہوں جس دن آپ رخصت ہو کر تشریف لائی تھیں ایسی ہی بارش ہو رہی تھی۔"

"اور تمام باراتی بھیگ کر چوہے بن گئے تھے۔" صبا بیگم کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اجی ہمیں باراتیوں سے کیا لینا۔ اپنی بات کریں۔" سہیل صاحب نے کہا اور صبا بیگم نے شرما کر اپنا چہرہ ان کی آغوش میں چھپالیا۔

"ویسے اولاد کے معاملے میں ہمارے درمیان شروع ہی سے اختلاف رہا۔ نہ جانے آپ کو لڑکیاں کیوں پسند ہیں۔ الٹی بات ہے باپ کو بیٹیوں کی خواہش ہوتی ہے اور ماں کو بیٹوں کی لیکن آپ؟"

بات مذاق کی تھی لیکن صبا بیگم اچانک اداس ہو گئیں۔ سہیل صاحب کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں کسی قدر پریشان ہو گئے۔ اتنے اچھے ماحول کو انہوں نے خواہ مخواہ خراب کر دیا تھا لیکن اب بات نباہنی بھی تھی۔

"کیا آپ کو اب بھی لڑکیاں ہی پسند ہیں؟"

"جانے دیں سہیل! کیا ذکر نکال بیٹھے۔" صبا بیگم اداسی سے بولیں۔

"میرا خیال ہے بیگم' آیئے یہ اختلاف آج ختم کر دیں۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔

"کیا مطلب؟"

"آج سے بیٹی میری پسند اور بیٹا آپ کی پسند۔" سہیل صاحب کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" صبا بیگم کی ذہنی کیفیت نہ بدل سکی۔

"بہت فرق پڑتا ہے۔ ہم زندگی کے سترہ سالوں کو اپنی عمر سے خارج کر دیتے ہیں۔ فرض کریں آپ آج ہی ہمارے گھر آئی ہیں۔"

"اللہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔"

"سچ عرض کر رہا ہوں۔ بارش کی اس رات میں ہم نئے سرے سے عزم کریں۔ بھول جائیں کہ ہم اولاد سے محروم ہیں۔ بھئی آج ہی تو ہماری سہاگ رات.........."

"خدا کے لیے کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ ساری سنجیدگی رخصت ہو گئی ہے۔" صبا بیگم نے سہیل صاحب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سہیل صاحب نے ان کی کلائی پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹ لیا۔

☆-------☆-------☆

سہیل صاحب گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو عابدہ خالہ نے راستہ روک لیا۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ عام حالات میں وہ قطعی سنجیدہ خاتون تھیں۔ دس سال سے سہیل صاحب کی نمک خوار تھیں اور "صاحب" کی عزت کرتی تھیں۔ کبھی بے تکلفی سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن آج چہرہ تھا کہ خوشی سے انگارہ ہو رہا تھا۔ کتھے چونے سے رنگے دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ سہیل صاحب نے بچ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی لیکن عابدہ خالہ اچھل کر سامنے آگئیں۔

"اندر نہیں جانے دوں گی میاں آج۔ مٹھائی کے پیسے اور جوڑے کا وعدہ کریں تب گھر کی دہلیز پار کر سکیں گے۔ اب ہی اللہ نے موقع دیا ہے۔ اللہ قسم' لیٹ جاؤں گی راستے میں' اندر نہیں جانے دوں گی۔"

"خالہ جی! وہ جونی گیا تھا کہ .... صبا کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ میں تو پریشان ہو کر آیا ہوں۔ یہ آج آپ کو کیا ہوا؟؟"

"ارے اللہ ایسی پریشانی روز روز لائے۔ اب تو میاں جی ایسا ہی ہو گا۔ مٹھائی کے پیسے اور جوڑے کا وعدہ!"

"کیسی پریشانی!" سہیل صاحب اور پریشان ہو گئے۔

"پیسے .... پہلے پیسے بعد میں دوسری بات۔"

"یہ پرس پکڑیئے اور جتنے پیسے چاہیں نکال لیجئے لیکن اللہ کے واسطے یہ تو بتا دیں کہ صبا کیسی ہے؟" سہیل صاحب نے جیب سے پرس نکال کر عابدہ خالہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

متلیاں ہو رہی ہیں' چکر آ رہے ہیں۔ میں نے علاج کر دیا ہے۔ اچار ہوتا ہے ایسے وقتوں کا علاج ارے جونی .... اللہ ساڑھے پانچ سیر مٹھائی لا .... اللہ جانتا ہے۔ اکیلا گھر دیکھ کر کیسا دل کڑھتا تھا۔ زبان نہیں کھلتی تھی کہ بی بی کا دل میلا ہو گا۔ سن ہی لی میرے رب نے۔" خالہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ سہیل صاحب کی سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا لیکن یقین کس طرح کرتے۔ رک کر خالہ کی شکل دیکھنے لگے۔

"خالہ جی کیا وہی بات ہے جو میں سمجھ رہا ہوں یا کوئی غلط فہمی ہے۔"

"غلط فہمی .... میاں بدفال نہ نکالو منہ سے۔ اللہ نہ کرے جو غلط فہمی ہو۔ آٹھ سال تک دائی کا کام کیا ہے۔ چونڈا منڈوا دوں گی اگر جھوٹ نکلے تو۔ جوڑے کے پیسے یوں ہی نہیں مانگ رہی!" عابدہ خالہ نے کہا اور سہیل صاحب کا دل انجانی مسرت سے دھڑک اٹھا۔

"اب تو اندر جانے دیں خالہ جی۔" وہ عاجزی سے بولے۔

"اللہ سلامت رکھے اندر جانے والوں کو۔ جم جم جاؤ میاں' یہ لو بٹوا رکھو۔ مالکوں کی چیز ان کی جیب میں ہی بھلی لگتی ہے۔" خالہ نے پرس سہیل صاحب کی طرف بڑھا دیا اور سہیل صاحب نے سو روپے کا نوٹ نکال کر عابدہ خالہ کو دے دیا۔

"ارے بس دل خوشی سے جوان ہو گیا تھا۔ میاں! آپ کا ہی دیا کھا پہن رہی ہوں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔" خالہ راستے سے ہٹ گئیں اور سہیل صاحب پُروقار انداز میں آگے بڑھے۔ پھر پلٹ کر دیکھا اور کسی کو موجود نہ پا کر دوڑ کر غڑاپ سے صبا بیگم کے کمرے میں گھس گئے۔ صبا بیگم مسہری پر دراز تھیں۔ چہرے پر پیلاہٹ' بال پریشان' لیکن سہیل صاحب کو دیکھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"صبا .... صبا کیسی ہو؟" سہیل صاحب نے مسہری پر بیٹھ کر ان کا بازو پکڑ لیا۔

"ٹھیک ہوں' بس یونہی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔" صبا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"یونہی .... اور وہ عابدہ خالہ ....؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں گی۔" صبا بیگم آنکھیں بند کئے مسکرا دیں اور سہیل صاحب ان پر لد گئے۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں گی اور یہ انکشاف آپ اتنے غیر اہم لہجے میں ...."

"اللہ اللہ سنبھل کر بیٹھئے .... آپ کو خدا کی قسم گدگدی نہ کریں۔ اب آپ کو احتیاط کرنا ہو گی۔" صبا بیگم نے شرماتے ہوئے کہا اور سہیل صاحب کے گدگدیوں کے

لئے بڑھنے والے ہاتھ رک گئے۔ وہ چٹنے لگے تھے۔

"بہتر ہے جناب! احتیاط کریں گے .... سخت احتیاط کریں گے لیکن للہ یہ خوشخبری ایک بار اپنے منہ سے بھی سنا دیجئے۔"

"آپ تو بچوں کی طرح چونچلے کرنے لگے۔ عابدہ خالہ جہاندیدہ ہیں۔ یہ دیکھئے نہ جانے کہاں سے ڈھیر سارا اچار اٹھالائیں لیکن واقعی فائدے کی چیز ہے۔"

اور صبا بیگم فائدے کی چیز استعمال کرتی رہیں۔ احتیاط کرتی رہیں۔ دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ رات کو دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ صبا بیگم کے حمل کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ اس کی تصدیق شہر کی ایک تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر نے بھی کر دی تھی۔ سہیل صاحب نے مستقلاً اس لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ ہر ہفتہ معائنہ ہوتا تھا۔ ہدایات جاری کی جاتی تھیں اور ان ہدایات پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ عابدہ خالہ اپنے پورے تجربے کے ساتھ صبا بیگم کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

یوں تو کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن صبا بیگم اولاد کی خواہش اس قدر شدت سے رکھتی تھیں کہ بہت سی انوکھی کیفیات کا شکار ہو گئی تھیں۔ ان کیفیات میں وسوسے ایک خاص اہمیت رکھتے تھے۔ وہ مختلف باتیں سوچتی رہتی تھیں۔ ننھے ننھے کپڑے سیتی رہتی تھیں حالانکہ بے شمار سینے والے موجود تھے لیکن یہ کام وہ اپنے ہاتھوں سے کر کے بے حد خوشی محسوس کرتی تھیں۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ننھا منا وجود ان کی آغوش میں ہے اور وہ اسے ہلکورے دے رہی ہوں لیکن سارے کے سارے لباس لڑکی کے ہوتے۔ کوئی کپڑا ایسا نہ تھا جو کسی لڑکے کو پہنایا جا سکے۔ ایک بار عابدہ خالہ اس سلسلے میں اپنی بے عزتی کروا بیٹھی تھیں۔ نہ جانے کیسے پھوئی زبان سے نکل گیا۔

"صبا بی بی! یوں لگتا ہے جیسے آپ کو لڑکی ہونے کا یقین ہو۔"

"کیا مطلب!" صبا بیگم نے یوں پوچھا جیسے ساری دنیا میں اب تک لڑکیاں پیدا ہوتی رہی ہوں اور لڑکے کے وجود کا تصور ہی نہ ہو۔

"تھوڑے سے کپڑے لڑکے کے لئے بھی تو سی لیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا ...."

"عابدہ خالہ ...." صبا بیگم غصے سے سرخ ہو گئیں۔ "کیا بکواس کر رہی ہیں آپ۔ آپ کو شرم نہیں آتی ہمارا ہی نمک کھاتی ہیں اور ہماری ہی بدخواہ۔"

"یہ بدخواہی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہمیں بچی کی آرزو ہے اور آپ بیٹے کی بات کر رہی ہیں۔"

"اللہ تمہاری آرزو پوری کرے بی بی! لیکن تعجب کی بات ہے۔ ساری دنیا بیٹے کی آرزو کرتی ہے۔ بچی کیا ہے' پرایا دھن ہوتی ہے۔ ساری زندگی پالو' پوسو' ناز نخرے اٹھاؤ اور دوسرے کے حوالے کر دو۔ بیٹے سے نسل چلتی ہے۔"

"ہم اتنے مجبور نہیں ہیں کہ بچی کو دوسرے کے حوالے کر دیں۔ ہمارے پاس اتنا کچھ موجود ہے کہ ہم گھر داماد رکھ سکتے ہیں۔ سینکڑوں نوجوان اس کے لیے تیار ہو جائیں گے۔" صبا بیگم نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"اللہ مرادیں پوری کرے بی بی! جو تمہاری پسند وہی ہماری۔ خدا تمہاری بچی کی آرزو پوری کرے۔" عابدہ خالہ نے کہا اور خاموش ہو گئیں لیکن صبا بیگم کے ذہن میں ایک وسوسہ جاگ اٹھا تھا۔ اگر واقعی بیٹا پیدا ہو گیا تو کیا ہو گا۔ انہیں تو بچی کی شدید آرزو تھی۔ ایک ننھی سی کومل سی' منی سے گڑیا' جسے وہ حسین حسین کپڑے پہنائے جس کے خوبصورت بالوں میں پیار سے کنگھی کرے۔

اور یہ وسوسہ رات کو ان کی زبان پر آ گیا۔ وہ سہیل صاحب کے بازو پر سر رکھ کر لیٹی تھیں۔ سہیل صاحب بھی کسی سوچ میں گم تھے۔

"نیند آ رہی ہے آپ کو؟" انہوں نے پوچھا اور سہیل صاحب چونک پڑے۔

"نہیں' بالکل نہیں۔ کیوں؟"

"پھر کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں' بس کچھ کاروباری باتیں ذہن میں آ گئی تھیں۔"

"کاروبار کو آپ باہر چھوڑ کر آیا کریں۔ یہاں آپ کا ذہن صرف میرے لئے ہونا چاہئے۔"

"بہتر سرکار عالی!" سہیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتائیے۔"

"ارشاد!"

"ہمارے ہاں لڑکا ہو گا یا لڑکی۔"

"سو فیصدی لڑکی۔"

"کیوں آپ یہ بات پورے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں۔"

"اس کی ایک خاص وجہ ہے۔"

"کیا؟" صبا بیگم نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ کہ اس سلسلے میں تمہارے اور ہمارے درمیان سمجھوتا ہو چکا ہے اور اس سمجھوتے کے نتیجے میں ...."

"پھر شرارت پر اتر آئے۔ سچ بتائیں آپ کا کیا خیال ہے؟؟"

"بھئی میں تو اس وجود سے پیار کرتا ہوں جو میرے گھر میں آنکھ کھولے گا۔ لڑکا ہو یا لڑکی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"خدا کے لئے آپ تو ایسا نہ کہئے۔ میں صرف لڑکی چاہتی ہوں۔ مجھے لڑکے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے آپ کی اس خواہش پر ذرا بھی اعتراض نہیں ہے۔ باقی معاملات اللہ بہتر جانتا ہے۔"

"آج اس کم بخت عابدہ نے بھی ہولا دیا۔ منحوس فال منہ سے نکل رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ماں باپ بیٹے کی آرزو کرتے ہیں' بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔"

"بات تو وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا لیکن پھر میں آپ سے متفق ہو گیا۔ میرا تو خیال ہے کہ اپنی بیٹی کا نام ہی سمجھوتہ رکھ لیں۔"

"یقین کریں اب مجھے تو یہ خوف ہونے لگا ہے کہ اگر لڑکا ہو گیا تو کیا ہو گا؟؟"

"کچھ نہیں ہو گا۔ آپ آرام سے سو جائیں۔" سہیل صاحب نے کہا مگر دونوں میں سے کوئی نہ سو سکا۔ سہیل صاحب صبا کے اس جنون کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ یہ جنون اب حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگر واقعی لڑکا پیدا ہو گیا تو صبا بیگم کی کیفیت کافی خراب ہو جائے گی۔ اس جنون کا کیا حل ہو؟ دوسری طرف صبا بیگم بھی اسی سوچ میں تھیں اگر لڑکا ہو گیا تو کیا ہو گا؟

اور یہ خوف وقت ولادت کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ عابدہ خالہ نے پیٹ دیکھ کر سہیل صاحب سے پورے اعتماد سے کہا تھا کہ لڑکا ہو گا۔

اور لڑکا ہی ہوا۔ اذیتوں کے بعد سکون کی پہلی منزل پر قدم رکھتے ہی صبا بیگم نے یہی سوال کیا تھا اور جو نرس ان کی خدمت میں مامور تھی اس نے ان کی ذہنی کیفیات سے بے پروا ہو کر جواب دیا۔

"لڑکا........" اور صبا بیگم کو چکر آ گیا۔ انہوں نے دہشت زدہ نگاہوں سے اپنے قریب لیٹے ہوئے ننھے وجود کو دیکھا جو دودھ کی طرح سفید تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دفعتاً ان کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ یہ ان کے بیٹے کا ٹکڑا ہے۔ یہ ان کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ کیا ہوا اگر ایک لڑکا ہے۔ میں اسے لڑکی بنا کر پرورش کروں گی۔ بالکل لڑکی بنا کر۔ انہوں نے سوچا۔

سہیل صاحب کو لڑکے کی اطلاع سن کر دلی مسرت کا احساس ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے انہیں صبا کا خوف دامن گیر ہو گیا اور انہوں نے گھبرا کر اطلاع دینے والی نرس سے پوچھا۔ "صبا بیگم کو اس کی اطلاع ہو گئی۔"

"کس کی ....؟" نرس نے شرارت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھی کہ ناتجربہ کار حضرت پیدائش کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔

"میرا مطلب ہے لڑکے کے بارے میں۔"

"ظاہر ہے ان کو اطلاع نہیں ہو گی۔"

"وہ ٹھیک ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔" نرس نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اگر زیادہ عمر میں بچہ ہو تو بچے کے باپ ایسے ہی سوال کرتے ہیں اور عام نوجوانوں سے زیادہ مضطرب ہوتے ہیں۔

پھر سہیل صاحب دھڑکتے دل کے ساتھ صبا کے پاس پہنچے۔ صبا بیگم نے پیار بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"کیسی ہو صبا؟"

"ٹھیک ہوں۔ آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔"

"نہیں صبا! مجھے آپ کی خوشی نہ ہونے کا دکھ ہے۔"

"اور مجھے آپ کی خوشی پوری ہونے کی خوشی ہے۔" صبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سہیل صاحب نے سکون محسوس کیا تھا ورنہ ان کا خیال تھا کہ کہیں صبا کی طبیعت بگڑ نہ جائے۔ وہ لڑکی کے سلسلے میں سخت جذباتی تھیں۔

لیکن پہلے ہی دن صبا کے جنون کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس نے لڑکے کو نہایت خوبصورت فراک پہنائی تھی۔ کپڑے تو سبھی لڑکیوں کے لئے تھے۔ وہی کپڑے استعمال کئے جانے لگے اور پھر صبا بیگم گھر آ گئیں۔ اپنے ساتھ بے شمار خوشیاں لائی تھیں۔ دونوں نے دل کھول کر ہنگامے کئے۔ انعامات وصول کئے۔ صبا بیگم بظاہر خوش نظر آتی تھیں لیکن

کبھی کبھی کبیدہ خاطر نظر آنے لگتی تھیں۔

"پریشان کیوں ہوتی ہو صبا۔ اب تو سلسلہ چل نکلا ہے۔" سہیل صاحب نے ایک دن شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس بار لڑکی سہی۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے خدا کو میری آرزو پوری کرنی منظور نہ ہو۔ پہلے بچے کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔" صبا بیگم نے جواب دیا۔

"بھئی اب تو یہ خدا کی ناشکری ہے۔ تم اسے لڑکی ہی سمجھو۔ یوں بھی وہ بے چارہ ابھی تک لڑکیوں کے لباس پہن رہا ہے۔"

"ہاں وہ میری بیٹی ہے۔ وہ میری بیٹی ہی ہے۔" صبا بیگم نے کہا۔

"نام کیا رکھو گی اپنی بیٹی کا۔ کئی دن کی ہو گئی۔ ابھی تک آپ نے نام ہی تجویز نہیں کیا۔"

"صولت۔" صبا بیگم نے کہا اور سہیل صاحب ہنس پڑے۔ "چلو اردو زبان کی یہ لچک ہمارے کام آ گئی۔ یہ نام لڑکی اور لڑکے دونوں میں چلے گا۔ تو پھر یہ نام ہے؟"

اور یوں صولت کا وجود ایک ٹھوس حیثیت اختیار کر گیا۔ صبا کو واقعی لڑکی کا جنون تھا۔ کوئی دوست لڑکے کا لباس لاتا تو صبا بیگم اسے اٹھا کر پھنکوا دیتیں۔ وہ صولت کے لئے لڑکیوں کا لباس ہی پسند کرتی تھیں۔ سہیل صاحب نے بھی اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ فرق ہی کیا پڑتا تھا ابھی صولت چند ماہ کا تھا بڑا ہو گا تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ ان کی خواہش تھی کہ ایک لڑکی ضرور پیدا ہو جائے تاکہ صبا بیگم کی حسرت پوری ہو جائے لیکن صولت نے اپنے بعد کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ایک سال کا ہوا پھر دو سال کا اور پھر تیسرے سال میں پڑ گیا۔ سہیل صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ شاید اب پھر سترہ سال اپنی عمر میں کم کرنے پڑیں گے۔ ویسے صبا بیگم مطمئن نظر آتی تھیں۔ صولت کو بالکل لڑکی کی طرح پرورش کیا جا رہا تھا۔ خوبصورت فراکوں اور حسین ترین لڑکیوں کے لباس' تین سال کی زندگی میں اس نے ایک بار بھی لڑکوں کا لباس نہیں پہنا تھا۔ اس کے بال لڑکیوں کے انداز میں ترشوائے جاتے۔ ان میں ربن باندھے جاتے اور اکثر انجان دوست یہ سوچ بھی نہ پاتے کہ وہ لڑکا ہے عموماً ان کے جاننے والے صولت کو لڑکی ہی سمجھتے۔

سہیل صاحب کے ذہن میں کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کی بیگم کا یہ جنون

کسی طور تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ پھر صولت کو نرسری میں داخل کراتے وقت تھوڑی سی دقت پیش آئی۔ اسکول میں حقیقت بتانی پڑی تھی۔

"ارے .... لیکن .... یہ کیسے ممکن ہے؟" اسکول کے سربراہ نے کہا اور تعجب سے صولت کو دیکھنے لگے جو سو فیصدی لڑکی لگتا تھا۔

"کوئی خاص حرج ہے جناب!" سہیل صاحب نے پوچھا۔

"ابھی تو کوئی حرج نہیں۔ چار سال کے بچے کی حیثیت ہی کیا لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا ہے۔"

"بس کیا بتاؤں میری بیگم کا جنون ہے۔"

"یہ جنون کب تک جاری رہ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ حقیقت کو اپنائیں۔ میں اس کا نام لڑکوں کے رجسٹر میں لکھوں گا۔"

"اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن براہ کرم لباس کے معاملے میں آپ تھوڑی سی چھوٹ دیں۔ ابھی چند سالوں میں اسے لڑکیوں کے لباس میں ہی رہنے دیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی لیکن یہ صورت حال آپ کے لئے ہی تکلیف دہ بن جائے گی۔ بچے کے ذہن پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ لڑکیوں کے انداز میں ہی بولتا ہے۔ آپ سوچئے اگر اسے عادت پڑ گئی تو کیا ہو گا؟؟"

"میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ کی مرضی۔" اور صولت کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جس نے دیکھا اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ یوں صولت اسکول میں پڑھنے لگا۔ اسکول کے ماسٹر اسے لڑکوں کی حیثیت سے مخاطب کرتے تو صولت کی آنکھوں میں حیرت ابھر آتی۔ وہ لڑکیوں کی طرح بولتا تو اسے منع کیا جاتا اور وہ الجھن میں پڑ جاتا۔ کئی بار اسے سرزنش کی گئی اور اس نے خوفزدہ ہو کر لڑکوں کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ گھر میں وہ عادتاً لڑکیوں کی طرح گفتگو کرتا اور اسکول میں ڈانٹ ڈپٹ کے خوف سے لڑکوں کی مانند۔ اس طرح اس کی شخصیت الجھتی چلی گئی۔ بمشکل تمام ایک سال اسکول میں گزرا ہو گا کہ ایک دن گھر میں بھی لڑکوں کی طرح بول اٹھا اور صبا بیگم سن رہ گئیں۔

"صولت۔" انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"جی امی!"

"ابھی تم نے کیا کہا تھا۔ تم یہ کام کرو گے۔"

"امی میں لڑکا ہوں یا لڑکی۔ گھر میں لڑکوں کی طرح بولتا ہوں تو آپ ناراض ہوتی ہیں اسکول میں لڑکیوں کی طرح بات کرتا ہوں تو سر ناراض ہوتے ہیں۔"

"سر ناراض ہوتے ہیں! انہیں کیا حق ہے ناراض ہونے کا۔" صبا بیگم غصے سے بولیں۔

"امی میرے لباس کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لڑکے مجھے دیکھ کر عجیب سے انداز میں ہنستے ہیں اور لڑکیاں بھی۔"

"اونہہ .... ہنسنے دو .... ہماری مرضی جو چاہے کریں۔ ویسے صولت تمہیں کون پسند ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"

صبا بیگم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے!" پانچ سالہ صولت نے الجھتے ہوئے کہا۔

"لڑکیاں۔" اور صبا بیگم خوشی سے اچھل پڑیں۔

"میں جیت گئی۔ میری لڑکی ہے۔ کرلے کسی کو کچھ کرنا ہو۔" انہوں نے پیار سے صولت کو سینے سے لگالیا اور پھر انہوں نے اس کے بال بنائے۔ ربن باندھے۔ یوں بھی جی نہ بھرا تو خوب میک اپ کیا اور خوبصورت بچہ بے حد حسین نظر آنے لگا۔ اسی دوران سہیل صاحب بھی واپس آگئے۔ صولت کو اس روپ میں دیکھ کر آج وہ بیوی کی خوشی میں خوش نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ صبا بیگم نے تھوڑی ہی دیر کے بعد سہیل صاحب کی خاموشی کو محسوس کرلیا اور انہیں بغور دیکھتی ہوئی بولیں۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"نہیں۔" سہیل صاحب نے ان سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔

"پھر بھی۔ ضرورت سے زیادہ خاموش ہیں۔"

"بس یونہی طبیعت الجھ رہی تھی۔ چائے پلواؤ۔" سہیل صاحب نے آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی منگواتی ہوں۔" صبا بیگم جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آئی اور سہیل صاحب چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

"یہ اسکول ماسٹروں کو کیا پڑی ہے کہ ہمارے معاملوں میں ٹانگ اڑائیں۔ ہماری اولاد ہے۔ اسے لڑکوں کی طرح پرورش کریں یا لڑکیوں کی طرح۔ آپ ذرا کل صولت کے اسکول جاکر ان سے بات کریں۔"

"کوئی خاص بات ہوئی کیا؟" سہیل صاحب نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں آج ہی صولت بتا رہی تھی کہ اسے لڑکوں کی طرح بولنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔"

"لیکن آپ کو یہ سب کچھ عجیب نہیں لگتا صبا بیگم۔" سہیل صاحب نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ....؟"

"کہ وہ لڑکا ہے اور آپ اسے لڑکی کی حیثیت سے مخاطب کرتی ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا جاننے والا ہر فرد ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔"

"ارے تو اولاد ہماری ہے یا ان کی؟ کمال ہے لوگوں کو دوسروں کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں رہتی ہے؟"

"صولت اب اسی دنیا کا فرد ہے بیگم! آج بچہ ہے کل بڑا ہو گا۔ آپ اس کی شخصیت کو مسخ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہیں۔"

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے تو آج تک میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھا ہے۔ میری اتنی سی خوشی آپ کو گوارہ نہیں ہے۔"

"آپ کی یہ خوشی صولت کو تباہ کردے گی۔"

"اللہ نہ کرے میری بچی کو کچھ ہو۔ کوسنے تو نہ دیں اسے۔"

"صبا .... صبا .... خدا کے لئے حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ وہ لڑکی نہیں ہے، لڑکا ہے۔ کل معاشرے میں اس کا کوئی مقام ہو گا۔ کل وہ دنیا کے سامنے جائے گا۔ آپ اسے کیا بنا رہی ہیں۔"

"کل جائے گی، آج تو نہیں۔ آج کی خوشیاں آپ مجھ سے کیوں چھین رہے ہیں۔" صبا بیگم کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور سہیل صاحب کے چہرے پر جھلاہٹ نمودار ہو گئی۔

"بلاوجہ رو رہی ہیں آپ ایک فضول بات پر۔ پانچ سال سے میں نے آپ کی اس کارروائی میں مداخلت نہیں کی لیکن اب یہ مذاق سنگین حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔ آج اسکول ماسٹروں پر اعتراض ہے آپ کا کل ساری دنیا پر ہو گا" دنیا آپ کے اس جنون سے

واقف نہیں ہے۔ خدا کے لئے اب اسے اس کا اصلی روپ دے دیجئے۔ اب اس کی عمر اس منزل میں داخل ہو رہی ہے جہاں انسان اپنی ذات کا تعین کرتا ہے۔"

"جو آپ کا دل چاہے وہ کریں۔ جب خود آپ نے میری نہ سنی تو دنیا کیا سنے گی۔" بیگم باقاعدہ رونے لگیں اور سہیل صاحب جھلا کر اٹھ گئے۔

"بہتر ہے آج آپ جی بھر کر رو لیں۔ میں برداشت کرلوں گا مگر کل سے اس گھر میں یہ کھیل نہیں ہو گا۔" وہ باہر چلے گئے اور صبا بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس شام گھر کی فضا سوگوار رہی۔ رات کے کھانے پر نہ تو صبا بیگم آئیں اور نہ سہیل صاحب! دونوں الگ الگ کمروں میں منہ لپیٹے پڑے رہے پھر دوسری صبح سہیل صاحب ناشتہ کئے بغیر اسٹور چلے گئے۔ صبا بیگم بھی ضرورت سے زیادہ بگڑی ہوئی تھیں۔

لیکن وہ دوپہر بے حد خوفناک تھی۔ شاذ و نادر ہی ان دونوں کے درمیان ایسی ناراضگی ہوئی تھی کہ چند گھنٹے گزر جائیں لیکن اب تو بہت وقت گزر گیا تھا۔ گیارہ بجے دن کو ہی صبا بیگم کے پیٹ میں ہول اٹھنے لگے۔ طرح طرح کی ترکیبیں سوچنے لگیں۔ شوہر کو منانے کی کوئی بات ذہن میں نہیں آتی تھی۔ ناشتہ بھی نہیں کر کے گئے اس بات پر ان کا دل مسوس رہا تھا۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا لیکن ان کی ضد بھی تو بے جا تھی۔ اگر صولت لڑکیوں کی طرح پرورش پا رہا ہے تو اس سے لوگوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہماری اولاد ہے۔ جس طرح چاہیں پرورش کریں۔ کتنے دنوں کی بات ہے۔ حقیقت کو کون روک سکتا ہے۔ بڑا ہو جائے گا تو اصلیت کی طرف ہی جائے گا۔ خود سب کچھ بدل جائے گا۔ اگر تھوڑے دن تک وہ اپنے دل کی حسرت پوری کریں گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ یہ تو زیادتی ہے۔ خدا نے بیٹی کی آرزو پوری نہیں کی۔ دنیا والے یہ وقتی خوشی چھیننے کے درپے ہیں۔ ہونہہ۔ ان کی مانے گا کون لیکن سہیل صاحب .... وہ ان دنیا والوں کے ساتھ کیوں شریک ہو گئے ہیں۔ وہ تو ان کے شوہر ہیں۔ قدم قدم پر ان کی نازبرداری کرنے والے۔ ذہن میں ایک خیال جم گیا تھا۔ سہیل صاحب تو شروع ہی سے بیٹے کے خواہشمند تھے۔ دل ہی دل میں تو خوش ہوں گے اوپری دل سے سوچ رہے ہوں گے کہ چلو' صبا بیگم بیوقوفی کر رہی ہیں۔ کرنے دو لیکن اب وہ صبا بیگم کے اس شوق سے اکتا گئے تھے اور دنیا والوں پر رکھ کر دل کی بات کہنا چاہتے تھے۔ کہوں گی تو سہی ان سے کہ سہیل! دنیا کا نام کیوں لیتے ہو۔ اپنے دل کی بات کہو۔ یوں کہو کہ تمہیں میری آرزو سے اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے کرتے رہے ہو۔

لیکن دوپہر .... دوپہر کو کھانے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا کہ اسٹور کا منیجر عمران علی اترا چہرہ لئے گھر میں داخل ہوا اس نے براہ راست صبا بیگم سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔

"کیسے ہیں عمران بھائی؟"

"ٹھیک ہوں بیگم صاحب .... وہ ...." منیجر کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"میں سمجھ گئی۔" صبا بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی۔"

"بس یونہی ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ بگڑ گئے ہیں۔ کیا کہا آپ سے۔ سچ کہیں کیا انہوں نے نہیں بھیجا آپ کو۔ میں خوب جانتی ہوں سہیل کو۔"

"آپ نے درست فرمایا بیگم صاحب! اس بار سہیل صاحب ضرورت سے زیادہ بگڑ گئے ہیں۔" عمران علی نے کہا اور رو پڑا۔ صبا بیگم نے حیران نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"ارے کیا ہوا عمران بھائی!"

"بیگم صاحب! سہیل صاحب اتنے سخت ناراض ہو گئے ہیں کہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ناراض ہو گئے ہیں' بیگم صاحب!"

"کیا .... کیا کہہ رہے ہیں آپ .... میری تو .... میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔" بیگم صاحب کے بدن میں تشنج ہونے لگا۔

"صبح کو .... دفتر جاتے ہوئے .... وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ ایک شدید حادثے کا شکار ہو گئے اور ہسپتال جا کر دم توڑ دیا۔ بیگم صاحب میں بدنصیب آپ کو یہ خبر سنانے آیا ہوں۔"

"سہیل .... ختم ہو گئے ...." صبا بیگم کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ پچھاڑ کھا کر گھومیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ چیخ کی آواز عابدہ خالہ نے سن لی اور دوڑی ہوئی آگئیں۔ پوری خبر سنتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔

دل تو سب کے دکھ گئے تھے لیکن دل پر صرف صبا بیگم کے لگی تھی۔ ہوش میں آتیں۔ سہیل صاحب کا نام پکارتیں اور پھر بے ہوش ہو جاتیں۔ نوکر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ پانچ بجے میت آگئی۔ چھ بجے دفن ہو گئے۔ اتنی سی بات تھی' اتنی سی کہانی تھی۔ صرف تذکرے رہ گئے' وجود فنا ہو گیا۔ صبا بیگم ایک دم بوڑھی ہو گئیں۔ شوہر کے ساتھ

جوانی بھی رخصت ہو گئی۔ غم کی کیا ہے' جب تک چاہو کرتے رہو۔ زخم ہوں تو ٹیس رہتی ہی ہے۔

دن' مہینے اور سال گزر گئے۔ اب تو تذکرے بھی ختم ہو گئے تھے۔ ملازمین وفادار تھے۔ اسٹور اسی طرح چل رہا تھا۔ عمران علی آنہ پائی کا حساب دیتے تھے۔ ایسے وفادار بھی قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ کسی نے بیگم صاحب کو سہیل صاحب کی عدم موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہمدردوں کو اختلاف تھا تو بس صولت کی پرورش پر۔ صولت نو سال کا تھا یا تھی' اس کی فطرت میں زنانہ پن پختہ ہو گیا تھا۔ اسکول تو اس دن کے بعد سے گیا نہیں تھا جس دن سہیل صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ بھلا صبا بیگم اپنی بچی کو ایسے لوگوں کے درمیان کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔ جو اس کا ذہن خراب کرتے تھے۔ چنانچہ بی صولت لڑکیوں کی طرح پرورش پا رہی تھیں۔ بال خوب لمبے اور گھنے تھے۔ آنکھوں میں سرمے کی لکیریں کھنچی رہتی تھیں۔ پان کھانے کی شوقین ہو گئی تھیں۔ تعلیمی مشغلہ گھر پر ہی جاری ہو گیا تھا۔ میڈم شگفتہ پڑھانے آتی تھیں اور ان سے صولت کو پڑھتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ابتدا میں بڑے دلچسپ واقعات پیش آتے تھے۔ بے چاری میڈم شگفتہ حقیقت سے بے خبر تھیں اور جب فیس عمدہ ہو تو حقیقتوں کی چھان بین کون کرتا ہے۔ وہ صولت کو لڑکی سمجھ کر ہی پڑھاتی تھیں۔ گھر کا ایک ایک ملازم اسے لڑکی کی حیثیت سے مخاطب کرتا تھا۔ پھر ان بے چاری کو کیسے معلوم ہوتا کہ وہ لڑکی کو نہیں لڑکے کو پڑھا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دیکھتیں کہ صبا بیگم صولت سے کسی طرح کا پرہیز نہیں کرتی تھیں۔ اس کے سامنے لباس وغیرہ تبدیل کر لیتی تھیں لیکن ایک دن اچانک یہ انکشاف ہو گیا اور میڈم کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ سکتے میں آ گئیں۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھر وہ پاگلوں کی طرح صبا بیگم کی طرف دوڑیں۔

"بیگم صاحب .... بیگم صاحب غضب ہو گیا۔ بیگم صاحب صولت ......!" اور صبا بیگم کے ہاتھ سے سروتہ چھوٹ گیا۔

"کیا ہوا میری صولت کو؟" انہوں نے زرد چہرے کے ساتھ پوچھا۔

"وہ .... وہ لڑکی .... لڑکا بن گئی ہے۔ مکمل لڑکا۔ آپ یقین کریں بیگم صاحب! وہ .... وہ ....!" میڈم شگفتہ سے کہتے نہ بن پا رہا تھا۔

صبا بیگم کے چہرے سخت جھنجلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

"اے کیا تم باؤلی ہوئی ہو۔ خواہ مخواہ مجھے ہولا دیا۔"

"خدا کی قسم بیگم صاحب آپ میری بات پر یقین کریں۔ میں نے خود .... میں نے ...."

"افوہ .... جاؤ بابا اپنے کام سے کام رکھو۔ وہ جو کچھ بھی ہے ٹھیک ہے۔" صبا بیگم کو میڈم شگفتہ کی بدحواسی پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔

"لیکن وہ ...."

"وہ لڑکا ہی ہے اور میں نے اسے لڑکیوں کی طرح پرورش کیا ہے' سمجھیں اور میں اس معاملے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی' سمجھیں۔ ارے میری مرضی' میری اولاد ہے جس طرح چاہوں اسے رکھوں۔ لوگوں کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے .... آپ کو ....!!" میڈم شگفتہ نے حیرت سے کہا۔

"اور کیا تمہیں معلوم ہو گا۔"

"لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا بیگم صاحب! آپ نہیں جانتیں کہ اس طرح تو .... اس طرح تو اس کے ذہن پر بڑے خوفناک اثرات مرتب ہوں گے۔"

"کیا اثرات مرتب ہوں گے؟"

"وہ اپنی ذات میں الجھ جائے گا۔ وہ اپنی شخصیت کو پہچان نہیں سکے گا۔ معاف کیجئے گا آپ نے اپنے شوق میں اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"میں نے ساری دنیا پر ظلم کیا ہے تو پھر ساری دنیا ہی مجھے پھانسی پر چڑھا دے۔ تم بھی چڑھا دو۔ میں کہتی ہوں تم لوگ اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے۔ فضول باتوں میں کیوں الجھتے ہو۔ آپ بھی کان کھول کر سن لیں میڈم! آپ کو وہی کرنا ہے جو میں چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیگم صاحب! ٹھیک ہے۔" میڈم نے افسوس سے کہا اور اس کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کر لی لیکن صولت کو پڑھاتے ہوئے وہ سخت ذہنی انتشار کا شکار رہتی تھیں۔ جان بوجھ کر ایک لڑکے کو لڑکی کے انداز میں مخاطب کرنا بڑی عجیب بات تھی لیکن کون اتنی عمدہ آمدنی کو چھوڑنا پسند کرتا ہے۔ تین سال تک انہوں نے صولت کو پڑھایا۔ صولت عموماً قمیض شلوار میں رہتا تھا۔ ایک سے ایک نفیس لباس' تقاریب میں وہ غرارے قمیض میں ہی نظر آتا تھا۔ انتہائی خوبصورت تھا۔ چہرے پر پوری پوری نسوانیت تھی۔ اس لئے بیشتر لوگوں کو اس پر کوئی شبہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی دوست بھی لڑکیاں ہوتی تھیں اور وہ ان کے درمیان خوش رہتا۔

لیکن زندگی کا چودھواں سال الجھنوں کا سال تھا۔ اب اس کی مسیں بھیگنے لگی تھیں اور زنانہ لباس میں اب وہ بے حد مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔ صبا بیگم کو بھی اب اس کا احساس ہونے لگا تھا۔ ان کا شوق بھی پورا ہو چکا تھا۔ لڑکے کو کب تک لڑکی بنا کر رکھ سکتی تھیں۔ آخر ایک دن تو حقیقت کا لباس پہننا تھا۔ چنانچہ ایک دن عمران علی سے گفتگو ہو گئی۔

"صولت کے لئے کسی ماسٹر کا بندوبست کریں عمران صاحب۔ دو سال سے یونہی ہے۔ نہ جانے ان اسکول والوں کو مجھ سے کیا کسر ہے' امتحان میں بٹھانے کے لئے اسے لڑکے کی حیثیت سے ہی پیش کرنا ہوگا۔ کم از کم میٹرک تو کر لے۔"

"زبان کھولنے کی اجازت دیں بیگم صاحب تو کچھ عرض کروں۔" بے چارے عمران علی نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ہاں کہیں ...."

"خدا تعالیٰ رحم کرے' صولت میاں پر وہ بڑے خوفناک راستے پر آ گئے ہیں۔ دیکھئے آپ کا نمک کھایا اس لئے اتنی جسارت کر رہا ہوں ورنہ ...."

"مگر ہوا کیا' ایسی کون سی خوفناک بات ہو گئی۔"

"وہ خود کو لڑکی سمجھتے ہیں اور یہ بات اب ان کے ذہن میں جم گئی ہے کہ وہ لڑکی ہیں۔"

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ اب وہ سمجھ دار ہو گیا ہے خود کو پہچاننے لگا ہے۔"

"خدا کے لئے کوشش کریں بیگم صاحب! آج سے تہیہ کر لیں کہ انہیں ان کی اصل شخصیت سے روشناس کرائیں گی۔"

"آپ سب نہ جانے کیوں پریشان ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات کبھی نہیں آئی۔ وہ لڑکا ہے۔ وہ لڑکا ہی رہے گا۔ ہمارے کچھ کرنے سے کیا ہو سکتا ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" عمران صاحب نے کہا۔ عمران صاحب تو چلے گئے لیکن زندگی میں پہلی بار صبا نے سنجیدگی سے سوچا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں اس وقت بھی نہیں آ رہی تھی کہ اگر انہوں نے اپنے شوق کے لئے کچھ دنوں کے لئے صولت کو لڑکی بنائے رکھا تو اس میں کیا غضب ہو گیا۔ لڑکا تو لڑکا ہی رہے گا۔ بہر حال اب انہوں نے صولت کے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ باپ کا چھوڑا ہوا بہت کچھ تھا۔ ساری زندگی کچھ نہ کرے تب بھی عیش سے گزار دے گا۔ کسی کی چاکری تھوڑی کرنی ہے لیکن اگر میٹرک کرلے تو کیا حرج ہے گھر پر کافی پڑھ رہا ہے۔ بس اسکول کی سند نہیں تھی تو کیا لیکن میٹرک کرنے کے لئے تو رجسٹریشن کرانا ہی پڑے گا اور اس کے لئے اصل حقیقت بھی سامنے لائی جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے صولت کے مستقبل کے لئے بیٹے پر ل رکھ لی۔

صولت کے کمرے میں پہنچی تو وہ پیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے ہاتھ میں ساڑھی لئے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ صبا بیگم کو دیکھ کر شرما کر ہنس پڑا۔

"امی۔ ہمارے لئے چند خوبصورت ساڑھیاں بنوائیں اور ہمیں ساڑھی باندھنا بھی سکھائیں۔ ہم اتنی دیر سے کوشش کر رہے ہیں مگر............"

"یہ ساڑھی کہاں سے آئی؟" صبا بیگم نے پوچھا۔ "آپ کی ہے۔ مگر یہ بلاؤز ہمیں ڈھیلا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کی فٹنگ درست نہیں ہو رہی۔" صولت نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"صولت بیٹے! میرا خیال ہے کہ اب آپ کو سنبھل جانا چاہئے۔ لڑکے ساڑھیاں نہیں باندھتے۔ آج آپ ہمارے ساتھ بازار چلیں۔ اب آپ مردانہ کپڑے استعمال کریں گے۔"

"مردانہ .... کیوں امی۔ کیا یہ کپڑے آپ کو اچھے نہیں لگتے؟"

"اچھے تو لگتے ہیں بیٹا مگر آپ لڑکے ہیں۔ اب تک جو ہوتا رہا وہ غلط تھا اب آپ کو ٹھیک ہونا چاہیے۔"

"مگر ہم سے مردانہ کپڑے تو نہ پہنے جائیں گے۔ ہمیں یہی اچھے لگتے ہیں بلکہ ہم تو آپ سے ایک اور فرمائش کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسی فرمائش؟"

"امی ہمیں ایک برقعہ منگوا دیں پرانی طرز کا۔ اللہ ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ برقعہ پہن کر گھر سے نکلو گے۔" صبا بیگم جھلا کر بولیں۔

"تو کیا ہوا۔ کیا دوسری لڑکیاں نہیں پہنتیں۔"

"لڑکے تو نہیں پہنتے۔"

"مگر ہم تو پہنیں گے۔ یوں بھی جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو ہمیں بڑی شرم آتی ہے۔ لوگوں کی نگاہیں ہم پر پڑتی ہیں تو وہ مسکرانے لگتے ہیں۔ برقعہ پہنیں گے تو منہ پر نقاب بھی ڈالیں گے۔ پھر کوئی ہمیں دیکھ ہی نہ سکے گا۔"

"کل سے تم مردانہ کپڑے پہنو گے سمجھے' بس اب ٹھیک ہو جاؤ۔"

"اللہ ٹھیک تو ہیں' آپ تو بس .... خواہ مخواہ ...."

اور صبا بیگم نے پہلی بار بدحواسی محسوس کی۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ لوگ کیا کہتے تھے' کیوں کہتے تھے۔ صولت کی ذہنی تربیت ہی لڑکیوں کی مانند ہوئی تھی۔

"اونہہ ٹھیک ہو جانے کے لئے تھوڑی سی سختی کی ضرورت ہے۔" انہوں نے سوچا اور دوسرے دن سے انہوں نے صولت کو درست کرنا شروع کر دیا۔ درزی نے اس کا ناپ لیا تو صولت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گھر کے تمام ملازمین کو ہدایت دے دی گئی کہ وہ صولت کو لڑکے کی حیثیت سے مخاطب کریں۔ کپڑے ارجنٹ سلوائے گئے تھے۔ تیسرے دن سے انہیں پہننا پڑے لیکن ان باتوں سے صولت کی حالت بری ہو گئی۔ وہ سخت پریشان نظر آنے لگا۔ کئی بار اس کے ساتھ سختی بھی برتنی پڑی اور وہ مسہری پر منہ چھپائے روتا رہا لیکن صبا بیگم کو اب حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کئے پر بدحواس ہو گئی تھیں اور اب انتہائی پامردی سے اس بات کی کوشش کر رہی تھیں کہ صولت خود کو پہچان لے۔ اس کے تمام زنانہ لباس ضائع کر دیئے گئے تھے لیکن صولت کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اپنانے کے لئے اسے بڑے کٹھن لمحات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ پھر جب اس کے بال مردانہ فیشن کے کٹے تو دو دن تک اس نے کھانا نہ کھایا۔ رو رو کر آنکھیں سرخ کر لیں۔ بس صبا بیگم اب تساہل نہیں برتنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے بالآخر صولت کو مردانہ لباس کا عادی بنا دیا۔

پڑھائی دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ آٹھ ماہ میں صولت کو اس قابل کر دیا گیا کہ وہ میٹرک کا امتحان دے۔ چند دشواریاں پیش آئیں تو انہیں پیسے خرچ کر کے دور کر دیا گیا اور پھر صولت کو میٹرک کے امتحان میں بٹھا دیا گیا لیکن جب صولت پہلا پرچہ کر کے واپس آیا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ اترا ہوا تھا۔ جس مشکل کا آغاز کیا گیا تھا وہ اب اپنے منطقی انجام کی طرف سفر کر رہی تھی۔

صبا بیگم بیٹے کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ "ارے کیا ہوا میرے لعل کو؟"

"امی اللہ کے واسطے ہمیں امتحان دینے نہ بھیجئے ہم مر جائیں گے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟ پرچے مشکل ہیں؟"

"نہیں ہمیں وہاں لڑکوں کے درمیان بیٹھنا پڑتا ہے امی ہمیں بڑی شرم آئی۔ ایک لڑ

کا گیا ہم سے .... سب کے سب ہمیں گھور رہے تھے۔"

"کیا بکواس ہے صولت۔"

"امی .... خواہ آپ کچھ بھی کہیں ہم امتحان دینے نہیں جائیں گے بس ہم نہیں جائیں گے!" صولت نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور روتا ہوا باہر نکل گیا۔ صبا بیگم بیٹھی رہ گئی تھیں۔ آج بہت سی باتیں ذہن میں آ رہی تھیں۔ اب محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ دشمن نہیں تھے۔ وہ خود ہی غلطی پر تھیں۔ بیٹا کیا سے کیا بن گیا۔ کیا اب اس کے ذہن سے یہ تاثر دور ہو گا۔ جوں جوں سوچتیں بدحواس ہوتی جاتیں۔ ٹھیک ہے دولت کی ریل پیل ہے روزگار کے لیے پریشان نہیں ہو گا لیکن زندگی میں اور بھی تو بہت کچھ ہے۔ آئندہ کیا ہو گا۔ شادی بھی کرنی ہے۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔

"ہاں سہیل! ٹھیک کہتے تھے میں نے تمہاری نہ مانی مگر ایسی بھی ناراضگی کیا۔ تم نے تو ساری حماقتوں کو سنبھالا تھا۔ ایک بات سے ایسے روٹھ گئے۔ اب میں کیا کروں کس سے اس مشکل کا حل پوچھوں۔"

انہیں پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ حماقت ہوئی ہے۔ اتنے طویل عرصے تک اور اتنی سنجیدگی سے اسے یہ کھیل جاری نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ رات کو بیٹے کو سمجھایا لیکن اس کی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ چوں چوں کے مربے کو کیا سمجھاتیں؟

"بیٹے یہ امتحان تمہاری زندگی کے لیے ضروری ہے۔"

"آئندہ سال آپ لڑکیوں کے ساتھ ہمارا رجسٹریشن کرا دیں۔"

"جوتے مار کر نکال دیے جاؤ گے۔"

"مگر کیوں' شلوار قمیض پہن کر جائیں گے۔"

"مونچھوں کا کیا کرو گے۔"

"اللہ یہ مونچھیں ہمیں زہر لگتی ہیں ہم کیا کریں ان کا۔" صولت نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہر لڑکے کے مونچھیں ہوتی ہیں۔"

"ہوتی ہوں گی ہمیں نہیں اچھی لگتیں!" صولت تنک کر بولا۔

"اور کل داڑھی بھی نکل آئے گی۔"

"داڑھی!" صولت نے بدحواس ہو کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"ہم تو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے امی! ہائے ہم کیا کریں۔" صولت بلک

بلک کر رو پڑا۔

"اپنے آپ کو سنبھالو صولت! لوگوں میں اٹھا بیٹھا کرو۔ لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ لیا کرو۔ کل سے تمہیں یہ سب کچھ کرنا ہے سمجھے۔" صبا بیگم نے حکم صادر کیا۔

لیکن صولت کے کان پر جوں نہیں رینگی تھی' اس نے رات کو سونے کے لیے ایک ملازمہ کا لباس غائب کر دیا صبا بیگم کوئی کئی دن کے بعد پتہ لگا تھا۔

"لعنت ہے تم پر............ تم یہ لباس پہن کر سوتے ہو۔"

"تو کیا کریں امی ہمیں مردانہ لباس میں نیند نہیں آتی۔"

"عادت ڈالو۔"

"کیسے ڈالیں ہم سے نہیں ہوتا۔" صبا بیگم لباس چھین کر لے گئیں اور صولت دیر تک بستر میں منہ چھپائے روتا رہا۔ نوکروں کے لیے ایک تماشہ بن گیا تھا۔ سب کے سب اسے لڑکا بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی کرکٹ کھیلنے کا سامان لا رہا ہے تو کوئی کچھ۔ انہیں کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ صولت ہاتھ میں بال لے کر باؤلنگ کرانے آتا۔ یا کھیلتا اور پھر ہائے اللہ کہہ کر زمین پر بیٹھ جاتا۔ طرح طرح کے بہانے کرتا۔ کبھی کہتا ہماری چک اتر گئی' کبھی ہاتھ میں موچ آجاتی۔

ایک صبح صبا بیگم نے اس کی صورت دیکھی اور آگ بگولہ ہو گئیں۔ صولت کا اوپری ہونٹ سوجا ہوا تھا اور مونچھوں کے چھوٹے چھوٹے روئیں جگہ جگہ سے غائب تھے۔

"یہ کیا ہو گیا؟" انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" صولت نے خوفزدہ ہو کر اوپری ہونٹ چھپا لیا۔

"ہاتھ ہٹاؤ صولت' کیا کر رہے ہو؟" صبا بیگم نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ مونچھیں ہمیں زہر لگتی ہیں ہم نے آمنہ آنٹی کو موچنے سے بھنوؤں کے بال نوچتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہماری بھنویں تو ٹھیک ہیں لیکن مونچھیں' مگر نہ جانے آمنہ آنٹی کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں یونہی بھنوؤں کے بال اکھاڑ لیتی ہیں۔ ہمیں تو ساری رات نیند نہیں آ سکی۔"

"صولت' صولت تمہیں کیا کہوں۔ کیوں میری جان لینے پر تلا ہے۔ ہائے اس غم کو کس طرح برداشت کروں میں تو کہیں کی نہ رہی۔"

"ذرا سی مونچھیں نوچی ہیں موچنے سے تو کیا قیامت آگئی۔ سب ہی تو کرتی ہیں" اور پہلی بار صبا بیگم نے صولت کو جوتا کھینچ مارا۔ صولت نے اس صدمے سے تین دن تک بھوک ہڑتال کی۔ صبا بیگم نے دو دن تک تو دل پر پتھر رکھا پھر ماتا عود کر آئی اور خوشامد کرنے پہنچ

گئیں۔

"صولت! میرے لعل! ماں کا گناہ معاف کر دے اتنی بڑی سزا نہ دے میرے بچے! مجھے تو پہلے ہی بہت بڑی سزا مل چکی ہے۔ خود کو پہچان میری روح............ ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"ہم بھی تو مر جائیں گے امی! آپ جو کچھ کر رہی ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔" صولت نے بے بسی سے کہا۔

"ہائے یہ مجھ بدنصیب ہی کی حماقت ہے۔ مگر اب میں کیا کروں۔ اب تو تم ہی میری مدد کر سکتے ہو صولت! میری مدد کرو۔"

"ایک شرط پر!" صولت نے کہا۔

"ہاں ہاں کہو۔ کیا شرط ہے بولو میں اپنی اس حماقت کی بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ ہمیں لپ اسٹک کا نیا شیڈ منگوا دیں گی اور ہمیں کبھی کبھی ساڑھی باندھنے کی اجازت بھی دے دیں گی۔" صولت نے کہا اور صبا بیگم نے سر پکڑ لیا۔

ذوہیب پچیس چھبیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ صبا بیگم کا دور کا رشتہ دار تھا۔ اس شہر میں تعلیم مکمل کرنے آیا تھا۔ گو اس کا قیام ہوسٹل میں تھا لیکن صبا بیگم کا پتا اس کے پاس موجود تھا۔ تلاش کرتا ہوا پہنچ گیا۔ صبا بیگم تو اپنوں کے لیے ترسی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی آؤ بھگت کی اور ذوہیب بے حد متاثر ہو گیا۔

"ہوسٹل میں قیام کرنے کی کیا ضرورت ہے بیٹے تمہارا گھر موجود ہے۔"

"شکریہ پھوپھی جان! اب تو سارے کام مکمل ہو گئے ہیں بے فکر رہیں آتا جاتا رہوں گا۔ یہاں میرا اور ہے ہی کون؟ ویسے آپ ہمارے ہاں کبھی نہیں آئیں۔"

"ہاں بیٹے! بس تقدیر کی ماری ہوں۔ تمہارے پھوپا جان کے انتقال کے بعد سے تو ساری دنیا سے کٹ کر رہ گئی۔"

"پھوپی جان! میرا کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔" ذوہیب نے پوچھا۔

"بھائی ہے بیٹے! ابھی بلاتی ہوں۔" صبا بیگم نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد صولت چلتا مٹکتا آگیا۔ ایک قیمتی کپڑے کی پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ ذوہیب کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے پر شرم کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"یہ صولت ہے۔"

"ہیلو صولت۔" ذوہیب نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور صولت شرما کر دوہرا ہو

گیا۔ اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

"واہ۔ بھائی شرمانے میں تو تم نے لڑکیوں کو مات کر دیا ہے! پھوپھی جان یہ تو بہت شرمیلا ہے۔"

"نہ جانے کیا ہو گیا ہے اسے۔ ذوہیب' میری تھوڑی سی ذمہ داری تم بانٹ لو۔"

"حکم دیں پھوپھی جان!"

"اسے اپنے ساتھ گھمایا پھرایا کرو............ لڑکیوں کی طرح گھر میں گھسا رہتا ہے۔ لڑکوں سے سخت گھبراتا ہے۔"

"کمال ہے آپ نے انہیں تعلیم نہیں دلوائی پھوپھی جان!" ذوہیب نے تعجب سے اس لڑکے نما لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تقدیر کی ماری ہوں بیٹے! پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گی۔" صبا بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ذوہیب نے پھر چھان بین نہیں کی تھی۔ وہ چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر آ گیا۔ آج وہ موٹر سائیکل پر تھا۔

"پھوپی جان میں نے نئی موٹر سائیکل خریدی ہے صرف آپ کے ہاں آنے کے لیے۔ تیار ہو جایئے صولت صاحب گھومنے پھرنے چلیں گے۔"

صولت ذوہب کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں شرمگیں مسکراہٹ ابھر آئی۔

"جاؤ صولت' بھائی کے ساتھ گھوم آؤ۔ لباس تبدیل کر لو۔ ہاں وہ چیک کا سوٹ پہن لینا۔" صبا بیگم نے ہدایت کی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھیں کہ کہیں صولت کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ صولت بھی نہ جانے کس طرح تیار ہو گیا تھا۔ بہرحال دونوں باہر نکل آئے۔ "بھئی تم تو بہت خوبصورت نوجوان ہو۔ مگر یار لڑکیوں کی طرح شرماتے ہو۔ بیٹھو۔" ذوہیب نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ۔ نہ بیٹھا جائے گا ڈر لگتا ہے۔"

"اوئی اللہ بچ مچ۔" ذوہیب نے مسخرے پن سے کہا۔

"ابے بیٹھ کہیں تجھ پر عاشق نہ ہو جاؤں۔"

"ہائے میں مر جاؤں۔ کیسے بے شرم ہیں آپ۔" صولت دوہرا ہو گیا۔

"دیکھو دوست مجھ سے یہ بدمعاشی نہیں چلے گی بیٹھتے ہو یا............" بمشکل تمام صولت

سائیکل پر بیٹھ گیا لیکن اس نے عقب سے ذوہیب کو بھینچ لیا تھا۔

"زنان خانے سے کبھی باہر نہیں نکلے کیا؟" راستے میں ذوہیب نے پوچھا۔

"ہمیں............ ہمیں شرم آتی ہے۔"

"لونڈیوں میں بیٹھتے رہے ہو گے!"

"ہاں۔"

"کتنی لڑکیوں کو بیوقوف بنایا ویسے یار تیری ترکیب پسند آئی۔ لڑکیاں تو بے تکلف ہو جاتی ہوں گی تجھ سے!"

"ہمیں لڑکوں سے شرم آتی ہے۔"

"آنی ہی چاہیے۔ بے شرم کہیں کا کتنی پھانسی ہیں؟ دیکھ یار اول تو تو میرا رشتہ دار ہے۔ دوسرے میں بے حد بے تکلف آدمی ہوں۔ اگر مجھ سے اداکاری کی تو بے دھڑک ہاتھ مار دوں گا۔"

"آپ ہمیں اچھے لگے ہیں ذوہیب............" صولت نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ذوہیب کے بدن سے لپٹے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"شکریہ............ اور آپ مجھے بالکل گدھے لگتے ہیں۔" ذوہیب نے ایک تفریح گاہ میں موٹر سائیکل روک دی اور صولت گھبرائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"اللہ ذوہیب............ یہاں تو مرد ہی مرد ہیں۔"

"تو پھر؟"

ہمیں شرم آتی ہے۔" صولت نے عجیب سے لہجے میں کہا تو ذوہیب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"یار پھوپھی جان نے مجھے بیوقوف تو نہیں بنایا۔"

"کس بات پر۔"

"تو سچ مچ لڑکا ہے یا............ اگر لڑکی ہے تو خدا کی قسم بتا دے کل ہی ہوسٹل چھوڑ کر آ جاؤں۔"

"اللہ آپ بڑے بے شرم ہیں۔"

"لڑکی ہے تو............" ذوہیب اچھل پڑا۔

"پہلے تھے اب نہیں ہیں۔" صولت نے ادا سے کہا اور ذوہیب پاگلوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

"اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا بھائی۔ یا تو تم بہت ہی ذلیل شے ہو۔ یا بے حد چالاک اور اداکاری میں یکتا۔ یا پھر دنیا کا آٹھواں عجوبہ۔ اچھا یہ بتاؤ تعلیم کیوں نہیں حاصل کی تم نے۔"

"بس لڑکوں میں بیٹھ کر شرم آتی تھی۔"

"اور لڑکیوں میں؟"

"نہیں۔" صولت نے جواب دیا۔

"خدا کے لیے مجھے بتاؤ صولت تم کیا ہو دیکھو پھر میں کوئی زیادتی کر بیٹھوں گا۔"

"کیا بتائیں ذوہیب ہم لڑکے ہی ہیں۔" صولت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"لیکن کیوں، کون سی بات تم میں لڑکوں جیسی ہے۔ یار بس خاموش ہو جاؤ ورنہ میرا دماغ گھوم جائے گا!" ذوہیب جھلاہٹ کا شکار ہو گیا اور صولت بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔ ذوہیب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صولت کس قسم کا نوجوان ہے۔ دیکھنے میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اس کی ہر جنبش، گفتگو کرنے کا انداز لڑکیوں کی مانند تھا۔ اس کے باوجود ذوہیب کو پسند تھا۔ اکثر دونوں ساتھ سیر کرنے جاتے۔ ذوہیب نے کئی بار صبا بیگم سے اس بارے میں پوچھا لیکن وہ بیچاری اسے کیا بتاتی اب تو یہ صورت حال تھی کہ صولت نہایت بے چینی سے ذوہیب کا انتظار کرتا۔ کسی دن وہ نہ آتا تو صولت اس دن اداس رہتا۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا۔ پھر ایک دن ذوہیب نے کہا۔

"یار صولت ایک راز کی بات بتاؤں۔"

"بتاؤ۔"

"وعدہ کرو استاد کسی سے کہو گے تو نہیں۔"

"وعدہ۔"

"مجھے ایک لڑکی سے عشق ہو گیا ہے۔"

"ایں۔" صولت پر جیسے بجلی سی گر گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ذوہیب کو دیکھتا رہا گیا لیکن ذوہیب اپنی دھن میں کہہ رہا تھا۔

"چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ میں بھی واپس گھر جاؤں گا۔ وہ بھی جائے گی۔ کوشش کروں گا کہ گھر جا کر کچھ کام بن جائے۔ اگر بات بن گئی تو خط لکھوں گا۔ میری شادی میں ضرور آنا۔"

"تو کیا چھٹیاں ختم ہونے کے بعد واپس نہ آؤ گے۔"

"اگر شادی کی بات بن گئی تو پھر تعلیم کی ایسی کی تیسی۔ ویسے بھی یار ہمارے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا۔ ویسے تمہاری ہونے والی بھابی بڑی حسین ہے۔ میں نے کئی بار تمہارا تذکرہ کیا ہے۔ اب تو شادی کے بعد ملاؤں گا۔ ویسے بھی تم خوب صورت آدمی ہو۔" ذوہیب ہنسنے لگا لیکن صولت کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ایک قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ ذوہیب کا تصور اس کے ذہن میں ایک عجیب حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

ذوہیب نے اس وقت اس پر کوئی توجہ نہ دی اور تھوڑی دیر کے بعد واپس چلا گیا لیکن صولت ٹوٹ گیا تھا وہ خود کو بے پناہ محرومیوں کا شکار سمجھتا تھا۔ جب سے صبا بیگم نے اسے لڑکا بننے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اسے یہ لباس ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں خود کو لڑکی تصور کرتا۔ ایک عجیب سی بے کلی ایک انوکھے احساس سے تڑپتا رہتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس سے بہت کچھ چھین لیا گیا ہو۔ اس کے حسین تصورات جو کسی نوجوان کے خواب سے آراستہ ہوتے وہ ذوہیب کو چاہنے لگا تھا۔ جب سے ذوہیب ملا تھا۔ اس کے خواب ذوہیب کے وجود سے سج گئے تھے۔ اسے لگتا جیسے ذوہیب نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ رکھا ہو جیسے وہ اسے چوم رہا ہو اور اس تصور سے اسے بے پناہ لذت کا احساس ہوتا تھا اور جب سے ذوہیب نے کسی لڑکی کا تذکرہ کیا تھا صولت کا دل بیٹھ رہا تھا۔ ساری رات روتے روتے گزر گئی۔ دوسرے دن بھی وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ سب نے بلایا لیکن اس نے کہہ دیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

ذوہیب کے آنے کی اطلاع بھی ملی لیکن وہ باہر نہیں نکلا۔ ذوہیب آج ہی جا رہا تھا۔ وہ ذوہیب سے ملنے کے لیے بھی نہ نکلا۔ اس کے ذہن میں بھنور پڑ رہے تھے اس کی دماغی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

رات کو تقریباً نو بجے صبا بیگم کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے نوکروں سے کہا کہ دروازہ توڑ دیں۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔ ملازموں نے دروازے کا تالا توڑ دیا اور صبا بیگم اندر داخل ہو گئیں۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔" انہوں نے شدید غصے کے عالم میں پوچھا۔

"امی، امی میں شادی کروں گی؟" صولت نے جواب دیا۔

"کیا بک رہے ہو کس سے شادی کرو گے۔"

"ذوہیب سے امی آپ ذوہیب سے میری شادی کرا دیں۔ ورنہ جان دے دوں گی۔ زہر کھا لوں گی میں۔"

"یہ تو کس طرح بول رہا ہے۔" صبا بیگم دہاڑیں۔

"ہاں امی۔ مجھ سے میرا پیار نہ چھینو ہائے میں مرجاؤں گی۔ ارے تمہارا ستیاناس جائے ارے مجھے میرا زوہیب دے دو نہیں تو میں مرجاؤں گی۔" صولت بین کرتے ہوئے رو رہا تھا۔ صبا بیگم غصے میں آپے سے باہر ہو گئیں پاؤں سے جوتی نکالی اور سر پر پل گئیں۔ نوکروں میں روکنے کی ہمت نہیں تھی لیکن صولت چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو .... خدا تمہارا بھلا کرے پر میرا پیار مجھے لوٹا دو ہائے عابدہ خالہ میرا دوپٹہ اوئی سارے مرد کمرے میں گھس آئے ہیں ارے نگوڑ ستیاناسیو' ہائے امی! مر جاؤں گی ارے میرا زوہیب مجھے دے دو۔"

صولت کی حالت اس طرح کبھی نہ بگڑی تھی۔ آج وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ ذہنی انتشار رنگ لایا تھا اور وہ دوہری شخصیت کے بوجھ سے آزاد ہو گیا تھا۔ پھر ایک بار جو موقع ملا تو وہ کمرے سے نکل بھاگا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور وہ نوکروں سے اس طرح بدن چرا کر بھاگ رہا تھا جیسے کسی عصمت مآب دوشیزہ کو سرعام برہنہ کر دیا گیا ہو۔

"پکڑو' ارے اسے پکڑو!" صبا بیگم ڈوبتی آواز میں بولیں اور نیچے بیٹھ گئیں۔

ایک جاہل ماں کی جاہلانہ ذہنیت رنگ لائی تھی اور اس ڈرامے کا آخری سین سامنے آگیا تھا۔

☆-------☆-------☆

سونو چونک پڑی۔ کہانی ختم ہونے کے بعد اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ بدن میں ایک بوجھل پن محسوس ہو رہا تھا۔ کتنے دن گزر گئے۔ نہ کوئی دلچسپی نہ کوئی اور تفریح کوئی ایسی صورت حال پیش نہیں آئی تھی۔ جس سے زندگی میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی۔ جب سے یہ ہیرا ملا تھا۔ خواب ہی خواب کہانیاں ہی کہانیاں ان کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا تھا زندگی میں۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ تھک گئی ہے اس سے پہلے کی زندگی متحرک تھی لیکن اس کو جب سے یہ ہیرا ملا تھا اپنی تو کوئی زندگی نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کس کس کی کہانیاں۔ یہ کہانیاں مجھے کیا دے رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔ ماضی بہت عرصے کے بعد اس کی نگاہوں میں اجاگر ہوا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کہانیاں دلچسپ تھیں لیکن دوسروں کی کہانیاں کب تک سنی جائیں اپنی زندگی کی داستان تو آگے بڑھانا ہی ہوتی ہے۔ مگر میری زندگی کی داستان ہے کیا۔ عجیب و غریب ماحول میں پیدا ہوئی۔ ماں کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ باپ نگاہوں کے سامنے آگیا لیکن ایسے کہ اسے تنہائی میں بھی باپ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کی دوسرے بچے سوتیلے بہن بھائی۔ کچھ عرصے اس کے ستم کا شکار رہے اور اس کے بعد زندگی

آگے بڑھ گئی لیکن اب طویل عرصے سے یہ زندگی رکی ہوئی تھی۔ یہ زندگی رکنی نہیں چاہیے۔ ہاں جب تک وہ ان چمکدار کہانیوں میں گم رہے گی۔ زندگی آگے نہیں بڑھے گی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے یوں کیا کہ یہ قیمتی ہیرا جو صرف ہیرا ہی نہیں تھا بلکہ ایک طلسم تھا ایک انوکھی داستان تھی ایک محفوظ جگہ رکھ دیا اور اس کے بعد فیصلہ کیا کہ زندگی کو تحریک دے۔ ماں اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ دوسرے شہر میں تھی۔ سونو نے اتنا کیا تھا ان کے لیے کہ اب انہیں زندگی گزارنے کے لیے کوئی پریشانی نہیں رہی تھی باپ سوتیلا تھا اور اس نے سونو کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن ماں تو تھی کوئی ایسی ہستی تو تھی جسے وہ اپنے نام سے منسوب کر سکتی تھی۔ جس کے لئے کچھ کرنے کا تصور اسے زندگی کی تحریک دے سکتا تھا۔ چنانچہ ماں ہی سہی۔ کم از کم وہ جو اس کے اپنے سگے بہن بھائی نہیں تھے لیکن ماں کے تو سگے تھے وہ۔ ٹھیک ہے ایسا کر لیا جائے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ بہت عرصے سے ماں کو کوئی رقم وغیرہ بھی نہیں بھیجی تھی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتی تو اپنے پاس دولت کے انبار لگا سکتی تھی لیکن یہ بھی اس کی فطرت کا ایک حصہ تھا کہ بہت زیادہ دولت پسند نہیں تھی وہ بس طبیعت میں ایک جوش تھا۔ ایک آتش تھی ایک غضب تھا۔ جو سر ابھارتا تو وہ اپنی زندگی کے کچھ معمولات میں مصروف ہو جاتی۔

باہر نکلنے کے لیے ایک طریقہ کار منتخب کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے میک اپ روم میں جا کر اپنے چہرے کی مرمت کی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک خوب صورت نوجوان کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ اس کے فن کا کمال تھا کہ وہ اپنی صورت کو مختلف شکلوں میں ڈھال سکتی تھی اور شاید یہ فن ہی اس کے لیے سب سے بڑی جیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک خوب صورت لباس پہنا اور پھر باہر نکل آئی۔ باہر کی دنیا اسے واقعی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ راستہ طے کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ یہ طلسمی ہیرا ایک پراسرار نیند کی حیثیت رکھتا ہے۔ واقعی وہ سو گئی تھیں گہری نیند انتہائی گہری نیند اور شکر تھا کہ اس نیند سے وہ جاگ گئی تھی۔ شہر کی سڑکیں گلیاں' انسانوں کا کاروبار' تبدیل شدہ زندگی اسے دلکش لگ رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے بہت عرصے کے بعد کسی قید سے رہائی پائی ہو۔ سارا دن آوارہ گردی کرتی رہی اور پھر جب رات ہوئی تو اس نے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ خیال تھا کہ کچھ دیر وہاں بیٹھے گی کھانا وغیرہ کھائے گی۔ اس کے بعد واپس گھر آجائے گی۔ چنانچہ ہوٹل کی ایک شاندار میز پر بیٹھ کر اس نے ویٹر کی طرف اشارہ کیا اور ایک مشروب لانے کے لیے کہا ایک نوجوان لڑکے کی حیثیت سے وہ اتنی پرکشش ہی تھی کہ وہ حسین لڑکی

اس کے قریب پہنچ گئی۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔" اس نے مترنم آواز میں کہا' سونو نے نگاہیں اٹھا کر اس حسین لڑکی کو دیکھا' نوخیز سی عمر دلکش چہرہ۔ دلکش نقوش۔ قدرے سلیقے کا لباس یہاں آکر بیٹھنے کی وجہ سونو کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن بہرحال اس نے لڑکی کو بیٹھنے کی اجازت دے دی اور وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔ لڑکی کے چہرے پر شرم و حیا کے نقوش تھے اور یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی برائی کا شکار ہو کر یہاں آئی ہے۔ سونو سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تو لڑکی نے کہا۔

"معاف کیجئے گا میں .... بس یونہی آپ کی طرف قدم اٹھ گئے تھے۔ سو ادھر آگئی۔"

"کوئی حرج نہیں ہے آپ گھبرا کیوں رہی ہیں۔"

"نہیں گھبرا تو نہیں رہی ہوں۔" لڑکی نے کسی قدر بدحواسی سے کہا تو سونو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"چلئے آپ نہیں گھبرا رہیں۔ اب آگے کہئے۔"

"ہم .... میں .... میں کیا کہوں۔" لڑکی بولی۔

"گڈ .... اس کا مطلب ہے کہنا بھی مجھے ہی پڑے گا۔"

"کیا..........؟" لڑکی نے کہا۔

"ابھی تک تو میں نے اس بارے میں نہیں سوچا کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ ویسے آپ بتائیے کیا کہوں میں۔"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ 'کہ۔"

"جی' جی آپ کا مطلب کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"آپ کا نام۔" سونو سوال کیا۔

"میراں.........." لڑکی آہستہ سے بولی۔

"مس میراں .... میرا نام کمال ہے۔ اب بتائیے آپ اس سے آگے ہم کیا باتیں کریں۔" لڑکی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مشروب کے گلاس کی طرف دیکھا تو سونو نے ہاتھ اٹھا کر ویٹر کو اشارہ کر دیا ویٹر فوراً ہی یہاں پہنچا تو سونو نے اسے لڑکی کے لئے بھی مشروب لانے کے لیے کہا اور لڑکی آہستہ سے بولی۔

"ہم.......... معاف کیجئے' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"چلئے معاف کر دیا اور یہ بھی یقین کر لیا آپ کا یہ مطلب نہیں تھا۔ اب آگے کہئے۔"

"آپ دراصل آپ کمال صاحب۔"

"جی جی جی.........."

"کمال صاحب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر میں ہوں کیا چیز۔"

"واہ کتنی ذہانت کی بات کی ہے آپ نے۔ حقیقتاً میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کیا چیز ہیں۔"

"میں دراصل بس آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ سے کچھ رقم اینٹھنا چاہتی ہوں۔" سونو کو ہنسی آ گئی اس نے آہستہ سے کہا۔

"چلئے ٹھیک ہے میں یہ نہیں سمجھوں گا کہ آپ مجھ سے کچھ رقم اینٹھنا چاہتی ہیں۔"

"اف' فوہ! آپ مجھے پریشان کیوں کر رہے ہیں۔"

"ویری گڈ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پریشان کرنے کے لیے یہاں آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔" سونو معنی خیز لہجے میں بولی اور لڑکی کے چہرے پر شرمندگی کے نقوش نمایاں ہو گئے۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی اور سونو اس کی شخصیت کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ لڑکی آخر ہے کیا چیز اور تھوڑا تھوڑا سا اندازہ اسے ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ آرام سے بیٹھیں۔ جو کہنا چاہتی ہیں اطمینان سے کہیں۔ کوئی بھی بات ایسی نہیں ہوگی جو آپ کی مرضی کے خلاف ہو۔ آپ کو قطعی طور پر پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ یہ ساری باتیں ذہن نشین کرنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے چہرے سے یہ تردد مٹ جانا چاہیے۔" لڑکی کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں۔"

"میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔"

"یہاں سے اٹھ کر آپ اپنے گھر جائیں گے۔"

"ہاں۔"

"کتنی دیر میں۔"

"جتنی دیر میں آپ کہیں۔" سونو نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے گھر تک لے جائیں گے۔"

"جی۔" سونو نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ لڑکی نے پھر نگاہیں جھکالیں۔ سونو اس کا مطلب سمجھ گئی تھی لیکن ایک لمحے کے لیے وہ شدید حیرانی کا شکار ہو گئی تھی۔ ایسے نقوش کی مالک لڑکی کیا اس طرح کے کام میں ملوث ہے۔ ایک بار پھر اس نے لڑکی کے چہرے کا بھرپور جائزہ لیا اور اس کے اپنے اس خیال میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ پھر ایک کہانی' پھر ایک کہانی یقینی طور پر یہ معصوم سی لڑکی کسی ایسے حادثے کا شکار ہے۔ جس نے اسے اس راستے پر ڈال دیا ہے۔ یہ حادثہ کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ہوا ہے اس بچاری کے ساتھ' سونو کو بہرحال اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ویٹر نے وہ مشروب لا کر رکھ دیا اور سونو کے اصرار پر لڑکی وہ مشروب پینے لگی۔ سونو نے کہا۔

"یقینی طور پر تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی۔"

"جیسا آپ پسند کریں کمال صاحب۔" کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سونو میراں کے ساتھ کافی دیر تک ہوٹل میں بیٹھی رہی اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ گئی ایک عجیب و غریب کھیل تھا یہ لیکن سونو بہرحال اس قدر مضبوط اعصاب کی مالک تھی کہ اس کھیل کو آسانی سے جاری رکھ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئی تھی۔ میراں اس کے ساتھ تھی لڑکی اچھی مضبوط ہاتھ پاؤں کی مالک تھی لیکن چہرے کی بناوٹ اور اس پر چھائے ہوئے شرم کے آثار اس کی شخصیت کو عجیب بنا کر پیش کرتے تھے۔ سونو کے بیڈ روم میں آ کر سونو کے اشارے پر وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ سونو لباس تبدیل کرنے چلی گئی تھی۔ مردانہ لباس بہت سے تھے اس کے پاس کیونکہ عموماً اس کے استعمال میں رہتے تھے۔ لڑکی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ سونو نے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر کہا۔

"ہاں میراں۔ اب تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"دراصل میں جناب کمال صاحب میں' میں .... میں۔"

"نہیں میراں' میں سمجھ چکا ہوں کہ تم میرے ساتھ یہاں تک کیوں آئی ہو۔ باقی ساری باتیں اپنی جگہ ہیں۔ میں تمہیں تمہارا منہ مانگا معاوضہ ادا کروں گا۔ بلکہ اگر تم چاہو تو یہ پیشگی رقم رکھ لو۔ مجھے صرف اپنے بارے میں بتاؤ۔ باقی تمام باتوں کو بھول جاؤ۔ ہو سکتا ہے زندگی میں تمہیں بہت سے ایسے لوگ ملے ہوں' جنہوں نے تمہیں صرف ایک لڑکی سمجھا ہو لیکن ایک لڑکی اچھی دوست بھی تو ہو سکتی ہے۔ تمہارے ساتھ ایسے کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ جنہوں نے تمہیں یہاں تک پہنچا دیا۔"

"بس جناب! آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میں۔ ویسے ایک بات میں آپ سے کہوں۔ میرے

جیسے چہرے جہاں کہیں بھی نظر آئیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ برے خیالات اور برے دل کے مالک ہیں۔ ایک بار صرف ان گہرائیوں میں جھانک کر دیکھ لیں۔ آپ کو وہ زخمی نظر آئیں گے۔ زخم ہی زخم ہوں گے ان کے دل پر' زخمی دلوں پر مرہم رکھنا عبادت ہے کمال صاحب مرہم لوگ کیا کریں ہم اسی انداز میں اپنے آپ کو کسی کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہماری کوئی پذیرائی نہ ہو جہاں بھی ہمیں دیکھا جائے گا اسی انداز میں دیکھا جائے گا۔" سونو نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ بہرحال میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں تم سے صرف دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کچھ پیئو گی۔"

"آپ مجھے کچن بتا دیجئے میں چائے بنا کر لاؤں گی۔"

"نہیں میں خود تیار کر لیتا ہوں۔"

"کمال صاحب پلیز۔"

"تو تم جاؤ۔ کچن تلاش کرنے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔" جب لڑکی چائے بنانے چلی گئی تو سونو کو اپنے آپ پر' اس ماحول پر ہنسی آنے لگی۔ کیا خوب صورت ڈرامہ چل رہا تھا۔ لڑکی چائے بنا کر لے آئی۔ بڑے اہتمام سے اس نے چائے بنا کر سونو کے سامنے پیش کی اور ایک پیالی لے کر خود بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"کمال صاحب! بس یوں سمجھ لیجئے۔ ماں ہے دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد ماں بے سہارا ہو گئی۔ رہنے کو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے ہم لوگ جہاں بھی بیٹھے ہم کو بری نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ ماں مجبور ہو گئی کہ زندگی کے لیے کوئی سہارا تلاش کرے لیکن عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو سہارا ماں کو حاصل ہوا وہ ہمارے سوتیلے باپ کی شکل میں ایک شیطان تھا اور اس شیطان کی شیطانیت کے بارے میں کیا بتاؤں میں آپ کو۔ ماں نے بڑی مشکل سے اس باپ سے نجات حاصل کی۔ عدالت کے ذریعے اس سے نجات حاصل ہو سکی تھی اس کے بعد ہم نے اس شہر کو ہی چھوڑ دیا۔ یہاں آ کر ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے۔ بہت عرصے تک میں کوشش کرتی رہی کہ مجھے ڈھنگ کی ملازمت مل جائے۔ جہاں بھی جاتی مجھے صرف ایک لڑکی کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور پھر اور پھر کمال صاحب آخر کار میں اپنی مشکل کی بھینٹ چڑھ گئی۔" لڑکی کی آواز لرزنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔

"ایک بھیڑیا مجھے .... مجھے نگل گیا چبا کر پھینک دیا اس نے مجھے۔ یہاں سے میرے

اندر یہ خیال ابھرا کہ جب میری زندگی کے لیے صرف یہی ایک راستہ رہ گیا ہے تو پھر اسے باقاعدگی سے کیوں نہ اختیار کروں۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہ دوسرا مہینہ ہے اور آپ شاید کمال صاحب میرے آٹھویں گاہک ہیں۔" سونو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ اس نے کافی دیر تک خاموشی اختیار کئے رکھی پھر بولی۔

"مجھے بہت افسوس ہوا ہے تمہاری داستان سن کر۔ کاش! میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔ بہرحال فکر نہ کرو' کچھ کریں گے۔ مل کر کچھ کریں گے۔" کافی دیر تک سونو اسے تسلی دیتی رہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لڑکی پر اپنی حقیقت واضح کر دے لیکن بہرحال تھوڑا سا انتظار ضروری تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔

"اب آرام کرو۔ کل صبح ناشتے کے بعد بیٹھ کر باقی باتیں کریں گے اور میں تمہیں بتاؤں گا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔" سونو نے چائے کی پوری پیالی حلق میں انڈیل لی کیونکہ وہ کسی حد تک ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ لڑکی ابھی تک اپنی چائے کی پیالی لئے بیٹھی تھی' چائے پینے کے بعد سونو نے کہا۔

"آرام سے سو جاؤ۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔" سونو کو اچانک ہی اپنے سر کے بھاری ہونے کا احساس ہوا تھا لیکن وہ اس وقت اس احساس کو کوئی معنی نہ دے سکی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ دن میں ناشتہ کرتے ہوئے وہ لڑکی کو اپنے بارے میں یہ بتائے گی کہ وہ لڑکی ہے اور پھر اگر ممکن ہو سکا تو وہ اسے اپنے پاس ہی رکھے گی اور اس کے لئے کوئی بہتر راستہ تلاش کرے گی۔ یہ کام اس کے لئے مشکل نہ ہو گا۔ چند ہی لمحوں میں وہ گہری نیند سو گئی تھی لیکن دوسری صبح جب وہ جاگی تو منہ کا مزہ خراب ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی موجود نہیں تھی۔ سونو چند لمحات گزرے ہوئے واقعات پر غور کرتی رہی۔ اٹھی تو سر چکرایا چکرایا سا محسوس ہوا اور ایک لمحے کے اندر اسے یہ احساس ہو گیا کہ رات کو سو جانا اور اس وقت سر کا چکرانا ایک عجیب سی بات کی نشاندہی کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اسے نشہ آور چیز استعمال کرائی گئی ہے۔ مگر کس نے' لڑکی کے علاوہ اور کوئی اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ وہ پھرتی سے اٹھی اور اس کے بعد اس نے اپنی رہائش گاہ کا ایک ایک چپہ دیکھ مارا لڑکی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ سونو کمرے میں آئی اور پھر اس نے اپنی قیمتی اشیاء کو تلاش کیا اور ایک لمحے کے اندر اندر اسے احساس ہو گیا کہ لڑکی ان اشیاء پر ہاتھ صاف کر کے جا چکی ہے۔ سونو کے حلق سے ایک قہقہہ نکل گیا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ واہ اسے کہتے ہیں چور کو مور۔ پھر اچانک ہی اسے اس ۔۔ے کا خیال آیا اور وہ اس کی جانب بڑھ گئی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ ہیرا

۔نی جگہ موجود نہیں تھا۔ البتہ ایک پرچہ وہاں پر رکھا ہوا تھا۔ سونو نے جلدی سے وہ پرچہ نکال ۔۔۔ اس پر اس نے لکھی ہوئی تحریر دیکھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ ۔۔ئیں۔ لکھا تھا۔

"مس سونو! یہ بات مجھے یہاں آپ کے کاغذات وغیرہ سے معلوم ہو گئی ہے کہ آپ کا اصل نام سونو ہے اور محترمہ میں نے آپ کا جائزہ بھی لے لیا ہے۔ بڑی دلکش اور دلچسپ خاتون ہیں آپ' آپ مرد کیوں بنی ہوئی ہیں۔ اس کا مجھے کوئی علم نہیں لیکن آپ یقین کیجئے' آپ کی شخصیت نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ بہت اچھی ہیں آپ لیکن اس کے علاوہ میں نے جو ۔۔ز لیا ہے آپ اسے میری ضرورت میری مجبوری سمجھ لیجئے۔ سب سے قیمتی چیز یہ ہیرا ہے۔ ۔۔ن عجیب سی حیثیت ہے اس کی۔ نہ جانے کیوں یہ مجھے بہت عجیب عجیب سا لگ رہا ہے لیکن ۔۔حال میں ہیروں کی پرکھ جانتی ہوں۔ خیر آپ کا بے حد شکریہ آپ نے میرے ساتھ بے حد اچھا سلوک کیا ہے۔ ہو سکتا ہے دوبارہ کبھی آپ سے ملاقات ہو۔ میراں ہی لکھوں گی اپنا نام ۔۔الانکہ یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔ ویسے آپ کا اصل نام بھی کمال نہیں تھا۔ او نے خدا ۔۔فظ۔" میراں سونو نے پُر خیال انداز میں گردن ہلائی اور بولی۔

"دوبارہ ضرور ملنا میراں۔ مجھے تم جیسی ساتھی کی ضرورت ہے۔" ہیرے کی گمشدگی کا ۔۔ے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا بلکہ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی نے اپنے سر اس ہیرے کی ۔۔یبت لگائی ہے۔ اگر وہ اسے صرف ایک قیمتی پتھر سمجھ کر کسی کے ہاتھوں فروخت کر دے گی ۔۔الگ بات ہے اور اگر وہ ہیرے کی دلچسپی میں گم ہو جائے گی تو خود بھی اپنے اچھے مستقبل ۔۔ے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ بہرحال یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس ۔۔نے یہ پتا لگا لیا تھا کہ سونو مرد نہیں بلکہ لڑکی ہے۔ یہ بات ذرا پریشان کن تھی۔ ہو سکتا ہے خود ۔۔یراں اس تجسس کا شکار ہو جائے کہ آخر ایسا کیوں تھا تین چار دن گزر گئے۔ گزرے ہوئے ۔۔قعے کو بھول جانا ہی ایک اچھا عمل تھا لیکن بعض اوقات وہ ہو جاتا ہے جس کا انسان تصور ۔۔ی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک اور ہوٹل تھا۔ بہت ہی اچھے علاقے میں واقع تھا اور یہاں صاحب ۔۔ثیت لوگ ہی آیا کرتے تھے۔ سونو اس دن اپنے اصل روپ میں تھی۔ ایک فیشن ایبل ۔۔ی کی شکل اختیار کئے ہوئے۔ وہ اس ہوٹل میں داخل ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اب کوئی ۔۔پنا شکار تلاش کرے اور اس کے لئے وہ ایسا ہی روپ اختیار کرتی تھی لیکن اپنی میز پر بیٹھنے ۔۔ے بعد اس نے جب شکار کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں تو ایک لمحے کے لئے اس کا ذہن شدید ۔۔نجلاہٹ کا شکار ہو گیا جس چہرے پر اس کی نگاہ پڑی تھی وہ ایک خوبصورت نوجوان کا چہرہ تھا

لیکن اس کے نقوش' اس کے نقوش سو فیصدی میراں سے ملتے جلتے تھے بلکہ اگر ان نقوش کو ایک حسین میک اپ دے دیا جائے تو وہ میراں ہی تھی۔ انتہائی نفیس لباس میں ملبوس۔ بہت ہی شاندار شخصیت نظر آ رہی تھی اس کی۔ سونو بہت دیر تک ایک سحر میں گرفتار رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ سچ ہے یا پھر ایک ناقابل یقین خواب۔ وہی لگ رہا تھا اور سو فیصدی وہی لگ رہا تھا لیکن وہ اسے لگ رہا تھا کہنے پر مجبور تھی۔ چند لمحوں تک سوچتی رہی اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آگے بڑھ کر اس میز کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اس نے گزرے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔"

"تشریف رکھئے مس سونو!" نوجوان نے کہا اور ایک بار پھر سونو ڈگمگا سی گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح سونو سے واقفیت کا اظہار کر دے گی یا کر دے گا۔ جس طرح کی کیفیت سونو کی ہوئی تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ ساری زندگی نہ جانے کیا کیا کچھ کرتی رہی تھی لیکن اس وقت جو ہوا تھا وہ ناقابل فہم تھا۔ ہلکے سے لڑکھڑائے انداز میں اس نے کرسی کھینچی اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھی ہوئی شخصیت نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے محسوس کیا ہو گا مس سونو! کہ میں نے آپ سے ناواقفیت کا اظہار نہیں کیا حالانکہ آپ کے گھر سے چوری کر کے بھاگا ہوں۔" سونو نے تھکی تھکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مردی آواز میں بول رہا تھا وہ سونو نے کہا۔

"ایک بات کا جواب دو گی۔"

"جی۔"

"مرد ہو۔

"ہاں میرا نام محسن ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"اس وقت تم لڑکی بنے ہوئے تھے۔"

"ہاں' اور آپ مرد۔" سونو نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس وقت دل و دماغ کی جو کیفیت ہو رہی تھی وہ ناقابل بیان تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ اس شخص کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہئے لیکن بس یقین آ بھی رہا تھا۔ محسن نے ویٹر کو اشارہ کیا اور اسی مشروب کا آرڈر دے دیا جو پہلی بار سونو نے اسے پلایا تھا۔ مشروب آیا تو سونو نے گلاس اٹھا کر [illegible]

"پتہ نہیں اس میں کوئی نشے کی چیز ہے یا نہیں۔"

"نہیں سونو! ایک بات کہوں آپ سے آپ یقین کیجئے آج چوتھا دن ہے آپ سے ملے ہوئے لیکن ان چاروں دنوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے۔ جو آپ کی یاد سے الگ رہا ہو۔ آپ ہی کے بارے میں سوچتا رہا اور اس بات پر بھی آپ یقین کر لیجئے کہ اگر آپ آج اس طرح نظر نہ آ جاتیں مجھے تو مجبور ہو کر میں فوراً آپ کے پاس آپ کی رہائش گاہ پر پہنچتا۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ صرف ایک بات اور اگر ہو سکے تو سچ بتا دو۔"

"جی۔"

"تم مرد ہو۔"

"تقدیر نے مجھے مرد ہی بنایا ہے لیکن درجنوں بار میں لڑکی بن چکا ہوں۔ میرے جاننے والوں کا خیال ہے۔ میں نسوانیت کی اتنی خوبصورت نقل اتار سکتا ہوں کہ دوسرے مجھ پر شک نہیں کر سکتے۔"

"میں خود اس کی گواہ ہوں۔"

"لیکن ایک بات کہوں مس سونو! آپ نے بھی کمال کیا تھا اور میں سچ کہہ رہا ہوں آپ سے کہ آپ کی اس باکمال شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ جب مجھے وہاں اندازہ ہوا کہ آپ مرد نہیں بلکہ ایک خاتون ہیں تو میری حالت بھی آپ سے مختلف نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں شدت حیرت سے آپ کو دیکھتا رہا تھا۔"

"تم نے مجھے چائے میں نشہ آور دوا دی تھی۔"

"ہاں!"

"یہ دوا تمہارے پاس کہاں سے آئی۔"

"میں اپنے لباس میں محفوظ رکھتا ہوں۔"

"لیکن تم نے یہ لڑکی کا روپ کیوں اختیار کیا تھا۔"

"اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو کیا یہاں مناسب رہے گی۔"

"کیا پھر میرے گھر چلو گے۔"

"ہاں۔" اس نے سکون سے جواب دیا اور سونو مسکرا دی۔ عجیب ڈھیٹ آدمی ہے۔ ایسے لوگ اسے پسند تھے۔ وہ اسے دوبارہ اپنے گھر لے آئی۔ اس نے نہایت خلوص سے اس کی خاطر مدارت کی اور کہا۔

"شاید میں اب عورت نہیں ہوں۔ تم اس کا اندازہ لگا چکے ہو گے چنانچہ یہاں یہ بھول

جاتا کہ تم ایک عورت کے ساتھ ہو۔ دوستی میں جنس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"میں یہ الفاظ نہیں کہہ سکوں گا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تم کون ہو۔" سونو بولی۔

"ہاں یہ اصل سوال ہے' لیکن تفصیل جاننے کے لئے تمہارے پاس وقت کا ہونا ضروری ہے۔"

"میرے پاس بہت وقت ہے۔"

"میرے بارے میں جاننے کے لئے تمہیں نجمہ کے بارے میں جاننا ہو گا۔"

"نجمہ؟"

"ہاں بیمار ماں کی واحد کفیل جو زندگی کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ حالات و واقعات میں گھری ایک بے بس لڑکی۔ گھر کے حالات اور ماں کی بیماری سے پریشان تھی۔ ملازمت تلاش کر رہی تھی اس دن بھی اسے انٹرویو کے لئے جانا تھا۔

بڑے مشکل حالات میں گزارہ کر رہی تھی۔ ماں بیٹی نے بڑے سرد و گرم دیکھے تھے زندگی کے۔ ایسے ایسے مراحل سے گزری تھیں دونوں ماں بیٹیاں کہ انسان زندگی سے اوبھ جائے لیکن دونوں نے ایک دوسرے کے لئے جینا سیکھ لیا تھا۔ نجمہ اسی کے لئے جی رہی تھی اور اس کی ماں بیٹی کے لئے۔ موت کی خواہش ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی لیکن نجمہ کی شادی سے قبل وہ مرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن تقدیر روٹھی ہوئی تھی۔ وقت ناراض تھا یا پھر انہیں زندگی گزارنے کے ڈھنگ نہیں آتے تھے۔ وہ زمانہ ساز نہیں تھیں۔ زمانہ ساز ہوتیں تو بچیوں کو مفت تعلیم نہ دیتیں۔ پڑوس کے گھروں کی بچیاں پڑھنے آتی تھیں۔ ان کے والدین نے پیشکش کی تھی کہ ان کی حیثیت کے مطابق ٹیوشن فیس قبول کر لی جائے لیکن علم کا یہ کاروبار دونوں ماں بیٹیوں کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔

پڑوسی ان کی شرافت کے معترف تھے اس لئے ہر طرح ان کے کام آنے کو تیار تھے لیکن انہوں نے اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دی۔ ابھی کچھ سہارے باقی تھے۔ طلائی کنگن چند انگوٹھیاں' وہ کپڑے جن پر چاندی کا کام تھا اور جنہیں رمضان علی کی بیوی نے خوشی خوشی خرید لیا تھا۔ کوڑیوں کے مول جو مل گئے تھے۔ آج کل بچے کام کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ ایسی چیزیں ملتی کہاں ہیں۔ نقشین برتن اور آخری چیز گھڑی تھی جو نہ جانے کب سے چل رہی تھی اور نہ جانے کب تک چلے گی۔

ہاں اس کے بعد کچھ نہیں تھا سوائے نجمہ کے چنانچہ بہت پہلے سے اس نے پڑوسن

سے اخبار لا کر درخواستیں ارسال کرنے کا خرچ اور بڑھا لیا تھا۔ اسی پھونک پھونک چلنے کی
ماری نہ ہوتیں تو شاید حالات بہت پہلے بگڑ گئے ہوتے لیکن وہ بڑی ہی خوبی سے عزت
نبھالے ہوئے تھیں اور شاید اسی بوجھ نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ پلنگ سے
لگ گئی تھیں۔

بس سے اتر کر وہ پیدل چل پڑی۔ ابھی آٹھ بجے تھے۔ سورج کی ٹھٹھری ہوئی شعاعیں
ہر سے مغلوب تھیں اور تیز ہوائیں بدن کے کھلے ہوئے حصوں میں چبھ رہی تھیں۔ وہ
فاتر کی عمارتوں کے نام پڑھتی ہوئی کافی دور نکل آئی اور پھر جب اسے احسان چیمبر کا بورڈ کسی
عمارت پر نظر نہیں آیا تو پریشان ہو کر رک گئی۔ اب کسی سے پوچھے بغیر چارہ نہیں تھا ایک
عمارت کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بوڑھے چوکیدار سے اس نے احسان چیمبر کے بارے میں
معلوم کیا۔

"یہی عمارت ہے جدھر تم کھڑا تھا۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ وہ گہری سانس لے کر
اندر داخل ہو گئی۔ زیادہ تر دفتروں میں صفائی ہو رہی تھی۔ تیسری منزل پر دانش برادرز کا بورڈ
نظر آگیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی ایک چپڑاسی نظر آیا
وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں انٹرویو کے لئے آئی ہوں۔"

"ابھی سے بی بی' ابھی تو ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔"

"ساڑھے آٹھ بجے ہی بلایا تھا۔"

"اور آپ آ گئیں۔" چپڑاسی ہنس پڑا پھر بولا۔

"خیر آ گئی ہیں تو بیٹھ جایئے۔ وقت کی پابندی اس دور کی سب سے بڑی حماقت ہے۔
ب وقت دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں بلکہ وقت کی پابندی نہ کرنا بھی آج کل فیشن ہے۔
بلکہ یہی ہوتا ہے۔ وقت دینے والوں کو بھی یقین ہوتا ہے کہ اس کی بات کو حماقت سمجھا
جائے گا اور آنے والوں کو بھی۔ یہاں چپڑاسی آٹھ بجے آتے ہیں' کلرک نو بجے' اکاؤنٹینٹ
اور دوسرے افسر ساڑھے نو بجے' مینجر دس بجے اور مالک گیارہ بجے سے شام پانچ بجے تک
کسی بھی وقت۔ جتنا بڑا آدمی ہو گا اتنی ہی دیر سے پہنچے گا۔ یہی بڑا ہونے کی پہچان ہے۔ بیٹھ
جایئے۔" اس نے انتظار گاہ کی طرف اشارہ کیا اور وہ اندر جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

چپڑاسی کا کہنا بالکل درست تھا نو بجے سے کلرکوں کی آمد شروع ہو گئی۔ پھر دوسرے
ب آئے اور دس بجے مینجر بھی آ گیا۔ چپڑاسی نے کمال مہربانی اور اس کے انتظار سے متاثر

ہو کر مینجر کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ مینجر صاحب بھی شاید فارغ تھے کہ انہوں نے فوراً اسے بلا لیا۔ درمیانی عمر کا مینجر چہرے سے سنجیدہ نظر آتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں تشویش کے آثار نظر آئے اور پھر جیسے اس نے ذہن کو کسی خیال سے جھٹک دیا اور اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔ پھر مینجر نے اپنے سامنے رکھا ہوا درخواستوں کا فائل اٹھا لیا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"نجمہ۔" اس نے جواب دیا۔ مینجر نے تلاش کر کے اس کی درخواست نکال لی اور اس پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

"تعلیمی اسناد۔"

"جی یہ موجود ہیں۔" اس نے اسناد نکال کر سامنے رکھ دیں۔

"پہلے کبھی ملازمت نہیں کی۔"

"جی نہیں۔"

"یہ کام سنبھال لیں گی آپ!"

"جی ہاں۔"

"ہوں۔" وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے گھنٹی بجائی اور چپڑاسی کو اندر بلا لیا۔

"اور کتنی لڑکیاں ہیں باہر؟"

"اور کوئی نہیں ہے صاحب!"

"کوئی نہیں ہے۔" مینجر نے تعجب سے کہا۔ پھر بولا۔

"اختر صاحب کو بھیج دو۔"

چپڑاسی چلا گیا اور ذرا دیر بعد ایک نوجوان آدمی اندر آ گیا۔

"ان خاتون کے علاوہ اور کوئی نہیں آیا اختر صاحب!"

"سر! سردیاں ہیں۔ دیر سے آئیں گی۔" اختر صاحب ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"تب پھر وقت پر آنے والی ان خاتون کا حق بنتا ہے اور میرے خیال میں یہ موزوں بھی ہیں۔ تم ان کے کاغذات تیار کرا لو۔ ہاں محترمہ! آپ کب سے کام شروع کر سکتی ہیں؟"

"آج ہی سے سر!" وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"گڈ' مجھے یہ مستعدی بھی پسند آئی۔ ٹھیک ہے اختر صاحب! آپ ان کے کاغذات تیار کر لیں اور عبدل سے کہہ دیں کہ اب آنے والی خواتین کو واپس کر دیں۔ ان سے کہہ دے

کہ اب انٹرویو کا وقت نکل گیا۔"

"بہتر جناب!" اختر نے اس کی درخواست وغیرہ سنبھالی اور باہر نکل گیا۔ مینجر نے کہا۔

"میں دانش صاحب سے آپ کی سفارش کروں گا خاتون! مجھے امید ہے کہ آپ کو آج ہی ملازمت مل جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس فرم کے مالک آ جائیں گے۔ آپ کے کاغذات تیار کر کے ان کی میز پر پہنچا دیئے جائیں گے۔ آخری فیصلہ دانش صاحب ہی کریں گے۔ میں آپ سے چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ گھر سے باہر کا ماحول گھر سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ قدم قدم پر لڑکیوں کو الجھنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مگر مجبوریاں گھر سے باہر نکال ہی لاتی ہیں۔ کوشش کریں کہ ان مجبوریوں کے لئے اپنی انا اپنے وقار کو قربان نہ کرنا پڑے۔ اب آپ باہر کمرہ انتظار میں بیٹھیں۔ دانش صاحب کے آنے پر آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔"

مینجر صاحب کے الفاظ میں کوئی خاص بات تھی جسے اس نے محسوس کیا لیکن سمجھ نہیں آ سکا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ عام سی بزرگانہ نصیحت ہو۔ بہرحال اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اسے تو نوکری مل جانے کی خوشی تھی۔ خدا کرے دانش صاحب ان کے تقرر کی توثیق کر دیں۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ ایک چالیس پینتالیس سالہ خاتون اندر داخل ہوئیں اور پھر دو لڑکیاں جو میک اپ میں لتھڑی ہوئی تھیں اور اس کے بعد ایک تیسری نوجوان خاتون جو نہایت عامیانہ لباس میں ملبوس ناک پر چشمہ رکھے ہوئے تھیں۔ اتفاق سے وہ نجمہ کے ساتھ ہی آ بیٹھی تھیں۔

"ہائے اللہ آپ بھی انٹرویو کے لئے آئی ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"بڑی سویٹ ہیں آپ کیا میں آپ کے حق میں دستبردار ہو جاؤں۔"

"نہیں شکریہ۔" نجمہ نے ہنس کر کہا۔

"سوچ لیں آپ' میرے پاس بہت بڑی سفارش ہے۔"

"آپ کو نوکری کی ضرورت بھی تو ہو گی۔"

"کوئی خاص نہیں بس تفریحاً..........." اس نے کہا۔

"لیکن آپ بہت دیر سے آئی ہیں۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت بڑی سفارش ہے میرے پاس۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ نجمہ کا دل دھڑکنے لگا لیکن مہربان عبدل نے اس کا یہ تردد ختم کر دیا وہ اندر آ کر بولا۔

"آپ لوگ انٹرویو کے لئے آئی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تو براہ کرم واپس جایئے۔ انٹرویو ہو چکا ہے اس کا ٹائم ساڑھے آٹھ بجے تھا۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"لیکن ساڑھے آٹھ بجے کون آتا ہے سردیوں میں۔" معمر خاتون نے کہا۔

"جو آتا ہے اسے نوکری مل جاتی ہے۔" عبدل نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"تو کسی کا اپائنٹ منٹ ہو گیا۔" ایک لڑکی بولی۔

"جی ہاں ہو گیا۔"

"یہ تو دھاندلی ہے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔" معمر عورت نے کہا۔

"دھاندلی تو آپ کی ہے بی بی ساڑھے آٹھ بجے بلایا تھا گیارہ بجے آ رہی ہیں۔"

"چپڑاسی تم مینجر کو میری سلپ دے دو۔" تقریباً ملازمت کے لئے آنے والی خاتون نے اپنا نام لکھتے ہوئے کہا۔

"مینجر صاحب چلے گئے۔ آپ کل یہ سلپ لے کر آ جایئے۔"

"اوہ' دانش صاحب تو ہوں گے۔"

"وہ بھی کل ہی ملیں گے۔" عبدل نے کہا۔

وہ ذرا مسخرہ قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا اور شاید اس کی مدد کرنے پر تل گیا تھا۔ چپڑاسی تھا لیکن صاحب اختیار تھا۔ اس لئے اس نے کسی کی نہ چلنے دی اور تمام امیدوار خواتین کو واپس جانا پڑا۔ چلتے چلتے ان محترمہ نے نجمہ کو اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔

"آیئے میں آپ کو مناسب جگہ ڈراپ کر دوں گی۔"

"جی' جی نہیں شکریہ میں چلی جاؤں گی۔ کار ہے آپ کے پاس۔"

"ہاں میرے دوست امجد نیچے موجود ہیں۔ میں اس کے ساتھ آئی تھی۔ آؤ میں تمہیں اس سے ملاؤں بہت سویٹ ہے وہ۔"

"شکریہ۔" نجمہ نے خشک لہجے میں کہا۔

خاتون شانے ہلا کر واپس چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مینجر صاحب نے اسے طلب کیا اور دانش صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ پھر چپڑاسی کے ساتھ دانش صاحب کے کمرے میں بھیج دیا۔ شاندار ائرکنڈیشنڈ دفتر میں گورے چٹے رنگ کا ایک خوش لباس ادھیڑ عمر شخص موجود تھا جس کی لمبی چوڑی میز پر کئی ٹیلیفون موجود تھے۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا جس کے

سوچے ہوئے پپوٹے کسی حد تک نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ نجمہ نے اس کی گہری اور دماغ میں اترنے والی آنکھوں سے ہلکی سی کپکپی محسوس کی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا۔

"کسی کی سفارش لائی ہیں آپ۔"

"ج' جی نہیں۔"

"خیر آپ تو خود اپنی سفارش ہیں۔ جایئے کام شروع کر دیجئے' میں مینجر کو فون کر دوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" نجمہ نے کہا اور دانش صاحب کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

حیرت سے اس کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔ مینجر صاحب نے اس کے کاغذات کی فائل بنا دی اور پھر اسے اس کی میز پر پہنچا دیا گیا۔ اختر صاحب نے اس کے سامنے بیٹھ کر اسے اس کا کام سمجھایا۔ جو زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مسرت اور خوشی کی لہریں بار بار اس کے بدن کی کپکپی بن جاتی تھیں۔ امی کو کتنی خوشی ہو گی۔ خدا کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو' بہت سے مسائل دور ہو جائیں گے' لگن سے کام کروں گی' ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

شام کو پانچ بجے جب وہ اس عمارت سے باہر نکلی تو اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی' یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔ بس میں بیٹھ کر گھر پہنچی اور بے صبری سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کی ماں بستر پر لیٹی ہوئی تھیں اور پڑوس کی ایک عورت بستر پر لیٹی اس کی پسلیوں کی سکائی کر رہی تھیں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا بات ہے امی خیریت تو ہے؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہوں' تمہیں بہت دیر ہو گئی۔"

"خدا کا شکر ہے امی ہماری مشکلات دور ہو گئیں۔ نوکری مل گئی۔ آج ہی سے کام بھی شروع ہو گیا۔"

امی خاموش ہو گئیں۔ یہ بیٹا تو نہیں تھا جس کی نوکری کی کوئی خوشی ہوتی۔ انہوں نے بحالت مجبوری گھر کی عزت دہلیز سے باہر نکالی تھی۔

"دفتر کا ماحول بہت اچھا ہے امی! بہت سے لوگ کام کرتے ہیں لڑکیاں بھی ہیں۔ مجھے بہت اطمینان ہوا ہے۔" اس نے امی کی کیفیت کا کسی حد تک جائزہ لے لیا تھا۔ امی نے گردن ہلا دی۔

پڑوسن نے بتایا کہ پسلیوں کا درد شدت اختیار کر گیا تھا اب حالت بہتر ہے لیکن کچھ کیا

نہیں جا سکتا کہ درد کب زیادہ ہو جائے صبح سے یہی ہو رہا ہے۔ "میری مانو کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دو۔ مجھے تو یہ نمونیہ معلوم ہوتا ہے۔"

وہ لرز گئی۔ آج ہی تو نوکری ملی تھی۔ خدانخواستہ اگر امی کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو انہیں کیسے چھوڑ کر جا سکے گی اور پھر اچھے ڈاکٹر کا انتظام کیسے ہو سکتا ہے۔ پچیس تیس روپے پڑے تھے ان میں پورا مہینہ گزارنا تھا۔ کرایہ بھی چاہئے تھا کوئی ایسی چیز نہیں رہی تھی جسے فروخت کیا جا سکے۔ اب کیا کیا جائے؟ گھر کا کام کاج کرتے ہوئے وہ انہی پریشانیوں میں الجھی رہی۔ آج تک پڑوسیوں سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ انہیں تو قرض مانگنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا۔ بہزار دقت سے اس نے پڑوسن سے کہا۔

"خالہ! میری نوکری لگ گئی ہے۔ انشاء اللہ پہلی تاریخ کو تنخواہ مل جائے گی۔ ہمیں کچھ قرض کی ضرورت ہے' مل جائے گا؟"

"کتنے پیسے چاہئیں بیٹی؟"

"جو بھی ممکن ہو سکے میں پہلی تاریخ کو.........." اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ خالہ گھر واپس چلی گئیں اور پھر واپسی میں اس نے اس کے ہاتھ پر اسی روپے رکھ دیئے۔"

"میں نے یہی بچا کر رکھے تھے بیٹی! مجھے افسوس ہے کہ پہلی بار تم نے.........."

"نہیں خالہ! آپ کا بہت شکریہ بس کام چل جائے گا۔" اس نے کہا۔

لیکن بہت جلد اسے پتا چل گیا کہ اسی روپے کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ چالیس روپے ڈاکٹر صاحب کی فیس تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مرغ کی یخنی بتائی تھی۔ انہوں نے جو دوائیں لکھ کر دی تھیں وہ تقریباً تیس روپے کی تھیں۔ نمونیہ ہی تشخیص کیا گیا تھا۔ یہ دس روپے بھی اسی شام خرچ ہو گئے اور اس کے نتیجے میں امی نے شام سکون سے گزاری دوسری صبح بھی ان کی طبیعت بحال رہی اس لئے وہ سکون سے دفتر پہنچ گئی۔ اسے کچھ اور کام دیئے گئے لیکن طبیعت میں بحال نہیں تھی۔ گہری سوچ اور پریشانی امی اگر بیمار نہ ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی۔ کام چل جاتا لیکن اب مہینہ کیسے گزرے گا؟ یہ دوا دو تین دن تک چل جائے گی اس کے بعد..........؟

کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن بہرحال اس نے اپنا کام بڑی دلجمعی سے کیا۔ اسی رات امی کی حالت بھی خراب ہو گئی۔ رات بھر شدید درد سے تڑپتی رہیں۔ صبح کو کسی قدر سکون نصیب ہوا اور وہ دفتر چلی گئی۔ شام کو ڈاکٹر صاحب سے کلینک جا کر ملی بتایا تو ڈاکٹر

صاحب نے انجکشن لکھ دیا۔ بیس روپے کے دو انجکشن خریدے اور دو روپے کمپاؤنڈر کو دے کر لگوائے۔ اب کرائے کے پیسوں کے بھی لالے پڑ گئے تھے اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہدایت کی کہ انجکشنوں کا کورس پورا کر لیا جائے اور یہ کورس بائیس انجکشنوں پر مشتمل تھا یعنی بائیس روپے روز۔

وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ اب تو کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ انا کو طاق میں رکھے۔ ماں کی زندگی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے اگر امی کو کچھ ہو گیا تو..........؟ اس تو کے آگے تاریک خلا تھا چنانچہ اس روز دفتر آ کر وہ دوپہر کو اکاؤنٹینٹ سے ملی۔ یہ بھی ضعیف العمر آدمی تھا اور شریف صورت بھی لگتا تھا۔

"میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں جناب!"

"کہئے کیا بات ہے۔"

"مجھے احساس ہے جناب! کہ ابھی مجھے نوکری کرتے ہوئے چار روز بھی نہیں ہوئے لیکن ضرورتیں وقت کے تابع نہیں ہوتیں۔ میں پریشانیوں کی انتہا تک پہنچنے کے بعد یہ بات عرض کر رہی ہوں کہ مجھے میری تنخواہ میں سے کچھ رقم ایڈوانس دلوا دی جائے۔"

اکاؤنٹینٹ صاحب نے ہمدردی سے اس کی بات سنی پھر بولے۔

"مجھے آپ کی پریشانیوں کا احساس ہے بی بی! لیکن یہاں ایڈوانس کا کوئی رواج نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو میں فوراً آپ کی یہ مشکل حل کر دیتا۔ اسی لئے میں آپ کو یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتا کہ آپ اس سلسلے میں مینیجر صاحب کو کوئی درخواست دیں۔ ہاں ایک مشورہ ہے۔ آپ دانش صاحب سے بات کریں یا ایک پرچہ ان کے نام لکھ دیں اور چپڑاسی کے ہاتھ اندر بھجوا دیں۔ ذاتی طور پر اگر دانش صاحب نے چاہا تو آپ کو ایڈوانس دے دیں گے۔"

نجمہ کو بڑی مایوسی ہوئی تھی لیکن ضرورت اسے سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک پرچہ لکھ کر دانش صاحب کے لئے اندر بھجوا دیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس کی طلبی ہو گئی۔ وہ دھاڑ دھاڑ کرتے دل کے ساتھ دانش صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ پُر رعب چہرے والے دانش صاحب نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر سرد لہجے میں بولے۔

"مس نجمہ! یہ وقت میرے لئے سخت مصروفیات کا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو زیادہ ہی ضرورت ہے تو آپ سات بجے تشریف لایئے اس وقت میں آپ کی تحریر پر غور کروں گا۔"

"سات بجے آپ دفتر میں مل سکیں گے جناب!"

"جی' ہاں ملوں گا۔" دانش صاحب نے کہا اور سامنے رکھے ہوئے فائل پر جھک گئے۔

وہ بے آواز چلتی ہوئی باہر نکل آئی اور اپنی میز پر جا بیٹھی۔ ذہن میں عجیب سے وسوسے سر ابھار رہے تھے لیکن وہ خود کو تسلیاں بھی دے رہی تھی۔ دانش صاحب نے سات بجے کا وقت دیا تھا' دو گھنٹے کہاں گزاروں گی چھٹی کے بعد؟ اس نے یہی طے کیا کہ گھر چلی جائے گی اور اس کے بعد امی سے کچھ کہہ کر واپس آ جائے گی۔ اصل بات امی کو بتانا ابھی مناسب نہیں ہو گا وہ بھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔

چھٹی ہونے کے بعد وہ دفتر کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اٹھ گئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو کئی عورتیں گھر میں جمع تھیں' امی کی حالت بے حد خراب تھی۔ ڈاکٹر صاحب آ کر واپس جا چکے تھے' درد کا شدید دورہ پڑا تھا اور صورت حال بہت خراب ہو گئی تھی۔

"دو گھنٹے تک بے ہوش رہی تھیں تمہاری امی۔ ہم لوگ تو انہیں ہسپتال لے جا رہے تھے لیکن اصغر کے ابا ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی انجکشن لگائے جب سکون ہوا ہے۔ یہ نسخہ اور بل دے گئے ہیں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ایک سو دس روپے کا بل تھا اور نسخہ الگ۔ پڑوسی اسے تسلیوں کے سوا کیا دے سکتے تھے۔ نسخہ اور بل اسے کڑی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ کیا کروں؟ آہ........ کیا کروں؟

امی اب بھی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ شاید انجکشن میں کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی۔ وہ تو پڑوسنیں اچھی تھیں کہ فوراً آ کر گھر سنبھال لیتی تھیں ورنہ نوکری وکری خاک میں مل جاتی اور اس کی وجہ بھی ان لوگوں کا رویہ اور شرافت تھی ورنہ کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔

بہت برا وقت آ پڑا تھا نجمہ پر۔ دانش صاحب نے بھی پوری امید تو نہیں دلائی تھی۔ بس غور کرنے کے لئے' اگر وہاں سے بھی پیسے نہ ملے تو کیا ہو گا۔ یہ خیال اس کی جان لئے جا رہا تھا۔ ساری دنیا میں ماں کے سوا اور تھا ہی کون۔ اگر........ اگر اور اس اگر سے آگے اس کا سینہ پھٹنے لگا۔ اس حالت میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی ماں کو نہیں چھوڑتی لیکن مجبوریاں اسے دوبارہ گھر سے باہر نکال لائیں اور وہ بس میں بیٹھ کر دوبارہ دفتر کی طرف چل پڑی۔ ٹھیک سات بجے وہ دانش صاحب کے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔

"دانش صاحب موجود ہیں۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ چپڑاسی کے جواب کا انتظار کرنے لگی' جیسے وہ کہے گا ابی سات بج چکے ہیں دفتر بند ہو چکا ہے۔ صاحب چلے گئے اور اس کے بعد اس کا دل ہمیشہ کے لئے رک جائے گا لیکن چپڑاسی نے کہا۔

"آپ نجمہ صاحبہ ہیں۔"

"ہاں۔"

"اندر چلی جایئے صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

کمرہ اس وقت نیم تاریک تھا مدھم روشنیاں جل رہی تھیں لیکن دانش صاحب کمرے میں موجود نہیں تھے۔ ہاں ان کی میز کی پشت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا اور جس کے پیچھے شاید چند ہی لوگوں کو معلوم ہو گا کہ کیا ہے' عام طور سے صرف وہ ایک آرائشی کمرہ نظر آتا تھا اس وقت وہ ہٹا ہوا تھا اور ایک کھلا دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ جھجک کر رکی تو دوسری طرف سے دانش صاحب کی آواز سنائی دی۔

"اس طرف آ جایئے مس نجمہ!"

اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے لیکن وہ بمشکل اس دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا لیکن نہایت خوبصورت کمرہ تھا۔ فرش پر گہرے سبز رنگ کا قالین تھا ایک طرف پرشکوہ مسہری پڑی ہوئی تھی۔ دوسری جانب صوفہ سیٹ جس پر اورنج کلر کے غلاف چڑھے ہوئے تھے' انہی میں سے ایک صوفے پر دانش بیٹھا ہوا تھا۔ درمیان میں سینٹر ٹیبل پڑی تھی جس پر شراب کی بوتل اور گلاس رکھے تھے۔

"نجمہ کا سر چکرانے لگا۔ وہ اس ماحول کی متوقع نہیں تھی لیکن........ لیکن یہ سب کچھ۔ وہ اتنی نادان نہ تھی کہ اس کا مطلب نہ سمجھتی۔ دل سینے میں کسی معصوم چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا لیکن ضرورت کی موٹی زنجیریں ٹخنوں میں پڑی تھیں' وہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

"تشریف رکھئے مس نجمہ! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" دانش نے بے جھجک گلاس اٹھا لیا اس کے چہرے پر بہکنے کے آثار نہیں تھے۔

"سر! آپ نے میرے بارے میں کچھ سوچا۔" اس کی مجبوری بولی۔

"بہت کچھ سوچا ہے آپ کے بارے میں آپ تشریف تو رکھئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا نجمہ کافی فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔

"میں نے آپ کا پرچہ پڑھ لیا۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں جتنے چاہیں لے لیں۔ میں چاہتا

ہوں کہ آپ ایک لمحہ بھی پریشان نہ رہیں۔ بتائیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے آپ کو؟"

دانش نے جیب سے پرس نکال لیا جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

"سر! میری تنخواہ سے۔"

"گولی ماریئے تنخواہ کو۔ ان پیسوں کا تنخواہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میری اور آپ کی دوستی کا معاملہ ہے۔ یہ لیجئے ایک ہزار کافی ہوں گے؟" دانش نے سو سو کے دس نوٹ نکال کر نجمہ کے پرس میں رکھ دیئے پھر بولا۔

"جب بھی آپ کو پیسوں کی ضرورت ہوا کرے مس نجمہ! آپ سات بجے یہاں آجایا کریں لیکن دن میں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کیونکہ دوسری ضرورت مند لڑکیاں بھی یہاں آتی رہتی ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

نجمہ کے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ اس کا وجود خاکستر ہوا جا رہا تھا' اس کا ضمیر چیخ رہا تھا لیکن .... لیکن برداشت کر رہی تھی۔ خود کو اذیت دے رہی تھی۔

"کبھی شغل کیا ہے؟" دانش صاحب نے شراب کی طرف اشارہ کیا اور اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔

"خیر کوئی حرج نہیں۔ ہاں تو مس نجمہ میری یہ پیشکش قبول کر لی آپ نے۔"

"سر........... سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔ میں بہت مجبور اور بے سہارا لڑکی ہوں۔ میری امی نمونیے کا شکار ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے سر کہ میں انہیں کن حالات میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ ان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو..........." وہ بے بسی سے رونے لگی۔

"اوہ .... نہیں' نہیں مس نجمہ! یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ یہاں کوئی سکھی نہیں ہے۔ سب کو کوئی نہ کوئی دکھ ہے۔ میں آپ کو ڈاکٹر فرہاد سے ملاؤں گا۔ بہت زندہ دل اور خوش مزاج شخص ہے۔ اگر آپ ان سے رابطہ رکھیں تو وہ آپ کی امی کا مفت علاج کریں گے۔ بہت بڑے اور تجربے کار ڈاکٹر ہیں۔ ہر طرح کا تجربہ ہے انہیں۔ ہر طرح کا۔" اس نے صوفے سے کھسک کر نجمہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اور یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ بے سہارا ہیں۔ آپ خود اپنا سہارا ہیں۔ بس انسان کو تہذیب و اقدار کے جھوٹے خول سے نکلنا ہوتا ہے۔ یہ رونا دھونا چھوڑیئے۔ زندگی کو بالغ نگاہ سے دیکھئے' زندگی ہنس پڑے گی۔" اس نے نجمہ کا شانہ دبا کر کہا نجمہ کھڑی ہو گئی۔

"سر! آج مجھے اجازت دے دیں۔ کل .... کل میں اسی وقت حاضر ہو جاؤں گی۔ میری امی سخت بیمار ہیں۔"

"کل...........؟" دانش کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

"اس قسم کا ادھار میرے لئے قابل قبول نہیں مس نجمہ! میں نے پورا دن آپ کے تصور میں برباد کیا ہے۔ اس شام کو تنہائی میرے لئے عذاب بن جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد چلی جایئے گا۔ میں خود آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

"خدا کے لئے .... خدا کے لئے آج مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔ میں کل ضرور آؤں گی۔ میں کل..........." وہ پھر رونے لگی۔ دانش نے گلاس میں بچی ہوئی شراب ساری کی ساری حلق میں انڈیل کر کہا۔

"بہتر ہے۔ کل آپ کو آنا ہے۔ اسے یاد رکھئے' جایئے۔"

وہ یوں وہاں سے نکلی جیسے اس کے پیچھے شعلے لپک رہے ہوں۔ یہ شعلے اس کے عقب میں تو نہیں تھے لیکن اس کے سارے وجود کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ خود کو آگ میں جلتا محسوس کر رہی تھی۔ دروازے سے نکلی تو چپڑاسی نے حیرت سے اسے دیکھا مسکرایا اور بولا۔

"ابھی سے جا رہی ہیں بی بی! اتنی جلدی۔" پھر ہنس پڑا۔

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا میرا نام بدر ہے۔"

اس کے دل پر برچھے اور برچھیاں لگیں۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ ڈر کے بغیر عمارت کی سیڑھیاں اترتی ہوئی باہر آ گئی۔ اسے اپنا پورا بدن بھیگا بھیگا محسوس ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے سارا لباس پانی سے بھیگ کر بدن سے لپٹ گیا ہو اور وہ بے لباس نظر آ رہی ہو۔ بس میں بیٹھ کر بھی اسے یہی احساس رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارے لوگ اسے دیکھ رہے ہوں۔ ان کی نگاہوں میں نفرت ہو۔

اس طرح وہ گھر پہنچ گئی۔ اندر کے حال سے خدا ہی واقف تھا لیکن گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا۔ امی تنہا تھیں اور جاگ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس پہنچ گئی اور پھر اس کے جذبات امڈ آئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور امی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"ارے' ارے نجمہ! روتے نہیں بیٹے۔ بیماری تو زندگی کے ساتھ ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں گی چند روز میں' تجھے اکیلا تھوڑی چھوڑوں گی۔ نہیں بیٹے! روتے نہیں ہیں۔ اب میری حالت کافی بہتر ہے۔ کہاں چلی گئی تھیں۔ عائشہ باجی بتا رہی تھیں کہ دفتر سے آ کر گئی ہو۔"

امی کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان کے سینے سے لگی چپ چاپ آنسو

بہاتی رہی۔ امی بے چاری یہی سمجھتی رہیں کہ وہ ان کی بیماری سے خوفزدہ ہے۔ ہر طرح سے اسے تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر نجمہ نے خود کو سنبھالا۔ اسے بہت سے کام کرنا تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا بل ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ بل دینے چلی گئی۔ واپس آئی تو خالہ بھی موجود تھیں اس نے ان کے پیسے بھی انہیں واپس کر دیئے۔

"ارے بگی ابھی ان کی ضرورت ہے' رکھ لو ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ بعد میں دے دینا۔"

"نہیں خالہ! ضرورت ہوئی تو پھر لے لوں گی۔ دفتر سے ایڈوانس مل گیا ہے۔ آپ رکھ لیں۔" اس نے کہا۔

لفظ ایڈوانس نے پھر اس کے دل پر چرکا لگایا تھا امی کی حالت پھر سنبھل گئی تھی۔ چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر وہ امی سے تھوڑے فاصلے پر دوسری چارپائی پر لیٹ گئی اور چکرائے ہوئے دماغ سے ان واقعات کے بارے میں سوچنے لگی۔ دانش صاحب' لیکن اس شخص کے بارے کیا سوچے دنیا کے بارے میں اس کا تجربہ ایک ہی تھا۔ بے غرضی' بے لوث ہمدردی کے الفاظ کتابوں اور کہانیوں میں تو ملتے ہیں حقیقی دنیا میں ان کا وجود کب کا ختم ہو گیا ہے۔ ٹھیک تو ہے لوگ محنت کرتے ہیں اور دولت کماتے ہیں اور اسے اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ دنیا تو ضرورت مندوں سے بھری پڑی ہے اگر یونہی لگانے پر آؤ تو ان کا خزانہ بھی ختم ہو جائے۔ تم دوسروں کی ضرورت پوری کرو دوسرا تمہاری' دانش صاحب کو اپنی دولت کا عوض چاہئے تو ٹھیک ہے۔ وہ زبردستی تو نہیں کرتے۔ اپنی دولت خرچ کر کے کسی کے چند لمحات خریدتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم اس دولت کے عوض اپنی ضرورت کے لئے کیا کر سکتے ہو؟

یہ رات بھی تاریک اور سنسان تھی یا پھر یہ دل کی ویرانی تھی۔ مستقبل کی تاریکی تھی جو فضا پر چھائی تھی۔ نہ جانے کب سوئی کب جاگی۔ ذہن کوئی مناسب بات نہ سوچ سکا کوئی مناسب فیصلہ نہ کر سکا۔ مناسب کیا ہے اس کا تعین ہی نہیں کر سکا۔

صبح کو امی کی آواز سنائی دی۔

"نجمہ بیٹی! اٹھو گی نہیں اذان ہو چکی ہے۔" اور وہ اٹھ گئی۔

نماز پڑھی لیکن آج اس نے کوئی دعا نہیں مانگی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مانگے۔ دفتر جانے کا فیصلہ بھی بادل نخواستہ ہی کیا تھا۔ وقت پر تیار ہو کر چلی گئی اور وقت پر دفتر پہنچ گئی۔ آج اس کے دل میں چور تھا۔ کام کرتے کرتے گردن اٹھا اٹھا کر ایک ایک کو دیکھنے لگتی

کوئی نگاہ مشکوک تو نہیں ہے' کوئی گزری ہوئی شام سے واقف تو نہیں ہے لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کسی کی توجہ اس پر نہیں تھی۔ اکاؤنٹینٹ صاحب بھی اس کی ضرورت بھول گئے تھے۔ انہیں کیا پڑی تھی کہ کسی کی پریشانی پر خود کو پریشان کرتے۔ ہاں اگر اس کی درخواست منظور یا نامنظور ہو کر آتی تو وہ ضرور اس کی اطلاع دیتے۔

سارے کام حسب معمول رہے۔ دوپہر کو لنچ ٹائم میں بھی وہ کام کرتی رہی۔ بھوک ہی نہیں لگی تھی۔ پھر پانچ بج گئے اور وہ خوفزدہ سی باہر نکل آئی۔ جب تک بس میں نہیں بیٹھی اس خوف کا شکار رہی کہ اب کوئی اسے بلانے آئے گا اور کہے گا کہ ٹھیک سات بجے صاحب آپ کا انتظار کریں گے۔

لیکن کوئی نہ آیا۔ ابھی تو زبان کی ساکھ باقی ہے مصیبت کا دن تو کل کا ہو گا۔

گھر آئی تو امی کو دیکھ کر بڑا سکون ہوا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج دن بھر درد نہیں ہوا تھا۔ طبیعت بے حد پر سکون تھی۔ امی کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی پریشانی بھول گئی۔ انہیں چائے بنا کر پلائی اور ان سے باتیں کرتی رہی لیکن سات بجے کے قریب اس کے دل پر بڑی وحشت تھی۔

پھر خوف کا دوسرا دن' اس دن دفتر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے قدم لرز رہے تھے۔ کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ یہ نوکری بے حد قیمتی تھی اس کے لئے۔ بڑی مشکل سے ملی تھی۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر نوکری چھوڑ دیتی تو بھیانک حالات پھر گردن پکڑ لیتے۔ پیسے کے بغیر تو ایک قدم چلنا دشوار ہے۔ ابھی اندازہ ہو گیا۔ امی ٹھیک ہو گئیں اگر علاج نہ ہوتا تو......... تو مر بھی سکتی تھیں اور وہ کسی قیمت پر انہیں کھونے کو تیار نہیں تھی۔ پھر اس دنیا میں اس کا کون رہ جائے گا۔ جن حالات سے وہ گزر چکی تھی۔ ان کا خیال کر کے اس کا دل خوف سے لرزنے لگتا تھا۔ امی بھی نہ ہوتیں تو.......... تو..........

اس وقت تقریباً چار بجے تھے جب عبدل اس کے پاس پہنچا وہ کسی کام میں منہمک تھی۔

"نجمہ بی بی!" عبدل نے پکارا اور وہ چونک پڑی۔

"صاحب نے بلایا ہے آپ کو۔"

عبدل نے سادگی سے کہا تھا لیکن نجمہ کے سر پر بم پھٹا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی بلندی سے نیچے لڑھک گئی ہو اور اب رو کے نہیں رک رہی ہو۔ اس نے زور سے میز کی سطح پکڑی اور دیر تک چکراتے ہوئے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ عبدل اسے اطلاع دے کر آگے بڑھ گیا اور اب کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو

رہی تھیں لیکن یہ وقت تو آنا ہی تھا آخر کب تک بچتی رہتی۔ ہمت سے اس وقت کا مقابلہ کرنا تھا۔

وہ اٹھی اور مضبوط قدموں سے دانش صاحب کے کمرے کی جانب چل پڑی۔ عبدل نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ عقبی دروازے کا پردہ برابر تھا اور دانش صاحب فائلوں پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ میز سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ چند ساعت کے بعد دانش صاحب نے کاغذ سرکائے اور قلم بند کر کے رکھ دیا۔ ان کے چہرے سے کسی تاثر' احساس نہیں ہو تا تھا۔

"آپ کی والدہ اب کیسی ہیں نجمہ بیگم!" انہوں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں سر!"

"آپ کل نہیں آئیں؟"

"جی!"

"کیوں؟"

"جس مقصد کے لئے آپ مجھے بلانا چاہتے تھے دانش صاحب! اس کے لئے میں بے کار ہوں۔ میں حالات کی شکار ایک غریب لڑکی ضرور ہوں' فاحشہ نہیں۔" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"لیکن آپ نے وہ روپے تو قبول کر لئے تھے نجمہ بیگم!"

"وہ میری ضرورت تھی' آپ انہیں میری تنخواہ سے کاٹ لیں۔"

"اس وقت یہ بات آپ نے نہیں کہی تھی بلکہ آپ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی تھیں۔"

"میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔"

"یہ بدمعاملگی اور بے ایمانی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ قابل اعتبار نہیں ہیں۔" دانش صاحب نے کہا۔

"آپ چاہیں تو عزت بچانے کی کوشش کو بے ایمانی کہہ سکتے ہیں' دانش صاحب! کیونکہ آپ کے نزدیک عزت کا مفہوم مختلف ہے۔ میں مجبور اور بے سہارا ہوں لیکن بھیڑیوں کا شکار نہیں بن سکتی۔"

"کمال ہے نجمہ صاحبہ! آپ مجھے گالیاں دینے پر اتر آئیں۔ حالانکہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آپ نے اپنی ضرورت مجھ سے کہی' میں نے اپنی آپ سے' دونوں کے درمیان

ایک سودا ہوا اور آپ اس سودے میں بے ایمانی پر اتر آئیں۔ اس کے بعد آپ مجھے گالیاں دے رہی ہیں اور پھر بھی آپ خود کو نیک نفس اور مجھے بھیڑیا کہہ رہی ہیں۔ اگر آپ کو یہ بات منظور نہیں تھی تو آپ وہ روپے قبول نہ کرتیں اور یہاں سے چلی جاتیں۔"

"میری مجبوری نے مجھے خاموش کر دیا تھا۔"

"لیکن آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہو گا مس نجمہ!"

"سر یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔" نجمہ نے غصے سے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس کا بدن لرز رہا تھا۔ یہ نوکری تو گئی۔ اس نے سوچا۔ بہرحال اللہ مالک ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ دانش صاحب کی باتوں میں سچائی تو تھی۔ وہ سب کچھ ہوا تھا جو انہوں نے کہا تھا لیکن .... لیکن مجبوری کی یہ قیمت تو نہیں ہوتی کہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا جائے۔ کیا عزت کی روٹی کمانا اتنا ہی مشکل ہے' کیا لڑکیوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ پھر اس کے اندر بغاوت کا سا ایک جذبہ پیدا ہوا' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ دانش صاحب نے جو چاہا تھا وہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی اور ایک بری بات کے جواب میں جو کچھ اس نے کیا وہ بھی کوئی بری بات نہیں تھی۔ ملازمت رہے یا جائے حالات کا مقابلہ کیا جائے گا۔

لیکن کچھ نہ ہوا۔ کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ ملازمت پر آتی رہی۔ اس واقعے کو تین دن گزر گئے تو اس نے سوچا کہ برا آدمی بزدل بھی ہوتا ہے۔ دانش صاحب کے دل میں اس کے لئے نفرت تو ہو گی لیکن وہ کان دبا کر بیٹھ گئے۔ اگر اس کے خلاف کوئی کارروائی کرتے تو ان کی حقیقت بھی تو سامنے آتی۔

چوتھے دن عبدل نے اسے پھر دانش صاحب کا پیغام دیا وہ بھونچکی رہ گئی۔ ان تین دنوں میں اسے جو تقویت ملی تھی وہ پھر ڈانواں ڈول ہو گئی۔ بہرحال مالک نے طلب کیا تھا جانا اس کا فرض تھا۔ وہ اٹھ گئی۔ دانش صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اپنی سیٹ پر نہیں تھے۔ شاید باتھ روم میں تھے۔ وہ کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگی اور چند ساعت کے بعد وہ آ گئے۔ ان کا چہرہ حسب معمول بے تاثر اور سپاٹ تھا۔

"آپ نے سوچا ہو گا مس نجمہ! کہ میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور آپ نے میری خاموشی کو بزدلی پر محمول کیا ہو گا۔"

"نہیں جناب!" وہ نگاہیں جھکا کر بولی۔

"پھر کیا سوچا تھا آپ نے؟" وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میں نے سوچا کہ شاید آپ کو میری مجبوری پر رحم آ گیا۔" اس نے بدستور نگا
جھکائے جھکائے کہا۔

"رحم دوسری چیز ہے۔ اگر آپ مجھ سے کام لیتیں تو آپ کی ساری مجبوریاں دور
جاتیں۔ آپ کا عہدہ بڑھ جاتا۔ تنخواہ بڑھ جاتی' اور اگر آپ ایک ماہ میں چار مرتبہ بھی دفت
اوقات کے علاوہ مجھ سے ملاقات کر لیتیں تو چار ہزار کی آمدنی الگ سے ہوتی۔ نہ جانے کی
آپ احمقوں کی جنت میں زندگی گزارنے کی شائق ہیں۔"

"اگر یہی سب کچھ کرنا ہوتا دانش صاحب! تو اس کے لئے آپ ہی رہ گئے تھے۔
کہیں بھی یہ سب کچھ کر سکتی تھی۔"

"گویا اب بھی آپ کی سوچ میں لچک نہیں پیدا ہوئی۔"

"میں پہلے بھی آپ کی ناپاک پیشکش پر لعنت بھیج چکی ہوں اور میری درخواست ہے
آئندہ آپ میری یوں توہین نہ کریں ورنہ میں آپ کے خلاف سخت قدم اٹھاؤں گی۔" وہ
کر بولی۔

"ٹھیک ہے' میں بے ایمانوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ جا سکتی ہیں۔
فائل مینیجر صاحب کو دے دیں۔" دانش نے ایک کاروباری فائل اٹھا کر اسے دے دیا۔

وہ کمرے سے نکل آئی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ دانش نے پھر اس کے ذ
میں کھولن پیدا کر دی تھی۔ اس کے وجود میں پھر بے بسی ابھرنے لگی تھی۔ یہ بھی کوئی زند
ہے۔ یہ نوکری تو نہیں جہاں وہ ہر وقت ذہنی کرب اور خوف کا شکار رہے جب بھی ا
دانش کی صورت نظر آئے گی وہ خوفزدہ ہو جائے گی۔ ایک چور کی طرح زندگی گزارنے
فائدہ۔

پھر یہ نوکری چھوڑ دی جائے۔ اللہ مالک ہے۔ کوئی دوسری مل جائے گی۔ کرب کے ء
میں تو زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ کر تھوڑی دیر تک خود کو نارمل کرنے
کوشش کرتی رہی پھر فائل لے کر مینیجر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہاں بھی مینیجر کے پا
چند افراد بیٹھے ہوئے تھے اس لئے وہ فائل مینیجر کے حوالے کر کے خاموشی سے باہر نکل آئی

وقت گزر تا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ لنچ میں چلی جائے گی۔ اسی سے کوئی بہانہ کر د
گی۔ کہہ دے گی کہ اسے ٹرائل پر رکھا گیا تھا۔ کام مشکل تھا اس لئے وہ نااہل قرار دے د
گئی۔ صحیح حالات اگر انہیں بتا دیے تو وہ خوفزدہ ہو جائیں گی اور اس کے بعد اسے ملازمت

صاحب کچھ کام لے کر آئے تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میں لنچ میں چلی جاؤں گی' اختر صاحب! مجھے کچھ کام ہے۔"

"اوہ کیا چھٹی لے لی ہے۔ مجھے علم نہیں تھا۔" اختر صاحب بولے اور پھر واپس چلے
گئے۔

وہ بیٹھی سوچتی رہی لیکن ابھی لنچ میں آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ عبدل کسی قدر بدحواس سا
اس کے قریب آیا۔

"بی بی! آپ کو دانش صاحب بلاتے ہیں۔"

"کیوں بلا رہے ہیں۔ میں مصروف ہوں۔ ابھی نہیں آ سکتی۔" اس نے نفرت بھرے
لہجے میں کہا۔

"مگر بی بی!" عبدل نے پریشان لہجے میں کہا۔

"جاؤ کہہ دینا نہیں آئی۔" وہ کرخت لہجے میں بولی۔

عبدل چلا گیا لیکن چند ہی لمحات کے بعد وہ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ واپس آیا۔ کانسٹیبلوں
کو دیکھ کر نجمہ ہکا بکا رہ گئی۔ دفتر کے دوسرے لوگ بھی سنسنی خیز نگاہوں سے کانسٹیبلوں کو دیکھ
رہے تھے۔ دفتر میں پولیس کا کیا کام؟

"مس نجمہ آپ ہیں۔" ایک پولیس والے نے کہا۔

"ہاں۔" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"ہم آپ کی تلاشی لیں گے۔" کانسٹیبل بولا۔

نجمہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ سحرزدہ سی اٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا
تھا۔ مینیجر صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ کانسٹیبل اس کی میز کی درازیں ٹٹولتے رہے اور پھر سب
سے آخری دراز میں فائلوں سے ڈھکے ہوئے ایک سرخ لفافے پر ہاتھ مار کر انہوں نے لفافہ
نکال لیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سو سو کے نوٹوں کی چار گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مینیجر کا منہ
کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے شدید حیرت جھانک رہی تھی۔ تب ایک کانسٹیبل نے مینیجر
صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لفافہ آپ کی موجودگی میں برآمد ہوا ہے مینیجر صاحب۔"

"تشریف لائیے شریف زادی۔" دوسرے کانسٹیبل نے حقارت سے نجمہ کو مخاطب
کرتے ہوئے کہا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔

تھی۔ اس کا نرم بازو کانسٹیبل کے آہنی ہاتھ میں دبا دکھ رہا تھا لیکن وہ اس تکلیف کو بھی بھول گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عالم خواب میں ہو۔ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر جو کچھ ہوا اس کی آوازیں تو اس کے کانوں میں آتی رہیں لیکن وہ خود جیسے ان سے بے تعلق تھی۔

"جی ہاں۔ یہ لڑکی ایک ہفتے قبل ملازم رکھی گئی ہے۔" یہ دانش صاحب کی آواز تھی۔"

"کسی کی معرفت آئی تھی یہ۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں انٹرویو میں کامیاب ہوئی تھی۔"

"کیا یہ آپ کے دفتر میں آئی تھی۔"

"تھوڑی دیر قبل' اس وقت میں باتھ روم میں تھا۔"

"یہ رقم کہاں رکھی تھی۔"

"میز کی دراز میں۔"

"ہاں' اختر صاحب آپ کیا بتا رہے تھے۔"

"یہ لنچ ٹائم کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں کوئی کام لے کر ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ لنچ ٹائم میں چلی جائیں گی۔"

"خیر' ان باتوں کی ضرورت بھی نہیں ہے آپ کی رقم برآمد ہو گئی ہے۔ ذرا اس کی شکل دیکھیں۔ صورت سے تو شریف معلوم ہوتی ہے لیکن اس قسم کی لڑکیاں۔ کمال ہے دانش صاحب! آپ آئندہ کوئی نیا اپائنٹ منٹ کرتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھا کریں۔"

"میرے خیال میں یہ ضرورت مند تھی لیکن بیوقوف نے پورے چالیس ہزار پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔" دانش صاحب بولے۔

"ضرورت مند؟"

"ہاں شاید اس کی ماں بیمار ہے۔ اس نے ملازمت پر آتے ہی دوسرے دن ایڈوانس مانگنے کے لیے درخواست دی تھی۔ وہ کاغذ بھی شاید میرے پاس موجود ہے۔ دیکھیے تلاش کرتا ہوں ہاں یہ ہے۔"

"خوب مگر یہ ایڈوانس تو کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔" انسپکٹر دانش صاحب سے بے تکلف لگتا تھا۔

"ایسے ناپاک وجود قابل قبول نہیں ہوتے ایسی لڑکیاں دوسری شریف لڑکیوں کا بھرم

بھی کھو دیتی ہیں۔" دانش صاحب نفرت سے بولے۔

"فکر نہ کریں۔ ہم اس کی اصلاح کر دیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو۔"

"ضرور تکلیف دیں گے۔ چلو لے چلو اسے ہتھکڑیاں ڈال دو۔" انسپکٹر نے کہا۔

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑیں تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس نے وحشت زدہ نگاہوں سے دانش صاحب کو دیکھا جو مسکرا رہے تھے۔

"چلو۔" کانسٹیبل نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟ کہاں۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی میں نہیں جاؤں گی۔ امی............ امی............" وہ دیوانہ وار چیخنے لگی اور دفتر کے تمام لوگ دفتر کے دروازے پر جمع ہو گئے۔

"آپ لوگ کام کریں۔ اس لڑکی نے دانش صاحب کی میز کی دراز سے چالیس ہزار روپے چوری کر لیے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

کانسٹیبل اسے گھسیٹنے لگے لیکن چند قدم چل کر ہی وہ حواس کھو بیٹھی تھی اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی تھی۔ اس کے بعد اسے تھانے میں ہی ہوش آیا تھا لیکن کاش ہوش کے بجائے موت آ گئی ہوتی۔ وہ تھانے کے کسی کمرے میں بینچ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک لیڈی کانسٹیبل کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے حد کرخت چہرہ تھا۔ ہمدردی یا محبت کے تاثرات سے عاری۔

"کیسا حال ہے؟" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ کیسا حال تھا۔ وہ جانتی تھی یا خدا۔ لیڈی کانسٹیبل نے بھی دوبارہ اپنے سوال کا جواب نہیں مانگا اور اسی کرخت لہجے میں بولی۔

"اٹھو۔"

وہ ہمت کر کے اٹھ گئی۔ لیڈی کانسٹیبل نے اس کی کلائی پکڑی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ حوالات کے دو حصے تھے ایک مردوں کے لیے دوسرا عورتوں کے لیے۔ لیڈی کانسٹیبل نے عورتوں والے حصے میں لے جا کر لاک اپ میں بند کر دیا اور سلاخوں دار دروازہ بند کر کے وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

روشنی جل اٹھی تھی لیکن یہ روشنی دل پر ایک ایسا بوجھ ڈال رہی تھی جو ناقابل برداشت تھا۔ اب تو رونے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تقدیر کی سزا آنکھوں کو کیوں دی جائے۔

رونے سے فائدہ؟ ایک آہ اس کے دل سے نکل گئی اور لرزتی آواز نے آہستہ سے کہا۔

"میں بے قصور ہوں مالک! اب جو تیرا جی چاہے کر۔" اس کے بعد کوٹھری کے ایک کونے میں زمین پر جا بیٹھی۔

رات گیلی لکڑی کی طرح آہستہ آہستہ سلگتی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے خیالات آ رہے تھے۔ امی کو اب کسی نہ کسی حادثے کا یقین ہو گا لیکن وہ رونے کے علاوہ کیا کر سکی ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ پڑوس میں کسی سے کہا ہو گا لیکن وہ لوگ بھی کیا کریں گے' دفتر بند ہو چکا ہو گا۔ کہاں سے معلوم کریں گے میرے بارے میں اور پھر کون تگ و دو کرے گا۔ یہ دنیا' یہ دنیا بالکل بیکار جگہ ہے۔ بس جی رہے ہیں لوگ' بس لیے کہ مر نہیں سکتے۔ فضول اور بیکار۔ کوئی فائدہ نہیں ہاں کوئی فائدہ نہیں امی میں اور کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کا بھی اللہ حافظ جیسی گزرے گزار لیے اور پھر اور پھر مر جائیے۔

دل میں ایک گولہ بنا اور آنکھیں بے قابو ہو گئیں۔ اب انہیں مرنے سے کون روک سکتا ہے۔ اس کے تصور میں ماں کی میت تھی۔ کلمہ طیبہ کا ورد ہو رہا تھا۔ کافور اور اگر بتیوں کی بو اس کی ناک میں بسی جا رہی تھی۔ دنیا کے دکھوں سے مرجھایا ہوا چہرہ آخری دیدار کے لیے کفن کھول دیا گیا تھا۔ لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ صرف وہ نہ تھی جسے وہ چہرہ دیکھنا چاہیے تھا۔ لوگوں نے چہرہ ڈھک دیا اور میت لحد میں اتار دی گئی۔ اس کے بعد مٹی کا ایک تودہ رہ گیا اور بس۔ وہ سسک سسک کر روتی رہی اور رات سلگتی رہی۔

نہ جانے کیا بجا تھا اس وقت جب دروازہ کھولا گیا۔ دو سپاہی تھے جنہوں نے اسے باہر آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ نہ جانے کہاں سے ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ نہ قدموں میں لغزش تھی نہ دل میں خوف بس پورے ماحول سے ایک بیزاری سی تھی۔ وہ انچارج کے کمرے کمرے میں پہنچا دی گئی۔ وہی انسپکٹر تھا جس نے اسے گرفتار کیا تھا۔ اس نے ایک فائل سامنے رکھ دی۔

"یہاں دستخط کر دو۔" اس نے ایک جگہ انگلی رکھ دی اور قلم اس کی طرف بڑھا دیا۔ قلم لے کر اس نے دستخط کر دیے تھے۔ کوئی بحث بیکار تھی سوائے اس کے کہ اپنی ذات کے لیے عذاب خرید لیا جائے۔ اب صاحب زر مالک تقدیر ہوتے ہیں لگتا ہے کاتب تقدیر کا عہدہ چند انسانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جو اب تقدیر کے حکمران ہیں اور زندگی کے فیصلے ان کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ وہ دواؤں میں ملاوٹ کر کے' غذاؤں میں ملاوٹ کر کے بیماریاں تقسیم کرتے ہیں اجناس اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں ذخیرہ کر کے' بھوک اور افلاس

پھیلاتے ہیں۔ جس سے خوش ہوں اس کے وارے نیارے اور جس سے ناخوش ہوں زندگی اس پر بوجھ بنا دی۔

یہی ہوا تھا۔ ایک صاحب زر نے ناخوش ہو کر خدا کی زمین تنگ کر دی تھی۔ آزادی چھین کر سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا تھا۔

"اگر تم چاہو تو عدالت میں اپنی صفائی میں بیان دے سکتی ہو۔"

"لیکن اس وقت یہی تمہارے حق میں بہتر تھا کہ تم چوری کا اقرار کر لو ورنہ پولیس کو یہ اقرار کرانے کے لیے تم پر تشدد کرنا پڑتا۔" انسپکٹر نے کہا وہ خاموش رہی پھر وہ بولا۔

"کیا واقعی آپ نے دانش صاحب کی میز سے یہ لفافہ نکالا تھا۔"

"آپ یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ دل تمہیں چور نہیں مان رہا لیکن سب کے سامنے تمہاری میز سے یہ لفافہ برآمد ہوا تھا جس کی تلاش کے لیے دانش صاحب نے مجھے بلایا تھا۔ چالیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی اور پھر دانش صاحب تمہارے سخت خلاف ہیں۔ میں نے تمہاری سفارش بھی کی تھی ان سے۔ میں نے کہا تھا کہ ممکن ہے کہ ضرورت اور مجبوری نے تمہیں اس کام کے لیے مجبور کیا ہو' اگر وہ اجازت دیں تو رقم تو برآمد ہو ہی گئی ہے کیس رجسٹرڈ نہ کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے لیکن دانش صاحب نے سختی سے کہا کہ تمہارے خلاف کیس ضرور بننا چاہیے اور کوئی رعایت نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس قسم کے مجرموں کو چھوٹ نہیں دینا چاہتے۔ کس بات پر ناراض ہیں وہ تم سے۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ انسپکٹر۔" اس نے گردن جھکا کر کہا۔

"کوئی ضمانت دے سکتا ہے تمہاری؟ نقد ضمانت ہو گی۔"

"کوئی نہیں دے سکتا۔"

"تمہارے والد.......... میرا مطلب ہے تمہارے عزیزوں میں سے کوئی ہے۔"

"ماں کے سوا کوئی نہیں ہے اور وہ بیمار ہے۔"

"سب انسپکٹر تمہارا پتا نہیں لے سکا ہے تم بتا دو کل تمہارے گھر اطلاع کر دی جائے گی۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں لوگوں سے کہہ سن کر تمہاری ضمانت کا بندوبست کر دے۔"

وہ سوچنے لگی اور پھر بیزاری سے اپنا پتا دہرا دیا جسے انسپکٹر نے لکھ لیا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ صرف یہی کر سکتا ہوں بی بی! کہ جب تک تم حوالات میں ہو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔ معاملہ اگر اتنے بڑے اور صاحب اختیار کا نہ ہوتا تو میں

تمہیں چھوڑ دیتا لیکن دانش صاحب کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"انسانوں کی سی باتیں کر کے انسانوں پر میرا اعتماد بحال کرنے کی کوشش نہ کریں انسپکٹر صاحب! جو آپ کی ضرورت ہو کرتے رہیں۔ میں آپ کے کاموں میں مداخلت نہیں کروں گی۔" اس نے جواب دیا۔

☆------☆------☆

رات گزر گئی۔ صبح کو ناشتہ دیا گیا جو شاید انسپکٹر کی مہربانی سے غنیمت تھا اور کسی قدر صاف ستھرے برتنوں میں تھا۔ اس نے ناشتہ کر لیا نہ کرتی تو کیا کرتی سخت بھوک لگ رہی تھی۔ پھر پڑوس کے فرید چچا آئے اس سے وعدہ کر گئے کہ کسی وکیل سے بات کریں گے ماں کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ رات بھر کی گمشدگی سے اس کی ماں کی حالت پھر خراب ہو گئی تھی۔

فرید چچا تین دن تک واپس نہیں آئے۔ چوتھے دن وہ محلے کے بزرگ امین خان کے ساتھ آئے۔ وکیل کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا کوئی نقد ضمانتی بھی نہیں مل سکا تھا' ہاں ایک خوشخبری اور سنا گئے تھے وہ دونوں۔ بیماری کی وجہ سے ماں کو ہسپتال میں داخل کر دیا ہے۔

امی کی حالت واقعی بہت خراب ہو گئی لیکن وہ بے بس پنچھی تھی جو کھو گیا تھا اسے پا نہیں سکتی تھی۔ امین خان نے بھی اسے تسلیاں دیں اور پھر وہ دونوں چلے گئے۔

گزرنے والی ہر گھڑی مایوسی میں اضافہ کرتی تھی۔ اسے کسی ہمدرد کا انتظار تھا۔ کسی ایسے ہمدرد کا جو تڑپتا ہوا آئے اور اس کی بے بسی پر رو پڑے۔ چیخ کر کہے کہ یہ معصوم لڑکی چور نہیں ہے اسے آزاد کر دو ورنہ' ورنہ میں اس ناپاک معاشرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ میں اس سماج کے در و دیوار ہلا دوں گا۔ کوئی اس کے سامنے نہ بول سکے۔ سب کو سانپ سونگھ جائے اور پھر وہ یہاں سے نکل کر اپنی امی کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن یہ خوابوں کی بات تھی۔ خود کو جھوٹی تسلیاں دینے کا راستہ تھا۔ ایسا کوئی نہیں تھا۔ خود کو فریب دینے سے فائدہ۔ کوئی نہ آیا فرید چچا امین خاں اور نہ کوئی اور شریف لوگوں کو یوں بھی تھانے آتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ امی کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

پھر اسے عدالت میں پیش کیا گیا جہاں اس پر الزامات لگانے والے بہت سے لوگ تھے اس کی صفائی میں کہنے والا کوئی نہ تھا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ بہت سی باتیں اس سے پوچھی گئیں اس نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا کہتی' دانش کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور پھر

اسے جیل بھیج دیا گیا۔

جیل تھانے کی نسبت دلچسپ جگہ تھی یہاں شریفاں تھی جس نے اپنے آوارہ دوست کو زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا اور اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا' نازو تھی جس پر گھر میں گھس کر چوری کا الزام تھا اور پھر کئی لڑکیاں اور عورتیں تھیں جن کی الگ الگ کہانیاں تھیں۔

اس ماحول میں اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی سماج اور معاشرے کا شکار وہ تنہا نہیں تھی سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوا تھا۔ سب کے تجربات اسے تسلی بخش رہے تھے۔ شریفاں کے آوارہ شوہر نے اس سے محبت کی تھی اور جب معاشرے سے لڑ کر اپنے لئے عدالت سے خود مختاری لے کر اس نے انعام اللہ سے شادی کر لی اور اس کی محبت میں اپنے بھرے پرے خاندان کو بھول گئی تو انعام اللہ نے اسے غلط راہوں پر چلانا چاہا۔ وہ خود نکما تھا لیکن اچھی زندگی کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کا ذریعہ شریفاں کو بنانا چاہا تو شریفاں نے اس سے اپنی توہین کا انتقام لیا۔ اس نے اس لیے تو گھر نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے انعام اللہ کو دھتورا کھلا دیا اور گرفتار ہو گئی۔ نازو کو بھی اس کے باپ نے چوری سکھائی تھی۔ ساری کہانیاں ایک جیسی تھیں۔ عدالت میں چند پیشیاں ہوئیں اور اس کے بعد اسے ایک سال کی سزا سنا دی گئی۔ ماحول بدل گیا اب وہ ملزمہ کے بجائے مجرمہ بن چکی تھی۔ چند ہفتوں کے بعد شریفاں بھی اس کے پاس آ گئی۔ اسے سات سال کی سزا ہوئی تھی۔

سزا ہونے کے تقریباً تین ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک دن وہی انسپکٹر صاحب جیل آئے جنہوں نے اسے گرفتار کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس پر نگاہ پڑی تو اسے پہچان کر اس کے پاس آ گئے۔ "کیسی ہو نجمہ؟"

"انسپکٹر صاحب! آپ سب کی مہربانیوں سے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اس جنت میں بھلا تکلیف کیسی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور انسپکٹر کی نگاہیں جھک گئیں۔

"تمہارے گھر سے کوئی آیا؟"

"میرا گھر؟ میرے گھر میں کوئی ہوتا انسپکٹر تو میں بے گناہ جیل میں نہ ہوتی۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے تمہارا کوئی پڑوسی۔"

"پڑوسی' ہمدرد' دوست' دلچسپ الفاظ ہیں اور اس ماحول میں' میں ہنس نہیں سکتی انسپکٹر صاحب! براہ کرم ہنسانے والی باتیں نہ کریں۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں بھی معلوم ہوا۔"

"امی.......... امی.........." اس کی آواز رندھنے لگی۔

"ہسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کسی نے تھانے آ کر اطلاع دی تھی۔" انسپکٹر نے افسردہ لہجے میں کہا اور دل میں پھر ایک گولہ اٹھا' آواز بند ہو گئی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور آنسو بھری آواز میں بولی۔

"امی نے تو ہمیشہ مجھ پر احسانات کیے ہیں۔ یہ ان کا آخری احسان ہے۔ انہوں نے مجھے اس کشمکش سے نجات دلا دی تھی۔ میری دوست' میری ہمدرد' مجھے سرزنش کرنے والی میری محاسب وہی تو تھیں اور میں سوچتی تھی کہ جیل سے نکلنے کے بعد میرا ان سے سامنا ہو گا تو میں کیا کہوں گی' وہ کہیں گی کہ اگر تم بے گناہ تھیں تو تمہیں سزا کیوں ہوئی۔ کیا قانون اندھا ہے۔ کیا خدا نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جب وہ مجھے یہ باتیں کہیں گی تو میں انہیں کیا جواب دوں گی میں تمہاری احسان مند ہوں امی.......... امی! میں بے قصور ہوں۔"

اس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ زار و قطار رونے لگی بے ہوش ہو گئی اور جب ہوش آیا تو اس کا سر شریفاں کی گود میں رکھا ہوا تھا' اس کی ہمدرد غمگسار' اس جیسی اس کے دکھ میں شریک تھی۔

اور جب تک وہ دکھی رہی' وہ اس کے دکھ میں شریک رہی۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے دکھ کو بھول گئی۔ پھر وہی معمولات ہو گئے لیکن اسے اس دن سخت کوفت ہوئی جب اسے رہائی کی خبر سنائی گئی۔ جیلر نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر اپنی دانست میں اسے خوشخبری سنائی تھی لیکن وہ اس بری خبر کو سن کر پریشان ہو گئی۔ حیران نگاہوں سے وہ جیلر کو دیکھتی رہی اور جیلر نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں رہائی کی خوشی نہیں ہوئی۔" وہ چونک پڑی۔

"اب میں کیا کروں جناب۔"

"اب تم اپنے گھر جاؤ اور آئندہ ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارو۔ قدرت نے تمہیں ایک آزاد انسان کی طرح پیدا کیا ہے۔ قانون شکنی کر کے مختصر سی زندگی کو سلاخوں کے پیچھے گزارنے سے کیا فائدہ۔ جاؤ اپنا لباس وغیرہ لے لو۔"

شریفاں اس سے لپٹ کر بلک بلک کر روئی تھی۔ وہ خود بھی بے حد آزردہ تھی۔ جیل کے اس ماحول میں زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ بہت سی باتیں بھول گئی تھی۔ باہر کی زندگی میں پھر وہی کچھ موجود تھا۔ مصائب' الجھنیں' پریشانیاں اور ایک جو واحد ہمدرد ہستی تھی وہ .... وہ چلی گئی تھی۔ اب تو اس کا گھر خالی ہو گا۔

سڑکیں عجیب سی لگ رہی تھی۔ سب کچھ نیا نیا اداس اداس۔ ایک سال نے اسے جانے کیا کیا دیا تھا۔ بہت سے تجربے کیے تھے اس نے' اس ایک سال میں خود پر اور اب پہلے جیسی جذباتی' بات بات پر رو پڑنے والی کمزور نہیں رہی تھی دل کچھ سخت ہو گیا تھا۔

بس سے اتر کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑی اور تھوڑی دیر کے بعد گھر کے سامنے تھی۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کسی نے نہیں کھولا ہے۔ دروازے کے سامنے کھڑی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ پڑوس کے دروازے سے کسی نے سر نکال کر جھانکا اور تھوڑی دیر بعد پورے محلے کو اس کی رہائی کی خبر ہو گئی۔ خالہ تالے کی چابی لے آئیں اور گھر کا دروازہ کھل گیا۔ وہ خالی مکان میں داخل ہو گئی اور اس کے پیچھے پڑوسنوں کا ہجوم۔ گھر کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس کی شاگرد لڑکیاں گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئیں۔ اسے حیرت تھی۔ چوری کی بات تو ان سب کو معلوم ہو گئی ہو گی لیکن انہوں نے انگلیاں نہیں اٹھائیں مجھ پر۔ طعنہ زنی نہیں کی سرگوشیاں نہیں ہوئیں۔ اشارے بھی نہیں کیے گئے ایک دوسرے کو۔ اس کے برعکس وہ پہلے سے کہیں خلوص اور محبت سے پیش آ رہی تھیں۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا انہوں نے۔

امی کی چارپائی خالی تھی اس خالی چارپائی کو اس نے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور بیٹھ گئی۔ خالہ اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ تب اس نے سوال کر ہی لیا۔

"آپ لوگ .... آپ لوگ بھی مجھے چور سمجھتی ہیں۔" بڑا درد تھا اس سوال میں بڑی گھٹن تھی۔

"اللہ پاک کی قسم۔ پورے محلے میں کسی کو بھی اس بات پر یقین نہیں ہے۔ ہم اندھے نہیں ہیں۔ آج سے نہیں جانتے بیٹی تمہیں۔ جن لوگوں نے کسی کی پائی کا احسان قبول نہ کیا ہو۔ جن کے دل خدا نے اتنے بڑے بنائے ہوں وہ ایسے نہیں ہوتے۔ خدا غارت کرے انہیں جنہوں نے تم پر یہ الزام لگایا۔ مظلوموں کا صبر پڑے ان پر۔ آمنہ کے ابا نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ بچی پر جھوٹا الزام ہے۔ ہم سب کو یقین ہے کہ تم بے قصور تھیں۔"

سب کے جواب یکساں تھے اس کے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ اسے امی کی حالات معلوم ہوئے جو بہت دل دوز تھے۔ اسے ان واقعات کا یقین تھا۔ اس کی جدائی کے لمحات میں امی بار بار مری ہوں گی۔ اس وقت تک انہیں سکون نہ ملا ہو گا جب تک ان کی مشکل حل نہ کی ہو گی' آہ' اگر وہ اس حادثے کا شکار نہ ہوئی ہوتی تو شاید اس طرح کھو جاتیں۔

پڑوس کے لوگ اگر مطعون کرتے تو شاید اس کی طبیعت کا وہ ٹھہراؤ قائم رہتا لیکن ہمدردانہ سلوک اور پیار بھری آوازوں نے اس کے زخم کھول دیے اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ آہ ایسی گئی امی کے پاس سے کہ پھر انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اسے ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ آخری بار انہوں نے اسے صبح کی نماز کے لیے جگایا تھا بس یہ ان سے آخری گفتگو تھی اور اس کے بعد ....

اس ایک سال نے اسے بہت کچھ دیا تھا رات بھر امی کی خالی چارپائی اسے ڈستی رہی۔ عائشہ خالہ اس کے پاس ہی سوئی تھی۔ پھر صبح صبح اس کے لیے ناشتہ آ گیا تھا۔ اگر یہ لوگ اسے نہ سنبھال لیتے تو نہ جانے رہائی کے بعد کی زندگی کیا بن جاتی لیکن سب نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی شخصیت آج بھی اسی قدر قابل بھروسہ اور پاک صاف ہے اور اب اسے ان لوگوں کے اعتماد کی لاج رکھنا ہے۔ دانش جیسے شخص کے خلاف وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کمزور اور بے بس تھی۔

دن گزرنے لگے۔ تلخ حقیقتیں عیاں ہونے لگیں زندگی بھی ایک قید ہے جس سے اپنی مرضی سے رہائی ممکن نہیں ہے جب تک سانس ہے جینا پڑتا ہے۔ اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا پڑتا ہے عائشہ خالہ نے پیشکش کی۔

"بیٹی تمہاری امی زندہ ہوتیں تو تمہارے بارے میں بہتر سوچتیں۔ اب وہ نہیں ہیں تو میں یہ بات تم سے کرنے پر مجبور ہوں۔ کیا تم مجھے اجازت دو گی۔"

"کیا بات ہے خالہ۔"

"لمبی زندگی پڑی ہے بیٹی! ہم لوگ تمہارے لیے فکر مند ہیں۔ آمنہ کے ابا کہہ رہے ہیں کہ تمہاری اجازت لے کر تمہارے لئے رشتہ تلاش کر لیا جائے۔ یوں اکیلی کب تک رہو گی زمانہ خراب ہے۔"

"نہیں خالہ! خدا کی قسم نہیں۔ یہ کبھی نہ سوچیں میرے بارے میں۔ تنہا رہوں گی' نوکری کروں گی۔ اگر کبھی میرے بزرگوں کو' آپ کو میرے کردار میں کوئی کجی کوئی خرابی نظر آئے تو میں اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔"

"نہ بیٹی خدا نہ کرے۔ شریف خون کبھی خراب نہیں ہوتے۔ ہمیں یقین ہے لیکن بیٹی اس لمبی زندگی کے لیے۔"

"خالہ نہیں۔ خدا کے لیے مجھے اس پر مجبور نہ کریں۔ ان بچیوں کو پڑھاؤں گی اور بس۔ اگر آپ نے اس کے لیے مجبور کیا تو .... تو میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔

اب میری زندگی کا یہی مقصد ہے ...."

یہ آخری بات تھی خالہ خاموش ہو گئیں۔ سوالات تو اس کے ذہن بھی تھے۔ نوکری .... یہ تصور روح فرسا تھا لیکن اس سے مفر بھی تو ممکن نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ زندگی یہی ہوتی ہے تو یہی سہی۔ پھر کوئی دانش مل جائے گا۔ پھر ایک سال کی سزا کاٹ لی جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ حالات ہمارے تابع تو نہیں ہوتے اور اس کے بعد پھر اس نے اشتہارات دیکھنے شروع کر دیے۔ درخواستیں بھیجنا شروع کر دیں اور ایک دوپہر پھر اسے انٹرویو لیٹر مل گیا۔ بڑا خوفناک کاغذ تھا۔ بہت سے ڈر وابستہ تھے اس سے لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو خوفناک ہونے کے باوجود زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہیں ان سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔

فرید ایکسپورٹرس کے دفتر کی عمارت بوسیدہ سی تھی۔ بندر گاہ کے علاقے میں ایک پرانی سے عمارت میں یہ دفتر واقع تھا جس میں تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں مہمان کے لیے ویٹنگ روم تھا' دوسرے میں کلرک بیٹھے ہوئے تھے اور تیسرا کمرہ باس کا تھا۔ ایک چپراسی نے اسے باس کے کمرے میں پہنچا دیا۔

سیاہ رنگ کی میز کے پیچھے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ دبلے پتلے بدن کا مالک' چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ جو نگاہ کا تھا۔ اس نے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا۔

"نجمہ ہے تمہارا نام۔"

"جی۔" اس نے جواب دیا۔

"پہلی بار ملازمت کے لیے نکلی ہو؟"

"جی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے یہ نوکری تمہاری پہلی نوکری ہو گی۔ یا اس سے قبل بھی نوکری کر چکی ہو۔"

"جی کر چکی ہوں۔" اس کی مدہم آواز نکلی۔

"لیکن اپنی درخواست میں تم نے تجربہ کچھ نہیں لکھا۔"

"یہ نوکری صرف ایک ہفتے کی تھی۔"

"کیوں چھوڑ دی؟" اس نے سوال کیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ چند ساعت سوچتی رہی پھر بولی۔

"یہ بتانا ضروری ہے۔"

"ہاں۔ میں جاننا چاہتا ہوں بی بی! اگر کوئی خاص بات نہ ہو تو بتا دو۔" باس نے کہا اور وہ ے گھورنے لگی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور پھر جب وہ بولی تو اس کے لہجے سے زہر پ رہا تھا۔

"اس لیے چھوڑ دی جناب کہ آپ جیسے ان داتا سمجھتے ہیں کہ غریب اور ضرورت ند ان کے ہاتھوں میں کھلونا ہوتے ہیں۔ آپ اپنی بدکار جوانی میں نامعلوم کتنی لڑکیوں کو اپنی بت کے جال میں پھانس کر شکار کرتے ہیں اور جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تب آپ کے حوس چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں اور کوئی ان پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا تو آپ نئے جال تے ہیں۔ بگلہ بھگت بن کر اپنی دولت کے سہارے مجبوریاں خریدنے کی کوشش کرتے ہیں راجے سکتے جسموں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے لیے آپ سنہری سکوں کی کھنک ے کام لیتے ہیں لیکن سب آپ کے شکار نہیں بن سکتے۔ میں ضرورت مند تھی اس کتے ے یں نے ایڈوانس تنخواہ مانگی تھی۔ صرف اس لیے کہ میری ماں کو نمونیہ ہو گیا تھا اور ہم لوگوں ے سامنے ہاتھ پھیلانے کے قائل نہیں تھے۔ اس نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی وشش کی اور پھر جب میں نے اس کے ہوس سے بھرے شیطان چہرے پر تھوک دیا تو اس نے مجھ پر چوری کا الزام لگوا دیا۔ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مجھے ایک سال کی سزا کرا ی۔ اب میں ایک سال کی قید کاٹ کر آزاد ہوئی ہوں اور اس ایک سال میں اپنی سب سے یمتی چیز اپنی ماں کھو بیٹھی ہوں۔ میری امی مر گئیں اور اب کوئی ایسی خاص شے میرے لیے باقی ہیں رہ گئی ہے۔ جس کے لیے مجھے ایڈوانس مانگنا پڑے۔ آپ سمجھ گئے۔"

وہ شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔ آنسوؤں کی دھار اس کے گالوں سے لڑھک کر یض بھگو رہی تھی اور سامنے بیٹھے شخص کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ چند ساعت وہ خاموش رہا پھر انتہائی نرم لہجے میں بولا۔

"میں ایسا نہیں ہوں بیٹی! میرے لیے تم میری بیٹی کی مانند ہو۔ سارے انسان یکساں ہیں ہوتے۔ تم نے سب کو یکساں کیوں سمجھ لیا۔"

"سب دولت مند ایک جیسے ہی ہوتے ہیں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔" اس نے ٹوٹے وئے لہجے میں کہا اور کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔ آنسو تھے کہ روکے نہ رک رہے تھے۔ اس ی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

تب دراز قد بوڑھا بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور میز کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس نے مجھ

کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کا احسان ہے کہ میں دولت مند نہیں ہوں بیٹی! بس ایک چھوٹا سا کاروبار ہے میں نے کسی امید پر جاری رکھا ہے۔ ورنہ میری تنہا ذات کو اس کی ضرورت نہ تھی لیکن میری آس نہیں ٹوٹی ہے۔ ممکن ہے.......... ممکن ہے کبھی میری تقدیر کی صبح بھی جائے۔ میں دولت مند نہیں ہوں بیٹی! اس کا اندازہ تم اس بوسیدہ آفس سے لگا سکتی ہو۔ جاؤ بیٹی! تم یہاں سے مایوس ہو کر واپس نہیں جا سکتیں۔ میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔ اگر تمہا باپ زندہ ہے تو تم اس لفظ کے تقدس کو پرکھ سکتی ہو۔ خدا نخواستہ اگر وہ نہیں ہیں تب! تمہارے ذہن میں باپ کی آواز تو ضرور ہو گی۔ میں اس آواز میں تمہیں پکار رہا ہوں۔ جاؤ بیٹی!"

ایسا سوز تھا اس آواز میں' ایسا درد تھا کہ نجمہ کا دردآشنا دل لرز گیا۔ وہ تعجب سے ا. دیکھنے لگی باس کے چہرے کی لکیروں میں اسے لاتعداد غموں کی داستان لکھی ہوئی محسوس ہو ایک اعتماد سا قائم ہونے لگا چند لمحات کے لیے وہ اپنا غم بھول گئی اور بیٹھ گئی۔

بوڑھے نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور چائے طلب کرلی۔

"آنسو خشک کر لو بیٹی! مجھے اس بھیڑیے کے بارے میں بتاؤ کون تھا وہ جس نے دنیا۔ تمہارا اعتبار اٹھا دیا۔ کون تھا وہ جس نے اس چھوٹی سی عمر میں تمہیں اتنے غم دے دیے۔"

☆--------☆--------☆

وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔ یہ شخص آخر کیا ہے۔ کیا ایسے ہمدرد بھی ہوتے ہیں ا دنیا میں۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تب وہ ان سے بولی۔

"اس کی فرم کا نام زیڈ برادرز ہے اور وہ خود ہارون پاشا کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اچانک ہی بوڑھے کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ چند لمحات شدید اضطراب کا ش رہا پھر اس نے لرزتے ہاتھوں سے میز کی دراز کھولی اس میں سے ایک سگار نکالا اور اس ایک سرا توڑ کر اسے دانتوں میں دبا لیا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ہاں.......... ہاں.......... ہا.......... آ آ.......... رون۔" اس کے حلق عجیب سی آواز نکلی اور نجمہ حیرت سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"آپ کس قدر مضطرب ہو گئے۔ کیا آپ کا اس سے کوئی رشتہ ہے؟

ر.........."

ہاں ظہیرا اس سے رشتہ ہے۔ نفرت کا رشتہ' انتقام کا رشتہ' یہ شخص' یہ ظالم درندہ لاتعداد دشمن رکھتا ہے' لیکن ابھی تک سزا نہیں ملی۔ یہ کیسا نظام قدرت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ آج بھی زندہ ہے۔ وہ آج بھی انسانوں سے کھیل رہا ہے۔ نہ جانے اور کتنے لوگ اس کے شکار ہوں گے۔ نہ جانے اس کی دیوانگی نے اور کتنی کہانیاں تخلیق کی ہوں گی' میں بھی اس کا شکار ہوں بیٹی! میرے سینے میں بھی اس نے ناسور ڈال دیا ہے کاش میں اس سے انتقام لے سکتا۔ کاش.........." وہ جلدی جلدی سگار کے کش لینے لگا۔

نجمہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھی چپراسی نے چائے لا کر رکھ دی۔ وہ چائے بنانے لگا تو نجمہ نے اسے واپس کر دیا اور خود اپنی طرف چائے کی ٹرے کھسکا کر چائے بنانے لگی۔ اسے چائے پیش کرتے ہوئے وہ بولی۔

"میں ضرورت سے زیادہ جرأت کر رہی ہوں۔ جناب! ملازمت کی تلاش میں آئی تھی لیکن حد سے تجاوز کر رہی ہوں۔ ملازمت دیں یا نہ دیں لیکن آپ کے الفاظ نے میرے ذہن میں تجسس پیدا کر دیا ہے آپ کو اس لعین سے کیا تکلیف پہنچی ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"میں' میں خود تمہیں بتانے کا خواہشمند ہوں۔ میرے تم سے دو رشتے قائم ہو گئے ہیں سمجھیں؟ دو رشتے۔ میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔ تم سے قبل میں نے یہ لفظ کسی اجنبی لڑکی کو نہیں کہا اور ہم دونوں ایک ہی ظالم کے شکار ہیں۔ میں اس کمینہ انسان سے بخوبی واقف ہوں کیونکہ اس نے میری زندگی بھی تباہ کی ہے۔"

فرید احمد خان نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکا لی اور پھر اس کے گھونٹ لیتے رہے۔ وہ ماضی کی یادوں کو تازہ کر رہے تھے پھر ان کی آواز ابھری۔

"بیس سال یا اس سے زیادہ گزر گئے۔ ہم دونوں ایک فرم میں نوکری کرتے تھے۔ وہ اکاؤنٹینٹ تھا اور میں اسسٹنٹ منیجر۔ چھوٹی سی فرم تھی' چند افراد پر مشتمل اسٹاف' بہت گہری دوستی تھی ہمارے درمیان' ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کی بیوی دانیہ بے حد نیک عورت تھی۔ ایک بیٹے کا باپ تھا وہ۔ میری بھی بیوی اور بچی تھی۔ اس وقت میری بچی کی عمر دو سال تھی۔ ہم دونوں اکثر اپنے مستقبل سے پریشان رہتے تھے۔ ہمیں اپنے بچوں کی فکر تھی۔ کرائے کا مکان' قلیل تنخواہ' ہمارا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ تب اس نے ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ اگر ہم اس ملک میں رہے تو یونہی سسک سسک کر مر جائیں گے اور ہماری اولادیں کسمپرسی کی زندگی گزاریں گی۔ اس لیے یہ ضروری

ہے کہ ملک سے باہر نکلا جائے' باہر کی دنیا میں قسمت آزمائی کی جائے۔ میں اس کی با
سن کر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا کہ باہر جانا آسان تو نہیں ہو گا۔ بہت بڑی رقم چاہئے اس ۔
لیے اور پھر بچوں کا کیا ہو گا۔ تب اس نے کہا کہ وہ تمام انتظامات کرے گا۔ رقم
بندوبست بھی ہو جائے گا۔

"اور بچے؟" میں نے پوچھا۔

"تم بھابی سے بات کرو۔ یوں کرو کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے ان کی بہن کے پا
بھیج دو اور اتنا خرچ دے جاؤ کہ چند ماہ آسانی سے گزار لیں۔"

"کمال کی باتیں کرتے ہو ہارون۔ آخر یہ سب کہاں سے ہو گا۔"

"دیکھو دوست! اگر اسی طرح زندگی گزارتے رہے تو بہت جلد بوڑھے ہو جاؤ گے
ہمت کرنا ہو گی رقم کا بندوبست میرے اوپر چھوڑو اور دوسری تیاریاں کرو۔ ہم جو
کریں گے اپنے بچوں کے لیے کریں گے۔ بہتر زندگی کے لیے کریں گے۔ تم بس
ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اس نے کچھ ایسی یقین دہانیاں کرائیں کہ میں اس
باتوں میں آ گیا۔ میں نے اپنی بیوی کو آمادہ کر کے اس کی بہن کے ہاں بھیج دیا اور اس
ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ اس نے طے کیا تھا کہ یونان کے ایک جہاز سے اسمگل ہو کر ہم با
جائیں گے اور اس کا بندوبست بھی کر لیا لیکن یہ بات ہمارے درمیان طے ہو گئی کہ
دونوں کے علاوہ کسی کو کچھ نہ معلوم ہو۔

اور پھر ایک شام اس نے مجھے پانچ ہزار روپے دیے اور کہا کہ یہ میں اپنی بیوی
بھجوا دوں۔ ہمیں رات ہی کو جہاز پر پہنچنا ہے کیونکہ صبح چار بجے جہاز ساحل چھوڑ دے
نہ جانے اس نے کیا چکر چلایا تھا۔ میں سوچنے لگا' بہرحال میں نے رقم بیوی کو بھجوا دی ا
پھر اس رات ہم دونوں نے ملک چھوڑ دیا۔ یونانی جہاز چل پڑا اور طویل سفر کے بعد ا
نے ہمیں ایک یورپی ملک میں چھوڑ دیا۔ بڑی سخت مشکلات سے زندگی بسر کرنا پڑی۔ تق
چھ ماہ ہم نے فاقہ کشی میں گزارے۔ میں اکتا رہا تھا اور اکثر اس سے میری جھڑپ ہو ج
تھی' پھر ایک دن میں نے اس سے سخت لہجے میں کہا کہ میں ہر قیمت پر واپس اپنے ملک
جاؤں گا۔ میں بیوی بچوں سے دور نہیں رہ سکتا تو اس نے کہا کہ اگر ہم اپنے ملک گئے
گرفتار ہو جائیں گے۔

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

تمہیں وہ رقم یاد ہو گی جو ہمارے یہاں آنے کا ذریعہ بنی تھی۔"

"ہاں یاد ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تمہیں وہ پچیس ہزار روپے بھی یاد ہوں گے جو آر گن برادرز سے وصول
ہوئے تھے اور تم نے مجھے جمع کرانے کے لئے دیے تھے۔"

"ہاں یاد ہیں۔" میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اس رقم کا اسٹیٹ منٹ تو بن گیا تھا لیکن کسی پاس بک میں اس کی بینک میں جمع
ہونے کی رسید نہیں ہے۔ وہ رقم تو ہمارے کام آئی تھی دوست! چھ چھ ہزار روپے کپتان
کو دینے پڑے تھے پانچ پانچ ہزار روپے بیوی بچوں کو باقی رقم آج تک ہماری معاون
رہی۔"

میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اپنے ملک میں' میں ایک مجرم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس
جرم میں ہم دونوں ہی شریک تھے۔ میں بد حواس ہو گیا تو وہ مجھے سمجھانے لگا۔

"اس کے علاوہ چارہ کار نہیں تھا دوست! میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے اور تمہارے
مستقبل کے لیے ہے۔ لگے رہو' اگر دولت حاصل ہو گئی تو اپنے ملک میں چلیں گے۔ اس
وقت تک تمہارے کیس کی فائل بھی بند ہو چکی ہو گی اور اگر نہ بھی بند ہوئی تو دولت
سے کیا نہیں ہو سکتا۔"

مجبوری تھی۔ ہم یورپ کے مختلف ممالک میں آوارہ پھرتے رہے اور پھر تقدیر کا
ستارہ گردش سے نکل آیا۔ مجھے ایک نوکری مل گئی جو شپنگ کمپنی کی تھی۔ ہارون ایک
ہوٹل کا منیجر بن گیا اور ہم دولت کمانے لگے۔ ایک سال کے بعد ہم نے اپنے گھروں کو
بڑی رقم بھیجی۔ شپنگ کمپنی نے میری بہتر کارکردگی سے متاثر ہو کر مجھے کچھ اور ذمہ
داریاں سونپ دیں اور مجھے کئی ملکوں میں جانے کا موقع ملا۔ اس طرح میری آمدنی میں بھی
اضافہ ہو گیا۔ میں نے کچھ اور بھی ہاتھ پاؤں مارے تھے جو ناجائز نہیں تھے لیکن مجھے ان
سے خوب آمدنی ہونے لگی۔ اس کے برعکس ہارون کا گزارہ صرف اس کی تنخواہ پر ہو رہا
تھا۔ اس نے کچھ اور عادتیں بھی ڈال لی تھیں جن میں شراب اور عورت بھی تھی۔ اس
طرح وہ اپنی ساری آمدنی وہیں خرچ کر لیتا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی کا خط میرے ہاتھ لگ
گیا جس میں اس نے اپنی کسمپرسی کا رونا رویا تھا۔ میں نے ہارون کو بہت برا بھلا کہا اور
ایک بڑی رقم اس کی بیوی کو روانہ کر دی۔ جس پر وہ میرا بڑا شکر گزار ہوا تھا۔

کیفیت تھی ہوٹل کی نوکری سے بھی وہ غیر ذمے داری برت رہا تھا جس کی وجہ سے بالآخر اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔ میں اس کی ملازمت کے لیے کوشش کر رہا تھا کہ اس دوران وہ بیمار ہو گیا۔ بیماری بہت شدت اختیار کر گئی اور علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو مجھے تشویش ہو گئی۔ بہر حال طویل عرصے کا ساتھ تھا اور دل میں، میں یہ بات تسلیم کرتا تھا کہ اگر ہارون مجھے یہاں لانے کا ذریعہ نہ بنتا تو میں کبھی اس قابل نہ ہوتا۔ چنانچہ میں نے اسے وطن واپس لانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں کوشش کرنے لگا۔ پہلے میں نے اپنی دولت منتقل کرائی۔ اس کے بعد دوسری کارروائیاں کر کے ہم دونوں واپس آ گئے۔ میں نے اپنا کنٹریکٹ بھی پورا نہیں کیا تھا اور پھر چونکہ ہمیں جعلسازی کر کے واپس آنا پڑا تھا اس لیے یہاں سے دوبارہ واپس جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہاں ہم خاموشی سے داخل ہوئے تھے کیونکہ گرفتاری کا خطرہ تھا۔ میں اپنی بیوی اور بچی سے ملا۔ یہ لوگ سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے اور انہیں ہماری حرکت سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ہارون کی بیوی اور بیٹا بھی خیریت سے تھا۔ وطن آ کر ہارون کی طبیعت خود بخود بہتر ہو گئی اور وہ تندرست ہو گیا۔ اس نے جوڑ توڑ کر کے وہ پچیس ہزار کی رقم کمپنی کو واپس کر دی اور وہ کیس ختم ہو گیا۔ اس سلسلے میں وہ بہت چالاک تھا اور پھر کمپنی کے مالک کو ڈوبی ہوئی رقم ملی تھی اس لیے انہوں نے زیادہ گڑبڑ بھی نہیں کی کچھ رقم پولیس کو بھی کھلانا پڑی۔ اس طرح ہمیں اس خوف سے آزادی ملی۔

میں انتہائی بہتر حالت میں تھا اور ہارون جوں کا توں۔ میرے ضمیر نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ان حالات میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں نے ایک فرم قائم کی اور ہارون کو اس میں ایک چوتھائی حصے کا حقدار بنا کر ڈائریکٹر بنا دیا۔ وہ میرا بے حد شکر گزار تھا پھر ایک حادثے میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور مجھے اس کی اور زیادہ دلجوئی کرنی پڑی۔ تھوڑے دن تو ہارون نے ٹھیک سے گزارے لیکن اس کے بعد عیش و عشرت شراب اور عورت لیکن فرم کے معاملات اس نے ٹھیک رکھے تھے۔ میں فطرتاً مجرمانہ ذہنیت نہیں رکھتا تھا اس لیے اس کی ان چالوں کو نہ سمجھ سکا جو وہ نہایت چالاکی سے چل رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے چند مددگار بھی بنائے تھے جو میرے گرد جال بن رہے تھے۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے پورے کاروبار پر قبضہ کرے۔ لاکھوں روپے کے سودے اس نے فرم کے نام سے کیے اور جعلسازی کر کے رقم ہضم کر گیا۔ اس طرح فرم [illegible]

[illegible] سمجھ سکا۔ اتفاق سے ایک بار کچھ کاغذ میرے ہاتھ لگ گئے جس سے مجھے اس کی جعلسازی کا علم ہو گیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا کام ادھورا رہ گیا تھا اور ابھی اس کی جعلسازی پوری نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اس کی گردن ناپ لی اور وہ بوکھلا گیا۔ میں اگر چاہتا تو اس کی اسکیم اسی وقت فیل کر سکتا تھا لیکن میری فطری شرافت اور نرم دلی نے مجھے اس سے باز رکھا۔ میں نے اسے پندرہ دن کی مہلت دے دی کہ وہ اس دوران ساری رقم واپس کر دے ورنہ پھر میں اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ اس دوران میں نے سارے کاغذات اپنے قبضے میں لے لیے تھے اور اس کی گردن میری گرفت میں تھی۔ اس گرفت سے نکلنے کے لیے اس نے یہ کیا کہ اپنے بدمعاش ساتھیوں کی مدد سے میری بیوی اور بچی کو اغوا کر کے کہیں پوشیدہ کر دیا۔ میری توجہ دوسری طرف ہٹ گئی اور میرا ذہن وقتی طور پر معطل ہو گیا۔ بیوی اور بچی کے علاوہ میرا اس دنیا میں اور کون تھا یہ ذلیل انسان ایک بار پھر میرے ہمدرد کی حیثیت سے سامنے آیا اور اس نے ان دونوں کی تلاش میں دن رات ایک کر دیے اور میری اس ذہنی پریشانی سے فائدہ اٹھا کر اس نے وہ کاغذات غائب کر دیے جو اس کے خلاف ثبوت کی حیثیت رکھتے تھے اور اس کے بعد وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ میری بیوی اور بچی اس کے قبضے میں ہے اور ان کی زندگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ میں زبان بند رکھوں۔

میں غصے سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں نے شدت جوش میں اسے قتل کرنے کی کوشش کی اور وہ سخت زخمی ہو گیا۔ تین مہینے تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہا اور میں جیل میں، صحت یاب ہو کر اس نے میرے اوپر ایک باقاعدہ کیس بنوا دیا۔ پچیس ہزار روپے کے غبن اور اس یورپی کمپنی کو دھوکہ دینے کے کیس کے علاوہ قاتلانہ حملے کا کیس بھی تھا۔ اس لیے مجھے نو سال کی سزا سنا دی گئی اور میں نے زندگی کے نو قیمتی سال جیل میں گزار دیے۔ پھر جب میں جیل سے باہر آیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میں کئی سال اپنی بیوی اور بچی کو تلاش کرتا رہا اور جب ان کی طرف سے مایوس ہو گیا تو ملک سے باہر چلا گیا۔ تین سال تک باہر کی دنیا سے اکتا کر پھر اپنے وطن آ گیا ہوں۔ آج بھی میرے دل میں آس ہے کہ شاید میری گمشدہ جنت مل جائے۔ اگر یہ آس میرے دل میں نہ ہوتی تو شاید میں نے موت کو گلے لگا لیا ہوتا لیکن میں آج بھی عملی زندگی میں ہوں اور محنت کر رہا ہوں، آخری دم تک میں جدوجہد جاری رکھوں گا تاکہ میری بیوی میری بچی اگر وہ

کہیں مجھے مل جائیں تو میں ان کی خدمت کر سکوں۔ انہیں کچھ دے سکوں۔

بوڑھے فرید احمد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ خاموش ہوا تو نجمہ چونک پڑی۔ اسے اس کے آنسوؤں کا احساس ہوا اور اس کے دل میں شدید ہمدردی کی لہر امنڈ آئی۔ وہ بے تاب ہو گئی۔ تب فرید احمد کو بھی ہوش آیا اور اس نے جلدی سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ دیا۔

"مجھے اور چائے دو بیٹی۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور نجمہ اس کے لیے چائے بنانے لگی۔

"تم رو رہی ہو آنسو پونچھ لو۔" فرید احمد نے کہا تب نجمہ کو اس نمکین پانی کا احساس ہوا جو اس کے ہونٹوں کو چھو رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ آنسو اس مظلوم بوڑھے کے لیے ہیں۔

وہ چائے پیتا رہا۔ بجھے ہوئے سگار کو اس نے دوبارہ سلگایا اور چائے پیتے پیتے اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس سے قبل کبھی کسی نے ایسا انٹرویو نہیں دیا ہو گا مس نجمہ! مجھے افسوس ہے۔" بوڑھے فرید نے مسکرانے کی کوشش کی۔ نجمہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔

"تو اب کیا ارادہ ہے مس نجمہ۔"

"جی؟" وہ سوالیہ انداز میں بولی۔

"آپ یہ ملازمت کر لیں گی۔"

"میں تو اسی لیے حاضر ہوئی ہوں جناب!"

"لیکن افسوس' میں آپ کو یہ ملازمت نہیں دے سکتا' مجھے اس کے لیے کسی اور امیدوار کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اوہ شاید' شاید میری میری کہانی؟"

"نہیں بیٹی! میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔ پھر تمہیں ملازم کس طرح رکھ سکتا ہوں۔ تم میری بیٹی بن گئی ہو اب میں تمہاری بنیادی الجھن دور کر کے تمہیں اس کا موقع دوں گا کہ تم اس موذی شخص سے اپنے پندار کی توہین اور ایک سال کے برباد کرنے کا انتقام لو۔ میں خود کو نیک نہیں ثابت کرنا چاہتا خود میری بھی یہی خواہش ہے کہ اس درندے سے انتقام لوں۔ ہمارا مقصد ایک ہے اور مجھے تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔"

"میں تیار ہوں۔ یہ تو میری دلی خواہش ہے۔" نجمہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"تم بہت کچھ کر سکتی ہو نجمہ! صرف ہمت سے کام لو۔ انسان ضرور کمزور ہوتا ہے لیکن جذبے طاقتور ہوتے ہیں۔ جذبے ناقابل شکست ہوتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا میں نے اپنی ہار مان لی۔ غموں نے مجھے وقت سے پہلے ضرور بوڑھا کر دیا ہے لیکن میرے جذبے آج بھی زندہ ہیں۔ میرے دل میں انتقام کی آگ ہے اور میں اس انتقام لینے کے لیے زندہ ہوں۔ بولو نجمہ! میرا ساتھ دو گی۔ اگر تم نے مجھ پر اعتماد کر لیا۔ اگر تم نے میرا ساتھ دینا منظور کر لیا تو ہم دونوں مل کر ایک ایسا کھیل کھیلیں گے کہ ہارون موت کے بعد بھی یاد رکھے گا۔"

"اگر مجھے آپ کا سہارا مل جائے تو میں تیار ہوں۔ میں ہر وہ کوشش کروں گی جس کا آپ مشورہ دیں گے لیکن اس سلسلے میں ایک شرط ہو گی جناب!"

"شرط! وہ کیا بیٹی؟"

"میں آپ کا کوئی مالی احسان قبول نہیں کروں گی۔ سلگتے جذبوں کی تسلی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کاروبار نہ ہو۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو یہ ملازمت دے سکتے ہیں۔"

"کسی صاحب ظرف کی بیٹی۔ باپ بھی نہیں ہے تمہارا۔ تمہاری کہانی میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔"

"میرے والد کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میں بہت چھوٹی تھی۔"

"بہر حال جو کوئی بھی تھا وہ قابل فخر انسان تھا۔ میں تمہارے پندار کو مجروح نہیں کروں گا لیکن تم خود سوچو یہ ملازمت تمہیں مجھ سے منسلک کر دے گی اور یہ بات اگر اس کے علم میں آ گئی تو خطرناک ہو گی۔ اس وقت تک تمہارے جملہ اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ اس کام کی تکمیل کے بعد ہم کوئی مناسب فیصلہ کریں گے۔"

"بات ایک ہی ہو گی جناب!" وہ بولی۔

"ضد مت کرو نجمہ! تمہاری یہ ضد ہمارے انتقام کے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔ ہمیں اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہیے۔" فرید احمد نے لجاجت سے کہا اور تھوڑی ردوقدح کے بعد آخر وہ تیار ہو گئی۔

"تب پھر ابتدائی اخراجات کے لیے یہ تھوڑی سی رقم قبول کرو۔ میں تمہاری یہ ملازمت کی درخواست پھاڑ رہا ہوں کل تم کس وقت آؤ گی۔"

"جب آپ حکم دیں۔"

"شام کو چھ بجے لیکن اس دفتر میں نہیں۔ میری رہائش گاہ انیس کلین اسٹریٹ میں ہے میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"میں پہنچ جاؤں گی۔" اس نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فرید احمد سے رخصت ہو کر واپس چل پڑی۔ بس میں بیٹھے بیٹھے وہ ان واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ فرید احمد کی کہانی تو اس کی کہانی سے بھی دلدوز تھی۔ اس شخص سے تو اس کا سب کچھ چھن گیا تھا۔ کتنا زخمی ہے اس کا دل۔ بوڑھا آدمی ہے' بیوی اور بیٹی کا زخم سینے میں لیے پھر رہا ہے۔ اس کی تو ساری زندگی برباد کر دی گئی۔ دولت چھن گئی' اولاد چھن گئی' نو سال جیل میں گزارے۔ کیا بچا ہے اس کے پاس سوائے ایک آس کے' اس کی آنسوؤں سے تر داڑھی یاد آئی تو اس کا دل بھر آیا۔ کتنا بے بس ہے انسان اور کتنے ہمدرد ہیں آنسو۔

گھر پہنچ گئی۔ رات کی تنہائیوں میں بھی فرید احمد کا خیال آتا رہا اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس شخص سے پورا تعاون کرے گی۔ اپنے رویے میں تبدیلی کرے گی اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کے درد کا مداوا بن جائے۔

☆--------☆-------☆

شام کے چھ بجے وہ کلین اسٹریٹ پر انیس نمبر بنگلہ تلاش کر کے پہنچ گئی۔ گھر میں دو ملازم تھے ایک کار بھی کھڑی تھی۔ جسے اس نے دفتر کے باہر بھی دیکھا تھا۔ ملازموں میں ایک بوڑھی عورت تھی دوسرا اس کا بیٹا تھا۔

فرید احمد نے شفقت سے پُر مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔ اس نے بھی گرمجوشی سے فرید احمد سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔ فرید احمد بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"میں امید و بیم کی کیفیت میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے کہ تم نہ آؤ۔"

"آپ سے وعدہ کیا تھا کیوں نہ آتی۔"

"کیا پیو گی؟"

"چائے۔" اس نے جواب دیا۔

فرید احمد نے بوڑھی عورت کو آواز دی اور جب وہ اندر آ گئی تو پھر وہ بولا۔

"باجی! یہ میری بیٹی ہے۔ اسے پہچان لو۔ یہ گھر اس کا ہے۔ میرے پیچھے اگر کبھی یہ

آ جائے تو اس کا خیال رکھا جائے۔ اب جاؤ چائے لے آؤ لیکن خالی نہیں۔"

"جی بھیا۔" بوڑھی عورت چلی گئی اور نجمہ مسکرانے لگی۔

چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی تھے۔ اس نے بے تکلفی سے سب کچھ کھایا چائے پی بوڑھے فرید احمد کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے' وہ اس کی آمد اور اپنائیت سے بے حد خوش تھا۔ پھر کام کی باتیں شروع ہو گئیں۔

"تمہاری درخواست میں تمہارا پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے غور نہیں کیا تھا اس پر کیا پتا ہے اور کیسا مکان ہے؟"

"غریب لوگوں کی بستی میں ایک معمولی سا مکان ہے لیکن میرے لیے وہ بہت انمول ہے کیونکہ اس سے میری زندگی کی گہری یادیں وابستہ ہیں۔"

"لیکن بیٹی ہم جو کام شروع کرنے والے ہیں اس کے لیے تمہیں ایک بہتر مکان کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو جاؤ۔"

"عارضی طور پر یہ ممکن ہے۔ آپ نہیں جانتے جناب! کہ میں جذباتی طور پر اس مکان سے گہری وابستگی رکھتی ہوں۔ میرے پڑوسی میرے لیے عزیزوں کی مانند ہیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں اگر اس سلسلے میں عارضی طور پر کہیں جانے کی ضرورت پیش آئے تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

"جو منصوبہ میرے ذہن میں ہے' اس میں کوئی کام عارضی نہیں ہے۔ بہرحال میں پہلے تم سے اس منصوبے کے بارے میں گفتگو کروں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم اس شخص کے خلاف اپنے دل میں کتنی نفرت رکھتی ہو جس نے تمہاری زندگی کو ناسور بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جس نے تمہاری ماں کو تم سے چھین لیا۔"

"نفرت؟" نجمہ نے آہستہ سے کہا۔

"نفرت اس کے لیے ایک معمولی لفظ ہے۔ میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی ہے۔ اگر مجھے اس سے انتقام لینے کا موقع مل جائے تو اس کے لیے میں جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ کوئی احساس' کوئی طلب اس طلب سے زیادہ نہیں ہے۔ میرا سارا وجود انتقام ہے۔ میری اپنی ذات کی ہر خواہش' ہر خوشی اس انتقام کے لیے وقف ہے۔ میں اس شخص سے ہولناک بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ جس نے میری ماں کی آخری جھلک بھی مجھے نہ دیکھنے دی۔"

"جذبوں کی شدت ہی فتح مند کرتی ہے۔ ہر احساس ہر لگن چھوڑ دو' زمین' مکان' جائیداد کوئی کچھ نہیں ہے۔ مقصد حیات کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اب میں تمہیں اپنے منصوبے کی تفصیل بتاتا ہوں۔" بوڑھے فرید احمد نے کہا۔

"جی بتایئے۔" نجمہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"میں نے تم سے ہارون کے بیٹے کا ذکر کیا تھا۔ اس کا نام یونس ہے اور وہ اب جوان ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ ہارون کی اور کوئی اولاد نہیں ہے اوباش باپ کا بیٹا بھی اوباش ہے۔ شراب' عیش' ناچ رنگ اور عورت یونس کی زندگی میں شامل ہے۔ تمہیں یونس کو اپنے دام میں پھنسانا ہو گا۔ اس سے اچھا انتقام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہم ہارون کو کسی خارش زدہ کتے کی مانند بے بس کر دیں گے لیکن نجمہ! تمہیں خود کو یکسر بدلنا ہو گا۔ اپنی ذات کے ہر احساس کو کچلنا ہو گا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا بیٹی! خوب سوچ لو' غور کر لو۔"

"سوچ' فکر' غور سچے جذبوں کا مظہر نہیں ہوتے جناب! جب میں نے اپنی ذات کو اس انتقام کے لیے وقف کر دیا ہے تو پھر میری اپنی ذات میرے لیے کچھ نہ رہی' اگر میں اپنے مستقبل اور اپنی زندگی کے بارے میں بھی سوچوں تو پھر جذبوں کی بات کو بالائے طاق رکھنا ہو گا۔ اس ساری دنیا میں میرا اب کوئی نہیں ہے۔ وہ ساری باتیں جو زندگی کی خوشیوں سے تعلق رکھتی ہیں میرے لیے بے مقصد ہیں۔ میں جانتی ہوں جناب! کہ اگر زندہ رہی تو مصائب و تکلیف میں گزار کر بہر صورت سانسوں کی آخری حد تک جا سکتی ہوں' ممکن ہے اس دوران میری زندگی کو کوئی ایسا سہارا مل جائے' جو میرے احساسات کی چبھن میں کچھ کمی کر دے لیکن اس کے باوجود جب بھی کبھی ماضی پر نگاہ ڈالوں گی تو وہ سارے خار بدن میں چبھنے لگیں گے جو میرے ماضی سے وابستہ ہوں گے۔ اس چبھن سے بچنے کے لیے' اس احساس محرومی اور ناکامی کو مٹانے کے لیے اگر مجھے یہ سہارا مل گیا ہے تو میں اسے کھونا پسند نہیں کروں گی۔ آپ قطعی طور پر مطمئن رہیے۔ نجمہ مر چکی ہے مگر اس کا انتقام زندہ ہے اور میں نے اپنے بقیہ سانس اسی انتقام کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ میں آپ کے ہر مشورے پر عمل کروں گی اور آپ قطعی طور پر مطمئن رہیں۔ آپ کبھی مجھے' میرے جذبوں کو کمزور نہیں پائیں گے۔" نجمہ نے کہا اور بوڑھے فرید احمد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ پھر اس نے پُر مسرت لہجے میں کہا۔

"ہارون' تم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے' تمہاری درازی اب تنگ ہونے

ہے اور اس پھندے کی گرفت بہت جلد تم اپنی گردن میں محسوس کرو گے۔ تم دیکھو گے کہ تڑپانے والے کیسے تڑپتے ہیں۔ بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کسی پر ظلم کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔" چند لمحات کے لیے خاموشی چھا گئی' نجمہ اپنے طور پر کچھ سوچ رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے فرید احمد سے پوچھا۔

"کیا ہارون کو آپ کی یہاں موجودگی کا علم ہے۔"

"نہیں۔" فرید احمد نے جواب دیا۔

"کیا وہ آپ کی فرم کے نام سے بھی واقف نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کاروباری آدمی ہے کبھی تو یہ نام سنا ہو گا اور اگر نہیں سنا تو ممکن ہے اس کے علم میں آ جائے اور وہ آپ کی طرف سے ہوشیار ہو جائے۔" نجمہ نے کسی قدر تشویش سے کہا۔

"نہیں بیٹی! ایسا نہیں ہو گا۔ کیونکہ فرید احمد میرا اصلی نام نہیں ہے۔ میں اس بارے میں کسی وقت تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنا نام تبدیل کیا ہے اور نیا کاروبار اپنا کر یہ کاروبار شروع کیا ہے۔ تاکہ ہارون کی نگاہوں سے پوشیدہ رہوں اور وہ یہاں میری موجودگی سے واقف نہ ہو سکے لیکن کچھ اور باتیں بھی میرے ذہن میں ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر تم یونس سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو یقینی طور تمہارے پاس اس کا آنا جانا بھی ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہارون بیٹے کی کاوشوں سے واقف ہو کر کبھی اس کا تعاقب کرے اور اس گھر تک پہنچ جائے جہاں تم موجود ہو تو وہ ہوشیار ہو جائے گا اور میں نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کیا عمل کرے۔ اسی لیے بیٹی! میں نے طے کیا ہے کہ تمہیں ایک دوسرے مکان میں منتقل کر دوں۔ میں خود نہیں رہوں گا اور ہمارے درمیان رابطہ قائم رہے گا۔ اگر تم یونس کو اپنے دام میں جکڑنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تو اسے یہ نہیں بتانا کہ تم کوئی سہارا رکھتی ہو۔ تم اس سے یہی کہنا کہ تمہارے والدین مر چکے ہیں اور تم ان کی چھوڑی ہوئی تھوڑی سی رقم پر گزارہ کر رہی ہو اس طرح ہارون میری موجودگی سے واقف نہیں ہو سکے گا اور یہی ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔" نجمہ پُر خیال انداز میں گردن ہلا رہی تھی۔ پھر اس نے چونک کر پوچھا۔

"تو آپ کا نام فرید احمد نہیں ہے۔"

"نہیں بیٹی! میرا اصل نام کچھ اور ہے جو میں نے اس وقت تک کے لیے ترک کر دیا ہے۔ جب تک میں اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لوں۔ میری خواہش ہے میری بیٹی! کہ تم بھی میرا اصل نام جاننے کی کوشش مت کرو۔ کیونکہ اس نام کو دوہرانے سے

میرے دل میں چبھن پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے اس نام سے وابستہ ان ساری چیزوں کے کھو جانے کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے جو میری زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اگر میری بیوی اور بیٹی مجھے مل گئیں تو میں دوبارہ وہی نام اختیار کر لوں گا۔ اس سے قبل صرف فرید احمد ہوں۔ مجھے امید ہے میری بچی کہ تم میرا اصل نام جاننے کی کوشش نہیں کرو گی۔ اسے میرے سینے کی گہرائیوں میں پوشیدہ رہنے دو' میں اس نام سے بڑی جذباتی وابستگی رکھتا ہوں۔ کیونکہ اس نام کے ساتھ مجھے اپنا وہ چھوٹا سا گھر یاد آجاتا ہے۔ جہاں میں بھی کبھی مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔" فرید احمد نے کہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ نجمہ نے اسے دوبارہ اس کے لیے مجبور نہ کیا' کافی دیر تک وہ فرید احمد کے ساتھ رہی' اس کے بعد اس نے واپسی کی اجازت مانگی۔

اس دوران اور ابھی تک بہت سی باتیں ہوئیں۔ فرید احمد نے اسے وہ ساری باتیں بتا دی تھیں۔ جن پر عمل کر کے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو سکتی تھی اور نجمہ نے پوری ذہانت سے اس پر عمل در آمد کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر وہ فرید احمد سے اجازت لے کر اپنے گھر چلی آئی۔

تین دن بعد وہ ایک چھوٹے سے خوب صورت فلیٹ میں منتقل ہو گئی جو فرید احمد نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ زندگی کی تمام ضروریات سے آراستہ اس فلیٹ میں آکر نجمہ کے نازک احساسات اور شدت اختیار کر گئے۔ یہ زندگی بے معنی زندگی تھی۔ اس کی حقیقی زندگی سے بہت دور' ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے بڑی تکالیف میں وقت گزارہ تھا اور ایک اچھی زندگی کے خواب صرف اس کی پلکوں میں پوشیدہ تھے۔ ان خوابوں میں اس نے کبھی خود کو ماں سے الگ نہیں پایا تھا۔ بلکہ سوچا تھا کہ ہمیشہ اس کی ماں اس کے ساتھ ہو گی۔ وہ قابل قدر ہستی جس نے اس کی پرورش کے لیے خود کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ جس نے شوہر کی موت کے بعد دوسری شادی کا تصور صرف اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ ایک بچی کی ماں تھی۔ جس نے ساری دنیا کو صرف اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنی بچی کی صحیح پرورش کرے اور جب نجمہ کو احساسات ملے تو اسے اپنی ماں کی قربانیاں اچھی طرح یاد تھیں اور تنہائی کے ان خوابوں میں وہ اپنی ماں کو ان ساری قربانیوں کا صلہ دینے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ مکان اور اس کی آسائش اس کے لیے بے معنی سی تھیں۔ یہ سب کچھ تو ایک مفروضہ ہے یہ قیامگاہ تو ایک عارضی قیامگاہ ہے ہاں انتقام کے راستے اسے جہاں جہاں بھی لے جائیں وہ ان پر چلنے سے انکار نہیں کرے گی۔ منزل کوئی

...نہ ہو لیکن اس کے سفر کا اختتام ہارون کی بربادی پر ہونا چاہیے۔ اس ہارون کی بربادی پر ...س نے نہ جانے کس کس کو برباد کیا ہو گا۔ میں ان مظلوموں کی نمائندہ ہوں اور میرا ...ن بہت عظیم ہے میرا مقصد بہت بڑا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے میری اپنی ...ات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مجھے اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ مجھے ہارون سے انتقام لینا ہے' اپنا انتقام' اپنی مظلوم ...ماں کا انتقام اور نہ جانے کتنی لڑکیوں کا انتقام جو اس درندے کی درندگی کا شکار ہوئی ہوں ...ی۔ اپنے اس فرض کو پورا کرنے کے لیے میں تن من دھن کی بازی لگا دوں گی۔

یونس کے بارے میں جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ وہ یہ تھیں کہ اس کا مستقل ...ٹھکانہ ایک کلب تھا۔ امیر باپ کا امیر بیٹا تھا اور جیسا بد فطرت باپ تھا ایسا ہی بد فطرت بیٹا ...تھا۔ یہ کلب اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی عیش گاہ تھی۔ وہاں ہر قسم کی تفریحات ہوتی تھیں۔ ...نجمہ نے یہ بھی سوچا کہ وہ جس ماحول میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ اس میں کلب جیسے تعیشات کا تصور بھی نہیں تھا۔ وہاں جا کر وہ اجنبی' اجنبی ہو گی۔ وہ ماحول اس کے لیے بالکل ہی نیا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس ماحول میں ضم نہ ہو جائے اور اپنی کاوشوں میں ناکام رہے لیکن وہ ناکام نہیں رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے کلب کے بارے میں ...معلومات حاصل کرنے کے لیے کئی نئے سہارے پیدا کیے۔ جہاں سے جو کچھ اسے معلوم ...ہو سکا اس نے حاصل کیا اور ذہن نشین کر لیا۔ فرید احمد بھی اس سلسلے میں اس کے پورے پورے معاون تھے ان سارے کاموں میں اسے دس بارہ دن سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ساری ضرورتوں سے آراستہ ہو کر بالآخر اس نے اس کلب میں پہلی بار جانے کا فیصلہ کر لیا۔

کلب جانے کے لیے جو جدید فیشن کا لباس اس نے اپنے بدن پر سجایا تھا' وہ اس سے قبل کبھی پہننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن کبھی کی بات دوسری تھی۔ اُس نجمہ اور اس نجمہ میں بہت فرق تھا۔

فرید احمد نے کلب کی ممبر شپ کا کارڈ اسے دے دیا تھا۔ جس کا اندراج کرانے کے بعد وہ اوباشوں کی اس جنت میں داخل ہو گئی۔ حسین ترین عمارت تھی' حسین لوگوں سے آباد لیکن تہذیب و اخلاق کی قیود سے آزاد ہر شخص اپنی دھن میں مست تھا' رقص و سرود سازوں کی نغمہ سرائی' رنگین بوتلوں کی کھنک' پیمانوں کی جلترنگ اور بد مست قہقہے۔

فرید احمد کے ایک دوست اس کلب کے ممبر تھے۔ انہی کے توسط سے وہ اس کلب میں داخل ہوئی اور ایک میز پر جا بیٹھی۔ بہت سی آنکھیں اس کی جانب نگران تھیں۔ حسن سادہ اس ماحول میں اجنبی تھا۔ جہاں میک کی تہوں کے نیچے بگڑے ہوئے چہرے تھے۔ اصلیت بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ہاں جو جن سے واقف تھے وہ میک اپ کے باوجود ان کے صحیح نقوش سے آشنا تھے اور ان کی حقیقت سمجھتے تھے لیکن یہ چہرہ جو میک اپ سے بے نیاز ہی اپنا رنگ جما رہا تھا ان سب کے لیے بے حد پُرکشش تھا اور اس کی جانب سب سے پہلے لپکنے والا سجاد تھا۔ ایک بڑے باپ کا شیطان بیٹا۔

"آپ کی اجازت سے۔" اس نے کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے کہا اور نجمہ نے گردن ہلا دی۔ وہ بے حد اعتماد کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"کلب میں اس حسین اضافے پر مجھے بے حد خوشی ہے اور میں ایک دوست کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کرنے کا خواہشمند ہوں۔"

"نوازش۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"مکمل تعارف حاصل ہو سکے گا۔"

"آہستہ آہستہ فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ میں نجمہ ہوں۔"

"بہت خوب۔ نہ جانے کیوں میں ایک دم بلندیاں طے کر جانے کا عادی ہوں۔ شاید اس کی وجہ میری بے لوث سادگی ہے جسے دل قبول کرتا ہے اس پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہوں۔ احمق ہوں شاید۔" وہ بولا اور نجمہ مسکراتی رہی۔

"کیا پئیں گے آپ؟" وہ چند ساعت کے بعد بولی۔

"کم از کم اس خدمت سے تو محروم نہ کریں۔ آج پہلے دن کے مہمان کی حیثیت سے مجھے یہ موقع دیں۔"

"آپ کو مایوسی ہو گی۔" وہ بولی۔

"کیوں؟"

"میں صرف کافی پیتی ہوں۔"

"آنکھوں کی رنگت ہی بتاتی ہے لیکن کبھی کبھی ان میں سرخی دیکھیں۔ یقین کریں خود ان کی دیوانی ہو جائیں گی۔" وہ رومانی انداز میں بولا۔

"دیوانگی سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔" نجمہ ہنس پڑی۔

وہ بھی لاجواب ہو کر اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔ پھر اس نے اپنے لیے شراب اور نجمہ

کے لیے کافی منگائی۔ دوسرے چند نوجوان حسرت بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور سجاد کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ نجمہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس کی تمام گفتگو نجمہ کے بارے میں تجسس سے متعلق تھی لیکن نجمہ نے اسے اپنے بارے میں ہوا بھی نہ لگنے دی۔ آہستہ آہستہ وہ وہاں بیٹھے لوگوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر رہی تھی لیکن یونس ان میں موجود نہیں تھا۔ پھر اس نے سجاد کے ساتھ کلب کے دوسرے حصے دیکھے اور وہاں موجود لوگوں کے بارے میں پوچھتی رہی۔

گیمز روم میں اسے یونس مل گیا۔ سجاد نے دور ہی سے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ یونس ہارون ہے۔ نجمہ نے سرسری نگاہوں سے اسے دیکھا اور دوسری طرف متوجہ ہو گئی لیکن اس نے یہی کوشش جاری رکھی کہ یونس اسے دیکھ لے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کلب کے بہت سے نوجوان نجمہ کی طرف متوجہ تھے جن میں اب یونس بھی شامل ہو گیا ہے۔

دوسری شام اس نے گیمز روم میں ہی نشست جمائی اور یونس کی قربت اسے حاصل ہو گئی وہ خود ہی اس کے پاس آ گیا تھا۔

ہیلو مس نجمہ!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور نجمہ کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔

"ہیلو۔" وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی۔

"آپ.......... آپ میرا خیال ہے ہمارا تعارف کہیں ہو چکا ہے۔"

"نہیں۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔" یونس بولا۔

"تب پھر آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہو گیا۔"

"گزری ہوئی کل کا موضوع آپ ہی تھیں۔ آپ تو شاید دس بجے چلی گئی تھیں لیکن آپ کا تذکرہ ایک بجے تک رہا۔"

"ارے۔ ایسی کیا خاص بات تھی۔"

"تھی نہیں مس نجمہ! ہے۔ آپ یہاں آنے والوں سے بالکل مختلف ہیں۔ پاکیزہ اور اعلیٰ خدوخال کی مالک یہی بات یہاں آنے والوں کے لیے حیران کن ہے۔ کیونکہ یہاں سب چہرے مصنوعی ہوتے ہیں۔ کچھ نہ ہو کر کچھ منوانے کے خواہاں' آپ سب کچھ ہو کر یہاں کیوں آ گئیں۔"

"اوہ' تعجب ہے۔ حالانکہ میرے خیال میں یہاں آنے والے سب کچھ ہوتے ہیں۔ کیا کمی ہے ان میں۔"

"یہ بات دیر سے سمجھ آئے گی مس نجمہ۔"

"مجھے آپ کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔"

"منتظر تھا کہ آپ اس قابل سمجھیں تو بتاؤں۔"

"تو اب بتا دیجیے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"خادم کو یونس ہارون کہتے ہیں۔"

"دلچسپ آدمی ہیں آپ۔"

"آج کا ہیرو بھی۔" یونس مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ کی قربت حاصل ہے۔ کل میں محروم رہا تھا اور سجاد لوگوں رعب ڈال رہا تھا۔ بڑا حسد ہو رہا تھا اس سے لیکن اس وقت بڑا سکون ہوا جب آپ اس کی کار میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ سجاد منہ لٹکائے واپس آ گیا اور یہاں خوب قہ پڑے۔" یونس مسکراتے ہوئے بولا۔

"خدا کی پناہ۔ اتنی ساری باتیں ہوئی ہیں یہاں میرے بارے میں۔"

"اس سے بھی کہیں زیادہ۔ ویسے ایک سوال کی اجازت دیں۔ آپ نے سجاد ساتھ جانے کے بجائے ٹیکسی کو کیوں ترجیح دی۔"

"سجاد صاحب سے میری ملاقات کل ہی ہوئی تھی وہ سارے وقت میرے سا رہے جسے میں نے اخلاقاً برداشت کر لیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ضرورت سے ز ہی مخلص ہو گئے تھے اور انہیں یقین تھا کہ میری واپسی ان کے ساتھ ہو گی۔ میں انہیں خوشگوار رہنے کا اشارہ دیا تھا۔"

"خدا کے لیے مجھ سے کوئی گستاخی ہو جائے تو معاف کر دیں ورنہ یہ سب میرا مذ اڑائیں گے۔ اوہ' سجاد صاحب آ رہے ہیں۔" یونس ایک دم بولا لیکن نجمہ نے پلٹ نہیں دیکھا۔

"کمال ہے مس نجمہ! میں کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں تو بے چین کہ آپ کیوں نہیں آئیں اور آپ یہاں موجود ہیں' ہیلو یونس۔"

"آئیے بھئی میں کچھ اور لوگوں سے آپ کو ملاؤں۔ وہ سب آپ کے منتظر ہیں۔

"سوری سجاد صاحب میں یونس صاحب سے کچھ ذاتی گفتگو کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ ہمیں ڈسٹرب نہیں کریں گے۔" نجمہ نے کہا۔

سجاد بھونچکا رہ گیا۔ یونس کی سفید جلد کے نیچے سرخی چمک اٹھی تھی۔ سجاد چند لمحات ات رہا۔ اور پھر خفت مٹانے کے لیے بولا۔

"پھر مس نجمہ یہاں سے فارغ ہو جائیں تو اس طرف نکل آئیں۔ میں آپ کا انتظار وں گا۔" کوئی اور جملہ سننے سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے واپس مڑ گیا اور چند ات کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

نجمہ مسکرا کر یونس کو دیکھنے لگی۔ یونس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی وہ آسمان میں از کر رہا تھا۔

"خوب ہیں یہ سجاد صاحب۔" وہ خود ہی بولی۔

"آپ کے لیے کیا منگاؤں مس نجمہ۔"

"میں کافی پیوں گی۔ آپ اپنے لیے جو چاہیں منگالیں۔"

"نہیں میں بھی آپ کے احترام میں کافی ہی پیوں گا۔ آپ شراب نہیں پیتیں۔"

"نہیں یونس صاحب! میں ان چیزوں سے محروم ہوں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے س کلب میں داخل ہونے کی جرأت کی ہے۔ میرا اسٹیٹس بھی وہ نہیں ہے جو آپ وں کا ہے۔ معمولی حیثیت کی مالک ہوں لیکن تنہا زندگی ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائی تو یہ جرأت کر ڈالی۔ پتا نہیں یہاں فٹ بھی ہو سکوں گی یا نہیں۔"

"نہیں مس نجمہ آپ کی شخصیت ان تمام چیزوں پر بھاری ہے۔ خدا کے لیے آپ مجھے سجاد نہ تصور کریں۔ میں بھی کلب میں کوئی نیک نام انسان نہیں ہوں لیکن لوگوں کی زت و احترام کرنا جانتا ہوں۔"

"یہ معمولی بات نہیں ہے یونس صاحب!" وہ بولی اور یہ شام اس نے یونس کے ساتھ ہی گزاری۔ دس بجے اس نے اجازت چاہی۔

"اس سے زیادہ رکنا مناسب نہیں ہے یونس صاحب۔"

"یقیناً آیئے میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔"

"آپ تو یہاں رکیں گے۔"

"ضروری تو نہیں ہے۔" یونس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"تب براہ کرم مجھے میرے فلیٹ پر ڈراپ کر دیں۔" نجمہ نے کہا۔

ایک بار پھر یونس کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ جلدی سے اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ نیلے رنگ کی ایک خوب صورت کار کا دروازہ کھول کر اس نے نجمہ کو اشارہ کیا اور نجمہ کار میں آ بیٹھی۔

یونس دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد نجمہ بولی۔

"میں نے آپ کو زحمت دی ہے یونس صاحب! اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ خواہ مخواہ آپ کو وہاں سے لے آئی۔"

"نہیں نجمہ صاحبہ! اگر عزت دی ہے تو اسے برقرار رہنے دیں' میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" یونس نے کسی قدر گھمبیر آواز میں کہا اور نجمہ مسکرانے لگی۔ وہ یونس کو راستہ بتاتی گئی اور چند ساعت کے بعد نیلے رنگ کی نئی چمکتی کار اس کے فلیٹ کی بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔

"اب یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ آپ یہاں تک تشریف لائیں اور میں آپ کو باہر سے جانے دوں۔ آیئے میں آپ کو کافی پلواؤں گی۔" یونس سحر زدہ سا نیچے اتر گیا اور نجمہ اسے فلیٹ میں لے گئی۔ ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ کو اب میری حیثیت کا اندازہ ہوا؟ دیکھئے یہ بلند پروازیاں ہیں۔ رہتی یہ ہوں اور پہنچنا آپ لوگوں تک چاہتی ہوں۔" نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں نجمہ صاحبہ! میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بعض شخصیتیں کسی خول میں نہیں رہتیں' آپ اپنی ذات میں جو کچھ ہیں وہ اتنا ہے کہ آپ کے دوستوں میں شامل ہونے والا خود کو خوش قسمت ترین سمجھ سکتا ہے۔"

"یونس صاحب! دنیا میں محبتوں سے محروم ہوں' والدین کا انتقال ہو چکا ہے' وہ تھوڑا سا سرمایہ چھوڑ گئے تھے جس کی سہارے زندہ ہوں لیکن مستقبل کا خوف ذہن میں موجود ہے اور شاید یہی خوف مجھے تنہائی اور ویرانی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ دیکھیں آگے زندگی کس ڈگر پر چلے۔" نجمہ نے سچ بولا اور جھوٹ کو کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھ دیا۔

"اور عزیز نہیں ہیں آپ کے؟" یونس نے پوچھا۔

"نہیں میں نے عرض کیا نا' عزیزوں سے بھی محروم ہوں' پہلے اس شہر میں نہیں تھی' اپنے ماحول سے اکتا کر یہاں آ گئی ہوں۔ سوچ رہی ہوں زندگی گزارنے کے لیے کوئی ذریعہ معاش تلاش کروں جو میری تھوڑی سی ضروریات کو پورا کر دے۔"

یونس عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا کیا خیالات تھے' بہرصورت اس نے ان کا اظہار نہیں کیا اور تھوڑی دیر تک یہ جذباتی سی گفتگو جاری رہی۔ پھر کافی پی گئی اور اس کے بعد اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ چلتے چلتے وہ بولا۔

"کل تشریف لائیں گی کلب میں۔"

"ہاں یقیناً اور سیدھی آپ کے پاس پہنچوں گی یونس صاحب! انسانوں کے انتخاب کا تھوڑا سا سلیقہ مجھے بھی ہے۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہوں گی۔" یونس مسرت بھرے انداز میں گردن ہلاتا ہوا نیچے اتر گیا۔

☆--------☆-------☆

یونس سے ملاقاتیں جاری رہیں۔ زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا لیکن اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد کام کر رہا تھا۔ اس لیے نجمہ نے کہیں جھول نہ آنے دیا۔ وہ نہایت کامیابی سے یونس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ اس نوجوان کے بارے میں اس نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔ باپ کی عیش کوشیاں اس سے پوشیدہ نہیں تھیں اس لیے احترام کا رشتہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ ہلکی سی جھنجلاہٹ کا شکار بھی تھا کیونکہ دولت مند باپ اپنے لیے لاکھوں خرچ کر دیتا تھا اور اس پر اخراجات کی پابندیاں تھیں۔ اسے نیک چلنی کی تاکید کی جاتی تھی اور خود انتہائی پستیوں میں پہنچ گیا تھا۔ فطرتاً یونس کمینہ نہیں تھا بس وہ اس لیے اوباش تھا کہ اوباش باپ کا بیٹا تھا۔ اگر صحیح راستہ مل جاتا تو شاید وہ' وہ نہ ہوتا جو تھا۔

نجمہ نے پوری طرح اسے پڑھا تھا اور اس کے بارے میں فیصلے کرتی رہی تھی۔ اب یہ ضروری نہیں تھا کہ ان کی ملاقاتیں کلب میں ہوتیں یونس بے تکلفی سے اس کے فلیٹ پر بھی آ جاتا تھا اور وہاں سے پروگرام بنتے۔ نجمہ کے بغیر اب اس کا وقت نہیں کٹتا تھا۔

ایک شام وہ شہر سے دور ایک خوب صورت پوائنٹ پر گئے ہوئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے یہ بارش ہلکی رہی پھر تیز ہو گئی۔ اس پوائنٹ پر وہ اکیلے نہیں تھے۔ دوسرے لوگ بھی سیر کرنے وہاں آئے تھے لیکن بادلوں کا رنگ دیکھ کر سب ہی وہاں سے

پلٹ پڑے تھے اور یہ دونوں تنہا رہ گئے تھے۔

بارش جب تیز سے تیز ہونے لگی اور گہری تاریکی چھا گئی تو نجمہ نے واپسی کے لیے کہا۔

"خدا کی قسم نجمہ صاحبہ! اس موسم میں آپ کو آپ کے فلیٹ پر چھوڑنے کے بعد جو تنہائی میرے وجود پر مسلط ہو گی اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔" یونس نے افسردگی سے کہا۔

"لیکن محترم! یہاں رات تو نہیں گزاری جا سکتی۔ سر چھپانے کی کوئی جگہ دور دور تک نہیں ہے۔" نجمہ نے شوخی سے کہا۔

"ایک شرط ہے واپسی کی۔" یونس بولا۔

"حکم۔"

"رات کو واپس نہیں جاؤں گا بلکہ آپ کے فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہوں گے' باتیں کریں گے اور کافی پی کر وقت گزاریں گے۔ بولیے منظور ہے۔"

"چلیے منظور ہے۔" نجمہ نے کہا اور یونس اس کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف دوڑ پڑا۔ بارش دھواں دھار ہو رہی تھی۔ یونس نے اسے کار میں دھکیلا اور خود بھی جلد سے بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔ وائپر تیز رفتاری سے پانی کی دھاریں صاف کر رہے لیکن اس کے باوجود سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سخت خطرناک ہو گئی تھی یونس نے کار کی روشنیاں جلالیں اور رفتار کچھ سست کر دی۔ وہ بڑی احتیاط سے کار رہا تھا لیکن ایک جگہ اسے رکنا پڑا۔ شہر سے باہر ایک برساتی ندی یہاں تک آنے والے راستے کو کاٹتی تھی۔ اس ندی پر کوئی پل نہیں تھا بلکہ سڑک نشیب سے گزرتی تھی بارش میں یہ نشیب بھر جاتے تھے اور یہاں سے گزرنا ممکن نہ رہتا تھا۔ اس وقت بھی ہوا گو بارش زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن طوفانی بہاؤ دور ہی سے محسوس ہو جاتا تھا یونس نے کار کو بریک لگا دیے۔

"جی حضور کیا حکم ہے۔"

"خدا کی پناہ اب کیا ہو گا؟" نجمہ پریشانی سے بولی۔

"کچھ بھی نہیں' اس میں پریشانی کی کیا بات ہے میں کار کو ریورس کر کے سڑک پر لیتا ہوں۔ ہم اسے بھی آپ کے فلیٹ کی بالکنی تصور کر سکتے ہیں۔" یونس مسکر

"لیکن اس ویرانے میں؟"

"نہیں مس نجمہ' آج تو اس ویرانے کی قسمت کھل گئی ہے۔ میں بے حد خوش ہوں نجمہ! کوئی تردد نہ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔" یونس نے کہا اور کار ریورس نے لگا شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ یونس نے اس کے لیے سیٹ کھول دی۔

"آرام فرمایئے۔" اس نے کہا اور نجمہ سیٹ پر دراز ہو گئی۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی' موسم خنک ہو گیا تھا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ یہ خاموشی طویل ہو گئی تو نجمہ نے اسے مخاطب کیا۔

"کچھ بولو یونس! اتنی طویل خاموشی؟"

"نجمہ! میں خوفزدہ ہوں۔ کوئی بری بات زبان سے نکل گئی تو............" یونس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"مجھے یقین ہے آپ کوئی غلط بات نہ کریں گے۔"

"اتنا اعتماد ہے مجھ پر۔"

"ہاں۔"

"یہ وعدہ کہ میری کسی بات کو برا نہ مانا جائے گا۔"

"وعدہ۔" نجمہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"تو نجمہ! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ............ کہ اب آپ کے بغیر ایک لمحہ شاق گزرتا ہے۔ ایک لمحے کی دوری پسند نہیں مجھے۔ میں آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" یونس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔ نجمہ خاموش ہو گئی۔

"جواب دو نجمہ!"

"آپ کا ماحول مجھے برداشت کر سکے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"صرف آپ مجھے قبول کر لیں۔ باقی ذمہ داریاں میری ہیں۔" یونس نے کہا۔ نجمہ نے آنکھیں بند کر لیں' پھر اس کی آواز ابھری۔

"میں تمہاری ہوں یونس۔"

☆--------☆-------☆

ہارون صاحب نے گہری نگاہوں سے یونس کو دیکھا۔

"کون ہے وہ۔"
"ایک تنہا لڑکی جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"
"مالی حالت کیسی ہے؟"
"میرے لیے قابل قبول۔"
"میں اپنی بات کر رہا ہوں یونس۔"
"میں آپ کی شادی کی نہیں اپنی شادی کی بات کر رہا ہوں ڈیڈی! شاید آپ کو کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" یونس نے زہریلے لہجے میں کہا۔
"گستاخی اور مذاق میں فرق ہوتا ہے یونس؟" ہارون صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔
"یہ نہ گستاخی ہے ڈیڈی! اور نہ مذاق۔ یہ میری زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ ہم دونو نے ہمیشہ ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے۔ میں اس امید کے ساتھ آپ سے بات کر رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ کی طرح مجھ سے تعاون کریں گے۔ میں اس لڑکی سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں اور اب یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسے باعزت طریقے سے اس گھرانے کے شایا شان رخصت کر کے اس گھر میں لائیں۔"
"شہر میں کوئی ایسی لڑکی نہیں ہے جس کے سرپرست نہ ہوں اور مالی حیثیت بہت بڑی ہو۔ مجھے صرف یہ تردد ہے' اس کا تعارف تو کروا دو مجھ سے۔"
"وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی ہے اور بہت مشکلات میں گزارہ کر رہی۔ اس طرح کہ اس پاس کار بھی نہیں ہے۔ یہ اس کی مالی حیثیت ہے ڈیڈی!"
"خوب اور تم اسے بیوی بنانا چاہتے ہو۔"
"آپ کی دعاؤں کے ساتھ۔"
"یہ بد دعا میں تمہیں کبھی نہیں دے سکتا یونس! حاجی عمر' شاہد علی اسٹیل والے ا چوہدری رمضان علی کو جانتے ہو؟ یہ سب اشارتاً تمہارا تذکرہ کر چکے ہیں۔ ان کی لڑکیا خوب صورت بھی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے نام کوئی ا فیکٹری یا بڑا کاروبار نہ ہو۔ تم سے شادی کے بعد یہ چیزیں جہیز میں مل جائیں گی اور میرے مقابلے کے کاروباری بن جاؤ گے۔ ان لوگوں سے سودے بازی بھی ہو سکتی ہے زیادہ بولی دے۔ تم اس دولت کو چھوڑ کر ایک قلاش لڑکی کو اپناؤ گے آخر کیوں؟"
"وہ مجھے پسند ہے ڈیڈی!"
"پتا بتاؤ اس کا۔ آج رات تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔" ہارون صاحب نے شفقت سے کہا۔
"ڈیڈی! میں نے آپ کو اس کی توہین کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔" یونس نے تلملا کر کہا۔
"بیٹے! یہ میرے اور تمہارے لیے نئی بات نہیں ہے' تمہارے خیال میں' میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟ میں نے کبھی تمہاری تفریحات میں مداخلت نہیں کی' صرف اس لیے کہ میں زندگی اور نوجوانی کو قید کرنے کا عادی نہیں ہوں' لیکن یہ آخر تمہیں کیا سوجھی؟ شادی کر کے قید ہو جاؤ گے' جب دنیا کے ہنگاموں سے تھک جاؤ تو شادی کر لینا' جلدی کیا ہے۔" ہارون صاحب بولے۔
"میں صرف شادی کرنا چاہتا ہوں اور اسی لڑکی سے۔"
"میں اجازت نہیں دے سکتا۔"
"اس کے باوجود میں اسے اپنا لوں تو؟"
"تو پھر میں ان فلمی باپوں سے مختلف حرکات نہیں کروں گا جو ایسے مواقع پر کرتے ہیں۔ میں تم سے کہہ دوں گا کہ جاؤ اس کے بعد اس گھر سے کوئی تعلق نہ رکھنا۔ میری دولت میں سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں ملے گی اور میں تم سے یہ بھی کہوں گا کہ اس گھر کے دروازے تنہا تمہارے لیے کھلے ہوں گے' جب بھی تمہیں اپنی حماقت کا احساس ہو جائے تو تنہا واپس آ جانا۔" ہارون صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"یہ سب کچھ مذاق تو نہیں ہے ڈیڈی!" یونس نے پوچھا۔
"اس شکل میں مذاق ہے کہ تم بھی اب تک مجھ سے مذاق کرتے رہے ہو۔ اگر تم نے یہ سب کچھ حقیقتاً کہا ہے تو میں نے بھی جو کچھ کہا ہے اسے بھی حقیقت سمجھو۔"
"تو پھر آئیے ڈیڈی! ایک کپ کافی ہو جائے۔ آخری کپ جو آپ کے ساتھ پیا جائے گا۔ اس کے بعد نہ جانے کب آپ کو یا مجھ کو اپنی غلطی کا احساس ہو۔" یونس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہارون صاحب نے گردن ہلا دی۔ ملازم کو کافی لانے کی ہدایت کی اور کچھ دیر بعد کافی آ گئی۔
"تھوڑی سی رقم تو مل سکے گی مجھے ڈیڈی! قرض حسنہ سمجھیں کسی وقت واپس کردوں گا۔" یونس نے کہا۔
"نہیں بیٹے! یہ اصول کے خلاف بات ہو گی اور پھر ممکن ہے یہ رقم تمہیں ابتدائی سہارا دے' اگر قلاش ہوئے تو جلدی واپس آنے کی کوشش کرو گے۔ تم یہ یاد رکھنا

کہ کسی بھی جعلسازی سے کہیں سے کوئی رقم نہیں لے سکو گے۔ میں سارے انتظامات کر لوں گا۔ ہاں مجھے اس جگہ کا پتا بتا دو جہاں تم قیام کرو گے تاکہ اگر کبھی مجھے ہی تمہاری ضرورت پیش آجائے تو میں تم سے رابطہ قائم کر لوں۔"

"چال چل رہے ہیں ڈیڈی تاکہ راتوں رات کوئی کارروائی کر ڈالیں' میں جھانسے میں نہیں آؤں گا۔" یونس نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی۔" ہارون صاحب نے شانے ہلائے اور کافی پینے کے بعد یونس اٹھ گیا۔

"کار کی چابی کہاں ہے۔" ہارون صاحب نے پوچھا۔

"شریف کے پاس ہے' معلوم کر لیں۔ آپ نے مجھے چیلنج کیا ہے اس لئے کچھ نہیں لے جارہا۔"

"گڈ ٹھیک ہے خدا حافظ۔" ہارون صاحب بولے اور یونس کوٹھی سے نکل آیا۔ اس کے ہونٹ تشویش سے سکڑے ہوئے تھے' بہرحال کافی غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا اور اس کے نتیجے پر بھی غور کر چکا تھا جو کچھ ہوا خلاف توقع نہیں ہوا تھا۔ ہارون صاحب اسی قسم کے آدمی تھے۔ ان کی اپنی زندگی تھی جس میں عورت اور شراب اسی طرح شامل تھی کہ انہیں کسی اور کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال یونس انتہائی احتیاط سے نجمہ کے فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہارون صاحب نے کسی کو اس کے تعاقب میں نہ بھیج دیا ہو۔

☆--------☆-------☆

فرید احمد نے پُرمسرت انداز میں گردن ہلائی۔

"عظیم کامیابی پر میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ خدا کرے مستقبل میں یونس تمہارے لیے ایک اچھا شوہر بھی ثابت ہو۔ اس کی عادات و اطوار کے بارے میں اتنے دنوں میں تم نے کوئی اندازہ تو قائم کر لیا ہو گا نجمہ!"

"یونس اتنا برا نہیں ہے۔ باپ کی فطرت اور حرکتوں نے اسے غلط راستوں پر ڈال دیا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان کوئی حجاب اور احترام نہیں ہے جس کا اندازہ مجھے اس کی گفتگو سے ہوا جو یونس نے مجھے سنائی ہے۔ ان حالات میں اگر یونس غلط راستوں پر نکل آیا تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے لیکن اس نے اب شراب نہ چھونے کا عہد کیا ہے۔"

"خدا کی قسم نجمہ! اگر اس اہتمام کے بعد تم اس کے ساتھ ایک خوش و خرم

گزار سکو تو مجھے بے حد مسرت ہو گی۔"

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" نجمہ نے پوچھا۔

"شادی۔ جس قدر جلدی ممکن ہو۔ اس کام میں دیر مناسب نہیں ہے یونس کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔"

"وہ بھی یہی چاہتا ہے۔"

"تاخیر نہ کرو نجمہ! اور ہاں ایک خیال میرے ذہن میں اور آیا ہے اگر یونس نے ہارون کو اس فلیٹ سے دور رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو پھر میرا تم سے مل بیٹھنا ضروری ہے لیکن اس طرح کہ یونس کو شبہ نہ ہو۔ ظاہر ہے تم نے اپنے کسی عزیز کا تذکرہ اس سے نہیں کیا ہو گا۔"

"جی نہیں۔"

"ایک یہ ترکیب ہو سکتی ہے۔ کسی شاہراہ پر اچانک ہی تم سے مل جاؤں اور تم چچا کہہ کر مجھے پہچان لو۔ یوں ہماری ملاقاتیں شروع ہو جائیں گی لیکن ابھی نہیں پہلے تم شادی کر لو۔" فرید احمد نے پُرخیال انداز میں کہا۔

نجمہ نے تمام ہدایات ذہن نشین کر لی تھیں۔ چلتے وقت فرید احمد نے دس ہزار روپے کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو' شادی کے سلسلے میں ضرورت ہو گی تعرض نہ کرو یہ ہمارے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔" اور نجمہ نے نوٹ رکھ لیے۔ پھر وہ واپس چل پڑی۔

یونس کسی کام سے گیا ہوا تھا اور ابھی تک فلیٹ واپس نہیں پہنچا تھا۔ نجمہ کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا لیکن کسی قدر مرجھایا ہوا سا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ وہ صوفے پر دراز ہو گیا۔

"یار نجمہ! یہ دنیا بڑی انوکھی جگہ ہے۔ سارے رشتے ناتے' دوستی یاری مسخرہ پن ہے' ایک دوسرے کو بیوقوف بنانے کے گر' بڑا لطف آیا ہے دنیا کی ایک نئی شکل دیکھ کر۔"

"کیا ہوا یونس۔"

"میں بے حد مطمئن تھا نجمہ کہ تھوڑی سی رقم اپنے دوستوں سے لے لوں گا اور اس وقت کے اخراجات پورے ہو جائیں گے لیکن میں نے کسی مکر و فریب سے کام لیے بغیر ساری باتیں سچ سچ بتا دیں۔ کیا رنگ بدلا ان لوگوں نے یار! اب تک میں ان قلمی

کمائیوں کو لغو اور بے ہودہ سمجھتا تھا جن میں انسان کو اخلاق و مروت سے اتنا گرا ہوا دکھایا جاتا تھا کہ ضرورت کے وقت وہ فوراً نگاہ بدل لیتے ہیں لیکن کمال ہے بھئی' ایک ایک بات سچ نکلی۔"

"تو تم پیسوں کا بندوبست کرنے گئے تھے۔"

"ہاں کیا گڑبڑ ہو گئی؟"

"ہوئی تو نہیں لیکن ہو جانے کا خطرہ ہے۔" نجمہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

"میرا تمہارا زبردست جھگڑا۔"

"ابھی سے۔" یونس نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی خود کو دوسروں کے سامنے ہلکا کرنے کی؟ میرے پاس جو پیسے موجود ہیں۔"

"اوہ یار! تم میری بیوی بننے والی ہو۔ ابھی سے سوچو گی کیسے نکھٹو شوہر سے پالا پڑا ہے۔ شادی کے لیے پیسوں کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔"

"جو کچھ کریں گے مل جل کر کریں گے یونس! تم کسی بھی مسئلے میں اب تنہا نہیں ہو۔ یہ دس ہزار روپے میں نے آج ہی بینک سے نکالے ہیں۔ میں کوئی حالات سے بے خبر ہوں۔"

"اتنے پیسوں کی اب تو ضرورت بھی نہیں ہو گی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ دوستوں کو ایک شاندار پارٹی دوں گا لیکن ایسے لوگوں کو کھلانے سے فائدہ جو اتنے خود غرض ہوں۔ بہرحال جو کچھ لوں گا قرض ہو گا۔ پکا وعدہ۔"

"میرے وجود کے ایک ایک ذرے پر تمہارا حق ہے یونس! تم یہ قرض ضرور ادا کر دینا لیکن اپنی بھرپور محبت دے کر' مکمل اعتماد دے کر۔" نجمہ نے کہا اور یونس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"میں ان الفاظ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا نجمہ!"

☆-------☆-------☆

دونوں کی شادی ہو گئی۔ گواہوں کا بندوبست خود قاضی صاحب نے کیا تھا۔ نکاح بھی ان کے گھر پر ہی ہوا تھا۔ تھوڑی سی مٹھائی تقسیم ہو گئی تھی اور بس وہاں سے واپس وہ فلیٹ پر آ گئے۔

ایک ہفتے تک دونوں فلیٹ ہی میں بند رہے تھے اور ایک ہفتے کے پہلے روز نجمہ نے اسے کسی کام سے روانہ کر دیا۔ یونس چلا گیا تو اس نے نیچے اتر کر جنرل اسٹور سے فرید احمد کو فون کر دیا۔

"دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں بیٹی!" فرید احمد نے اس کی آواز کو پہچان کر کہا۔

"شکریہ۔ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔"

"میں اپنے مشن سے غافل تو نہیں ہوں نجمہ بیٹی! دل مسوس کر یہ وقت گزارہ ہے۔ کاش! میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں رخصت کرتا۔ بہرحال ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہو گا یونس کہاں ہے۔"

"میں نے ایک کام سے بھیجا ہے۔"

"وہ پروگرام آج کر لیا جائے۔"

"ملاقات کا؟"

"ہاں۔"

"جیسے آپ پسند کریں۔"

"شام کو پانچ بجے ساحل سمندر' مغربی سمت میں تمہیں چہل قدمی کرتا ملوں گا پروگرام تو یاد ہے نا۔"

"چچا فرید احمد۔"

"بالکل۔" فرید احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

"خدا حافظ اور ہاں دلہن بن کر آنا۔ میری آنکھیں تمہیں اس شکل میں دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔"

"اوہ۔" نجمہ شرمائے ہوئے انداز میں بولی اور پھر فون بند کر دیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد یونس کی واپسی ہوئی تھی۔ نجمہ نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔ دوپہر ہو چلی تھی اس لیے دونوں نے کھانا کھایا اور آرام کرنے لگے۔

"میں آج کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"بھئی اب میں گھر والا ہوں۔ کھانے پکانے کی چیزیں بھی خریدنا ہوں گی۔ مجھے یہ کچھ آنا چاہیے۔"

"ہاں' بے شک' یوں کریں گے' آج شام کو نکلیں گے۔ تھوڑی دیر تک ساحل کی سیر کریں گے اور اس کے بعد شاپنگ کر کے گھر لوٹ آئیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"خادم اعتراض کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن رات کا کھانا۔" یونس ایک دم خاموش ہو گیا۔

"ہاں رات کا کھانا؟" نجمہ نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے گھر آ کر کھائیں گے۔" یونس پھیکے انداز میں ہنس کر بولا اور نجمہ اسے گھورنے لگی۔

"سچ بولو۔ کیا کہہ رہے تھے۔" اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"اوہ نجمہ! ابھی تک فضول خیالات ذہن سے نہیں نکل سکے۔ میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھائیں گے لیکن یہ نہایت احمقانہ بات ہے۔ جس کا اپنا ایک گھر ہو' مزے مزے کے کھانے پکانے والی بیوی ہو اسے بھلا ہوٹل میں کھانے کی کیا ضرورت ہے یار نجمہ! ایک مسئلہ اور حل کرو۔"

"فرمایئے!" نجمہ نے ہونٹ بھینچ کر پوچھا۔

"بھئی اب مجھے مرد بننے دو۔ کہیں نوکری کرنا پڑے گی۔ نہایت ضروری ورنہ مجھے یوں لگے گا جیسے میں' میں نے' میرا مطلب ہے کہ یوں لگے گا جیسے ابھی میں بالغ نہیں ہوا۔ دیکھو نا مرد اسی وقت مکمل ہوتا ہے' جب وہ عورت کا مکمل محافظ ہو' اسے اپنے قوت بازو کی کمائی کھلائے۔ میں خود کو ابھی نامکمل سمجھتا ہوں۔"

"خدا ہماری مدد کرے گا یونس! یقیناً تمہیں یہ سب کچھ کرنا ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے لیکن ابھی نہیں کم از کم ایک ماہ گزر جانے دو۔ ابھی میں تم سے جدا نہیں رہ سکتی۔"

"جو حکم حضور والا۔" یونس نے گردن خم کر دی۔

☆--------☆--------☆

ساڑھے چار بجے ہی وہ ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر کی پُر جوش لہروں سے پاؤں بھگوتے ہوئے وہ مشرقی ساحل سے مغربی ساحل کی طرف بڑھتے رہے اور پھر اچانک کسی نے نجمہ کو پکارا۔ نجمہ رک گئی۔ یونس بھی اس فیشن ایبل بوڑھے کو دیکھ رہا تھا جو بے اختیار انداز میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اوہ چچا جان۔۔۔۔۔۔۔۔ چچا جان! آپ' آپ واپس آ گئے۔ کیسے ہیں آپ؟" نجمہ نے

اظہار کی اور بوڑھے نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"میری بچی! میری بیٹی! کیسی ہو تم؟" بوڑھے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یورپ سے کب آئے چچا جان!"

"طویل عرصہ ہو گیا بیٹے! یہیں چھوٹا سا کاروبار کر لیا ہے؟"

"آیئے میں آپ کو یونس سے ملاؤں۔ یونس! یہ میرے چچا فرید احمد ہیں۔ میرے والد کے بچپن کے دوست ہیں اور انہوں نے مجھے گودوں میں کھلایا ہے۔ بہت محبت کرتے تھے مجھ سے۔ اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے طویل عرصے کے بعد ملے ہیں۔"

"یونس کون ہے نجمہ بیٹی!"

"چچا جان! یہ میرے شوہر ہیں۔"

"ارے۔ اوہ تو اتنی دور کیوں کھڑے ہیں یہ۔ آؤ بھئی میرے سینے سے تو لگ جاؤ۔ بھئی واہ' تم بھی میرے جگر کے ٹکڑے ہی ہو۔ خوب ملے بھئی تم لوگ' روح خوش ہو گئی۔" فرید احمد نے یونس کو بھی گلے لگا لیا۔ وہ بھی خوش نظر آ رہا تھا۔

فرید احمد اسے ساتھ لے کر ساحل سے پلٹ پڑے۔

"تو کیا کرتے ہو یونس! میاں تم؟ کیا کوئی کاروبار کرتے ہو؟ شکل و صورت سے کسی بڑے گھرانے کے چشم و چراغ لگتے ہو۔ آؤ بھئی! میں تمہیں اتنی جلدی نہیں چھوڑوں گا۔ میرے گھر چلو' آؤ تمہاری گاڑی کہاں ہے۔" فرید احمد نے جان بوجھ کر کہا اور یونس جزبز ہو گیا۔

"ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے چچا جان!" نجمہ جلدی سے بولی۔

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔ ساتھ ہی چلیں گے آؤ' انکار کی گنجائش نہیں ہے۔" فرید احمد نے اپنی شخصیت ایک دم بدل دی تھی۔ وہ انہیں اپنے گھر لے گئے۔ چائے تیار کرائی اور لوازمات کے ڈھیر لگا دیے۔ بچھ گئے تھے وہ ان کے سامنے اور یونس ان کے خلوص سے بے حد متاثر ہوا۔

"آپ کب تشریف لا رہے ہیں ہمارے گھر؟ ہم تو اس قدر خوش ہیں۔ آپ کے مل جانے سے جس قدر خوشی ہوئی ہے میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"کیا خوب رہی میاں! میں بھلا اب تم لوگوں کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ کل ہی آؤں گا تمہارے۔" اور یونس نے فلیٹ کا پتا دیا۔ رات ہو گئی تو انہوں نے واپسی کی

اجازت مانگی۔ فرید احمد بگڑ گئے۔

"یعنی تم لوگ کھانا کھائے بغیر جاؤ گے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"نہیں چچا جان! اس وقت کھانا نہیں کھائیں گے۔" نجمہ نے کہا۔

"میں نے تیار کرا لیا ہے بھئی۔"

"نہیں چچا جان! میں معافی چاہتی ہوں۔ براہ کرم محسوس نہ کریں۔" وہ لجاجت سے بولی اور اس نے کسی قیمت پر یہ دعوت قبول نہیں کی۔ حالانکہ یونس نرم پڑ گیا تھا۔ وہ چچا جان کے پُر خلوص اصرار کے آگے بے بس ہو گیا تھا۔ واپسی میں فرید احمد نے ان دونوں کو ایک ایک ہزار روپے دیے۔

"یہ فرید احمد صاحب خوب ملے نجمہ! بے حد نفیس انسان ہیں۔ بڑے مخلص' لیکن کیا یہ تنہا ہیں؟"

"ہاں یونس! انہوں نے شادی نہیں کی۔"

"وجہ؟"

"مجھے اتنی معلومات نہیں۔ بس مخلص انسان ہیں اپنوں کی طرح ہیں بالکل' یہاں ٹیکسی رکواؤ۔" نجمہ ایک شاندار ہوٹل کے سامنے ایک دم بول پڑی اور ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں ٹیکسی سے اتر گئے۔

"یہاں کیوں؟" یونس نے پوچھا۔

"کھانا کھائیں گے۔" نجمہ نے کہا اور یونس ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ہوٹل کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ساری زندگی اسی طرح چاہتی رہنا نجمہ! جو کچھ دے رہی ہو۔ اس میں کوئی کمی ہوئی تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

☆--------☆-------☆

فرید احمد صاحب اب ان لوگوں کی زندگی میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے۔ شام کا کھانا انہوں نے یہیں کھانا شروع کر دیا تھا۔ فرمائشیں کرکے جاتے تھے اور خوب نخرے کرکے کھاتے۔ گھر کے معاملات ان سے پوشیدہ نہیں رہے تھے۔ یونس کی پوری کہانی انہیں سنا دی گئی تھی اور انہوں نے مرغی کی ران بھنبھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"بھلا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے۔ ہارون صاحب کو ناک رگڑنا پڑے گی ایک دن۔ [illegible]

نہیں اس میں در حقیقت تمہاری محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مرتے دم تک تمہیں یاد نہیں کریں گے لیکن اس کے بعد اس کے بعد کیا ہوگا۔ تم فکر کیوں کرتے ہو یونس میاں! کوئی نوکری ووکری نہیں کرو گے تم۔ میرا کاروبار ہے' تم چلاؤ۔ سب لے لو' میرا کون ہے اس دنیا میں۔"

وہ رات یونس کے لیے خاصی کٹھن تھی۔ اپنے باپ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ ساری زندگی یونس کا نام نہیں لے گا لیکن یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی آخر میں ہارون کی اولاد ہوں۔

عجیب عجیب خیالات اس کے ذہن میں پکتے رہے اور ہارون صاحب کے لیے اس کے دل میں نفرت پروان چڑھتی رہی۔ فرید احمد صاحب سے جب بھی گفتگو ہوتی تو وہ نامحسوس انداز میں اس نفرت کو اور ہوا دیتے۔ یونس اب اپنے باپ کو ایک غاصب اور درندہ صفت انسان سمجھنے لگا تھا۔ اکثر وہ فرید احمد کے پاس ان کے دفتر چلا جاتا تھا اور اس موضوع پر گفتگو ہوتی۔ فرید احمد صاحب نے گھر کے اخراجات میں کبھی کمی نہ ہونے دی تھی۔ نت نئے طریقوں سے وہ ان کی مالی ضروریات پوری کرتے رہتے تھے لیکن یونس کو شرمندگی ہی ہوتی تھی۔

"جس شخص نے ساری زندگی راج ہی کیا ہو' وہ کسی کی نوکری کرے گا۔ یونس میاں تم خود کو قتل مت کرو۔ تم میری بیٹی کا سہاگ ہو۔ مجھے یہ منظور ہے کہ نجمہ سڑکوں پر ٹیکسیوں کے پیچھے دوڑتی رہے۔ معمولی کھا پہن کر اس گھٹے ہوئے فلیٹ میں زندگی گزارے لیکن یہ منظور نہیں کہ تم کہیں سو روپے کی نوکری کرو اور تمہاری شخصیت مسخ ہو کر رہ جائے۔ میرے پاس جو کچھ ہے اگر تم قبول کرو تو حاضر ہے۔ تم خود ہی تکلف کرتے ہو۔ میاں! کل بچے ہوں گے ان کے لیے تمہیں بہتر زندگی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ آخر تم میرا کاروبار کیوں نہیں سنبھالتے؟"

"میں یہ نہیں کر سکتا چچا! ناممکن ہے یہ میرے لیے۔"

"تو پھر اپنا حق حاصل کرو۔ مرد بن کر سامنے آؤ۔ ہارون کی سازش اس کے منہ پر الٹ دو۔ وہ ہے کیا چیز۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں چچا!"

"کیا سوچ رہے ہو' مجھے بتاؤ؟"

"میں ان سے ملوں گا' بات کروں گا ان سے اور اگر وہ مجھے میرا حق دینے پر آمادہ نہ

ہوئے تو میں انھیں راستے سے ہٹا دوں گا۔ انہوں نے ساری زندگی عیش میں گزار... انتہائی قابل نفرت ہے ان کی شخصیت' میں آپ کو ان کی گھناؤنی حرکتوں کے بارے میں... بھی نہیں سکتا۔ جو شخص انسانیت سے اتنا گر گیا ہو اسے زیادہ عرصے زمین پر بوجھ نہ... رہنا چاہیے۔ میری نجمہ کسمپرسی میں زندگی گزار رہی ہے۔ اپنی بیوی کے لیے میرے... میں بہت سی امنگیں تھیں مگر کیا دیا ہے میں نے اسے۔ یہی نا کہ آج تک خود اس... ٹکڑوں پر پڑا ہوا ہوں۔"

"کیا کرو گے تم اگر ہارون نہ مانا تو........... قتل کر دو گے اسے؟"

"اگر اس کی نوبت آگئی تو یہ بھی کر گزروں گا۔"

"اور پھر جیل چلے جاؤ گے' پھانسی پر لٹک جاؤ گے' کیوں؟ وہی نوجوانی کی ناتجربے... باتیں۔ اگر اس حد تک آگے بڑھنے کی ہمت رکھتے ہو تو ذہانت سے کام لو۔ میں تمہیں... ایک پلان بتا سکتا ہوں۔ ایک ایسی ترکیب کہ ہارون چاروں شانے چت ہو جائے۔ ... ہمت ہے؟"

میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"سوچ لو یونس میاں! اچھی طرح۔" فرید احمد کے چہرے پر سرخی پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ اس پوائنٹ تک آگئے تھے جس کے لیے انہوں نے یہ سارا جال پھیلایا تھا۔

☆--------☆--------☆

قدموں کی آہٹ پر ہارون میاں چونک کر پلٹے اور یونس کو دیکھ کر زہریلے انداز میں مسکرانے لگے۔ "ہیلو ڈیڈی! کیسے ہیں آپ؟" یونس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہلے سے کہیں زیادہ خوش۔ تم میری تندرستی دیکھ رہے ہو؟" ہارون صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

یونس نے محسوس کیا ہارون صاحب کی صحت واقعی پہلے سے بہتر تھی۔

"ہاں یہی لگتا ہے لیکن ڈیڈی! میری صحت کافی گر گئی ہے۔"

"کیسے آئے؟" ہارون صاحب نے اجنبی لہجے میں کہا۔

"شکست مان لی ہے ڈیڈی! واپس آگیا ہوں۔"

"بیوی کہاں ہے تمہاری۔"

"چھوڑ دیا اسے۔"

"تم نے یا اس نے۔" ہارون صاحب حقارت سے بولے۔

"میں نے ڈیڈی!"

"تمہیں اپنی ناکارہ شخصیت کا احساس ہو گیا ہو گا۔ مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟"

"آپ میری واپسی سے خوش نہیں ہوئے ڈیڈی۔"

"قطعی نہیں۔ میں دوسری قسم کا انسان ہوں۔ پہلے بھی میں تمہارا عادی نہیں تھا' تم چلے گئے تو ایک بار بھی مجھے یاد نہیں آئے۔ یقین کرو یونس کہ تمہاری ماں کو میں اس کی ...ت کے چند گھنٹوں بعد بھول گیا تھا۔"

"میں آپ کا بیٹا ہوں ڈیڈی! آپ کی اولاد۔" یونس کی آواز میں لرزش تھی۔

"صرف اس لیے کہ تم میری بیوی کے ہاں پیدا ہو گئے تھے۔ تمہاری پیدائش نہ ...یری ضرورت تھی نہ خوشی اور اب بھی تم میری ضرورت نہیں ہو۔ میں اپنی ذات میں ...مل ہوں۔"

یونس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا لیکن اس نے یہ حقارت آمیز سلوک ...اشت کر لیا۔ البتہ اس کا عزم پختہ ہو گیا تھا۔ تب ہارون صاحب بولے۔

"بہرحال آگئے ہو تو پہلے جیسی حیثیت نہیں حاصل کر سکتے' مجھے لوٹ آنے والوں ...ے نفرت ہے لیکن تمہیں برداشت کر لوں گا۔ ایک عام سی زندگی تم میری کوٹھی میں ...زار سکتے ہو۔"

"جو حکم ڈیڈی!" یونس آہستہ سے بولا اور اندر داخل ہو گیا۔

گھاگ آدمی سے واسطہ تھا اس لیے اسے محتاط رہنا تھا۔ چند روز اس نے نہایت ...خاموشی سے گزارے اور پھر ایک شام پہلا انجکشن اس نے شراب کی سربند بوتل کا ...ڈھکن کھول کر اس میں داخل کر دیا۔ یہ انجکشن اسے فرید احمد صاحب نے فراہم کیے ...تھے۔ اس شام یہی بوتل ہارون صاحب کے سامنے پہنچی تھی۔

اور دوسری صبح وہ بیمار تھا۔ اعصابی کھچاؤ محسوس ہو رہا تھا اسے۔ یونس اس کی ...خدمت میں موجود تھا۔ فیملی ڈاکٹر نے دوائیں تجویز کیں۔ انجکشن کا پورا کورس لکھ دیا گیا ...تھا۔ یونس ہر معاملے میں پیش پیش تھا لیکن ہارون صاحب نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ ...وہ اپنی بیماری سے جھنجلائے ہوئے تھے۔ زندگی میں دو چار بار ہی بیمار ہوئے تھے اس لیے ...بیماری کے عادی نہیں تھے۔

طبیعت دو تین روز میں درست نہیں ہوئی تو انہوں نے چڑچڑے لہجے میں ڈاکٹر سے ...لیے جو ہر وقت انہیں دیکھنے آتا تھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟ آج تین دن گزر گئے اور مجھے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کیا بات ہے آپ بیماری کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے یا دوائیں بے اثر ہیں؟"

"ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے ہارون صاحب!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات صرف یہ ہے کہ اب آپ کی عمر اس مشقت کی اہل نہیں ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ جوانی بہت پیچھے رہ گئی ہے آپ کو اپنے معمولات میں تبدیلی پیدا کرنا چاہیے۔"

"گویا آپ مجھے مرجانے کا مشورہ دے رہے ہیں؟" ہارون صاحب نے کہا۔

"جی نہیں جینے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"فضول باتیں ہیں۔ زندگی کے لوازمات کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بے معنی ہے۔ میرے خیال میں مجھے علاج کے لیے یورپ جانا ہوگا۔"

"جیسا آپ پسند کریں ویسے دو تین دن میں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی لیکن اس کے بعد بھی آپ کو احتیاط رکھنا ہوگی۔ بے احتیاطی آپ کو دوبارہ بیمار ڈال دے گی۔"

"شکریہ۔" ہارون صاحب نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ڈاکٹر کی بات سے انہیں ذرا اتفاق نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دیر تک اسے برا بھلا کہتے رہے۔ یونس اس وقت قریب تھا۔ انہوں نے یونہی پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے یونس۔"

"انتہائی لغو اور بے ہودہ گفتگو کی ہے ڈاکٹر نے۔ میں اس سے ذرا بھی متفق نہیں ہوں۔ زندگی عیش کے لیے ہے اور اگر زندگی سے عیش نکل جائے تو وہ زندگی موت سے بدتر ہے۔"

"جی خوش کر دیا تم نے یونس! میرے خیال میں ڈاکٹر خود بوڑھا ہو گیا ہے اور اس نے علاج کے بجائے نیکیوں کی تلقین کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔" ہارون صاحب ہنس کر کہا۔

"آپ یہ کورس پورا کر لیں' اگر اس سے آپ کی حالت بہتر نہ ہوئی تو پھر یورپ چلیں گے۔" یونس نے کہا۔

"یورپ کی رنگین فضائیں تو یوں بھی صحت بخش ہوتی ہیں لیکن ایک طویل حاضری سے قبل کچھ ضروری انتظامات کرنا ہوں گے۔ کاروبار کو یوں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔" یونس نے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "انجکشن کا وقت ہو گیا ہے لائیے میں آپ کو انجکشن دے دوں۔" وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر کے تجویز کردہ انجکشنوں کے بکس سے اس نے ایک انجکشن نکالا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے دوسرا انجکشن۔ اس دوسرے انجکشن کی دوا اس نے سرنج میں کھینچ لی اور ڈاکٹر کے بتائے ہوئے انجکشن کو توڑ کر اس کی دوا باتھ روم کے فلیش میں بہا دی۔ اس کے بعد وہ سرنج لیے ہوئے دوبارہ ہارون صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا اور وہ دوا ان کے بازو میں انجکٹ کر دی۔

ہارون صاحب آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے لیکن تھوڑی دیر بعد ان کے بدن پر شدید تشنج پیدا ہو گیا۔ ان کے حواس گم ہو گئے اور پھر وہ نہ جانے کیا کیا ہذیان بکنے لگے۔ گھر کے نوکر بری طرح سہمے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ بلایا گیا لیکن ہارون صاحب اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھے وہ شدید غصے کے عالم میں بولے۔

"تم ڈاکٹر ہو یا گدھے' چلو نکلو یہاں سے ورنہ اور سنو آئندہ اگر یہاں قدم رکھا تو گاڑی میں جوت دوں گا۔"

ڈاکٹر بوکھلا گیا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو ہارون صاحب اس کی طرف دوڑے ڈاکٹر پہلے ہی سے باہر نکل گیا۔ یونس بھی اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ "سوری ڈاکٹر صاحب میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"لیکن یہ اس وقت؟" ڈاکٹر نے پریشانی سے کہا۔

"آپ ان کی عادت سے واقف ہیں۔ انہیں آپ کی بات بہت بری لگی تھی۔ اس وقت وہ آپ کو بلانے کے حق میں نہیں تھے۔"

"ڈاکٹر ہوں۔ اپنے مریض کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ اگر یہ رویہ جاری رہا تو معاف کیجئے آپ کو دوسرے ڈاکٹر سے رابطہ کرنا ہوگا۔ میں ان کا علاج جاری نہ رکھ سکوں گا خدا حافظ۔" ڈاکٹر باہر نکل آیا۔ یونس پرسکون نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ہارون صاحب کی حالت بگڑتی چلی گئی اب ان پر وقفے وقفے سے باقاعدہ دورے پڑنے لگے وہ بہت کم ہوش میں رہنے لگے تھے۔ یونس ان کی ضرورت پر انہیں شراب مہیا کر دیا تھا۔ شراب انہیں پرسکون کر دیتی تھی۔ ان کے شناسا ان سے ملنے آتے تو وہ ان

سے ملاقات سے انکار کر دیتے تھے۔ ان سے رابطہ یونس رکھتا تھا۔ چنانچہ کاروباری امور بگڑنے لگے۔ آخر یونس کو تمام دفتری امور سنبھالنے پڑے دنیا جانتی تھی کہ یونس ہارون پاشا' ہارون صاحب کا بیٹا ہے چنانچہ اس سے رجوع ہونے پہ کسی کو اعتراض نہیں تھا فرید اور یونس نے بڑی خوش اسلوبی سے پورا کاروبار سنبھال لیا۔ یونس نے بڑے غرور کے ساتھ فرید احمد سے ملاقات کی۔ فرید احمد صاحب نے بڑے پُرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

"کیسے ہو یونس؟"

"بالکل ٹھیک ہے انکل۔ آپ کی دی ہوئی دوا سے میں اپنی کوشش میں مکمل طور سے کامیاب ہو گیا ہوں۔" یونس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" فرید احمد صاف نے چھپا لیا۔

"لیکن اب میں نجمہ سے دور نہیں رہنا چاہتا۔"

"تمہیں اس سے دور رہنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ تمہاری بیوی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس وقت تمہارے گھر کو اس کی ضرورت ہے۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں تیار ہوں نجمہ کو فوراً لے جاؤ۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" فرید احمد صاحب اٹھ گئے اور وہ دونوں ساتھ چل پڑے۔ یونس کی شاندار قیمتی کار نجمہ کے فلیٹ پر پہنچی اور دونوں نکل کر فلیٹ کی طرف چل پڑے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دستک دے کر جب وہ اندر داخل ہوئے تو دو خواتین نجمہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ نجمہ نے ان دونوں سے ان کا تعارف کرتے ہوئے کہا۔

"اوہو' فضیلہ خالہ یونس آ گئے۔ یونس یہ فضیلہ خالہ ہیں اور یہ ان کی نند تسنیم خالہ یہ یونس ہیں میرے شوہر اور یہ میرے چچا جی۔"

سادہ لوح خواتین شرمانے لگیں۔ پھر انہوں نے اجازت مانگ لی۔ ان کے جانے کے بعد یونس نے کہا۔ "اچانک نمودار ہونے والی خالہ کو میں نہیں جانتا۔"

"بس یونہی شناسا ہیں۔ بڑی مشکل سے گھر تلاش کر کے ملنے آئی تھیں۔ دوبارہ آنے کے لیے کہہ گئی ہیں۔"

"چلو ان کی یہ دھمکی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"دھمکی۔"

"ہاں دوبارہ آنے کی دھمکی۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"مطلب یہ کہ جب وہ دوبارہ یہاں آئیں گی تو انہیں اس فلیٹ میں تالہ پڑا ہوا ملے گا۔" یونس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں ....؟" نجمہ حیرت سے بولی۔

"اس لیے کہ تم یہاں نہیں ہو گی۔"

"افسوس میں اب بھی نہیں سمجھی۔"

"مطلب یہ کہ اب آپ کو سسرال سدھارنا ہے۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"ہاں نجمہ تیاریاں کرو' تمہاری ذمے داریوں نے تمہیں آواز دے دی۔ اتنی بڑی کوٹھی' بیمار سسر اس کے علاوہ میں باہر جانے سے قبل تمہیں تمہارے گھر میں آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کہیں باہر جا رہے ہیں انکل یہ بات تو میرے علم میں بھی نہیں ہے۔"

"ہاں شاید بہت جلد۔"

"مگر کہاں۔"

"مشرق وسطیٰ۔ دورہ مختصر ہو گا!" نجمہ ان کی ہدایات سمجھ گئی تھی اس لیے وہ تیاریاں کرنے لگی۔

"ویسے یونس میاں! نوکروں وغیرہ کو تو نجمہ کے بارے میں معلومات ہوں گی کیا انہیں اس بات کا علم ہے کہ تم نے ہارون صاحب سے کیا کہہ کر دوبارہ رابطہ قائم کیا ہے؟" فرید احمد نے پوچھا۔

"نہیں چچا! ڈیڈی دوسری قسم کے آدمی ہیں۔ قطعی غیر جذباتی' وہ نوکروں کو صرف نوکر سمجھتے ہیں اور ذاتی معاملات میں کبھی شامل نہیں کرتے۔"

گڈ چلو ہارون کی کوئی خوبی تو ہمارے کام آئی۔"

"میں نے البتہ انہیں خود سے واقف رکھا ہے وہ سب یہ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اس لیے ڈیڈی مجھ سے ناراض ہو گئے تھے لیکن اب وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ میں اپنی بیوی کو اسی کوٹھی میں لے آؤں ...."

"خوب' لوہے کو واقعی لوہا ہی کاٹتا ہے۔" فرید احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

ہارون صاحب کو اب صرف کوٹھی کے ایک حصے میں محصور کر دیا گیا تھا۔ وہ نیم پاگل ہو چکے تھے۔ چند ملازم ان کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کے لیے ہر آسائش مہیا تھی لیکن انہیں کوٹھی کے دوسرے حصے میں آنے کی اجازت نہیں تھی اور اس بات پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ اکثر جب وہ دورے کی حالت میں ہوتے اور خود پر غور کرتے تو ان پر جنون طاری ہونے لگتا تھا۔ اپنی بے بسی پر وہ سر کے بال نوچنے لگتے تھے۔ ساری زندگی حکمراں رہے تھے۔ جو دل چاہا کیا تھا۔ سینکڑوں انسانوں سے زندگی چھین چکے تھے۔ بے شمار ان کے سامنے بے بسی سے ناک رگڑ رگڑ کر مر چکے تھے لیکن آج وہ خود بے بس تھے اور یہ بے بسی ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ انہیں علم تھا کہ یونس نے ان کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اب وہ محکوم ہیں۔ یونس کا رویہ بھی اب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ ایک دن عالم ہوش میں وہ یونس پر چڑھ دوڑے تھے اور اسی دن سے ان کی رہائش گاہ الگ کر دی گئی تھی۔ انہوں نے یونس سے کہا تھا۔

"میں کاروباری امور کا حساب دیکھنا چاہتا ہوں' مجھے دفتر لے چلو۔"

"ان تمام چیزوں سے اب آپ کو کوئی سروکار نہیں ہے ڈیڈی۔ آرام کریں۔ فضول باتوں میں نہ الجھیں کاروبار میرا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں نے کوئی وصیت تو نہیں لکھی ہے۔"

"وصیت کی ضرورت نہیں ہے ڈیڈی! میں آپ کی واحد اولاد ہوں۔ آپ کے بعد یہ سب کچھ قانوناً میرا ہی تو ہے۔"

"میرے بعد' میری زندگی میں نہیں۔"

"آپ زندہ کب ہیں ڈیڈ' میری ایک جنبش آپ کو موت سے ہمکنار کر سکتی ہے کان دبا کر پڑے رہیے ورنہ میں بہت برا سلوک کروں گا آپ کے ساتھ۔"

"میں تجھے جان سے مار دوں گا نابکار' کمینے! یہ تو مجھے اولاد ہونے کا صلہ دے رہا ہے۔"

"جو کچھ آپ نے باپ بن کر دیا ہے ڈیڈی! وہی لوٹا رہا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں میں بندوبست کردوں گا۔" اور اس کے بعد ہارون صاحب کا اس حصے میں بندوبست کر گیا تھا۔ کوٹھی کے حالات اب ان کے علم میں نہ رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی کوٹھی کے عقبی باغ تک تھی لیکن باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے بھی ملازم ان کی نگرانی کرتے تھے۔

اس شام بھی وہ ٹھیک ٹھاک تھے اور باغ کے فوارے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ان کی نگاہ ایک خوب صورت لڑکی پر پڑی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ آہ میں زندگی سے کس قدر دور ہوں۔ یہ حسین پیکر جو میرے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ اب انہیں دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ اٹھے اور لڑکی کے قریب پہنچ گئے۔ خوب صورت لڑکی عجیب سی نگاہوں سے ہارون صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً ہارون صاحب کو محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کی شکل جانی پہچانی سی ہو۔ انہوں نے بہت قریب جا کر قریب سے اسے دیکھا۔ ممکن ہے کبھی وہ ان کی تنہائیوں کی شریک رہی ہو۔ کون ہے وہ؟

"ہیلو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"ہیلو ہارون صاحب۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"کون ہو تم۔ میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے۔ یونس کی دوست ہو' اس کے پاس آئی ہو؟"

"پہچانئے ہارون صاحب ورنہ تسلیم کیجئے کہ آپ مکمل طور پر پاگل ہو گئے ہیں۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی اور ہارون صاحب غصے سے سرخ ہو گئے۔

"تم میری کوٹھی میں آکر مجھ سے بدتمیزی کر رہی ہو' اس کا نتیجہ جانتی ہو۔"

"آپ کی کوٹھی' ہارون صاحب! آپ واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔ اب یہ آپ کی کوٹھی کہاں رہی ہے۔ پہلے واقعی آپ لوگوں کو سزا دیتے تھے لیکن اب تو آپ ان تمام سزاؤں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ آپ کی بینائی' آپ کی یادداشت بوڑھی ہو چکی ہے۔ آپ مجھے نہیں پہچانتے' غور کریں۔ میں نجمہ ہوں۔ آپ کے دفتر میں ملازمت کرنے آئی تھی۔ ایک ہزار روپے دے کر آپ نے میری عزت خریدنے کی کوشش کی تھی اور جب میں نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تو آپ نے اپنے اختیارات سے کام لے کر مجھے ایک سال کے لیے جیل بھجوا دیا تھا۔ کیا آپ کی یادداشت ساتھ دیتی ہے۔"

"ہاں' اوہ' واقعی تم وہ لڑکی ہو۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے لیکن یہاں اس کوٹھی میں۔ میرا مطلب ہے کیا اب تم یونس کی دوست ہو؟"

"بہت گہری دوست' زندگی بھر کی دوست۔ میں اس کی بیوی ہوں۔" نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہارون صاحب پر جیسے بجلی گر پڑی۔

"بیوی۔" وہ دیوانہ وار چیخے۔

جب میں باہر نکلی تو پوری دنیا میں تنہا تھی۔ میری ماں مر چکی تھی۔ ایک ایسے شخص نے مجھے سہارا دیا جو مجھ سے زیادہ آپ کے مظالم کا شکار تھا۔ اس کی مدد سے میں نے آپ کے بیٹے سے دوستی کی اور بالآخر اس نے مجھ سے شادی کرلی۔ جس پر آپ نے اسے گھر سے نکال دیا' لیکن ہارون صاحب یوں میرا انتقام پورا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے یونس کو دوبارہ آپ کے پاس بھیجا۔ صرف اس لیے کہ وہ آپ کو معطل کر دے اور اپنا حق آپ سے چھین لے۔ پھر یونس نے آپ کو ایسے انجکشن دے کر مفلوج کر دیا جو اعضا کو کمزور کرتے ہیں اور دماغ کے خلئے خشک کر کے جنون کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اب آپ ایک دیوانے انسان ہیں۔ پاگل اور مریض۔ تھو۔" نجمہ نے زمین پر تھوک دیا۔

"یہ میرا انتقام ہے آپ سے دانش صاحب! آپ نے مجھ سے میری آزادی کا ایک سال چھینا تھا' میں نے آپ سے آپ کی زندگی کے نہ جانے کتنے سال چھین لیے ہیں۔ آپ ایک مفلوج اور پاگل انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں کیا یہ ایک بھرپور انتقام نہیں ہے' میں آپ کی اس کوٹھی' آپ کی اس ساری جائیداد کی مالک ہوں اور آپ کا بیٹا میرا غلام ہے۔ سمجھے ہارون صاحب' سمجھ گئے نا آپ۔"

"لڑکی! یہ نہیں ہو سکتا .... ہرگز نہیں ہو سکتا' میں .... میں تجھے قتل کر دوں گا۔ میں تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔" ہارون صاحب پر ایک بار پھر دورہ پڑ گیا۔ نجمہ ان کی زد سے بچ گئی تھی' لیکن دوسرے لمحے وہ ملازم دوڑ پڑے جو دور رہ کر ہارون صاحب کی نگرانی کرتے تھے۔ انہوں نے ہارون صاحب کو گرفت میں لے لیا۔

"چھوڑ دو مجھے ذلیل کمینو! مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میری دشمن ہے' میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے ساری زندگی اپنے دشمنوں کو نیچا دکھایا ہے' میں اسے ...." وہ چیختے رہے اور ملازم انہیں گھسیٹتے ہوئے ان کی قیام گاہ پر لے گئے۔ انہوں نے انہیں ایک کمرے میں بند کر دیا۔

یونس کو نوکروں کی زبانی تفصیل معلوم ہوئی تو وہ چراغ پا ہو گیا۔ اس نے نجمہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"سوری ڈارلنگ' تمہیں پریشانی ہوئی۔ میرا خیال ہے اب ان بڑے میاں کو کسی دماغی ہسپتال میں داخل کرا دوں یا کہیں اور منتقل کر دوں۔ یہاں رہ کر وہ تمہارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔"

رکھوں گی۔" نجمہ نے کہا۔

"میں تو اس بوڑھے سے عاجز ہوں۔ دل چاہتا ہے۔ زہر دے دوں۔"

"نہیں یونس!" نجمہ لرز گئی۔ "آئندہ ایسی بات مت سوچنا' تم بے فکر رہو' آئندہ اس کی نوبت نہیں آنے پائے گی' میں خیال رکھوں گی۔" نجمہ نے یونس کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا۔ وہ یونس کے ہاتھوں سے قتل نہیں کرا سکتی تھی۔ وہ ہارون نہیں تھی۔ ہارون صاحب کے لیے بس یہی کافی تھا کہ وہ بے بسی سے تڑپتے رہیں لیکن دوسری طرف ہارون کے ذہن میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ دورے کی کیفیت میں تھا' لیکن اسے حالات کا پورا پورا اندازہ تھا۔ نجمہ ایک غریب گھرانے کی معمولی سی لڑکی جس نے اس کی بے عزتی کی تو اس نے نجمہ کی ساری زندگی برباد کر دی لیکن اس وقت وہ اس کے مقابلے پر ہے اور اسے شکست ہو چکی ہے۔ اسے اس حالت میں پہنچانے والا اس کا بیٹا ہے۔ "یونس .... آہ .... آہ' مجھے شکست ہو چکی ہے' میں واقعی بے بس انسان ہوں۔" ہارون صاحب کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو چمکے تھے۔

"ہاں میں ایک شکست خوردہ انسان ہوں میں بے بس ہوں۔ ان دونوں کے خلاف کچھ کرنے کی سکت اب مجھ میں نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے' تب انہوں نے سوچا۔ "میں اب یہاں نہیں رہوں گا' نجمہ کسی بھی وقت مجھے موت کی نیند سلا دے گی' یہ دشمنوں کا گھر ہے' مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ انجکشن سے بالآخر مجھے ختم کر دیں گے' میں ان دشمنوں سے جان نہیں بچا سکتا' مجھے بھاگ جانا چاہیے۔"

یہ خیال ان کے ذہن میں پختہ ہو گیا اور ایک رات جب نوکر ان کی دماغی کیفیت سے مطمئن ہو کر آرام کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئے۔ کوٹھی کے عقبی باغ کی ایک باڑھ پھلانگ کر وہ احاطے کے پاس پہنچے اور پھر احاطے کی دیوار کے دوسری طرف کود گئے۔ وہ اس خطرناک مقام سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ اعضا واقعی کمزور ہو چکے تھے۔ دوڑنے کی کوشش کی تو ان کے پھیپھڑے پھول گئے۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ تھوڑی دور چل کر ایک جگہ زمین پر بیٹھ گئے۔ اعضا بالکل ہی بے جان ہو گئے تھے۔ چنانچہ شہر کا رئیس اعظم' ایک اشارے پر لوگوں کو زندگی سے محروم کر دینے والا ایک گندی سی نالی کے قریب پتھر پر سر رکھ کر سو گیا۔ گہری نیند۔

صبح کو جب وہ جاگا تو مکمل طور پر دورے کی کیفیت میں تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔

"مرگی کا دورہ ہے شاید' جوتا سنگھاؤ۔ ہاں جوتا سنگھاؤ۔" لوگ تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک ہمدرد نے جوتا اتار کر ہارون صاحب کی ناک پر رکھ دیا۔

اس بار دورے کی حالت کچھ طویل ہو گئی تھی۔ ہارون صاحب پاگلوں کی طرح سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے' معدے میں کچھ نہیں تھا اس لیے قویٰ بھی جواب دیتے جا رہے تھے۔ صورت بگڑ کر رہ گئی تھی۔ لباس غلیظ ہو چکا تھا۔ اس حالت میں انہیں ہوش آ گیا لیکن ہوش و حواس کی یہ کیفیت اور بھی سوہان روح تھی۔ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ کیا تھے کیا ہو گئے تھے۔ بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں اور دل میں ایک احساس جاگ رہا تھا۔ کیا یہ ان کے گناہوں کی سزا ہے' بڑی پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں اور یہ خیالات انہیں اور بے چین کر رہے تھے۔ اس سے بہتر تو دیوانگی ہے' کم از کم یہ خیالات تو پریشان نہیں کرتے ہیں۔ اپنے قویٰ بھی باغی ہو گئے تھے۔ آنکھیں کوشش کے باوجود نہیں کھل رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی' زبان بھی خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی' اس وقت کوئی ان کا ساتھی نہیں تھا۔ بھوک کی شدت نے ایک بار پھر غشی طاری کر دی' لیکن یہ غشی کسی تکلیف سے دور ہوئی تھی۔ یہ تکلیف بازو میں سوئی کی چبھن کی تھی۔ کسی کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ البتہ انہیں اپنی حالت بہتر محسوس ہوئی تھی۔ بھوک کی کیفیت بھی نہیں تھی اور بدن کے نیچے کھردری زمین کے بجائے آرام دہ بستر تھا۔ پھر انہیں نیند آ گئی اور وہ سو گئے۔ دوسری بار جاگے تو بدن بہت ہلکا پھلکا تھا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی ناکام نہیں رہی۔ پہلی بار انہوں نے اس بدلے ہوئے ماحول کو دیکھا۔ درمیانے درجے کے فرنیچر سے آراستہ ایک کمرہ تھا جو کسی ہسپتال کا کمرہ نہیں معلوم ہوتا تھا' لیکن ہسپتال پہنچانے والا بھی کون ہو گا۔ پھر یہ کون سی جگہ ہے۔ ان کی کوٹھی تو نہیں ہو سکتی یہ۔ دیر تک اپنی جگہ لیٹے سوچتے رہے۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور ڈاکٹر نظر آیا' جسے انہوں نے گلے کے اسٹیتھو اسکوپ سے پہچانا تھا۔ ڈاکٹر مسکراتا ہوا ان کے پاس آ بیٹھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب! کیا یہ کوئی پرائیویٹ ہسپتال ہے' مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"یہ ساری باتیں بعد میں معلوم ہوں گی۔ زبان دکھائیں۔" ڈاکٹر نے کہا اور ہارون

صاحب نے زبان نکال دی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا معائنہ کر کے بیک وقت دو انجکشن دیے اور بولے۔

"کیا آپ بیکولن کے انجکشن استعمال کرتے رہے ہیں؟"

"یہ کیا چیز ہوتی ہے ڈاکٹر؟"

"ایک نشہ آور دوا' لیکن جس کے نتائج کافی خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ دوا نشہ آور تو ہوتی ہے' لیکن اعصابی تشنج پیدا کر کے دماغ کو مفلوج کر دیتی ہے۔"

"ہاں شاید میں یہ دوا استعمال کرتا رہا ہوں۔" ہارون صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ انہیں نجمہ کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔

"اندازاً کتنے عرصے آپ نے یہ انجکشن لیے؟"

"زیادہ عرصہ نہیں ہوا' میں صحیح وقت نہیں بتا سکتا۔"

"شراب یا دوسری نشہ آور اشیاء بھی استعمال کرتے رہے ہیں آپ؟"

"کثرت سے ڈاکٹر۔"

"ہوں یہی وجہ ہے کہ بیکولن آپ کے ساتھ وہ سلوک نہ کر سکی جو اس کی خاصیت ہے' بہرحال میں نے اس کے اثرات زائل کر دیے ہیں۔ امید ہے اب آپ کی وہ کیفیت نہیں ہو گی لیکن کوئی نشہ آور چیز اب آپ کے لیے سخت مضر ہو گی۔ خیال رکھیں۔" ڈاکٹر اپنا سامان سمیٹ کر اٹھ گیا۔ اس نے ہارون صاحب کے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

مزید کئی دن انہیں اسی الجھن میں گزارنا پڑے۔ ڈاکٹر انہیں نیند کے انجکشن دے دیتا تھا تاکہ ان کے اعصاب پُرسکون رہیں۔ ابھی تک غذا بھی مصنوعی طور پر ہی دی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور ایک نئی شکل سامنے آئی۔ ایک بوڑھے شخص کی شکل جس نے انہیں اپنے ہاتھ سے غذا دی تھی۔ ہارون صاحب کی جسمانی حالت اب بھی بالکل ٹھیک تھی۔ بوڑھے شخص نے انہیں تھرماس سے چائے انڈیل کر دی اور چائے پی کر ہارون صاحب نے بڑی فرحت محسوس کی تھی۔

"میں نے پہلی بار آپ کو اس جگہ دیکھا ہے۔ کیا آپ بھی مجھے یہاں کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟" انہوں نے کہا اور بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ میرا گھر ہے ہارون۔"

"آپ ...... آپ مجھے جانتے ہیں۔" ہارون صاحب اچھل پڑے۔

"تم بھی اگر کوشش کرو تو مجھے پہچان سکتے ہو۔ تمہاری عنایت نے مجھے بوڑھا ضرور کر دیا ہے لیکن کوشش کرو تو مجھے پہچان سکتے ہو۔" بوڑھے نے کہا اور ہارون صاحب آنکھیں پھاڑنے لگے اور پھر ان کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ ان کا دل اچھلنے لگا اور ان کے حلق سے ایک سرسراہٹ سی نکلی۔

"غلام جیلانی۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ تم مجھے ضرور پہچان لو گے۔"

"تم .... تم زندہ ہو جیلانی! تم زندہ ہو۔ تم کب واپس آئے تم تو یورپ چلے گئے تھے۔"

"اپنی روح تو یہیں چھوڑ گیا تھا ہارون۔ وہاں کیسے رہتا؟ ایک پل چین نہیں ملا وہاں طویل عرصہ ہوا واپس آئے ہوئے۔"

"اسی شہر میں تھے۔"

"ہاں لیکن غلام جیلانی بن کر نہیں' فرید احمد بن کر۔ غلام جیلانی کو تم زندہ کہاں رہنے دیتے۔" بوڑھے نے کہا اور ہارون صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے دل و دماغ کی بری حالت تھی۔ جس شخص کو انہوں نے زندہ درگور کر دیا تھا اس نے اس برے وقت میں ان پر احسان کیا تھا۔ دیر تک وہ آنکھیں بند کیے خاموش رہے پھر بولے۔

"مجھے کہاں سے لائے تھے؟"

"ایک سڑک سے تم نیم مردہ حالت میں مجھے ملے تھے۔"

"کون کہتا ہے کہ گنہگاروں کو سزا نہیں ملتی جیلانی۔ مجھے دیکھو۔ تمہاری حالت مجھ سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا جیلانی! کیوں کہ یہ میری ایک اور بے غیرتی ہو گی۔ میں معافی کے قابل نہیں ہوں۔ مگر تم نے مجھ سے انتقام کیوں نہیں لیا۔ تم نے میرے بدن میں کیڑے کیوں نہیں پڑنے دیے' مجھے اس بری حالت میں دیکھ کر تم نے قہقہے کیوں نہیں لگائے۔" ہارون صاحب کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے ہارون! میں فرشتہ نہیں ہوں۔ میں نے تم سے بھرپور انتقام لیا ہے۔ یہ میرا انتقام ہی ہے ہارون کہ تمہاری فرعونیت ختم ہو گئی ہے اور اب تم ایک مجبور اور بے کس انسان ہو۔ میں نے ہی تمہیں اس حال میں پہنچایا ہے ہارون۔ سمجھے تم۔ میں نے ہی یونس کو وہ ہیکولن کے انجکشن فراہم کیے تھے۔ میں مطمئن ہوں۔

ہارون میں نے ہی اس لڑکی کو تمہارے پیچھے لگایا تھا جو ایک سال کی سزا کاٹ کر میرے پاس ملازمت کے لیے آئی تھی۔ اگر میں اس کی مدد نہ کرتا تو وہ یونس تک نہ پہنچ پاتی۔ پھر میں نے ہی ان دونوں کی شادی کرائی اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ یونس تمہارے خلاف ہو گیا۔ وہ لڑکی بھی میری طرح تمہارے مظالم کا شکار تھی۔ اس لیے ہم دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی اور تمہیں اس حال کو پہنچا دیا' سمجھے تم۔ یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ میں فرشتہ ہوں۔" جیلانی نے سخت لہجے میں کہا اور ہارون صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔

"تمہارا احسان ہے جیلانی! کہ تم نے میرے سینے کا بوجھ کسی قدر ہلکا کر دیا۔ میں اسی قابل تھا لیکن........... مجھے اس حال میں پہنچانے کے بعد تم نے میری موت کا تماشہ کیوں نہیں دیکھا' میری سزا کیوں نہیں پوری ہونے دی۔"

"اس لیے ہارون! کہ ان ساری باتوں کے باوجود میں انسان ہوں' انسانیت کی یہ تذلیل میرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی' اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکا' میرا انتقام پورا ہو چکا تھا' سڑکوں پر گھسٹتے ہوئے ہارون کو میں نے بہرحال معاف کر دیا۔ اب میرے تمہارے درمیان کوئی قرض باقی نہیں۔ ہاں ہارون! اگر آخرت کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ اگر مجھ پر کیے گئے مظالم کا احساس کر کے ایک فرض انسانی پورا کرنے کا خیال دل میں آئے تو مجھ پر ایک احسان کر دو۔ ہمارا پرانا حساب ختم ہو چکا ہے۔ ہارون! آؤ نیا حساب کتاب شروع کر دیں۔ ایک نیا کھاتہ کھول لیں۔ خدا کے لیے مجھے میری بیٹی سے ملا دو۔ مجھے ان کا پتا بتا دو' وہ کہاں گئیں۔ کیا تم نے انہیں قتل کر دیا؟" جیلانی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور ہارون صاحب نے شدت جذبات سے کانپتے ہاتھوں سے جیلانی کے ہاتھ تھام لیے۔

"خدا کے لیے جیلانی! میرے دوست' آنسو پونچھ لو' میں اب آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری عظمت ہے کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ میں اس قابل نہیں ہوں جیلانی! میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے بدلے میں تم نے کچھ بھی نہیں کیا لیکن تمہاری عظمت ہے کہ........... کہ تم نے مجھے اتنی جلدی معاف کر کے انسانیت کا مظاہرہ کیا ہے جیلانی! میرے جرم کی داستان یوں ہے کہ بھابی کو ہمارے درمیان ہونے والی چپقلش کا کوئی علم نہیں تھا۔ جب مجھے تم سے خطرہ محسوس ہوا تو میں بھابی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ان سے

روپوش ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی بیوی اور بیٹی کی گرفتاری کی تیاری کر رہی ہے۔ چنانچہ جیلانی کی ہدایت پر انہیں یہاں سے فوراً کہیں چلے جانا چاہیے۔ اس طرح میں انہیں تیار کر کے حیدر آباد لے گیا۔ وہاں میں نے ایک مکان حاصل کر کے ایک بڑی رقم دی اور کہ کہ وہ بالکل روپوش رہیں اور کسی سے ملنا جلنا نہ رکھیں اور خاموشی سے وقت گزارتی رہیں۔ بھابی نے میری بات مان لی تھی۔ ان سے مطمئن ہو کر میں واپس آ گیا اور یہاں میرے اور تمہارے درمیان چپقلش چلتی رہی۔ میں ان کے ذریعے تم سے وہ کاغذات حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا لیکن تمہاری زبان بند رکھنے کا ذریعہ بھی وہی دونوں تھیں' اس لیے میں نے تمہیں ان تک نہیں پہنچنے دیا' اس کے بعد میں زخمی ہو گیا۔ تمہیں جیل ہو گئی۔ تندرست ہونے کے بعد بھی میں خوف زدہ تھا کیونکہ بھابی قانون کے سامنے پیش ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ میں دوبارہ ان کے پاس گیا اور میں نے انہیں تمہاری موت کی خبر سنائی۔ میں نے کہا کہ تم پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے ہو' لیکن پولیس کو اب بھی جیلانی کی بیوی اور بیٹی کی تلاش ہے۔ میں نے انہیں پچیس ہزار روپے دیے اور کہا کہ اب وہ باقی زندگی یہیں گزار دیں اور ممکن ہو تو اپنا نام ہی بدل لیں' اس کے بعد جیلانی! اس کے بعد میں نے ان کی خبر نہیں لی۔ مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا۔"

"کیا تمہیں حیدر آباد کا وہ مکان یاد ہے ہارون؟" جیلانی کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن ہو گئے۔

"تم حیدر آباد چلنے کی تیاری کرو' جیلانی' ممکن ہے خدا مجھے اس آخری وقت میں سرخرو کر دے۔ جاؤ جیلانی تیاری کرو............ جلدی کرو۔"

"میں تمہاری صحت یابی کا انتظار کر لوں گا ہارون! ابھی تم............"

"تمہیں خدا کا واسطہ جیلانی' جلدی کرو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جلدی کرو' اب ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ جاؤ جیلانی! اٹھ جاؤ۔"

☆--------☆--------☆

اس کے بعد وہ ایک لمحے کے لئے بولتے بولتے رک گیا۔ سونو اس کہانی کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اس کی خاموشی اسے بڑی ناگوار گزری اور اس نے کہا۔

"آگے کیا ہوا مسٹر محسن! پلیز مجھے بتایئے۔" محسن کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

"بس کچھ کہانیوں کا نامکمل رہ جانا ہی بہتر ہوتا ہے جو کچھ ہوا کافی حد تک بہتر ہوا لیکن اس کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جنہیں تشنگی کا شکار رہنا چاہئے۔ میں تمہیں بتاؤں سونو تشنگی کا اپنا ایک مقام ہے اور ہم اگر ہر چیز اپنے طور پر مکمل کر لیں تو آپ یقین کریں کہ تکمیل کا لفظ ناگوار گزرنے لگے۔" سونو محسن کو دیکھنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی ایسا عمل ہوا ہے جس نے محسن کو آگے کی کہانی سنانے سے روک دیا ہے۔ کوئی ایسی بات جسے وہ اپنے لفظوں میں بیان نہ کرنا چاہتا ہو۔ نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لئے سونو کے چہرے پر اداسی کی ایک لکیر دوڑ سی گئی۔ محسن نے اسے محسوس کیا اور بدستور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہاں' بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں نجمہ ہی کا بیٹا ہوں کیا ہوا کس کس طرح ہوا اسے جانے دو۔ بہت سی دکھ بھری داستانیں اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ میں نجمہ کی اولاد ہوں اور نجمہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہاں! اس سے آگے کہانی میری شروع ہو جاتی ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ میں بس جس طرح اس دنیا میں آیا اور جس طرح میں نے اس دنیا کو دیکھا اور اس کے بارے میں سوچا وہ ایک بہت ہی تکلیف دہ داستان ہے اور اس کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ جن حالات میں میری پرورش ہوئی وہ بہتر نہیں تھے۔ بہت ہی دکھ بھرے حالات تھے وہ۔ بس یوں سمجھ لو کہ میری پیدائش کسی کے لئے باعث خوشی نہیں تھی۔ حالانکہ میری ماں دکھ کے تمام لمحات سے گزر آئی تھی لیکن کون کہتا ہے کہ دکھ کی کہانی کب ختم ہوتی ہے۔ ایک کہانی ختم ہوتی ہے تو دوسری کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ماں جن لوگوں کے درمیان پہنچ گئی تھی وہ بہتر نہیں نکلے۔ میرے باپ نے بہت عرصے پہلے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے کہیں باہر چلا گیا۔ دنیا کے کسی ایسے ملک میں جس کے بارے میں اس نے کسی کو اطلاع نہیں دی تھی۔ بڑی بے بسی اور بے کسی کی زندگی گزر رہی تھی۔ نجمہ کو اپنے معصوم سے بچے کے ساتھ جن لوگوں کے ساتھ گزارہ کرنا پڑ رہا تھا وہ انتہائی سنگدل اور اپنے آپ میں مست لوگ تھے لیکن یہ سمجھ لو کہ بہت ہی برے حالات چل رہے تھے اور میں ہاں اب میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے بلکہ متعارف کراتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ میں ایک ایسے عالم میں پروان چڑھ رہا تھا جو بڑا عجیب و غریب تھا۔ ذہنی طور پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی مجھ پر جب میں دیکھتا تھا کہ لوگوں کے والدین بڑی خوش دلی کے ساتھ انہیں اسکول تک پہنچانے آتے ہیں۔ ان کے لئے طرح طرح کی خوشیاں فراہم کرتے ہیں۔ مجھے بھی اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا لیکن اس طرح کہ میری

ماں ایک دن گردن خم کئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچی تھی اور انہوں نے از راہ رحم مجھے اسکول میں جگہ دے دی تھی۔ بہرحال اس کے بعد مجھے پہلی بار کلاس روم بھیج دیا گیا۔ کلاس روم میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور بچے خوب شور مچا رہے تھے۔ میرے ننھے سے ذہن میں استاد کا جو تصور تھا وہ آنے والے استاد کو دیکھ کر عجیب سی شکل اختیار کر گیا۔ سارے بچے گرد آلود فرش پر بے حس و حرکت بیٹھ گئے لیکن مجھے یہ فرش پسند نہیں آیا تھا جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا سونو! طبیعت میں ایک ضد سی تھی۔ غالباً یہ ضد اس لئے پیدا ہو گئی تھی کہ میری ضد کبھی کسی نے نہیں اٹھائی تھی۔ ماں تو خود ایک بے بس، بے کس اور مجبور سی عورت تھی۔"

"ایک منٹ' ایک منٹ' محسن ایک منٹ۔" سونو نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا اور محسن جس کا چہرہ خواب آلود ہو رہا تھا سونو کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے نیند سے آنکھیں کھل گئی ہوں۔

"آخر وہ ایسے کون سے حالات ہوئے تھے جن کے تحت نجمہ اتنے اچھے اور مہذب لوگوں کے درمیان سے نکل کر ایسے برے حالات میں پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے تمہیں جنم دینے کے بعد اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔"

"حالات بالکل ٹھیک ہو گئے تھے۔ سب کچھ درست ہو گیا تھا لیکن بس نجمہ کی زندگی کا ایک انقلاب اسے ان حالات میں لے آیا تھا۔ اپنوں سے دور غیروں کے درمیان ایسی ہی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ مجھے پھر اسکول آ جانے دو۔ میں گندے فرش پر نہ بیٹھا تو ماسٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے تجھے کیا ہو گیا جو بانس کی طرح کھڑا ہوا ہے؟"

"فرش گندا ہے۔ میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"لاٹ صاحب کے بچے اوقات میں رہ چل بیٹھ۔" میں ان لاٹ صاحب کے بارے میں سوچنے لگا جن کا میں بچہ تھا لیکن وہ لاٹ صاحب میری سمجھ میں نہیں آ سکے۔ اسکول کا ماحول جس طرح کا تھا وہ ایک دلچسپ جگہ تھی اور کم از کم میں سوچ رہا تھا کہ جہاں میری اصل حیثیت سامنے آئے گی اور مجھے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا اور پھر یہی ہوا: اپنے جوہر دکھانے لگا۔ بچوں کی پٹائی میرا دلچسپ مشغلہ تھا۔ کسی کے دانت ٹوٹے' کسی کی آنکھ میں چوٹ لگی اور خوب ہنگامہ ہو گیا۔ بہرحال یہ تمام تفریحات جاری رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میری اپنی ضروریات نے بھی پر نکالے۔ میری ماں کے پاس تو کچھ ہوتا

نہیں تھا' بڑی مشکل سے اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی خوشامد کر کے فیس معاف کرائی تھی لیکن بات صرف فیس کی نہیں ہوتی بلکہ دوسری ضروریات بھی ہوا کرتی ہیں۔ جو دوسرے بچوں کی پوری ہو جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے۔ ماسٹر صاحب کی گھڑی کسی بچے کا بستہ عام طور سے بچوں کی کتابیں غائب ہوتی رہیں۔ کئی بار پکڑا بھی گیا اور بڑی شاندار ترکیبیں لڑا کر نکل بھی آیا۔ اصل میں بات وہی ہوتی ہے کہ کوئی عمل کیا جائے اگر اسے کرنے کا سلیقہ ہو تو بات بنتی ہے۔ ایک طرف تعلیم میں دلچسپی دوسری طرف اپنا کام آخرکار میں نے اپنا کام جاری رکھا پڑھائی کا نتیجہ سامنے آتا رہا لیکن اس میں بھی میری فنکاری کام آتی تھی۔ پھر ایک دن گھر سے کچھ رقم چرائی باہر تو کبھی نہیں پکڑا گیا تھا لیکن گھر میں پکڑا گیا وہ بھی باپ کے رشتہ داروں نے پکڑا تھا۔ رقم بھی انہی کی تھی' ماں جو اپنی زندگی سے ہی عاجز تھی اور بڑی مشکل سے وہاں گزر رہی تھی اور میری اسکول کی شکایتوں سے ہی تنگ تھی۔ اس بار برداشت نہ کر سکی اور اس نے مجھے اتنا مارا کہ میرے جسم سے خون رسنے لگا۔ مجھے گھر سے نکال دیا گیا اور آخرکار واقعی میں نے گھر چھوڑ دیا۔ میں اپنی اس پہلی رات کو یاد کرتا ہوں جو میں نے گھر سے باہر گزار دی اور اس کے بعد سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔

غرض یہ کہ پھر میں نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ چھوٹا سا تھا بات صرف اتنی سی تھی کہ تیز دوڑنے کی عادت پیدا کروں۔ ضروری تھا جان بچانے کے لئے تیز دوڑوں۔ چنانچہ برق رفتاری سے اپنا کام کرتا اور نکل جاتا کسی کے ہاتھ میں نوٹ دیکھا لپکا اور بھاگ لیا۔ بچوں کی چیزیں کھیل کود کا سامان ایسی جگہ بھی مل گئی تھی جہاں میں یہ سامان بیچ سکتا چنانچہ یہ سارا کام اس انداز میں جاری رہا اور وہیں سے مجھے باقی سارے کام کرنے کا موقع ملا۔ اب میں کیا بتاؤں۔ بڑی عمدگی کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔ اس سلسلے میں چند دوست بھی بن گئے تھے۔ جو یونہی سڑکوں کی اولاد تھے اور سڑکوں پر زندگی گزارتے تھے۔ ان سے دوستی بڑی اچھی رہی ویسے تو بہت سے لوگ ملے تھے لیکن میرا ایک دوست ندیم شاہ تھا۔ عام لوگوں کی نسبت بڑی اچھی طبیعت کا مالک اور فراخ دل' کافی عرصے تک میری اور اس کی دوستی رہی وہ بھی میری طرح بالکل تنہا زندگی گزار رہا تھا اور مشکلات کا شکار بھی تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کے درمیان دوستی گہری ہوتی چلی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے تنہا ہی ہاتھ مارنے شروع کر دیئے اور اس سلسلے میں نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگے۔ ندیم شاہ بھی

رہے تھے۔ ہم نے کچھ ایسے ہاتھ مارے جن کی وجہ سے ہمارے پاس ایک اچھی خاصی رقم آگئی تو ندیم شاہ نے مجھ سے کہا۔

"کیا خیال ہے پاپے' کیوں نہ ہم اپنے رہنے کے لیے کسی مناسب جگہ کا بندوبست کریں۔ یہ سڑکیں اور فٹ پاتھ پائیدار نہیں ہوتے یہاں پہلی بات تو یہ کہ پولیس والوں سے زبردستی کی دوستی رکھنا پڑتی ہے اور یہ دوستی بہرحال مناسب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دوستی کرتے ہوئے تمام پولیس والے ہمیں پہچان لیں گے اور اگر کبھی ہم ان میں سے کسی کے ہاتھ لگ گئے تو میرا مطلب ہے کام کے وقت تو وہ صاف کہہ سکتے ہیں' ہم دونوں آوارہ چھوکرے ہیں سڑکوں اور گلیوں کے باسی سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

دونوں میں ایک بڑی خوبی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی بات پر اتفاق کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ندیم شاہ کے کہنے سے ہم نے کسی رہائش گاہ کی تلاش شروع کر دی اور رہائش بھی ملی تو بڑی ہی شاندار ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ تنہا رہتی تھیں بڑے مزے کی شخصیت تھی ان کی' سب ان کو خالہ کہا کرتے تھے ان کا اصل نام بھی خالہ ہی ہو کر رہ گیا تھا تو خالہ نے اپنے اس جھونپڑے کا ایک حصہ کرائے کے لیے خالی کر رکھا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسے انہوں نے ذریعہ معاش بنایا تھا۔ چنانچہ ہم اس میں منتقل ہو گئے۔ خالہ سے میں نے انٹرویو لیا تھا۔ پہلے دن انہوں نے جو زبان استعمال کی تھی۔ وہ بڑی میٹھی تھی کہنے لگیں۔

"دیکھو بچو میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور یہاں جو آکر رہتا ہے میں اسے اپنی اولاد ہی سمجھتی ہوں۔ اگر میرے بچے بن کر رہو تو' تم یہاں رہ سکتے ہو۔ ورنہ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔" ہم دونوں ہی خالہ سے لپٹ گئے تھے اور مجھ سے زیادہ ندیم شاہ نے اداکاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ خالہ ہم تو بہت عرصے سے کسی بزرگ کے سائے کو ترس رہے ہیں۔ بہرحال خالہ کا سایہ ہمیں مل گیا لیکن خالہ بڑی آفت کی پرکالہ نکلی۔ دو دن تک تو انہوں نے ہمیں بڑی عزت دی تیسرے دن کہنے لگیں۔

"دیکھو جیسا کہ میں نے تم سے کہا ہے کہ میری گزر بسر اسی چھوٹے سے کرائے کے کمرے پر ہوتی ہے۔ پچھلے پندرہ دن سے یہ کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ کرائے دار تو بہت سارے آئے' لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی ایسے کو دوں گی جو مجھے پسند آئے۔ بات پسند کی نہیں ہوا کرتی۔ بات تو یہ ہے کہ ضرورتیں بھی پوری ہوں۔ دودھ والے کا حساب [illegible]

...ہ بچے آگئے ہیں۔ بس اب شروع کرواتی ہوں تو بس ایسا کرو بات کر لو ایک کلو دودھ ...ے لیا کرو' میں آدھا کلو دودھ پیتی ہوں۔ باقی چائے وغیرہ کے لیے کام آجاتا ہے۔ اس ...ے علاوہ راشن لا کر رکھو۔ صبح کو پراٹھے وغیرہ بنا لیا کرو۔ تمہیں پراٹھے بنانا تو آتے ہی ہوں گے۔ بہرحال یہ کوئی ایسی باتیں نہیں تھیں۔ جس سے خالہ بری لگنے لگتیں خالہ کی اور ہماری بڑی اچھی چلنے لگی تھی وہ بہرحال ایک بزرگ خاتون تھیں۔ اپنی عمر کا بڑا حصہ گزار چکی تھیں۔ اس لیے ہمیں ان کی باتیں بری نہیں لگتی تھیں اور ہم ان کا کام خوشی سے کر دیا کرتے تھے۔ پھر زندگی کے دوسرے معاملات کے ساتھ کچھ اور معاملے بھی طے ہوئے۔ مثلاً تھوڑے ہی فاصلے پر ہمیں ایک ایسے گھر کا پتا چلا جہاں برے لوگ رہا کرتے تھے۔ رات کو کاریں آتی تھیں اور اس گھر سے لڑکیاں نکل کر کاروں میں بیٹھ کر جایا کرتی تھیں۔ انہی میں سے ایک لڑکی نوشاد بھی تھی جس کی ندیم شاہ سے آنکھ لڑ گئی اور ندیم شاہ اس کی یاد میں آہیں بھرنے لگا لیکن ہمیں بہت جلد یہ پتا چل گیا تھا کہ نوشاد جس برے ماحول میں رہ رہی ہے وہ اچھا نہیں ہے اور اس گھر میں رہنے والے آخرکار اسے بھی برے راستوں پر لگا دیں گے۔ ندیم شاہ نے کہا۔

"یار! یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی نوشاد میرے دل میں بہت دور تک اتر گئی ہے۔ اگر اس کی اماں نے اسے بھی غلط راستوں پر لگا دیا تو میرا کیا ہو گا۔"

"تیرے راستے ہی غلط ہیں ندیم شاہ! تُو جانتا ہے کہ وہ ایک برے ماحول میں رہنے والی لڑکی ہے۔ پھر بھی تُو اس کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔"

"برے ماحول میں بے شک رہ رہی ہے لیکن خود ابھی تک بری نہیں ہوئی ہے۔ یار اسے بچاؤ۔ کچھ کرو دیکھو کچھ سوچو۔" ہم کیا دیکھتے' کیا سوچتے گزر بسر ہوتی رہی پھر ایک دن نوشاد نے ندیم شاہ کو بتایا کہ اس کی اماں اس کا سودا کر چکی ہے اور اسے آج رات روانہ ہونا ہے۔ ندیم شاہ پر تو دیوانگی سوار ہو گئی۔ مرنے مارنے پر تل گیا۔ اس نے کہا کہ آج وہ دو چار قتل کر دے گا لیکن مجھے ایک نئی سوجھی تھی۔ میں نے ندیم شاہ سے کہا۔

"یار ندیم شاہ! بجائے اس کے کہ تُو اپنی جان کھونے پر آمادہ ہو جائے کوئی ایسی ترکیب سوچتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ابھی تو تُو خود بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ نوشاد کو دو وقت کی روٹی ہی کھلا سکے۔ جیسے گزر بسر ہو رہی ہے تجھے اندازہ ہے۔ ایسی صورت میں اگر نوشاد تیرے قبضے میں آ بھی جائے تو کہاں رکھے گا [illegible]

"مگر تُو ایک بات سن لے محسن! اگر نوشاد کو اس راستے پر لگا دیا گیا تو میں خود کشی کر لوں گا۔ یا پھر دو چار کو جان سے مار ڈالوں گا۔"

"نہیں ایسا نہیں کر' نہ تُو خود کشی کر نہ دو چار کو جان سے مار۔ میں خود کچھ کرتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"بس کچھ کرتا ہوں۔"

"کچھ بھی کر لیکن نوشاد کو رات کو یہاں سے جانا نہیں چاہئے۔ بس اسی پر میری زندگی کا دار و مدار ہے۔"

"نوشاد سے ملاقات کر کے اس کا ایک جوڑا اچھا سا لباس لے آ اور ایک برقع' میں نے دیکھا ہے کہ لڑکیاں یہاں سے برقع پہن کر جاتی ہیں۔"

"ہاں ان کمینوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے اور اپنی دانست میں وہ پڑوسیوں کی نگاہوں سے بچ گئے ہیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہے سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کس طرح کے لوگ ہیں مگر یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"بس جو کہہ رہے ہیں وہ مان جاؤ۔ ہم درویشوں کی بات ہے۔" ندیم شاہ کے واقعی نوشاد سے بڑے گہرے تعلق تھے۔ ایک عمدہ سا سوٹ اور برقع لے آیا وہ باقی کام میں نے کیا تھا۔ میں نے پہلی بار اپنے چہرے پر ایک لڑکی کا میک اپ کیا یہ سامان بھی میں بازار سے خرید کر لایا تھا اور جب خود میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اپنے آپ پر قربان ہو گیا۔ بلاشبہ ایک اچھی شکل اختیار کی تھی میں نے۔ اس کے بعد میں نے ندیم شاہ کو ساری صورت حال سمجھائی۔ ندیم شاہ تو ہنس ہنس کر پاگل ہو گیا تھا کہنے لگا۔

"ابے تُو اپنی زندگی کیوں خطرے میں ڈال رہا ہے۔ بیٹا جان عذاب میں پڑ جائے گی آخر۔"

"بس بس دوستوں کی خاطر جان خطرے میں ڈالنا تو پڑتی ہی ہے۔ البتہ ایک بات مجھے بتا دے تُو نوشاد کو اگر تیرے ساتھ کہیں نکلنا پڑا تو نکل جائے گی۔"

"تیار بیٹھی ہوئی ہے وہ' کہتی ہے کہ آج ہی رات کہیں چل دیں۔"

"خیر اس بے سرو سامانی کے عالم میں تُو کہیں جانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔" تو یہی ہوا منصوبے کے مطابق جب نوشاد کو رات کو اس کار میں بیٹھ کر جانا تھا جو گلی سے دور ایک جگہ آ کر کھڑی ہو گئی تھی' تو نوشاد تو نکل نہ

ندیم شاہ کے ساتھ اور برقع اوڑھ کر میں کار میں جا بیٹھا۔ نوشاد کو چونکہ پوری رات باہر رہنا تھا اور صبح کو گھر پہنچنا تھا اس لئے وہ ندیم شاہ کے ساتھ پچھلے راستے سے خالہ کے گھر میں داخل ہو گئی۔ میں برقع میں ملبوس کار میں بیٹھا چل پڑا اور کیا شاندار کوٹھی تھی جس میں مجھے پہنچایا گیا اور کیا ہی منحوس آدمی تھا وہ جو رات کو کمرے میں داخل ہوا میں تو پورا منصوبہ بنائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر تقریباً پچاس یا باون سال ہو گی۔ بے تکے اور بے ڈول بدن کا مالک تھا۔ کوئی بڑا ہی آدمی لگتا تھا۔ نشے میں بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور بولا۔

"کمال کیا ہے بنانے والے نے واقعی کمال کیا ہے۔ کیا نام ہے تمہارا بی بی!"

میں نے جواب دیا۔ میں اپنی آواز میں بولا تھا اور میری آواز اچھی خاصی بھاری تھی۔ وہ چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔

"بم' بم ذم کیا نام بتایا۔"

"بمباسٹرڈ موکا۔"

"ایں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلنے لگا۔ میں نے اچانک ہی اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس پر آ پڑا۔

"ہاں میں بمباسٹرڈ موکا ہوں تم اگر چاہو تو مجھے ڈمباسٹر ببوکا کہہ سکتے ہو۔ بات ایک ہی ہے۔ میں جنگل سے آیا ہوں۔ وہیں ایک درخت پر رہتا ہوں اور مجھے تمہاری جان نکالنے کا کام سونپا گیا ہے۔" میں نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اس کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ جہاں پڑا تھا وہیں پڑے پڑے بے ہوش ہو گیا اور اس کے بعد میں نے اور کچھ تو نہ کیا کمرہ بند کر کے اس کی تلاشی لی کمرے ہی میں تجوری بھی تھی اور تجوری میں کم از کم دس بارہ لاکھ روپے موجود تھے۔ بھلا اس کے بعد کیا سوال تھا۔ پیسے سمیٹے اور وہاں سے نکل بھاگا۔ رقم بہت بڑی تھی۔ اس لئے ہر طرح کا رسک لیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ پہلے تو دل میں یہی تھا کہ کچھ کام کروں گا اور کوشش کروں گا کہ ندیم شاہ کو ایک بہتر زندگی دے سکوں۔ دوست تھا اپنا لیکن اتنی بڑی رقم کے ساتھ اب میرا بھی وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ گھر پہنچا ندیم شاہ شریف آدمی تھا۔ بے شک نوشاد وہاں موجود تھی لیکن دونوں جاگ رہے تھے اور بڑی شرافت سے الگ الگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر نوشاد بھی خوب ہنسی۔ پھر میں نے ندیم شاہ کو الگ بلا کر اس سے پوچھا کہ نوشاد کیا واقعی [illegible]

کہ شاید اس سے اچھا موقع کبھی نہ ملے۔ چنانچہ نکل چلیں یہاں سے میں نے ندیم شاہ سے کہا۔

"تو پھر میرا خیال ہے وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔" خالہ کے لئے ہم نے کوئی بیس ہزار روپے وہیں چھوڑ دیئے تھے اور اس کے بعد خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ میں ابھی تک زنانہ میک اپ میں ہی تھا اور برقع اوڑھے ہوئے تھا۔ ہم لوگ سیدھے ریلوے سٹیشن پہنچے اور پھر ٹرین ہمیں لے کر چل پڑی۔ بڑی سنسنی محسوس ہو رہی تھی لیکن ہم نے اتنی دور کا سفر اختیار کیا تھا کہ بہت زیادہ فاصلہ ہو جائے۔ پھر میں' ندیم شاہ اور نوشاد چودہ گھنٹے کا سفر طے کر کے اس دوسرے شہر پہنچ گئے اور پھر اس کے بعد میں نے ندیم شاہ کو ایک بڑی رقم دی اور اس سے کہا کہ وہ شریف آدمی ہے اس نے ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ چنانچہ بہتر ہے کہ وہ عزت کی زندگی گزارے۔ میرا اس کے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ ندیم شاہ نے بہت کہا مجھ سے کہ اب جو کچھ بھی کریں گے ساتھ مل جل کر ہی کریں گے لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں ساتھ رہا تو ندیم شاہ کبھی جرم کی زندگی سے نہیں ہٹ سکے گا۔ ہم لوگ یہی کرتے ہیں کہ کہیں چلتے ہیں الگ الگ اور اس کے بعد میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس کے بعد سے مجھے عادت پڑ گئی۔ دولت کماتا ہوں اور مختلف طریقوں سے زندگی گزار رہا ہوں۔ آج بھی میرے ذہن میں وہی سب کچھ ہے۔ لڑکیوں کا روپ دھار کر سیر و سیاحت بھی کرتا ہوں اور اپنے تفریحی مشغلے جس انداز میں ملیں وہ میرے لئے ایک مختلف انداز تھا۔ ایک انوکھی اور چونکا دینے والی بات۔ تمہارے پاس سے جا کر میں بہت کچھ سوچتا رہا میں تمہارے بارے میں پھر میرا دل چاہا کہ میں اپنے آپ کو تم پر ظاہر کر دوں۔ بس یہی میری کہانی ہے۔"

"بڑی دلچسپ بڑی عجیب۔"

"مگر تم نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔"

"بہت مختصر ہے میری کہانی بس یہ سمجھ لو کہ تھوڑا سا وقت انوکھے انداز میں گزارا ہے۔" سونو نے مختصراً اپنی داستان بھی سنا دی اور محسن اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سونو! میں تمہیں بتاؤں۔ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زندگی کے وہی راستے اپنا لیں جو عام لوگ اپنا لیتے ہیں۔ میں تم سے محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ بالکل یہ کہہ کر کہ تم مجھے ایک لمحے کے لئے قبول نہ کرو۔ دوستی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تمہیں [illegible]

حلق سے ایک قہقہہ آزاد ہو گیا اور محسن چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیوں ہنسی کیوں؟"

"اگر تم اس ہیرے کی بات کر رہے ہو تو یقین کرو کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"کیا مطلب کیوں؟"

"عاجز آ جاؤ گے اصلیت سے دور ہو جاؤ گے۔"

"مطلب؟" محسن نے حیرت سے سوال کیا تو سونو اسے ہیرے کے بارے میں بتانے لگی اور وہ حیران رہ گیا۔

"مگر تم اس سے عاجز کیوں آ گئی ہو۔"

"اس لئے محسن! کہ جب سے وہ ہیرا میرے پاس آیا ہے۔ میں عمل کی زندگی سے بہت دور ہو گئی ہوں۔ کوئی مشغلہ' کوئی مقصد ہی نہیں رہا زندگی کا۔ بس ہزاروں داستانوں میں کھو گئی ہوں۔" محسن نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"لیکن سونو! ایک بات مجھے بتاؤ۔ یہ تو زندگی کا ایک انتہائی دلچسپ تجربہ ہے۔ ہماری ضرورتیں ہی کتنی ہوتی ہیں اور پھر ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہمارے پاس ذہانت بھی ہے اور عمل بھی ہے۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جب بھی ہمیں ضرورت ہوئی' دولت کا حصول ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن تم ذرا ایک بات سوچو۔ کسی کے بارے میں اگر تم اصلیت معلوم کرنا چاہو تو داتنوں پسینے آ جائیں گے۔ کوئی کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ سب اپنے اوپر ملمع چڑھائے رہتے ہیں اور حقیقت انسان کی آنکھوں سے دور رہتی ہے۔ لاتعداد ایسے کردار ہماری زندگی میں آتے ہیں جن کے بارے میں ہم بہت کچھ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان کے بارے میں کچھ نہیں پتا چل پاتا۔ کون ہیں کیسے ہیں کیا کر رہے ہیں۔ کس طرح جی رہے ہیں یا پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے جرائم پیشہ جو اپنے آپ کو دنیا سے چھپانے میں کامیاب ہیں اور کامیابی سے اپنے آپ کو چھپا لیا کرتے ہیں۔ پولیس کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکتے رہتے ہیں اور دنیا کی آنکھوں میں بھی یہ صرف ہم ہوں گے جو ان کی اصلیت کو جانیں گے اور سمجھیں گے۔ ان کی ساری حقیقتوں سے روشناس ہو جائیں گے۔ یہ تو ایک بہت ہی اچھا ذریعہ ہے۔ جبکہ عام لوگوں کے پاس ایسے ذرائع بالکل نہیں ہو سکتے۔ اصل میں بات وہی ہے کہ کسی چیز کو منفی' یا مثبت انداز میں دیکھنا ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے تم اپنے ماحول سے تنگ آ چکی ہو۔ دیکھو سونو! میں تمہیں بتاؤں۔ اپنا کام اپنے طور پر جاری رکھو بلکہ اس کے

ذریعے تو ہمیں ایسے شکار بھی مل جائیں گے جو ہمیں بہت کچھ دیں گے۔ ہمیں کسی کے ساتھ فریب کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بلکہ ہم ان سے کہیں گے کہ چونکہ وہ خود غلط اور جرائم پیشہ لوگ ہیں اس لئے ہمیں یہ ادائیگی کریں۔ سونو یہ تو بہت ہی دلچسپ اور دلکش بات ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ۔"

"کمال ہے۔ واقعی کمال ہے محسن! میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اس کے حصول کے بعد سے اب تک اس کے ذریعے صرف کہانیاں سنی ہیں۔ کبھی اس کو اس انداز میں استعمال کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ بات ایک چھوٹی گرہ کی ہوتی ہے انسان کے اپنے ذہن میں کوئی بھی چھوٹی سی گرہ ہو۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ اس میں ابھار رہ ہے۔ محسن اگر تم ایک سچی اور پُرخلوص دوستی قبول کر سکتے ہو تو میں تمہیں اس کی پیشکش کرتی ہوں۔" محسن نے آگے بڑھ کر سونو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دباتا ہوا بولا۔

"سونو! میں کبھی تمہیں یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ مجھ سے دوستی کر کے تم نے غلطی کی۔ ہم دو بہت اچھے ساتھیوں کی حیثیت سے دنیا کا سفر کریں گے۔ دنیا کو دیکھیں گے' لوگوں کی دلچسپ کہانیاں اپنے علم میں لائیں گے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ یہ تو بہت ہی دلچسپ رہے گا' بہت ہی عمدہ۔" سونو بڑی مسرور نظر آ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کا آغاز کس مشکل میں ہوا۔ وہ ذہنی طور پر اسے بھٹکانے کے لئے کافی تھا لیکن اب کچھ عرصے سے طبیعت میں جو ٹھہراؤ پیدا ہوا تھا وہ کبھی کبھی فطری تقاضے بھی کر دیتا تھا اور دل یہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے' کوئی ایسا عمل جو زندگی کا ضامن ہو اور محسن کے مل جانے کے بعد اس کے امکانات زیادہ ہو گئے تھے۔ اس نے مسکرا کر گردن ہلائی اور بولی۔

"محسن! ہماری طرح کے لوگوں سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ عموماً ہم جیسے لوگ کسی سے مخلص نہیں ہوتے۔ بس وقتی طور پر اگر کوئی دوستی ہو جائے تو الگ بات ہے۔ ورنہ سب چلتا ہے لیکن میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ بغیر کسی اندرونی لگاؤ اور رشتے کے اگر ہم ایک دوسرے سے واقعی مخلص ہو جائیں تو کیسا رہے گا۔"

"میں تو ہو چکا ہوں سونو! اپنی بات کرو۔" سونو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور محسن نے محبت سے اس ہاتھ کو ہاتھ میں لے لیا اور پھر کہنے لگا۔

"میں نہیں جانتا سونو! کہ تمہاری زندگی میں ایسا کوئی کردار آتا ہے یا نہیں جس سے

مخلص ہونے کو دل چاہا ہو لیکن اگر تم آج بھی اپنی ماں' اپنے سوتیلے باپ اور سوتیلے بہن بھائیوں کے لئے کچھ کرتی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ کچھ جذبے تمہارے اندر موجود ہیں۔ میرا ثبوت یہ ہے کہ ندیم شاہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار رہا ہے۔ گویا میں مخلص ہونا جانتا ہوں۔ باقی رہ گئیں تم تو میں تمہیں یہ پیشکش کرتا ہوں کہ ایک بار مجھے آزما کر ضرور دیکھو۔"

"میں نے اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں اسی لئے دیا ہے محسن' اور ہم اپنی زندگی کا پہلا تجربہ کریں۔" اور ان کے پہلے تجربے کا شکار ایک الجھا ہوا سا انسان تھا۔ نوجوان چہرے کے نقوش یہ بتاتے تھے کہ شوخ اور دلچسپ رہا ہے۔ اس وقت ایک ریستوران میں بیٹھا عجیب سے انداز میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اس کے سامنے ایک چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی اور چائے کی پیالی سے بھاپ کی ایک لکیر بلند ہو رہی تھی۔ یہ بلند لکیر خاصی اوپر اٹھ رہی تھی۔ انہوں نے اپنا عمل شروع کیا تو نوجوان نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر عجیب سے انداز میں انہیں گھورنے لگا۔ سونو نے تجربے کے لئے ذرا تیز آواز میں کہا۔

"تم کون ہو۔ تمہارے ساتھ کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ کس حیثیت کے حامل ہو۔ کیا کرتے ہو۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے۔" محسن کے لئے یہ ایک حیرت انگیز اور دلچسپ تجربہ تھا اور اس وقت اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سامنے میز پر آ بیٹھا۔ پھر اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"جی ہاں میں ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہوں۔ بے شک تنخواہ معقول ہے لیکن وہ سب پریشانیاں مجھے بھی لاحق ہیں جو ہر ملازم پیشہ شخص کو لاحق ہوتی ہیں۔ والدین شہر سے تقریباً ایک سو میل دور ایک قصبے میں رہتے ہیں جہاں ہماری کچھ زمینیں ہیں۔ ان پر میرے دونوں چھوٹے بھائی کاشت کرتے ہیں۔ والد صاحب کی اسی قصبے میں دکان ہے۔ مالی حیثیت نہایت پُرسکون ہے یعنی ہم نے چادر اور پاؤں برابر رکھے ہیں۔ اس لئے کوئی دقت نہیں ہوئی اور زندگی باآسانی گزر رہی تھی۔ سوائے اس ملازمت کے جو گھر سے بہت دور ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ گھر کی بات ہی کیا ہوتی ہے اور پھر ایک کاشتکار کے گھر کی جس میں دو بھینسیں ہوں' اپنے کھیت کی تازہ سبزیاں ہوں۔ طویل و عریض صحن میں لہلہاتے درخت ہوں اور دروازے کے باہر تاحد نگاہ پھیلے ہوئے کھیت ہوں۔ ایسی جنت کو کون چھوڑنا پسند کرتا ہے لیکن نوکری یہ سب چھڑوا دیتی ہے۔ دبی دبی زبان میں کئی بار اباں جی سے کہا کہ میں بھی کھیتی باڑی کر کے زمینوں سے سونا نکالوں لیکن والد صاحب

کی منطق ذرا مختلف ہے۔ ان کی دانست میں سونا نکالنے کا کام میرے بھائی کر رہے ہیں۔ اس لئے زمینوں پر میرا وزن کیوں ڈالا جائے۔ پیسہ مختلف راستوں سے گھر میں آئے تو بھلا ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور اس ضعیفی میں بھی دکان کا نظم و نسق خود سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ خود ہی شہر سے دکان کے لئے سامان خرید کر لاتے ہیں حالانکہ میں نے ان کی عمر کے پیش نظر کئی بار پیشکش کی ہے کہ جب ہر ہفتے میں گھر آتا ہوں تو دکان کا سامان بھی لے آیا کروں گا لیکن یہ بات والد صاحب کے اصولوں کے خلاف تھی۔ وہ اپنا کام خود کرنے کے قائل ہیں اور خود ہی سب کچھ کرتے ہیں۔

یوں تو کئی مواقع آئے جب گھر چھوڑتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہوئی لیکن اس بار تو انتہا ہی ہو گئی تھی۔ بات یہ تھی کہ سیمیں آئی ہوئی تھی۔ سیمیں میری پھوپھی زاد بہن ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک اس کی ذات میں میرے لئے کوئی کشش نہیں تھی لیکن برا ہو اس رات کا جس رات صحن میں سب سو رہے تھے۔ میں بھی اماں بی کی چارپائی سے ایک چارپائی پر لیٹا کروٹ بدلے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اماں بی اور قبلہ و کعبہ کے باتیں کرنے کی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ میرا نام لیا گیا تھا اس لئے میرا متوجہ ہو جانا فطری تھا۔

"اختر سے پوچھ لیا جائے۔" اماں بی نے کہا تھا۔

"فضول بات ہے وہ انکار کیوں کرے گا۔ میری بہن کی بچی ہے' کوئی غیر تو نہیں ہے۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ابھی ہمارے خاندان میں جدید تہذیب کی نحوست داخل نہیں ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے ہمارے بچے والدین کے فیصلوں سے انحراف نہیں کرتے۔" والد صاحب بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ پڑھا لکھا بچہ ہے دوسرے بیٹوں کی مانند کھیتوں میں ہل نہیں چلاتا............" اماں بی نے کہا۔ والد صاحب تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ سرہانے کے پائیوں کے نیچے لگی اینٹ کھسک گئیں اور دھماکے کی آواز کے ساتھ چارپائی ٹیڑھی ہو گئی۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟ ہل چلانے والے' زمین کے سینے سے رزق نکالنے والے تمہاری نگاہ میں حقیر ہیں؟ اس پڑھے لکھے بچے میں کوئی خاص خوبی ہے کیوں؟" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولے۔

والدہ صاحبہ' والد بزرگوار کی انہی اداؤں سے گھبراتی ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ چارپائی سے کود کر دالان میں دری بچھانے چلے جاتے وہ جلدی سے بولیں۔

"ہرگز نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ' احمقانہ بات منہ سے مت نکالا کرو۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔ اترو چارپائی سے' اینٹ لگا دوں۔" اماں بی نے بے نیازی سے کہا۔

"ہاں تو کیا فرما رہی تھیں آپ؟" اینٹ درست ہونے کے بعد والد صاحب نے پوچھا۔

"ارے بس یہی کہہ رہی تھی کہ اس سے پوچھ لیا جائے۔ اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی۔ پھر ارادہ کیا ہے؟"

"منگنی کئے دیتے ہیں۔ ایک سال کے اندر نکاح کر دیں گے۔" قبلہ نے فرمایا۔

میرا دل اچھل پڑا۔ گویا خاکسار کا گھر بسانے کی بات ہو رہی ہے اور والد صاحب کی بہن کی بچی کے ساتھ اور یہ بچی سیمیں کے سوا کون ہو سکتی تھی۔ ایک ہی تو ان کی بہن تھی اور ایک ہی ان کی بچی۔

سیمیں میری شریک حیات' میری زندگی کی ساتھی بن رہی تھی۔ یہ جاننے کے بعد نیند کیسے آتی۔ اس سے قبل کبھی سیمیں کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔ پھوپھی زاد بہن سے زیادہ اسے اور کوئی حیثیت نہیں دی تھی لیکن اب اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور نیند کے آنے تک اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ایسی بری بھی نہیں ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ سیمیں ذہن پر سوار ہو کر رہ گئی۔ شہر کے ایک درمیانے درجے کے علاقے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا تھا جس میں اب تک کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن اب سیمیں کا بخار رہنے لگا تھا۔

پھوپھی جان سو میل دور رہتی تھیں گویا ان کے ہاں جانے آنے کے لئے ایک ہفتہ درکار تھا۔ دل تو بہت چاہتا تھا کہ ایک ہفتے کی چھٹی لے لی جائے۔ کم از کم وہاں جا کر سیمیں سے اس سلسلے میں بات تو کی جائے اور شرمانے لجانے کی ادائیں دیکھی جائیں۔ اگر بات قبلہ و کعبہ کی زبان سے نکل کر پھوپھی کے کانوں میں داخل ہو گئی تو یہ مواقع ختم ہو جائیں گے لیکن گھر والوں کی اجازت کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے سات دن پورے ہوئے۔ جمعرات آئی اور حسب معمول دفتر سے سیدھا گھر چل پڑا۔ راستے میں موٹر سائیکل کی ٹینکی بھروائی اور ہمیشہ سے زیادہ تیز رفتاری سے موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ جمعرات کی شام کو میرا انتظار کیا جاتا تھا۔ عمدہ کھانے پکتے تھے' پستے والی کھیر خاص طور سے پکائی جاتی تھی۔ گھر کے تمام لوگ رات کا

کھانا ساتھ ہی کھاتے تھے۔ اس روز بھی یہ سارے انتظامات ہوئے۔

والد صاحب کے پاس محفل جمی تو میں نے پروگرام کے مطابق پھوپھی جان کو دیکھنے کا تذکرہ کیا۔

"میں نے پھوپھی جان کو بیمار دیکھا ہے اور اسی دن سے سخت پریشان ہوں۔" والد صاحب بولے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں کل ہی ان کا خط آیا ہے۔ سب خیریت ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ پھوپھی جان سے مل آؤں۔" میں نے اس کے بعد بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

"نہیں میاں ابھی مناسب نہیں ہے' پھر دیکھا جائے گا۔" والد صاحب نے اس نامناسب کی وجہ بھی بتانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

ظاہر ہے ابھی جدید تہذیب کی نحوست نے اس کے گھر کے دروازے نہیں دیکھے تھے پر بڑوں کے دل کی بات ہم تیس سالہ بچوں کو معلوم ہونا کیا ضروری تھا۔ چنانچہ ناکام و نامراد دوسری شام واپس چلا آیا۔ پھر دل چاہا کہ سیمیں کو خط لکھوں لیکن یہ نہایت خوفناک بات تھی کیونکہ جدید تہذیب کی نحوست ابھی پھوپھی جان کے گھر میں بھی نہیں گھسی تھی۔ چنانچہ دل مسوس کر رہ جانا پڑا۔ بہرحال اب سیمیں کا خوشگوار تصور تنہائیوں کا ساتھی بن گیا تھا اس لئے یہ تنہائیاں اتنی جان لیوا نہ رہی تھیں۔ بس اس سے ملاقات کی آرزو دل میں موجود تھی۔

یوں بھی ملازمت کے بعد کے اوقات تنہا ہی گزرتے تھے۔ دوستی وغیرہ کے سلسلے میں' میں ذرا محتاط تھا۔ سلام کی حد تک ہی تعلق رکھتا تھا۔ البتہ اگر کبھی دل گھبراتا تو آصف بھائی کے ہاں چلا جاتا جو پولیس آفیسر تھے۔ بہت ہی دور کے عزیز تھے اور شہر میں میری یہ نوکری انہی کی رہین منت تھی۔ انہوں نے تو مجھے اپنے بنگلے کے ایک کمرے کی پیشکش کی تھی لیکن والد صاحب کی اصول پسندی آڑے آئی۔ چند روز کی بات نہیں تھی مستقل سلسلہ تھا۔ اس لئے مجھے حکم ملا کہ رہائش کے لئے کوئی جگہ تلاش کرلی جائے۔ پھر جگہ مل بھی گئی۔ جو میرے اور میری موٹر سائیکل کے لئے کافی تھی۔

☆------☆------☆

موٹر سائیکل کی آواز پر دوڑ کر دروازے پر آنے والوں میں سیمیں کو دیکھ کر دل اچھل پڑا۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سیمیں ہی تھی اور

کے فیصلے سے بے خبر تھی ورنہ اتنی محبت سے میرا استقبال نہ کرتی۔

"کیسی ہو سیمیں!" میں نے پوچھا۔

"دیکھ لیں بالکل اچھی اور خوب موٹی ہو رہی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اور پھوپھی جان کیسی ہیں۔"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔"

"کب آئیں؟"

"آج تیسرا دن ہے۔"

"ساتھ کون آیا ہے؟"

"بڑے بھائی چھوڑ گئے تھے۔ انہیں جلدی تھی ورنہ ضرور رک جاتے اور تم سے مل کر جاتے۔" سیمیں نے جواب دیا۔

میرے چھوٹے بھائی نے حسب عادت موٹر سائیکل سنبھال لی اور ایک چکر لگانے چلا گیا۔ جمعرات کی شام اور جمعہ کا دن یہ اس کی ملکیت ہوتی تھی۔ ہم سب اندر چلے گئے اور پھر بھی رونق' وہی ہنسی قہقہے جن میں والد صاحب کی پسند کا خیال کیا جاتا تھا۔ آدھی رات تک یہ ہنگامے جاری رہے' پھر والد کے حکم پر سب سونے کے لئے لیٹ گئے۔ سیمیں تو لیٹتے ہی سو گئی لیکن اس رات میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ سیمیں تھوڑے ہی فاصلے پر سو رہی تھی۔ میری زندگی کی ساتھی میری شریک حیات' میں بار بار گردن اٹھا کر اس کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ آج پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ سیمیں واقعی خوبصورت ہے۔ سفید رنگ' متناسب بدن' اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک لافانی مسکراہٹ چپکی رہتی تھی۔

دوسرے دن شام سے پہلے مجھے واپس جانا تھا مگر دل نہیں چاہتا تھا۔ سیمیں کی معیت کا اس سے عمدہ موقع پھر نہ ملتا۔ اس سے بات کر کے اس کی رائے معلوم ہو سکتی تھی لیکن بلی کی گردن میں گھنٹی کیسے باندھی جائے' والد صاحب سے رکنے کی اجازت کیسے ملے۔

اسی فکر میں صبح ناشتہ ٹھیک سے نہ کیا جا سکا' اماں بی نے یہ بات محسوس کر لی بولیں۔

"کیا بات ہے اختر میاں! ناشتہ ٹھیک سے کیوں نہیں کیا' آنکھیں بھی گلابی ہو رہی ہیں؟"

"کچھ طبیعت گری گری سی ہے اماں بی' دو دن قبل بخار بھی آ چکا ہے۔" میں نے

جھوٹ کا سہارا لیا۔

"دوا لی کسی ڈاکٹر سے؟" اماں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں' بس میں نے سوچا ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے کوئی فضول دوا نہ لی۔ میں ابھی حکیم صاحب سے جوشاندہ بنوا لاتا ہوں۔ دوپہر کو کھچڑی کھانا اور جوشاندہ پیو طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" والد صاحب نے کہا۔

"میں نے دفتر میں دو تین دن کی چھٹی کے لئے کہا ہے۔" میں دبی زبان میں بولا۔

"کیا کہا؟ چھٹی۔ غلط ہے میاں! بالکل غلط ہے۔ کوئی چھٹی نہیں ہو گی۔ لاحول ولا قوۃ ایسی معمولی معمولی باتوں پر چھٹی۔ یہ شہری ہوا بس اس لئے خراب ہوتی ہے' نازک مزاج بنا دیتی ہے۔ مجھے دیکھو بس ساری زندگی میں ایک چھٹی کی ہے۔ وہ بھی اس دن جب تمہاری اماں بی سے نکاح کرنا تھا اور اس کے بعد سے آج تک چھٹی نہیں کی۔ اصول پسند بنو میاں! اصول پسند۔ بے اصول انسان زندگی میں کبھی خوش نہیں رہتا' سمجھے۔" نادر شاہ نے کہا۔

میری ساری امید پر اوس پڑ گئی۔

"جی۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"بلکہ یوں کرو کھچڑی بھی نہ کھاؤ۔ ایک دن کا فاقہ ایک ہزار بیماریوں کا علاج ہے۔ میں ابھی جوشاندہ لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے اپنی تقدیر پر ہنسی آنے لگی۔ چھٹی بھی نہیں ملی اور اب جھوٹا رہ کر جوشاندہ بھی پینا پڑے گا۔ جس سے مجھے بچپن سے چڑ ہے۔ میں جانتا تھا کہ والد صاحب کے اس فیصلے میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے تن بہ تقدیر ہو گیا۔ جوشاندہ بھی پیا' دوپہر کو دسترخوان کو حسرت سے دیکھتا رہا جہاں سب بیٹھے بریانی اڑا رہے تھے' مجھے میری سازش کی سزا ملی تھی۔

وقت تھا کہ پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ اوپر سے آسمان پر بادل گھر آئے تھے۔ ہائے اس حسین موسم میں تو تیمیں کو ساتھ لے کر سیر کی جاتی اور نہر والے باغ میں کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر اس سے زندگی کی سب سے خوبصورت سب سے انمول کہانی کہی جاتی۔ آسمان کی ان گلابیوں میں تیمیں کے گالوں پر اتری شفق کیسی حسین لگتی لیکن اس وقت تو قبلہ والد صاحب فلک کج رفتار بنے ہوئے تھے۔ جمعہ کے دن دکان بھی نہیں کھولتے تھے جو تھوڑی سی تنہائی مل جاتی' کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو صبر کر لیا کہ انسان حالات کے تابع ہے۔ جوشاندے کا ایک ڈوز اور تیار ہو رہا تھا تاکہ روانگی سے پہلے پی لیا جائے اور شہر پہنچتے پہنچتے طبیعت صاف ہو جائے۔

طبیعت تو بھوک نے ہی صاف کر دی تھی۔ پیٹ میں چوہے نہ جانے کیا کیا پڑھ چکے تھے۔ تب نادر شاہی حکم ملا۔

"وقت سے پہلے نکل جاؤ تاکہ جلدی پہنچ جاؤ' بادل کا رنگ ٹھیک نہیں ہے۔"

"جی بہتر۔" میں نے کہا اور دل میں بولا۔ "دفعان ہو جاتا ہوں۔"

میرا بھائی موٹر سائیکل کو غسل دے رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا بادل گھرتے آ رہے تھے' میں موٹر سائیکل کے غسل سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ اماں بی آئیں۔

"بیٹے! اب جانے کی تیاری کرو' موسم دم بدم خراب ہوتا جا رہا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا' بھوک اور مایوسی نے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے اماں بی سے پوچھا۔

"اماں بی! کچھ کھیر ہو گی بچی ہوئی؟"

"ہاں ہاں کیوں۔"

"ایک دوست سے وعدہ کر لیا تھا کہ اس بار آؤں گا تو کھیر لاؤں گا' بس تھوڑی سی کسی برتن میں رکھ دیں۔"

"اے خدا کی نیک۔ صبح سے کہہ دیتے تو میں پکا دیتی۔ اتنی سی کھیر لے جاؤ گے دوست کے لئے۔" اماں بی بولیں۔

"بس اماں بی! ایک آدمی کے لئے تو چاہئے۔ جتنی ہو دے دیں کافی ہو گی۔" میں نے کہا۔

بادل تھے کہ مسلسل خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ میں نے بڑی دعائیں مانگی کہ بادل برس بھی پڑیں اور جل تھل کر کے میری راہ روک دیں لیکن وہ بھی والد صاحب کے ہمنوا تھے۔ میرے رخصت ہونے تک برسنے کو تیار نہ ہوئے۔ چلتے وقت میں نے تیمیں سے پوچھا۔

"کب تک رہو گی؟"

"بڑے بھائی تھوڑے چار دن تک اپنے کام سے شہر آئیں گے اور واپسی میں مجھے لیتے

جائیں گے' اسی شرط پر لائے تھے۔" سیمیں نے جواب دیا۔

"خدا حافظ!" میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے چل پڑا۔

ذہن سخت پراگندہ ہو رہا تھا کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہ مل سکا جو میں سیمیں سے کچھ کہہ سکتا۔ بادل اور گہرے ہو گئے' اب ہلکی ہلکی گرج بھی ہونے لگی تھی برس پڑتے تو اب ہم واپس ہو سکتا تھا لیکن ان کا والد صاحب سے معاہدہ تھا۔

☆-------☆-------☆

قصبے سے چار پانچ میل دور آ کر گاڑی نہر کے کنارے روک دی۔ بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ موٹر سائیکل سے کھیر کا برتن کھولا اور بے صبری سے پیندے تک صاف کر دیا۔ نہر کا پانی پی کر طبیعت بحال ہوئی تو خدا سے توبہ کی کہ آئندہ کبھی اس کی نوتوں سے منہ نہ موڑوں گا اور پھر آگے چل پڑا۔

راستہ ہموار نہ تھا۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے گڑھے تھے۔ مگر میں اس راستے کے نشیب و فراز سے واقف تھا اس لئے بارش شروع ہونے سے قبل شہر پہنچنے کے خیال سے موٹر سائیکل تیزی سے بھگا رہا تھا۔

چالیس میل کا سفر طے ہو چکا تھا۔ تب آخرکار بادلوں کا دل پسیج گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ہو گیا۔ سر پر ہیلمٹ نہ ہوتا تو پانی کی دھاریں بھیجہ ہلا ڈالتیں۔ سڑک کے تیسرے نشیب سے گزرا تو خدا ہی یاد آ گیا۔ پانی تیزی سے نشیبی علاقوں میں داخل ہو رہا تھا اور مزید چند منٹ بعد آگے بڑھنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مگر اب تو واپسی بھی ممکن نہیں رہی تھی کیونکہ پیچھے رہ جانے والا راستہ زیادہ نشیب میں اور ناہموار تھا۔ چاروں طرف پانی کی دیواریں نظر کی راہ میں حائل تھیں' لباس تربتر تھا۔ مگر آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میں سوچ رہا تھا۔ گھر میں سب لوگ چھت کے نیچے اس بارش سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ سیمیں بھی ان کے ساتھ ہو گی۔ اچانک ایک گڑھے سے بچنے کی کوشش میں موٹر سائیکل سڑک سے اترتے اترتے بچی' میں نے فوراً دماغ کو قابو کیا کہ کہیں سیمیں سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ نہ ہو جائے۔ بارش سے میرے گھر کے لوگ میرے لئے ضرور پریشان ہو رہے ہوں گے۔ والد کے منہ سے تشویش زدہ آواز نکل رہی ہو گی۔ اماں بی کہہ رہی ہوں گی کہ بچہ رک جاتا تو کیا جاتا۔ طبیعت بھی خراب تھی۔

اچھا ہے یہ لوگ پریشان ہوتے رہیں۔ انہیں بھی تو لطف آئے اور میری اس انتقامی سوچ کا نتیجہ مجھے فوراً ہی مل گیا۔ اگلا ٹائر کسی چھوٹے سے گڑھے میں پڑ گیا تھا اور پانی

اچھل کر میرا منہ دھو گیا۔ پورا چہرہ کیچڑ سے پٹ گیا لیکن اس وقت ان باتوں پر توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو سنبھالا لیکن بات کچھ بگڑ ہی گئی تھی۔ گاڑی کا انجن ریس نہیں پکڑ رہا تھا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ شاید پانی پرزوں میں پڑ گیا تھا پھر موٹر سائیکل بند ہو گئی۔ میں نے اس بگڑے ساتھی کو منانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ بھی شاید میرے والدین کی شکایت برداشت نہ کر سکی تھی۔

میں نے بے بسی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اگر اس علاقے کے چپے چپے سے واقف نہ ہوتا تو یہ اندازہ لگانا سخت مشکل ہوتا کہ میں کس علاقے میں ہوں۔ گو چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن یہ جان لیا تھا کہ میں اس وقت چورانی کے قریب ہوں۔ اس علاقے کا کوئی نام نہ ہوتا لیکن اس سڑک سے کچھ ہٹ کر نشیب میں چورانی کے کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کوئی قدیم شہر تھا اور کچھ عرصے قبل آثار قدیمہ والوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا تھا۔ پھر ایک عرصے تک یہ شہر اخبارات کا موضوع بنا رہا۔ ادھر سے گزرتے ہوئے میں نے کئی بار یہاں آثار قدیمہ والوں کو مصروف دیکھا تھا۔ اس وقت یہ جگہ ہی کار آمد ہو سکتی تھی۔ شاید ان کھنڈرات میں کوئی پناہ گاہ مل سکے یہ سوچ کر میں ان کھنڈروں کی طرف چل پڑا۔

ایک قدیم اور مردہ شہر میں نہ جانے کیسے لوگ رہتے تھے گو دیہاتی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے طبیعت میں خوف نہیں تھا۔ پھر بھی طرح طرح کے وسوسے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ میری وحشت اور پریشانی عروج پر تھی۔ گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں سے وقت دیکھا۔ ابھی سات ہی بجے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے رات آدھی ہو چکی ہو۔ بارش نہ ہوئی ہوتی تو اس وقت میں شہر میں ہوتا۔ موٹر سائیکل کو دھکیلتے کھنڈرات کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اس شہر خموشاں کو دیکھنے کی کوشش کی جو اب زیادہ دور نہیں تھا۔

یہاں زمین زیادہ خراب نہیں تھی۔ یا تو پانی یہاں سے بہہ گیا تھا یا پھر اس زمین میں پانی جذب کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی اس لئے اتنی تیز رفتار بارش بھی اس زمین کو خراب نہیں کر سکی تھی۔ موٹر سائیکل دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔

کھنڈرات تک پہنچتے پہنچتے بارش تقریباً رک گئی۔ بس ننھی ننھی بوندیں رہ گئیں۔ ہاں بارش کے رکتے ہی ہوا کے جھکڑ چلنے لگے تھے جن کی وجہ سے موسم سرد ہو گیا۔ میرے

بدن کے کپڑے چونکہ ابھی تک بھیگے ہوئے تھے اس لئے سرد ہوا کے ان جھکڑوں نے مجھے خاصا پریشان کیا۔

کھنڈرات کا علاقہ خاصا صاف ستھرا تھا۔ آثار قدیمہ والوں نے یہاں کافی محنت کی تھی اور ہر چیز نمایاں کر دی تھی۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں چھت موجود ہو تاکہ اس منحوس رات میں اس کے نیچے کچھ سکون مل سکے۔

بجلی کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا اور ہوا کی شدت کم ہو رہی تھی۔ کسی وقت بھی بارش دوبارہ شروع ہو سکتی تھی۔ میں اس قدیم شہر کے ویران کھنڈر میں کسی روح کی مانند بھٹک رہا تھا۔ اچانک زور کی بجلی چمکی اور اس کی تیز روشنی میں مجھے ایک پوری عمارت نظر آ گئی میں تیزی سے اس طرف بڑھنے لگا۔ بجلی دوبارہ چمکی اور دل خوشی سے بھر گیا وہ عمارت اس کھنڈر میں واحد عمارت تھی جو ابھی تک اپنی پوری شان سے کھڑی تھی۔ میری رفتار میں اضافہ ہو گیا سڑک سے یہاں تک موٹر سائیکل گھسیٹ کر لانے میں کافی قوت صرف ہوئی تھی ساتھ ہی بھوک' گیلے کپڑے اور سرد ہوا نے مل کر میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا لیکن بڑی مصیبت کے سامنے چھوٹی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ عمارت کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ میرے اوپر دوبارہ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ میں جلدی سے عمارت کے سائبان کے نیچے چلا گیا۔ یہاں بارش سے پناہ مل گئی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سٹینڈ پر لگائی اور ایک دیوار سے ٹیک لگا لی۔ بارش پھر پورے زور و شور سے ہونے لگی تھی۔ میں ذرا سکون کی خاطر دیوار پر پورا بوجھ ڈال کر کھڑا ہوا تو دیوار سے عجیب سی آواز ابھری۔ میں چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور دیوار کو ٹٹول کر دیکھا تب معلوم ہوا کہ وہ دیوار نہیں بلکہ کوئی دروازہ ہے جو اندر سے بند ہے۔

دروازہ اندر سے بند ہونے کا یہی مطلب تھا کہ اندر کوئی موجود ہے لیکن کون شاید آثار قدیمہ والے اپنے کام کی تکمیل کے لئے یہاں رہ رہے ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو ساری مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔ وہ لوگ ضرور میری مدد کریں گے اور مجھے ان گیلے کپڑوں اور سرد ہواؤں سے نجات مل جائے گی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ ایک بار' دو بار اور پھر تیسری بار۔ تینوں بار دستک کے درمیان وقفہ رکھا تھا اور ہر دستک کے بعد میرے کانوں نے کچھ سننے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

میرے [illegible] ابھرنے لگا۔ مگر دروازہ اندر سے بند کیوں ہے۔ میں نے

سوچا لیکن اس وقت عمارت کی اوپر کی منزل میں روشنی نظر آئی۔ عمارت میں جو کوئی ! تھا وہ اس موسم میں گرم بستر میں چھپا ہوا کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو گا۔ میں نے اسے ہو شیار کرنے اور یہ بتانے کے لئے کہ دستک کی آواز اس کا واہمہ نہیں ہے۔ دو دستک دی اور دروازے سے کان چپکا دیئے اور پھر سکون کی گہری سانس لی۔ دروازے کے دوسری جانب چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دروازہ ابھی تک نہیں کھلا تھا لیکن روشنی کی کرنیں بند دروازے کی جھریوں سے جھانکنے لگی تھیں۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ کوئی شخص موی شمع ہاتھ میں لئے دروازے کھڑا تھا۔ شمع کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آگئی۔ ایسا محسو ہوتا تھا جیسے کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف رکھ دی ہو۔ اس کا چہرہ برف کی طر سفید اور بے رونق تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور ویران تھیں۔ اس نے گردن سے ٹخنوں ت ایک سیاہ لبادہ پہنا ہوا تھا اور ایک موٹا کپڑا سر اور شانوں سے لپٹا ہوا تھا۔ بھوؤں کے عا کہیں بال نظر نہیں آتے تھے۔ اسے دیکھ کر میرے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے عجیب سی بے ہنگم اور کھردری آواز میں پوچھا۔

اس کی آواز سن کر میں نے خود کو سنبھالا اور جی کڑا کر کے بولا۔

"میں ایک مسافر ہوں' بارش نے راستہ بند کر دیا ہے اور میری موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہے۔ کیا آپ آج کی رات مجھے یہاں رکنے کی اجازت دیں گے۔" اس میرا بغور جائزہ لیا سائبان میں کھڑی موٹر سائیکل کو دیکھا اور اسی سرد آواز میں بولا۔

"انتظار کرو۔" اور دروازہ دوبارہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

میں اپنی اس وقت کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ دل اندر سے چیخ رہا تھا کہ بھا چلو۔ یہ جگہ درست نہیں ہے' یہ روحوں کا مسکن ہے۔ جو شخص ابھی باہر آیا تھا وہ انس نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن تھکن کا یہ حال تھا کہ جی چاہتا تھا کہ یہیں لیٹ جاؤں اور مو اگر آتی ہے تو بلا سے آکر گردن دبا دے مگر اس وقت آرام کرنے کو مل جائے۔

اس کشکش میں تھا کہ دروازہ پھر کھل گیا۔ اس بار وہ دو تھے۔ مرد کے پیچھے ا عورت بھی تھی جس کے لمبے لمبے اور سیاہ بال اس کے شانوں اور جسم پر بکھرے ہو تھے' سیاہ بالوں کے ہالے میں بڑا خوبصورت چہرہ تھا لیکن زندگی کے ہر جذبے اور تاثر عاری۔

راستہ چھوڑ دیا۔

میں انہیں شکرگزاری سے دیکھتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ مرد نے شمع عورت کے ہاتھ میں دے کر دروازہ بند کر دیا۔ عورت نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا' میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔

"میں آپ لوگوں کا بہت شکرگزار ہوں۔ باہر بہت تیز ہوا ہے اور میرا لباس بھیگا ہوا ہے۔" میری آواز میں خوف کی لرزش تھی۔

شمع کی روشنی اتنی مختصر تھی کہ ماحول کو پوری طرح اجاگر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم ایک محراب دار دالان سے گزر رہے ہیں۔ ان دونوں کی خاموشی نے ماحول کو اور بھی پُراسرار بنا دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ گو مجھے پناہ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں مگر ذرا سی خوش اخلاقی کا اظہار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے تو انسانی فطرت کے خلاف مجھ سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور اس وقت کہاں جا رہا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے رک کر عورت نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر خدا کا نام لے کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک خاصا کشادہ کمرہ تھا جس میں قدیم طرز کا ایک شمعدان روشن تھا۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں تھا البتہ زمین پر ایک قدیم قالین بچھا ہوا تھا جو کبھی بے حد نفیس اور قیمتی رہا ہو گا لیکن اب تو نہایت بوسیدہ اور جگہ جگہ سے نچا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں اور کچھ نہ تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ خاتون! میں اس سرد رات میں آپ کو تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں لیکن میں مجبور تھا۔ ایک زحمت اگر اور کر لیں کہ مجھے ایک پیالی چائے فراہم کر دیں تو بڑا احسان ہو گا۔" میں نے دروازے پر کھڑی عورت سے کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" پہلی بار عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ جس قدر حسین تھی اس کی آواز اسی قدر مکروہ تھی۔

میں خود اپنی اس جسارت پر شرمندہ ہو گیا۔ خواہ مخواہ ایک فضول بات کہہ دی۔ میری گردن جھک گئی۔ اس وقت دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سرد مہر عورت واپس چلی گئی تھی۔ اب میں کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔

دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کمرے میں ایک ہلکی سی حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ جو

اوڑھنے کو مل جائے لیکن میرے بداخلاق میزبانوں نے تو مجھے رات گزارنے کے لئے دری یا چادر تک دینا گوارہ نہیں کیا تھا اگر وہ لوگ آثار قدیمہ کے محکمے سے متعلق تھے تو ممکن نہ تھا کہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ ہو۔ کتنی بے حسی سے اس خوبصورت عورت نے بدصورت انکار کر دیا تھا۔

بہرحال اب کمرے میں تنہائی تھی چنانچہ میں نے ہیلمٹ اتار کر قالین پر رکھ دیا اور جیکٹ اور قمیض بھی اتار لی۔ جیکٹ بھیگی ہوئی تھی مگر قمیض اس کے نیچے ہونے کی وجہ سے خشک تھی۔ البتہ پتلون کی بری حالت تھی میں نے دروازے پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر پتلون اتار کر ایک نیم تاریک گوشے میں نچوڑ نچوڑ کر جس قدر خشک ہو سکی کر لی۔ اس کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت حالت پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے اسے دوبارہ پہن لیا اور بیٹھنے کے لئے مناسب سی جگہ تلاش کرنے لگا۔ سارے بدن میں سردی اور تکان سے درد ہونے لگا تھا۔ میں ہیلمٹ کا تکیہ بنا کر ایک طرف لیٹ گیا لیکن ٹھنڈا اور گرد آلود فرش تکلیف میں اضافہ کرنے لگا تو اٹھ کر اس ستون سے پشت لگا کر بیٹھ گیا جس پر شمعدان رکھا ہوا تھا۔

بارش سے بچنے کے لئے پناہ گاہ تو مل گئی تھی لیکن کیسی عجیب جگہ اور کیسے انوکھے لوگ ملے تھے۔ ہمدردی کے جذبے سے عاری۔ انسانی ذہن تو تجسس کا شکار ہوتا ہے کسی سے ملتے ہی اس کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے لیکن ان دونوں نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

بیٹھے بیٹھے میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی تو اپنے عقب میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔ میرا تجسس بیدار ہو گیا۔ میں اٹھ کر اس دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا تو اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔ سامنے ایک اور کمرہ تھا مگر تاریکی میں ڈوبا ہوا۔ میں نے واپس آ کر شمعدان اٹھایا اور اس کی روشنی میں دوسرے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ بھی پہلے کمرے جیسا ہی تھا مگر اس قدر چھوٹا اور اس کے فرش پر قالین بھی نہیں تھا اور کمرے کا داخلی دروازہ یہی تھا جس سے میں گزر کر آیا تھا۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی ضرور تھی مگر وہ بند تھی۔ کمرے میں لکڑی کی ایک الماری رکھی تھی جس میں ایک موٹا سا قفل لگا ہوا تھا۔ اس قفل پر آثار قدیمہ کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ الماری کی چوکھٹ اکڑی ہوئی تھی لیکن اسے علیحدہ کر کے الماری کھولی نہیں جا سکتی تھی۔ نہ جانے اس الماری میں رکھا ہو گا۔ میں نے سوچا اور پھر گردن جھٹک دی۔ مجھے ان تمام چیزوں سے

کیا واسطہ جلدی سے صبح ہو جائے تو میں اس خاموش جہنم سے نکل جاؤں۔ وہ دونوں کوئی بھی ہوں بھاڑ میں جائیں۔ بات صرف ایک رات کی ہے۔

میں وہاں سے واپس اسی جگہ آ گیا جہاں پہلے بیٹھا تھا۔ شمع دان اس کی جگہ رکھ کر میں پھر اسی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے پپوٹے جھک رہے تھے مگر سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ نہ جانے یہ خوف کا نتیجہ تھا یا تھکن کا۔ میرے پُراسرار میزبانوں کی بے نیازی نے بھی بے چین کر رکھا تھا۔

دماغ کے کسی گوشے میں خیال کا ایک خانہ کھلا۔ اگر ان لوگوں کا تعلق آثار قدیمہ سے ہے تو اس لق و دق عمارت میں صرف دو افراد کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ کیا وہ دونوں میاں بیوی ہیں لیکن اس غیر محفوظ جگہ حکومت کی طرف سے بھی کسی جوڑے کو قیام کی اجازت نہیں مل سکتی اور پھر وہ دونوں کیسے بے جگر ہیں کہ اس ویران شہر میں جہاں دور دور تک انسان موجود نہیں ہیں آرام سے رہ رہے ہیں۔ ناممکن سی بات ہے۔ کوئی عورت زندگی کے ہنگاموں سے کٹ کر یہ بے رنگ زندگی گزارنا قبول نہیں کرے گی اور پھر ان کا لباس۔ وہ بھی تو موجودہ دور کا نہیں ہے۔

کوئی چیز جیسے میرے حلق میں آ پھنسی تھی۔ ایک دہشت ناک خیال نے مجھ سے میرے حواس چھین لئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ انسان ہی نہ ہوں۔ ہاں ممکن ہے وہ قدیم روحیں ہوں۔ میرے اعضا سنسنانے لگے۔ دہشت بھری سنسنی میرے سارے وجود میں طاری ہو گئی اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

پاؤں بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ آگے بڑھنے کی کوشش کی تو قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ اب میں وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ سڑک پر بارش میں جو کچھ بیت جائے مگر اس دہشت ناک ماحول سے تو نجات مل جائے گی۔ جس میں اگر کچھ وقت اور گزر گیا تو شاید حرکت قلب ہی بند ہو جائے۔ میں نے جیکٹ اٹھا کر بدن پر منڈھی، ہیلمٹ ہاتھ میں لیا اور کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچ گیا لیکن دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ عورت مجھے یہاں قید کر گئی ہے۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔

دل چاہا کہ دروازہ زور زور سے پیٹوں اور حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخوں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس ویرانے میں ان دونوں کے سوا کون ادھر آ سکتا تھا۔ طرح طرح کے خیالات پریشان کرنے لگے اور یہ یقین ہو گیا کہ میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا

ہوں۔ آج سے قبل یہ کھنڈرات کبھی اتنے خوفناک نہیں لگے تھے۔ قدیم آبادیوں کے کھنڈرات میں بھٹکتی ہوئی روحوں کے بارے میں تمام داستانیں یاد آ رہی تھیں۔ ایسی راتیں اور ایسے موسم ان کے لئے شکار کا بہترین وقت کہا جاتا ہے۔ میں نے اس ویران مقام پر آ کر خود کو شکار کے لئے پیش کر دیا تھا۔ پوری رات خوف کے عالم میں گزارنے سے بہتر تھا کہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کروں اگر نیند آ گئی تو خوف سے نجات مل جائے گی' میں نے سوچا۔ اگر سوتے میں بھی مر گیا تو یہ اذیت تو نہ ہو گی۔ میرے اصول پسند والد کو میرے بعد یہ احساس تو ہو جائے گا کہ اولاد کو رعایا بنا کر ہر حکم کی تعمیل پر مجبور کرنے کا یہ انجام ہو سکتا ہے۔ سیمیں کے خواب بھی ادھورے رہ جائیں گے لیکن ابھی تو مجھے اس کے خوابوں کا علم ہی نہیں ہے۔ بہرحال وہ یہ تو سوچے گی کہ ایک جوان رعنا جسے وہ اختر بھائی کہا کرتی تھی اب اس عالم رنگ و بو میں نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ عرصے تک میری لاش ہی دستیاب نہ ہو۔ پھر بھی محکمہ آثار قدیمہ والے یہاں آئیں اور میری لاش دیکھ کر پولیس کو اطلاع دیں پھر پولیس میری جیبوں کے سامان اور موٹر سائیکل کے رجسٹریشن نمبر سے میرا پتا معلوم کر کے میرے والدین کو میری المناک موت کا مژدہ سنائے۔

خیالات کی اس یلغار میں اپنی موت کے بعد کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اماں بی دھاڑیں مار رہی تھیں۔ والد گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ دونوں بھائی ناراض ہو رہے تھے کہ ایسے خراب موسم میں مجھے گھر سے کیوں نکالا گیا تھا۔ پھوپھی کو شک تھا کہ ان کی بیٹی کو سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ کیوں کر دیا گیا۔ سیمیں کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑی جا رہی تھیں کہ چھناکوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی تھی لیکن اس کے گہری نیند میں بدلنے سے قبل ہی چوڑیوں کے چھناکے نے نیند اڑا دی۔

میں نے غور سے سنا۔ وہ آواز دروازے کی طرف سے اب بھی آ رہی تھی۔ خوف سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک آواز آنا بند ہو گئی۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا دروازے کے پاس جا کر سنوں۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو اور یہ آواز تیز ہواؤں یا بارش کی ہو۔ ممکن ہے میں [illegible]

گھور رہے ہوں۔ کچھ لوگ ایسے ہی خود پرست ہوتے ہیں کہ انھیں دوسروں کے معاملات سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے میں ساری رات خوف و دہشت کے عالم میں گزار دوں اور صبح وہ دونوں مجھے اپنے سپاٹ چہروں کے ساتھ صبح بخیر کہہ کر خدا حافظ کہہ دیں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔ بارش یا تو رک چکی تھی یا اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں وہاں سے ہٹنا ہی چاہتا تھا کہ باہر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ قدموں کی واضح آوازیں جو ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر کوئی دروازے کے قریب آ کر رک گیا۔ جھریوں سے روشنی بھی نظر آ رہی تھی کوئی شمع ہاتھ میں لئے باہر موجود تھا۔ پھر کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی باہر سے کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ مگر میں نے اندر سے بھی کنڈی لگا دی تھی۔

وہ لوگ میری تاک میں تھے اور اب کوئی فیصلہ کر کے آئے تھے۔ میرے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں دروازے کے پاس سے ہٹ گیا۔ باہر سے کنڈی کے پیچ کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں نے چیخ کر کہا۔

"کون ہے' کیا بات ہے؟"

کنڈی کھولنے کی کوشش ترک کر دی گئی۔ چند لمحے سکون رہا پھر کوشش جاری ہو گئی۔ اب کنڈی پر زوردار ضربیں لگائی جانے لگیں۔ بالآخر کنڈی ٹوٹ گئی۔

دروازے میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ عورت کے ہاتھوں میں تین شمعوں والا شمعدان تھا اور مرد کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور ان سے دور چلا گیا۔ وہ دونوں سرد نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ۔" میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔

"ان ویرانوں میں کسی اجنبی کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم یہاں کی داستانیں باہر کی دنیا کو سنانا نہیں چاہتے۔" مرد کی کرخت اور سپاٹ آواز ابھری۔

"بارش کی رات کے اجنبی! صدیوں سے ہمارے لب خشک ہیں۔ اپنے خون کی زندگی ہمارے سینوں میں اتار دو۔" عورت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"ہمیں اپنا خون پیش کر دو۔ آؤ ہمارے سینوں میں اتر جاؤ۔ ہم اپنے وجود میں تمہاری حفاظت کریں گے۔" مرد بولا۔

"اس کے بعد تم بھی ہم میں سے ایک ہو گے۔ پھر ہم بارش کی کسی اور رات کا

انتظار کریں گے۔ جب ہمارے درمیان کوئی اجنبی پناہ لینے آئے گا اور ہماری پیاس بجھا گا۔"

"آؤ' آؤ' آؤ۔" دونوں بیک وقت بولے۔

میں تھر تھر کانپنے لگا اور بے اختیار دوسرے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔ وہ دونو چیختے ہوئے میرے پیچھے بھاگے۔

"پکڑو .... دوڑو .... جانے نہ پائے۔ وہ ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ ا کے لہو سے ہماری تشنگی مٹے گی ورنہ ہم پیاسے رہیں گے۔ پیاس' پیاس۔"

میں نے کمرے میں جاتے ہی پھرتی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی کوئی چیز زو سے دروازے سے ٹکرا کر نیچے گری۔ غالباً مرد نے کلہاڑی کھینچ ماری تھی جس سے وہ اس دروازے کی کنڈی بھی توڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد یہ فرش میرے خون سے رنگین ہوتا او ان کی زبانیں چٹخارے لے لے کر میرا خون چاٹ رہی ہوتیں۔

فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹیں اب دروازے کے قریب تھیں۔ میری نگاہ الماری پر جا ٹکی۔ اگر اس وزنی الماری کو دروازے سے لگا دیا جائے تو انہیں فوری طور پر اندر آنے کا راستہ نہ مل سکے گا۔ میں نے فوراً الماری کے ساتھ زور آزمائی شروع کر دی۔ الماری بے حد وزنی تھی۔ عام حالات میں شاید میں اسے سرکا بھی نہیں سکتا تھا لیکن اس وقت زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ میں الماری کھسکانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کوشش میں الماری کی نچلی چوکھٹ کی موٹی لکڑی علیحدہ ہو گئی۔

میں نے الماری دروازے سے لگا دی۔ اس دروازے کی کنڈی بھی پہلے کی طرح توڑی جا رہی تھی اور میں وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اب وہی بند کھڑکی میرے سامنے تھی جو میری امید کا واحد مرکز تھی۔ اگر وہ بھی نہ ہوتی تو زندگی کی آس ختم ہو جاتی۔

میں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور اس کے پٹ ٹٹول کر دیکھے اس طرف سے اسے کھولنا ناممکن تھا۔ البتہ توڑنے کی کوشش کی جا سکتی تھیں میرے ذہن میں الماری سے الگ ہونے والی لکڑی کا خیال آیا۔ میں نے وہ لکڑی اٹھائی اور پوری قوت سے کھڑکی پر مارنا شروع کر دی۔ میرے ہاتھ جھنجھنانے لگے لیکن یہ وقت ان ہاتھوں کی پرواہ کرنے کا نہیں تھا۔ کھڑکی بہت مضبوط ثابت ہوئی مگر مسلسل ضربوں سے دوسری طرف لگی ہوئی زنجیر ڈھیلی ہو کر نکل گئی اور دونوں پٹ کھل گئے۔ کھڑکی [illegible]

میں نے دوسری طرف کچھ دیکھے بغیر کھڑکی پر چڑھ کر تاریکی میں چھلانگ لگا دی۔

تاریکی اس قدر گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں پٹ بند کر کے ہر طرف ٹٹولنے کے باوجود کنڈی نہ ملی۔ شاید وہ ٹوٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ میں مڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ تاریکی راہ میں حائل تھی۔ کچھ اندازہ نہیں تھا میں کہاں ہوں۔ ایک وسیع خلا سا تھا نہ کوئی دیوار حائل ہوئی نہ دروازہ ملا۔ اندھوں کی طرح ہاتھ آگے پھیلائے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی چیز سے ٹکرا کر رک گیا۔ ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ لکڑی کی بینچ تھی میں اس سے بچ کر آگے بڑھا تو ایک اور بینچ نے راستہ روک لیا یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سی بینچ پڑی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی گرجا گھر یا کسی اسی طرح کی عبادت گاہ ہو۔ مجھے خیال آیا۔ اگر یہ کوئی عبادت گاہ ہے تو یہاں سے باہر جانے کے لئے کوئی دروازہ بھی ضرور ہو گا میں ان بینچوں سے بچ کر آگے بڑھتا رہا۔

دوسری طرف کھلی کھڑکی کے دوسری جانب سے ضربوں کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ دفعتاً آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ شاید انہوں نے دروازہ کھول لیا تھا پھر الماری سرکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ ان کی نگاہ کھڑکی پر جائے گی تو کھلی کھڑکی دیکھ کر سب کچھ سمجھ جائیں گے کاش ان کے یہاں آنے سے قبل مجھے باہر جانے کا موقع مل سکے۔ مایوسی کے عالم میں' میں نے سوچا لیکن جس طرف کا رخ کرتا کوئی نہ کوئی چیز راستے میں حائل ملتی۔ بچتا بچاتا نہ جانے کتنی دور پہنچ سکا تھا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بس ایک ہی خیال ذہن پر حاوی تھا کہ موت میرا تعاقب کر رہی ہے۔

کھڑکی میں شمع کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے ان دونوں کو اس کھڑکی پر سے اترتے ہوئے دیکھا۔ میں نیچے بیٹھ کر چھپنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ وہ لوگ اس طرف آ چکے تھے۔ شمع کی روشنی میں وہ مجھے جلد ہی تلاش کر لیتے مگر کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

دھندلی روشنی میں معلوم ہوا کہ وہ ایک خاصا کشادہ ہال تھا اور اس میں ترتیب سے بینچ پڑی ہوئی تھیں۔ پھر ہال میں ان کی مدھم آوازیں ابھرنے لگیں۔

"دروازے باہر سے بند ہیں۔" عورت نے کہا۔

"ہاں وہ باہر نہیں جا سکتا۔"

"یہ دروازے توڑ کے بھی نہیں جا سکتے۔"

"ناممکن ہے۔"
"تب پھر وہ کہاں ہے۔"
"کسی بینچ یا ستون کی آڑ میں ہوگا۔"
آؤ تلاش کریں اسے بچ کر نہیں جانا چاہئے۔"
"وہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ یہ اب کسی طرح ممکن نہیں ہے۔"
"ہاں .... ورنہ..........." عورت نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت ایک دھماکہ
اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔
"یہ کیا ہوا؟" عورت نے پوچھا۔
"کھڑکی بند ہو گئی ہے۔"
"مگر کیسے؟"
"غالباً ہوا سے۔" مرد نے کہا۔
"لیکن یہاں ہوا کہاں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کھڑکی کے پاس ہی چھپا
اور ہمارے یہاں آنے کے بعد اس نے دوسری طرف جا کر کھڑکی بند کر دی ہو۔" ع
نے کہا اس سے قبل کہ مرد عورت کی اس بات کا جواب دیتا اچانک ہی ہال کے
ستون پر رکھے شمعدان کی شمعیں روشن ہو گئیں۔ اس کے بعد تو ہال کے ہر ستو
شمع دان روشن ہوتے چلے گئے اور چند ہی لمحوں میں پورا ہال روشن ہو گیا۔ اتن
عمارت کا یہ ہال قابل دید تھا۔ ہال کی چھت کافی بلند تھی۔ تین طرف بلند و بالا
دروازے تھے جن پر بیل بوٹے کھدے ہوئے تھے۔ تقریباً چار چار فٹ بلند لکڑی
منقش ستون پورے ہال میں جا بجا ایستادہ تھے اور ان پر تین شمعوں والے شمعدان ر
تھے۔ ستونوں کی قطاریں تین فٹ بلند چبوترے تک گئی تھیں۔ چبوترے پر تین
ستونوں سے موٹی موٹی رسیوں کے پھندے جھول رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان
مجرموں کو پھانسی دینے کا کام لیا جاتا رہا ہو۔ چبوترے کے وسط میں شاہ بلوط سے بنی
شاندار کرسی رکھی تھی اور کرسی سے کچھ دور ایک ننگی مجسمہ ایستادہ تھا جس کی د
آنکھیں بند تھیں اور ایک ہاتھ میں ترازو لٹکی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں پلڑے
تھے۔ یہ غالباً انصاف کی علامت تھی اور یہ ہال کسی عدالت کا منظر پیش کر رہا تھا۔
"یہ شمعدان کیسے روشن ہو گئے۔" مرد کی آواز نے مجھے چونکا کر صورت ،
احساس دلایا۔

"پتا نہیں۔" عورت کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔
مرد کی نگاہیں ہال میں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں اور آخر اس کی نگاہ کی زد
میں میں آ ہی گیا۔
"وہ رہا۔" وہ مجھے دیکھتے ہی چلایا اور کلہاڑی سنبھال کر میری طرف بڑھا۔
ہال کے تمام دروازے بند تھے۔ روشن ہال میں ان کی نظروں کو دھوکا دینا بھی ممکن
نہ تھا۔ میں اپنی زندگی سے مایوس ہونے لگا۔ بچنے کی کوئی راہ نہیں رہی تھی۔ تاہم زندگی
بڑی قیمتی چیز ہے' انسان اس کی حفاظت آخری حد تک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ
میں بھی بچنے کے لئے بھاگا۔ اسی وقت ہال میں اچانک مدھم مدھم شور سنائی دینے لگا ایسا
معلوم ہوا جیسے بہت سے لوگ دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے ہوں۔ میں نے ایک بینچ کا
سہارا لے کر آگے نکلنا چاہا تھا کہ میرا ہاتھ کسی کے شانے سے چھو گیا۔ میں چیخ مار کر پیچھے
ہٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بینچ کو دیکھنے لگا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تمام بینچوں پر لوگ بیٹھے
نظر آنے لگے۔ ان کے جسموں پر لمبے لمبے سیاہ لبادے تھے اور وہ ایک دوسرے سے
سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور گردنیں ہلا ہلا کر تائید کرتے جا رہے تھے۔
دو چیخوں کی آواز سن کر میں نے اپنے تعاقب میں آنے والے دشمنوں کی جانب
دیکھا چند لوگ جن کے لباس بینچوں پر بیٹھے لوگوں سے مختلف تھے انہیں اپنے گھیرے میں
لئے ہوئے تھے۔ عورت کے ہاتھ سے شمعدان اور مرد کے ہاتھ کی کلہاڑی نیچے پڑی
تھی۔ وہ خوف و دہشت سے بری طرح چلا رہے تھے۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ جبکہ میری جانب کسی نے توجہ بھی
نہیں کی تھی لیکن اس پراسرار ماحول نے میرے حواس چھین لئے تھے۔
"جاؤ .... جاؤ مظلوموں کی جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ جلدی جاؤ مجرم وہاں پہنچنے والے
ہیں۔" کسی نے مجھ سے کہا۔
میں نے احمقوں کی مانند اس طرف دیکھا۔ دشمن روحوں کو گرفتار کرنے والے
انہیں چبوترے کی طرف لے جا رہے تھے وہ چبوترے پر رکھی شاہ بلوط کی کرسی کے بائیں
جانب پہنچ کر ان دونوں کو حراست میں لے کر کھڑے ہو گئے۔
مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی غیر مرئی قوت مجھے اس چبوترے کی طرف لے جا رہی
تھی۔ کچھ نادیدہ ہاتھ مجھے اپنے جسم پر شدت محسوس ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کرسی کے
دائیں جانب پہنچا دیا اور میرے جسم سے جدا ہو گئے۔ میں اس طلسمی ماحول میں بے حس و

حرکت کھڑا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کیا چکر ہے۔

اسی وقت وہ سنگی مجسمہ حرکت کرنے لگا۔ اس کا ترازو والا ہاتھ نیچے ہوا پھر اس اپنی آنکھیں کھول دیں اور پُروقار انداز میں قدم بڑھاتا ہوا کرسی پر آ بیٹھا۔ اب وہ گو: پوست کا ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔

اسے حرکت کرتا دیکھ کر بینچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے تھے۔ کرسی پ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ نیچے جھکا لیا۔ اس کے ساتھ ہی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے لوگ بیٹھ گئے۔ دو سیاہ پوش ایک میز اٹھائے ہوئے آئے اور میز اس معزز شخص سامنے رکھ دی پھر ایک آواز ابھری۔

"بائیں جانب ملزم ہیں اور دائیں جانب ایک مظلوم جو ان دونوں کے ظلم کا: ہے۔"

اس شخص نے جو یقیناً منصف تھا' بائیں جانب دیکھا اور پھر مجھے دیکھ کر بارع آواز میں پوچھا۔

"کیا کوئی عینی شاہد ہے۔"

"نہیں مگر مجرم دوسرا جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کئے گئے ہیں۔ یہ دوز ایک قتل کر چکے ہیں اور دوسرا قتل کرنے کی کوشش میں آلہ قتل کے ساتھ پکڑے ہیں۔ یہ دونوں احاطہ عدالت میں دائیں جانب موجود شخصیت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ کلہاڑی ان کے اس ارادے کا ثبوت ہے۔"

انہیں گرفتار کرنے والوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کلہاڑی منصف سامنے میز پر رکھ دی۔ منصف نے کلہاڑی کو چھو کر اس کی دھار دیکھی اور اثبات: گردن ہلا کر بولا۔

"ارادہ قتل۔"

"جی' وہ بھی کمرہ عدالت میں۔"

"ان دونوں کو بے نقاب کیا جائے۔" منصف نے حکم دیا۔

دو سیاہ پوش آگے بڑھے اور انہوں نے ان دونوں کی گردنیں ٹٹول کر ایک جھلی اتار دی۔ اندر سے دو خوفزدہ اجنبی چہرے برآمد ہوئے تھے۔ میں حیرانی سے انہیں دیکھتا گیا۔ عورت کے خدوخال بے حد حسین تھے اور مرد بھی خاصا وجیہہ تھا لیکن دونوں وہی حالت تھی جو تھوڑی دیر قبل میری تھی۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہی پھر منصف

...م دیا۔

"مقدمہ پیش کیا جائے۔" دائیں بائیں کھڑے لوگوں نے گردنیں جھکا دیں۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہنا شروع کیا۔

"منصف معظم! نام اس شخص کا اطہر یوسفی ہے۔ جدید دور کے ایک پیشے سے ...ملہ ہے اور اپنے مالک کے اعتماد کا قاتل ہے۔ اس کی شریک کار عورت نائلہ کہلاتی ہے۔ مقتول اسے بیٹی کی مانند چاہتا تھا کہ لاولد تھا اور دولت مند بھی۔ یہ لڑکی جو اس کی ...نمک خوار تھی اور اس کے ہاں کی ملازم لیکن اس کی مراعات اور نوازشات سے بہرہ ور تھی اور اس نے اس پر مہربانیوں کے دفتر کھول دیئے تھے لیکن یہ بدبخت خلوص و مہر سے ناواقف اور طمع زر سے ناپاک تھی کہ اس کی فطرت میں بدکاری تھی اور یوں ربط ہوا اس کا اس مرد کے ساتھ اور دونوں ایک ہی شخص کی مہر و عنایات سے سرفراز تھے اور اس کے اہم رازوں سے واقف تھے اور عورت بدکار نے اس سے ہر قسم کے راہ و رسم پیدا کر لئے اور کہا ماجرا اس دولت مند شخص کا کہ اس کے اعتماد میں تھی اور وہ اس سے اپنی دولت پوشیدہ نہیں رکھتا تھا۔ سو ان دونوں نے ایک عزم ناپاک کیا اور عورت جو نائلہ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ مالک کی مصروفیات پر نگاہ رکھنے لگی اور یوں اس پر رمز کھلا کہ ایک رات وہ صاحب دولت کثیر لے کر گھر واپس گیا ہے اور اس رات یہ دولت اس کے پاس ہی رہے گی چنانچہ ان زر پرستوں نے منصوبہ ناپاک بنایا اور عورت اس دولت مند شخص کے گھر پہنچ گئی اور اپنی مظلومیت کی داستان یوں سنائی اسے کہ ماں اس کی ...تیلی ہے اور ظلم و ستم کرتی ہے اس پر کہ زندگی اجیرن ہے اور بہتر ہے کہ موت ہی آ جائے۔

وہ صاحب دل پسیج گیا اور اس نے اجازت دی اسے کہ یہ رات اس کے گھر میں ...گزار دے اور دوسری صبح وہ اس کے لئے کوئی بندوبست کر دے گا لیکن حقیقت یہ نہ تھی کہ یہاں آنے کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ سو جب رات ہوئی تو وقت مقرر پر اس نے اس مرد ناپاک کے لئے گھر کے دروازے کھول دیئے اور وہ داخل ہو گیا اپنے مذموم ارادوں کے ساتھ اس مکان میں کہ یہ اس کی رہنما تھی سو کہا اس نے اپنے عاشق سے کہ دولت اس مرد بزرگ نے اس کمرے میں اس خانہ زر میں رکھی ہے جس کی چابی اس کے ...ں موجود ہے لیکن ہوا یوں کہ اس مرد ضعیف نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا اور

اس کے دروازے پر دستک دی اور مرد ضعیف نے دروازہ کھول دیا اور پایا اپنی دانست
اسی مظلومہ کو اپنے سامنے تو صورت احوال کی دریافت کے لئے اسے اندر بلا لیا لیکن ا
کے عقب میں یہ نامراد شخص بھی اندر داخل ہوا اور اس نے اس مرد مہربان کی گرد
میں اپنے مظر کا پھندا ڈال دیا اور اس کے قوی ہیکل بدن کی قوت کے آگے وہ مظلو
مدافعت جسمانی نہ کر سکا اور اس کے تنگ شکنجے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یوں ا
دونوں کے لئے مشکل نہ ہوا۔ اس کی دولت کا حصول کہ دونوں بے نصیب سنگ دل:
لاثانی تھے اور سیم و زر کے آگے انسانی زندگی کو بے حقیقت سمجھتے تھے۔ چنانچہ حصول
کے بعد یہ دونوں وہاں سے نکل آئے اور اس ارادے کے ساتھ اپنے اپنے مقامات
واپس چلے گئے کہ کچھ وقت خاموشی سے گزاریں گے اور اس کے بعد یہ دولت لے
کہیں اور چلے جائیں گے اور اپنی بدکار زندگی کو عیش کے ساتھ جاری رکھیں گے۔
جب اس شخص کی موت کا چرچا ہوا اور عقدہ کشا اس کی موت کا راز پانے میں مصرو
ہوئے تو ان دونوں کی جانب کسی کی توجہ نہ گئی اور یہ معصوم بنے اپنے مشاغل
مصروف رہے یہاں تک کہ وقت خاصا گزر گیا اور عقدہ کشا اس موت کی حقیقت پا
میں ناکام ہو گئے۔

جب انہوں نے وقت غنیمت پایا تو فرار کی تیاریاں کرنے لگے لیکن کسی نے رہنم
کر دی عقدہ کشاؤں کی اس جانب کہ اس رات جب وہ مرد ضعیف زندگی سے محروم ہو
یہ عورت اس کے ہاں مقیم تھی۔ یوں اس کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے اور اس
اپنے اس عاشق کو یہ افتاد بتائی اور طے کیا دونوں نے کہ نکل چلا جائے رات کی خامو
میں کسی ایسی جانب جہاں سے انہیں بیرونی ملک جانے کی سہولت حاصل ہو۔ سو یہ دو
اس زر کثیر کے ساتھ چل پڑے اور انہیں یہی گوشہ عافیت نظر آیا جہاں یہ اس د
موجود ہیں اور جو سنگدل ہوتے ہیں ان کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں گو یہ اپنی دانست
ایک محفوظ جگہ آ پہنچے تھے لیکن نادان اس بات سے بے خبر تھے کہ تقدیر انہیں
انسانوں کی عدالت سے بچا لائی ہے لیکن جس جگہ انہوں نے پناہ لی وہ ایسی عدالت
جہاں کا انصاف بے مثال ہوا کرتا تھا۔ ہم نے ان کا مقدمہ درج کر لیا۔

اے منصف اعظم! اپنے تئیں اور منتظر تھے اس رات کے جب بادلوں سے انہ
کا حکم ملتا ہے اور یہی وقت تھا کہ انہیں عدالت میں طلب کیا جائے لیکن یہ نادان ا
مرد معصوم کو جو پناہ کی غرض سے یہاں آ گیا تھا۔ اپنی شیطنت کا شکار بنانے پر تل گئے
یہ سوچا انہوں نے اس کے بارے میں کہ اس کی زندگی کہیں ان کی عارضی پناہ گاہ نہ
چھین لے اور یہ شخص یہاں ان کی موجودگی کی نشاندہی نہ کر دے۔ سو انہوں نے اپنے
اصل چہرے چھپائے اور یہاں موجود سامان قدیم سے ہمارے لباس لے کر اپنے جسموں پر
چڑھائے اور اس مرد معصوم کو خوفزدہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کی موت
کے لئے وقت کا بھی تعین کر لیا اور اسے دہشت سے اس قدر مفلوج کر دیا کہ وہ مدافعت
نہ کر سکے لیکن ہم نے اس کی رہنمائی کی اور اسے یہاں تک پہنچا دیا۔ سو اے منصف
اعظم! یہ حاضر ہیں اور تیرا انصاف آزاد ہے کہ ان کے لئے سزا متعین کر۔" وہ خاموش
ہو گیا اور ہال میں لوگوں کی سرگوشیاں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دینے لگیں۔

میں حیرت سے منہ پھاڑے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا' جنہیں روحیں سمجھ کر میں
بھاگتا پھرا تھا۔ اگر مجھے پہلے ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی تو میں اتنا بزدل اور کمزور بھی
نہیں تھا کہ ان کا شکار بن جاتا۔ اصل روحوں سے تو اب واسطہ پڑا تھا مگر یہ تو خلاف توقع
کچھ اور ہی ثابت ہو رہی تھیں۔

منصف نے دھیمی مگر بارعب آواز میں خاموش رہنے کا حکم دیا تو اک دم سکوت
طاری ہو گیا۔ سب کی نگاہیں اس کے چہرے کی جانب اٹھ گئیں۔ منصف نے ان دونوں کو
دیکھا وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

"ناپاک جرم کا ارتکاب کرنے والو! کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم .... ہم یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں نکل جانے دو .... ہمیں
نکل جانے دو۔" مرد نے دہشت زدہ آواز میں کہا اور ہال میں ہنسی کی آوازیں ابھرنے
لگیں۔

"خاموش رہو .... خاموش رہو۔" منصف نے انہیں سرزنش کی۔ وہ خاموش
ہو گئے تو منصف نے کہا۔

"تمہاری زندگی یا موت سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ تمہاری دنیا الگ ہے اور
ہماری الگ' تمہارے فیصلے تمہاری دنیا کی عدالت میں ہوتے ہیں لیکن تم نے فرار ہو کر
جس جگہ پناہ لی ہے وہ بھی عدالت ہے۔ اگر تم یہاں نہ آتے تو ہمیں تمہاری کوئی پرواہ نہ
ہوتی۔ عدالت میں انصاف کے طلبگار ہی داخل ہوتے ہیں اور مجرموں کو یہاں سزا ضرور
ملتی ہے۔ یہاں آ کر تم نے عدالت کے انصاف کو آواز دی ہے اور انصاف کیا جا رہا ہے

"ہمیں انصاف نہیں چاہئے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانے دو۔" اطہر یوسفی خوف سے کانپتے ہوئے بولا اور ان کے درمیان سے نکل بھاگا۔ وہ تیزی سے دروازے کے قریب پہنچا' کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پر ٹکریں مار رہا تھا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وحشت زدہ چیخوں سے ہال گونج اٹھا تھا۔ وہ ایک ایک دروازے پر زور آزمائی کر کے ہار گیا تو کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ہو سکی۔ آخر تھک کر ہانپتے ہوئے زمین بیٹھ گیا۔

"اسے اس کی جگہ واپس لاؤ۔" منصف نے حکم دیا۔ حکم سنتے ہی سیاہ پوش آگے بڑھے اور اس کو پکڑ کر واپس لے آئے۔

"تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو' کہو۔" منصف نے سامنے کی بینچ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کی جانب دیکھ کر کہا۔ وہ شخص اٹھ کر چبوترے پر چڑھ آیا۔

"میں ایک نکتہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"یہ ناپاک قاتل اپنی ساتھی لڑکی سے بھی مخلص نہیں تھا' اس کا ارادہ تھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد یہ لڑکی کو قتل کر دے گا۔"

"نکتہ ذہن نشین ہوا۔" منصف نے کہا۔

"یہ لوگ موت سے فرار کے خواہش مند ہیں جو اب ناممکن ہے اور جاننے والے تو نے جانا اور دیکھا کہ عدالت نے انصاف کیا اور ستم نہیں چھوڑا' اس میں لیکن وہ دولت کہاں ہے جس کے لئے ان ناپاکوں نے پہلے اس ضعیف مرد کے اعتماد کو اور پھر اسے قتل کیا؟"

ایک شخص ایک بڑا سا سوٹ کیس اٹھائے آگے بڑھا اور سوٹ کیس کھول کر منصف کے سامنے رکھ دیا۔ منصف نے حقارت بھرے انداز میں اس میں بھرے نوٹوں کو دیکھا اور بولا۔

"بند کرو اس ناپاک شے کو جس کے لئے انسان انسانیت کھوتا جا رہا ہے اور پستیوں میں گرتا جا رہا ہے۔" سوٹ کیس بند کر دیا گیا۔

"عدالت نے پوری تفصیل سنی اور ان دونوں کو بدترین جرم کا مرتکب پایا۔ نوعیت جرم بتاتی ہے کہ دونوں یکساں مجرمانہ حیثیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی تشفی کے لئے آخری تصدیق کر لی جائے۔ مقتول کو حاضر کیا جائے۔" منصف نے کہا۔ ایک شخص نے وہیں کھڑے کھڑے آواز لگائی۔

"مقتول سرور علی ولد بہادر علی حاضر ہے تو عدالت میں پیش ہو۔" میری آنکھوں نے درمیانی کرسی سے ایک بوڑھے شخص کو اٹھتے ہوئے دیکھا' لیکن اس کی شکل بے حد بھیانک تھی۔ زبان باہر لٹک رہی تھی اور آنکھیں حلقوں سے ابھری ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر حواس ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اسی حالت میں چبوترے پر پہنچ گیا۔ عورت نے ایک بھیانک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

"تمہارا نام ہی سرور علی ہے؟" منصف نے پوچھا۔

"ہاں میں سرور علی ہوں۔"

"اپنی زبان اندر کرو' الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں۔" منصف نے کہا' اس نے زبان اندر کر لی۔

"کیا تم تصدیق کرتے ہو کہ یہی دونوں تمہارے قاتل ہیں؟"

"ہاں یہی دونوں میرے قاتل ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ ہال میں پھر آوازیں ابھرنے لگیں جنہیں منصف کی آواز نے خاموش کر دیا۔

"ان تمام واقعات کی روشنی میں مجرموں کو ان کے بھیانک جرم کے نتیجے میں سزائے موت سنائی جاتی ہے۔ دونوں مجرموں کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔"

چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ سیاہ پوش نے دونوں کو جکڑ لیا تھا اور پھر وہ بے ہوش عورت اور خوف سے تھر تھر کانپتے مرد کو پھانسی کے پھندوں کے حوالے کرنے لے چلے۔ چند لمحے بعد ہی وہ دونوں پھندوں میں لٹکے ستونوں سے جھول رہے تھے۔ ان کی گردنیں لمبی ہو گئی تھیں اور آنکھیں باہر ابل آئی تھیں۔

پھڑکتے ہوئے جسم ساکت ہو گئے تو منصف کرسی سے اٹھا اور ترازو ہاتھ میں لے کر وہیں جا کھڑا ہوا جہاں اس کا مجسمہ نصب تھا اور دوبارہ پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر شمعدان گل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہال تاریک اور ویران ہو گیا۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ ہال میں مکمل خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ میں اندھیرے میں سما ہوا جہاں کھڑا تھا وہیں لیٹ گیا۔ پھر جب پیروں میں خون کی گردش بحال ہوئی تو دروازوں کے اوپر روشندانوں سے صبح کی روشنی جھانکنے لگی اور آہستہ آہستہ ہال کی تاریکی دم توڑ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ہال میں میرے علاوہ کسی کا نشان تک نہ تھا۔ ساری کرسیاں خالی پڑی تھیں' ان پر

نشانات موجود تھے۔ پتھر کا مجسمہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ چبوترے پر جہاں تین ستونو رسی کے پھندے لٹکے ہوئے تھے دونوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی گردنیں ہوئی تھیں اور زبانیں اور آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں جو اس بات کی علامت تھیں انہیں پھانسی دی گئی ہے۔

میری کیفیت اب رات جیسی نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے قریب جا کر اس کی کنڈی پکڑ کر زور سے کھینچی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب را اطہر یوسفی کی انتہائی کوشش کے باوجود نہ کھلنے والا دروازہ چرچراتا ہوا آسانی سے کھ گیا۔ باہر سرد ہوا اور تیز روشنی نے میرا استقبال کیا۔ دن پوری طرح بیدار ہو چکا سامنے سرخ پتھر کی بنی راہداری تھی اور دائیں جانب ایک وسیع احاطہ تھا جس میں بے خود رو جھاڑیاں تھیں۔ میں احاطے کی جانب بڑھا مگر ایک خوفناک سانپ کو جھاڑیو گھستے دیکھ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور راہداری میں آگے بڑھنے لگا۔ صدر درواز میری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اس بھیانک رات کے خاتمے کے ساتھ ہی میری ہمت بھی ختم ہو گئی تھی لیکن اتنی ہمت پھر بھی نہیں تھی کہ کچھ دیر رک کر موٹر سائیکل خرابی تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ میری ضرورت نہ ہوتی تو اسے ہاتھ لگائے ہی چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ میں موٹر سائیکل دھکیلتا ہوا باہر نکلا۔ عمارت کے باہر پتھر کی سل پر آثار قدیمہ والوں نے سیاحوں کی راہنمائی کے لئے لکھ دیا تھا۔

"یہ چورانی عدالت عالیہ ہے۔" میں نے پتھر کی سل پر نظر ڈالی اور پھر موٹر سا لے کر جو دوڑ لگائی تو دیکھنے والے کے لئے ایک عمدہ منظر تھا بشرطیکہ وہاں کوئی دیکھنے ہوتا۔ میں اس تیزی سے دوڑا تھا کہ شاید اتنا تیز کبھی نہیں دوڑا ہوں گا۔

سڑک پر پہنچا تو سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی لیکن رک کر سانس درست ہو کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ بھاگتے ہی میں نے کسی خیال کے بغیر بس یونہی موٹر سا سٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو پہلی ہی کک میں وہ سٹارٹ ہو گئی۔ گاڑی کی خرابی یا د کے اسباب کچھ بھی ہوں لیکن اس وقت میں اس کے تعاون کا بے حد احسان مند تھا۔

رات کی بارش کا پانی جگہ جگہ کھڑا تھا مگر اب موٹر سائیکل میرا پوری طرح دے رہی تھی چنانچہ میں نے گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ میری حالت دیکھ کر کسی نے کیا سو گا مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میں گھر پہنچ کر بستر پر جا گرا اور پھر مجھے کوئی

بہرحال آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ میں نے بستر پر پڑے پڑے وقت کے بارے میں سوچا۔ سنا تھا کہ ایسے حالات سے گزرنے کے بعد شدید بخار ہو جاتا ہے۔ آدمی ہذیان بکتا ہے اور بعض اوقات مر بھی جاتا ہے لیکن میں ٹھیک ٹھاک تھا جو چیز میرے لئے اس وقت سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی وہ بھوک تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے صدیوں سے بھوکا ہوں۔

اس چھوٹی سی رہائش گاہ کے چھوٹے سے کچن میں اس وقت سوکھی ہوئی ڈبل روٹی جیلی اور جام کے ڈبے اور چائے کا سامان موجود تھا۔ میں نے چائے کا پانی رکھ دیا اور کچھ بلے پانی میں پتی ڈال کر چائے تیار کی اور سوکھی ہوئی ڈبل روٹی اس میں بھگو دی۔ اس دوران چمچے سے جیلی کی آدھی بوتل صاف کر لی تھی۔

چائے کے ساتھ تیار شدہ ڈبل روٹی کا حلوہ معدے میں پہنچ کر تقویت کا باعث بنا اور میں اپنے حال پر غور کرنے لگا۔ بلاشبہ میں غیر معمولی قوتوں کا مالک ہوں ورنہ رات کے واقعات حرکت قلب بند ہو جانے کا باعث بھی بن سکتے تھے اور میرے وجود میں چھپی ہوئی اس غیر معمولی قوت نے مجھے بیمار بھی نہیں ہونے دیا تھا۔

بھوک سے نجات ملی تو گزرے ہوئے حالات پر غور کرنے کا موقع ملا۔ پہلے تو والد صاحب پر غصہ کرتا رہا کہ اگر ذرا سے نرم ہو جاتے تو مجھے ان خوفناک مراحل سے نہ گزرنا پڑتا۔ آخر چھٹی تو ہو ہی گئی تھی۔ پھر میں خود ان واقعات سے دوچار ہو رہا تھا۔ ایک خوفناک خواب سا معلوم ہوتا تھا' گھر میں پڑے پڑے ہول سوار ہونے لگا تو گھر سے باہر نکلنے کی سوجھی' چنانچہ باہر نکل کر تالا لگایا اور آصف بھائی کے گھر کی طرف چل دیا۔

آصف بھائی کی کار پورٹیکو میں موجود تھی اور اس پر کور چڑھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر میں موجود تھے اور اس وقت کہیں جانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ بھابی جان نے ہمیشہ کی طرح پُرخلوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ بچے آ کر لپٹ گئے۔ میں نے انہیں پیار کر کے راستے سے خریدی ہوئی ٹافیاں ان میں تقسیم کیں۔ پھر آصف بھائی کے بارے میں معلوم کیا۔ بھابی نے کہا۔

"پندرہ دن کی چھٹی پر ہیں اور طے کر چکے ہیں کہ یہ پندرہ دن بلیرڈ کھیل کر گزار دیں گے۔ وہیں چلے جاؤ' گیندوں پر نشانے لگا رہے ہوں گے۔" میں بلیرڈ روم میں پہنچ گیا۔ آصف بھائی نے سرخ گیند سفید گیند پر مارتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔

"مجھ پر یا گیندوں پر؟" میں نے پوچھا۔ وہ حسب عادت زوردار قہقہہ لگا کر بولے
"بھئی تمہاری خیریت پوچھ رہا تھا۔"

"ان گیندوں سے بھی برا حال ہے۔" میں گہری سانس لے کر اداسی سے بولا
سنک پر پوڈر لگاتے ہوئے مجھے دیکھ کر بولے۔

"گھر گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"سب خیریت سے ہیں؟"

"جی ہاں' سوائے میرے۔"

"کیوں تمہیں کیا ہوا ہے۔ دھت تیرے کی۔" وہ بیک وقت مجھے اور خانے میں جانے والی گیند کو مخاطب کر کے بولے۔

"ایک کہانی سنانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

"سناؤ سناؤ کیا بہت دلچسپ ہے؟"

"بے حد ذرا توجہ سے سنیں۔"

"ہاں ہاں۔ میں توجہ سے ہی سن رہا ہوں۔"

"پہلے یہ بتائیں گزشتہ چند ہفتوں یا مہینوں میں سرور علی ولد بہادر علی نامی کوئی دولت مند قتل ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔ آصف بھائی کی سنک رک گئی۔

"اخبار میں پڑھا ہو گا۔ یہ کیس میرے پاس ہی تھا۔" وہ دوبارہ گیندوں پر لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔

"کیا اس قتل کا شبہہ کسی اطہر یوسفی نامی شخص پر تھا جس کے ساتھ ایک نو لڑکی نائلہ بھی تھی؟" میں نے پھر سوال کیا۔ آصف بھائی پھر رک گئے اور مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

"یہ دونوں نام اخبارات کو نہیں دیئے گئے تھے پھر تمہیں کیسے معلوم ہو گئے؟"

"آپ ان دونوں کی تلاش میں بھی ناکام رہے ہوں گے؟" میں نے کہا۔ آصف بھائی نے سنک ایک طرف رکھ دی۔

"گویا تم مجھے کھیلنے نہیں دو گے' چلو ٹھیک ہے آؤ ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔ بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔" ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ کر صوفوں پر بیٹھ گئے تو انہوں نے کہا۔

"ہاں میں ان دونوں کی تلاش میں بھی ناکام ہوں لیکن تمہیں یہ نام کیسے معلوم ہو گئے۔ بعض وجوہ کی بنا پر ان کے نام ظاہر نہیں کئے گئے تھے۔"

"کیا یہ قتل دولت کے لئے کیا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ آصف بھائی بے چینی سے پہلو بدل کر بولے۔

"تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے' مجھے حیرت ہے کہ تمہیں ان باتوں کا علم کیسے ہوا جنہیں صرف چند ذمے دار لوگ ہی جانتے ہیں۔"

"پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

"یہ درست ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی کہ اس قتل کے پس پردہ دولت ہی ہے' اطہر یوسفی اور نائلہ بھی منظر عام پر آئے تھے۔"

"ہوں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"کیا ان کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر کوئی انعام بھی رکھا گیا ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں جو کچھ معلوم ہے جلدی سے اگل دو۔"

"میں انہیں مردہ حالت میں گرفتار کرا سکتا ہوں۔"

"مار بیٹھوں گا اب تمہیں۔ صحیح بتاؤ تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟" آصف بھائی نے کہا۔ جواب میں' میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ میرے خاموش ہونے کے بعد انہوں نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ دونوں لاشیں اب بھی وہیں موجود ہوں گی؟"

"بس یہی سمجھ لیں آصف بھائی! میں بھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ لاشیں اب بھی وہاں موجود ہوں گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ یہ کہانی تفریحی حیثیت نہیں رکھتی۔ بہرحال تمہیں وہاں تک میری رہنمائی کرنا ہو گی۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ خود ہی چلے جائیں؟ میں آپ کو پوری پوزیشن بتائے دیتا ہوں۔"

"نہیں اختر میاں! تم ساتھ چلو گے۔ ہم پولیس فورس کے ساتھ چلیں گے اور پھر میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا۔ جن حالات میں تم نے وہاں رات گزاری ہے یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے' بس ایک دو فون کر لوں پھر چلتے ہیں۔"

"ہاں ایسے معاملات میں دیر کرنا مناسب نہیں ہوتا۔"

مجھے آصف بھائی نے تیاریوں کے دوران بھی اپنے ساتھ ہی رکھا کہ کہیں بھاگ نہ جاؤں اور پھر رات کی تاریکی میں ایک بار پھر میں پولیس کی جیپ میں سوار کھنڈرات کی طرف جا رہا تھا۔ نہ جانے آج کن حالات سے گزرنا پڑے۔ دل اس سے لرز رہا تھا۔

بہرحال پولیس کو لے کر چورانی کی اس پُراسرار عدالت تک جا پہنچا۔ طاقتور ٹارچ کی روشنی میں ہم راہداری سے گزر کر ہال کے دروازے تک پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ ٹارچوں کی روشنی میں ننگی مجسمہ اپنی جگہ کھڑا نظر آیا۔ دونوں لاشیں پڑی نظر آئیں۔ آصف بھائی نے عجیب سی نظروں سے لاشوں کو دیکھ سپاہیوں کو انہیں اٹھانے کا حکم دے کر خود آگے بڑھ کر چبوترے پر پڑا ہوا نوٹوں سے سوٹ کیس اٹھا لیا اور پھر اچانک یوں لگا جیسے فلم ختم ہو گئی ہو۔ آواز بند ہو گئی ہو داستان سنانے والے کے بدن کو کئی جھٹکے لگے اور وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سونو اور محسن کو دیکھا اور اس کے حلق سے طرح کی آوازیں نکلنے لگیں۔

"م' معاف کیجئے' میں نے غلطی سے م' معافی چاہتا ہوں۔ س' سوری بدحواسی سے اٹھا تو سونو جلدی سے بولی۔

"رکیے تو سہی اختر صاحب رکیے پلیز آپ نے یہ نہیں بتایا کہ............" سونو نے ہی کہا تھا کہ محسن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اسے جانے دیں مس سونو اس کی کہانی اتنی ہی تھی۔ سونو خاموش ہو گئی اختر ہال سے باہر نکل گیا تھا سونو نے کہا۔

"عجیب کہانی تھی۔"

"ہاں' لیکن میری زندگی کا سب سے انوکھا تجربہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شخص نے بڑی پُراسرار کہانی سنائی ہے لیکن یہ کہانی جھوٹی نہیں تھی۔"

"بالکل نہیں تھی کیونکہ۔"

"ہاں کیونکہ؟" محسن سوالیہ انداز میں بولا۔

"کیونکہ یہ میرا بھی تجربہ ہے۔ یہ لوگ سچ بولتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"زندگی اتنا بڑا انعام کسے دیتی ہے۔ ذرا غور کرو۔ یہ کتنی قیمتی چیز ہے یہ اس کے ذریعے بڑے بڑے مجرموں سے ان کے راز اگلوائے جا سکتے ہیں۔ ہمیں زندگی کا ایک دلکش مصرف حاصل ہو سکتا ہے۔" سونو سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر سونو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"سچ مانو محسن! میں نے اس طرح نہیں سمجھا تھا۔ اس کی وجہ جانتے ہو کیا ہے؟"

"کوئی وجہ بھی ہے۔" محسن نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"بھلا وہ کیا؟"

"اس سے پہلے تم مجھے نہیں ملے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ کسی اچھے دوست کا ساتھ ہو تو انسان زیادہ بہتر انداز میں سوچ سکتا ہے۔"

محسن مسکرا دیا۔ پھر بولا۔ "ہاں ایسا ہے چلو خیر اٹھو آؤ چلیں۔"

"کہاں؟"

"کسی اور حسین کہانی کی تلاش میں............" محسن بولا۔

اور سونو مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔

☆------☆------☆

سونو نے اس انداز میں پہلے نہیں سوچا تھا۔ بلکہ وہ تو اب اس ہیرے سے اکتا گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ نایاب ہیرا تو جدوجہد کا قاتل ہے۔ بے شک اس سے دل بہل جاتا ہے لیکن عمل تو رک جاتا ہے۔ ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں سے رابطے ٹوٹ گئے تھے۔

لیکن اب؟

پھر اس نے دل میں ایک فیصلہ کیا۔ اصل ہیرا پتھر نہیں بلکہ محسن ہے۔ ایک دوست' ایک ساتھی اور شاید محبوب؟ یہ سوال اس نے اپنے دل سے نہیں کیا تھا۔ کیونکہ کچھ سوال' سوال نہیں صرف جواب ہوتے ہیں۔ بہت شاطر تھی وہ۔ بڑے فراڈ کئے تھے اس نے .... لیکن بڑے سے بڑا شاطر کبھی کبھی اپنے ہی جال میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ سونو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ محسن غیر محسوس انداز میں چپکے سے اس کے دل میں اتر گیا تھا۔

"یہ تو بڑی نایاب شے ہے۔ اس سے تو ہم لوگوں کے دلوں میں اتر سکتے ہیں۔ بڑے مجرموں سے ان کے راز اگلوا سکتے ہیں!" اور سونو کو لگا تھا جیسے واقعی یہ ہیرا نایاب شے ہے۔ اب وہ اسے اپنی نہیں اپنے محبوب کی آنکھ سے دیکھے گی۔

"آئندہ میں کوئی غلطی کر بیٹھوں سونو کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟" ایک دن محسن نے پوچھا۔

"آئندہ زندگی میں تمہاری ہر غلطی معاف!"

"واقعی؟"

"سو فیصدی۔" سونو نے کہا۔

"تو میں ایک غلطی کر بیٹھا ہوں۔"

"بتاؤ گے؟"

"ہاں بتانا چاہتا ہوں۔"

"بتاؤ۔"

"اس ہیرے کے ذریعے میں نے تمہیں پڑھ لیا ہے۔"

"کیا؟" سونو دنگ رہ گئی۔

"ہاں۔"

"مگر کب؟"

"بس دو تین دن پہلے۔"

"اوہ تو پھر۔"

"تم بہت حسین ہو سونو اندر سے بھی اور باہر سے بھی، میں تمہیں پہلے سے زیادہ چاہنے لگا ہوں۔ تمہارا ماضی تمہاری مجبوری ہے لیکن اس کے باوجود تم اپنی ماں سوتیلے بہن بھائیوں کو پال رہی ہو۔ بڑی بات ہے سونو۔ بہت بڑی بات ہے۔ ایک گناہ بھی کیا ہے میں نے۔"

"کیا؟"

"یہ۔" محسن نے منی آرڈر کی ایک رسید سونو کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ا لاکھ روپے کا خصوصی منی آرڈر اس نے سونو کی ماں کو بھیجا تھا۔ "بس یوں سمجھ لو کہ ماں کو خراج عقیدت تھا۔"

"تحقیق یہ سونو۔ ادھر اسے دیکھو۔ کیا کہتی ہو اس شخص کے بارے میں۔"

"کچھ پریشان ہے۔"

"شاید کوئی جرم کیا ہے اس نے۔"

"ممکن ہے۔ دیکھیں۔"

"ضرور۔"

"میں کوئی جرائم پیشہ آدمی نہیں ہوں بھائی بلکہ جرائم کا خاتمہ میری ذمے داری ہے۔ تم جس محمود صاحب کو جانتے ہو، بہت بڑے اور بہت ذمے دار پولیس افسر ہیں۔ یہ ان کی عنایت ہے اور وہ مجھے اپنے خاص آدمیوں میں جگہ دیتے ہیں۔ بس سمجھ لو میں اسی عنایت کا شکار ہوں۔" اجنبی شخص نے کہا۔

"شکار .... کیسا، کیوں؟"

"بس ایک مصیبت میرے گلے پڑ گئی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"خواجہ مسرور کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"پرکھوں کے رئیس ہیں۔ ان لوگوں میں سے ہیں جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کسی مشکل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اپنی مصیبت تو بتاؤ۔" سونو بولی۔

"خواجہ مسرور بیگ کے عالیشان ایوان میں ایک فنکار کو قتل کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے تحقیقات کیں اور مسرور بیگ کے بیان سے مطمئن ہو گئی۔ قاتل کوئی مافوق الفطرت ہستی تھی۔ کوئی ایسی نادیدہ ہستی جسے دیکھا جانا، گرفتار کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھلا پولیس اس قاتل کو کیسے گرفتار کرتی اور چونکہ یہ بیان خود خواجہ صاحب نے دیا تھا اس لیے اس میں شک شبہے کی کیا گنجائش تھی۔

بات آئی گئی ہو گئی ہوتی لیکن خواجہ مسرور نے میرے چیف حسن محمود صاحب سے خود بات کی تھی کہ وہ آرٹسٹ میر سعید کے قتل کی خفیہ تحقیقات چاہتے ہیں اور اس کے لیے کسی ماہر جاسوس کو ان کی رہائش گاہ پر اس طرح بھیج دیا جائے کہ کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس مردے میں پھر سے جان پڑ گئی تھی اور حسن محمود صاحب نے اس سلسلے

عمل کروں اور ان کی پسند کے قاتل کو گرفتار کروں۔

چنانچہ میں نے کیس لے لیا اور اس سے متعلق پورا فائل میرے سپرد کر دیا گیا رات کو فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے پوری صورت حال معلوم ہوئی جو یوں تھی۔

خواجہ سرور بیگ بہت دولت مند تھے اور یہ دولت انہیں ترکے میں ملی تھی۔ بہت بڑا کاروبار تھا جسے لاتعداد ملازمین چلاتے تھے۔ خواجہ صاحب نوادرات کے شوقین تھے اور ان کی عالیشان کوٹھی شہر سے اسی میل دور ایک چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر واقع تھی۔ اس کوٹھی میں آرٹ کے نادر اور بیش بہا نمونوں کا ایک باقاعدہ عجائب گھر موجود تھا اور اس عجائب گھر کی تعمیر اس طرح کرائی گئی تھی کہ وہ نقب زنی اور آتش زنی سے محفوظ رہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس عجائب گھر میں پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ کی مالیت کے نوادرات موجود تھے۔ جنہیں خواجہ صاحب نے پوری زندگی کی تگ و دو کے بعد حاصل کیا تھا۔ ان نوادرات میں قدیم دنیا کی لاتعداد تاریخیں چھپی ہوئی تھیں۔ مصر، بابل، نینوا اور دوسرے قدیم ترین مقامات اور اہم افراد کی بیش بہا چیزیں یہاں موجود تھیں۔ خواجہ صاحب کے اس جنون کی انتہا یہ تھی کہ قدیم مصر کے آثار میں سے انہوں نے راعلاف فرعون ہشتم کے دور کی ایک پوری دیوار حکومت مصر سے خرید لی تھی۔ یہ دیوار مصر کے ایک ویران غار میں موجود تھی اور اس میں بنے نقش و نگار قدیم مصر کی سیر کراتے تھے۔ خواجہ صاحب نے زر کثیر خرچ کر کے پوری دیوار بنیادوں تک کھدوا دی اور پھر اسے کرینوں کے ذریعے بندرگاہ تک لا کر جہاز میں لاد دیا گیا۔ اس طرح وہ اسے اپنے عجائب گھر تک لانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن آخر وقت میں دیوار کا ایک حصہ چکنا چور ہو گیا اور اس کے قدیم نقش و نگار میں ایک سقم پیدا ہو گیا۔

خواجہ سرور کو اس حادثے کا گہرا صدمہ ہوا تھا۔ نادر روزگار عجوبے کو یہاں تک لانے میں انہوں نے جو جانفشانی کی تھی اس کا صلہ کچھ نہ رہا تھا۔ دیوار خوب جدوجہد کے بعد اس عجائب گھر میں نصب ہو گئی لیکن اس کا ضائع شدہ حصہ بہت بدنما معلوم ہوتا تھا۔ طویل عرصے تک تو خواجہ صاحب اس بارے میں سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس تباہ شدہ حصے کو قدیم تاریخ کی روشنی میں درست کرایا جائے اور پھر راعلاف کے بارے میں چھان بین شروع ہو گئی۔ سینکڑوں کتابیں خریدی گئیں۔ ملکی اور غیر ملکی ماہرین کو بھاری معاوضے ادا کئے گئے جو اس سلسلے میں تحقیقات کر رہے تھے۔ پوری دیوار خواجہ صاحب کے ذہن میں محفوظ تھی لیکن ماہرین نے اس ضائع شدہ حصے کے جو نقش ڈرائنگ کئے وہ خواجہ صاحب کی آنکھوں کو نہیں بھائے۔ اس لئے ٹوٹے ہوئے حصے کی تعمیر نامکمل رہی۔

طویل عرصہ گزر گیا۔ عجائب گھر میں لاتعداد نوادرات کا اضافہ ہوا لیکن یہ نامکمل دیوار خواجہ صاحب کے ذہن میں آج بھی زخم بنی ہوئی تھی اور وہ جو بھی کوشش ہو سکتی تھی کر رہے تھے۔ پھر کسی طرح یہ مسئلہ میر سعید تک پہنچ گیا۔ یہ ایک سنگ تراش تھا۔ اپنے فن میں کھویا ہوا، مصریات اس کا خاص موضوع تھا اور پھر خواجہ صاحب نے اسے کسی نہ کسی طرح تیار کر لیا کہ وہ اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے سلسلے میں کام کرے۔ میر سعید نے طے کیا کہ پلاسٹر آف پیرس سے اس دیوار کو پہلے مصنوعی طور پر تیار کرے اور اپنی معلومات کی روشنی میں اس کے نقوش ترتیب دیتا رہے۔ ممکن ہے وہ اس کو اس کے اصل نقوش دینے میں کامیاب ہو جائے۔

اور پھر اس منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ میر سعید نے کام شروع کر دیا لیکن ابھی اسے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک صبح عجائب گھر میں اس کی لاش ملی۔ اس کے سر پر ایک وزنی ہتھوڑے سے وار کیا گیا تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کا بھیجہ باہر نکل پڑا تھا۔

اب یہ کیس خادم کے سپرد کر دیا گیا تھا اور حسن محمود صاحب نے مجھے ساری ذمہ داریاں سونپ دی تھیں اور اب مجھے اس سلسلے میں سر کھپانا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ خواجہ صاحب کیا چاہتے ہیں اور انہیں میر سعید کے قتل کی تحقیقات کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے قرب و جوار سے مطمئن ہو کر ہی خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں پہلے میر سعید کے بارے میں پوری طرح چھان بین کر لوں تاکہ اس امکان کو بھی مدنظر رکھوں کہ ممکن ہے میر سعید کے قتل کا تعلق براہ راست خواجہ صاحب کی کوٹھی سے نہ ہو بلکہ کسی اور شخص نے جو کسی طور میر سعید سے دشمنی رکھتا ہو اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہو کہ قتل کا شبہ اس تک نہ پہنچے اور لوگ اس سلسلے میں خواجہ صاحب کی رہائش گاہ ہی کی طرف متوجہ رہیں۔

میر سعید کے اہل خاندان سے مل کر میں نے اس بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں [illegible] کے مطابق وہ [illegible] انسان تھا۔ اپنے فن سے لگن کے علاوہ اسے

کسی اور چیز سے سروکار نہیں تھا۔ کسی سے اس کی دشمنی کا تصور بھی نہیں کیا جا
غمزدہ لوگوں کے بیانات سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ یوں بھی میں جانتا
خود پولیس نے ایسی تمام کوششیں کرلی ہوں گی۔ اگر اسے کچھ کامیابی حاصل ہوئی ؛
قتل کی فائل میں تفصیلات ضرور لکھی ہوتیں۔ چنانچہ اب اس سلسلے میں خواجہ صاد
کوٹھی کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں رہ جاتی۔

کوٹھی میں داخل ہونے کے لئے کوئی اور حیثیت اختیار کرنی چاہئے اگر میں ؛
کے کارکن کی حیثیت سے وہاں داخل ہوتا ہوں تو ممکن ہے متعلقہ لوگ ہوشیار ہو
چنانچہ کوئی دوسری شکل بہتر ہے۔ فن مصوری کے بارے میں مجھے کافی معلومات ،
تھیں زمانہ طالب علمی میں شوق بھی کیا کرتا تھا لیکن باقاعدہ تربیت کبھی نہیں لی او
لائن ہی بدل گئی لیکن اس وقت ذہن میں یہی سمائی تھی۔ ایک مخبوط الحواس مصور کی
اختیار کر کے میں ایک دوست کی جیپ لے کر چل پڑا۔ جیپ میں مصوری کا سامان ' ر
برش' ایزل بورڈ' چند معمولی سے لباس' کھانے پینے کی کچھ چیزیں' ایک آوارہ گرد'
سرمایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں چل پڑا۔ اسی میل کا سفر کچھ زیادہ نہیں تھا۔ موسم سرد تھ
لئے ڈرائیونگ میں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی اور بالآخر میں اس عمارت کے نواح میں
گیا۔

عمارت شہری آبادی سے دور ضرور تھی لیکن جائے وقوع کے لحاظ سے بہ
علاقے میں تھی۔ اس سے تقریباً دو میل دور ایک پہاڑی بستی واقع تھی جس کے اطر
میں کھیت اور درخت لہلہا رہے تھے۔ خوبصورت جگہ تھی' مجھے بے حد پسند آئی۔ چا
طرف حسین پہاڑیاں احاطہ کئے ہوئے تھیں لیکن جوں جوں شام جھکتی آ رہی تھی سر
بڑھتی جارہی تھی۔ ایک متعلق شخص کی حیثیت سے اس کوٹھی میں داخل ہونے کے
کچھ پریشانیاں اٹھانا ضروری تھا اس لئے یہ رات میں نے کھلی جگہ پر بسر کرنے کا فیصلہ
البتہ میں اس پگڈنڈی سے زیادہ دور نہیں تھا جو اس کوٹھی کا راستہ تھی۔ رات گئے
انتظار کرتا رہا لیکن پگڈنڈی پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سردی تھی کہ مزاج !
رہی تھی۔ میں نے جیپ کا ہڈ چڑھالیا اور اس میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اندازہ ہو گیا تھ
رات اسی طرح بسر کرنا پڑے گی۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ رات سوتے جاگتے گزری تھی اس لئے صبح طبیعت'
کسلمند تھی۔ ...

صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد انتظار کرنے لگا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ دوپہر گزری تو میں
بور ہونے لگا۔ کسی کم بخت نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اگر آج کی رات بھی کوئی متوجہ
نہیں ہوا تو کل صبح خود ہی کوشش کروں گا۔ رات کی سردی کافی تکلیف دہ ہوتی تھی لیکن
شام کو تقدیر کے بند دروازے کھل گئے۔ دور سے دو گھوڑے آتے ہوئے نظر آئے
تھے۔ یہ خواجہ صاحب کی رہائش گاہ ہی سے برآمد ہوئے تھے۔ میں اپنے پروگرام پر عمل
کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ لوگ مجھے نظرانداز نہیں کریں گے لیکن
چند فیصد خطرہ بھی تھا۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ توجہ نہ دیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گھوڑوں کی
رفتار پہلے تو سست تھی لیکن جب ان کے سواروں کی نگاہ مجھ پر پڑی تو ان کی رفتار تیز
ہو گئی اور ان کا رخ میری جیپ کی طرف ہو گیا۔ میں نڈھال سا ایک سیٹ پر پشت ٹکا کر
بیٹھ گیا تھا۔

چند ساعت بعد دونوں گھوڑے سوار مجھ تک پہنچ گئے۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی
تھی اور دوسرا مرد۔ دونوں خوش پوش تھے اور چہروں سے صاحب حیثیت نظر آتے تھے۔
میں نے اپنے بدن میں جنبش پیدا کی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں دیکھنے لگا۔
دونوں ہی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر لڑکی نے باریک مگر سخت آواز میں
پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

"معاف کیجئے گا خاتون! آپ کی پذیرائی کے لئے مستعد نہیں ہو سکا۔ سخت بیمار ہو گیا
ہوں' دو تین دن سے ایسے موسمی اثرات کا شکار ہوا ہوں کہ بدن کی جان نکل کر رہ گئی
ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اوہ! بیمار ہو۔" لڑکی کے لہجے میں ہمدردی پیدا ہو گئی۔

"جی ہاں۔ یہاں سے کچھ دور ان پہاڑیوں کے پیچھے نکل گیا تھا۔ پہلی ہی رات شدید
ملیریا کا شکار ہو گیا۔ اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ جیپ ڈرائیو کر کے بستی تک پہنچ سکوں۔
دو دن تک سخت نقاہت اور بخار کا شکار رہا۔ پچھلی شام ہمت کر کے یہاں تک کا سفر کیا
لیکن چند منٹ سے زیادہ میرے لئے ڈرائیونگ ممکن نہیں ہے۔"

"پہاڑیوں کے پیچھے کیوں نکل گئے تھے؟" اس بار مرد نے پوچھا۔ لہجہ مشکوک اور
کسی حد تک تضحیک آمیز تھا۔

میں لے گیا تھا۔" میں نے اس کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"اوہ! تم مصور ہو؟" لڑکی کے لہجے میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ پھر وہ تشویش سے "لیکن تم بیمار ہو۔ تھوڑی سی کوشش اور کرتے تو ہماری کوٹھی تک آ سکتے تھے کوئی بات نہیں ہے' آؤ ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔ جبار! تم گھوڑا سنبھالو' میں جیپ کروں گی اور تم اس طرف سرک آؤ۔" آخری الفاظ لڑکی نے مجھ سے کہے تھے۔

"اگر جیپ میں ڈرائیو کروں تو؟" نوجوان نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے اچھے ڈرائیور ہو؟" لڑکی غرا کر بولی۔

"ہرگز نہیں۔ یہ دعویٰ تو میں نے کبھی نہیں کیا۔" نوجوان جلدی سے بولا۔

"صورت سے تم سائیس معلوم ہوتے ہو اس لئے اپنا کام کرو اور ہاں گھ جیپ سے پچاس گز دور رہنے چاہئیں ہمارے سر پر مسلط ہونے کی کوشش مت کر آگے بڑھو۔" وہ گھوڑے سے اتر آئی اور نوجوان دوسرے گھوڑے کی لگام سنبھ آگے بڑھ گیا۔ لڑکی میرے برابر آ بیٹھی تھی۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی اس نے سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

"یہ مکان دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں مجھے امداد ضرور مل جائے گی حواس مجتمع کر کے وہاں تک پہنچنے کی ہمت کر رہا تھا۔"

"تمہیں یہ یقین کیوں تھا۔" لڑکی نے کہا۔

"اس مکان میں رہنے والے آپ کی طرح کشادہ دل کے مالک ہوں گے ورنہ پُررونق نہ تھا۔" میں نے ایک دولت مند لڑکی کے مزاج کو مدنظر رکھ کر کہا او درحقیقت خوش ہو گئی۔

"میرے والد خواجہ سرور بیگ بے حد مشہور انسان ہیں۔ میں ان کی اکلوتی شامہ ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ اگر آپ کی جگہ آپ کا وہ سائیس ہوتا تو کبھی مدد نہ کرتا۔ آپ کے دل میں میرے لئے صرف اس لئے ہمدردی پیدا ہو گئی کہ آپ بڑے باپ کی بیٹی ہیں' وہ سائیس آپ کا کون ہے؟"

"اس کا نام جبار بیگ ہے' میرے چچا کا بیٹا ہے جو خود تو کسمپرسی کی زندگی گزا ہوئے مر گئے اور ہمارے لئے یہ تحفہ چھوڑ گئے۔ یہ خوشامدی انسان دن رات ڈیڈ خوشامد کرتا ہے اور عیش کرتا ہے۔"

"اس کی والدہ؟"

"ہوں گی کبھی اب نہیں ہیں' ڈیڈی سادہ دل انسان ہیں ورنہ چچا میاں نے تو ہمیشہ خاندان کو بدنامی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اونہہ چھوڑیے میرے خاندان کی باتیں۔ اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم صرف مصوری کرتے ہو؟"

"ہاں۔ آرٹسٹ ہوں۔ تجریدی آرٹ تخلیق کرتا ہوں۔ اکثر حسین مناظر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔"

"اوہ! تجریدی آرٹ۔ مجھے مصوری کی یہ صنف بہت پسند ہے۔" لڑکی بولی۔

"خوب! یہ میری خوش بختی ہے لیکن آپ کو یہ آرٹ کیوں پسند ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ بولی۔ میں حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا تب اس نے وضاحت کی۔

"ہاں' دیکھو نا' درخت بنائے' پہاڑ بنائے' جھرنے بنائے' سب جانی پہچانی چیزیں ہیں۔ یا پھر بھینس کا دودھ نکالتی ہوئی گوالن یا پنگھٹ کو جاتی ہوئی لڑکی۔ اس میں کیا بات ہے سب ہی ان معلومات کو جانتے ہیں۔ لطف تو ان چیزوں میں آتا ہے جو سمجھ میں نہ آئیں اور ان پر غور کرنا پڑے۔ پھر نتیجہ ہماری سوچ کے برعکس نکلے۔ میری ایک تصویر بناؤ گے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"کیوں نہیں لیکن..........."

"میں اپنی تجرید چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"میں کر دوں گا۔" میں نے بڑے خلوص سے کہا۔ اگر وہ اپنی صحیح تصویر بنانے کے لئے کہتی تو شاید مجھے پریشانی ہوتی کیونکہ رنگ اور برش کا یہ کمال مجھے اس قدر نہیں آتا تھا لیکن تجرید۔ اس میں سب کچھ چلتا ہے۔ اس لئے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ اگر چاہتی تو میں اس کے پورے خاندان کی تجرید کر سکتا تھا۔

خوبصورت عمارت کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ لڑکی سست رفتاری سے جیپ چلاتی رہی تھی ورنہ اتنی باتیں کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ البتہ آگے جانے والے دونوں گھوڑے پچاس گز سے زیادہ نہیں بڑھے تھے پھر جیپ عمارت کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ لڑکی نے اسے وسیع پورچ میں روک دیا۔ جبار گھوڑوں کو شاید اصطبل کی

چند ملازم نزدیک پہنچ گئے اور شمسہ انہیں ہدایت دینے لگی۔ اس نے خود مجھے سہارا دے کر نیچے اتارا اور اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

"تمہارا سامان کمرے میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہاں اس وقت تک آرام کرو جب پوری طرح تندرست نہ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ آج پیر ہے جمعرات کو انکل زبیر آئیں گے وہ تمہاری صحت کے لئے دوائیں تجویز کر دیں گے۔ اگر تم کہو تو ان کو ابھی فون کر دیا جائے۔"

"انکل زبیر کون ہیں؟" میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ ہفتے میں ایک بار آ کر ہم سب کا چیک اپ کرتے ہیں لیکن اگر ضرورت پیش آ جائے تو انہیں فون کر کے بلایا بھی جا سکتا ہے۔"

"نہیں مس شمسہ! شکریہ۔ بخار اتر چکا ہے لیکن ملیریا میں یہ خرابی ہے کہ یہ شدید اثرات چھوڑ جاتا ہے' بس یہ کمزوری ہے جس پر دو ایک روز میں قابو پالوں گا۔"

"ضرور' ضرور۔" اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر کہا اور پھر ایک ملازم کو کافی لانے کے لئے کہہ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"تمہارے دوسرے اہل خاندان بھی ہوں گے۔ کیا وہ تمہارے لئے پریشان ہوں گے؟"

"نہیں میرا کوئی نہیں ہے سوائے ان رنگوں اور برشوں کے اور یہ میرے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ! شادی بھی نہیں کی؟"

"بس انہی کے درمیان شاد ہوں۔"

"دلچسپ بات ہے۔ میری بھی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ڈیڈی کئی بار کہہ چکے لیکن ان کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ کبھی نہیں ہو گا۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں دنیا دیکھی ہے میں نے' بے وقوف نہیں ہوں۔ ایک ایک پر نگاہ رکھتی ہوں۔" اس کا لہجہ بگڑ گیا۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا وہ چہرے پر نفرت کی لکیریں لئے گردن جھکائے کچھ سوچ رہی تھی۔ تبھی ملازم کافی لے کر آ گیا۔

"تم کافی پیو میں ذرا تمہاری آرام گاہ کا جائزہ لے لوں۔"

"کافی نہیں پئیں گی میرے ساتھ مس شمسہ؟" میں نے پوچھا۔

[illegible]

[illegible] جاتے دیکھ رہا تھا پھر جب وہ دروازے سے باہر نکل گئی تو ملازم نے کہا۔

"کافی بنا دوں صاحب!" میں چونک پڑا پھر میں نے گردن ہلا دی۔

جس کمرے میں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا وہ کافی کشادہ تھا۔ ضروریات زندگی کی تمام چیزوں سے آراستہ۔ عقب میں ایک کھڑکی کھلتی تھی جس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی البتہ نیچے کافی گہرائی تھی۔ اس طرف کوٹھی کا لان تھا جس میں گھاس اور کنارے کنارے درخت ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ میرا سارا سامان اسی کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔

ویسے میں مکمل بندوبست کر کے آیا تھا۔ اگر کوئی میرے بارے میں چھان بین کی کوشش کرتا تو میرے بیان کی تردید نہ ہو پاتی۔ زیادہ سے زیادہ وہ جیپ کے رجسٹریشن سے اس کے مالک کا پتا لگا لیتے اور جب وہ لوگ میرے دوست تک پہنچتے تو اس سے انہیں یہی اطلاع ملتی کہ جیپ اس کے مصور دوست کے پاس ہے جو اکثر حسین مقامات کی تلاش میں اس کی جیپ استعمال کرتا رہتا ہے اس لئے میں مطمئن تھا۔

روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ ابھی تک کسی نے مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس وقت آٹھ بجے تھے جب بھونچال آ گیا۔ تین چار افراد دھڑ دھڑاتے کمرے میں گھس آئے۔ سب سے آگے ایک قوی الجثہ شخص تھا جس کے بدن پر قیمتی لباس تھا اور چہرے سے وہ کافی بارعب نظر آتا تھا۔ اس کے پیچھے جبار تھا جس سے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ تیسرا آدمی ایک دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک لگی ہوئی تھی اور سب سے پیچھے ایک بھاری جسامت کا نوجوان تھا جو معذوروں کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور خود ہی کرسی دھکیلتا ہوا اندر آیا تھا۔

جس انداز میں وہ داخل ہوئے تھے اس نے مجھے بوکھلا دیا تھا اور میں ایک ایک کی شکلیں دیکھنے لگا۔

"میں گھر میں موجود نہیں تھا ورنہ............" قوی الجثہ شخص نے مجھے گھورتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"جی!" میرے حلق سے بوکھلائی ہوئی آواز نکلی۔

"تم کبھی یہاں داخل نہ ہو سکتے' سمجھے۔"

"جی!" میں نے جلدی سے گردن ہلا دی۔

[illegible]

"مم .... میں خود نہیں آیا جناب!" میں نے بمشکل کہا۔

"جی ہاں' یہ خود نہیں آئے انکل!" جبار دبی آواز سے بولا۔

"تم چپ رہو جی۔ میں بات کر رہا ہوں۔" قوی الجثہ شخص نے اسے ڈانٹ دیا۔

"جبار کی یہی عادت ہے ڈیڈی! میرا .... میرا مطلب ہے خواجہ صاحب' جب بھی آپ بات کر رہے ہوتے ہیں یہ درمیان میں بول پڑتے ہیں۔" معذوروں کی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے منمناتی آواز میں کہا۔ اس کی آواز اس کی جسامت کا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی۔ قوی الجثہ شخص جبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیوں۔ تم اپنی یہ عادت ترک نہیں کرو گے؟" اس کی آواز خونخوار تھی۔

"دو چار دن میں ترک کر دوں گا' آپ فکر نہ کریں انکل! مگر آپ نے دوسری بات پر غور نہیں کیا۔" جبار معذور شخص کو گھورتے ہوئے بولا۔

"کون سی بات پر۔" قوی الجثہ شخص بولا۔

"توصیف نے ابھی آپ کو ڈیڈی کہا تھا۔ بعد میں اس نے خواجہ صاحب کہہ کر برابر کرنے کی کوشش کی گویا نئے شخص کے ذہن میں یہ بات ڈالنا مقصود تھی کہ وہ آپ کو ڈیڈی کہہ سکتا ہے اور آپ کے اور اس کے درمیان کوئی ایسا رشتہ موجود ہے۔"

"لعنت ہے اس پر اور اس کے ڈیڈی پر۔ کیوں توصیف! تم ہر نئے شخص کے سامنے اس کوشش میں کیوں مصروف رہتے ہو؟" قوی الجثہ شخص جس کے بارے میں اب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خواجہ مسرور بیگ ہے' اب معذور شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اب بغلیں جھانکنے لگا تھا۔

"مم .... منہ سے نکل گیا تھا۔" توصیف گردن لٹکا کر بولا۔

"نکل نہیں گیا تھا۔ یہ شخص اٹھارہ سال میں اس عادت کو ترک نہیں کر سکا کیسے ممکن ہے اور پھر آپ غور کریں انکل! ہر نئے شخص کے سامنے ہی اس کے منہ سے یہ بات کیوں نکل جاتی ہے؟"

"غور کر رہا ہوں' اچھی طرح غور کر رہا ہوں۔ گیٹ آؤٹ توصیف گیٹ آؤٹ۔" خواجہ صاحب دہاڑے اور توصیف نے جلدی سے کرسی کا رخ موڑ دیا۔ وہ برق رفتاری سے کرسی لڑھکاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبار کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر آنکھ دبائی اور پھر جلدی سے سنجیدہ ہو گیا۔ توصیف کے

"کیا بیمار ہو تم؟" سوال کیا گیا۔

"جی' ملیریا ہو گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اسپتال بھجوانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ تمہارے پاس جیپ موجود ہے اگر ڈرائیو نہیں کر سکتے تو میں ڈرائیور کا انتظام کر سکتا ہوں۔ بولو تیار ہو؟"

"میرے تیار نہ ہونے کا کیا سوال ہے جناب! میں خود یہاں نہیں آیا۔ آپ زحمت نہ کریں میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے تم بہت نحیف نظر آ رہے ہو۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دروازے پر ثمامہ کی شکل نظر آئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اندر دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر سخت غصے کے آثار تھے لیکن کمرے میں موجود لوگوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

"میں تمہیں اس حالت میں جانے کے لئے مجبور نہ کرتا لیکن آج کل حالات بہتر نہیں ہیں۔ میں کسی اجنبی کو اپنے گھر میں ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"ایک بات یاد رکھیں ڈیڈی!" عقب سے ثمامہ کی آواز ابھری۔

"اگر اس گھر میں کبھی آپ کا مہمان داخل ہوا تو .... تو خدا کی قسم میں اسے جوتے مار کر نکالوں گی .... سمجھے آپ' میں اسے..........." اس آواز پر سب پلٹ پڑے۔

"اور ان مظلوم صاحب کو تو میں ابھی دیکھتی ہوں۔" وہ ایک دم پلٹی اور سب اچھل پڑے۔

"ارے ثمامہ .... ثمامہ!" خواجہ صاحب کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے سب دوڑ پڑے۔ میں احمقوں کی طرح کھڑا سر کھجا رہا تھا اور باہر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔

"چھوڑیں ڈیڈی! مجھے چھوڑ دیں۔ میں ان مظلوم صاحب کی مظلومیت میں اور اضافہ کر دوں گی۔ ایک لمحے نہیں رہ سکتے وہ اس کوٹھی میں۔ آپ نے میرے مہمان کی بے عزتی کی ہے۔ میں..........."

مجھ سے کمرے میں نہیں رکا گیا اور میں دروازے پر نکل آیا۔ خواجہ صاحب نے

"دیکھو۔ دراصل .... دراصل قصور میرا نہیں ہے۔ اس جبار نے مجھے
اس نے مجھے بتایا تھا اور پھر یہ بات تو مجھے معلوم بھی نہیں تھی کہ وہ تمہارا مہمان ہے
"تو جبار نے آپ کو اکسایا تھا؟" شامہ جبار کی طرف پلٹی اور جبار نے دوڑ لگا
وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

"بے شک' بے شک۔ تم نے دیکھ لیا دشمن میدان سے فرار ہو گیا۔ ارے یہ
کچھ اسی کا کیا دھرا ہے ورنہ تمہارا مہمان میرا مہمان ہے۔" خواجہ صاحب نے
چکارتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب وہ یہاں نہیں رکے گا۔ آپ نے اس کی کافی بے عزتی کی ہے۔"

"کیسے نہیں رکے گا۔ اس کے تو فرشتے بھی رکیں گے ذرا جا کر دیکھے۔"
صاحب بولے۔

"آپ اسے کیسے روک سکیں گے۔ افسوس اس بیمار شخص کے ساتھ آپ
سلوک کیا۔" شامہ نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"میں اسے روک لوں گا تم فکر مت کرو۔ جمیل! جلدی کرو جاؤ اس کی جیپ
چاروں ٹائروں کی ہوا نکال دو۔ جاؤ جلدی کرو۔" اس بار خواجہ صاحب اس دبلے
شخص سے بولے جو چشمہ لگائے ہوئے تھا اور اب تک اس سارے مسئلے میں خامو
تھا۔ وہ خستہ قدموں سے باہر چلا گیا۔

"آؤ' آؤ۔ میرے کمرے میں چلو۔ شامہ بیٹی آؤ۔ میں شرمندہ ہوں تم
بوڑھے باپ کو معاف کر دو' آؤ بیٹی۔" خواجہ صاحب اسے چکارتے ہوئے وہاں سے
گئے۔

میں کمرے کے دروازے پر کھڑا اپنی کھوپڑی پر چپتیں مارتا رہا۔ بالکل ہی بھس
رہ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خود پاگل ہو گیا ہوں یا کسی پاگل خانے میں گھ
ہوں۔ ایک بات جو سمجھ میں آئی' ہر کردار اپنی جگہ بے مثال تھا خود خواجہ صاحب
مخبوط الحواس ہی نظر آئے تھے۔

بہرحال پہلا ہی دن کافی دلچسپ تھا۔ اس پاگل خانے میں تو عام حالات میں بھی
گزارا جا سکتا ہے چہ جائیکہ مجھے یہاں کچھ کام بھی کرنا تھا۔ دیر تک میں وہاں کھڑا ت
جوار میں نگاہیں دوڑاتا رہا اس دوران کئی ملازمین پر نگاہ پڑی تھی لیکن اور کوئی نظر

آدھے گھنٹے کے بعد ایک ملازمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی۔ ٹرالی پر چند پھل یخنی
اور کچھ نمکین چیزیں تھیں۔ یہ ایک بیمار کے لئے ڈنر تھا۔

"مس شامہ کہاں ہیں؟" میں کے اس سے سوال کیا۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔"

"میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کھانا کھا لیجئے میں انہیں اطلاع دے دیتی ہوں۔" ملازمہ نے کہا اور باہر نکل
گئی۔

بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا بیماروں ہی کا تھا لیکن غنیمت تھا اس لئے میں پیٹ
بھرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس دوران میں ان تمام لوگوں کے بارے میں بھی غور کر
رہا تھا۔ ملازمہ جب برتن لینے آئی تو اس نے اطلاع دی کہ اس نے شامہ کو میرا پیغام دے
دیا ہے۔ ملازمہ سے میں نے کوئی اور گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

پھر شامہ آ گئی۔ سلک کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کا دھلا دھلا چہرہ خاصا جاذب
نگاہ محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی سادہ سادہ کیفیت بھی مجھے بہت پسند آئی تھی۔ میں نے
مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔

"میری وجہ سے آپ کافی پریشان ہو گئیں' مس شامہ!"

"مجھے شرمندہ نہ کرو تو تمہارا احسان ہو گا۔" اس نے نڈھال سے انداز میں کہا۔

"ہرگز نہیں مس شامہ! میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ایسی بات
ہوتی تو میں یہاں سے چلا جاتا۔"

"میں اس کے لئے تمہاری شکر گزار ہوں اور میری خواہش ہے کہ تمہارا پروگرام
کچھ بھی ہو' تم یہاں دس پندرہ دن قیام کرو۔ میں ان لوگوں کو ذلیل کرنا چاہتی ہوں جو
اپنے آپ کو کچھ سمجھ کر اپنی ذات سے بھاری ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"آپ حکم دیں تو میں تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔" میں نے کہا اور اس کے
چہرے پر طمانیت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمہارا مزید شکریہ۔ میں پریشان تھی کہ نہ جانے تم نے ان حالات سے کیا نتیجہ اخذ
کیا ہو۔ کیا اثر لیا ہو لیکن تم اعلیٰ ظرف انسان ہو۔ میں مطمئن ہوں۔ ویسے تمہارا نام مجھے
اب تک نہیں معلوم ہو سکا۔"

"شکریہ تنویر! دراصل یہ گھرانہ اچانک خبطی ہو گیا ہے ورنہ اس سے قبل یہاں لوگ ایسے نہیں تھے۔ اس پاگل خانے میں میرا تو ذرا بھی دل نہیں لگتا لیکن کیا کر یہاں پیدا ہوئی ہوں' پلی بڑھی ہوں' کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمجھو گے بھی نہیں اور غور بھی مت کرنا ورنہ الجھنوں کا شکار ہو جاؤ گے۔ کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتا دینا۔ صبح کو شیو وغیرہ کر لینا۔ صاف ستھرے ہونے سے آ بیماری دور ہو جائے گی۔ میں چاہتی ہوں تم یہاں سے تندرست ہو کر جاؤ اور پھر جتنے رہو گے وقت اچھا گزرے گا۔ ہاں ایک بات کہوں ان گدھوں میں سے کسی کی باتوں مت آنا۔ تم دیکھ ہی چکے ہو گے یہ گھر پاگل خانے سے کم نہیں ہے۔"

"نہیں' ایسی بات نہیں ہے لیکن میں نہیں سمجھا آپ کن گدھوں کی بات کر ر ہیں؟"

"خاص طور سے جبار اور توصیف کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ یہ دونوں ذ مریض ہیں۔ عملی زندگی میں ناکام ہو کر دوسروں کے سہاروں کے عادی ہو گئے ہیں ا پوری زندگی عیش و عشرت کے خواب دیکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔" لڑکی کے لہجے م نفرت ابھر آئی۔

"آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے' مس شمامہ؟"

"رشتہ' مجھے اس لفظ سے گھن آتی ہے۔ انسان رشتوں کے بندھن میں بندھ کر کس قدر مجبور ہو جاتا ہے' سب اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں کوئی کسی کو پسند کرتا ہے کسی کو ناپسند لیکن یہ لفظ اتنا تلخ ہے کہ بس۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ لوگوں کو خود پر مسلط رکھنا پڑتا ہے۔ جبار میرے چچا کا بیٹا ہے۔ چچا جان اپنے حصے کا ترکہ اڑا کر قلاش ہو گئے بیوی مر گئی' بیٹے سمیت یہاں آ پڑے اور پھر خود بھی ختم ہو گئے۔ جبار صاحب رشتے کے سانپ بنے ہوئے ہمارے سینے پر سوار ہیں اور اس پورے گھر کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ ڈیڈی انہیں مرحوم بھائی کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں حالانکہ یہ شخص اپنے ناکارہ باپ سے ذرہ بھی مختلف نہیں ہے اور اگر .... اگر وہ ڈیڈی کو اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو گیا تو .... تو میں دعویٰ سے کہتی ہوں کہ ایک دن وہ بھی قلاش ہو جائے گا اور ڈیڈی کی روح عرش پر بھی سکون نہ پا سکے گی۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے اور ڈیڈی [illegible]"

"اوہ! کیا خواجہ صاحب۔"

"ہاں لیکن میں خودسر ہوں اور ڈیڈی مجھ سے اوپر نہیں جا سکتے چنانچہ بات اس پر چھوڑ دی گئی ہے کہ جبار مجھے تیار کرے اور وہ گدھا ان کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ جانتے ہو وہ کوششیں کیا ہیں۔ وہ ایک بے ضمیر درباری کی طرح میری اور میرے ڈیڈی کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔ بس ایک کٹھ پتلی کی مانند گردش کرتا رہتا ہے۔ کیا ایسے شخص کو زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے چنا جا سکتا ہے؟"

"نہیں ایسا شخص کبھی اچھا انسان نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔

"ڈیڈی کو بتاؤ۔ ڈیڈی کو سمجھاؤ جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے جو رشتوں کے سانپ پالے ہوئے ہیں اور اس کے زہر سے ناآشنا ہیں۔"

"توصیف کون ہے؟" میں نے پوچھا اور اس نے لمبی سانس لی چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"ڈیڈی کی آنکھیں کھولنے کے لئے وقت کا ایک تازیانہ ہے جسے توصیف کہتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو اسے ایک ایسا بلیک میلر کہہ سکتے ہو جسے ڈیڈی نے اٹھارہ سال تک پرورش کیا ہے۔" میں تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں نہیں سمجھا مس شمامہ!"

"اٹھارہ سال قبل جب میں صرف ایک سال کی تھی۔ میری امی فوت ہو گئی تھیں۔ میں نے ماں کی شکل میں آنٹی زیبا کو دیکھا تھا۔ انہوں نے درحقیقت مجھے ماں کی طرح پرورش کیا تھا۔ جب رشتوں ناتوں کی تمیز ہوئی تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ زیبا آنٹی میری ماں نہیں ہیں بلکہ ایک بیوہ خاتون ہیں جنہیں ڈیڈی نے میری پرورش کے لئے رکھ لیا تھا۔ زیبا آنٹی اپنے ساتھ توصیف کو بھی لائی تھیں اور اس کے بعد توصیف نے بھی اسی کوٹھی میں پرورش پائی ہے لیکن.........." شمامہ کے چہرے پر نفرت کے آثار ابھر آئے۔ میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور جب وہ دیر تک کچھ نہ بولی تو میں نے ہی اسے ٹوکا۔

"آپ خاموش ہو گئیں مس شمامہ!"

"نفرت ہو رہی ہے اس دنیا سے' شدید نفرت۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"ڈیڈی اگر چاہتے تو کیا دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے کوئی انہیں روکنے والا تھا۔ [illegible] کوئی روکتا انہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"انہوں نے اپنی دلچسپیوں کا رخ موڑ لیا۔ نوادرات کے وہ پہلے ہی شوقین تھے ا
کے بعد انہوں نے اپنی زندگی نوادرات جمع کرنے میں گم کر دی۔ زیبا آنٹی بہت نیک
تھیں۔ ایک ماں کی مانند نرم خو اور محبت کرنے والی لیکن جو سوغات وہ ڈیڈی کے لئے
چھوڑ گئیں وہ کسی مکروہ خون کا نتیجہ تھی۔ ایک بیٹے نے دولت کے لئے مردہ ماں پر کیچڑ
اچھال دی۔ توصیف کہتا ہے کہ میرے ڈیڈی نے زیبا آنٹی سے نکاح کیا تھا یا نہیں کیا
لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ ان کے زیبا آنٹی سے بیویوں جیسے تعلقات تھے اس نے بچپن
آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔"

"اوہ۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"کیا زیبا آنٹی مر چکی ہیں؟"

"ہاں وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"اس نے یہ الزام خواجہ صاحب کے منہ پر لگایا ہے؟"

"ہاں' صاف صاف۔"

"خواجہ صاحب نے کیا جواب دیا؟"

"ایک ہفتہ بیمار رہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا اور بس۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے۔"

"انہوں نے توصیف کو گھر سے نکال کیوں نہیں دیا؟"

"بزدل ہیں۔ زمانے کے سامنے کوئی مسئلہ لے کر نہیں آ سکتے۔ بری طرح ڈرتے
ہیں میں ان سے بات کر چکی ہوں۔"

"لیکن بظاہر تو وہ بہت غصہ ور ہیں اور یوں لگتا ہے کہ توصیف اور جبار ان سے
ڈرتے ہیں۔"

"بے وقوف بنانے کے گر ہیں سارے۔ وہ اوپر سے سخت اور اندر سے بہت نرم
ہیں۔ عزت کا خوف بری طرح ان پر مسلط ہے۔ کچھ نہیں کر سکتے وہ اس دنیا میں اور وہ
لوگ ان کی اسی سادگی اور بزدلی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"توصیف معذور ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بھی اس کی اپج ہے۔ کون اسے ان
ڈراموں سے روک سکتا ہے۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اس کی
ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ وہ ٹانگوں میں شدید درد کی شکایت کرتا رہا اور جلد ہی تو
معذوری ظاہر کر دی۔ پھر اس کے لئے کرسی آ گئی۔ ٹانگوں کا علاج اس نے پسند نہیں
کیا۔ اب بھی جب تک وہ چاہتا ہے کرسی پر بیٹھا رہتا ہے اور جب چاہتا ہے پیدل چلتا
ہے۔"

"ارے .... لیکن کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"کاش اس سوال کا جواب کسی کے پاس ہوتا۔" شامہ نے گہری سانس لے کر کہا پھر
بولی۔

"دراصل یہ سب ڈیڈی کو پاگل کر دینے کے چکر میں ہیں اور ڈیڈی ان کے ہاتھوں
میں کھیل رہے ہیں۔"

"جمیل کون ہے؟"

"ڈیڈی کا سیکرٹری۔"

"وہ کس قسم کا آدمی ہے؟"

"وہ آدمی نہیں سیکرٹری ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" شامہ نے جواب دیا اور
میں گردن ہلانے لگا۔ تب وہ چونک پڑی۔

"میں بھی بے وقوف ہوں۔ خواہ مخواہ تمہیں ان چکروں میں الجھا بیٹھی۔ تم خود ہی
بیمار ہو' ہاں اگر میری ایک درخواست مان سکو تو میں تمہاری شکرگزار ہوں گی۔"

"ضرور مس شامہ کہئے۔"

"چند روز یہاں قیام کرو۔ میں اس ماحول سے بری طرح اکتائی ہوئی ہوں۔ چند روز
تو آرام سے گزر جائیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن دوسرے لوگ.........." میں نے کہا اور وہ غصے
میں بپھر گئی۔

"بزدل صرف ڈیڈی ہیں میں نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے دوہری شخصیت اختیار کر
رکھی ہے۔ بظاہر وہ خوشامدی اور ڈرپوک نظر آتے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ ڈیڈی
کی صلح پسند طبیعت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن میں ان سب لوگوں سے نمٹنے کی
صلاحیت رکھتی ہوں۔ ان کی مجال نہیں ہے کہ میرے راستے میں آئیں۔ جب میں تمہیں
یہاں روکنا چاہتی ہوں تو کس کی مجال ہے کہ اعتراض کرے۔" اس نے غصیلے انداز میں
کہا۔

[illegible] صاحب کون ہیں جن کے بارے میں آپ نے خواجہ صاحب

کو دھمکی دی تھی۔"

"اونہہ۔ ایک فضول سے شاعر ہیں۔ اکثر دو چار ماہ کے لئے یہاں آ پڑتے ہیں ڈ کے پرانے شناسا ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں' عیش کرتے ہیں۔ کہتے یہ ہیں کہ شاعری کا انہیں اس پُر فضا مقام پر لے آتا ہے لیکن اصلیت میں جانتی ہوں جب لوگ ادھار دینا بند کر دیتے ہیں تو وہ ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ تم نے وہ لطیفہ تو سنا ہو گا کہ ایک صاحب قبض کی دوا لینے کے لئے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں مؤثر دوا دے دی جو قبض کشا تھی لیکن حضرت کو افاقہ نہیں ہوا۔ دوسرے دن پھر اور ڈاکٹر کو کیفیت بتائی۔ ڈاکٹر نے دوا بدل دی لیکن جب تیسری اور آخری دوا بھی کا نہ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پریشان ہو گئے انہوں نے کہا بھائی اس کے علاوہ تو میرے پاس دوا نہیں ہے۔ ویسے تم کرتے کیا ہو۔ شاعر ہوں۔ حضرت نے جواب دیا اور ڈاکٹر نے پیٹ لیا پھر جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر انہیں دیا اور بولے۔ میاں بلاوجہ تم نے مجھے پریشان کر رہے ہو۔ جاؤ یہ پیسے لے جا کر پہلے کچھ کھا پی تو لو۔ تو اپنے مظ صاحب بھی قبض کشائی کے لئے یہاں آ جاتے ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ میں بھی مسکرا دیا۔

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب آرام کرو۔ یوں بھی بیمار آدمی ہو اور ہاں یہاں کے حالات سے بددل مت ہونا۔ تمہیں کسی طرح کے تردد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں کے ماحول سے کافی حد تک واقف ہو چکے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔

خوبصورت عمارت کی پہلی رات میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ بہت سے خیالات ذہن میں تھے اور پھر نیند آ گئی۔ دوسری صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ ملحقہ غسل خانے میں شیونگ وغیرہ کا سامان رکھوا دیا گیا تھا۔ میں نے شیو اور غسل کر کے لباس تبدیل کر لیا۔ پھر غسل خانے سے باہر نکلا تھا کہ ملازمہ نظر آئی جو میرا انتظار کر رہی تھی میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"شمہ بی بی نے بھیجا ہے اور پوچھا ہے کہ طبیعت کیسی ہے؟ یہ بھی کہا ہے کہ اگر طبیعت ٹھیک ہو تو ناشتہ دوسروں کے ساتھ ہی کریں۔ کیا جواب دوں؟"

"طبیعت اب ٹھیک ہے۔ ناشتے کے لئے مجھے بلا لینا۔" میں نے کہا۔

ملازمہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں لباس وغیرہ درست کرنے لگا اور مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ملازمہ ناشتے کے لئے بلانے آ گئی تھی۔ ناشتے کے کمرے میں سبھی موجود تھے۔ جبار اور توصیف بھی تھے۔ توصیف اس وقت بھی معذوروں کی کرسی پر

تھا جو ڈائننگ ٹیبل سے لگی ہوئی تھی۔ شمہ نے تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بے تکلفی سے بولی۔

"ہیلو تنویر! اب تمہاری حالت کافی بہتر معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں' مس شمہ! آپ کی عنایت ہے۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس کے باوجود ابھی تم بھاری غذا سے پرہیز کرو' بیٹے! ابلے ہوئے انڈے اور سلائس لے لو۔ دو ایک دن پرہیز ضروری ہے۔" خواجہ صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ اس وقت ان کے لہجے میں مجھ سے ناپسندیدگی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔

دوسرے لوگوں سے تو میری ملاقات ہو چکی تھی لیکن مظلوم صاحب کی شخصیت اجنبی تھی۔ شکل و صورت سے بھی شاعر ہی نظر آتے تھے۔ طبیعت میں کسی قدر کھردرا پن تھا اور خوبی یہ تھی کہ انہیں شعروں کی بدہضمی نہیں تھی اس لئے گوارہ تھے۔ ناشتے کی میز پر کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔ ماحول میں تکدر سا تھا اس کے بعد سب اٹھ گئے۔ شمہ بے تکلفی سے میرے ساتھ باہر آ گئی تھی۔

"آج دن کا کیا پروگرام رکھا جائے؟ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تو میری تصویر بناؤ۔" اس نے کہا۔

میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ میں پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ میں تجریدی آرٹ بناتا ہوں اس لئے کوئی پریشانی نہیں تھی البتہ نہ جانے کہاں سے مظلوم صاحب نے ہماری گفتگو سن لی اور ہمارے درمیان آ دھمکے۔

"شاعری اور مصوری بہت نزدیک ہیں اس رشتے سے میں تمہارے نزدیک آ سکتا ہوں۔" وہ بولے۔

"جی نہیں۔ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آپ ڈیڈی سے رشتے جوڑیئے۔" شمہ نے رکھائی سے کہا۔

وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر آگے بڑھ گئے۔ شمہ مجھے باغ کے ایک حصے میں لے گئی۔ ملازم سے اس نے رنگ اور برش منگوا لئے تھے۔ میں نے ایک کینوس خراب کرنا شروع کر دیا۔ جو کچھ میں بنا رہا تھا اس پر خود بھی شرمندگی تھی لیکن بہرحال کیا کیا جاتا۔

دو گھنٹے تک کام ہوا اس کے بعد خود شمہ نے ہی منع کر دیا۔ اس کے خیال میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لنچ پر بھی سب ساتھ رہے البتہ ڈنر ٹیبل پر خواجہ

صاحب موجود نہیں تھے۔ یوں اس مکان میں دوسری رات گزری اور پھر مزید دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں گہری نگاہوں سے حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا یہاں موجود سار کرداروں کی دلچسپی اپنی اپنی جگہ برقرار تھی۔ جبار اور توصیف ایک دوسرے سے نفر کرتے تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے کی کاٹ میں مصروف رہتے تھے۔ ثمامہ سب پر حا تھی اور اس کے سامنے آنے سے سبھی کتراتے تھے۔ میں ایک ایک کی فطرت کا تجزیہ رہا تھا۔

لیکن یہ رات ذرا دلچسپ ثابت ہوئی۔ ڈنر ٹیبل پر ہی میں نے خواجہ صاحب آنکھوں میں حیرت دیکھی تھی۔ نہ جانے کیوں بار بار مجھے گھور رہے تھے اور ان کی ا حرکت میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے شبہ ہو گیا چنانچہ میں نے تھکن کا اظہار کیا ا جلدی ہی اپنی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ ثمامہ وغیرہ نے فراخ دلی سے مجھے اجازت دے د تھی۔ جلد ہی میرے شبہے کی تصدیق ہو گئی۔ دروازے پر آہستگی سے دستک ہوئی تھی میں نے دروازہ کھول دیا۔ خواجہ صاحب کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"میں نے ڈنر ٹیبل پر ہی آپ کے چہرے کے تاثرات پڑھ لئے تھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو تم وہی ہو؟" خواجہ صاحب کی آواز میں سرسراہٹ سی تھی۔

"کون؟"

"تنویر واسطی فرام سپیشل برانچ۔"

"شاہد حسن محمود صاحب سے آپ کی بات چیت ہوئی ہے؟"

"ہاں میں نے انہیں یاددہانی کے لئے فون کیا تھا۔ انہوں نے یہ خبر سنائی کہ ان کا نمائندہ یہاں پہنچ چکا ہے۔ تب تمہارے بارے میں گفتگو ہوئی اور میں حیران رہ گیا۔ تاہم مجھے تمہارے طریقہ کار سے اتفاق ہے اور میں تمہاری ذہانت سے متاثر ہوا ہوں۔" خواجہ صاحب بولے۔

"شکریہ خواجہ صاحب۔"

"حالات تو تمہارے علم میں ہوں گے؟" خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"حالات نہ کہیں خواجہ صاحب! میری معلومات عام لوگوں سے زیادہ نہیں ہے یعنی آپ کے عجائب گھر کی وہ دیوار میرے علم میں ہے جس کا ایک حصہ ضائع ہو چکا ہے... ہر قیمت پر درست کرانا چاہتے ہیں اسی دیوار کی درستگی کے لئے آپ نے میر حمید کی خدمات حاصل کی تھیں جسے قتل کر دیا گیا۔ قتل کی بات دب گئی تھی لیکن آپ کی خواہش پر دوبارہ اس کے بارے میں تحقیقات شروع کی گئی ہیں۔ بس اس سے زیادہ میرے علم میں کچھ نہیں ہے۔"

"ہوں۔ سارے معاملات یہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ میرے اردگرد جو لوگ پھیلے ہوئے ہیں ان کی تعداد مختصر ہے۔ تم جائزہ لے چکے ہو گے۔ ممکن ہے تمہیں ان لوگوں کے بارے میں تفصیل بھی معلوم ہو گئی ہو۔"

"رشتوں کی نوعیت معلوم ہوئی ہے۔ ہم اسے تفصیل تو نہیں کہہ سکتے؟"

"یہی بات اہم ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل کچھ نہیں ہے۔ جبار میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ گو اپنے بھائی سے میرے تعلقات بہتر نہیں رہے لیکن اس کی موت کے بعد جبار کا میرے علاوہ کوئی نہیں رہا تھا۔ اس لئے میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں اور میری یہی خواہش تھی کہ میں ثمامہ کی شادی جبار سے کر کے اس خاندان کو استحکام بخشوں۔"

"کیا ثمامہ اس بات سے خوش ہے؟"

"نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جبار کو زیادہ پسند نہیں کرتی لیکن یہ بات بھی میرے علم میں ہے کہ اس کا مرکز نگاہ کوئی اور بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں میرے لیے جبار سے بہتر اور کوئی نوجوان نہیں ہو سکتا۔"

"ثمامہ سے آپ نے اس بارے میں گفتگو کی ہے؟"

"ہاں کی ہے۔ اس نے صاف کہا کہ وہ جبار کو پسند نہیں کرتی لیکن یہاں میں اس کی پسند اور ناپسند کا احترام نہیں کروں گا۔ ان معاملات میں اس خاندان کی بہتری کی ذمہ داری مجھ پر آتی ہے۔"

"تعجب ہے۔ حالانکہ میرے خیال میں ثمامہ اپنی ایک رائے رکھتی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ لوگ اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔"

"میں نے ساری زندگی اس کی ناز برداریاں کی ہیں اور اسے برتری دی ہے لیکن اس کے برے بھلے کا فیصلہ کرنے کا حق مجھے ہے۔ میں یہ حق استعمال کروں گا۔" خواجہ صاحب کی آواز ٹھوس تھی۔

"ٹھیک ہے گویا آپ جبار سے ثمامہ کی شادی کریں گے؟"

"ہاں یہ یقینی امر ہے۔"
"شامہ اور جبار کو آپ کے اس فیصلے کا علم ہے؟"
"کسی حد تک۔"
"جبار کی کیا کیفیت ہے؟"
"وہ خوش ہے۔"
"اب بات توصیف کی رہ جاتی ہے۔ معاف کیجئے گا خواجہ صاحب! آپ نے اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت کی دعوت دی ہے اس لیے میں آپ سے ذاتی بھی کروں گا۔ توصیف کے بارے میں وضاحت چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور صاحب کسی قدر شرمندہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے بولے۔
"گویا تمہاری معلومات کافی وسیع ہیں۔ ہاں توصیف ایک بد کردار نوجوان ہے کی ماں میرے لیے ایک محسنہ' ایک بہن کی حیثیت رکھتی تھی۔ شامہ کی پرورش نے میری بھرپور مدد کی اور اسی ناتے سے میں نے توصیف کو بھی اپنی اولاد کی مانند لیکن اس نے میری جائیداد میں حصہ بنانے کے لیے اپنی مرحوم ماں پر ایک شرمناک لگایا اس سے اس کی بد کرداری کا پتا چلتا ہے۔ وہ بے حد مکار نوجوان ہے۔ معذور کرسی پر رہتا ہے لیکن اس کی ٹانگیں درست ہیں۔ بے شمار ڈاکٹر اسے چیک کر۔ اور ان کی متفقہ رائے ہے کہ اس کی ٹانگوں میں یا دوسرے جسمانی نظام میں کوئی نہیں ہے لیکن وہ نہیں مانتا۔ میں نہیں جانتا اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے اور بات سے خوفزدہ ہوں۔ میں اس کے دل کی گہرائیوں کے بارے میں کچھ نہیں حالانکہ ابتدا ہی سے میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میں اسے جائیداد میں اس کا ایک ضرور دوں گا تاکہ اس کی ماں کے تعاون کا بدل ہو سکے لیکن .... نہ جانے وہ ہے؟"
"خواجہ صاحب! شامہ کی رگوں میں آپ کا خون ہے اور بظاہر توصیف کا کوئی جذباتی یا خونی رشتہ نہیں ہے؟"
"ہاں۔ میں سمجھا نہیں۔"
"توصیف جبار کی جگہ تو نہیں لینا چاہتا؟"

ہے جنن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے یہ تصور بھی ختم ہو جاتا ہے۔"
"شامہ توصیف سے بھی نفرت کرتی ہے؟"
ہاں۔ وہ سادہ لوح لڑکی ہے اس کے اندر فریب نہیں ہے۔ اس لیے وہ فریبوں سے نفرت کرتی ہے۔"
"خیر خواجہ صاحب! یہ تو ہوئیں ان لوگوں کی باتیں۔ اب ہم میر سعید کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ آپ نے اسے اس دیوار کی تکمیل کے لیے بلایا تھا؟"
"ہاں۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ میر سعید کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ وہ ایک سچا مصور تھا۔ حقیقی فنکار تھا۔ میں نے اس دیوار کی تکمیل کے لیے بڑے بڑے ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن مجھے مطمئن کرنے والا وہ واحد انسان تھا اور اس کی ایک وجہ بھی تھی۔"
"وہ کیا؟"
"میر سعید اپنے فن کا سچا تھا۔ مصریات سے اسے دلچسپی ضرور تھی مگر ان ماہرین کے برابر نہیں۔ اسے معلومات نہیں تھیں لیکن اس نے اپنے فن کی سچائیوں کو پکارا اور جذبات میں ڈوب کر وہ نقش ترتیب دیئے جو اس دیوار کا حقیقی حصہ تھے اور جنہیں میرے ذہن نے بھی قبول کر لیا تھا۔ وہ اگر زندہ رہتا تو یقیناً میری اس آرزو کی تکمیل ہو جاتی۔"
"کیا اس نے ان نقوش کو ڈیزائن کیا تھا؟"
"ہاں اس نے انہیں کئی طرح سے ڈیزائن کیا تھا اور بالآخر ان کی حقیقت پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"
"کیا اس نے یہ نقوش کاغذ پر اتارے تھے؟"
"ہاں ایک فائل ترتیب دی تھی اس نے۔ میں اسے لایا تھا۔" خواجہ صاحب نے ایک فائل اپنے لباس سے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی۔
"یہ وہ نقش ہیں جو میر سعید نے ترتیب دیئے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں اس نے کافی محنت کی تھی۔ یہ فوٹو گراف دیکھو۔ یہ دیوار میرے عجائب گھر میں موجود ہے اور میر سعید نے اپنے نقوش اس سے منسلک کر کے یہ دوسرے فوٹو گراف بنائے ہیں۔ یہ وہ آخری تصویر ہے جس سے میں مطمئن تھا .... لیکن ...." خواجہ صاحب خاموش ہو گئے۔

"میں کچھ سوالات کروں گا خواجہ صاحب۔"

"ضرور۔"

"میر سعید کے قتل کے بارے میں آپ نے پولیس کو رپورٹ دی تھی۔ میں یہاں آنے سے قبل ساری فائل دیکھی ہے۔ پولیس نے اس قتل کو ایک پُراسرار دے دیا ہے اور قاتل کو نامعلوم قرار دیا ہے اس میں صرف آپ کی کوششیں شامل یا در حقیقت پولیس ناکام رہی تھی۔"

"مجھے یقین ہے تنویر بیٹے! تم اس وقت تک میری باتوں کو غلط نہیں سمجھو گے تک میری گفتگو میں کوئی جھوٹ یا میرے کردار میں کوئی خامی نہ تلاش کر لو۔ بظاہر پو یہ کیس ختم ہی کر چکی ہے لیکن میں نے خود تمہیں دعوت دی ہے۔ یہ بات بھی تم معلوم ہے اس سے کم از کم یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔" خواجہ صاحب بھاری لہجے میں بولے۔

"مجھے یقین ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس دیوار کو یہاں نصب کرائے طویل وقت گزر چکا ہے لیکن پچھلے چند ماہ عجائب گھر میں کچھ پُراسرار واقعات پیش آنے لگے ہیں۔ تمام چیزیں اپنی جگہ چھوڑ دیتی اور عجیب عجیب خوشبوئیں بکھر جاتی ہیں۔ تمہیں حیرت ہو گی کہ ایک بار راعلاف کے نقوش کے نیچے مجھے قدیم ترین دور کے کپڑے کی ایک چادر بھی ملی تھی اور سونے کا ا زیور بھی جو میرے تجربے کے مطابق دور فرعون کا ہی تھا۔ میں نے یہ دونوں چیزیں محفو کرلی تھیں لیکن پھر وہ غائب ہو گئیں۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے کہ عجائب گھر کے بند ہونے کے بعد وہاں کچھ نادیدہ قوتیں مصروف عمل ہو جاتی ہیں۔ میں نے اکثر راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ صرف اس خیال کے تحت کہ حقیقت معلوم کروں لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ میر سعید کو میں نے ٹھیک انسان پا کر ہی ہر وقت عجائب گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی اور در حقیقت اس فنکار کو وہاں کی قیمتی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے کام کا جائزہ لینے وہاں جاتا تھا اور وہ اسی اثناء میں قتل ہو گیا۔"

"اس کی موت کے وقت آپ کے ذہن پر کیا تاثر تھا؟"

"یہی کہ وہ کسی پُراسرار موت کا شکار ہوا ہے۔"

"اور اب؟" میں نے سوال کیا۔ خواجہ صاحب کسی قدر پریشان ہو گئے چند ساعت خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔

"اب میرے ذہن پر یہ تاثر ہے کہ کسی نے ان پُراسرار حالات کا سہارا لے کر اسے قتل کیا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ کسی نے ان پُراسرار حالات کو اور زیادہ پُراسرار بنانے کی کوشش کی ہے۔"

"کس نے؟" میں نے خواجہ صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہی فیصلہ کرنے کے لیے تو میں نے تمہیں زحمت دی ہے۔" خواجہ صاحب میرے سوالات سے کسی قدر تنگ آ گئے تھے۔

"شکریہ خواجہ صاحب! میں ضرور حقیقت حال افشا کردوں گا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ آپ کا شبہ معلوم کروں۔ آپ کا یہ خیال میرے لیے بہت معاون ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا خیال گھر کے لوگوں ہی کی طرف ہے لیکن خواجہ صاحب! ان میں سے کوئی اگر مجرم ہوا تو آپ کے لیے بڑی مشکل پیش آئے گی۔ کیا آپ اسے قانون کے حوالے کرنے پر تیار ہو جائیں گے؟"

"یہ سب کچھ میری اپنی ملکیت ہے۔ اپنی میراث کے لیے میں سازشوں کو برداشت نہیں کروں گا' خواہ وہ کوئی ہو۔ میں ان سب کو چاہتا ہوں لیکن دولت کے حصول کے لیے ان کا جنون مجھے پسند نہیں ہو گا۔ مجرم کو سامنے آنا چاہئے خواہ وہ کوئی ہو۔"

"ہوں۔" میں نے گردن ہلائی۔

"کیا آپ مجھے وہ عجائب گھر نہیں دکھائیں گے؟"

"ضرور۔ ابھی یا کل؟" خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"کل دن میں مناسب رہے گا۔ ویسے میر سعید کی بات ابھی تک الجھی ہوئی ہے۔ آخر اس بے چارے کا ان معاملات سے کیا تعلق تھا وہ تو بے ضرر انسان تھا۔ تاہم آپ مطمئن رہیں جس لیے آپ نے مجھے بلایا ہے میں وہ کام ضرور پورا کروں گا۔"

"میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔"

"بہتر۔"

"جس تعاون کی ضرورت تمہیں پیش آئے مجھے پیچھے نہ پاؤ گے۔ بات کتنی ہی سنگین ہو مجھ سے کہہ سکتے ہو۔"

"بہت بہتر۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خواجہ صاحب رسمی الفاظ ادا کر کے باہر نکل گئے ان کے جانے کے بعد میں نے

تھے۔ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا کہ مجرم کون ہے؟

دوسری صبح حسب معمول تھی۔ دن میں شامہ نے مجھے تصویر مکمل کرنے کے لیے پکڑ لیا۔ کینوس پر میں نے کیا کیا تھا یہ میں خود بھی نہیں جانتا تھا میں نے ایک خوبصورت سی بوتل بنائی تھی جس پر سر بھی تھا اور آج یہ تصویر مکمل ہوئی تھی۔ میں نے اسے آخری ٹچ دیئے اور رنگ اور برش احترام سے شامہ کے قدموں میں رکھ دیا۔ شامہ کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ شام کو اس نے تصویر کی نقاب کشائی کا اہتمام کیا۔ اس میں خواجہ صاحب مظلوم صاحب' جبار' جمیل اور توصیف شامل تھے۔

دوسرے لوگوں کی کیفیت تو جو بھی رہی ہو لیکن مظلوم صاحب سخت پریشان تھے کینوس کی بوتل کو ہر زاویے سے دیکھ رہے تھے اور جب ان سے نہ رہا گیا تو بول پڑے۔

"بڑے بھائی! تصویر تو دیکھ لی اب اللہ کے لیے اس کا ترجمہ بھی کر ڈالو ورنہ میں بیمار پڑ جاؤں گا۔"

"تجریدی آرٹ مصور کے جذبات کا عکس ہوتا ہے' مظلوم صاحب! اس میں ماحول اور شے کے بارے میں صرف اپنے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ مس شامہ ایک خوبصورت خاتون ہیں میں اس تصویر کو ان کا پیکر دے سکتا تھا لیکن یہ ان کے اوصاف کا عکس ہے۔ آپ ان لکیروں کو کسی خم سے بے نیاز پاتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت کی سادگی کی ترجمان ہیں۔"

"اور یہ بوتل!"

"یہ ایک معصوم لڑکی کے جذبات کی گہرائی کا سمبل ہے۔ اتنی سادگی کے باوجود وہ ہر تلخی کو خود میں چھپا سکتی ہے۔ یہ عورت کی پاکبازی کا اظہار ہے۔"

"اور یہ درمیان میں رنگ برنگے دھبے؟" مظلوم صاحب نے متاثر ہو کر پوچھا۔

"یہ وہ معصوم خواہشات ہیں جن سے کوئی بھی سادہ سے سادہ وجود محروم نہیں۔ جس کی پذیرائی اور احترام ہر ذی روح پر فرض ہے۔ اس سادگی کا تحفظ ضروری ہے ورنہ عورت بدنما ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ مگر میرے بھائی ان اوصاف کو تحریری شکل میں دینا ضروری ہے ورنہ عام لوگ کیا سمجھیں گے؟"

"مس شامہ کوئی نمائشی چیز تو نہیں ہیں۔ سمجھنے والے خود سمجھ لیں گے۔ ہاں اگر

صاحب چونک پڑے۔

"واللہ کیا خوبصورت خیال دیا ہے۔ تمہاری تصویر کے نیچے میرا قصیدہ۔ چار چاند لگ جائیں گے اس میں۔" وہ جھوم کر بولے۔

"شکریہ مظلوم صاحب! آپ کا بوڑھا قصیدہ اس حسین تصویر کا سارا حسن ختم کر دے گا۔ اسے یوں ہی رہنے دیں۔" شامہ نے رکھائی سے کہا۔

مظلوم صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بول سکے تھے۔

شامہ تصویر کو اپنی خواب گاہ میں لے گئی تھی اور میں خواجہ صاحب کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

"تمہاری چالاکیوں پر پیار آنے لگا ہے۔ بلاشبہ تم ایک ذہین نوجوان ہو۔ فن مصوری سے کیا واقعی لگاؤ ہے؟"

"ٹین ڈبے اور خالی بوتلیں بنانے میں کیا مشکل پیش آتی ہے؟ نئے دور نے تجرید کے سہارے بتوں کی عزت رکھ لی ہے۔ ورنہ اس حیثیت سے یہاں داخل ہونے میں کافی مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔

خواجہ صاحب مسکراتے رہے۔ پھر وہ مجھے اپنے نایاب عجائب گھر میں لے گئے۔ قابل دید جگہ تھی ایسی ایسی نایاب چیزیں موجود تھیں کہ میں بھی کھو کر رہ گیا قدیم تہذیب' تاریخ کے ایسے ایسے بیش بہا نوادرات جو انسان کو نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کراتے تھے۔ اس کے بعد میں نے راعلاف کی وہ دیوار دیکھی جس کا ایک حصہ بدنما ہو گیا تھا۔ ہزاروں سال قبل کے کاریگروں کی صناعی نگاہوں کے سامنے تھی۔ راعلاف کی مخصوص شبیہہ جیتی جاگتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آج بھی اس قدر روشن اور نمایاں تھی کہ یقین نہ آتا تھا کہ اس قدر پرانی ہے۔ پھر میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں میر سعید کی لاش ملی تھی اور باریک بین نگاہوں سے قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران میں نے خواجہ صاحب پر بھی نگاہ رکھی تھی لیکن ان کے کردار میں ایک تشویش زدہ انسان کے علاوہ کوئی اور جھلک نظر نہیں آئی۔ کافی وقت وہاں گزار کر ہم دونوں باہر آ گئے۔

پھر خواجہ صاحب تو چلے گئے اور میں یونہی عمارت کے اردگرد چہل قدمی کرنے لگا۔ اس وقت میں ایک برآمدے سے گزر رہا تھا کہ مجھے دور سے توصیف نظر آیا جو کرسی دھکیلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

ہوئے کہا۔

"کیا تم بھی اپنی تجرید چاہتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ نہیں! میری تو قدرتی تجرید ہو چکی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کرسی میرے بدن کا جزو بن گئی ہے۔" اس نے تلخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سوری توصیف! مجھے افسوس ہے لیکن میں تمہاری اس بیماری کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہاں رہنے والوں نے بتایا ہو گا۔ ان کے خیال میں' میں نے اپنی ذات سے دلچسپ مذاق خود کیا ہے۔"

"نہیں' مجھ سے ایسی بات کسی نے نہیں کی لیکن آخر بیماری کیا ہے؟"

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ کچھ نہیں ہے لیکن میرے بدن کو سنبھالنے والے ستون بے حد کمزور ہو چکے ہیں۔ میں کھڑا ہو سکتا ہوں' قوت ارادی سے کام لے کر بھی سکتا ہوں لیکن یہ ستون اس کے بعد لرزنے لگتے ہیں۔ اتنا شدید درد ہوتا ہے ان کہ میں بیان نہیں کر سکتا ہے۔" توصیف نے مظلومیت سے کہا۔

"ملک سے باہر جا کر علاج کیوں نہیں کراتے؟"

"دلچسپ سوال ہے۔ کیا یہ سوال تم نے سڑکوں پر گھسٹتے ہوئے لاتعداد لوگوں بھی کیا ہے؟" توصیف نے پوچھا۔

"ان میں اور تم میں فرق ہے۔"

"بھلا کیا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہارے پاس وسائل ہیں۔ تمہارا تعلق ایک دولت مند خاندان سے ہے۔"

"یہی تو بدنصیبی ہے میرے دوست! میری ماں اور باپ نے میرے ساتھ مذاق ہے۔ باپ تو میری پرورش کا بوجھ میری ماں کے کندھوں پر ڈال کر عدم کی جانب فرار گیا ماں مرتے وقت تک اس دولت مند شخص سے یہ اعتراف نہ کرا سکی کہ وہ اس منکوحہ یا داشتہ ہے اور موت کے بعد کون کمانے کے سودے کرتا ہے۔ خواجہ مسرور اسے بہن کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اب کون ان سے اعتراف کرائے۔"

"اوہ! لیکن تمہاری ماں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"معصومیت کی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اس پر غور نہیں کیا اور جب ذہن [illegible]

"میں خواجہ صاحب سے بات کروں؟" میں نے پوچھا۔

"تم.........." وہ گہری آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اجنبیوں سے اس گھر کے تمام لوگ گھبراتے ہیں لیکن تم نہ جانے کیا ہو۔ یہ سب مت کرو' اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو یہ اس خاندان پر احسان ہو گا۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"خواجہ صاحب کی آنکھوں سے پٹی کھول دو۔ جبار نے انہیں اپنی مٹھی میں کس رکھا ہے شامہ میری بہن ہے۔ اگر میں ایک مضبوط انسان ہوتا تو اس کے حقوق کا تحفظ کرتا لیکن میں معذور ہوں اور جبار کی بن آئی ہے۔ شامہ سے شادی کر کے وہ صرف اس دولت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے اس سے زیادہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے اور خواجہ صاحب اس کے لیے تیار ہیں۔ کسی طرح انہیں سمجھا دو کہ ایک اوباش باپ کی اولاد اوباش ہوتی ہے وہ سب کچھ لٹا دے گا۔"

"تم نے خواجہ صاحب سے بات نہیں کی؟"

"کس حیثیت سے کروں؟ میری آواز بے اثر ہے۔ ہاں وہ شکوک و شبہات میں ضرور گھر جاتے ہیں اور پھر جبار کا جال بہت مضبوط ہے۔ میر سعید نے بھی کوشش کی تھی لیکن اس کا نتیجہ۔"

"اس آرٹسٹ کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں بے حد مخلص نوجوان تھا۔ اتنا مخلص کہ لوگ اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا مخلص انسان کیوں قتل ہو گیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

میں بغور توصیف کو دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر تاسف کے آثار تھے اور ان میں بناوٹ نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن یہ اداکاری بھی ہو سکتی تھی۔ جب وہ دن کا بیشتر حصہ کرسی پر بیٹھ کر اپاہجوں کی طرح گزار سکتا ہے تو اس کے لیے یہ اداکاری بھی مشکل نہیں تھی۔

"تو کیا تمہارے خیال میں میر سعید نے اس عمارت کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی کہ اس نے جبار سے شادی کی مخالفت کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

توصیف نے اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

" [illegible] "

"پھر؟"

"شامہ نے اس کی پُرکشش شخصیت میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔" توصیف نے انکشاف کیا اور میں تھوک نگل کر رہ گیا۔ چند ساعت میں اس کے لہجے کی گہرائی پر غور کرتا رہا پھر میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ جبار نے ...."

"بس خدا کے لئے بس۔ میری قبر اس سے زیادہ گہری مت کرو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بول سکوں گا۔ مجھے اجازت دو۔" توصیف نے کہا اور جلدی جلدی کری گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہ گیا تھا۔ ابھی کئی سوال تشنہ تھے۔

توصیف نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی تھی لیکن میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں میں خوب چلتی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ جبار اس سلسلے میں کیا کہتا ہے چنانچہ میں اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور جبار کو تلاش کرنا بھی مشکل نہیں ہوا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"شامہ سے ملے؟"

"نہیں کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"ابھی وہ تمہیں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ مجھ سے بھی پوچھا تھا۔ کہاں چلے گئے تھے؟"

"اپنے کمرے میں ہی تھا۔ نہ جانے شامہ اس طرف کیوں نہیں گئی؟"

"جلدی میں تھی کہیں جا رہی تھی۔"

"کہاں؟"

"وہ اپنے پروگرام کسی کو نہیں بتاتی۔ شہر ہی گئی ہو گی اپنی کسی دوست کے ہاں۔ اکثر ہفتے عشرے میں چلی جاتی ہے۔"

"تنہا؟"

"ہاں۔ وہ بہت خود سر ہے۔ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی۔ جاتے ہوئے شاید تمہیں بتا کر جانا چاہتی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں رات تک واپس آجائے گی۔ ویسے تم نے اس کی تصویر خوب بنائی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم نے اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔"

کیونکہ وہ دوسروں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہوتا ہے ویسے تمہاری کہی ہوئی بات مجھے عجیب لگی ہے۔ شامہ کی خود سری تمہارے لیے تشویشناک نہیں ہے۔ میں نے اس وقت بھی محسوس کیا تھا جب تم میری آمد کی مخالفت کر رہے تھے۔ شامہ کے پہنچتے ہی تم لوگوں نے راہ فرار اختیار کی تھی۔" میں نے کہا۔ جبار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"یہ ابتدائی مراحل ہوتے ہیں۔ جس لڑکی سے شادی ہو اسے یقین دلاؤ کہ کائنات میں تم سے زیادہ سعادت مند اور بزدل شخص کوئی نہیں ہے۔ اگر اسے یقین آگیا تو پھر وہ تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ ہاں شادی کے بعد تمہاری حکمرانی شروع ہوتی ہے۔"

"ہوں۔ تو یہ ارادے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولا۔

"سنا ہے توصیف اس شادی کی مخالفت کر رہا ہے۔"

"وہ میرے لئے بے ضرر چیز ہے۔ اس کی صرف اتنی ہی خواہش ہے کہ اسے جائیداد میں سے کچھ مل جائے اگر تایا جان نے یہ فیصلہ کیا تو اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" جبار نے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں خواجہ صاحب کی دولت اتنی ہے کہ تمہاری کئی پشتیں بھی اسے خرچ نہیں کر سکیں گی۔ ان کا عجائب گھر بے مثال ہے۔ میرا خیال ہے صرف اس کی مالیت کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ ارے ہاں یہ میر سعید کے قتل کا کیا قصہ ہے؟"

"وہ عجائب گھر اس کوٹھی کی سب سے بھیانک جگہ ہے۔ بدقسمتی سے میں ان مافوق الفطرت چیزوں کا قائل ہوں۔ روحانیت کا وجود ملتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں جب بھی اس عجائب گھر میں جاتا ہوں مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور ر اعلاف کی وہ تاریخ تو مجھے بے حد خوفناک لگتی ہے مجھے یقین ہے کہ میر سعید کسی ایسی ہی چیز کا شکار ہوا ہے وہ زیادہ وقت عجائب گھر میں گزارتا تھا۔"

"اگر یہ بات ہوتی تو کسی اور کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔" میں نے سوال کیا

"پہنچ سکتا ہے۔ تم یقین کرو خود میرے اوپر بعض اوقات عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ بس انوکھے خیالات ذہن میں جگہ بنانے لگتے ہیں۔"

"میر سعید نے کبھی ذات خود بھی ان احساسات کا ذکر نہیں کیا؟"

"وہ ایک سیدھا سادا اور معصوم سا آرٹسٹ تھا اور بس۔ کسی کو اس کی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔"

"ہاں میں نے یہ بات سنی تھی۔ مجھے تعجب ہوا تھا کہ اس معصوم سی جگہ اور کسی کا قتل ہو جائے۔"

"نہیں میرے دوست اس ماحول کی معصومیت مجروح ہو گئی ہے۔ توصیف نے جو گھناؤنا الزام نایا جان پر لگایا ہے وہ بے حد تکلیف دہ ہے۔ کاش وہ اس انداز میں دولت کے حصول کی کوشش نہ کرتا۔ بہرحال اگر اس نے ضرورت سے زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلائے تو پھر مجھے اس کے لیے مناسب بندوبست کرنا پڑے گا۔" جبار نے کہا اور پھر چونک کر کہنے لگا۔

"تم یہاں سے کب واپس جا رہے ہو منصور! یہ ماحول اس قابل نہیں کہ یہاں اجنبی لوگ رہ سکیں۔ میرا مشورہ ہے کہ بس یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ جگہ تمہیں راس نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میں اپنی جگہ خاموش کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ یہ دوسرا پُراسرار آدمی تھا اور میں خواجہ صاحب کے بیان کی روشنی میں ان دونوں پر غور کر رہا تھا۔ میر سعید کن حالات کا شکار ہوا تھا اس کا فیصلہ ابھی مشکل تھا۔ دو متضاد باتیں سننے میں آئی تھیں۔ توصیف نے اشارہ کیا تھا کہ شامہ میر سعید میں دلچسپی لے رہی تھی اور ظاہر ہے جبار یہ بات کسی طور پسند نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے مراد تھی کہ جبار بھی میر سعید کا قاتل ہو سکتا تھا البتہ جبار نے توصیف کا نام اس انداز میں نہیں لیا تھا بلکہ اس قتل کو پُراسرار رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔

شامہ خاصی رات تک واپس نہیں آئی تھی لیکن گھر میں کوئی اس کے لیے فکرمند نہیں تھا۔ سارے کام حسب معمول تھے۔ رات کے کھانے پر بھی شامہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی تھی لیکن وہاں سے واپسی پر جمیل سے ملاقات ہو گئی۔ یہ مرنجاں مرنج قسم کا آدمی تھا اور ابھی تک میں نے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی تھی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہیلو مسٹر جمیل!"

"جناب عالی!" وہ ادب سے بولا۔

"مس شامہ ابھی تک واپس نہیں آئیں؟"

"صبح واپس آئیں گی' فون آیا تھا ان کا۔"

"اوہ! مجھ سے کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔ شہر گئی ہوں گی؟"

"جی ہاں۔ شہر میں ان کی خالہ رہتی ہیں۔"

"کون؟" میں چونک پڑا۔

"سگی خالہ ہیں بیگم توقیر' توقیر صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اور کون کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ماں بیٹے ہیں۔ نادر علی ایک فرم میں اسٹینو ہیں۔ بہت شریف آدمی ہیں انہوں نے ہی مجھے یہاں ملازمت دلائی ہے۔"

"نادر علی کون ہیں؟"

"مس شامہ کے خالہ زاد بھائی۔"

"شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں' ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"یہاں آتے جاتے ہیں؟"

"نہیں جناب! ان لوگوں سے خواجہ صاحب کے تعلقات بہتر نہیں ہیں۔ بس شامہ بی بی ان سے ملتی ہیں۔"

"یہ بات خواجہ صاحب کے علم میں ہے؟"

"خدا کے لیے آپ انہیں نہ بتا دیں۔ میرے منہ سے بے اختیار یہ بات نکل گئی ہے۔ چونکہ میں نادر بھائی کا دوست بھی ہوں اس لیے مجھے معلوم ہے۔ دوسروں کو اس کا علم نہیں ہے۔"

"جب خواجہ صاحب سے ان لوگوں کے تعلقات نہیں تو تمہیں یہاں ملازمت کیسے مل گئی؟"

"نادر بھائی نے مس شامہ سے کہا تھا۔ انہوں نے مجھے یہاں رکھوا دیا۔"

"ٹھیک ہے بے فکر رہو۔ میں بھی کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کروں گا۔ ویسے اس کوٹھی کے حالات عجیب ہیں۔" میں نے بات چھیڑی لیکن جمیل سے مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔

خاصی ذہنی ورزش ہو رہی تھی۔ بہرحال یہ نیا کردار بھی میرے لیے خاصی دلچسپی کا

تینوں پر جاتا تھا۔ ہر کردار کی اپنی کوشش ایک جامع حیثیت رکھتی تھی۔ توصیف، جس نے اس گھر میں عیش و عشرت کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ یہاں سے نکل کر باہر کی دنیا میں وہ کوئی مقام نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی مرحومہ ماں پر بھی الزام لگانے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ وہ ہر جائز ناجائز طریقے سے دولت کے حصول کا خواہاں تھا۔ اس کی فطرت کی مکاری اس بات سے بھی عیاں تھی کہ اس نے کوئی بیماری نہ ہوتے ہوئے خود کو مفلوج کر لیا تھا۔ معمولی بات نہیں تھی اور پھر اس کا مقابل جبار تھا جسے آسانی سے یہ سب کچھ حاصل ہو رہا تھا۔ جو بذات خود کچھ نہیں تھا لیکن خواجہ صاحب کو رام کر کے وہ سب کچھ بنا جا رہا تھا۔ یہ بات توصیف کے لیے تکلیف دہ تھی ممکن ہے توصیف نے میر سعید کو قتل کر کے جبار کے خلاف کوئی جال بچھانے کی کوشش کی ہو اور اس میں ناکام رہا ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ جبار نے توصیف کے خلاف کوئی کمزور کھیل کھیلا ہو۔ ان دونوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔

لیکن اس تیسرے کردار نادر علی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اسے شامہ کی توجہ حاصل تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ خواجہ صاحب سے نادر کے بارے میں بھی معلوم کر لیا جائے۔

دوسری صبح اس کے لیے مناسب تھی۔ شامہ صبح کو بھی نہیں آئی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے خواجہ صاحب کو جا لیا اور خواجہ صاحب مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"کوئی خاص بات مسٹر تنویر۔"

"جی ہاں! کچھ معلومات درکار ہیں۔"

"کہو۔"

"نادر علی کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔ خواجہ صاحب چونک پڑے۔ انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا اور بولے۔

"کیوں خیریت! یہ نام ...."

"براہ کرم مجھے اس کے بارے میں بتائیے۔"

"شامہ کا ننھیالی عزیز ہے۔ غالباً اس کی خالہ کا بیٹا۔"

"آپ سے ملاقات نہیں ہے؟"

"ہاں۔ ابتدا ہی سے کچھ اختلافات چلے آ رہے ہیں جن کی نوعیت سو فیصدی خاندانی قسم کی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم لوگ ایک دوسرے

نہیں ہوتی۔"

"شامہ بھی ان لوگوں سے نہیں ملتی؟"

"وہ کیسے مل سکتی ہے۔"

"یہاں کوئی نہیں آتا؟"

"میں نے کبھی اجازت ہی نہیں دی۔" خواجہ صاحب بولے۔

"شامہ نے کبھی ان لوگوں سے ملاقات کی ضد بھی نہیں کی؟"

"بہت عرصے پہلے کی تھی۔ وہ بھی تنہائی سے اکتا کر لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ میں ان لوگوں سے رابطہ نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے اجازت نہیں دی۔" خواجہ صاحب ناخوشگوار لہجے میں بولے۔

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کی طرف سے سختی کے بعد شامہ نے چھپ کر ان لوگوں سے ملاقات کی ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" خواجہ صاحب غرائے۔

"شامہ خود سر ہے خواجہ صاحب!"

"اس کی خود سری اس لیے قائم ہے کہ وہ نافرمان نہیں ہے لیکن تمہارے یہ سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ شامہ شہر جا کر نادر علی اور اپنی خالہ کے یہاں قیام کرتی ہے اور شاید وہ پچھلی رات بھی وہیں رہی ہے۔" میں نے کہا۔

خواجہ صاحب اچھل کر بے اختیار کھڑے ہو گئے اور مجھے گھورتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ اس اطلاع کا ان پر شدید رد عمل ہوا تھا۔ میں چند ساعت وہیں رکا اور پھر اس کمرے سے نکل آیا۔ خواجہ صاحب برابر کے کمرے میں فون پر کسی سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں الفاظ تو نہیں سن سکا لیکن آواز کافی سخت تھی۔ بہر حال اس سے زیادہ مداخلت میں نے مناسب نہیں سمجھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے بعد کے حالات مجھے معلوم نہیں ہو سکے۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہا تھا لیکن جب ڈیڑھ بج گیا اور مجھے بھوک لگی تو میں باہر نکل آیا۔ خلاف معمول آج وقت پر لنچ نہیں لگا تھا۔ باہر نکلتے ہی پہلی نگاہ جمیل پر پڑی تھی جو بوکھلایا ہوا سا ایک طرف جا رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ رک گیا۔

"جی ہاں۔ اچانک ہی شامہ بی بی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انھوں نے خود کو زخمی کر لیا ہے۔"

"ارے کہاں ہے شامہ؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے ہال میں ہیں۔" جمیل نے جواب دیا۔

میں تیزی سے اس طرف بڑھ گیا۔ بڑے ہال کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل گیا۔ کمرے میں سبھی موجود تھے دو ڈاکٹر بھی تھے۔ خواجہ صاحب نڈھال سے ایک کر پر بیٹھے ہوئے تھے اور شامہ ایک آرام دہ کوچ پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس کی پٹی پر بینڈیج تھی جس پر خون کا بڑا سا دھبا پڑا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے گردن اٹھا کر دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ جبار بھی کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔ البتہ توصیف کے چہرہ پُر سکون تھا۔ وہ اس ماحول سے کسی قدر بے تعلق نظر آ رہا تھا۔

"سکون سے سونے دیں خواجہ صاحب! ذہنی انتشار کم ہو جائے گا تو حالت خود بہتر ہو جائے گی۔ ہمارے لیے جو حکم ہو۔" ایک ڈاکٹر نے کہا۔

"بہتر ہے ڈاکٹر۔ اگر کوئی ضرورت پیش آئی تو میں فون کر دوں گا۔" خواجہ صاحب سست لہجے میں بولے۔

"خدانخواستہ اگر طبیعت پھر بھی نہ بہتر ہو خواجہ صاحب تو میری رائے پر غور کر: وہاں بہتر دیکھ بھال ہو سکے گی۔" دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔

"میں اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی مناسب فیصلہ کر سکوں گا۔" خواجہ صاحب بولے۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ اچھا خدا حافظ۔" ڈاکٹر نے کہا اور پھر دونوں ڈاکٹر باہر گئے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے توصیف اور جبار سے کہا

"جاؤ تم دونوں بھی آرام کرو۔"

"تایا جان آپ ...." جبار نے زبان کھولی۔ خواجہ صاحب سخت لہجے میں بولے۔

"میں نے کہا نا' جاؤ آرام کرو۔"

"جی بہتر۔" جبار بولا اور گردن لٹکائے باہر نکل گیا۔

اس کے پیچھے ہی توصیف بھی کرسی دھکیلتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ ان دونوں کے ...... لہجے میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ پھر میں نے سادہ سی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے مس شامہ سو رہی ہیں۔ آیئے انھیں آرام کرنے دیں۔ آیئے۔"

میں واپس دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

خواجہ صاحب حیران سے اٹھ کھڑے ہوئے بہرحال وہ بھی میرے پیچھے پیچھے نکل آئے تھے۔

"سوری خواجہ صاحب! اس کمرے میں گفتگو کرنا مناسب نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا تمہارے خیال میں شامہ.........؟"

"وہ ہوش میں بھی آ سکتی تھی۔ میں فی الوقت اپنی پوزیشن صاف رکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں نادر علی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" خواجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ مناسب سوال نہیں ہے خواجہ صاحب! ظاہر ہے آپ نے میری یہاں ڈیوٹی لگائی ہے۔ اسے انجام دے رہا ہوں۔ آپ یہ بتایئے کیا میرا خیال درست تھا؟"

"ہاں' وہ عرصہ دراز سے ان لوگوں سے ملتی رہی ہے لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔" خواجہ صاحب نے کہا۔

"وہ ہیں کس قسم کے لوگ؟"

"بس نادر علی کہیں ملازمت کرتا ہے ایک ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں تو طویل عرصے سے ان لوگوں سے دور ہوں۔"

"اس دوری کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"وہ میرے معیار کے لوگ نہیں تھے۔ بس شادی ہو گئی تھی۔ کچھ وجوہ کی بنا پر دونوں خاندان شروع ہی سے ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں۔"

"آپ نے شامہ سے اس بارے میں سوال کیا تھا؟"

"ہاں میں نے سختی کی تھی۔ اس نے اعتراف کر لیا لیکن اس کے بعد ہی وہ جذباتی ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کافی بدتمیزی کی اور اس کے بعد اول فول بکنے لگی۔ اپنی خواب گاہ میں توڑ پھوڑ بھی کی۔ اسی میں زخمی بھی ہو گئی۔"

"اس نے کہا کہ وہ میرا خون ہیں' میں ان سے ضرور ملوں گی۔ خون خون سے نہیں رہ سکتا اور پھر وہ اول فول بکنے لگی۔ کہنے لگی صدیوں سے خون کو خون سے جا جاتا رہا ہے' تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ راعلاف کے غار ویران ہو گئے ہیں' روشنی گئی ہے۔ تباہی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ ایسے ہی دوسرے الفاظ۔"

"اوہ۔ راعلاف کا نام بھی لیا تھا شامہ نے؟"

"ہاں۔ مجھے خود حیرت ہے۔"

"اب آپ کا کیا خیال ہے خواجہ صاحب۔" میں نے پوچھا۔

"سخت پریشان ہوں بیٹے! سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میری تو عقل ساتھ گئی۔ سچ سچ یوں لگتا ہے کہ جیسے تباہی دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ عزت کے خوف سے ساری زندگی احتیاط سے گزاری ہے لیکن ان دنوں جن حالات میں گھر گیا ہوں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عزت بچانا مشکل ہو جائے گی۔" خواجہ صاحب روہانسے ہو گئے۔

"دل چھوٹا نہ کریں خواجہ صاحب! حوصلہ رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد آپ کو کوئی فیصلہ کن اطلاع دوں گا۔"

"میرے لئے اپنائیت سے کام کرو تنویر! یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ تم کاروباری طور پر یہاں آئے ہو۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں سخت پریشان ہوں۔"

میں نے خواجہ صاحب کو کافی تسلی دی اور پھر انہیں اپنے کمرے تک پہنچا آیا۔ میں خود بھی پریشان تھا۔ مشکوک لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ان کے درمیان فیصلہ مشکل تھا کہ اصل مجرم کون ہے۔ سب ہی جرم کے معیار پر پورے اترتے تھے ہر آدمی کی ٹانگ کسی نہ کسی طور پھنسی ہوئی تھی۔ انہی میں سے کسی ایک کی ٹانگ کھینچنی تھی مگر ابھی تک کسی ایک کے خلاف بھی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں ہو سکا تھا۔ حسن محمود سے دوران کوئی رابطہ نہیں رہا تھا لیکن میں خود محسوس کر رہا تھا کہ کافی دن ہو گئے ہیں میں ابھی تک کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکا۔

شام کو پانچ بجے کے قریب میں خود ہی اس ہال نما کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس وقت بھی تمام لوگ اندر موجود تھے۔ شامہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب وحشیانہ سی چمک تھی۔ میرے داخل ہونے پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔

دیکھا۔ اختاتون کی موت کی بعد قرص خورشید غروب ہو گیا ہے اور کیوں نہ ہوتا ہم نے آمون کی نصیحتیں یاد نہ رکھیں' دیوتاؤں کے باپ نے کہا تھا کہ انسان نیک کام کرے' برائیوں سے بچے' مصر کی عشقیہ غزلیں ذہن کو انتشار بخشتی ہیں اور منتشر ذہن کبھی بہتر سوچ کا حامل نہیں ہوتا۔ کاہن اعظم! اس غزل کا مطلب سمجھو اور راعلاف کی فطرت سے واقف ہو جاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میں محبوبہ کا بوسہ لوں اور اس کے ہونٹ کھلے ہوں تو میں بغیر پئے مست رہوں۔ کاش میں اس کی خادمہ ہوتا تو اس کے تمام اعضاء کا رنگ و روپ دیکھتا۔ کاش میں گازر ہوتا............

کاش میں اس کی انگوٹھی ہوتا جو اس نے انگلی میں پہن رکھی ہے۔ موت آج میرے سامنے ہے۔

جیسے مرکی خوشبو۔

جیسے کوئی تیز ہواؤں کے دوش پر' بادبانی کشتی میں بیٹھا ہو۔

موت آج میرے سامنے ہے۔

جیسے کنول کے ادھ کھلے پھولوں کی خوشبو۔

جیسے کوئی مدہوشی کے کنارے بیٹھا ہو۔

راعلاف کی فطرت میں انتشار ہے۔ اس کے نقوش نمایاں ہیں اس کے ہونٹوں کے نم بزم کی تاریخ لکھتے ہیں۔

کاہن اعظم جاؤ' معبد کے چراغ روشن کرو' تاریکیوں کو فنا کردو کہ یہ تمہارا منصب اور یہی تمہارا فرض' جاؤ یہاں سے چلے جاؤ اور اس وقت تک اپنی صورت نہ دکھاؤ جب تک ایک ایک چراغ روشن نہ ہو جائے۔ جاؤ۔" وہ اس طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر دہاڑی کہ اسے کھانسی آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔

میں دروازے سے باہر نکل آیا۔ کمرے میں ملازمین بھی تھیں جنہوں نے شامہ کو سنبھال لیا۔

خواجہ صاحب اٹھ کر باہر نکل آئے تھے۔

"مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں؟ وہ ذہنی توازن کھو چکی ہے۔" وہ پریشان لہجے میں بولے۔

"وقتی کیفیت بھی ہو سکتی ہے۔ اسے پرسکون رہنے دیں۔"

"اس کا امکان نہیں ہے۔ صرف ایک بات تعجب کی ہے۔ اس پر مصر کیوں سوار ہو گیا ہے؟"

"میں تو اب خوفزدہ ہو گیا ہوں۔"

"کس بات سے؟"

"یہ راعلاف کا معاملہ در حقیقت کوئی پُراسرار نوعیت تو نہیں رکھتا۔ جب سے دیوار میرے عجائب گھر میں آئی ہے میں الجھنوں کا شکار ہو گیا ہوں۔"

"آپ کو اس انداز میں نہیں سوچنا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے مگر حالات ...." خواجہ صاحب پریشانی سے بولے۔

"غور کریں خواجہ صاحب! میری تو رائے ہے کہ صبر و سکون سے حالات کا جائزہ لیں۔ ویسے کیا یہ دورہ پہلی بار پڑا ہے مس شمامہ کو؟"

"ہاں۔ عام حالات میں وہ سنجیدہ لڑکی ہے۔ اس سے ایسے کسی گھٹیا ڈرامے کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔" خواجہ صاحب نے کہا۔

اسی وقت ایک ملازمہ باہر نکل آئی۔ شمامہ نے خواجہ صاحب کو طلب کیا تھا وہ چلے گئے اور میں حالات پر غور کرتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ میں دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل آیا اور چوروں کی طرح شمامہ کی خواب گاہ کی طرف چل پڑا۔ ڈنر کے بعد بھی میں دیر تک شمامہ کے کمرے میں تھا۔ ڈاکٹر نے رات کی دوا میں خواب آور دوا بھی دی تھی اور شمامہ گہری نیند سو گئی۔ میں نے آخری کوشش کے تحت شمامہ کی خواب گاہ کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے تیاریاں کر لی تھیں۔ چنانچہ کسی دقت کے بغیر میں خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں نے ٹارچ روشن کر لی اور اس کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شمامہ کے تکیے کے نیچے مجھے قدیم مصریات کی ایک کتاب ملی اور میں ٹارچ کی روشنی میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر میرے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ قدیم مصری نظم جو شمامہ نے سنائی تھی اس کتاب میں موجود تھی۔ کتاب میں نے جوں کی توں رکھ دی اور پھر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شمامہ کی الما... کی ایک خفیہ دراز میں مجھے ایک نوٹ بک ملی اور میں نے ا[illegible] [illegible] کو اچھی طرح پڑھا اور پھر اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ رات کی تاریکی میں ایک راہداری سے مڑ رہا تھا کہ میں نے سایہ دیکھا جو دبے قدموں چل رہا تھا اور میں چونک پڑا۔ سایہ راہداری میں دوسری طرف مڑ گیا لیکن میرے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے اور پھر میں نے سائے کو روشنی میں دیکھا۔ وہ توصیف تھا جو تیز رفتاری سے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی چال میں کوئی لغزش نہیں تھی۔ انتہائی پُر اعتماد اور پھرتیلی چال تھی۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور میں ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ یہ اس وقت کہاں گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر پلٹ پڑا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ بند کیا اور روشنی کر کے نوٹ بک کھول لی۔ میں اس نوٹ بک کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا اور میرے ذہن میں بے شمار الجھنیں تھیں۔

دوسری صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی پتا نہیں کیا حالات تھے۔ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا ممکن ہے شمامہ کی بیماری کی وجہ سے ان معمولات میں فرق آیا ہو۔ بہر حال غسل وغیرہ کر کے میں فارغ ہوا اور پھر باہر نکل آیا۔ شمامہ اسی کمرے میں تھی اور خواجہ صاحب اس کے پاس موجود تھے۔ شمامہ کی حالت بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور نزدیک ہی ناشتے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔

"آؤ تنویر! میں نے تمہاری وجہ سے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔ بیٹھو' میں ناشتہ یہیں منگوائے لیتا ہوں۔" خواجہ صاحب نے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ خواجہ صاحب نے ملازمہ کو آواز دے دی تھی۔

"جبار اور توصیف نے ناشتہ کر لیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"توصیف صاحب نے تو کر لیا' جبار صاحب کہیں چلے گئے ہیں۔" ملازمہ نے جواب دیا۔

"خیر تم ہم دونوں کے لیے ناشتہ لے آؤ۔" خواجہ صاحب نے کہا۔ ملازمہ چلی گئی۔ میں نے اس دوران کئی بار شمامہ کا چہرہ دیکھا تھا۔ ایک بار نگاہیں ملیں تو میں نے اس کی خیریت پوچھی۔ اس وقت وہ ہوش میں تھی۔

ناشتے کے بعد میں نے خواجہ صاحب سے اجازت مانگی اور شمامہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ خواجہ صاحب بھی چونک پڑے تھے۔

"اتنی جلدی کیا ہے بیٹے! چلے جانا۔" خواجہ صاحب مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولے

"تنویر صاحب بھی اس ماحول سے اکتا گئے ہوں گے۔" شامہ نے کہا۔

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ بس اب کافی دن ہو گئے ہیں' مجھے اجازت دیں۔
تھوڑی سی ردوقدح کے بعد خواجہ صاحب تیار ہو گئے۔

"کبھی کبھی نکل آیا کریں تنویر صاحب! جب بھی ادھر سے گزر ہو۔" شامہ بولی۔

"بہت جلد دوبارہ ملاقات ہو گی مس شامہ۔" میں نے جواب دیا۔ خواجہ صاحب مجھے باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ کچھ دور آکر انہوں نے کہا۔

"خیریت۔ یہ اچانک کیا سوجھی؟"

"کام ختم ہو گیا ہے خواجہ صاحب! اپنے چیف سے مشورہ کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ خواجہ صاحب چونک پڑے۔

"کیا مطلب؟ کیا مطلب گویا تم نے ....؟"

"جی ہاں کسی حد تک۔ بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟ مجھے الجھن میں چھوڑ جاؤ گے؟" خواجہ صاحب نے پریشان لہجے میں کہا۔

"عرض کر چکا ہوں تھوڑا سا کام باقی ہے اس کے بعد ہی تفصیل عرض کروں گا۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا میں محمود صاحب سے بات کروں؟"

"ضرور کر لیں لیکن میری رپورٹ سے قبل وہ بھی کچھ نہیں بتا سکیں گے۔" میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔ پھر تم کب تک واپس آؤ گے؟ بھئی صاحبزادے تم میری پریشانیاں بڑھا رہے ہو گے؟" خواجہ صاحب نے کہا۔

"بہت جلد خواجہ صاحب! بہت جلد۔ مجھے آپ کی پریشانیوں کا پورا پورا احساس ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر میں انہیں سلام کر کے وہاں سے نکل آیا۔

☆-------☆-------☆

ایک ہی انداز ایک ہی شکل' جن لوگوں کی داستان سنی ان کی شکل یکساں نظر آئی سونو اور محسن جانتے تھے کہ آگے کی کہانی کیا ہے لیکن اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ خوا...

انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ کہانی تشنہ چھوڑ دی۔

"سونو!" محسن نے کہا۔

"ہوں۔"

"اب کیا کریں؟"

سونو پھیکے سے انداز میں مسکرا دی پھر بولی۔ "انسان جب اپنے وجود سے تھک جاتا ہے تو کیا کرتا ہے۔"

"کیا تم اپنے وجود سے تھک گئی ہو۔"

"پتہ نہیں۔" سونو نے جواب دیا۔

"سونو۔" محسن عجیب سے لہجے میں بولا۔

"ہاں کہو۔"

"آؤ شادی کر لیں۔" محسن کے الفاظ پر سونو نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولی۔

"کیا یہ ہماری مشکلات کا حل ہے۔"

"ہاں۔"

"وہ کیسے؟"

"یوں کہ صدیوں سے لوگ یہی کرتے آئے ہیں۔ یہی دنیا کی تاریخ ہے۔" محسن نے کہا۔ سونو اسے دیکھتی رہی' پھر ہنس پڑی پھر بولی۔

"تم بہت چالاک ہو۔ بہت ہی چالاک کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"ہاں اس لیے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' لیکن محسن کیا ہم اس ہیرے سے نجات حاصل کر لیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس نے ہم سے ہماری زندگی چھین لی ہے۔ اس نے ہمیں دوسروں کی کہانیوں میں الجھا دیا ہے۔"

"یہ ہماری انفرادیت ہے۔ لوگ صرف اپنی زندگی کی تلخ اور خشک داستانوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ہم خوش نصیب ہیں جن کے ساتھ کائنات کے بہت سے در کھل گئے ہیں۔

"انہی ادھوری کہانیوں کا نام زندگی ہے اور زندگی گزارنے کے لیے تجسس ضروری

"ہم اپنی زندگی کے رشتوں سے دور نہیں ہٹ گئے محسن!"

"لیکن میرا خیال ہے ہم نے اب زندگی کے راستے پائے ہیں۔ اس سے پہلے حالات کے قیدی تھے اور اب کردار زندگی کے مالک ہیں۔ ہمارے پاس اتنا کچھ ہے ہمیں ابھی کسی کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیا تم اپنی ماں کے پاس جانا چاہو گی۔"

"ابھی نہیں میں اس کی ضرورتیں پوری کر رہی ہوں۔ وہ ذہنی طور پر اپنے بچو یعنی میرے سوتیلے بہن بھائیوں سے منسلک ہے۔ میری ضرورت اسے صرف اتنی ہے میں اس کی کفالت کرتی ہوں ورنہ وہ خوفزدہ تھی کہ میری وجہ سے اس کے بچے جرائم پیشہ بن رہے ہیں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" محسن نے کہا۔

"جو زندگی ہم گزار رہے ہیں وہ بری نہیں ہے۔"

"تم بری کی بات کر رہی ہو سو تو میں کہتا ہوں ہمارے بعد کون ہو گا جو اس طر انسانی زندگی کے رازوں سے واقف ہو رہا ہو گا۔ ہم محقق ہیں لاکھوں حقیقتوں کے شن جو جاننا چاہیں جان لیں۔ ایسے ایسے راز کھولیں جن تک دوسرے سوچ بھی نہ سکیں۔"

"تو آؤ کوئی نئی کہانی تلاش کریں۔ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھو جو دولت مند کا کھیل ہے۔"

"اور وہ شخص اس دلچسپ کردار معلوم ہوتا ہے۔ اسے نشانہ بنائیں۔"

آپ نے پیلس ضرور دیکھا ہو گا۔ شہر کے بارونق اور فیشن ایبل علاقے میں و ہے اور کئی منزلوں پر مشتمل ہے اور اس میں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ نچلی م عام ضرورت کی اشیاء کے لیے اور اوپر کی منزل جیولری' اشیائے سنگھار تیار شدہ ملبو اور دیگر اشیائے فیشن کے لیے مخصوص ہے۔ اس منزل سے ایک سرے سے دوسر سرے تک قالین بچھا ہوا ہے۔ وہاں زیادہ تر اونچی سوسائٹی کی خواتین خریداری کے جاتی ہیں۔ یوں بھی معمولی حیثیت کے لوگ وہاں جانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ پیلس چھوٹے بڑے کئی ملازم کام کرتے ہیں۔ چار سکیورٹی آفیسر ہیں جن میں ایک داراب سینئر تھا۔ نہ صرف سروس کے اعتبار سے بلکہ کارکردگی کے لحاظ سے بھی یہی وجہ تھی جب بھی کوئی گڑبڑ ہوتی سب سے پہلے داراب کا ہی نام لیا جاتا۔

ہفتے کی صبح جب کہ ابھی خریداروں کی گہماگہمی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پیلس مالک شیخ اجمل نے داراب کو اپنے دفتر میں طلب کیا جو عمارت کی دوسری منزل پر

تھا۔ شیخ اجمل چھوٹے قد کے ایک نرم مزاج شخص تھے۔ ان کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی اور سر کے بال برف کی مانند سفید ہو چکے تھے۔

"بیٹھو داراب بھائی۔" وہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ داراب میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور شیخ جی کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"سناؤ کام کیسا جا رہا ہے۔"

"بہت اچھا جا رہا ہے۔" داراب نے کہا۔

"گراؤنڈ فلو پر چوریوں کا تناسب بہت کم ہو گیا ہے۔ گزشتہ ہفتے کے دوران صرف ایک عورت نے پارکر پین چرانے کی کوشش کی تھی۔"

"پولیس کے حوالے کر دیا اسے؟"

"نہیں کسی اچھے گھرانے کی عورت تھی۔ اس کا شوہر تعمیراتی کمپنی میں سول انجینئر ہے۔ ہم نے اس کے شوہر کو بلا کر وارننگ دے دی تھی۔"

"معلوم نہیں یہ پڑھی لکھی اور شریف گھرانوں کی عورتیں ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ چند ہفتوں سے پہلی منزل پر بڑی پُراسرار چوریاں ہو رہی ہیں۔"

"جیولری وغیرہ؟"

"نہیں قیمتی لباس۔" شیخ اجمل نے کہا۔ "بعض لباس پانچ سو سے لے کر ہزار روپے کی مالیت تک کے تھے۔"

"لباس؟" داراب نے حیرت سے کہا۔

"لیکن اتنی بڑی چیز چوری کیسے ہو سکتی ہے۔"

"مزید حیرت یہ کہ ان چوریوں کا انکشاف گزشتہ ہفتے اسٹاک چیکنگ کے دوران ہوا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ان چوریوں میں کوئی سیلز گرل یا کلرک بھی ملوث ہے۔"

"شروع میں میرا بھی یہی خیال تھا لیکن بظاہر ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس معاملے میں ذاتی طور پر کچھ تحقیقات کی ہیں۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے پہلی منزل پر دو ڈریسنگ روم بنے ہوئے ہیں۔ بعض عورتیں ڈریس خریدنے سے پہلے انہیں پہن کر دیکھنا ضروری

سمجھتی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے مجرمانہ ذہن رکھنے والی کوئی عورت اس سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے وہ ہمارا لباس اپنے لباس کے نیچے پہن لیتی ہے اور کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید کر واپس چلی جاتی ہے۔"

"ہمیں اس کا سدباب کرنا چاہیے۔"

"مسئلہ اتنا آسان بھی نہیں ہے تم جانتے ہی ہو کہ پہلی منزل پر بڑی بڑی بیگمات آتی ہیں۔ ہم انہیں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جانے سے قبل اپنا لباس چیک کرواتی جائیں ڈریسنگ روم میں جانے سے پہلے یہ بتا دیا کریں کہ کتنے ڈریس لے کر جا رہی ہیں۔ یہ بات نہ صرف ان بیگمات کے وقار کے منافی ہوگی بلکہ ہمارے اسٹور کی شہرت کو بھی نقصان پہنچے گا۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ڈریسنگ روم میں جانے والی ہر عورت پر نظر رکھی جائے رش کے وقت تقریباً پچاس ساٹھ عورتیں خریداری کے لیے موجود ہوتی ہیں۔ جبکہ ہمارے اسٹاف میں کل پانچ افراد ہوتے ہیں یعنی چار سیلز گرلز اور ایک سیکیورٹی آفیسر۔"

"تو پھر ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔" داراب نے کہا۔

"ہمیں کچھ عرصے کے لیے ڈریسنگ روم بند کر دینا چاہیے۔"

"میں نے اس کا دوسرا علاج سوچا ہے۔ تم نے ون وے شیشے کا ذکر تو ضرور سنا ہو گا۔"

"غالباً آپ اس شیشے کی بات کر رہے ہیں جس کے ایک طرف سے اپنا عکس دیکھا جا سکتا ہے اور دوسری طرف سے آرپار دیکھا جا سکتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔" شیخ جی نے کہا۔

"اس وقت یہ شیشے ہمارے ڈریسنگ روم میں لگے ہوئے ہیں گزشتہ رات میں نے اپنی نگرانی میں پرانے شیشے تبدیل کرا کے ون وے شیشے لگوا دیے ہیں۔" داراب نے آنکھیں جھپکائیں۔

"یہ تو آپ نے بڑے کمال کا کام کیا ہے شیخ جی۔"

"شکریہ۔" شیخ جی نے کہا۔

"اب ہمیں چور پکڑنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

"یقینی بات ہے۔"

"اس کام کے لیے مجھے کسی قابل اعتماد آدمی کی ضرورت ہے۔ جو چور بھی پکڑے اور بات باہر بھی نہ جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔"

"م' میں۔" داراب اچھل پڑا۔ اس کے وہم میں بھی نہیں تھا کہ شیخ جی یہ کام اس کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔

"کیا میں عورتوں کو لباس تبدیل کرتے ہوئے دیکھوں گا میرا خیال ہے کہ اس کام کے لیے کوئی عورت مناسب رہے گی۔"

"عورت تو مناسب رہے گی لیکن مسئلہ صرف عورت کا نہیں بلکہ قابل اعتماد عورت کا ہے۔ اگر میں نے کسی عورت کو اس کام پر مامور کر دیا تو اگلے روز پورے شہر میں یہ بات پھیل جائے گی کہ پیلس کے ڈریسنگ روم میں ون وے شیشے لگے ہوئے ہیں۔ میں کسی صورت میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو تم ہمارے اسٹور کے سیکیورٹی آفیسر ہو۔ سراغرساں ہو اور سراغرساں کی حیثیت ڈاکٹر کی سی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں کی عورتوں میں ایک مقولہ مشہور ہے۔ ڈاکٹر اور درزی سے جسم نہیں چھپایا جا سکتا۔ تم اس مقولے میں سراغرساں کا اضافہ کر سکتے ہو۔ اس میں کوئی ذاتی بات نہیں ہے یہ تمہارا پیشہ ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"م' میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم سب کچھ جانتے ہو۔ تم ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ انسان ہو۔ کسی ذہنی عیاشی کے لیے یہ کام نہیں کرو گے۔ صرف چور پکڑنے کے لیے "ناگوار فریضہ" انجام دو گے۔ ارے بابا! یہ جو بیگمات ہمارے ہاں خریداری کے لیے آتی ہیں بڑی آزاد خیال ہوتی ہیں۔"

"وہ ان کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے جیسے شادی شدہ آدمی کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔"

"میں شادی شدہ نہیں ہوں۔" شیخ جی چونک پڑے۔

"اتنی عمر ہو گئی ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم چالیس برس کے تو ضرور ہو گے۔"

"بیالیس سال۔" داراب نے تصحیح کی۔

"خیر خیر کوئی بات نہیں۔ میری نظر میں تم سے زیادہ موزوں اور قابل اعتماد اور کوئی نہیں ہے۔ کل سے یہ ڈیوٹی سنبھال لو۔ ڈریسنگ روم کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا ہے۔ آنے جانے کے لیے باہر کا دروازہ استعمال کرنا اور بڑی احتیاط سے کام کرنا۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ تم یہ نگرانی کر رہے ہو۔" داراب سر جھکا کر سوچنے لگا اس کے

میز پر رکھ دی۔

"یہ اس کمرے کی چابی ہے۔ یہ کمرہ ایک منٹ کے لیے بھی کھلا نہیں رہنا چاہیے۔ ویسے اس کا تالا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی بند ہو جاتا ہے اور بغیر چابی کے نہیں کھل سکتا۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"اوکے داراب بھائی! مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے امید ہے کہ اب چور کی گرفتاری میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔"

داراب نے چابی اٹھا کر جیب میں ڈالی اور کچھ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس رات وہ عجیب و غریب خواب دیکھتا رہا۔ جوانی میں اس نے شائل نامی ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔ وہ لڑکی اسے آخری وقت تک اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی تھی لیکن جب اس کے والدین نے اس کی منگنی امریکہ میں ملازمت کرنے والے ایک لڑکے سے کر دی تو اس نے چپکے سے اس رشتے کو قبول کر لیا اور داراب کو بھول جانے کی نصیحت کرتے ہوئے تعلق ختم کر دیا۔ اس روز کے بعد داراب کو دنیا کی تمام لڑکیوں سے نفرت ہو گئی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اس واقعے کو بائیس برس گزر چکے تھے اس کے بعد داراب نے کسی لڑکی کے چہرے کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ پیلس میں جہاں وہ سکیورٹی آفیسر تھا۔ زیادہ تر عورتیں اور لڑکیاں ہی آتی تھیں لیکن اس نے ان کے چہروں پر کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔ ہمیشہ ان کے ہاتھوں پر نظر رکھتا تھا اور وہ بھی نیم وا آنکھوں سے۔ یہی وجہ تھی کہ کسے ہوئے جسموں اور حسین چہروں نے اس کے خیالات کو کبھی پراگندہ نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ اب شیخ جی نے جو کام اس کے سپرد کیا تھا اس کا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ عورت کا تصور اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے عام آدمی کے لیے پریوں کا تصور۔ اس نے شائل کے سوا عورت کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس کے ذہن میں تجسس بھی تھا اور گھبراہٹ بھی۔

اگلی صبح کو تیار ہو کر ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ ڈریسنگ روم کے عقب میں جو کمرہ بنا ہوا تھا۔ وہ پندرہ فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا تھا۔ اس میں دو دروازے تھے ایک اسٹور میں کھلتا تھا اور دوسرا باہر کی طرف۔ لمبائی والی دیوار پر داہنی جانب دو قد آدم پینٹنگز آویزاں تھیں۔ یہ پینٹنگز ایک مضبوط فریم کے اندر جو کسی چوکھٹ کی مانند تھا دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر دروازے کے پٹ کی طرح دائیں جانب کھل گئی اور دوسری

صورت اور آراستہ ڈریسنگ روم دیکھے جا سکتے تھے خاصے کشادہ کمرے تھے۔ لباس پہن کر عورتیں چل پھر بھی سکتی تھیں۔ ہر ڈریسنگ روم میں سرخ قالین اور مخمل کے پردے لگے ہوئے تھے اور ایک ایک اسٹول رکھا تھا۔

داراب نے ٹھنڈا سانس لیا اور کمرے میں رکھی ہوئی واحد کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے اسے خریداری کے لیے آنے والی عورتوں کی دبی دبی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ دس بج کر دو منٹ پر ایک نمبر ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا اور بتی جل گئی۔ کمرہ کسی اسکرین کی مانند روشن ہو گیا داراب کے بدن میں جھرجھری سی آ گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر فوراً ہی اسے یاد آیا کہ وہ ڈیوٹی دینے کے لیے وہاں بیٹھا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں اور ڈریسنگ روم میں دیکھا۔ شیشے کی دوسری طرف ایک ادھیڑ عمر کی فربہ اندام عورت کھڑی تھی۔ اس کا بھرا بھرا چہرہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ خوب کھاتی تھی اور کھا کر سو جاتی تھی۔ اس نے خاصا گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک۔ بھنویں بنی ہوئیں۔ گالوں پر غازہ اور پلکوں پر مسکارہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہلکے آسمانی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ قمیض اتنی تنگ تھی کہ جسم باہر نکلنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ساڑھی اور بلاؤز تھا۔ داراب سوچ رہا تھا کہ وہ اتنی تنگ قمیض اتارے گی کیسے۔

خاتون نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا اور پہلے آئینے میں اپنے میک اپ کا جائزہ لیا داراب کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ اسے گھور رہی ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میک اپ کے بارے میں مطمئن ہونے کے بعد خاتون نے اپنا دوپٹہ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور بلاؤز کو سینے سے لگا کر دیکھا پھر اس نے بلاؤز کو قمیض کے اوپر ہی پہن لیا اور مختلف زاویوں سے اسے جانچنے لگی۔ اس کے جانے کے بعد داراب نے اطمینان کا سانس لیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

ایک گھنٹے بعد دو نمبر ڈریسنگ روم کی بتی جل اٹھی اور ایک دبلی پتلی عورت اندر آئی۔ اس نے ہاتھ میں بلوچی کام والی قمیض پکڑی ہوئی تھی۔ داراب کے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ خاصی جھگڑالو قسم کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس نے آتے ہی اپنا لباس اتار کر اسٹول پر پھینک دیا اور وہ دوسرا لباس پہننے کے بجائے مختلف زاویوں سے اپنے جسم کا معائنہ کرنے لگی۔ داراب کی پیشانی

وہ دوبارہ شیشے کی دوسری طرف کھڑی ہوئی عورت کو دیکھ رہا تھا عجیب عورت تھی وہ تحق
شام تک داراب کو چار مزید عورتوں کی احمقانہ حرکتیں دیکھنا پڑیں وہ چاروں چالیس سال سے زیادہ عمر کی فربہ اندام عورتیں تھیں۔ داراب کو ایک نیا تجربہ ہوا۔ لباس۔ اندر وہ عورتیں کسی حد تک معقول اور مناسب نظر آتی تھیں لیکن لباس کے بغیر انتہائی بھدی اور ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھیں۔ ان میں سے کسی نے کوئی لباس چھپا۔ کی کوشش نہیں کی تھی۔

اگلے روز وہ ٹھیک وقت پر اس کمرے میں موجود تھا۔ اس کے ابتدائی خدشات۔ بنیاد ثابت ہوئے تھے۔ کسی عورت نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس بے وفا اور خود غرض محبوبہ شائل بھی چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکی ہو گی۔ اس کا جسم؟ فربہ اور بے ڈھنگا ہو چکا ہو گا۔ نہ جانے وہ کہاں ہو گی اور کس حال میں ہو گی۔ شہ نصف درجن بچوں کی ماں بن چکی ہو گی۔ اسے یاد آیا کہ بیس سال قبل وہ اپنے شوہر۔ ساتھ امریکہ کے شہر سان فرانسسکو چلی گئی تھی۔ اب بھی وہیں کہیں ہو گی لیکن آج؟ اس کا خیال کیوں آرہا ہے۔

اسی لمحے ڈریسنگ روم کی بتی جل اٹھی اور اس کے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا کمرے میں داخل ہونے والی ایک پچیس چھبیس سالہ پُرکشش لڑکی تھی۔ تاہم اس رنگ سانولا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک ریشمی گاؤن لائی تھی۔ پہلے اس نے کپڑوں کے او گاؤن پہنا لیکن پھر برا سا منہ بنا کر اتار دیا۔ داراب نے سوچا کہ شاید اسے گاؤں پسند نہیں آیا تھا لیکن اسے اپنے خیال پر فوراً ہی ترمیم کرنا پڑی کیونکہ لڑکی نے اپنے کپڑے اتار۔ شروع کر دیے تھے۔ داراب نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کیونکہ لڑکی اس گاؤن اپنے لباس کے نیچے نہیں پہن سکتی تھی۔

جمعرات تک پُراسرار چور کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ شام کے وقت جبکہ اسٹور ؛ خریداروں کا بے پناہ رش تھا۔ داراب نے ایک بیس اکیس سالہ لڑکی کو ڈریسنگ روم ؛ داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے بال سنہری اور رنگ سرخ و سفید تھا پیشانی کشادہ اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس نے بہترین تراش کی پرنٹڈ میکسی پہن رکھی تھی اس کے کھلے ہو۔ بال ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی داراب کا دل دھڑکنا بھول اور سانسوں کی رفتار بے ترتیب ہو گئی۔ پانچ دنوں کے دوران پہلی مرتبہ اتنی جوان ا

قیمت سات آٹھ سو روپے کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اندر آتے ہی میکسی کی زپ کھولی اور اسے اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ داراب کے بدن میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ لڑکی کا دودھیا رنگ جسم انتہائی متناسب تھا۔ اس نے دوسری عورتوں کی طرح کوئی غیر ضروری حرکت نہیں کی مسکرا کر اپنے عکس کی جانب دیکھا اور بڑے اطمینان کے ساتھ ایک لباس پہننے لگی۔ داراب کسی بت کی طرح بے حرکت کھڑا تھا۔ اسے تمام اخلاقی اور پیشہ ورانہ فرائض بھول گئے تھے۔ لڑکی نے لباس کے اوپر میکسی پہن لی اور اس کی شکنیں دور کرنے لگی نیچے پہنا ہوا ڈریس پوری طرح میکسی کے نیچے چھپ گیا تھا۔ داراب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ آگے قدم آگے بڑھا اور شیشے کے قریب ہو کر لڑکی کو گھورنے لگا۔

اتنے میں لڑکی نے اپنے لباس سے مطمئن ہونے کے بعد چہرہ آگے کیا اور پُرخیال انداز میں مسکرا دی۔ داراب نے لاشعوری طور پر اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے عکس کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لمحہ بھر کے بعد لڑکی نے دوسرا لباس اٹھا لیا اور ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر نکل گئی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ یہی وہ لڑکی تھی جو لباس چوری کر کے جاتی تھی۔ اسٹور کی طرف کھلنے والے دروازے کے اوپر دو انچ قطر کا ایک رنگین شیشہ لگا ہوا تھا اس شیشے میں سے اسٹور کا سارا منظر دیکھا جا سکتا تھا داراب جلدی سے دروازے کے سامنے گیا اور شیشے میں اسٹور کے اندر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ سنہری بالوں والی لڑکی نے دوسرا لباس ہینگر پر لٹکا دیا اور نہایت اعتماد کے ساتھ سیڑھیوں کی جانب چل دی۔

داراب کے منہ سے بے اختیار آہ نکل گئی 'اتنی خوب صورت اور سلجھی ہوئی لڑکی چور بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چند لمحوں کے اندر وہ اس لڑکی کی آزادی اور عزت کو ختم کر سکتا تھا لیکن کسی نادیدہ قوت نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ پیر جکڑ لیے۔ وہ لڑکی کو سیڑھیوں پر غائب ہوتے دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس واقعے نے اس کی سات سال کی آبرو مندانہ ملازمت کو داغدار کر دیا تھا۔ وہ سنہری بالوں والی لڑکی سے زیادہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا لیکن اس احساس پر ایک دوسرا احساس غالب تھا اور یہ احساس اس کے پورے وجود پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ بائیس سال بعد ایک بار پھر اس کے سینے میں محبت کے جذبات کروٹ لینے لگے تھے۔ وہ آگ جو اس کی دانست میں راکھ بن چکی تھی دوبارہ سلگنا شروع ہو گئی تھی۔

ڈریسنگ روم میں آنے والی فربہ اندام بیگمات میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے صرف سنہری بالوں والی لڑکی کا انتظار تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس پکڑنا چاہتا تھا بلکہ صرف ا لیے کہ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان تین دنوں کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس ذہن سے اس کا خیال محو نہیں ہوا تھا۔

پیر کے روز وہ لڑکی ڈریسنگ روم نمبر ایک میں داخل ہوئی اس کا چہرہ پھول کی ما تازہ اور شگفتہ تھا۔ سنہرے بال حسب سابق پشت اور کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ سر اوپر گہرے شیشوں والا چشمہ نظر آرہا تھا۔ جو اس نے غالباً بطور فیشن یا بالوں کو روکنے لیے لگایا ہوا تھا۔ آج وہ پرنٹڈ شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ ہاتھ میں نیلے رنگ کی میک تھی اور میکسی ایک ایسا لباس ہے جسے شلوار قمیض کے نیچے نہیں پہنا جاسکتا۔ داراب سوچا آج واقعی وہ خریداری کرنے آئی تھی۔ اتنے میں لڑکی نے اپنی قمیض اتار دی ا میکسی میں چھپا ہوا ایک نیکلس نکالا اور اپنے گریبان میں چھپا لیا۔ داراب دم بخود ہو گ وہ نیکلس آٹھ سے دس ہزار کی مالیت کا تھا۔

"خدا کے لیے ایسا نہیں کرو۔" داراب نے شیشے کے قریب منہ کرکے سرگوشی کی

"پلیز نیکلس واپس رکھ آؤ۔" لڑکی نے سر آگے کر کے شوخ نظر سے آئینے کو د داراب کو ایسا لگا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی ہو اور اس کی ہ کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"دیکھو چندا۔" داراب نے مزید کہا۔ "تم جیسی حسین اور معصوم لڑکی کو یہ حر زیب نہیں دیتی۔ چوری سنگین جرم ہے ایک نہ ایک دن پکڑی جاؤ گی۔ تمہاری یہ خو صورت جوانی جیل کی مضبوط دیواروں کے اندر ڈھل جائے گی۔"

لڑکی کے خوب صورت ہونٹ وا ہو گئے۔ اس کے دانت موتیوں کی مانند اور ہ تھے۔ اس نے اس حصے پر ہاتھ پھیرا جہاں نیکلس چھپایا تھا اور شوخ انداز میں آنکھ ما داراب حیرت سے پیچھے ہو گیا اسے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ لڑکی شیشے کے دوسری طر کھڑی ہے اور اس نے اپنے عکس کو آنکھ ماری ہے۔ انداز ظاہر کرتا تھا کہ اس نے خو مبارک باد دی تھی۔ پھر اس نے میکسی پہن کر دیکھی۔ وہ اس کے بدن پر بالکل فٹ تھ پوری طرح مطمئن ہو کر اس نے میکسی اتار کر قمیض پہن لی اور باہر نکل گئی۔ دار جلدی سے دروازے کے قریب گیا اور سوراخ سے اسٹور میں دیکھنے لگا۔ لڑکی سیڑ

سے بلّار کھنا چاہتی تھی۔

داراب کے ذہن میں عجیب کشمکش ہونے لگی۔ ضمیر یہ کہتا تھا کہ اس لڑکی کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس لڑکی کو کسی مختلف طریقے سے سمجھانا چاہیے اور شاید اس مختلف طریقے سے وہ اس کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے دوبارہ اسٹور میں دیکھا۔ لڑکی جا چکی تھی۔ وہ ایک دم مڑا عقبی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ زینہ طے کر کے نیچے پہنچا اور عمارت کے اوپر سے گھوم کر داخلی دروازے کے سامنے پہنچ گیا لیکن لڑکی کہیں نظر نہ آئی شاید وہ رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تھی داراب سر جھکائے واپس آگیا۔

اس کے سینے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ محبت کے شعلے۔ اسے سنہری بالوں والی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ ہر چند کہ اس نے اس سے پہلے بھی کئی لڑکیوں کو دیکھا تھا لیکن شائل کے بعد یہ پہلی لڑکی تھی جس میں اس نے بے پناہ کشش محسوس کی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس سے آدھی عمر کی تھی۔ حسین اور ماڈرن تھی۔ اس کے ساتھ محبت کا مطلب سوائے حسرت کے کچھ نہیں تھا۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران وہ انتہائی بے چینی کے ساتھ لڑکی کا انتظار کرتا رہا۔ اسے ڈریسنگ روم میں آنے والی دوسری عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ عام طور پر دوسری طرف منہ پھیر لیا کرتا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ بالکل وقت ضائع نہیں کرے گا سنہرے بالوں والی لڑکی کا پیچھا کرے گا اور موقع ملتے ہی اس کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کر دے گا۔ اگر اس نے محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو وہ اسے گرفتاری کی دھمکی دے کر آمادہ کرے گا۔

ہفتے کے روز شیخ جی نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا ان کے چہرے پر تشویش پائی جاتی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔

"کوئی کامیابی ہوئی۔" داراب کو اپنے حلق میں کچھ اٹکتا محسوس ہوا۔ اس نے آج تک اپنی ملازمت میں بے ایمانی نہیں کی تھی لیکن آج وہ جھوٹ بولنے پر مجبور تھا اور ایک ایسی لڑکی کی خاطر جس کا وہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔

"ابھی تک چور کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"تمہیں نگرانی کرتے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو چلا ہے میرے خیال میں اتنے عرصے

نیکلس غائب ہے۔" داراب کی ہتھیلیوں میں پسینہ آگیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"ساڑھے سات ہزار کا نن۔ نیکلس۔"

"ہاں معلوم ہوتا ہے کہ چور نے اپنا طریقہ کار بدل دیا ہے۔ میں یہ نگرانی ختم کر رہا ہوں کل اتوار ہے اور میں چاہتا ہوں کہ شیشے تبدیل کرا دیئے جائیں۔"

داراب کے ذہن میں سب سے پہلے خیال یہ آیا کہ اب وہ اپنی محبوبہ کو نہیں دیکھ سکے گا۔

"میرا خیال ہے کہ چند روز اور دیکھ لینا چاہیے۔" اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا "ممکن ہے اگلے ہفتے تک چور کا کچھ پتہ چل سکے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری غیر حاضری میں گراؤنڈ فلور پر چوریوں کا تناسب بڑھ گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی ہیں۔"

"چہ میگوئیاں؟"

"ہاں غالباً سیلز اسٹاف کے کسی ممبر نے تمہیں کمرے میں آتے جاتے دیکھ لیا ہے۔ اس نے یہ افواہ پھیلائی شروع کر دی ہے کہ تم ڈریسنگ رومز کی نگرانی کر رہے ہو۔ لوگوں کو ابھی یہ تو نہیں پتا چلا کہ ڈریسنگ روم میں دن وے شیشے لگے ہوئے ہیں لیکن یہ ضرور شبہ ہو گیا ہے کہ کسی سوراخ وغیرہ کے ذریعے تاک جھانک ہو رہی ہے۔ اگر یہ بات عام ہو گئی تو ہماری ساکھ کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ اعلیٰ گھرانوں کی عورتیں ہمارے یہاں خریداری کرنا چھوڑ دیں گی۔ علاوہ ازیں اگر یہ بات قانون کی گرفت میں آگئی تو جرمانے کے علاوہ تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔ پھر تمہاری تنخواہ کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اگر تم مہینے میں پانچ چھ سو روپے کی چوری پکڑ بھی لو تو کیا فائدہ یہ رقم تمہاری تنخواہ سے آدھی بھی نہیں۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے نگرانی ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دو چار دن اور دیکھ لینا چاہیے۔" شیخ جی نے گہری نظر سے داراب کو دیکھا۔

"کیا بات ہے۔" انہوں نے کہا۔

"جب میں نے نگرانی شروع کرنے کے لیے کہا تھا تو تم ہچکچا رہے تھے اور اب ختم کرنے پر تیار نہیں۔" داراب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

"بس چند دن اور سہی۔"

"نہیں۔" شیخ جی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں کل ہر صورت میں شیشے تبدیل کروا دوں گا۔ تم صرف آج کا دن اور کوشش کر کے دیکھ لو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" داراب نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ ایک دم بے چین ہو گیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ آج سنہری بالوں والی لڑکی ضرور آجائے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کبھی اسٹور میں جھانکتا تھا اور کبھی ڈریسنگ روم میں سات بجے تک اس کی مایوسی انتہا کو پہنچ گئی کیونکہ اسٹور بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اگلے روز چونکہ چھٹی تھی اس لیے اسٹور کے اندر خاصا رش تھا۔

سات بج کر پانچ منٹ پر ڈریسنگ روم کی بتی جل اٹھی۔ داراب کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ آنے والی وہی حسین چور تھی جو سامان کے ساتھ اس کا دل بھی چرا لے گئی تھی۔ آج وہ پھر میکسی پہن کر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو لباس تھے۔ اس نے باری باری دونوں کا جائزہ لیا۔ پھر ایک جو زیادہ قیمتی تھا میکسی کے نیچے پہن لیا۔ یہ دیکھتے ہی داراب عقبی دروازے سے باہر نکلا اور سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ اپنی موٹر سائیکل کو جو گلی میں کھڑی تھی نکال کر ایسی جگہ پر لے آیا جہاں سے اسٹور کے داخلی دروازے کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اسٹور کا کوئی ملازم اسے لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹوں بعد لڑکی باہر آئی اور ایک ٹیکسی کی طرف بڑھی جو دروازے سے چند قدم آگے کھڑی تھی۔ غالباً ٹیکسی اسی کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ وہ ڈرائیور سے بات کیے بغیر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ داراب مناسب فاصلہ چھوڑ کر تعاقب کرنے لگا۔

ٹیکسی خالد بن ولید روڈ سے ہوتی ہوئی جمال الدین افغانی روڈ پر پہنچی اور پھر سیدھی دوڑنے لگی۔ اس سڑک پر ٹریفک تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے داراب نے درمیانی فاصلہ زیادہ کر دیا۔ عالمگیر روڈ طے کرنے کے بعد ٹیکسی ایک دم بائیں طرف مڑ گئی اور چند گلیاں مڑنے کے بعد ایک گلی تھی۔ داراب گلی کے کونے پر رک گیا۔ موٹر سائیکل بند کی اور پیدل ٹیکسی کی طرف چل پڑا۔ جب وہ قریب پہنچا تو ٹیکسی آگے بڑھ گئی اور

داراب دروازے کے قریب جا کر سوچنے لگا۔ اس وقت ٹی وی پر کوئی مزاحیہ پروگرام ہو رہا تھا اور آس پاس کے گھروں سے ٹی وی کی پُر شور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ داراب نے دروازے کو تھوڑا سا دھکیل کر دیکھا تو اسے کھلا ہوا پایا دروازے کے بالکل سامنے جو کمرہ تھا اس میں بتی جل رہی تھی لیکن کسی کی موجودگی کے آثار نہ تھے۔ اچانک اس نے کھلی ہوئی کھڑکی سے سنہری بالوں والی لڑکی کو دیکھا۔ مکان کے پچھلے حصے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ اگر گھر میں کوئی اور فرد موجود تھا تو وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اس اعتبار سے لڑکی سے تنہائی میں بات کرنے کا وہ بہترین موقع تھا۔ داراب ہمت کر کے آگے بڑھا اور دروازے سے اندر جھانکا۔ لڑکی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔ داراب نے ہاتھ کی پشت سے دروازے پر دستک دی۔ لڑکی چونک کر پیچھے مڑی اور داراب پر نظر پڑتے ہی چیخنے کے لیے منہ کھولا۔

"پلیز، میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" داراب نے جلدی سے کہا لیکن اس کے منہ سے چیخ نکل ہی گئی۔

"دیکھو دیکھو شور نہیں مچاؤ۔" داراب نے نرمی سے کہا۔

"میں اس اسٹور سے آیا ہوں جہاں سے تم نے ڈریس چرایا ہے۔"

"اوہ نہیں نہیں۔" لڑکی پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

"بچاؤ بچاؤ۔"

"خدا کے لیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم پر چوری کا الزام عائد کرنے نہیں آیا۔ اگر شور مچاؤ گی تو اپنی پوزیشن خراب کرو گی۔" لڑکی نے دونوں ہاتھ مدافعانہ انداز میں اٹھا لیے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خوف کے باعث پھٹی جا رہی تھیں برابر پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ سنگھار میز کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول سے ٹکرائی اور چیخ مار کر قالین پر گر گئی۔ اسی لمحے اندر سے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ دروازے میں ایک بھاری جسم کی عورت نمودار ہوئی۔ وہ ننگے پیر اور ننگے سر تھی۔

"عروج بیٹی کیا بات ہے۔" عروج نے ہانپتے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ، یہ بدمعاش میرا پیچھا کر رہا ہے۔" موٹی عورت ایک دم دروازے کی طرف مڑی۔

"کون ہو تم۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی [illegible]

داراب نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر بدل چکی تھی۔

"اوہ شمائل تم۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ یہ سنتے ہی عروج کے چہرے پر خوف کے بجائے حیرت نمودار ہوئی۔ وہ کبھی اپنی ماں کو اور کبھی داراب کو دیکھنے لگی۔ شمائل نے بھی داراب کو پہچان لیا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ چند ساعتوں تک دونوں آنکھیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کے خیالات لمحہ بھر میں سفر کرتے ہوئے بائیس سال پیچھے چلے گئے تھے۔

"ذلیل بے شرم۔ تم ابھی تک اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔" بالآخر شمائل نے کہا۔

داراب ایک گہری سانس لے کر بوجھل قدموں سے واپس چل پڑا۔ باہر دروازے کے سامنے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔

"میں نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ کیا اسی گھر سے آ رہی تھی۔" اس نے داراب کو دیکھ کر پوچھا۔

"جی ہاں اسی گھر سے آ رہی تھی۔" داراب نے خشک لہجے میں کہا۔

"خیریت تو تھی۔"

"پہلے نہیں تھی اب ہے آپ کیا ان کے پڑوسی ہیں۔"

"پڑوسی بھی ہوں اور مالک مکان بھی۔" داراب جانے لگا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"بڑے صاحب آپ کے کرائے دار کون کون ہیں۔"

"یہ تو میں ٹھیک نہیں جانتا۔ بڑی مصیبت زدہ عورت ہے۔ شوہر نے کسی امریکن لڑکی سے شادی کر کے اسے چھوڑ دیا تھا۔ بیچاری جوان بیٹی کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔"

داراب نے دوسری دفعہ گہرا سانس لیا اور جب وہ چلا تو اس کے قدم زیادہ بوجھل نہیں رہے تھے۔ نہ جانے کیوں؟

☆------☆------☆

سونو اور محسن ان حادثوں سے اکتائے نہیں تھے۔ وہ ہر اس داستان میں جو پُراسرار ہیرے کے توسط سے ان کے علم میں آ رہی تھی، گم ہو جاتے تھے، ان کی اپنی حیثیت شخصیت بالکل صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی داستان کا ایک حصہ بننے پر مجبور تھے۔

ہر داستان ایک انوکھے موڑ پر ختم ہو رہی تھی اور نئی داستان کا آغاز بھی کچھ ایسے ہی انداز سے ہو رہا تھا۔

اس وقت سونو اور محسن ایک ریستوران میں بیٹھے اس شخص کو دیکھ رہے تھے جس کی کہانی اچانک ادھوری رہ گئی تھی۔ کسی بھی داستان کو مکمل کرنا ان دونوں کے بس میں نہیں تھا وہ شخص سوفٹ ڈرنک لے رہا تھا۔ اس نے بل کی رقم نکال کر میز پر رکھی اور وہاں سے اٹھ گیا۔

"اب کیا کریں؟" سونو نے محسن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے' چلو اب اپنے ہوٹل چلتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔" محسن نے اس کی تھکاوٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

جس وقت وہ ریستوران سے نکل رہے تھے' اس وقت بہت سی نظریں اس خوش لباس' خوب صورت اور نوجوان جوڑے کو ستائشی انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ قدرت نے ان دونوں کو ایک عجیب موڑ پر ملایا تھا۔ اگر سونو کو محسن نہ ملتا تو شاید اس کی زندگی اور حالات اس وقت اس نہج پر نہ ہوتے۔ یہی حال محسن کا بھی تھا۔ اس بات کا احساس ان دونوں کو ہی تھا۔

ماضی نے انہیں وہ کچھ سکھا دیا تھا جو شاید صدیوں میں کسی شخص کو حاصل ہو۔ دونوں ہی ماہر فن تھے۔ انہوں نے ٹیکسی کے ذریعے واپسی کا سفر کیا اور اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ یہ لوگ ایک ہی مشترکہ کمرے میں ٹھہرے تھے۔ اس کے باوجود کہ دونوں جوان تھے' جذبات سے لبریز لیکن اخلاقی اقدار کا پاس رکھتے تھے۔ محسن نے تنہائی میں کبھی بھی ان حدود کو پار کرنے کی نہ تو کوشش کی تھی اور نہ ہی اس طرح کا کوئی خیال اس کے ذہن میں کبھی آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سونو بھی اس پر بھرپور اعتماد کرنے لگی تھی۔ کمرے میں دو علیحدہ علیحدہ بیڈ تھے۔ محسن نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو کر سونو کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا محسن؟" سونو نے اس طرح دیکھنے پر اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی!" اس نے مبہم سا جواب دیا تو سونو اس کے قریب جا بیٹھ گئی۔

"سچ سچ بتاؤ محسن کیا بات ہے؟" سونو نے محسن کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے

"میں یہ سوچ رہا ہوں سونو کہ کیا زندگی اسی کا نام ہے۔ تم سے ملنے سے قبل زندگی میں کچھ دلکشی اور کشش تھی۔ تم سے ملنے کے بعد زندگی کا ڈھنگ تو تبدیل ہوا ہے' لیکن کچھ یکسانیت سی آگئی ہے۔ کیا یہ یکسانیت ہمیں بور نہ کردے گی؟"

"پھر کیا چاہتے ہو؟" سونو نے سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے محسن سے پوچھا۔

"اس زندگی کی یکسانیت سے نکلو' کہیں اور چلو' جہاں زندگی میں رعنائی ہو' مہم جوئی ہو اور کچھ کرنے کا موقع ملے' آخر کب تک ہم اس ہیرے کے سحر میں جکڑے رہیں گے۔" اس کے لہجے سے واقعی اکتاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

"تمہارے پاس اس سلسلے میں کیا تجویز ہے؟" سونو نے اس سے پوچھا۔

"کچھ عرصہ تک اپنے حالات سدھار دو' پھر سکون سے کہیں ڈیرہ ڈال لو۔" محسن نے کہا۔

"کیا واقعی سکون ملے گا؟" سونو نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "محسن! ہم جس ڈگر پر چل نکلے ہیں' اس میں سکون اور آرام جیسی نعمتیں پانا بہت مشکل ہیں۔"

"کوشش تو کی جا سکتی ہے سونو!" محسن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" سونو نے اس سے اتفاق کیا۔

"کل' کل سونو ہم اس سلسلے میں پہلا قدم اٹھائیں گے۔ ہم اپنی باقی زندگی سکون سے گزارنے کے لیے کل سے کوشش کریں گے۔ پھر ہم .... دونوں ہاں سونو دونوں ایک ساتھ نئی زندگی کا سفر شروع کریں گے۔ آج ہم پھر اس ہیرے سے کوئی نئی اور مکمل داستان سنتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ ہمیں کہاں کی سیر کراتا ہے۔" محسن نے ہیرے کو نکال کر درمیانی میز پر رکھ دیا تھا۔

ہیرے سے مدھم مدھم پُراسرار شعاعیں نکل کر پورے کمرے کو سحرزدہ کر رہی تھیں۔

☆-------☆-------☆

یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ انسان ایک ہی شکل' ایک ہی صورت' ایک جیسے مسائل رکھتا ہے۔ مگر سب کی کہانیاں الگ الگ ہیں۔ پتا نہیں یہ ساری کہانیاں ایک جیسی کیوں نہیں ہوتیں۔ اکثر سوچتا تھا' کہیں رشتے ہوتے ہیں' کہیں نہیں ہوتے جو بھرے پڑے خاندانوں میں گھرے ہوتے ہیں وہ خاندانوں سے نالاں ہوتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا وہ

میں بھی تنہا ہی تھا یا تنہا نہیں تھا کیونکہ شمس میرا پورا خاندان تھا۔ میرا واحد
جو عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا لیکن خود کو میرا بزرگ سمجھتا تھا۔ میری تنہائی کی دا-
طویل اور بے مزا ہے۔ اس لیے میں اسے دہرانا پسند نہیں کروں گا۔ بس یوں سمجھ
زندگی پڑھنے میں گزری ہے۔ نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا تھا اور کتابوں میں اتنا غرق ہوا کہ
گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ پھر ایک بار چونکا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو وقت بہت آگے
چکا تھا۔ بالوں میں چاندی جھلک آئی تھی اور چہرہ ست گیا تھا۔

ارے میں بوڑھا ہو گیا۔ میں نے سوچا اور پھر اپنی غفلت کا احساس ہونے لگا
گزرتے وقت کا احساس بے معنی ہوتا ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اپنی تعلیم عملی میـ
میں لاتا تو بہت کچھ بن سکتا تھا لیکن کچھ بننے کو جی نہ چاہا۔ بہت دن تک سوچتا رہا۔
کورٹ انسپکٹر بن گیا۔ نہ جانے کیوں شاید کسی اندرونی جذبے نے سر ابھارا تھا یا اگر
کوئی چیز ہوتی ہے تو اس نے مستقبل کی طرف دھکیلا تھا۔

شمس سے کیسے دوستی ہوئی یاد نہیں مگر بہت اچھا دوست ہے وہ۔ اس کے ساتھ
کر عمر کم ہو جاتی ہے۔ شوخ' کھلنڈرا' ویل ڈریس' ہر طرح فیشن کرنے والا' مصری ا
عمر شریف سے بہت متاثر ہے۔ وہی اس کا آئیڈیل ہے۔ چنانچہ اس کے چوڑے
چہرے پر عمر شریف اسٹائل مونچھیں نظر آتی ہیں۔ مشرقی کاؤ بوائے ہے۔ وہ اکثر چو
چھجے والا ہیٹ لگائے چست لباس پہنے اپنی کھلی چھت کی جیپ میں بیٹھ کر نکلتا ہے
لوگوں کے چہروں پر خوف تلاش کرتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کوئی اس کی بھنچی
غلافی آنکھوں سے مرعوب نہیں ہوتا۔

بہر حال خوب ہے وہ۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔

جو منصب میں نے سنبھالا تھا۔ ابتداء میں تو مجھے اس سے کوئی رغبت محسو
ہوئی لیکن بعد میں اس پیشے میں محنت کرنے لگا۔ بدترین جرائم پیشہ افراد کو اپنے ہاتھ
تو سزا نہیں دے سکتا تھا لیکن انہیں سزائیں دلوانے کا مشغلہ برا نہیں تھا۔ اس سلسلے
بڑے بڑے معرکے ہوتے تھے۔ گناہ گار کو بے گناہ ثابت کرنے والوں سے چونچیں
تھیں ان کے نئے نئے تجربے حاصل ہوتے تھے۔

لیکن شمس مجھ سے مخالفت رکھتا تھا۔

"تم بوڑھے ہو رہے ہو۔"

"تم وقت سے پہلے بوڑھے ہو رہے ہو۔"

"وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے جو خشک زندگی اپنائی ہے وہ تمہیں ذہنی طور پر قتل کر دے گی۔"

"خشک زندگی؟"

"سو فیصدی خشک زندگی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ قانون کی کتابیں' کورٹ میں
چیخنے دہاڑنے کا کھیل اس کے علاوہ کیا ہے تمہاری زندگی میں؟"

"تم نے کبھی اس کا تجزیہ نہیں کیا شمس؟"

"خاک تجزیہ کروں' تجزیہ کرنے کے لیے رکھا ہی کیا ہے زندگی کے تین شعبوں
سے تعلق رکھنے والے لوگ میری نگاہوں میں عجیب حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کون کون سے شعبے؟" میں نے سوال کیا۔

"ڈاکٹر گورکن اور یہ تمہارے پولیس والے یا کورٹ انسپکٹر وغیرہ سمجھ لو پتا نہیں یہ
لوگ اپنی زندگی میں خوش کس طرح رہتے ہیں۔"

"ہوں اور جلادوں کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا" میں نے ہونٹ بھینچ کر
مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے بارے میں ہی گفتگو کر رہا ہوں۔ بات ایک ہی ہو گئی۔" شمس نے
چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے کہا لیکن میں نے اس کی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے
اس سے سوال کیا۔

"تمہارے خیال میں زندگی کیا ہے؟"

"زندگی وہ جو زندگی ہو۔" اس نے حسب عادت کہا۔

"مثلاً؟"

"اب تفصیل بتانا ضروری ہے کیا' بچپن رنگین کھلونوں اور تالیوں سے سجا ہونا
چاہیے اور جوانی چاند سی عورت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ میرا نہیں بلکہ دنیا کے بڑے بڑے
محققوں کا خیال ہے۔ تم اس سوچ کو صرف مجھ سے منسوب مت کر دینا۔ یہی راستے ہیں۔
بچپن سے بڑھاپے تک کے سفر کے لیے اور اگر انسان انہی راستوں سے دور ہو جائے تو
سمجھ لو اس نے اپنی زندگی میں بہت بڑی کمی چھوڑ دی ہے۔"

"مگر میں ان راستوں سے الگ تو نہیں چلنا چاہتا۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے۔"

"ثبوت دو۔" اس نے پُر زور لہجے میں کہا۔

"کیسے؟"

"رنگین کھلونوں اور تتلیوں کی حد سے تو نکل چکے ہو۔ بالوں میں چاندی آ گئی ہے۔ لمبے تڑنگے دیوہیکل گالوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں اور آنکھوں میں دھندلاہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ اس دور سے کیوں نکل آئے ہو جو چاند سی عورت کا دور تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اس دور سے تو نہیں نکلا۔"

"تو پھر چاند سی عورت کہاں ہے؟"

"انتظار کر رہا ہوں اس کا۔" میں نے شمس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"انتظار' تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں تلاش کرتی ہوئی تمہارے پاس آ جائے گی۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"برخوردار من۔ خود آگے بڑھ کر اسے تلاش کرو۔ دیکھو نیل آرمسٹرانگ خود چاند کی تلاش میں گیا تھا۔ چاند تو اسے تلاش کرتا ہوا نیچے نہیں آ گیا تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے میں اس سلسلے میں پیچھے رہ گیا لیکن تم نے کون سے تیر مار دیے' تمہاری چاند سی عورت کہاں ہے؟"

"میں ہر کام ذمہ داری سے کرنے کا عادی ہوں۔ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا۔" شمس نے گال پھلاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب' کیا مطلب؟ گویا تم نے یہ کام شروع کر دیا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر مجھے اس سے لاعلم کیوں رکھا گیا۔ کیا واقعی تم سچ بول رہے ہو؟"

"یقیناً پیارے بھائی لیکن اس سچ کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ بات البتہ کافی دن سے چل رہی تھی لیکن ون وے ٹریفک تھی۔ دوسرا راستہ زیر تعمیر تھا۔ اب اس پر آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔"

"خوب کون ہے وہ؟"

"نام اسماء ہے محترمہ کا اور میری یونیورسٹی میں ہی ہے۔"

"مجھ سے کیوں نہیں ملوایا ابھی تک؟"

"کمال کرتے ہو یار' خود ملتا تو تم سے ملاتا نا' بہت دنوں سے کوشش میں معروف

"حدود اربعہ کیا ہے محترمہ کا؟"

"کچھ نہیں معلوم۔ بس چاند سی لڑکی ہے۔ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں' سارے مشرقی نقوش بھلے بھلے سادہ سادہ عادات و اطوار' میک اپ سے بے نیاز خوب صورت۔ کار میں آتی ہے' بد صورت ڈرائیور کے ساتھ۔" شمس نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

"کہاں رہتی ہے؟"

"دلنشیں ولا۔ عبار روڈ۔"

"باقی معلومات؟" میں نے سوال کیا۔

"ابھی حاصل نہیں ہو سکیں۔"

"دوسری سڑک کھلنے کا احساس کیسے ہوا؟"

"یونیورسٹی کی کینٹین میں کافی کی دعوت قبول کرنے کے بعد اب وہ سلام کر کے خیریت پوچھ لیتی ہے۔"

"بس.........؟" میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب۔ شادی نہیں کی تو کیا باراتیں بھی نہیں دیکھیں۔ اب اتنا تو تجربہ ہے ہی ہمیں۔"

"اور تم اس سلسلے میں سنجیدہ ہو؟"

"کمال کرتے ہو یار' ایسا ویسا سنجیدہ۔ بس یوں سمجھ لو کہ آج تک بڑی شرافت سے زندگی گزاری ہے۔ دراصل اپنا معیار بھی معمولی نہیں ہے۔ کوئی خاتون اس قابل ہی نہیں تھیں۔ بار بار دعوتیں دی گئیں بلکہ کچھ نیک بیبیاں تو بہت آگے بڑھ گئیں لیکن ہم بچ کے راہی ہیں۔"

"گویا عشق صادق ہے۔"

عشق شمس سمجھو کیا سمجھے؟"

"بہر طور دوست' میری دعائیں ترے ساتھ ہیں۔ میں تو تیری کامیابی کا متمنی ہوں۔" میں نے خلوص دل سے کہا۔ شمس واقعی میرا واحد دوست تھا اور میں بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ شمس نے بڑے مولویانہ انداز میں آمین کہا اور بولا۔

"اب تم میرے مشورے پر سنجیدگی سے عمل کر ڈالو۔"

"بہتر ہے پیر و مرشد۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا لیکن خود میرے دل میں اس سلسلے

میں کبھی نہیں جھانک سکا۔ طلب کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک معمول تھا زندگی کا اور بس' احاطہ عدالت سینکڑوں مناظر کا حامل تھا۔ جانے پہچانے اجنبی چہرے' ہتھکڑیاں پہنے ہوئے مجرم' زنانہ پولیس فورس' مردانہ قہقہے' آہیں' پریشانیاں اور خوشیاں یہی زندگی کا معمول تھا اور میں نے اپنے آپ کو اسی زندگی میں ضم کر رکھا تھا۔ نہ جانے کون کون اس عدالت میں آتا تھا۔ کیسے کیسے گھناؤنے الزامات کا حامل' بعض چہرے ان الزمات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے لیکن حقیقت کچھ اور ہی نکلتی پھر اس دن اس لڑکی کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ سادہ لباس' سادہ بال' حسین چہرہ' بڑی بڑی آنکھیں' تیکھے تیکھے نقوش تھکا تھکا سا انداز نہ جانے کیوں مجھے اس چہرے پر ایک ازلی شرافت نظر آئی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ لڑکی آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار ہوئی تھی اور اس پر سرِ راہ فحش اشارے بازی کا الزام تھا۔ پولیس کے ایک اہلکار نے خود اس سے بات کی اور سودا طے ہونے کے بعد اسے تھانے لے آیا۔ ضروری کارروائی کے بعد اسے تھانے میں پیش کیا گیا تھا۔

میں نے چند لمحات تک اس کا جائزہ لیا۔ خود کو بہت تجربہ کار نہیں سمجھتا لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر دل میں ایک تصور ضرور ابھرا تھا' وہ یہ کہ یہ لڑکی بدکار نہیں ہو سکتی۔ بہر حال فرض جذبات سے الگ چیز ہے۔ مجھے اپنی کارروائی کرنی تھی۔ چنانچہ میں نے سلسلے میں تفصیلات معلوم کیں اور اس کے بعد جذبات کو ذہن سے نکال کر کیس کی پیروی کرنے لگا۔

"تمہارا نام؟" میں نے پوچھا۔

"بچی۔"

"اصل نام بتاؤ۔"

"اصل' اصل نام کچھ نہیں ہے جس کا جو دل چاہتا ہے کہہ لیتا ہے۔ ہم کسی کو منع نہیں کرتے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں اپنے جرم کا اعتراف ہے؟"

"جرم۔" اس نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ "کوئی جرم نہیں کیا ہم نے جج صاحب' اگر ضرورت کو جرم کہا جائے تو ان تانا شاہ کو کون روک سکتا ہے۔ (اشارہ میری طرف تھا) اور جس ضرورت کو الزام کہا گیا ہے' وہ غلط نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی میری ضرورت پیش آجائے۔ ایسے وقت کے لیے میرا پتا لکھ لو [illegible]

سترہ بلیو اسکوائر۔"

"گویا تمہیں اعتراف ہے۔"

"ہاں میری ضرورت ناگزیر تھی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"جناب والا' اس کیس میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ سماج کے یہ ناسور جگہ جگہ رس رہے ہیں۔ ان کا سدباب ضروری ہے۔"

"ضرورت سے زیادہ نہ بولو وکیل صاحب! ہم سماج کے ناسور نہیں' اپنی ذلت کے ناسور ہیں۔ ہم نے اپنے وجود کو زخم بنا لیا ہے اور یہ تمہارے سماج کی خدمت ہے۔ ہم تمہاری ناپاک خواہشوں کا زہر خود میں سمیٹ کر خود سڑتے رہتے ہیں اور جراثیم تمہارے گھروں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ اگر ہم یہ سب کچھ نہ کریں تو' تو جج صاحب.......... زبان نہ کھلواؤ۔ توہین عدالت ہوگی۔" کچھ ایسا اثر تھا ان الفاظ میں' کچھ ایسی کیفیت تھی کہ میں مرعوب ہو گیا۔ لڑکی پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ عدالت نے اسے پندرہ دن قید اور تین ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی تھی۔ لیڈی پولیس اسے باہر لے گئی لیکن میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں سادہ چہرے کی وہ لڑکی میرے حواس پر مسلط ہو گئی۔ میں کئی دن تک پریشان رہا۔ ایک دن شمس نے کہہ ہی دیا۔

"یار حیدر' کچھ پریشان لگتے ہو۔"

"سخت پریشان ہوں۔"

"اس کی وجہ؟" شمس نے پوچھا۔ لیکن اسے کچھ بتانا مصیبت مول لینے کے مترادف تھا چنانچہ میں نے رخ بدل لیا۔

"تمہارا عشق۔ تمہارے اندر کچھ اور تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سو تو ہے۔" شمس بہل گیا۔

"مجھے خطرہ ہے کہ کہیں جنگل میں نہ نکل جاؤ۔ آثار نمودار ہوتے جا رہے ہیں۔"

"یار کیوں خوفزدہ کر رہے ہو۔ ہمت بڑھانے کے بجائے تم ایسی باتیں کر کے میری ہمت توڑ رہے ہو۔"

"کون سے اسٹیج پر ہو آج کل؟"

"ہوٹل میں کھانا کھلا چکا ہوں۔"

"[illegible]؟"

"بس ایک دفعہ۔"

"کیا گفتگو ہوئی؟"

"بس یہی کہ چیکو کی آئس کریم کچھ اچھی نہیں ہوتی۔ بازن اور کیش میں کیا فرق ہے؟"

"یہ رومانی گفتگو تھی؟"

"جو کچھ بھی تھی' یہی تھی۔" شمس نے بے بسی سے کہا۔

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"مفت مشورہ درکار ہے۔"

"مفت مشورہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔

"دلنشیں ولا میں کتنے کتے پلے ہوئے ہیں؟"

"کتے؟" شمس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"پتا نہیں معلوم نہیں کیا۔"

"معلوم کرو۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی بتاؤ کہ تمہیں کتوں سے جنگ کرنے کا کوئی تجربہ ہے یا نہیں؟"

"یار پتا نہیں کیا الٹی سیدھی گفتگو کر رہے ہو' کتوں سے جنگ کرنے کی کیا تک ہے۔ کون سے کتوں سے جنگ کرنا پڑے گی مجھے۔ میرا خیال ہے تم مذاق اڑا رہے ہو۔" شمس نے منہ پھلاتے ہوئے کہا اور مجھے ہنسی آگئی۔

"بے وقوف آدمی' پریشان کیوں ہے عشق کر رہا ہے کرتا رہ' اس کا دل ٹٹول کہ اس کے دل میں کیا ہے؟"

"کیسے دل ٹٹولوں یار' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ تم جانتے ہو۔ میں ان راستوں کا راہی نہیں ہوں بس پہلی ہی بار کوئی دل کو بھایا ہے لیکن ایک بات تم اچھی طرح سمجھ لو حیدر کہ اس کے علاوہ اب میں دنیا میں کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔"

"زندہ باد' زندہ باد عشق اتنا ہی پختہ اور مضبوط ہونا چاہیے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم اسی طرح میرا مذاق اڑاتے رہو گے' مجھے کوئی مشورہ نہیں دو گے؟"

"کیوں نہیں میری جان کیوں نہیں۔ کہہ تو چکا ہوں پریشان ہونے سے کیا فائدہ' میں تیرے ساتھ ہوں۔ ملتا رہ اس سے اور صورت حال سے بھی مجھے آگاہ رکھنا۔"

"تم اب ان معاملات کو سنبھالو گے حیدر' میں نے تم سے آخری بات کہہ دی ہے۔"

"بالکل آخری۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور شمس منہ پھلا کر چلا گیا۔

میں اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک ہنستا رہا تھا۔ واقعی پیارا نوجوان تھا۔ آج کل کے فراڈ قسم کے لڑکوں سے بالکل مختلف اور مجھے اس کی یہ ادا پسند تھی۔ یہ بھی جانتا تھا کہ جو فیصلہ اس نے کر لیا ہے وہ معمولی نہیں ہوگا اور وہ اس سلسلے میں بالکل سنجیدہ ہے۔

بہر طور اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ شمس ایک اچھے گھرانے کا کھاتا پیتا لڑکا تھا۔ کوئی بھی لڑکی یا لڑکی کے والدین اسے پسند کر سکتے تھے۔ آج کل ویسے ہی لڑکوں کا کال تھا چنانچہ شمس کا مسئلہ اتنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کسی مناسب وقت دیکھ لیا جائے گا۔

معمولات جوں کے توں جاری رہے لیکن ایک چیز میرے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ جب بھی فرصت ملتی وہ لڑکی میرے ذہن میں در آتی۔ جسے ایک فاحشہ کی حیثیت سے عدالت میں لایا گیا تھا اور جس نے ایک عجیب و غریب بیان دیا تھا۔ اس کے الفاظ میں بڑی سچائی تھی۔ اس کے انداز میں بڑی گہری سوچ جھلک رہی تھی لیکن اس نے جو لہجہ اختیار کیا تھا وہ اس سوچ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس سے اتنا متاثر تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ تاثر کم نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے کیس آ چکے تھے میرے پاس بہت سے دلدوز واقعات سے الجھ چکا تھا لیکن وہ لڑکی ذہن سے محو نہیں ہو رہی تھی اور سب سے تعجب خیز بات یہ تھی کہ مجھے اس کی سزا کا ایک ایک دن یاد تھا۔

پھر ایک صبح آنکھ کھلی تو ذہن میں ایک کلک سی ہوئی۔ پندرہ دن پورے ہو چکے تھے۔ یعنی آج وہ رہا ہو رہی ہوگی۔ بڑا احمقانہ خیال تھا۔ خود پر ہزار ہا نفرین کی لیکن کم بخت ذہن سے چپک ہی گئی تھی۔

دن بھر کورٹ میں اس کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر آخر میں فیصلہ کیا کہ اس سے ملاقات ضرور کروں گا۔ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ بس اتنا معلوم کرنا تھا اس سے زیادہ میرے ذہن میں اور کوئی بات نہیں تھی۔ ہمت کرتا رہا۔ اس کا پتا مجھے زبانی یاد تھا بلیو سکوائر

دوسری منزل فلیٹ نمبر سترہ۔ خود پر ہنستا بھی رہا تھا لیکن بہرطور اس دنیا کا ایک پختہ کار انسان تھا اور پھر میرا پروفیشن ایسا تھا کہ اس میں اشتیاق لازمی چیز تھی۔ چنانچہ میں نے خود کو وہاں جانے سے نہیں روکا۔ شام کو تیار ہو کر گھر سے باہر نکل آیا اور تھوڑی ہی دیر بعد بلیو سکوائر پہنچ گیا۔

دوسری منزل کے فلیٹ نمبر سترہ کے سامنے پہنچنے کے بعد دل نے ایک بار پھر سمجھایا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جانا۔ عزت بڑی اہم چیز ہوتی ہے۔ کسی نے یہاں دیکھ لیا' کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں یہاں اس انداز میں آیا ہوں تو پھر بدنامی سے بچا نہیں جا سکتا لیکن جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ دل نے جواب دیا اور میں نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

دروازہ کھولنے والی ایک عمر رسیدہ عورت تھی' اس نے مجھے دیکھا اور بولی۔

"آج کسی سے نہیں ملیں گی۔"

"مجھ سے ملیں گی۔" میں نے برجستہ جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔"

"کب بلایا ہے؟"

"تم اندر جا کر انہیں اطلاع دو۔"

"اندر آ جاؤ۔" بوڑھی عورت دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی اور میں اندر داخل ہو گیا۔ انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رہا ہو کر آ گئی ہے۔

بوڑھی عورت نے مجھے ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جس میں کسی خاص پرکاری سے کام نہیں لیا گیا تھا لیکن ہر شے میں نفاست تھی۔ میں انتظار کرتا رہا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ تھکی تھکی سی' سادہ سے لباس میں ملبوس' بکھرے ہوئے بال' غمزدہ آنکھیں۔ اس نے اندر داخل ہونے کے بعد مجھے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک صوفے پر آ بیٹھی۔

"میں نے آپ کو کب بلایا تھا؟" اس نے کہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا اس نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کیا پہچانتی' ویسے بھی اس وقت میں بدلے ہوئے حلیے میں تھا۔

"آپ بھول رہی ہیں محترمہ!"

"جی کیا مطلب؟"

"جی ہاں' پندرہ دن پہلے آپ نے مجھے دعوت دی' تھی

گھر کا پتا لکھ لو تانا شاہ! فلیٹ نمبر سترہ' دوسری منزل بلیو سکوائر۔"

"تانا شاہ!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور دفعتاً اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوہ! اوہ آپ وہ ہیں۔ وہی میرا مطلب ہے کورٹ انسپکٹر۔"

"جی ہاں' جی ہاں' میں وہی ہوں لیکن اس وقت آپ بڑا شستہ لہجہ اور صاف زبان استعمال کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کیا میں پہلے اردو نہیں بولتی رہی؟"

"اردو تو بولتی رہی ہیں لیکن ذرا مختلف انداز سے۔"

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ خیر چھوڑیئے' فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔"

"آپ کی اس دن کی تقریر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے آیا تھا۔"

"رہنے دیجئے بابو جی' بے کار باتیں ہیں یہ سب۔ ہمیں بھی غصہ آ گیا تھا۔ کہہ گئے ہوں گے کچھ۔ ویسے سچ مانو ہم نے غلط نہیں کہا تھا۔"

"بالکل سچ کہا تھا آپ نے اور اس کی تصدیق کے لئے آپ کے پاس حاضری دی ہے۔"

"تول مول کر کے بات کر رہے ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم پسند آ گئے تھے۔" اس نے ناز بھرے انداز میں کہا اور ہنس پڑی۔

"ہاں آپ پسند آ گئی تھیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ میں آپ کا نام بھی نہیں لے سکتا۔"

"ہوں آپ کا نام کیا ہے؟"

"حیدر' حیدر زماں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے اس کی مناسبت سے ہمارا بھی کوئی نام رکھ لو۔ ہمارے تو ویسے بھی مختلف نام ہوتے ہیں۔"

"محترمہ! میں آپ کا اصلی نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"اس دن بھی آپ اصلی نقلی کے چکر میں پڑ گئے تھے اور خاصے غصے میں تھے۔ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا بابو جی! پتا نہیں انسان کون کون سی منزلوں سے گزر کر اور کن کن راستوں پر چل کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ اس کے راستے کے بارے میں مت

"تم کون ہو؟ تم وہ نہیں لگتیں جو خود کو ظاہر کرتی ہو۔"

"ہر شخص وہ نہیں لگتا جو خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اب تم خود دیکھ لو' تم ہر قسم کے مجرموں کو سزائیں دلواتے ہو لیکن اپنی ذات میں تم خود بھی مجرم ہو۔ کیا تمہیں یہاں آتے ہوئے اس دکھ کا احساس نہیں ہوا جو تمہارے ضمیر نے برداشت کیا ہو گا؟"

"ہوا تھا لیکن تم غلط فہمی سے نکل آؤ۔ میں کوئی گھناؤنا مقصد لے کر تمہارے پاس نہیں آیا۔ بس دل میں یہ خواہش تھی کہ تم سے تمہارے بارے میں معلوم کروں۔"

"نہیں بابو جی' بات سنو۔ میں آج ہی رہا ہو کر آئی ہوں۔ میرا خیال ہے تمہیں میری رہائی کا صحیح دن بھی معلوم تھا۔"

"ہاں میں نے ایک ایک دن یاد رکھا ہے۔"

"کیوں آخر کیوں؟"

"بس تجسس اور تمہارے بارے میں جاننے کا شوق۔"

"ہوں تو میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تھکی ہوئی ہوں۔ جیل کی زندگی اچھی تو نہیں ہوتی اور وہ بھی پُرمشقت زندگی اور ہم جیسی عورتوں کی مشقت کیا ہوتی ہے؟ اس کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو گا۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا اور نہ ہی تمہارے ذہن پر کوئی بار لادوں گا۔ بس میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دو۔"

"تمہارے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دوں یا۔" وہ بولی اور پھر ایک دم ہنس پڑی۔ میں سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا تھا پھر میں نے کہا۔

"میں تمہارے اس دن کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

"ارے تو پہلے کیوں نہیں کہا۔ بلاوجہ' دراصل میں پھوکٹ کے گاہکوں کو پسند نہیں کرتی۔"

"میں تمہارا گاہک نہیں ہوں لڑکی۔"

"ٹھیک ہے ہر شے مختلف انداز میں استعمال کی جاتی ہے۔ تم اپنے ذہن کی تسکین کے لئے یہاں آئے ہو۔ گاہک تو ہوئے نا۔ نکالو دو سو روپے۔" وہ بولی اور میں نے دو سو روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"کہو اب کیا چاہتے ہو؟"

"تم کون ہو؟"

"میرا نام زاہدہ ہے' کیا سمجھے؟ اور اصلی نام ہے۔ دو سو روپے تو تمہارے وصول ہو گئے۔"

"یہ دو سو روپے اور رکھو اور اس کے بعد اپنے بارے میں مزید تفصیل بتاؤ۔"

"نہیں بابو' ماضی انمول ہوتا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ میں نے اپنے ماضی کو قیمتی سرمائے کی مانند اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے۔ یہ قیمتی خزانہ کاغذ کے ٹکڑوں کے عوض کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ آئے ہو' بیٹھو' باتیں کرو' جو کچھ بھی چاہتے ہو بتا دو لیکن میرے ماضی کو ٹٹولنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کے بارے میں' میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ کبھی نہیں' کسی قیمت پر نہیں۔"

میں تشنہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تمہاری مرضی ہے زاہدہ میں پندرہ دن تک ذہن میں تجسس چھپائے رہا ہوں۔ اگر تم میری مدد کرنا نہیں چاہتیں تو نہ کرو' تمہاری مرضی۔"

"مدد۔" وہ آہستہ سے بولی۔ پھر کہنے لگی۔ "چائے پیو گے؟"

"ہاں پلوا دو۔" میں نے کہا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ بوڑھی ملازمہ سے شاید چائے کے لئے کہہ کر اندر آ گئی تھی۔ "تمہارے انداز میں بڑی اپنائیت ہے بابو جی! لیکن اس دن تو تم نے بڑی بے رحمی کا سلوک کیا تھا۔"

"ہاں اس وقت مجھے تمہارے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن جوں جوں سوچتا رہا میرے ذہن میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوتا چلا گیا۔"

"بے کار سی باتیں ہیں یہ سب۔ اس دور میں جس کسی کو بھی دیکھو گے' اندر سے کچھ باہر سے کچھ نظر آئے گا اور یہ دہری شخصیت انسان نے مجبوراً اپنائی ہے۔ ورنہ کون اپنے اوپر خول چڑھا کر اپنے آپ کو دوغلا کرنا پسند کرتا ہے۔"

"تم تعلیم یافتہ ہو؟"

"میں صرف زاہدہ ہوں۔ فاحشہ' سوسائٹی گرل' جو نام بھی تم دے لو۔"

"پلیز اب یہ باتیں مت کرو زاہدہ۔"

"چلو ٹھیک ہے تمہارے دل میں میرے لئے گداز پیدا ہو گیا۔ یہ اچھی بات ہے اور پھر تم جیسے لوگوں سے شناسائی تو ہمارے لئے فائدہ مند ہی ہوتی ہے۔" وہ ایک آنکھ بند کر کے مسکرائی۔

[illegible]

کروں۔ میں نے شکریہ ادا کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے زاہدہ' آئندہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھ سے ضرور مل لینا۔ میں تم سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔ یہ پیسے اٹھا کر رکھ لو۔"

"نہیں زاہدہ' رہنے دو۔"

"آج میرے آرام کا دن تھا۔ تم آئے' مجبوراً تم سے ملی لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی معمول سے ہٹ کر بھی میرے پاس آیا۔ ورنہ میں اس قابل کہاں تھی۔ رکھ لو یہ پیسے' یہ میرے لئے حرام ہیں۔ ہاں ہنسو اس بات پر کہ میں حلال و حرام کا فرق جانتی ہوں۔ جو کام نہ کیا جائے اس کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا۔ میری لغت میں وہی حرام ہے۔ رکھ لو خدا حافظ۔" اس نے کہا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ میرے لئے اب وہاں رکنا ممکن نہیں تھا لیکن اس نے مجھے پہلے سے زیادہ الجھا دیا تھا۔ اس نے اپنے کردار کا ایک انوکھا نقش چھوڑا تھا مجھ پر' یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ وہ' وہ نہیں تھی جو اس دن اپنے آپ کو عدالت میں بتا کر پیش کر رہی تھی کون ہے۔ کون ہے آخر؟ وہ کون ہے؟

ذہن میں لاتعداد الجھنیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن کسی ایک شخصیت کے بارے میں بہت دیر تک سوچنا میرے لئے ممکن بھی نہ تھا۔ ہزاروں مسائل تھے دوستوں کی ویسے بھی کمی تھی۔ فطرتاً بھی بہت زیادہ دوست بنانے کا عادی نہیں تھا۔ ایک شخص تھا جس سے زندگی کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ شمس نے کافی دن کے بعد مجھ سے ملاقات کی تھی۔ میں نے اس سے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اس کا مقصد ہے اب تمہاری مصروفیات مختلف ہو گئی ہیں۔ کہو کیا حال ہے ان محترمہ کا۔"

"بہت عمدہ' بہت ہی عمدہ یار' ایک خاص مسئلے کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ وقت نکالنا پڑے گا۔"

"ہاں' ہاں کہو' کیا بات ہے؟"

"ذرا چلنا ہے۔"

"کہاں؟"

"بھئی دلنشیں۔" اس نے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے اس انداز پر بے اختیار میرا قہقہہ نکل گیا۔

"سسرال کا نام لے کر اس طرح شرمایا جاتا ہے' اس کا مجھے پہلی بار تجربہ ہوا ہے۔"

"اب جو کچھ بھی سمجھ لو۔ مذاق اڑانے والے بھی تم ہی ہو اور' اور.........." شمس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ٹھیک ہے مگر پروگرام کیا ہے۔"

"دراصل ان کی بہن۔"

"اوہو ان۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"دیکھو' مجھے غصہ آ جائے گا۔ بات بات پر مذاق مت اڑاؤ۔"

"اچھا ٹھیک ہے آگے بڑھو۔"

"وہ میرا مقصد ہے اسماء کی بہن آئی ہوئی ہیں۔ وہ کسی فرم میں اچھی حیثیت پر ملازم ہیں اور فرم کی طرف سے مختلف ممالک کا دورہ بھی کرتی رہتی ہیں۔ زیادہ تر ان کی مصروفیات ملک سے باہر ہی ہوتی ہیں۔ بس کبھی مہینے پندرہ دن کے لئے آ جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے اسماء نے ان سے میرا تذکرہ کیا ہے۔ ابھی تک خود میری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ کل شام کو کھانے پر دعوت دی ہے اور میں نے اسماء سے کہہ دیا ہے کہ تم بھی میرے ساتھ آؤ گے۔"

"ہُنہ گویا میرا تعارف بھی ہو چکا ہے ان خاتون سے لیکن بدقسمتی سے میں ابھی تک ان کی زیارت سے محروم ہوں۔"

"تو پھر کل شام کو پانچ بجے میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور ہاں کوئی اور مصروفیت نہیں ہونی چاہئے۔"

"نہیں میرے یار' تیرا مسئلہ دنیا کے تمام مسئلوں سے زیادہ اہم ہے میرے لئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شمس بہت دیر تک مجھ سے گفتگو کرتا رہا اور اس کے بعد خوش خوش رخصت ہو گیا۔ تنہائیاں صرف اس کی ذات کے لئے مخصوص تھیں جس نے میرے ذہن میں ایک زخم سا بنا دیا تھا۔ حالانکہ ایک پیشہ ور عورت تھی' ایک سوسائٹی گرل تھی جس کے بارے میں تنہائی میں سوچنا بھی گناہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں وہ میرے ذہن پر اس قدر حاوی ہو چکی تھی۔

دوسرا دن کورٹ میں گزرا۔ میں نے اپنی مصروفیات اس طرح منتخب کی تھیں کہ شمس کے معاملے میں تساہل نہ ہو۔ پانچ بجے گھر پہنچ گیا اور پانچ بج کر پانچ منٹ پر شمس

میرے پاس پہنچ گیا۔ بہت ہی عمدہ قسم کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسم سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ انگلی اٹھا کر بولا۔

"خدا کی قسم' اگر ایک بھی جملہ مذاق اڑانے کے لئے کہا تو ناراض ہو جاؤں گا۔ نہ خود وہاں جاؤں گا' نہ لے جاؤں گا۔"

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ شمس نے خود ہی میرے لئے لباس کا انتخاب کیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم دلنشیں کی جانب چل پڑے۔ خوبصورت عمارت تھی۔ رکھ رکھاؤ بھی اچھا تھا۔ اسماء نے برآمدے میں استقبال کیا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا اور دل ہی دل میں شمس کی پسند کی داد دی۔ بلاشبہ اس نے اسماء کے بارے میں جو کچھ بھی کہا تھا' درست کہا تھا۔ سادہ سی طبیعت کی سادہ سی لڑکی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور آہستہ سے بولی۔

"حیدر صاحب!"

"ہاں اسماء میں حیدر ہوں۔"

"یوں سمجھیں کہ میں آپ سے اتنی ہی واقف ہوں جتنے آپ کے تمام قریبی لوگ ہو سکتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور پھر ہمیں اندر لے گئی۔ ڈرائنگ روم پُر تکلف طور پر آراستہ تھا۔ پورچ میں' میں کار بھی کھڑی دیکھ چکا تھا۔ جس کے پاس ڈرائیور موجود تھا۔ گویا ان لوگوں کے مالی حالات خاصے بہتر تھے۔ اسماء نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور ابھی وہ باہر بھی نہ نکلی ہو گی کہ اس کی بہن اندر داخل ہو گئی۔ اندر گھستے ہی اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"معاف کیجئے گا کچھ منٹ' کچھ منٹ۔" اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور میری اس پر اور میرے ذہن کو اتنا شدید جھٹکا لگا کہ شاید میری بینائی ہی چند لمحے کے لئے گم ہو گئی تھی۔ میں اندھوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شاید اپنا جملہ پورا کیا اور سامنے صوفے پر آ بیٹھی لیکن مجھے اب بھی اس کی شکل واضح نظر نہیں آ رہی تھی البتہ میں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار کسی پر نہ ہونے دیا۔ ناقابل یقین بات تھی' بالکل ہی ناقابل یقین۔ یہ وہی تھی' ہاں یہ وہی تھی جس نے اپنا نام زاہدہ بتایا تھا۔ رفتہ رفتہ میری کیفیت کسی حد تک بہتر ہونے لگی اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے سفید پڑا ہوا تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن' لیکن اس کا ایک ایک تاثر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ شدت حیرت سے دیوانی

ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح کنٹرول کیا۔ یہ صورت حال میرے لئے بہت حیرت انگیز تھی۔ شمس اور اسماء نہ جانے کیا کیا باتیں کر چکے تھے۔ میں مسکرایا اور میں نے زاہدہ کی طرف دیکھا۔

"شمس آپ لوگوں کی بہت تعریفیں کرتا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید آپ کو اس سلسلے میں مایوسی ہو۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں' اسماء بہت پیاری بچی ہے۔ میں اپنے آپ کو چہرہ شناس تو نہیں کہتا لیکن تھوڑی بہت شد بد ہے مجھے اس سلسلے میں۔"

"بے حد شکریہ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ کسی نے ہم دونوں کی کیفیت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اسماء اور شمس اب ایک دوسرے سے بہت زیادہ بے تکلف ہو چکے تھے اور اپنے بجائے کسی اور سلسلے میں کچھ سوچنے پر آمادہ نہیں تھے۔ نہ جانے کیا کیا گفتگو ہوتی رہی' نہ جانے کیا کیا الفاظ ادا کئے گئے' میں بھی بول رہا تھا لیکن نہ بولنے کی مانند۔ اس کے بعد کھانے کا وقت ہوا۔ بہت ہی پُر تکلف میز سجائی گئی تھی۔ میں اس کی کیفیت میں وہی کھویا کھویا پن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی بے انتہا کوشش کی تھی لیکن انسان ہی تھی اور خود کو چھپانے میں ناکامی محسوس کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک ہم لوگ ساتھ رہے اور پھر شمس نے اجازت مانگ لی۔ وہ دونوں باہر برآمدے تک ہمیں چھوڑنے آئی تھیں۔ ہم لوگ چل پڑے۔ شمس نے راستے میں پوچھا۔

"کہو' کیا خیال ہے؟"

"بہت مناسب' نہایت موزوں شمس! میں تمہیں تمہارے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔"

"زاہدہ بہن بھی بہت ہی نفیس طبیعت کی مالک لگتی ہیں۔ بالکل احساس ہی نہ ہونے دیا انہوں نے کہ ہم اجنبی ہیں۔"

"کیا اسماء اپنی بہن کو تمہارے بارے میں تفصیلات بتا چکی ہے؟"

"ہاں اسماء نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے لئے ایک ساتھی منتخب کر چکی ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ دعوت بھی اسی سلسلے میں تھی۔ حیدر بس اب ایسا ہے کہ تمہیں میرے گھر آنا پڑے گا امی اور ابو کو تیار کرنا پڑے گا۔ ویسے تو کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ میرے گھر والے بہت ہی روشن ذہن کے مالک ہیں۔ انہوں نے

بارہا اس بات کا مجھ سے تذکرہ کیا ہے کہ جب بھی میں کسی کو اپنے ذہن میں پاؤں ان کو بتا دوں۔ وہ اسے میری زندگی میں شامل کر دیں گے۔ مجھے غلط راستوں کا راہی نہیں بننا چاہئے۔"

"میں ان لوگوں سے مل لوں گا۔ تم اطمینان رکھو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ شمس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ذہن و دل میں طوفان برپا تھا۔ ایک اور خوفناک دھماکا ہوا تھا میرے ذہن میں۔ اسماء کی بہن زاہدہ' وہ خود تو بلیو سکوائر کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے اور اس کی بہن؟ کیا پُراسرار کہانی ہے' کیا عجیب واقعہ ہے۔ بہرطور میں خود کو باز نہ رکھ سکا۔ اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب میں بلیو سکوائر کے فلیٹ نمبر سترہ پر کھڑا کال بیل بجا رہا تھا۔ دروازہ اسی بوڑھی ملازمہ نے کھولا اور مجھے دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"زاہدہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی اندر آ جایئے۔" ملازمہ نے جواب دیا اور میں اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بڑا عجیب سا احساس تھا دل میں وہ کیا کہہ کر دلنشیں سے واپس آئی ہو گی۔ اس میں تو کوئی شک و شبہ ہی نہیں تھا کہ زاہدہ وہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں' میں نے اسے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ صوفے کی پشت سے گردن ٹکائے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات کا اظہار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں کیا لیکن صورت ہی سے نڈھال نظر آ رہی تھی۔ میں خاموشی سے ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ چند لمحات مجھے اسی طرح دیکھتی رہی پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" اس نے کہا۔

"تمہیں یقین تھا میں آؤں گا؟"

"ہاں یقین تھا کیونکہ یہ غیر فطری بات نہیں ہے۔"

"شکریہ زاہدہ! یقیناً ایسا ہی ہے لیکن کیا میری حیرتوں کو بھی غیر فطری سمجھا جا سکتا ہے؟"

"نہیں ہرگز نہیں بس حیدر صاحب! ہوتا ہے زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ بات بننے سے پہلے بگڑ جاتی ہے۔ میں بہت غمزدہ ہوں' بے حد غمزدہ۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا' کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا۔"

"چائے نہیں پلاؤ گی زاہدہ؟" میں نے سوال کیا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"تم مجھ سے ناراض نہیں ہو حیدر؟" اس نے کسی قدر متحیرانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"فرشتے ہو۔ بالکل فرشتے ہو۔ آسمان سے کب اترے؟" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"پتا نہیں' یاد نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور پھر بولا۔ "چائے کے لئے ٹالنا چاہتی ہو تو دوسری بات ہے۔"

"نہیں' چائے منگواتی ہوں۔" اس نے کہا اور وہیں بیٹھے بیٹھے ملازمہ کو آواز لگا دی۔ چائے لانے کے لئے کہا اور پھر مجھے گھورنے لگی۔

"خود کو بہت زیادہ باظرف ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ یہ بتاؤ اب تمہارا کیا نظریہ ہے؟"

"زاہدہ' پہلی بات میں یہ کہہ دوں کہ میں آوارہ منش یا اوباش فطرت انسان نہیں ہوں۔ اپنے بارے میں کوئی کہانی نہیں سنانا چاہتا تمہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ بہت ہی عجیب سی زندگی گزری ہے۔ اس دن عدالت میں تمہیں دیکھا' تمہارے خلاف کارروائی کی لیکن تمہارے الفاظ نے ذہن میں ایک کرید سی پیدا کر دی۔ میں تمہیں جاننا چاہتا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی زاہدہ کہ تم مجھے وہ نظر نہیں آئی تھیں جو خود کو ظاہر کرنا چاہتی تھیں۔ یہی بنیاد تھی کہ میں نے دوبارہ تم سے ملاقات کی۔ ہماری یہ ملاقات جو آج شمس کے ساتھ ہوئی بالکل غیر متوقع تھی۔ انسانی کمزوریوں' انسانی مجبوریوں کا براہ راست مجھ سے واسطہ رہا ہے۔ کوئی بھی شخص برا نہیں ہوتا۔ صرف حالات اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ میری ایک بات کان کھول کر سن لو زاہدہ! فیصلہ کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں نے تمہاری شخصیت کو جس رنگ میں دیکھا ہے اس کا شمس کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اپنی نیت کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ تم جو کچھ کر رہی ہو کیوں کر رہی ہو۔ وہ کون سے عوامل تھے جو تمہیں یہاں تک لے آئے لیکن اس جذبے نے مجھے متاثر کیا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو اپنی بہن سے دور رکھ کر اس کا مستقبل بنانے کی کوشش کی ہے۔ زاہدہ اس دور کو میں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں کیونکہ ذہنی طور پر نابالغ نہیں ہوں۔ میں ان حالات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ ان واقعات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو تمہیں اس منزل تک لے آئے۔ یقیناً تم بری انسان نہیں ہو کیونکہ تمہارے ذہن میں اچھائیاں جاگزیں ہیں۔ مجھے اپنے بارے میں تفصیل بتاؤ زاہدہ' یہ میرا حق ہے۔ یہ شمس کا اور اسماء کا مستقبل ہے۔ کیا تم مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی؟"

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے بارے میں ایک ایک تفصیل بتاؤں گی حیدر! سنو غور سے سنو۔"

"چھوٹا سا گھر تھا ایک میرا جس میں' میں بھی عزت دار بیٹیوں کی مانند رہتی تھی۔ امی تھیں' ابو تھے اور ایک چھوٹی بہن۔ میرے ابو ایک شریف النفس انسان تھے۔ کاروبار کرتے تھے اور سکون سے زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ہمارے عزیز و اقارب نہیں تھے۔ بس ابو کے دوست ہی ہمارے رشتے دار تھے۔ ان سے ملنا جلنا رہتا تھا۔ ہم دونوں بہنیں بڑے ناز و نعم سے پرورش پا رہی تھیں لیکن حالات کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ میری امی بیمار ہو گئیں۔ معمولی سا بخار تھا جو بے احتیاطی کی وجہ سے نمونیے میں تبدیل ہو گیا اور ان کی حالت بگڑنے لگی۔ ابو سخت پریشان تھے لیکن امی کی زندگی بچانے کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ نمونیہ بری طرح بگڑ گیا اور بالآخر وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہماری پُرسکون زندگی تباہ ہو گئی۔ ابو اس سے بستر سے لگ گئے۔ میں میٹرک کا امتحان دے چکی تھی لیکن ابھی گھرداری کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ امی نے ساری ذمہ داری اپنے ہی شانوں پر سنبھال رکھی تھی۔ اس لئے میں گھریلو معاملات کو نہ سنبھال سکی اور بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ابو بیچارے بہت پریشان رہنے لگے۔ میری تعلیم بھی وقتی طور پر رک گئی تھی۔ جس کی ابو کو بے حد فکر تھی۔ انہوں نے میرے بارے میں وہی تمام خواب دیکھے تھے جو ماں باپ اولاد کے لئے دیکھتے ہیں۔ بہرطور وقت گزرتا رہا۔ کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن بالآخر ابو نے ایک فیصلہ کیا۔ انہوں نے معقول تنخواہ پر ایک ایسی بزرگ خاتون کو ملازم رکھا جنہیں گھر کی دیکھ بھال کے فرائض سنبھالنے تھے اور کھانا وغیرہ پکانا بھی ان کی ذمہ داری تھی۔

بزرگ خاتون نے ابتدا میں تو بڑے اچھے طریقے سے گھر سنبھالا لیکن بعد میں اصلیت پر اتر آئیں۔ گھر کی چیزیں آہستہ آہستہ غائب ہونے لگیں۔ ان کے رشتے داروں میں سے بھی کوئی نہ کوئی مہمان گھر میں ضرور رہتا تھا۔ ابو نے ہم دونوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ خود کو سنبھالا اور کاروبار کی جانب متوجہ ہو گئے لیکن جب بزرگ خاتون صحیح روپ میں سامنے آئیں تو گھر کی طرف سے پھر پریشانیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ بزرگ خاتون گھٹری کی سی فطرت رکھتی تھیں اور ان کے ہاتھ پاؤں کافی دراز تھے' ان کے رشتے داروں میں نوجوان لڑکوں کا بھی گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ ابو انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ میں اپنے حالات سے مجبور تھی۔ بزرگ خاتون نے گھر پر خاصا تسلط جما لیا تھا اور ان سے کچھ

کہتے ہوئے ابو کو خوف محسوس ہوتا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی اور پریشانیاں پھر اس گھر میں بسیرا کر لیں گی۔ نقصانات برداشت کئے جاتے رہے لیکن ابو نے ان بزرگ خاتون سے کچھ نہ کہا لیکن پھر جب ایک دن ان بزرگ خاتون کے ایک رشتے دار لڑکے نے ایک شام مجھے ایک خط دیا جس میں اظہار عشق کرتے ہوئے فلم دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی تو میں نے وہ خط ابو کو دے دیا ابو کے لئے اب یہ حرکتیں ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔ انہوں نے وہی خط ان بزرگ خاتون کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ انہیں یہاں نہیں رکھ سکیں گے۔

بزرگ خاتون کی اچھی خاصی آمدنی ختم ہو رہی تھی۔ انہوں نے بہت کوششیں کیں۔ اس نوجوان کو برا بھلا کہا لیکن ابو کا پیمانہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اس موقعے کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتے تھے جو ان خاتون سے نجات حاصل کرنے کا تھا۔ ہر طرح کا خوف دامن گیر تھا لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہی انہیں اپنی عزت بہت عزیز تھی چنانچہ ان بزرگ خاتون کو گھر سے نکال دیا گیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ دبے ہوئے مسائل پھر سے ابھر آئے۔ ابو کے دوست بارہا انہیں مجبور کرتے تھے کہ وہ دوسری شادی کر لیں لیکن ابو کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ انہوں نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اس دوران ابو کے دوستوں کی بیگمات اور کچھ دوسری خواتین بھی ہمارے گھر آتی رہتی تھیں۔ ان کی آمد ہم دونوں بہنوں کی وجہ سے ہوتی تھی اور ابو ان کا احترام کرتے تھے۔ انہی میں صفیہ بیگم ابو کے ایک دوست کی بھتیجی تھیں۔ جوان العمر تھیں اور اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک۔ انہوں نے مجھ سے دوستی بڑھانا شروع کر دی۔ کیونکہ میں عمر میں ان سے آٹھ نو سال ہی چھوٹی ہوں گی۔ آہستہ آہستہ وہ میری بے تکلف دوست بن گئی۔ اتنی بے تکلف کہ میں ہر وقت ان کا دم بھرنے لگی۔ وہ عموماً میرے پاس ہی رہتی تھیں اور ابو سے بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی جا رہی تھیں۔ ابو فطرتاً نیک سیرت انسان تھے۔ صرف میری وجہ سے وہ صفیہ بیگم کا احترام کر لیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ صفیہ بیگم کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ اب ابو خود بھی ان کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے اور ان کا انتظار کرتے تھے۔ میں نے دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ کچھ عرصے تک میری تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا تھا۔ پھر ایک دن میں کالج سے واپس آئی تو میں

بات نہیں محسوس کی میں نے کیونکہ صفیہ بیگم سے میرے بھی بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس کے بعد تو اکثر یہ ہوتا تھا کہ جب میں واپس آتی تو صفیہ بیگم ابو کے کام کر رہی ہوتیں۔ انہوں نے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ میں نے کبھی ان سے ان کے ذاتی معاملات کے بارے میں نہیں پوچھا تھا لیکن یہ بات مجھے معلوم تھی کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور کئی بہنوں کی بہن ہیں بہرطور میرے ذہن میں کبھی کوئی خاص بات نہیں آئی۔ حالانکہ میں دنیا کو سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ میں نے کبھی غور بھی نہیں کیا تھا کہ صفیہ بیگم کی آمد کسی خاص مقصد کے تحت ہو سکتی ہے۔ پتا نہیں حالات کیا کیا رخ اختیار کرتے رہے لیکن میں نے کبھی صفیہ بیگم کے بارے میں کوئی غلط خیال نہیں کیا۔ ویسے بھی ابو کی اور ان کی عمر میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن پھر ایک شام ابو نے میرے پیارے ابو نے مجھ سے کہا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں زاہدہ!"

"جی ابو!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"زاہدہ! تم سمجھدار ہو گئی ہو' بیٹی تم جانتی ہو تمہاری ماں کی موت کے بعد میں کس قدر پریشان رہا کن حالات سے گزرا ہوں لیکن میں نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ گھر سے دکان پر جاتا ہوں تو پورا دن شدید وسوسوں کا شکار رہتا ہوں۔ وہ محترمہ جب آگئی تھیں تو دل کو اطمینان ہو گیا تھا کہ ایک معمر خاتون گھر میں موجود ہیں۔ وہ تمہیں اور اسماء کو سنبھال لیں گی لیکن انہوں نے جو کچھ کیا تمہارے علم میں ہے۔ بیٹی' باپ کو بیٹیوں سے ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہئے لیکن مجبوراً انسان کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آنے والا وقت میرے لئے مزید پریشانیوں کا وقت ہو گا۔ اسماء ابھی چھوٹی ہے لیکن تم ماشاء اللہ سمجھدار ہو گئی ہو اور ایک باپ کی اس سے بڑی خوشی اور کوئی نہیں ہوتی کہ وہ عزت و احترام کے ساتھ اپنی بیٹی کو اس کے شوہر کے گھر رخصت کر دے۔ میرے ذہن میں بھی تمہارے لئے بہت سے خیالات ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس ناآسودہ گھر سے عزت کے ساتھ رخصت ہو جاؤ۔ کاروبار سنبھالنے کے لئے مجھے مزید ذمہ داریاں برداشت کرنی ہیں اور پھر اسماء ہے جو بہرطور ابھی عمر کی اس منزل میں ہے جہاں اسے ایک تربیت کنندہ کی ضرورت ہے' ایک ایسے سرپرست کی ضرورت ہے جو اس کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ تم رخصت ہو جاؤ گی تو اسماء اس گھر میں بالکل اکیلی رہ جائے گی۔ مجھے بتاؤ اس کے بعد میں کیا کروں۔"

"ابو میری سمجھ کچھ نہیں آ رہا لیکن جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ اتنا ضروری نہیں ہے۔ ابو' ذمہ داریاں انسان کو بہت سارے مسائل سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ میرا مسئلہ اتنا شدید نہیں ہے اس وقت تک جب تک اسماء اپنے طور پر ذمہ داریاں قبول کرنے کے قابل نہ ہو۔ کیا ضروری ہے ابو بے شمار گھرانے ایسے ہیں جہاں لڑکیاں موجود ہیں ان کی شادیاں نہیں ہوئیں یا پھر دیر سے ہوئی ہیں۔ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے یہ۔"

"آہ بیٹی تم ایک ہمدرد بیٹی کے طور پر سوچ رہی ہو' ایک پریشان حال باپ کے طور پر نہیں سوچ رہیں۔ اس لئے یہی سب کچھ ممکن ہے۔ در اصل زاہدہ' دراصل میں چاہتا ہوں کہ' کہ........." ابو کی آواز اٹکنے لگی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"لوگوں نے مجھے بے حد مجبور کیا لیکن میں نے کسی کی نہیں مانی۔ البتہ یہ خیال میرے ذہن میں مسلسل چبھتا ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ گی اس کے بعد اس گھر کا کیا بنے گا؟ میں تنہا رہ جاؤں گا۔ اسماء بھی جوان ہو جائے گی۔ اسے اپنا گھر آباد کرنا ہو گا اور پھر میں؟ میری زندگی کیا ہے تم دونوں یا کم از کم تم اس بارے میں کبھی نہیں سوچتیں بہرطور اس خیال کے تحت ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے اور میں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔"

میں پریشانی سے ابو کا چہرہ دیکھتی رہی تب ابو بولے۔

"صفیہ تم سے بہت مانوس ہے۔ وہ اسماء کو بھی چاہتی ہے۔ اس کے دل میں بہت پیار ہے۔ میں نے صرف اس کے بارے میں اسی لئے سوچا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں صفیہ سے نکاح کر لوں؟" میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ صفیہ کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ' وہ تو بہت کم عمر تھیں ابو کے مقابلے میں اور کبھی میں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی لیکن ابو کے ان الفاظ کے بعد میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح صفیہ بیگم اور ابو ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ تاہم میں بھونچکی سی ان کو دیکھتی رہ گئی۔ میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ ابو نے کہا۔

"صفیہ کا گھرانہ بھی کسمپرسی کا شکار ہے۔ بہت سی لڑکیاں ہیں اس گھر میں اور امجد صاحب کو ان لڑکیوں کی فکر کھائے جاتی ہے۔ صفیہ کے ایک رشتے دار نے مجھ سے خود اسے سلسلے میں بات کی ہے۔ تم بتاؤ میں کیا جواب دوں انہیں؟"

"ابو' میں کیا بتاؤں اس سلسلے میں لیکن کیا خود صفیہ بیگم تیار ہیں؟"

"ہاں وہ تیار ہے۔" ابو نے جواب دیا۔ میں پریشانی سے ابو کی شکل دیکھتی رہی۔ امید تو مجھے بھی پیدا ہو گئی تھی کہ ابو اور صفیہ کے درمیان یقیناً اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہے لیکن یہ بات ایسی صورت میں سامنے آئے گی اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ تاہم دل میں ایک خیال ابھرا کہ صفیہ بیگم سے میری بہت زیادہ دوستی ہے۔ اگر وہ ماں کی شکل میں گھر میں آ جاتی ہیں تو اس میں کوئی بہت بڑا حرج بھی نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے ابو کہا۔

"ابو' میرا خیال ہے اگر آپ ایسا کر لیں تو مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"صرف اعتراض نہیں ہے۔ یا تمہیں خوشی ہو گی؟"

"نہیں ابو' میں آپ کی خوشی میں ہر طرح خوش ہوں۔" اس طرح صفیہ بیگم میری سوتیلی ماں بن کر ہمارے گھر میں آ گئیں اور ابو ان کے وجود میں گم ہو گئے۔ صفیہ بیگم نے ابو کے گرد جال بننے شروع کر دیئے اور رفتہ رفتہ ان کی اصلیت بھی سامنے آتی گئی۔ درحقیقت ایک ایسے گھر سے ان کا تعلق تھا جہاں کسمپرسی کا راج تھا اور تمام بہنوں کی موجودگی میں صفیہ بیگم کے لئے قطعی اس بات کا امکان نہیں تھا کہ ان کی شادی جلد ہو جائے لیکن شادی ہونے کے بعد انہوں نے اپنے رویے کو وہ نہ رکھا جو رکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس گھر میں میری حیثیت تیسرے درجے کی سی ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ابو میرے وجود کو نظرانداز کرنے لگے۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے سارے فرائض بھولتے جا رہے تھے۔ اکثر صفیہ بیگم کو لے کر سیر و تفریح کے لئے نکل جاتے تھے اور گھر میں ہم دونوں بہنیں تنہا رہ جاتی تھیں۔ مجھے آہستہ آہستہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ ابو نے ہمارے لئے بہتر نہیں کیا لیکن ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بدلے ہوئے ابو میری سمجھ سے باہر تھے۔ صفیہ بیگم اب آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ میں اکثر یہ سوچتی تھی کہ ابو جیسے عمر رسیدہ شخص کے ساتھ صفیہ بیگم جیسی سیماب صفت خاتون کیسے ایڈجسٹ ہو گئی ہیں۔

رفتہ رفتہ صفیہ بیگم کے عزیز ہمارے گھر آنے لگے۔ انہی میں مسعود بھی تھے جو صفیہ بیگم کے کوئی کزن تھے۔ مسعود عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے' بہت بڑا چہرہ لیکن جسم اس چہرے کی نسبت دبلا پتلا تھا اور اس چہرے پر شرافت نظر نہیں آتی تھی۔ بہر طور ان کے آنے جانے کا سلسلہ کچھ عجیب تھا عموماً وہ اس وقت آتے جب ابو گھر پر موجود نہیں ہوتے تھے صفیہ بیگم کے کمرے میں گھس جاتے تھے اور اس کے بعد گھنٹوں

باہر نہیں نکلتے تھے میں کسی بھی سلسلے میں صفیہ بیگم سے کوئی اختلاف نہیں کرتی تھی لیکن اس رات صفیہ بیگم کی حقیقت کھل گئی۔ ابو کاروباری سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے اور اس رات ان کی واپسی کا امکان نہیں تھا۔ رات کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ میں اٹھ کر باہر نکل آئی۔ راہداری سے گزرتے ہوئے مجھے صفیہ بیگم کے کمرے سے باتیں کرنے کی آواز آئی تو میں ٹھٹک گئی۔ میں یہی سمجھی تھی کہ شاید ابو واپس آ گئے ہیں اور صرف یہ معلوم کرنے کی غرض سے میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی کہ ابو سے ان کی اچانک واپسی کے بارے میں پوچھوں لیکن مدھم بلب کی روشنی میں مجھے ابو کے بجائے مسعود صاحب نظر آئے۔ کاش' کاش میں وہاں نہ جاتی۔ کاش وہ لوگ مجھے نہ دیکھ پاتے لیکن میرے قدم جم کر رہ گئے تھے اور ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ صفیہ بیگم کے حلق سے وحشت کی آواز نکل گئی۔ دونوں بدحواس ہو گئے۔ میں خاموشی سے وہاں نکل آئی لیکن ساری رات میں سوکھے پتے کی طرح کانپتی رہی تھی۔ میرا سارا خون خشک ہو گیا تھا اور اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ دوسری صبح میں شدید بخار میں مبتلا ہو گئی جب میں کافی دیر تک باہر نہ نکلی تو صفیہ بیگم میرے پاس آ گئیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ خوف و دہشت کے آثار ان کے چہرے پر منجمد تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئیں اور انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اوہ' تمہیں بخار ہے۔" وہ چونک پڑیں۔ پھر انہوں نے بہت زیادہ محبت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ مجھے دوا اور انجکشن لینے پڑے۔ صفیہ بیگم صبح سے شام تک میری تیمارداری کرتی رہتی تھیں۔ ابو نے ٹیلی فون پر اس رات بھی واپس نہ آنے کی اطلاع بھجوا دی تھی لیکن دوسری رات صفیہ بیگم میرے کمرے میں رہیں اور جب ان سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ پھٹ پڑیں۔ انہوں نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔

"ارے' ارے آپ' آپ۔" میں ان کی اس کیفیت سے گھبرا گئی تھی۔

"مجھے معاف کر دو زاہدہ۔ میں ایک عجیب و غریب حادثے کا شکار ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ' یہ سب کچھ کیا مناسب ہے؟"

"نہیں' لیکن مسعود صاحب دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ میں بھی ان سے انتہائی پیار کرتی ہوں۔ زاہدہ' تم میری درد بھری کہانی نہیں سمجھ سکتیں' تمہیں معلوم ہے کہ ہم

سات بجتیں ہیں۔ ہماری زندگی انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گزر رہی تھی۔ بڑے پریشان تھے ہم لوگ۔ مسعود مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ہمارے پاس اتنا کچھ نہیں تھا کہ ہم مسعود کے گھر والوں کی مانگ پوری کر سکتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ بے پناہ چاہتے ہیں لیکن حالات نے ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دی کہ ہم دونوں یکجا ہو جائیں اور میرے ماں باپ کی مجبوریوں نے مجھے اپنی عمر سے کئی گناہ بڑے شخص سے منسوب ہونے پر مجبور کر دیا۔"

"لیکن اگر ابو کو پتا چل گیا تو؟"

"تم نہیں بتاؤ گی تو کیسے پتا چلے گا۔" صفیہ بیگم نے کہا اور میں پریشانی سے ان کی صورت دیکھنے لگی۔ وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں کہ خود میرے دل میں بھی ان کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ میں نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں خاموش رہوں گی لیکن آپ خود کو سنبھالیے آؤ' یہ سب کچھ بے حد بھیانک ہے۔"

صفیہ بیگم روتی رہیں۔ میں نے ابو سے کچھ نہ کہا۔ مسعود آتے رہے لیکن صفیہ بیگم کے دل میں چور تھا۔ وہ ہر لمحے مجھ پر اور ابو پر نگاہ رکھنے لگیں۔ وہ ہمیں تنہائی کا ایک لمحہ بھی نہیں دیتی تھیں۔ پھر ایک شام جب ابو گھر میں نہیں تھے' مسعود میرے کمرے میں گھس آئے اور انہوں نے مجھ سے شیطانیت آمیز گفتگو شروع کر دی۔ وہ مجھے بھی صفیہ بنانا چاہتے تھے۔ میں نے ان کا سر پھاڑ دیا اور وہ زخمی ہو کر چلے گئے لیکن بعد میں مجھے پتا چل گیا کہ اس سازش میں صفیہ بیگم کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ مجھے اپنے جرم کا شریک بنانا چاہتی تھیں تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد بھی وہ مزید کوششیں کرتی رہیں۔ اس بار مسعود کے ساتھ فلم اور تھیٹر دیکھنے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے ان کی کوئی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔ صفیہ بیگم کے خلاف میرے دل میں کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی میں اس بات کو چھپائے رکھنا چاہتی تھی لیکن خوف دل میں بھی تھا۔ البتہ میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے ابو سے کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔ ابو کو اپنا معاملہ خود ہی دیکھنا ہو گا لیکن صفیہ بیگم مطمئن نہیں تھیں۔ وہ مسلسل اپنی کوششوں میں مصروف تھیں کہ کسی طرح میں بھی کسی بات میں پھنس جاؤں تاکہ وہ مجھے بلیک میل کے زبان بند کرنے پر مجبور کر دیں۔ مسعود سے ان کا رابطہ مسلسل جاری تھا اکثر ابو کی غیر موجودگی میں مسعود گھنٹوں صفیہ بیگم کے کمرے میں رہا کرتے تھے۔

پھر ایک شام ابو نے مجھے طلب کیا۔ ان کی آنکھیں غضب سے سرخ ہو رہی تھیں' انہوں نے ایک خط میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس خط کا جواب چاہیے۔"

میں حیرانی سے ابو کی صورت دیکھنے لگی اور اس کے بعد میں نے لفافہ اٹھا کر چاک کیا اور اس میں سے پرچہ نکال لیا۔ یہ خط میرے نام تھا کسی افضل نامی نوجوان کا جس نے مجھ سے گہری آشنائی کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے دوسری ملاقات کے بارے میں پوچھا تھا۔ خط پڑھ کر میری جو حالت ہوئی اس کی تفصیل نہیں بتائی جا سکتی۔ بہر طور میں نے ابو سے کہا کہ میں کسی ایسے نوجوان کو نہیں جانتی لیکن ابو نے میری کسی بات پر اعتبار نہیں کیا اور دوسرے ہی دن سے میرا کالج جانا بند کر دیا گیا۔ میں بی اے کے سال اول میں تھی۔ میرا کوئی احتجاج قبول نہیں کیا گیا مجبور ہو کر میں خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد افضل نامی نوجوان کے کئی خطوط ان کو ملے۔ ان خطوط میں ایسی پچویشن کی تفصیل ہوتی تھی جو پیش آچکی ہوتی تھی اور یہ اتنی گھناؤنی باتیں ہوتی تھیں۔ جن کی تفصیل ناقابل بیان ہے۔

ابو کو میری بدکاری کا یقین ہوتا چلا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اب میرے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ مجھے ننگ خاندان اور آوارہ بھی کہنے لگے تھے۔ میری حیثیت اب نوکروں سے بھی بدتر ہو گئی تھی اور ان حالات میں زندگی گزارنا میرے لیے ایک کٹھن مسئلہ بن گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ صفیہ بیگم کے دل کا چور اپنا تحفظ چاہتا ہے تاکہ اگر میری زبان کبھی ان کے خلاف کھلے تو اسے انتقامی جذبہ قرار دیا جائے اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہو گئی تھیں۔

میں نے ابھی تک ان کے خلاف زبان نہیں کھولی تھی لیکن انہوں نے مجھے مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن ابو نے مجھے بری طرح مارا پیٹا اور ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر نکال دیا۔ انہوں نے مجھ سے ایسی شرمناک باتیں کہی تھیں جو ایک باپ اپنی بیٹی سے کبھی نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے کہا کہ میں ان کے وجود پر غلاظت کا ڈھیر ہوں اور کسی بھی دن کوئی ایسی خبر انہیں ملے گی کہ ان کی گردن ہمیشہ کے لیے جھک جائے گی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسماء معصوم ہے۔ میں اس کی زندگی بھی تباہ کر دوں گی۔ اس لیے میرا اب اس گھر میں رہنا ممکن نہیں ہے۔

میں کیا کرتی' کیا کیا جا سکتا تھا۔ کہاں جاتی۔ میری تو اس دنیا میں کسی سے کوئی شناسائی نہیں تھی چنانچہ میں نے ابو سے منت سماجت کی کہ مجھے اسی گھر میں رہنے دیا جائے۔

آئندہ میں انہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ میں ایک ذلیل و خوار ہستی کی حیثیت سے اسی گھر میں رہتی رہی۔ جو گناہ گار تھے وہ سکون سے میری ذلت کا تماشا دیکھتے رہے۔ میری حیثیت بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب میری ہر جنبش کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور مجھ پر کسی طرح سے یقین نہیں کیا جاتا تھا۔ اسماء کو مجھ سے دور رکھنے کی کوششیں کی جارہی تھیں لیکن میں جانتی تھی کہ میرے بعد اسماء کی باری ہے۔ صفیہ بیگم کے مظالم میری غیر موجودگی میں صرف اسماء پر ٹوٹیں گے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اسماء کا میرے سوا اب اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور آنے والا وقت اسے ان پریشانیوں کے لیے تیار کر رہا ہے۔ خودکشی کرنے کا سوچا لیکن اسماء کا ہی خیال تھا جس نے مجھے باز رکھا۔

اور پھر ایک بادلوں بھری رات میری تقدیر کی طرح تاریک میری زندگی میں آئی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں' بادل گرج رہے تھے۔ بجلی کے کوندوں سے میں بچپن ہی سے ڈرتی تھی۔ جب بھی بجلی چمکتی تھی۔ امی مجھے اپنے پاس سلاتی تھیں یا میرے پاس آکر لیٹ جاتی تھیں لیکن آج کوئی نہیں تھا اور نہ ہی میں کسی کے پاس جا سکتی تھی۔ میں اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی۔ اچانک ہی مجھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سمجھی کہ کھلی کھڑکی سے ہوا کا کوئی جھونکا آیا ہے اور یہ صرف ہوا کی آواز ہے لیکن اپنی مسہری کے سامنے ایک سائے کو دیکھ کر میرے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر اٹھنا چاہا تو ایک آواز میرے کانوں میں ابھری۔

"میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ خاموش لیٹی رہو۔ اگر تم نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو۔ تو اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔"

"کون ہو تم' کون ہو؟"

"میں کوئی بھی ہوں۔ اگر تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو خاموش رہو۔" اس نے ایک لمبا سا چاقو نکال کر اس کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔

دنیا کو بہت گہری نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ میں دہشت زدہ ہو گئی اور' اور اس نے میری زندگی کی وہ آخری پونجی بھی چھین لی جسے ہوشمندی کے بعد اپنا وقار سمجھا جاتا ہے' میں اس خوفناک انسان کا کچھ نہ بگاڑ سکی' لیکن شاید یہ سب کچھ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔

انہوں نے اس شخص کو پکڑ لیا۔ ابو کی آنکھوں سے خون جھلک رہا تھا۔

"کون ہے تُو؟ کون ہے؟"

وہ نوجوان کانپنے لگا۔ چند لمحات تک کچھ نہ بول سکا لیکن جب ابو کا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا تو وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

"میرا نام' میرا نام افضل ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟"

"جی ہاں میں خود نہیں آیا۔ بلایا گیا تھا مجھے۔"

"کیا بکواس کرتا ہے کس نے بلایا تھا تجھے؟"

"زاہدہ' زاہدہ نے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے؟"

"آپ یقین کیجیے۔ میں کئی بار یہاں آچکا ہوں' زاہدہ خود ہی مجھے یہاں بلاتی ہے۔"

وہ خطوط میرے ذہن میں تھے جو کسی افضل نامی نوجوان نے مجھے لکھے تھے لیکن میں تو اس بدبخت کی شکل بھی نہیں پہچانتی تھی۔ میں تو اس کی صورت سے بھی آشنا نہیں تھی۔

میری زندگی کی یہ رات طوفانوں سے بھری ہوئی تھی۔ ابو اس نوجوان کو پیٹتے رہے اور وہ یہی کہتا رہا کہ قصور اس کا نہیں دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔

ابو بری طرح لرز رہے تھے۔ غصے سے ان کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں خون کی چمک نظر آ رہی تھی اور میں ان کے سامنے بے جان' دہشت زدہ مسہری پر پڑی ہوئی تھی۔

"تُو آوارگی اور بے حیائی کی ان منازل تک پہنچ چکی ہے زاہدہ' میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تیری بدقسمتی ہے کہ میں نے اسے کمرے سے نکلتے دیکھ لیا۔ دل تو چاہتا ہے کہ تجھے زمین پر گرا کر چھری سے ذبح کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ تیرے بعد اسماء بھی ہے۔ میں اپنی زندگی کو مسائل میں نہیں الجھا سکتا۔ میری زندگی میں صفیہ ہے جسے میری ضرورت ہے۔ اسماء ہے میری زندگی میں جس پر ابھی تک تیرے ناپاک وجود کی پرچھائیں نہیں پڑ سکی۔ میں تجھ سے بے پناہ نفرت کرتا ہوں' تیرے گندے وجود کو اب میں اپنے گھر کے احاطے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر تیرے ذہن میں میرا کوئی احسان موجود

ہے تو اس کے عوض تُو اسی وقت یہ گھر چھوڑ دے۔ اگر صبح کو تُو مجھے یہاں نظر آئی تو میں خود صفیہ اور اسماء کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اس سے زیادہ میں تجھ سے کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا۔ بدبخت' لعنت ہے تجھ پر اور اس کی روح پر جو تجھ جیسے گندے وجود کو چھوڑ کر خود جہنم میں چلی گئی۔"

ابو نے صفیہ بیگم کا بازو پکڑا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ ابو کے الفاظ کا زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اب میں کسی سے بھی کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کسی کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانا نہیں چاہتی تھی۔

میں خاموشی سے اٹھی۔ میرے اندر ایک عزم ابھر آیا تھا۔ میں اس حادثے پر پاگل نہیں ہوئی تھی بلکہ اور ہوشمند ہو گئی تھی۔ اسی ہوشمندی کے عالم میں' میں نے لباس پہنا اور پھر وہ رقم اپنے ساتھ لے لی جو اس دوران میں نے جمع کی تھی۔ میں اب خود اس نفرت انگیز ماحول میں رہنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اپنی بہن اسماء کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے سوئی ہوئی اسماء کو جگایا۔ اس سے خاموش رہنے کے لئے کہا اور آنے والے طوفانوں سے بے نیاز ہو کر باہر نکل آئی۔ بادل گرج رہے تھے' بجلی چمک رہی تھی۔ طوفان کی آغوش کو میں نے ماں کی آغوش سمجھ لیا تھا اور اسماء کو اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ میں خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے اسماء کی پرورش کرنی تھی۔ میری اسماء کو میری ضرورت تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرے بعد صفیہ بیگم کا دوسرا شکار اسماء ہو گی۔

اسماء مجھ سے بے پناہ مانوس تھی۔ میں نے ہی تو اسے ماں کی محبت دی تھی۔ غلطی میری نہیں تھی دوسروں نے حماقت کی تھی پھر میں اس کا خمیازہ کیوں بھگتوں۔ ایک ٹرین کے زنانہ درجے میں بیٹھ کر میں نے بھیگا ہوا لباس نچوڑا اور پُر عزم ہو کر سفر کرنے لگے۔ اسماء میرے سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ اس بے چاری کو حالات کا کوئی احساس نہ تھا۔ راستے میں دوسری عورتوں سے میں نے ٹرین کی منزل کے بارے میں پوچھا اور جب ٹکٹ کلکٹر وہاں آیا تو میں نے اپنا اور اسماء کا ٹکٹ بنوا لیا۔ میرے ذہن میں بے پناہ نفرت تھی اور اب میں اسی نفرت کے سہارے زندہ رہنا چاہتی تھی۔

میں منزل پر پہنچ کر اسٹیشن پر اتر گئی۔ کوئی خوف میرے دل میں نہیں تھا۔ میں نے ان ہزارہا بھٹکی ہوئی عورتوں کی کہانیاں پڑھی تھیں جو میرے جیسے حالات کا شکار ہو کر بازار حسن کی زینت بن جاتی ہیں۔ مجھے اگر کہیں جگہ نہ ملی تو اس جہنم میں تو مل ہی جائے گی۔

اپنے تباہ کرنے والوں سے انتقام لینے کے بارے میں' میں نے ایک منصوبہ بنا لیا تھا اور میں بازار حسن کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ڈھونڈنے سے کیا نہیں ملتا۔ میں اپنی منزل کی تلاش میں کامیاب ہو گئی اور جو سب سے پہلا کوٹھا نظر آیا اس پر چڑھ گئی۔

دن کا وقت تھا۔ دن میں یہ کوٹھے ویران ہوتے ہیں۔ میری ملاقات ایک مکروہ شکل کی عورت سے ہوئی اور وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"کیا بات ہے بی بی' کیوں آئی ہو یہاں؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کے پاس۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے پاس۔ تم جیسی لڑکی اور میرے پاس جانتی ہو یہ کون سی جگہ ہے؟"

"ہاں جانتی ہوں یہ بازار حسن ہے اور میں طوائف بننا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا اور عورت کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"طوائف بننا چاہتی ہو؟"

"ہاں مجھے طوائف بنا دو۔ روٹی اور کپڑے کے علاوہ کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔" وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی تجربہ کار نگاہیں مجھے اندر سے ٹٹول رہی تھیں۔ پھر اس نے پوچھا۔

"ناچنا گانا آتا ہے۔"

"نہیں سب کچھ سیکھ لوں گی۔" میں نے جوب دیا۔

"اچھا چھا' ٹھیک ہے۔ آؤ' اندر آؤ۔" عورت نے کہا اور مجھے لے کر اندر داخل ہو گئی۔ اس نے مجھے غسل خانے کا راستہ بتاتے ہوئے نہانے کے لیے کہا۔ میرے قد و قامت کے کپڑے بھی اس نے مجھے دے دیے اور میں نے ہنسی خوشی سب کچھ قبول کر لیا۔ اسماء اس ماحول کو دیکھ کر حیران تھی لیکن میرے سینے میں جو جہنم سلگ رہی تھی اس نے مجھے دوسرے احساسات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ انہوں نے مجھے ٹھکرایا تھا جو میری عزت و عصمت کے محافظ تھے۔ اب میں صرف میں تھی۔ نزاکت خالہ مکمل نائکہ تھیں۔ انہیں چمڑی اور دو دو ملی تھیں۔ مجھ پر عنایتوں کی بارش ہو گئی۔ ہمیں عیش کرائے جانے لگے۔ سب کچھ مہیا کر دیا گیا ہمیں۔ میں نے نزاکت خالہ کی ہر بات مان لی۔ رقص و موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگی اور کاروبار جاری ہو گیا۔ میں نے خود کو گم کر لیا تھا۔ ہر فکر سے بے نیاز کر لیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اسماء نے اپنے

آنکھیں تاریک ہو گئیں۔ میں نے سوچا اسماء میری ذمہ داری ہے۔ وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ نہیں آئی۔ اسے بھی ایسی زندگی گزارنا ہو گی۔ اس طرح تو میں اپنی بہن کو برباد کر دوں گی۔ اس دنیا کو اب میں پہچان چکی تھی۔ جانتی تھی کہ نزاکت خالہ ہمیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گی۔ چنانچہ ایک رات میں اسماء کو لے کر وہاں سے بھی نکل بھاگی۔ پھر نہ جانے کہاں کہاں ماری پھرتی رہی۔ لوگوں سے چھپنا بھی تھا مجھے اور میں یہاں آ گئی۔ میں نے دوسرے راستے اختیار کر لیے اور اسماء کو تعلیم دینے لگی۔ میرے زندگی اسماء کے بہتر مستقبل کے علاوہ کچھ نہیں۔ جو کچھ میں نے اسے دیا ہے۔ جو کچھ میں اسے دینا چاہتی تھی' اب تک میں اس میں کامیاب رہی ہوں لیکن' لیکن اب چانک ڈور الجھ گئی ہے۔ یہ ڈور اس طرح الجھ جائے گی مجھے اندازہ نہ تھا۔" وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے سے ٹک گئی۔

"اب بتاؤ کیا کروں؟ میں اب کیا کروں؟"

میں اسے دیکھتا رہا۔ بہت دیر تک دیکھتا رہا چائے آ گئی۔ ٹھنڈی ہو گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا' سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

☆------☆------☆

شمس کے والدین نے اسماء کو پسند کر لیا تھا۔ وہ ان کے گھر میرے ساتھ گئے تھے۔ زاہدہ کا چہرہ بدستور زرد تھا۔ وہ ہر بات خوفزدہ لہجے میں کرتی تھی اور چور نگاہوں سے مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ میں نے زاہدہ سے کہا۔

"اب میں کبھی تمہیں اس فلیٹ میں نہ دیکھوں۔" میرے لہجے میں حکم تھا۔ وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے ان الفاظ کا ردعمل دیکھنے کے لیے میں بلا اسکوائر گیا۔ فلیٹ نمبر سترہ میں تالا پڑا ہوا تھا۔ پڑوسیوں سے معلوم ہوا کہ فلیٹ خالی ہو" ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے بعد میں دلنشیں ولا چل پڑا۔

اس دوران شمس کی شادی کی تیاریاں میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور اس میں' بہت مصروف رہتا تھا۔ بالآخر شادی ہو گئی۔ اسماء رخصت ہو گئی۔ زاہدہ دلنشین ولا تنہارہ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

[illegible]

آہستہ سے کہا۔

"کہاں؟"

"فیصلہ نہیں کیا۔"

"مجھ سے مشورہ نہیں کرو گی؟"

"مشورہ دو گے؟"

"کیوں نہیں۔"

"بتاؤ۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ "اور اس کے بعد تمہیں آسمانوں کی طرف واپس بلا لیا جائے گا۔ نہیں حیدر' انسان رہو۔ فرشتہ بننے کی کوشش مت کرو۔ ایثار اچھی چیز ہے مگر اتنا نہیں کہ خودکشی کا باعث بن جائے۔ میرا ماضی تمہارے سامنے ہے۔"

"غور سے سنو زاہدہ۔ میں تنہا ہوں اور اس تنہا زندگی میں کبھی برسات نہیں ہوتی۔ تم جا سکتی ہو۔ میں تمہیں روکنے کا حق نہیں رکھتا لیکن اس کے بعد بھی میری زندگی میں کوئی پھول نہیں کھلے گا۔ مجھے تمہارے ماضی سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ انسان کے مسائل ہیں جو جاری تھے' جاری ہیں اور جاری رہیں گے۔ ہم ان مسائل سے رفتہ رفتہ ہی نمٹتے ہیں۔ تم میری نگاہ میں پاک ہو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے۔ میں ایک چھوٹے سے تعاون کے بدلے تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا یہ ممکن ہے حیدر' کیا یہ ممکن ہے؟" اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور میں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"کیوں نہیں زاہدہ' ماضی ختم ہو گیا۔ اب حال کا سفر جاری ہوں گا۔ اس میں ہم ایک دوسرے کے ہم قدم ہوں گے۔"

☆------☆------☆

یہ محسن بھی مزے کا آدمی ہے۔ بالکل میری طرح لاابالی' لاپرواہ' اصل میں وقت اور حالات انسان کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نیا ہو وہ اجنبی اگر کسی نئی اور اجنبی جگہ جاتا ہے تو سہم سہم کر ایک ایک قدم بڑھاتا ہے لیکن

جب دنیا سے بھرپور واقفیت ہو جائے تو یہ دنیا بہت آسان لگتی ہے۔ سونو نے اپنی زندگی کے بارے میں کبھی کبھی تو بہت زیادہ ہی سوچا تھا۔ یہ کروں گی وہ کروں گی' ایسا کروں گی ویسا کروں گی' لیکن زندگی کے تجربات نے بلکہ اپنے آپ سے زیادہ دوسروں کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ زندگی سے زیادہ ناپائیدار اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک بیکار اور بے مقصد۔ آسمان کی بلندی کے برابر مینار بناؤ' چڑھتے چلے جاؤ' چڑھتے چلے جاؤ۔ آسمان تک تو کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ درمیان میں رکنا پڑے گا' تھک جاؤ گے' مر جاؤ گے اور بس۔ پھر زندگی کے لیے اتنے بلند و بالا مینار کیوں بنائے جائیں' وہ آسان طریقے کیوں نہ اپنائے جائیں جو زندگی کو ہنستے کھیلتے کچھ وقت میں تقسیم کر دیں اور اس کے بعد بس' مکمل ختم۔ پیس۔ ہضم۔ محسن اچھا انسان ہے' زندگی کا ایک اچھا ساتھی بن سکتا ہے۔ وقت تقدیر اور قدرت نے زندگی کو جاننے کے لیے ایک اچھا موقع دیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ زمانہ قدیم کی الف لیلہ میں ایک چراغ ہوتا تھا' ایک جادوگر ہوتا تھا ایک جن ہوتا تھا' اس کہانی کو دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا' سنا جاتا تھا' یہ کہانی بھی تو اتنی ہی دلچسپ ہے' یہ نہ پڑھی جا رہی ہے۔ نہ سنی جا رہی ہے بلکہ دیکھی جا رہی ہے۔ لوگ کتاب کی طرح کھل جاتے ہیں۔ کیسی انوکھی کیسی دلچسپ کتاب ہوتی ہے یہ۔ اس کے اوراق کھولو اترتے چلے جاؤ' کیا لطف آتا ہے' کردار بڑے بڑے جاندار جیسے یہ لڑکی۔ کون ہے یہ' محسن ذرا اسے دیکھو۔

"اب تو چہرہ شناسی میں بھی اتنی مہارت ہو گئی ہے کہ بہت سے کردار لفظوں کی شکل میں سمجھ میں آجاتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟"

"نہیں اس کتاب کا پہلا ورق الٹو۔" محسن نے کہا۔

"نام رمشا ہے' دو چھوٹی بہنوں اور ماں کی کفیل ہے' آہا .... آؤ ذرا آگے بڑھیں .... جی مس رمشا۔"

"بس دنیا بالکل بیکار جگہ ہے زندگی میں نہ جانے کیسے کیسے کردار آتے ہیں' میرے ابو بہت بڑے آرکیٹکٹ تھے' ایک بہت بڑی فرم میں ملازمت کرتے تھے۔ تین بیٹیوں کے باپ پر جو ذمے داریاں ہو سکتی ہیں۔ وہ ان پر بھی تھیں اور بیٹا اتفاق سے کوئی نہیں تھا' لیکن وقت نے ساتھ نہیں دیا' حادثہ ہوا موت کی دھند میں لپٹ گئے' اقبال شاہ صاحب بہت اچھے انسان تھے' جب رمشا نے ان سے کہا کہ وہ جمالی صاحب کی جگہ ان کے ہاں ملازمت کرنا چاہتی ہے تو بے چارے اقبال شاہ صاحب اسے تعجب سے دیکھنے لگے اس نے پھر کہا۔

"سر! میں پریکٹ آرکیٹکٹ ہوں' تعلیم کے علاوہ ابو سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"ہاں جمالی صاحب' تذکرے کیا کرتے تھے' ٹھیک ہے بیٹا' کوئی بات نہیں تم کل سے آجاؤ۔"

"وہ اقبال شاہ کی فرم میں پہنچ گئی اور اس نے زندگی کو ایک بالکل مختلف طریقے سے شروع کر دیا' مشغل اور طویل کے مستقبل کے لیے اس نے اپنے آپ کو مخصوص کر دیا۔ یہاں اسے شاہد ملا جس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس کے دل میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اقبال شاہ نے اسے حیدر سے ملایا اور اس نے انہیں بتایا کہ جمالی اسکائنو اس کا خواب ہے۔

اقبال شاہ نے ایک دن اس سے کہا۔ "میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں بیٹی اس سے انکار نہ کرنا۔"

"جی سر.........." رمشا نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور حیدر زمان صاحب نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"وعدہ کرو کسی مشکل' کسی الجھن کا شکار ہوئیں تو مجھے ضرور یاد کر لو گی' مجھ سے ضرور تذکرہ کرو گی' یہ وعدہ کر سکتی ہو یا یہ بھی تمہارے ذہن پر گراں گزرے گا۔" رمشا نے حیدر زمان صاحب کا کارڈ ہاتھوں میں لیا اور بولی۔

"انکل کہہ سکتی ہوں آپ کو؟.........."

"خدا تمہیں طویل زندگی عطا کرے' بہت خوشی ہو گی مجھے۔"

"انکل میرا آپ سے وعدہ ہے' آپ کی دعاؤں کی طالب بھی ہوں کہ کبھی ایسی ضرورت پیش نہ آئے لیکن اگر ...."

"ہاں بیٹے بالکل' یہ میری خواہش ہے۔"

اور پھر وہ باہر نکل آئی' رواں رواں خوشی محسوس کر رہی تھی' چہرہ مسرت سے کھلا ہوا تھا۔

شام کو خاص طور پر واپسی پر شاہد نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

"صورت حال کا خاصی حد تک مجھے علم ہو چکا ہے اور میں جانتا ہوں کہ حیدر زمان

صاحب تمہارے کام سے بہت متاثر ہوئے ہیں' میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کرو' میں اگر اس بارے میں کچھ کہوں گا تو نہ جانے کیا سوچو گی۔"

"ارے کہو نا میں سننا چاہتی ہوں اور بھلا سوچوں گی کیا۔" وہ بہت خوش تھی' زندگی پر اس کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا' دنیا بہت اچھی جگہ ہے' اقبال صاحب نے اسے زندگی کے راستوں پر آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا' شاہد ایک نیک نفس اور شریف نوجوان تھا' اس کے ذہن میں شاہد کے لیے بہت جگہ بن گئی تھی' حیدر زمان صاحب جو کوئی بھی تھے' بیٹی کہہ کر اسے مخاطب کیا تھا' اس کی محنت کی پذیرائی کی تھی اور خاصی عزت دی تھی اسے یہ چیزیں بڑی خوش کن لگیں' لوگ کہتے تھے کہ جمالی صاحب کا بیٹا نہیں ہے' ابو میں نہیں جانتی کہ موت کے بعد روح کے احساسات کیا ہوتے ہیں لیکن انسان خود اپنے جذبات کی دنیا آباد کر لیتا ہے' میں "جمالی اسکائینو" قائم کر کے یہ سمجھ لیجئے کہ اپنے ان جذبات کو سکون دوں گی جو میرے اپنے اندر پوشیدہ ہیں۔ وہ شاہد کے ساتھ اس کے اسکوٹر پر بیٹھ گئی تو شاہد ہنس کر بولا۔

"جی میڈم.......... حکم فرمایئے کہاں چلوں؟"

"گھر.........." وہ پُر مسرت لہجے میں بولی اور شاہد نے اسکوٹر آگے بڑھا دی' تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر پہنچ گئے تھے۔

"اجازت!" شاہد باہر سے بولا۔

"نہیں.......... کل تو ویسے بھی چھٹی ہے کوئی مصروفیت ہے؟"

"جی نہیں کوئی خاص مصروفیت نہیں۔"

"تو پھر آیئے آپ کو آج کچھ بنا کر کھلائیں گے مثلاً انڈوں کا حلوہ۔" شاہد مسکراتا ہوا اس کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ کئی بار رمشا نے محسوس کیا تھا کہ امی شاہد کے آنے سے خوش ہوتی ہیں' مشعل اور طوبیٰ تو شاہد سے بہت ہی بے تکلف ہو گئی تھیں اور بعض اوقات اس سے فرمائشیں بھی کر ڈالتی تھیں جنہیں شاہد بڑی مستعدی سے پوری کرتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کا ان سے براہ راست تعلق ہو' ایک دوبار رمشا نے شاہد سے احتجاج بھی کیا تھا۔

"ویسے تو آپ بہت اچھے انسان ہیں شاہد' لیکن دیکھیں لڑکیوں کی ہر فرمائش نہ پوری کر دیا کریں' ان کی زبان کھل جائے گی اور بعد میں جب ان کی پذیرائی نہیں ہوگی تو انھیں دکھ ہوگا' [illegible]

ہیں کہ شاہد بھائی تو ہمارے اپنے ہیں' آپ کیوں بیچ میں ٹانگ اڑاتی ہیں۔"

"تو آپ بجائے اس کے کہ ان باتوں پر پابندی لگائیں مس رمشا' آپ انھیں صرف ایک بات بتایا کریں وہ یہ کہ شاہد اپنے نہیں' بتادیا کریں کہ بس میرے دفتر میں کام کرنے والے ایک آدمی ہیں اور ایسے ہی کبھی کبھی آجایا کرتے ہیں' غیروں سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگتے' آپ سمجھا دیجئے گا انہیں۔"

شاہد کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ رمشا شرمندہ ہو گئی۔ آج بھی امی نے شاہد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگیں۔

"شاہد تم رمشا کو دروازے تک چھوڑنے آتے ہو' اندر کیوں نہیں آجایا کرتے۔"

"وہ آنٹی بس' میں سوچتا ہوں بزرگوں کی ایک مثال ہے نا کہ "انگلی پکڑتے پکڑتے انسان پہنچا پکڑنے لگتا ہے۔" وہ مثال یاد آتی ہے تو باہر ہی سے بھاگ جاتا ہوں۔"

"نہیں بیٹے اتنا کچھ جان چکے ہو ہمارے بارے میں اور پھر رمشا بہت ریزرو لڑکی ہے' اگر وہ تمہارے ساتھ اس طرح آتی جاتی ہے تو تم یقین کرو اس نے تمہیں اتنا ہی بااعتماد سمجھا ہوگا' آجایا کرو بیٹے' آتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنا آیا ہو۔"

"جی یہ بچیاں کہاں ہیں دونوں؟"

"وہ پڑوس میں گئی ہیں' سکول کی کچھ دوست ہیں وہ بلا کر لے گئے ہیں۔"

"جب ہی خاموشی کا احساس ہو رہا ہے۔"

"چائے پیو گے؟"

"بالکل پیوں گا' رمشا اندر گئی ہیں' چائے کے ساتھ غالباً انڈوں کا حلوہ ملنے کے امکانات بھی ہیں۔" سائرہ بیگم ہنسنے لگی تھیں' شاہد نے گردن خم کر لی۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"آنٹی جن کے سرپرست نہیں ہوتے' بزرگ نہیں ہوتے وہ زندگی کے بہت سے نازک مرحلوں میں اپنے آپ کو کتنا تنہا محسوس کرتے ہیں' آنٹی میری بھی یہی کیفیت ہے' مجھے اپنی زندگی کے سفر پر آگے بڑھنے کے لیے کیا کرنا چاہئے؟" سائرہ بیگم نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر بولیں۔

"بیٹے بات روایتی سی ہے لیکن یہ روایتیں بھی حقیقتوں پر مبنی ہوتی ہیں' جب انسان بزرگوں کی کمی محسوس کرے یا کسی بھی رشتے میں کمی محسوس کرے تو کسی سے دلی طور پر مخلص ہو جائے' میں سمجھتی ہوں کہ صرف خون ہی کے رشتے نہیں ہوتے بعض اوقات

اجنبی لوگ عزیزوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر اپنے ثابت ہوتے ہیں۔"

"آنٹی آپ نے مجھے جو عزت' جو تحفظ اور جو مقام دیا ہے' وہ بعض اوقات مجھے بہکا دیتا ہے' آج آپ سے جو کچھ کہہ کر جا رہا ہوں نا آنٹی! اس کے بعد جب تک آپ میرے لیے کوئی پیغام نہیں بھیجیں گی اور مجھے یہاں نہیں بلائیں گی' میں دوبارہ آؤں گا نہیں' آنٹی ہمت نہیں پڑ رہی کہنے کی لیکن ہمت کر رہا ہوں' آنٹی اگر آپ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دیں تو مجھے ایک ماں جیسی محبت کرنے والی اور دو چھوٹی بہنیں مل جائیں گی' آنٹی میں رمشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں' میری جو تنخواہ ہے' وہ رمشا کو معلوم ہے' میرا کردار میری شخصیت بھی انہیں معلوم ہے اور آنٹی میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے ناپسند بھی نہیں کرتیں لیکن اس کے باوجود آپ پہلے خود میری اس پیشکش کو اپنی نگاہ سے دیکھیں پھر چاہیں تو رمشا سے بھی اس بارے میں پوچھ لیں' آپ نے مجھے ناپسند کیا یا رمشا نے مجھے مسترد کیا تو خدا قسم برا نہیں مانوں گا بس اتنا محسوس کروں گا کہ یقینی طور پر آنٹی نے یہ مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔"

سائرہ بیگم چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھیں' اتنے پُر اعتماد لہجے میں یہ الفاظ کہہ دینا' ایک اچھے انسان کی علامت تھی تاہم انہوں نے ایک سوال اور کیا کہنے لگیں۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ رمشا سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکے ہو؟"

"آنٹی میں نے کبھی رمشا کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا' میں اس کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہوں' آپ کچھ کہنے کا تصور کر رہی ہیں' انہوں نے جس طرح میری موٹرسائیکل پر آنا قبول کیا ہے' میں جانتا ہوں اس کے لیے بھی انہوں نے بڑی اہمیت دی مجھے بہرحال مس رمشا کو اس بارے میں ابھی تک کچھ نہیں معلوم کہ میرے ذہن میں ان کے لیے کیا تاثر ابھرا ہے۔"

"وقت تو دو گے نا مجھے؟.........." سائرہ بیگم نے کہا۔

"میں نے عرض کیا نا آنٹی آپ اب جب مجھے آفس ٹیلی فون کریں یا مجھے بلانے کے لیے کوئی پیغام دیں گی تب میں اندر آؤں گا ورنہ نہیں۔" اسی وقت رمشا ہاتھوں میں ایک بڑی سی ٹرے لیے ہوئے اندر آ گئی۔

"جناب عالی انڈوں کا حلوہ اور چائے زرا نوش فرمائیے انکل حیدر زمان کی طرح اس پروجیکٹ کی بھی داد دیجئے گا۔"

"ضرور.........." شاہد نے کہا اور اس کے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ مصروف ہو

گیا پھر جب شاہد چلا گیا تو رمشا نے کہا۔

"امی یہ دونوں آخر کب تک پڑوس میں رہیں گی' اندھیرا پھیل گیا ہے' میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔"

"بیٹھو بیٹھو.......... تھوڑی دیر بیٹھو' مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"جی خیریت.........."

"رمشا بہت اچھی بیٹی ہو تم' بہت مان ہے مجھے تم پر' تمہارے کسی بھی عمل پر میں کبھی متردد نہیں ہوئی حالانکہ تم پہلی بار گھر سے نکلی ہو' رمشا زندگی کا سفر نہ جانے کیسی کیسی مشکلات سے بھرا ہوتا ہے' قدرت نے مرد کو ایک سائبان کی حیثیت دی ہے اور سائبان بڑا ضروری ہوتا ہے' میں تمہیں بتاؤں کہ یہ ساری باتیں میں تم سے کیوں کر رہی ہوں بات اصل میں یہ کہ ابھی جب تم باورچی خانے میں تھیں' میری شاہد سے بات چیت ہو رہی تھی رمشا' شاہد نے تم سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے اور جس شریفانہ انداز میں کیا ہے' اس کی شخصیت کا پتا چلتا ہے بیٹی' شاہد مجھے پسند ہے لیکن میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ رمشا سے گفتگو کرنے کے بعد ہی میں کوئی جواب دے سکوں گی۔"

پھر سائرہ نے شاہد سے ہونے والی تمام باتیں رمشا کو بتا دی تھیں۔ بے شک رمشا اور شاہد کے بارے میں دفتر کے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ متاثر ہیں' کوئی پروا نہیں کی تھی اس بات کی دونوں نے لیکن شاہد نے جس طرح اس سے کچھ کہنے کے بجائے امی سے اس موضوع پر بات کی تھی' اس نے رمشا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سائرہ بیگم نے کہا۔

"رمشا اصل میں رشتوں میں بہت ساری روایتیں ہوا کرتی تھیں' ماں بیٹی' باپ بیٹی' بہن بھائی' سب کے کچھ راستے ہوا کرتے تھے لیکن اس بدلے ہوئے وقت میں' مسائل کے اس دور میں جب ہم اپنی بیٹیوں کو باہر نکال دیتے ہیں اور انہیں باہر کی دنیا میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں تو پھر کچھ رویے خود بخود بدل جاتے ہیں' میں نے پہلے تم پر اعتماد کا اظہار کیا اس کے بعد اب تم سے یہ سوال کر رہی ہوں کہ کیا یہ رشتہ قبول کیا جا سکتا ہے؟ شاہد نے اپنے دل کی بات کہہ دی لیکن مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں کے درمیان ایسی کوئی بات کبھی نہیں ہوئی ہو گی' اب ہوئی ہے تو مجھے اسے جواب دینا ضروری ہو گا' کیا جواب دوں بیٹی اسے' بتانا پسند کرو گی۔"

وہ الجھے ہوئے انداز میں امی کو دیکھتی رہی۔ بڑی صاف ستھری اور پُر سلیقہ گفتگو ہو

رہی تھی' اس کیفیت کو برقرار رکھنا تھا۔ اس نے کہا۔

"مجھے سوچنے کے لیے وقت دیجئے امی' میں آپ کو کل جواب دے دوں گی۔"

"ٹھیک ہے' کل ویسے بھی اتوار ہے' چھٹی ہو گی' اب میں اس موضوع پر اور کوئی بات نہیں کروں گی' بچیوں کو بلانا چاہو تو بلا لاؤ' واقعی وقت بھی زیادہ ہو گیا ہے اور کچھ سوناپن بھی محسوس ہو رہا ہے۔" امی نے کہا۔

یہ رات رمشا پر بہت کٹھن تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہد کی شرافت' اس کی اپنائیت' اس کے ہر انداز نے رمشا کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا' اس سے یگانگت' اس کے ساتھ بے دھڑک گھر تک کا سفر رمشا کی اندرونی کیفیت کا مظہر تھا لیکن شادی کے بارے میں اس نے نہیں سوچا تھا' اس نے ایک مقصد چنا تھا' ابو سے ایک وعدہ کیا تھا' ایک مشکل وعدہ تھا وہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا' اس وقت وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی' اب حقیقتوں کو جاننے کا موقع ملا تھا ہر مشکل سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"امی ایک بار شاہد سے اس موضوع پر بات کرنے کی اجازت چاہتی ہوں' کل واپسی پر تھوڑی سی دیر ہو جائے گی۔" دوسرے دن اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" امی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

پہلی بار اس نے شاہد سے گھر کی بجائے کہیں اور چلنے کی فرمائش کی تھی اور شاہد کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ پُر مسرت لہجے میں بولا۔

"کیا واقعی .... مگر امی ...."

"ان سے اجازت لے چکی ہوں میں۔"

پہلی بار ہی وہ کسی ریستوران میں داخل ہوئی تھی' بمشکل تمام اس نے اپنے اندر کی جھجک کو چھپایا تھا۔

"تم نے امی سے جو کچھ کہا ہے' اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ...." شاہد نیچی نگاہوں کے ساتھ بولا۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر تم نے امی سے بات کی ہے۔"

"ہاں رمشا .... زندگی کے کئی المیے ایسے ہیں جو تمہیں نہیں بتا سکا' تم سے بات کرنے کی بجائے میں نے امی سے بات کرنا ہی مناسب سمجھا' تمہارے ذہن میں اگر کوئی بات ہے تو میں اس کا جواب دینے کے لیے حاضر ہوں۔"

"صرف ایک بات شاہد ...."

"ہاں کہو ...."

"میں آسمانوں پر پرواز کے خواب کبھی نہیں دیکھتی لیکن ایک خواب مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے اس کی تعبیر کے لیے میری مدد کرو گے۔" اور پھر اس نے "جمالی اسکائینو" کے بارے میں اپنی حسرتوں کی کہانی اسے سنا دی۔ شاہد نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"رمشا .... یہ تمہاری نہیں' اب میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔"

☆-------☆-------☆

دفتر کے لوگوں کو پہلے ہی اس بات کا شبہ تھا کہ رمشا اور شاہد ایک دوسرے سے بہت قریب ہو چکے ہیں' رمشا کی دوست ریپشنسٹ ثوبیہ نے اس بارے میں رمشا سے پوچھا تو رمشا نے کہا۔

"ہاں ثوبیہ .... بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔"

ثوبیہ نے عجیب سی نظروں سے رمشا کو دیکھا پھر بولی۔ "عورت ہو کر تم عورت پر ظلم کرنا پسند کرو گی رمشا .... کیا یہ مناسب ہو گا۔"

"کیا ....؟" وہ چکرائی۔

"اس نے تمہیں نہیں بتایا۔"

"کس نے ....؟"

"شاہد نے ...."

"کیا نہیں بتایا؟" رمشا کے وجود میں کپکپی دوڑ گئی تھی۔

"وہ شادی شدہ ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔" ثوبیہ نے کہا۔

رمشا کے کانوں میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ سر ایک دم گھوما تھا اور اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے نہ جانے کتنے جتن کیے تھے۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔ "شاہد ہی کی بات کر رہی ہو نا؟"

"سب کو تعجب تھا کیونکہ تمہارے بارے میں سب کی رائے ہے کہ تم بہت شریف لڑکی ہو اور یقین کرو کوئی کسی کے ذاتی معاملات نہیں کریدتا ورنہ کوئی نہ کوئی اس بارے میں تم سے یہ ضرور پوچھتا کہ شاہد سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔"

"وہ شادی شدہ ہے؟" رمشا نے اور کچھ نہیں سنا تھا۔

"ہاں بھئی اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"دفتر کے دوسرے لوگ بھی یہ بات جانتے ہیں۔"

"تقریباً تمہیں ...?"

"مجھے کسی نے نہیں بتایا۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔

"تم نے کسی سے پوچھا تھا؟ ایک منٹ وہ رستم آ رہا ہے' یہ شاہد کے گھر کے برابر رہتا ہے۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔" چپراسی رستم نے چائے کی پیالی ثوبیہ کے سامنے رکھی پھر رمشا سے بولا۔ "آپ کی چائے یہیں رکھ دوں میڈم؟"

"ہاں رستم! ایک بات بتاؤ' شاہد صاحب کا گھر تمہارے گھر سے کتنی دور ہے؟"

"تین گھر بیچ میں ہیں میڈم!"

"تم جاتے ہو شاہد صاحب کے گھر؟"

"جی جاتا ہوں۔ سودا ترکاری بھی میں ہی لا کر دیتا ہوں۔"

"شاہد صاحب کی بیگم کا کیا نام ہے؟"

"رخسانہ بیگم۔ بڑی اچھی بی بی ہیں وہ پانچوں وقت کی نمازی۔"

"بیٹا کتنا بڑا ہے؟"

"آٹھ سال کا ہے جی۔"

رمشا سے چائے بھی نہیں پی گئی تھی۔ بہت عجیب کیفیت ہو گئی تھی اس کی۔ پھر نہ جانے کہاں سے اس کے اندر ایک جنون سا ابھر آیا۔ ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی اس پر' یہ راستہ خود میں نے اختیار کیا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے۔ ایسے فریبی تو ہر طرف بکھرے ہوتے ہیں۔ میں تو جمالی اسکائینو بنا رہی تھی۔ شاہد سے شادی کر کے' ایک شادی شدہ مرد سے شادی کر کے لیکن یہ سب کچھ سچ بھی ہے یا نہیں۔ کوئی سازش بھی ہو سکتی ہے۔ اپنی تکمیل پر اس نے رستم سے شاہد کے گھر کا پتا پوچھا اور کچھ دیر کے بعد فون پر شاہ صاحب سے چھٹی لے کر اٹھ گئی۔ وہاں کے بعد ہی وہ شاہد کے گھر پہنچی تھی۔ بوسیدہ سا عسرت زدہ گھر تھا۔ دروازہ شاہد کے نقوش سے مماثل ایک بچے نے کھولا تھا۔

"امی گھر پر ہیں بیٹے؟"

"جی! ہیں۔"

"کون ہے فیصل۔" اندر سے آواز آئی تو وہ اندر داخل ہو گئی۔ خوش شکل عورت نے اسے اجنبی نظروں سے دیکھا تھا۔

"آپ کا نام رخسانہ بیگم ہے۔"

"جی! خیریت ہے۔"

"خدا کا شکر ہے بالکل خیریت ہے' آپ سے دو منٹ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"آیئے تشریف رکھئے۔"

"شاہد آپ کے شوہر ہیں؟"

"جی ہاں!"

"کتنا عرصہ ہو گیا آپ کی شادی کو؟"

"جی' آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"آپ کو معلوم ہے کہ شاہد صاحب آج کل اپنے دفتر کی ایک لڑکی سے پینگیں بڑھا رہے ہیں۔" رمشا اسے گھورتی ہوئی بولی اور رخسانہ کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں ہی وہ لڑکی ہوں۔ شاہد صاحب مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بات مجھے آج ہی معلوم ہوئی ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں۔ آپ میری بات پر یقین کر لیں گی کہ مجھے اس بارے میں معلوم نہیں تھا۔"

رخسانہ نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"خدا کا شکر ہے اب ایسا نہیں ہو گا لیکن آپ کوشش کریں کہ وہ کہیں اور نہ بھٹکنے پائیں۔ اب میں چلتی ہوں۔"

تصدیق ہو چکی تھی۔ اس کے دل پر جو بیت رہی تھی وہی جانتی تھی لیکن اسے اپنی اعصابی قوتوں سے اب شناسائی حاصل ہوئی تھی۔ وہ زبردست قوت برداشت رکھتی تھی۔ خوب غور کرنے کے بعد رات کو اس نے امی سے کہا۔ "امی شاہد کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" امی نے پوچھا اور اس نے سب کچھ امی کو بتا دیا۔ امی سسک سسک کر رونے لگی تھیں۔

"اب کیا ہو گا؟" وہ روتی ہوئی بولیں۔

"کچھ نہیں امی! تھوڑی سی غلطی مجھ سے ہی ہو گئی تھی' آپ سے شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دیں' باقی سب ٹھیک ہے۔"

لیکن رات کو اسے معلوم ہو گیا کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ شاہد تو دل میں سوراخ کے اندر داخل ہو گیا ہے۔ وہ تو سینے میں زخم کی طرح دکھ رہا ہے۔ میں تو بہت متاثر ہو ہوں اس سے۔ آہ' لیکن میں کسی کا حق چھیننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ معصوم عورت .... لیکن اب تو دفتر میں تماشا بن جاؤں گی مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر

قریبی ہے۔ ایسے معاملوں میں کسی سے پوچھا بھی تو نہیں جا سکتا۔ کیا کروں اب .... یہ تو بہت برا ہو گیا۔ کوئی مؤثر فیصلہ کرنا ہو گا۔ اس پہلی غلطی کو آخری غلطی بنانے کے لئے وہی مؤثر قدم اٹھانا ہو گا۔

دوسرے دن وہ آفس گئی۔ شاہد نہیں آیا تھا۔ تیسرے چوتھے دن بھی وہ نہیں آیا لیکن پانچویں دن وہ شام کو اس کے گھر آ گیا۔ حلیہ بے حد خراب ہو رہا تھا' آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ امی اور وہ اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

"رمشا نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ وہ سب سچ ہے' ماں باپ نے پتھر کی ایک دیوار کو بیوی بنا کر ساری زندگی اس کے چنگل میں دے دی وہ ایک پتھرائی ہوئی عورت ہے۔ میں آٹھ سال تک اسے انسان بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کچھ نہ بن سکی۔ اب میں صرف اس سے نفرت کرتا ہوں۔ میں نے رمشا سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے اعتراف ہے لیکن میں ان سے مخلص ہوں۔ میں رخسانہ کو طلاق دے دوں گا۔ انہیں کبھی میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"نہیں بیٹے! ہم تو ویسے ہی لاوارث ہیں' بے سائبان ہیں' ہماری بدنامی کا سامان نہ کرو' تمہیں خدا کا واسطہ۔ ہم تو یہ سب سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آپ لوگوں کو مجھ پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ ورنہ .... ورنہ میں رخسانہ کو قتل کر دوں گا۔ خود کو گولی مار لوں گا' اب میں رمشا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"تمہیں خدا کا واسطہ اب تم جاؤ .... اور میری بچی کو تنگ نہ کرنا .... جاؤ تم ...."

"رمشا! میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"شاہد! تم جھوٹے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔ بس میں اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیں جینے دو۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے باوجود جینے دو۔"

"میں بھی جینا چاہتا ہوں رمشا! لیکن تمہارے بغیر یہ ممکن نہیں ہو گا۔"

تب مجبور ہو کر رمشا اقبال شاہ کے آفس میں داخل ہو گئی۔ "سر! میں آپ سے شاہد کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"تم ایک بہت اچھے انسان کی بیٹی ہو رمشا! خود ایک بہترین آرکیٹکٹ ہو لیکن اس وقت مجھے بے حد افسوس ہوا تھا جب میں نے تمہیں غلط راستوں پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا اس کے باوجود میں نے سوچا تھا کہ ایک بار تم سے بات کروں

لیکن میں ہمت نہیں کر سکا۔"

"سر! وہ مجھ پر بے جا دباؤ ڈال رہا ہے' وہ شادی شدہ آدمی ہے اور............"

"رمشا! میں نے تمہیں خود کئی بار اس کے ساتھ بائیک پر جاتے ہوئے دیکھا ہے اور شاید تم اپنی مرضی سے ایسا کرتی تھیں۔ پلیز! اس ذاتی معاملے میں مجھ سے کچھ نہ چاہو۔"

رمشا کو احساس ہوا کہ وہ اس دفتر میں سب سے زیادہ بے کردار لڑکی ہے۔ اس کی عزت دو کوڑی کی ہو گئی ہے۔ اسی رات شاہد پھر ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا حلیہ بدستور بگڑا ہوا تھا۔

"شاہ صاحب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' رمشا! تم پولیس میں میری رپورٹ کرو۔ مجھے گرفتار کرا دو۔ میں تو پھانسی تک پر چڑھنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھ پر رحم کرو رمشا! خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔"

"ہمیں سوچنے کا موقع دو شاہد! ہمیں کچھ وقت درکار ہے۔" اس کے جانے کے بعد امی نے کہا۔

"رمشا! ہم بے حد خطرناک حالات میں گھر گئے ہیں۔ اب ہمارا یہاں رہنا ہمیں برباد کر سکتا ہے۔"

"امی! میں کیا کروں؟" وہ روتی ہوئی بولی۔

"راتوں رات یہاں سے نکل چلو' کسی کو پتہ نہ چلنے دو اور کہیں بھی گم ہو جاؤ۔"

"گھر............ یہ سب کچھ............" رمشا نے کہا۔

"بند کر کے تالا لگا دو' ضروری چیزیں لے لو۔ عزت سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔"

"جائیں گے کہاں؟"

"تمہیں فرزند علی یاد ہیں۔ تمہارے ابو کے دور کے رشتے دار تھے۔ کراچی میں رہتے ہیں۔ مجھے ان کا پتا یاد ہے پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے اس کے بعد اللہ مالک ہے۔"

سارے خواب مصلوب ہو گئے تھے۔ جمالی اسکائینو تکمیل سے قبل زمین بوس ہو گیا تھا۔ زمین میں بیٹھی وہ یہی سوچ رہی تھی' انسان جذبات میں آ کر ایسی ایسی باتیں سوچ بیٹھتا ہے' جو صرف الف لیلہ کی کہانیوں میں ہی پوری ہو سکتی ہیں۔ انسانی زندگی تو بہت ہو [illegible]

سے پاؤں' ایک چھوٹا سا دماغ' کائنات کو تسخیر کرنے کے خواب کیسے پورے کر سکتا ہے۔ یہ خواب سچے نہیں ہوتے' خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں' انسان ان خوابوں میں اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کر لیتا ہے اور بس بھلا اس سے زیادہ ان کی کیا اہمیت ہوتی ہے' میں کمزور سی شخصیت' بہت دعوے کئے تھے میں نے' کہ یہ کروں گی وہ کروں گی' ابو آپ کا نام روشن کروں گی لیکن سب وقت کی کہانیاں ہوتی ہیں اور فیصلے کرنے کا حق کبھی انسان کے پاس نہیں ہوتا۔

کراچی روشنیوں کا شہر' زندگی کے حسن سے مالا مال' سائرہ بیگم کو فرزند علی چچا کا پتا معلوم تھا۔ ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی بس وہ بھی چچا کسی کام سے آئے تھے اور ابو کی زندگی میں ہی بہت بار یہ کہہ کر گئے تھے کہ کراچی آئیں ان کے ساتھ رہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے اس نے سوچا۔ سائرہ بیگم نے بڑے اعتماد کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور کو پاکستان کوارٹرز کا پتا بتا دیا تھا۔ پھر وہاں داخل ہونے کے بعد کرکٹ کھیلنے والے کچھ بچوں سے کوارٹر کا نمبر معلوم کیا تھا اور اس کے بعد جو شخصیت دروازہ کھولنے آئی تھی وہ دبلے پتلے بدن کی ایک خوبصورت سی لڑکی تھی جس کے چہرے کے نقوش مرجھائے ہوئے تھے۔

سائرہ بیگم نے نیچے اتر کر اپنا سوٹ کیس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "تم عائشہ ہو نا!"

"جی مگر آپ!"

"ہم اسلام آباد سے آئے ہیں' فرزند علی بھائی موجود ہیں۔"

"کون ہے عائشہ؟" اندر سے آواز آئی۔

"ابو اسلام آباد سے مہمان آئے ہیں۔" اور پھر فرزند علی باہر نکل آئے اور انہوں نے سائرہ بیگم کو دیکھ کر بے اختیار کہا۔

"ارے تم' آؤ اندر آ جاؤ' سائرہ بیگم آؤ اندر آ جاؤ' میرے لئے بیٹیوں کی مانند ہو تم' آؤ بیٹی اندر آ جاؤ۔"

ویسے یہ حقیقت تھی کہ جب فرزند علی چچا اسلام آباد آئے تھے تو سائرہ بیگم نے ان کی بڑی خدمت کی تھی اور وہ بہت متاثر ہو کر گئے تھے۔

بس پھر سارے تعارف ہوئے۔ فرزند علی چچا نے اس بات پر شرمندگی کا اظہار کیا کہ اپنی مجبوریوں کی بنا پر وہ جمالی صاحب کی موت پر اسلام آباد نہ آ سکے' یہاں کی کیفیت یہ تھی کہ فرزند علی کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا اور عائشہ جس کی شادی پانچ سال قبل ہو چکی

تھی اس کا شوہر اسے چھوڑ کر دبئی چلا گیا تھا اور پھر اس نے کوئی خبر نہیں لی تھی' طویل قصہ طویل کہانی تھی۔ عائشہ کے سسرال والوں نے اسے آباد نہ ہونے دیا اور اس وقت عائشہ کی ساڑھے تین سال کی ایک بچی تھی جس کا نام لبنیٰ تھا۔ اتنی اچھی کہ بس دل میں بٹھا لینے کو دل چاہے۔ ویسے عائشہ بھی بہت پیاری لڑکی تھی' فرزند علی صاحب نے صورت حال سے واقفیت حاصل کی اور دل کھول کر بولے۔

"نہیں بہن' بھاوج کو بہن سمجھ لو' بیٹی سمجھ لو اور پھر اس چھوٹے سے کوارٹر میں جگہ بہت ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہو گی تمہیں اور پھر ہم جس قابل بھی ہیں حاضر ہیں۔"

فرزند علی صاحب نے بڑا اچھا طریقہ اپنا رکھا تھا۔ گورنمنٹ اسکول میں ماسٹر تھے' لبنیٰ کو ساتھ ہی لے جایا کرتے تھے۔ ادھر عائشہ نے بھی ایک جگہ نوکری کی ہوئی تھی۔ بی اے پاس تھی وہ اور نوکری کر رہی تھی۔ گھر کو تالا لگا دیا جاتا تھا لیکن اب یہ گھر ان ماں بیٹیوں نے آباد کر لیا۔

دوسرے دن فرزند علی صاحب معمول کے مطابق اسکول چلے گئے' عائشہ اپنے دفتر' گھر کو تالا لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ گھر میں مہمان موجود تھے۔ رمشا نے سائرہ بیگم سے کہا۔

"امی مجھے بھی یہاں نوکری تلاش کرنا ہو گی' ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ہمیں۔"

سائرہ بیگم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئیں' ظاہر ہے کیا کہہ سکتی تھیں بیٹی سے' کچھ لمحے توقف کے بعد بولیں۔

"بیٹی کراچی اجنبی جگہ ہے' اسلام آباد تو بہت مختصر تھا وہاں کی زندگی یہاں سے کافی مختلف ہے لیکن کراچی میں.........."

"جو غلطی ہو گئی مجھ سے امی' پہلی بات تو یہ کہتی ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہو گا' اس کے علاوہ اطمینان رکھیں میں بہت خود اعتمادی سے اب سب کچھ کروں گی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

عائشہ سے تذکرہ کیا تو وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بولی۔

"دیکھو ایسا کرو' کل سے میں انگریزی کا اخبار منگوا لیا کروں گی اور کچھ اردو کے بھی اخبار خرید لیا کریں گے۔ ظاہر ہے ہم مہنگے اخبار مسلسل نہیں خرید سکتے لیکن ملازمتوں کے اشتہارات ان ہی اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔ بس تم انہیں دیکھو اور جو مناسب جگہ

اپنے لئے سمجھو وہاں کے لئے درخواست لکھ ڈالو۔ باقی سارے کام میں کر دوں گی۔"

"ٹھیک ہے عائشہ!" اس نے کہا اور پھر وہ عائشہ کی ہدایت کے مطابق کام کرنے لگی۔ دو تین جگہیں ایسی تھیں جہاں رسائی کی جا سکتی تھی' ایک فرم کا اشتہار بھی تھا جہاں ریسپشنسٹ کی ضرورت تھی اور براہ راست ملاقات کے لئے کہا گیا تھا۔ وقت گیارہ بجے سے دوپہر ایک بجے تک کا تھا۔ اس وقت کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ اس جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی لیکن ہمت کر کے تیار ہو کر گھر سے باہر نکل آئی۔ اب نہ جانے کیوں اس کے اندر ایک عجیب سے اعتماد نے جنم لیا تھا۔ ایک رکشا لیا اور آئی آئی چندریگر روڈ کے لئے کہہ کر بیٹھ گئی' سفر طویل تھا لیکن بہرحال وہ مطلوبہ جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

جس فرم کا اشتہار تھا' اس میں شاید سب سے پہلے داخل ہونے والی وہی تھی۔ انتظار گاہ میں بیٹھ گئی' بہت شاندار آفس تھا' چم چم چمک رہا تھا۔ سامنے ہی چیئرمین کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ شیشے کا بہت بڑا آفس بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہی انتظار گاہ تھی۔ چپڑاسی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ پھر اور لڑکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ چار لڑکیاں آئی تھیں لیکن اس کے بعد مین دروازے سے جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر رمشا کے پورے وجود میں گرم گرم لہریں دوڑ گئیں اور وہ ہکا بکا رہ گئی۔

حیدر زمان صاحب کو اس نے پہچان لیا تھا۔ شاندار سوٹ میں ملبوس تھے اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ ایک نگاہ انہوں نے بیٹھی ہوئی لڑکیوں پر ڈالی تھی اور پھر رمشا کو دیکھ کر ٹھٹکے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح کھڑے رمشا کو دیکھتے رہے۔ رمشا کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ حیدر زمان صاحب ذرا مختلف قسم کے انسان تھے۔ کسی بھی قسم کا ڈرامہ کرنے کی بجائے وہ اس کے قریب پہنچے اور بولے۔

"سر اوپر اٹھاؤ لڑکی' تمہارا نام رمشا ہے نا!"

رمشا کو حیرت ہوئی' حیدر زمان صاحب نے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا' اتنا رہی وہ ان کے ذہن میں۔ اس نے دل میں سوچا۔

بہرحال اس نے سر اٹھایا اور حیدر زمان صاحب نے اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور بولے۔

"تم بھی.......... اٹھو۔" دوسری بار ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" انہوں نے کہا اور رمشا لرزتے قدموں سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ اب بھلا یہ سوچنے کیا وقت تھی کہ یہ حیدر زمان صاحب کا ہی دفتر ہے' کیا عجیب بات ہوئی تھی' پیچھے سے آواز آئی۔

"لو بھئی یہ ملازمت تو طے ہو گئی۔"

حیدر زمان صاحب اسے ساتھ لئے ہوئے اپنے شاندار آفس میں پہنچے اور بائیں جانب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ سامنے کی کرسیاں خالی تھیں۔ پھر انہوں نے بیل بجائی اور چپڑاسی فوراً ہی اندر داخل ہو گیا۔

"کتنی بچیاں آئی ہیں؟"

"سر باہر تین اور ہیں۔"

"ہوں۔" انہوں نے کہا اور پھر بولے۔ "ایک ایک کر کے بھیجو۔"

"جی سر!" چپڑاسی نے کہا اور باہر چلا گیا' رمشا سے انہوں نے کوئی اور سوال نہیں کیا تھا۔ رمشا خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لڑکی اندر آئی' حیدر زمان صاحب نے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی' اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس کی فائل نکالی جس میں اس کی درخواست لگی ہوئی تھی اور بولے۔

"یہ الفاظ کس نے کہے تھے کہ یہ ملازمت تو طے ہو گئی!"

"سس .... سر! میں نے۔"

"ہوں!" انہوں نے درخواست پر نظر ڈالی پھر بولے۔

"کام کر سکو گی' میرا مطلب ہے جس کام کے لئے اشتہار دیا گیا ہے۔"

"سر! میرا کوئی تجربہ نہیں ہے' لیکن..........."

"جاؤ کہیں اور ملازمت تلاش کرو۔" انہوں نے کہا اور لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ رمشا تعجب بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی' اس کے بعد تین چار اور لڑکیوں کا انٹرویو ہوا' ان میں سے ایک لڑکی سے حیدر زمان صاحب نے کہا۔

"تم کل سے کام پر آ جاؤ۔"

"جی' جی سر!"

"کل سے کام پر آ جاؤ۔ یہاں فیروز صاحب ہیں باہر جا کر ان سے مل لو بلکہ ٹھہرو میں تمہیں چپڑاسی کے ہاتھ بھجوائے دیتا ہوں وہ تمہیں ساری صورت حال بتائیں گے۔"

تھی۔ پھر حیدر زمان صاحب نے چپڑاسی کو بلا کر چائے طلب کی اور اس کے بعد رمشا سے مخاطب ہو کر بولے۔

"تم اس ملازمت کے لئے ہی آئی تھیں نا؟"

"جی سر!"

"اسلام آباد سے کب آئیں؟"

"تھوڑے دن ہوئے۔"

"وہاں سے ملازمت کیوں چھوڑ دی؟"

رمشا نے ایک نگاہ حیدر زمان صاحب کی طرف دیکھا اور اس آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حیدر زمان صاحب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جب رمشا کے خوب آنسو بہہ چکے تو وہ بولے۔

"لو اب آنسو خشک کرو اور ممکن ہو تو مجھے صحیح صورت حال بتا دو۔" اور نہ جانے کیوں رمشا کی زبان کھل گئی۔ ایک ایک لفظ اس نے حیدر زمان کو بتا دیا۔ حیدر زمان صاحب خاموشی سے سن رہے تھے' پھر انہوں نے کہا۔

"اشتہار دیکھ کر آئی تھیں؟"

"جی سر!"

"میرا کارڈ گم کر دیا ہو گا۔"

"نہیں' نہیں سر! سب کچھ گھر میں ہی رہ گیا۔ ہم بس ضرورت کی چیزیں لے کر آ گئے۔"

"ہوں' اب ملازمت کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔"

"جی سر!"

"میں تمہارے والد سے کتنا چھوٹا یا کتنا بڑا ہوں گا اندازے سے بتاؤ۔"

حیدر زمان صاحب کا سوال بڑا عجیب تھا' اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر گردن جھکا لی۔

"بولو رمشا! تم بہت بولڈ لڑکی ہو' اچھے فیصلے کر سکتی ہو' بہت عزت اور بے حد احترام کرتا ہوں میں تمہارا۔ وہ بس میں کیا کہوں انہیں' اچھے لوگ نہیں ہوتے جو انسانوں کی حقیقتوں کو نہیں سمجھتے۔ اقبال شاہ صاحب نے غلطی کی اپنے آپ کو تم سے بے تعلق

فرشتے میں اور ظاہر ہے یہ فرق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ اچھے اور نیک کام کرنا بہت بڑی سعادت ہے لیکن فرشتہ کبھی نہیں بن سکتا وہ' خیر چھوڑو' بتایا نہیں تم نے؟"

"سر' ابو آپ ہی کی عمر کے ہوں گے۔"

"اگر جمال صاحب زندہ ہوتے تو تمہارے بارے میں اچھے انداز میں سوچتے تا بیٹے' دیکھو میں تمہاری روشن پیشانی اور روشن آنکھوں کی پیش گوئی کر چکا ہوں' قدرت نے مجھے اگر یہ موقع عطا کیا ہے تو میں اس کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں سر!"

"میرے پاس یہاں بہت کچھ ہے' گھر میں بھی بہت کچھ ہے لیکن میں کوئی بے تکی روایت کوئی بے تکی مثال قائم نہیں کروں گا۔ ایک آفس ہے جسے میں تین دن میں ٹھیک کروا دوں گا' تم اس میں اپنے کام کا آغاز کرو گی اور یہ میں تمہیں بتا دوں کہ میں خود تین نئے پروجیکٹ شروع کر رہا ہوں اور اس کے لئے مجھے یقین کرو' اسلام آباد تمہارے پاس جانا تھا۔ میں اقبال شاہ سے یہ کہتا کہ میری پسند کا کام وہ لڑکی کر سکتی ہے چنانچہ مجھے اس سے یہ کام کرا کے دیا جائے۔ اب اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ تم یہیں آ گئی ہو۔ بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے' اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھو' انشاء اللہ تعالیٰ تم یہاں پُرسکون طریقے سے کام کرو گی اور میں اپنے تمام تر تعلقات سے کام لے کر تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانے کا راستہ دکھاؤں گا۔"

رمشا شدت حیرت سے گنگ رہ گئی تھی پھر حیدر زمان صاحب نے اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ اسے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی کچھ لمحے قبل وہ کہہ چکے تھے کہ انسان کبھی فرشتوں کا ہمسر نہیں ہو سکتا لیکن وہ تو فرشتوں جیسا ہی عمل کر رہے تھے۔

امی کو آ کر پورے واقعات سنائے تو انہوں نے سجدہ شکر ادا کیا اور کہنے لگیں۔

"انسان کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ انسانوں کی مدد کریں۔ اللہ کسی نہ کسی کے ذریعے ہی عطا کرتا ہے اور عطا کرنے والی ذات اسی کی ہے۔"

حیدر زمان نے جو کچھ کیا وہ ناقابل یقین تھا۔ انہوں نے ایک سادہ بورڈ اس خوبصورت آفس کے بڑے دروازے پر لگوا دیا تھا اور یہ سادہ بورڈ جس پر صرف ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے دیکھ کر رمشا کو حیرت ہوئی' حیدر زمان صاحب نے کہا۔

"تم [illegible] کا نام تم خود لکھو گی [illegible] کوئی نام لکھنے کی ضرورت نہیں

ہے کیونکہ ابھی تمہیں صرف میرا کام کرنا ہے' بعد میں اس نام کا انتخاب تم خود کرو گی۔"

بڑا عجیب بڑا جذباتی فیصلہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے حیدر زمان صاحب اس کے دل میں جھانک سکتے ہوں۔ بہرحال اس نے اپنے دفتر کو اندر سے دیکھا' اس کی توقع سے کہیں شاندار تھا۔ دو دن میں حیدر زمان صاحب نے یہ سب کچھ کر ڈالا تھا' ناقابل یقین سی بات تھی۔ پھر حیدر زمان صاحب نے فون پر اس سے کہا۔

"اور بہتر ہے کہ میں تمہاری طرف سے کچھ اشتہارات دے دوں۔ اپنے لئے ساتھیوں کا سلیکشن کر لو۔ ایک چپڑاسی' تین کلرک' ایک سیکرٹری' کسی ایسی لڑکی کو اپنی سیکرٹری بناؤ' جو تمہارے معیار پر پوری اترے۔"

"سر ابھی اس کی اتنی جلدی تو نہیں ہے۔ بس ایک چپڑاسی کافی ہو گا۔"

"نہیں بیٹے' دیکھو میں روزانہ دو گھنٹے تمہارے ساتھ گزاروں گا اور تمہیں آفس ہینڈل کرنے کی تربیت دوں گا۔ کچھ کام ضروری ہوتے ہیں' میری بات مان لینا' خدمت کرنا۔"

"ٹھیک ہے سر!" پھر اچانک ہی اسے عائشہ کا خیال آیا تھا' عائشہ گریجویٹ تھی ایک فرم میں ملازمت کرتی تھی اس نے عائشہ سے تذکرہ کیا' عائشہ کہنے لگی۔

"کہیں یہ نہ سمجھیں زمان صاحب کہ تم نے اپنے رشتہ دار اکٹھے کرنا شروع کر دیئے۔"

"نہیں میں بات کر لوں گی ان سے۔"

حیدر زمان صاحب نے بھی عائشہ کو بے حد پسند کیا تھا اور خوش ہو کر بولے تھے۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے تم دونوں کی انڈر سٹینڈنگ بھی ہو گی' بس سمجھ لو' سیکرٹری کی حیثیت سے عائشہ کا انتخاب ہم نے خود کر لیا۔" اور اس کے بعد زمان صاحب نے ہی عائشہ کی تنخواہ کا تعین کیا تھا۔ عائشہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ یہ تنخواہ اس کی موجودہ تنخواہ سے بہت زیادہ تھی لیکن بہرحال یہ قصے کہانیاں بھی انسانی زندگی سے ہی متعلق ہوتی ہیں۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی رمشا کہ اس کی زندگی کو اتنا سہارا ملے گا لیکن اپنی مہارت کی بنا پر جو کام اس نے کیا درحقیقت وہ حیدر زمان صاحب کی کاوشوں کا بدل تھا۔ حیدر زمان صاحب نے باقاعدہ بہت سے لوگوں کو رمشا کا کیا ہوا کام دکھایا تھا اور بڑے بڑے ماہر سول انجینئر اپنی زبان سے کہہ بیٹھے تھے کہ رمشا کی شخصیت باکمال ہے۔

اس کے بعد کام کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ رمشا کے اندر تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔

فرزند علی صاحب نے اسے سہارا دیا تھا۔ رمشا نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ حیدر زمان صاحب کے بے حد اصرار پر اس نے نئے مکان میں رہائش اختیار کی اور فرزند علی کی اسکول کی ملازمت ختم کرا کے اپنے ساتھ لے گئی' اس نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔

"دیکھئے چچا جان! آپ کو اسکول کی ملازمت سے جو معاوضہ ملتا ہے اس کا بندوبست اللہ تعالیٰ نے عائشہ کی تنخواہ کی شکل میں کر دیا ہے۔ باقی اپنے واجبات آپ وصول کر کے اپنے طور پر ان کا جو دل چاہے کریں' جہاں تک معاملہ عائشہ کا اور میرا ہے تو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم لوگوں کو اللہ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔"

"بیٹی! میں کیا کہوں' میری تو زندگی کا ایک اثاثہ ہے یہ۔"

"بزرگ بچوں کی بات مان لیا کرتے ہیں۔ اگر ضد ایسی نہ ہو جس سے کوئی نقصان پہنچے۔ میں اپنا ایک گھر بنا چکی ہوں' آپ لوگوں کے ساتھ آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہم تنہا ہو جائیں' امی اکیلی رہیں' طوبیٰ اور مشعل لیتی کی دوستی کو ترسیں تو جیسا آپ مناسب سمجھیں' آپ کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی میں۔"

"نہیں بیٹے' ٹھیک ہے' جیسا تم چاہو۔" اور اس کے بعد فرزند علی کے ساتھ وہ نئے شاندار گھر میں منتقل ہو گئی۔ خوابوں کی تعبیریں مل رہی تھیں لیکن ابھی تک دفتر کے باہر لگا ہوا بورڈ سادہ تھا۔ وہ حیدر زمان صاحب کی ایک ایک عنایت کا صلہ انہیں واپس کر دینا چاہتی تھی اس کے بعد ہی اس بورڈ پر اپنی پسند کا نام لکھوانے کا حق اسے حاصل ہو سکتا تھا۔ حیدر زمان صاحب کے جتنے بھی پروجیکٹ اسے ملے اس میں اس نے اپنی محنت اور ذہانت کی انتہا کر دی تھی۔ دفتر کے کام بھی بڑھتے جا رہے تھے' لیکن وہ دن رات اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھی اور ان پروجیکٹس کی تکمیل کرنے کے لئے ایک ایک لمحہ سوچتی رہتی تھی۔ پھر یہ کام مکمل ہو گئے۔ حیدر زمان صاحب بے حد خوش تھے۔ تمام حلقوں میں وہ اسے متعارف کراتے رہتے تھے۔ انہوں نے بڑے کھرے انداز میں ایک ایک پیسے کا حساب کیا اور ہر چیز کی قیمت لگا کر اس فرم اس مکان اور باقی تمام لوازمات کا مالک انہوں نے رمشا کو قرار دیا۔ رمشا نے احسان مندی سے حیدر زمان صاحب کو دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

"دیکھو رمشا اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں نے ایک اندھا اعتماد کر کے اتنی بڑی ذمہ داری تمہارے شانوں پر ڈال دی تھی۔ بات اصل میں یہ تھی کہ میں نے وہاں اقبال شاہ کے پاس تمہارا جو کام دیکھا تھا اسے دیکھ کر ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بے پناہ ذہانت کی مالک ہو۔ معلومات کرنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے والد جمالی صاحب ایک بہترین آرکیٹکٹ تھے اور تم نے ان ہی سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ میں نے بے شک یہ ایک رسک لیا تھا لیکن مجھے اس کا جو رزلٹ ملا ہے۔ تم یقین کرو۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم پورے اعتماد کے ساتھ کام جاری رکھو' یہ سب کچھ جو میں نے تمہارے لئے کیا تھا اب تم پر احسان نہیں رہا۔ بلکہ اتنا ہی معاوضہ مجھے دوسری کسی فرم کو ادا کرنا پڑتا چنانچہ محبت کے ہر احساس کو ذہن میں رکھو اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جہاں تک احسان مندی کا تعلق ہے تو اس کے لئے اظہار محبت ہی سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے کیا سمجھیں۔"

"جی سر!" اس نے کہا اور حیدر زمان صاحب اسے دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"کچھ تو ادائیگی کر دو ہمارے ان احسانات کی۔"

"میں سمجھی نہیں سر!"

"کبھی غلطی سے انکل بھی کہہ دیا کرو اچھا لگے گا تمہاری زبان سے .... یہ خواہش ہے ہماری۔" اس کی گردن جھک گئی اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس نے اپنا سر حیدر زمان صاحب کے سینے پر رکھ دیا۔

"آپ انکل ہی نہیں' میرے لئے میرے ابو کا مقام رکھتے ہیں' شاید میرے ابو بھی اپنی کاوشوں سے اتنا کچھ نہ کر پاتے کیونکہ ان کے پاس یہ ذرائع نہ تھے۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹے! بہت بڑا مقام دیا ہے تم نے مجھے۔" حیدر زمان نے کہا۔

رمشا کو ایک پُراطمینان زندگی مل گئی تھی۔ ان تمام ہنگامہ آرائیوں نے بہت سے ناخوشگوار لمحات بھلا دیئے تھے لیکن بزرگوں کے سوچنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔

فرصت کے ایک دن جبکہ ڈرائنگ روم آباد تھا تینوں بچیاں کھیل رہی تھیں' فرزند علی نے رمشا اور عائشہ کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"آج ہم دونوں تم سے اپنی ایک مشکل کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت تم ہمیں چھوٹا اور خود کو بزرگ سمجھو۔"

رمشا اور عائشہ مسکراتی نگاہوں سے فرزند علی اور سائرہ بیگم کو دیکھ رہی تھیں۔ ماحول خاصا دلچسپ ہو گیا تھا۔ فرزند علی صاحب جہاندیدہ انسان تھے اور پوری عمر کا تجربہ

ان کی زندگی میں شامل تھا۔ انہوں نے کہا۔

"بھئی رمشا بیگم اور عائشہ بیگم انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوا کرتے ہیں' بچپن میں اسکول کی تعلیم ماں' باپ کی اطاعت اور اس کے بعد کھیل کود' جوانی میں زندگی کے دوسرے لوازمات بڑھاپے میں اپنے بچوں کا خیال رکھنا' ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنا اور بہرحال پھر شام ہو جاتی ہے' تو مسئلہ کہنے کا یہ ہے کہ ہم لوگ جس سے دور سے گزر رہے ہیں اس کے بارے میں تم سے کچھ کہنا اس لئے غیر مناسب ہے کہ تم خود سمجھدار ہو' رمشا! ماشاء اللہ جو کچھ تم نے کیا ہے اسے دہرانے بیٹھوں تو خود کو شرمندگی ہو گی اس احساس کے ساتھ کہ میرے ساتھ جو کچھ تم نے کیا ہے میں شاید اس کی ادائگی کی کوشش کر رہا ہوں' یا تمہیں خوش رکھنا چاہتا ہوں اور ایسا ہے۔ میرے دل میں بارہا یہ خواہش ابھری ہے کہ دل کھول کر تم سے تمہاری تعریف کروں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ہے اس لئے کہ تمہارے مزاج سے واقف ہوں' یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے ہمیشہ مجھے بہت بڑا مرتبہ' بہت درجہ دیا ہے بس اسی حق کو مدِنگاہ رکھتے ہوئے تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی چچا جان! بلاوجہ اتنی تمہید باندھی آپ نے' سیدھا سادا سوال کر ڈالتے۔" رمشا ہنس کر بولی۔

"بیٹے ماشاء اللہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے تم نے' اب یہ بتاؤ زندگی کے ساتھی کا انتخاب کب کرو گی؟" ایک لمحے کے لئے رمشا کے رنگ میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی اور کوئی سمجھ سکا ہو یا نہ سمجھ سکا ہو لیکن سائرہ بیگم نے یہ تبدیلی پوری طرح محسوس کی تھی اور ایک لمحے کے لئے کانپ کر رہ گئی تھیں' تاہم انہوں نے محسوس کیا کہ رمشا نے خود کو بھرپور طریقے سے سنبھالا ہے اور پھر وہ پُرسکون ہو گئی۔

"چچا جان! زندگی کا ساتھی صرف شوہر ہی تو نہیں ہوتا' آپ سب ہماری زندگی کے ساتھی ہیں۔ یہ بچیاں ہیں' کبھی کبھی انسان کو صرف اپنے لئے ہی نہیں سوچنا چاہئے بلکہ اگر کچھ لوگ ان سے منسلک ہوں تو پھر اپنے آپ کو ان کی شکل میں دیکھ کر وہ صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

"تمہیں احساس ہے بیٹے کہ تمہارے الفاظ کتنے بے ربط ہیں' کوئی ربط نہیں بن رہا' پھر جو کچھ کہنا چاہتی ہو میں سمجھ نہیں پا رہا۔"

"چچا جان! آپ یہ بتایئے کہ میں نے شوہر کے بارے میں کچھ کہہ کر غلطی تو نہیں کی

ہے' آپ اس وقت ہمارے بارے میں ہی گفتگو کرنا چاہتے ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"تو دیکھئے عائشہ کی زندگی کو دیکھ لیجئے' اس نے اگر اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے' اگر اس نے زمانے کے مظالم کو خود پر جھیلنے کا فیصلہ کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو یہ کامیابی حاصل ہو جائے' جہاں تک میرا مسئلہ ہے تو آپ یقین کیجئے کہ ذہن کے کسی گوشے میں ایسا تصور تک نہیں ہے' دنیا کی ہر بات مان لوں یا اس بارے میں غور کروں یا آپ مجھے اس کے لئے اپنی پسند کی آزادی بھی دے دیں' تو انتہائی عاجزی کے ساتھ درخواست کرتی ہوں کہ ایسا کبھی نہ کہیں' میں اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی اور مجھے یقین ہے کہ اپنی زندگی کو میں ان بچیوں کے سہارے' عائشہ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کا سایہ ہمارے سروں پر رکھے' بڑے پُرسکون طریقے سے گزار جاؤں گی' میری ساری محنت سارا تجربہ اب ان بچیوں کے لئے مخصوص ہو جانے دیجئے' میں خود اس بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتی' ہاں اگر آپ عائشہ سے یہ سوال کریں تو اس کی ذمہ داری میں لیتی ہوں کہ لیتی کو میں سنبھالوں گی' عائشہ اس کی فکر نہ کرے۔"

عائشہ نے چونک کر رمشا کو دیکھا پھر تھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اور جس دن مجھے اس کے لئے مجبور کیا گیا میں خودکشی کر لوں گی۔"

"ارے باپ رے۔ نہیں بھئی یہ بچیاں تو باقاعدہ بغاوت پر آمادہ ہو گئیں بھائی جان۔" سائرہ بیگم کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی ویسے بارہا انہوں نے اس بارے میں سوچا تھا' آخر بیٹی کی ماں تھیں' طوبیٰ اور مشعل تھیں جو بڑی تیزی سے جوان ہوتی جا رہی تھیں' ان کا مسئلہ بھی سامنے آئے گا' قدرت نے ہاتھ تھام لیا تھا کوئی ملی پریشانی دامن گیر نہیں رہی تھی لیکن بہرحال رمشا کے بارے میں بھی ان کے ذہن میں کچھ تصورات تھے لیکن وہ حقیقت بھی جانتی تھیں اور بارہا انہوں نے سوچا تھا کہ رمشا کو اندر سے ٹٹولیں' اس کمبخت شاہد کی غلاظت رمشا کے ذہن سے دور ہوئی ہے یا نہیں' لیکن ہمت نہیں کر سکی تھیں' بیٹی کچھ ایسا ہی روپ اختیار کر چکی تھی۔ رمشا نے جو انداز اختیار تھا اس کے بعد فرزند علی صاحب نے اس کی غیر موجودگی میں سائرہ بیگم سے کہا۔

"اصل میں اس لڑکی نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنایا ہے' اس میں تحلیل ہو گئی' میں اس کی فطرت کا تجزیہ کر سکتا ہوں' اب میں آپ کو بتاؤں بھائی اسے اسی طرح چھوڑ

دیجئے، نہ تو عائشہ اور نہ وہ ہمارے کہنے سننے سے اس بات پر راضی ہوں گی، چاہے ہم ان کے سامنے کیسی ہی شخصیت کو کیوں نہ لے آئیں، اب ان معاملات کو وقت پر چھوڑ دیجئے، قدرت نے ہمیں موقع دیا تو ہم دیکھ لیں گے ورنہ وہ خود ہی کبھی نہ کبھی اپنی تقدیر کا فیصلہ کرلیں گی۔"

سائرہ بیگم ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی تھیں، بہر حال ماں تھیں آرزوؤں کا ایک طوفان دل میں تھا لیکن ہر آرزو تو پوری نہیں ہو جاتی۔ یہی کیا کم تھا کہ بیٹی نے بیٹی ہو کر وہ کر دکھایا تھا جو بڑے بڑے نہ کر سکیں۔ پھر رمشا نے اس بورڈ کے سادہ تختے پر جمالی اسکائینو کے سائن جگمگا دیئے، اس کا افتتاح سوچ دیا کر حیدر زمان صاحب نے کیا تھا۔ رمشا جذباتی انداز میں آدھے گھنٹے تک اس بورڈ کے سامنے کھڑی رہی تھی، اسے مبارک بادیں مل رہی تھیں، لیکن وہ سکتے کے سے انداز میں جمالی اسکائینو کو دیکھ رہی تھی، بہر حال اس فرم کا نام خاصی شہرت اختیار کرتا جارہا تھا اور اب اسٹاف بھی بڑھانا پڑ رہا تھا، چنانچہ عمارت میں بھی توسیع کی گئی اور اسٹاف بھی اچھا خاصا بڑھایا گیا، کئی لڑکے اور لڑکیاں رکھے گئے تھے، کئی آرکیٹکٹ اب یہاں کام کر رہے تھے اور انہی میں سجاد بھی تھا۔ سجاد ایک اشتہار کے جواب میں آیا تھا اور اس نے انٹرویو کے دوران کچھ اس قسم کا اظہار کیا تھا کہ رمشا نے اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

"سجاد صاحب آپ کتنے عرصے سے یہ کام کر رہے ہیں؟"

"میڈم ویسے تو جو تعلیم حاصل کی وہ الگ نوعیت کی حامل ہے، لیکن بچپن سے میں ایک خواب دیکھتا آیا ہوں اور اس خواب کی تعبیر کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں، آپ مجھے بے شک ملازم نہ رکھیں انٹرویو دینا میرا فرق ہے کیونکہ جمالی اسکائینو بہت بڑی فرم ہے اور اس فرم کا کام کرنے کے بعد میری حیثیت بہت بڑھ جائے گی، پھر جب یہاں سے نوکری چھوڑوں گا تو مجھے بڑی عزت ملے گی اور پھر............ اور پھر............"

"یہاں سے آپ نوکری کیوں چھوڑیں گے۔ کیا اس لیے کہ آپ کو زیادہ تنخواہ حاصل ہو؟"

"نہیں .... بلکہ اس فرم کا آرکیٹکٹ کہلا کر میں اپنی ایک چھوٹی سی فرم بناؤں گا اور کہوں گا کہ یہ جمالی اسکائینو کی برانچ ہے یا پھر میں وہاں کا آرکیٹکٹ ہوں، اس طرح ذرا میری پوزیشن بنے گی، بعد میں سارے معاملات تقدیر پر چھوڑ دوں گا۔" اس انٹرویو کے ناتے کے بعد عائشہ نے کہا۔

یہ آدمی صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔" رمشا کہنے لگی۔

"نہیں عائشہ میں کوئی جذباتی لڑکی نہیں ہوں۔ زندگی کے حقائق سے واقف بھی ہوں اور ان تمام مصائب کا سامنا کر چکی ہوں جو اس سلسلے میں پیش آتے ہیں، اگر یہ شخص اس طرح اپنی تقدیر بنانا چاہتا ہے تو میرا خیال ہے اسے نوکری دے دو، ہمارا کیا لے جائے گا پہلے ہی ہم نے کون سے آسمانوں میں سوراخ کیے ہیں، اگر قدرت ہمارے ذریعے اس کا کام کر دیتی ہے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" عائشہ گردن ہلا کر خاموش ہو گئی تھی۔

بہر حال جمالی اسکائینو بڑی عمدگی سے اپنا کام سرانجام دے رہی تھی اور اس فرم کی خاصی شہرت ہو گئی تھی، بہت بڑے بڑے پروجیکٹ مل رہے تھے اسے اور کچھ ہی دنوں میں رمشا نے محسوس کیا کہ ویسے تو اسے بڑے اچھے اچھے ماہرین کا تعاون حاصل ہے لیکن سجاد کافی ذہین انسان ہے اور اپنے کام میں بے پناہ مہارت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سجاد کے اندر جو ایک کیفیت پائی گئی تھی وہ بھی ذرا کچھ عجیب تھی وہ انتہائی بے باک اور بے دھڑک قسم کا نوجوان تھا، رمشا کے آفس میں کئی بار بغیر اجازت لیے آگیا تھا۔ رمشا نے اسے صرف سرد نگاہوں سے دیکھنے پر اکتفا کیا تھا، ایک دن اس نے شکایت کر ڈالی۔

"میڈم یہ آپ اپنے چپراسی کو ذرا سمجھا دیجئے گا، میرا بھی راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے، کیا آپ کے پاس آنے کے لیے اجازت لینا ضروری ہے؟"

"دفتر کے قوانین تو قوانین ہی ہوتے ہیں مسٹر سجاد۔"

"لیکن آپ نے اگر ایسا کیا تو آپ یقین کیجئے میں یہ نوکری چھوڑ کر چلا جاؤں گا، مجھے الگ سے اہمیت ملنی چاہیے، اگر ابھی سے میرا دل ٹوٹ گیا تو آپ غور کیجئے کہ مستقبل میں ترقی کیسے کر سکوں گا۔"

"آپ کس کام سے آئے ہیں بتایئے؟"

"بس میں ناراض ہو گیا ہوں، آپ سمجھئے میں روٹھ گیا ہوں آپ سے۔" کچھ ایسا انداز اختیار کیا اس نے کہ رمشا کو ہنسی آگئی۔

"بیٹھیے بھئی بیٹھیے میں کہہ دوں گی اس سے، لیکن پھر بھی آپ اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو خود سوچیں گے کہ تھوڑا سا ڈسپلن ضروری ہوتا ہے۔"

"ہاں، یقیناً تھوڑا سا ڈسپلن ضروری ہوتا ہے۔ میں اندر داخل ہو کر آپ کو سلام

کرتا ہوں آپ کی اجازت سے کرسی پر بیٹھتا ہوں' بس اتنا کافی ہے نا آپ کم از کم مجھے یہ احساس تو دلایئے کہ میں واقعی ایک بہت اچھا آرکیٹکٹ ہوں اور دوسرے لوگوں سے بہت اچھا کام کرتا ہوں' میری عزت افزائی ہو گی میرا حوصلہ بڑھے گا۔"

"اب یہ بتایئے آپ سائن اینڈ سائن کے سلسلے میں کیا کر کے لائے ہیں؟"

"میں نے سائن اینڈ سائن کو سائن بنا دیا ہے یہ دیکھئے۔" اس نے اپنا بنایا ہوا نقشہ رمشا کے سامنے پھیلا دیا' رمشا خود کام سے واقف تھی' محنت سے کام کرنا جانتی تھی۔ انتہائی ذہانت سے ہر پہلو کو ذہن میں رکھ کر کام کرتی تھی' یہ نقشہ اس کے سامنے آیا تو وہ اس پر غور کرنے لگی اور پھر پُر مسرت لہجے میں بولی۔

"ویری گڈ۔ سجاد ویری گڈ' واقعی بہت خوبصورت نقشہ بنایا ہے تم نے اور میں سمجھتی ہوں کہ .... کہ ...."

"دیکھئے نا اسی لیے تو میں اپنے اندر ایک خاص بات محسوس کرتا ہوں اور آپ کے دل میں اپنے لیے ایک خاص مقام کا خواہش مند ہو نا........ ہوں بھلا اس میں کیا غلطی ہے میری........"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" رمشا نے کہا اور پھر بولی۔ "اب آپ جانا پسند کریں گے۔"

"نہیں' خیر آپ کے پاس سے جانے کو کس کا جی چاہتا ہے' لیکن وہ ذرا اکرم اسکوائر کے پیمنٹ کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا تھی۔ آپ نے اس کا فائل مجھے دیا تھا اس کے سلسلے میں ذرا سی بات چیت کر لیں مجھ سے........"

"ارے ہاں۔ فون بھی آیا تھا ان لوگوں کا ہم لوگ ان کے کام میں خاصے لیٹ ہو چکے ہیں۔"

"تو بس کام کا آدمی تو صرف میں ہی ہوں میرے سپرد کر دیجئے یہ کام' آپ بے فکر رہیں سب کچھ سنبھال لوں گا۔" اور اس نے اس موضوع پر بات شروع کر دی' رمشا بھی اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی پھر تقریباً پون گھنٹے تک وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے رہے اور رمشا کو احساس نہ رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے' سجاد نے تمام پوائنٹ نوٹ کیے اور اس کے بعد بولا۔

"ٹھیک ہے' میں اب آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور فوری طور پر یہ کام شروع کیے دیتا ہوں تاکہ اتنی بڑی پارٹی ہمارے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔"

سجاد کے جانے کے بعد رمشا ایک عجیب سے احساس کا شکار ہو گئی' نہ جانے کیوں وہ ایک سمجھ میں نہ آنے والی الجھن میں گرفتار ہو گئی تھی۔

یہ سجاد کس قسم کا آدمی ہے۔ باقی لوگوں میں کسی کی یہ مجال نہیں کہ ضرورت سے زیادہ بات کر جائے لیکن یہ کچھ زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا کرنا چاہیے اس سلسلے میں۔

اسی وقت عائشہ نے اندر آنے کی اجازت مانگی اور وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"آؤ عائشہ تم مجھ سے اجازت لینے کا مذاق نہ کیا کرو۔" عائشہ سنجیدگی سے اندر داخل ہو گئی۔ پھر بولی۔

"بیٹھ سکتی ہوں۔"

"عائشہ پلیز۔" وہ بدستور احتجاجی لہجے میں بولی۔ عائشہ بیٹھ گئی پھر اس نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

"جمالی اسکائیو اب ایک مذاق نہیں ہے اللہ کے فضل سے بہت بڑا شاف ہے ہمارا ملک بھر کے اخبارات میں ہمارے پروجیکٹس کے اشتہارات چھپنے لگے ہیں اس کے علاوہ۔"

"کیا ہو گیا عائشہ۔" وہ عائشہ کے لہجے کی سنجیدگی محسوس کر کے بولی۔

"میری بات کا برا تو نہیں مانو گی؟"

"خود فیصلہ کر لو۔" رمشا نے کہا۔

"اسٹاف کے ساتھ نرم روی بے شک انسانی فرض ہے لیکن بے تکلفی سے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔"

"سجاد کی بات کر رہی ہو۔"

"ہاں بڑی سرکشی ہے اس کے انداز میں' میں نے اسی دن محسوس کی تھی جب وہ انٹرویو دے رہا تھا بلکہ میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔" عائشہ نے کہا۔

"مجھے یاد ہے عائشہ لیکن اس کے بعد میں نے تمہیں اپنے احساسات کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اس نے انہی خوابوں کا تذکرہ کیا جو کبھی میں نے دیکھے تھے۔ ایک صاحب دل نے میرے ان خوابوں کی تکمیل میں میری مدد کی تھی۔ یوں سمجھ لو وہ قرض اتارنا چاہتی ہوں میں۔"

"اپنے وجود کی قربانی دے کر؟"

"مطلب؟"

"میں نے دو مرتبہ اندر جھانکا تھا۔ تم دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ دوسری بار تمہارا سر جھکا ہوا تھا اور وہ تمہارے بالوں کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"ہاں۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ دیکھو رمشا یہ سب غیر انسانی عمل ہے' سب کچھ انسانوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے لیکن زندگی کے ہم سفر کے انتخاب کے لیے بڑی گہرائیاں درکار ہوتی ہیں اور ذرا سی لغزش ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے۔ میں زخم خوردہ ہوں۔ تمہیں سمجھاتی ہوں ایک ہی بیٹے کا داغ کافی ہے۔ میرا تجربہ اب بھی یہی کہتا ہے کہ وہ اچھا انسان نہیں ہے۔"

رمشا سکتے میں رہ گئی تھی اس نے عائشہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ بھی زخم کھا چکی ہے اور زندگی کے ان راستوں کو ہمیشہ کے لیے ترک کر چکی ہے اگر سجاد ایسی کسی کوشش میں معروف ہے تو اسے ناکام کرنا ضروری ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"وہ صرف ایک اچھا آرکیٹکٹ ہے اس سے زیادہ میرے لیے کچھ نہیں۔"

"لیکن وہ تمہارے قریب آنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"میں اسے ٹھیک کر دوں گی۔ بے فکر رہو۔"

حیدر زماں نے اسے فون کیا۔ "شام کو چائے پی رہی ہو اپنی کوٹھی کے لان پر۔"

"میری خوش نصیبی انکل۔"

"میرے ساتھ ایک اور مہمان ہوں گے' تھوڑا سا اہتمام کر لینا۔"

"بہتر ہے۔"

حیدر زماں کے ساتھ جو شخصیت کار سے اتری تھی وہ بڑی پُر سحر تھی۔ عمر پینتیس سال کے قریب ہو گی لیکن ایسے جاندار چہرے اور پُرکشش آنکھیں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ قدو قامت بھی بے مثال تھا۔ اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس تھا۔

"تیمور جمال شاہ سے ملو رمشا۔ یوں سمجھ لو بہت بڑی شخصیت نے ہمیں عزت بخشی ہے۔ شاہ صاحب چھ سال تک دنیا گھومتے رہے ہیں اور اب دنیا بھر کے تجربات کو سامنے رکھ کر یہاں خاص قسم کے پروجیکٹس بنانا چاہتے ہیں۔ قومی جذبے سے سرشار ہیں۔ کسی غیر ملکی کمپنی سے یہ پروجیکٹ ڈیزائن کرانے کے بجائے وہ اپنے ہی وطن کے کسی ادارے کو یہ کام سونپنا چاہتے ہیں۔"

"اس کی وجہ ہے۔ مس معاف کیجئے گا آپ کو مس کہوں یا ...."

"شاہ صاحب۔ رمشا اپنی زندگی کا مشن پورا کر رہی ہیں۔ اس لیے شادی کے جھگڑے میں ابھی نہیں پڑیں۔" حیدر زمان نے کہا۔

تیمور جمال شاہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری پھر اس نے کہا۔

"اصل میں مس رمشا ہر انسان کے دل میں کچھ خواہشات ہوتی ہیں۔ بعض اپنی ان خواہشات کو اپنے سینے میں دبائے زندگی کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے یہاں تک کہ ان کے سفر کا اختتام ہو جاتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض اپنی خواہشات کے اس چیلنج کو قبول کر لیتے ہیں۔ میں نے ایک طویل زندگی اپنے وطن کے پسماندہ ترین لوگوں کی حیثیت سے گزاری ہے۔ اس وقت میرے دل میں جو خواہشات پیدا ہوئی تھیں میں نے انہیں صرف روح کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا تھا لیکن ایک دن میں نے سوچا کہ کیوں نا ان کے لیے کوشش کی جائے جس طرح بھی ممکن ہو سکا بہر حال کسی حد تک مجھے کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں گھوم پھر کر وہاں کے لوگوں کے طرز زندگی کو دیکھا۔ یہ دیکھا کہ وہ لوگ اگر پسماندہ ہیں تو کیوں ہیں' خوشحال ہیں تو کیوں ہیں؟ اور جو کچھ میں نے ان لوگوں سے پایا اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ ان میں بنیادی بات میں نے اپنا بھی لی' وہ یہ کہ سب سے پہلی چیز محبت ہوتی ہے' وطن سے' اہل وطن سے اور سب سے زیادہ ان سے جو اپنی ان تشنہ آرزوؤں کی قبر میں سو جاتے ہیں۔ بہر حال میں افسانہ طرازی نہیں کر رہا۔ وطن سے محبت کا جذبہ سینے میں لے کر میں آخر کار اپنے وطن آ گیا بات ذرا طویل ہو گئی معافی چاہتا ہوں۔ مقصد یہی تھا کہ جو کچھ کروں اپنے اہل وطن کے ساتھ مل کر کروں۔ میں جو پروجیکٹ بنانا چاہتا ہوں ان کی نوعیت کی تفصیل ذرا طویل ہے۔ آپ سے رابطہ قائم رہے گا چنانچہ آپ کو اس کی تفصیل کاروباری طور پر بھی بتانا ہو گی۔ حیدر زماں صاحب نے آپ سے ملاقات کرا دی۔ میں اپنا موقف آپ کو بتاؤں گا اور آپ اس پر کام شروع کر دیجئے گا کیا آپ میرے لئے فرصت نکال سکیں گی۔"

کیوں نہیں جناب۔ ظاہر ہے اول تو آپ نیک جذبوں کے تحت اس کام کا آغاز کر رہے ہیں اس کے علاوہ بہر حال مجھے اپنا کام کرنا ہی ہے۔"

"تو یوں سمجھئے کہ اتنا کام ہے میرے پاس کہ شاید طویل عرصے تک آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہ پیش آئے تاہم میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ آپ جس

طرح چاہیں کام کریں۔"

"بہت بہتر۔" رمشا نے کہا حیدر زماں صاحب نے اس دوران خاموشی ہی اختیار کیے رکھی تھی۔ پھر انہوں نے کہا۔

"تو کاروباری گفتگو ختم ہوئی۔"

"جی ہاں' مس رمشا سے ان کے آفس کے لیے کوئی وقت لے کر میں ان سے ملاقات کرلوں گا۔"

"بہت بہتر۔" حیدر زماں صاحب نے کہا اور پھر خاطر مدارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رمشا کو تیمور جمال شاہ کی شخصیت بڑی زبردست محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا وقار کچھ ایسا دبدبہ تھا کہ ذہن جکڑ کر رہ جاتا تھا۔ وہ ان ساحروں میں سے تھا جو نہایت نرم روی سے خود کو تسلیم کرا لیتے ہیں۔ حیدر زماں اس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے لیکن رمشا بہت دیر تک تیمور جمال شاہ کی شخصیت پر غور کرتی رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں یہ شخص بڑا عجیب سا لگا تھا۔ اس کی آنکھیں انتہائی خوبصورت تھیں لیکن ان آنکھوں میں اسے ایک عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ وہ چمک جو غور سے دیکھنے پر انتہائی خوفناک محسوس ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنے ذہن سے تمام تصورات جھٹک دیئے۔ زندگی میں اگر کچھ ایسے موڑ آتے رہیں تو زندگی بے کیف نہیں رہتی۔

رمشا بھی جمال اسکائینو کی ترقی کی خواہش مند تھی۔ باقی جہاں تک عائشہ کی نصیحتیں تھیں۔ وہ خود بھی اس قدر ناتجربے کار نہیں تھی اور اب وہ زندگی میں ایسا کوئی دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جہاں تک امی کی خواہشات کا تعلق تھا تو ماشاء اللہ اب تو تین تین لڑکیاں نگاہوں کے سامنے تھیں۔ مشعل' طوبیٰ' لبنیٰ ان تینوں کا مستقبل مل جل کر ہی تعمیر کرنا تھا۔

بے چارے فرزند علی' رمشا کے احسانات تلے دبے ہونے کا اظہار کرتے رہتے تھے گو اظہار الفاظ میں نہ ہوتا لیکن انہوں نے جو ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بہر حال وہ اس بات کے احسان مند ہیں کہ رمشا نے ان کی زندگی کا انداز ہی بدل دیا ہے۔ تو یوں یہ سارے معاملات چل رہے تھے۔

تیمور جمال نے تین چار دن کے بعد رمشا سے ملاقات کرکے اپنے پروجیکٹس کے بارے میں تفصیلات طے کیں اور اس کے بعد رمشا کو ذمہ داریاں سونپ دیں لیکن جو بہت بڑا کام تیمور جمال نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ ایک باقاعدہ معاہدہ کرکے ایک بہت بڑی رقم [illegible]

رمشا کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی تھی اور کہا تھا۔

"مس رمشا یہ چیک بک موجود ہے۔ میں نے جمال اسکائینو کے نام سے یہ اکاؤنٹ اس لیے کھلوا دیا ہے کہ طویل عرصے تک آپ کو میرے ان پروجیکٹس پر کام کرنا ہوگا۔ میں یہ بات تو بالکل نہیں کہتا کہ خدانخواستہ آپ مالی مشکلات کا شکار ہیں لیکن اپنی طرف سے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ وصولیاتی کے شے کو بالکل ہی ذہن سے نکال دیں اور پُرسکون انداز میں کام کریں۔"

رمشا نے عائشہ سے اس موضوع پر بعد میں بہت دیر تک گفتگو کی تھی۔

"ہاں واقعی شخصیت تو ہے۔"

"اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قدر بڑی شخصیت ہونے کے باوجود بالکل نرم طبیعت کا مالک ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے اپنے مزاج کو قابو میں رکھنا سیکھ رکھا ہو۔ ورنہ اس کے چہرے کی بناوٹ' آواز کی گونج یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ صرف احکامات دینے کا عادی ہے۔"

یہ سارے معاملات چل رہے تھے ایک آدھ بار رمشا کو تیمور جمال کے شاندار آفس میں بھی جانا پڑا تھا اور تیمور جمال شاہ نے اس طرح اس کی خاطر مدارت کی تھی کہ رمشا شرمندہ ہو گئی تھی لیکن اس کے نتیجے میں اس نے تیمور کے ہر منصوبے کو اتنی محنت سے آگے بڑھانا شروع کیا تھا کہ شاید کسی اور کام میں اس نے اتنی محنت نہ کی ہو گی اور اس بات کا بھی اسے قائل ہونا پڑا تھا کہ جتنی ذہنی ہم آہنگی اس نے اپنے اور سجاد کے درمیان دیکھی تھی اتنی ذہنی ہم آہنگی کسی دوسرے آرکیٹکٹ کے اندر نہیں تھی۔ سجاد کو ایک دفعہ کوئی بات سمجھانی پڑتی تھی اور اس کے بعد وہ چراغ کا جن بن کر وہ چیزیں جوں کی توں پیش کر دیتا تھا۔ کام کرنے میں بھی اتنا تیز رفتار کہ کم بخت نے آج تک کام سے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا لیکن فطرت وہی۔ البتہ رمشا عائشہ کی ہدایت کے مطابق اب اس کے ساتھ بالکل خشک ہو گئی تھی اس نے کئی بار اپنے آپ سے شرمندگی بھی محسوس کی۔ مثلاً یہ کہ وہ عائشہ کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی ہے۔ سجاد کسی کام سے آیا رمشا نے اسے بیٹھنے کی پیشکش بھی نہیں کی۔ نہ چائے کے لئے پوچھا سجاد جھکا جھکا اپنا کام سمجھاتا رہا اور اس کے بعد عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا واپس چلا گیا لیکن اس دن کچھ عجیب سا موسم ہو رہا تھا عائشہ اس دن آفس نہیں آئی تھی کچھ کام تھے گھر پر رک گئی تھی۔ [illegible]

شروع ہو گئی اور موسم میں ایک عجیب سی رومانی کیفیت پیدا ہو گئی۔

چپراسی نے اس کے آفس میں داخل ہونے کے بعد پردے وغیرہ برابر کرنے شروع کیے تو رمشا نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پردے مت سمیٹو' بلکہ وہ سامنے والی کھڑکی بھی کھول دو!"

"جی میڈم!" چپراسی نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ اس کھڑکی سے نظر آنے والا منظر بہت خوبصورت ہوتا تھا پُر رونق سڑک زندگی کی مشکلات اور خوشیوں میں ڈوبے ہوئے لوگ جب بھی انسانی فطرت اور کیفیت کا جائزہ لینے کو جی چاہے تو اس کھڑکی سے دوسری طرف دیکھنے لگو۔ انسان کی مشکلات کا کافی حد تک اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بادلوں بھرے آسمان کے نیچے بارش میں ڈوبی ہوئی زندگی رواں دواں تھی۔ سکڑے سمٹے لوگ' برستی ہوئی بوندیں ایک عجیب ماحول پیدا ہو رہا تھا کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور سجاد فائل دبائے جنگلی بیل کی طرح اندر گھس آیا۔ رمشا نے اسے چونک کر دیکھا تب وہ جلدی سے واپس مڑا اور دوڑتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی اور رمشا نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

"مے آئی کم ان میڈم۔" اس نے سوال کیا۔ رمشا نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گیا وہ اس وقت ایک خوبصورت سفاری سوٹ میں ملبوس تھا ویسے بھی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ بھرا بھرا متناسب بدن' چہرے سے کھلنڈرا پن اور شوخی نمایاں۔

"تم آنے سے پہلے چپراسی کو میرے پاس کیوں نہیں بھیجتے؟"

"میڈم اصل میں اپنے آپ کو اس ادارے کا ایک ذمہ دار رکن سمجھتا ہوں اب دیکھیے نا وہ جو کہتے ہیں کہ

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

تو میرا مطلب ہے کہ کم از کم اتنی عزت تو آپ مجھے دیجئے گا۔"

"دیکھو سجاد میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ دفتر کا ایک ڈسپلن ہوتا ہے ایک طریقہ کار ہوتا ہے' تم بہت اچھے انسان ہو' لیکن میں یہ بات بالکل پسند نہیں کرتی کہ تم احمقانہ طور پر مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرو' مجھے مجبوراً تمہارے خلاف ایکشن لینا ہو گا۔"

"آپ یقین کیجئے' آج کے بعد آپ کو شکایت نہیں ہو گی' میں نہایت ذہانت سے آپ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کروں گا ویسے آپ نہایت شاندار طریقوں سے میری بے عزتی کرتی رہتی ہیں لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے یعنی وہی سوچ لیا ہے جو ایک اور صاحب نے بھی سوچا تھا اور اپنے آپ کو ان تمام چیزوں سے مبرا کر لیا تھا۔"

رمشا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اس نے ہاتھ لایا ہوا فائل رمشا کے سامنے پھیلا کر وہ نقشہ کھول دیا جو انتہائی ضروری تھا حالانکہ اس وقت رمشا کا موڈ بالکل نہیں تھا کہ وہ کوئی اہم کام کرے موسم عجیب انداز سے اس پر اثر انداز ہو رہا تھا لیکن یہ نقشہ جو اس نے رمشا کے سامنے پھیلا دیا تھا' تیمور جمال شاہ کے ایک پروجیکٹ سے ہی متعلق تھا اور اس سلسلے میں رمشا نے وعدہ کیا تھا وہ بہت جلد اس کے بلیو پرنٹس تیمور کو فراہم کر دے گی۔ رمشا کا خیال تھا کہ یہ کام خاصے وقت میں ہو گا لیکن اس نقشے کو مکمل دیکھ کر اسے حیرت ہوئی اور وہ جلدی سے اس پر جھک گئی۔

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ ان صاحب نے بے عزتی سے بچنے کا کیا طریقہ اختیار کیا تھا۔" وہ کھڑے کھڑے بولا لیکن رمشا نقشے پر جھکی رہی تب وہ خود ہی کہنے لگا۔

"ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ اللہ کے فضل سے آج تک کسی نے ان کی بے عزتی نہیں کی۔ لاتیں ماریں' گھونسے مارے' کبھی کبھی جوتے بھی پھینک مارے گئے' گالیاں دے لیں' لیکن خدا کا شکر ہے کہ کبھی بے عزتی نہیں کی کسی نے؟"

رمشا نے بے اختیار ہنسی روکی تھی اور پھر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ ان صاحب نے اپنی بے عزتی نہ ہونے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا تھا۔"

"نن نہیں معافی چاہتا ہوں۔"

"دیکھیے سجاد میں آپ کو آخری بار سمجھا رہی ہوں کہ صرف اپنے کام سے کام رکھا کریں۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں' پھر کہتی ہوں یہ بات' کام میں آپ نے جس سلیقے سے اپنی گڈ پوزیشن ظاہر کی ہے۔ میں اس کا آپ کو برابر صلہ دے رہی ہوں۔ مزید اگر کچھ چاہتے ہیں آپ تو مجھ سے بات کیجئے گا لیکن میں یہ بالکل برداشت نہیں کروں گی کہ آپ یہاں آ کر مجھے لطیفے سنائیں۔ منہ اٹھائے کمرے میں چلے آئیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے آپ جو دل چاہے کہہ لیجئے بس ہاتھ جوڑ کر ایک درخواست کہ آج [illegible] بے عزتی کبھی نہ کیجئے گا۔"

"آپ جاسکتے ہیں میں انٹرکام پر آپ سے گفتگو کروں گی۔"

"وعدہ!" اس نے کہا اور رمشا نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے گھوم کر تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا رمشا کچھ تو اچھے موسم کی وجہ سے اور کچھ اس کی باتوں کی وجہ سے ایک بار پھر عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ بے اختیار دل چاہا کہ اسے بلائے۔ اس سے کچھ اور باتیں کرے یہ تو موسم ہی ایسا ہے۔ بے شک یہ پروجیکٹ اہمیت کا حامل ہے لیکن بہرحال اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔

پھر اس نے خود کو سنبھالا آنکھیں بند کر کے زور سے گردن جھٹکی اور انٹرکام سوئچ دبا کر سیکرٹری سے چائے کے لیے کہا پھر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن میں سوچوں کے دائرے سمٹنے پھیلنے لگے تھے۔ دیر تک وہ خیالات میں ڈوبی رہی۔ پھر اس وقت چونکی جب چپراسی نے چائے کے نفیس برتن اس کے سامنے سجا دیے۔

"بنادوں میڈم۔"

اس نے سوال کیا وہ جواب بھی نہیں دینے پائی تھی کہ انٹرکام پر اشارہ موصول ہوا اور اس نے سوئچ آن کر دیا۔

"ہاں!"

"میڈم تیمور جمال شاہ تشریف لائے ہیں۔"

"ایں کہاں ہیں؟"

"میرے پاس موجود ہیں۔"

"اوہ، انہیں ساتھ لے کر آؤ۔" اس نے چائے کے برتنوں کی طرف دیکھا۔ پھر چپراسی کو جانے کا اشارہ کیا۔ فوراً جمال شاہ اندر داخل ہوا تھا ہلکے رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس اپنی ساحرانہ شخصیت کے ساتھ مدھم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ اندر داخل ہوا تو رمشا نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ وہ چائے کے برتنوں کو دیکھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"چائے کی شفاف پیالیاں بتاتی ہیں کہ ابھی آپ نے چائے نہیں پی۔ آپ یقین کریں اگر آپ چائے پی چکی ہوتیں تو مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ ویسے ایک بات بڑی عجیب ہے مس رمشا' بزرگ کہتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے میں ایک لمحہ کسی بھی وقت ایسا ضرور ہوتا ہے جب انسان کی کسی بھی خواہش کو مقبولیت مل جاتی ہے۔ میں نے بارہا خود اس کا تجربہ

کاش اس لمحے کا تعین ہو سکے۔" رمشا نے بھی خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔

"ایسا ہو سکتا تو انسانی زندگی میں کوئی خواہش باقی نہ رہ جاتی اور پھر انسان ختم ہو جاتا۔ یہ خواہشیں ہی تو زندگی کہلاتی ہیں۔ بالکل اتفاقیہ طور سے ادھر سے گزر رہا تھا کہ آپ کا خیال آیا۔ آپ کا خیال آیا تو آپ کے پاس آنے کو دل چاہا۔ پھر سوچا کہ بارش ہو رہی ہے آپ سے کوئی اپائنٹ منٹ بھی نہیں ہے آپ مصروف نہ ہوں مگر پھر یہ رسک بھی لے لیا سوچا کہ آپ سے گزارش کروں گا کہ مس رمشا بس ایک پیالی گرم گرم چائے پلوا دیجئے اس سے زیادہ زحمت نہیں دوں گا آپ کو اور دیکھ لیجئے یوں لگ رہا ہے جیسے آپ چائے پر میرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"یقیناً ابھی لیجئے کچھ کھانے کے لیے منگواؤں؟"

رمشا نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

بالکل نہیں چائے کا وقار مجروح ہو جائے گا۔"

تیمور شاہ نے کہا۔ رمشا نے چائے اس کے سامنے رکھی دوسری پیالی اپنے سامنے۔ دیر تک خاموشی سے چائے کا احترام کیا گیا پھر تیمور نے کہا۔

"کہئے کام کیسا چل رہا ہے؟"

"بس اس بات کی خواہش مند ہوں کہ آپ کو کہیں شکایت کا موقع نہ دوں۔ اس نقشے کے بارے میں آپ نے کہا تھا ایمرجنسی ہے اگر جلد تیار ہو جائے تو۔" رمشا نے وہ فائل کھول کر نقشہ سامنے کرتے ہوئے کہا۔ یہ وہی نقشہ تھا جو ابھی سجاد چھوڑ کر گیا تھا۔

"واقعی یہ .... یہ مکمل ہو گیا۔" تیمور جھک گیا۔ پھر دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا اور سانس لے کر بولا۔ "میں یہ تو نہیں کہوں گا مس رمشا کہ بہت جلد اپنے شعبے میں آپ بہت سے چراغ گل کر دیں گی۔ کیونکہ اچھے لوگ روشن چراغ نہیں بجھاتے لیکن یہ میری پیش گوئی ہے کہ جمالی اسکائینو بہت بڑا مقام حاصل کرے گا۔ جہاں کام میں جادوگری ہو وہاں ترقی دور نہیں ہوتی۔ میں اس برق رفتاری اور پرفیکشن سے بے حد متاثر ہوا ہوں واقعی کمال ہے۔"

"شکریہ تیمور صاحب!" وہ بولی۔

"شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ آپ کی اس پرفیکشن نے میرے حوصلے بڑھا دیئے ہیں۔" چائے ختم کرنے کے بعد وہ اٹھا تو رمشا نے کہا۔

"ابھی بارش [illegible]"

"کوئی حرج نہیں ہے یہ تو کبھی کبھی کی مہمان ہوتی ہے اس سے جی نہیں چرانا چاہیے۔ ہاں مس رمشا۔ ایک بات آپ سے کہنا چاہتا تھا۔"

"جی فرمایئے۔"

"حیدر زماں صاحب سے علم ہوا تھا کہ آپ کی مستقل رہائش اسلام آباد میں تھی اور کراچی منتقل ہوئے آپ کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔"

"اب تو بہت دن ہو گئے ہیں۔" رمشا نے کہا۔

"اس کے باوجود کبھی کسی بھی مرحلے میں آپ کوئی مشکل پیش آئے تو مجھے ضرور بتا دیجئے۔ یہ صرف رسمی الفاظ نہیں خیال رکھیے گا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ رمشا اسے دیکھتی رہی تھی پھر اس نے دل میں سوچا کہ اچھا انسان ہے اچھی باتیں کرتا ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ اس دن خوب ہنگامے ہوتے تھے مشعل، طوبیٰ اور للتی خوب منصوبے بناتی تھیں وہ بھی ان کی شرارتوں اور خواہشوں میں شامل ہو جاتی تھی آج بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ شام کو باہر کھانے کا پروگرام بنا تھا لڑکیوں نے برگر کھانے کی فرمائش کی تھی۔ شام کو چار بجے کے قریب حیدر زماں صاحب اچانک آئے اور رمشا نے نہایت خوشدلی سے ان کا استقبال کیا۔ وہ کچھ مضمحل سے تھے۔

"خیریت انکل؟"

"ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب۔" وہ حیرت سے بولی۔

"امریکہ جا رہا ہوں تمہیں معلوم ہے دونوں بیٹے وہاں ہیں۔"

"جی۔ جی۔"

"میری پوتی سخت بیمار ہے اللہ خیر کرے میری بڑی چہیتی ہے۔ رات کو فون پر کراہتے ہوئے مجھے بلا رہی تھی۔ میں رات کو پونے ایک بجے کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔"

"اوہ۔ انتظام ہو گیا۔"

"ہاں۔ تمہیں یہی بتا رہا تھا۔ اللہ خوش رکھے۔ تیمور جمال شاہ کو۔ بادشاہ ہے پریشانی آج اتوار کی تھی اس نے کیا کیا' کیسے کیا اللہ بہتر جانتا ہے لیکن بس سمجھ لو سارے کام ہو گئے ہیں اور رات کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔"

"تمہاری ضرورت ہے بیٹی۔ خلوص دل سے میری حرا کے لیے دعا کرنا اور ہاں خیال رکھنا کوئی مشکل پیش آئے تو تیمور شاہ سے کہہ دینا۔"

"انکل فون پر مجھ سے رابطہ رکھیے گا آپ سے ڈھارس رہتی ہے۔"

"ضرور بیٹے۔ بس دعا کرنا اللہ کوئی برا وقت نہ دکھائے۔"

وہ حیدر زماں کو سی آف کرنے ایئرپورٹ گئی تھی وہیں تیمور بھی پہنچا ہوا تھا۔ دونوں نے انہیں رخصت کیا رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ جب حیدر زماں چلے گئے تو تیمور نے پوچھا۔

"آپ کے ساتھ ڈرائیور ہے۔"

"نہیں۔ اصل میں انکل نے گھر پر ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا لیکن میرا دل نہیں مانا۔ ڈرائیور سو چکا تھا میں خود چلی آئی۔"

"جی!" وہ گونجدار آواز میں بولا۔

"اچھا۔ خدا حافظ۔" رمشا نے کہا۔

"خدا حافظ!" تیمور نے گردن خم کر کے کہا اور رمشا ایئرپورٹ سے باہر آ گئی بے شک رات زیادہ ہو گئی تھی لیکن اسے تردد نہیں تھا اب اس کے اندر کافی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ کار اسٹارٹ کر کے وہ چل پڑی۔ حیدر زماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو بے لوث' بے غرض کسی کے لیے اتنا کچھ کر دیتے ہیں کہ یقین نہ آئے۔ حیدر زماں ایسے ہی انسان تھے۔ اس کے لیے تو وہ فرشتہ صفت ہی ثابت ہوئے تھے سب کچھ کیا تھا انہوں نے اور کہیں ان کا لالچ نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہی سڑکیں سنسان تھیں پھر وہ اپنی رہائش گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی کہ ایک موڑ پر اسے پولیس ناکہ نظر آیا بہت سی گاڑیوں کی لائن نظر آئی تھی۔ مسلح پولیس فورس کے جوان رائفلیں تانے کھڑے ہوئے تھے۔ اسے ایک خوف سا محسوس ہوا۔ تمام گاڑیوں سے لوگوں کو نیچے اتار لیا گیا تھا اور گاڑیوں کی تلاشی لی جا رہی تھی اسے بھی لائن میں آنے کا اشارہ کیا گیا۔ جتنی لمبی لائن لگی تھی اور جس طرح تلاشی ہو رہی تھی اس سے تو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے ایک گھنٹے سے زیادہ لگ جائے گا۔ وہ لائن سے آگے نکل آئی اور پولیس کے دو جوانوں نے اس پر رائفلیں تان لیں۔ ایک آفیسر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے کوئی رعایت کیے بغیر کہا۔

"کیا بات ہے آفیسر۔ میں ایئرپورٹ سے آرہی ہوں اور تنہا ہوں۔ اتنی لمبی لائن میں تو بہت وقت لگ جائے گا۔" وہ بولی۔

"آپ کو خود یہ احساس نہیں ہوا کہ رات کو دو بجے آپ کو تنہا نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ آپ کو تو خاص طور پر چیک کرنا ہو گا۔"

اسی وقت ایک شاندار کار قریب آکر رکی اور تیمور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ آفیسر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر تیمور کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"اوہ سر آپ۔"

"ان خاتون کو کیوں روکا ہے آپ نے۔"

"سر وہ اصل میں۔"

"یہ ایک معزز خاتون ہیں اور پھر یوں بھی آپ کو خواتین کا احترام کرنا چاہیے۔"

"جی سر بس ڈیوٹی۔ کاغذات دیکھنے تھے بس۔" آفیسر نے کہا۔

"آپ مجھے جانتے ہیں؟" تیمور نے گونجدار آواز میں کہا۔

"جی سر کیوں نہیں۔"

"میں انہیں جانتا ہوں' کافی ہے؟"

"جی میڈم پلیز آپ جائیے۔" آفیسر نے کہا اور رمشا نے کار آگے بڑھا دی کچھ اس طرح نروس ہو گئی تھی کہ تیمور کا شکریہ بھی نہیں ادا کر سکی تھی۔ بس عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ گھر تک فاصلہ ذہنی انتشار کے عالم میں طے کیا۔ گیٹ پر کار روکی حواس سنبھالے۔ چوکیدار نے گیٹ بھی نہیں کھولا تھا کہ تیمور کی کار اس کے برابر آکر رکی۔ اس دوران چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہے تیمور کی کار آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔ پھر سنبھل کر اندر داخل ہو گئی۔

لباس وغیرہ تبدیل کر کے بستر پر لیٹی تو اسے ان تمام باتوں کا خیال آیا۔ ویسے واقعی جذباتی ہو گئی تھی۔ اس وقت اسے تنہا ایئرپورٹ نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ معاملہ تو کچھ بھی نہیں تھا پولیس ظاہر ہے اپنا فرض سرانجام دے رہی تھی۔ اکثر اخبار میں ایسے ناکوں کے بارے میں پڑھتی رہتی تھی لیکن یہ بھی پڑھا تھا اس نے کہ اکثر تشفی نہ ہونے پر لوگوں کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا اس وقت تیمور واقعی اس کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوا تھا' اگر وہ نہ آتا تو .... لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ تیمور ادھر کیسے آنکلا۔ رات کے اس پہر [illegible]

وہ اس کے پیچھے آرہا تھا اس نے ایئرپورٹ پر پوچھا تو تھا کہ وہ تنہا ہے یا ڈرائیور ساتھ ہے اور۔ تو کیا وہ اس کے تحفظ کے خیال سے .... لیکن کیوں اسے کیا پڑی ہے ممکن ہے انکل نے اس سے میرے بارے میں درخواست کی ہو۔ بہرحال انکل حیدر زماں بے مثال انسان ہیں اور تیمور جمال۔ انوکھی شخصیت ہے ان کی عجیب سے ایک خول میں بند۔ کچھ بھی تو نہیں معلوم اس کے بارے میں مگر ہے بہت شاندار۔ کیا زبردست اثر و رسوخ ہیں پولیس آفیسر کتنے احترام سے پیش آیا تھا۔ بہت دیر تک وہ بھی سوچتی رہی پھر سو گئی۔

وہ بھی بادلوں بھرا دن تھا۔ نہ جانے کیوں یہ بادل اس کی کمزوری تھے۔ اسلام آباد میں تو خیر بارش اپنے موسموں میں خوب ہوتی تھی لیکن کراچی میں یہ سنہرے دن ہوتے ہیں اور اہل کراچی ایسے موسموں سے خوب لطف اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ کچھ ضروری کام تھے لیکن اس نے سامنے والی کھڑکی کھلوائی تھی اور خاموشی سے بادلوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ یہ بادل اور کچھ یادیں اسے ہمیشہ مضمحل کر دیتی تھیں حالانکہ صبح کو موسم خوشگوار تھا لیکن اب وہی کیفیت ہو گئی تھی۔ اس دوران انکل حیدر زماں سے بھی دو بار بات ہو چکی تھی وہ بھی اب ٹھیک تھی لیکن حیدر زماں نے بتایا تھا کہ اب اس سے دور رہنا ممکن نہیں ہے انہیں امریکہ میں لمبا قیام کرنا ہو گا۔ بہرحال وہ ان کا ذاتی معاملہ تھا کیا کہہ سکتی تھی۔ سارا دن بادل گھرے رہے لیکن بارش نہیں ہوئی تھی۔ پانچ بجے وہ اٹھ گئی عائشہ چلی گئی تھی وہ بھی کچھ تھکی ہوئی لڑکی تھی۔

پاگل پن کی حد تک اصول پرست' دفتر کی حدود میں وہ صرف ملازم ہوتی تھی باقی وہ رمشا سے بہت پیار کرتی تھی باہر نکل کر کار میں بیٹھی اور پھر نہ جانے کیوں اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"فیاض' گھر جانے کی جلدی تو نہیں ہے۔"

"بالکل نہیں میڈم' حکم کریں۔"

"چلو دور سمندر پہ چلتے ہیں۔"

"جہاں حکم ہو۔"

"کلفٹن۔" اس نے کہا۔

کلفٹن کے انتہائی بائیں جانب جہاں کوئی موجود نہیں تھا وہ کار سے اتری پھر کوئی دو گھنٹے تک وہاں چہل قدمی کرتی رہی۔ بادلوں کی وجہ سے خوب تاریکی پھیل گئی تھی واپس پلٹی اور کار میں بیٹھ کر چل پڑی۔ اچانک اسے اپنا موبائل یاد آیا اور وہ چونک پڑی۔

"ارے فیاض۔"
"جی میڈم!"
"دفتر میں میرا موبائل رہ گیا ہے۔"
"لے لیجئے میڈم! جمشید تو ہو گا۔" فیاض نے کہا اور پھر دفتر کی طرف چل پڑا۔ جمشید دن رات کا چوکیدار تھا۔ دفتر کی عمارت میں ہی رہتا تھا اس وقت بھی گیٹ پر موجود تھا اور مستعد تھا لیکن اندر عمارت میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔
"جمشید۔ یہ اندر روشنی کیسی ہو رہی ہے۔ لائٹس بند کیوں نہیں کیں تم نے۔"
"نہیں میڈم جی' صرف سجاد صاحب کام کر رہے ہیں۔"
"کیا؟" وہ حیرت سے بولی۔
"ہاں جی' روز ہی کرتے ہیں۔"
"کتنے بجے تک؟"
"کبھی کبھی دس بجے تک۔ ایک دن تو حد ہی کر دی تھی کام کرتے کرتے سو گئے تھے۔ کوئی دو بجے میں نے جا کر دیکھا تو فرش پر پڑے سو رہے تھے۔"
"پھر؟"
"بس میڈم! میں نے جگا کر واپس بھیجا تھا۔"
"دو بجے گھر گئے تھے۔"
"ہاں جی۔"
"ہوں۔ میرا دفتر بند ہے؟"
"بالکل میڈم جی۔"
"لاؤ چابیاں دو۔ میرا فون اندر رہ گیا ہے۔"
"میں لا دوں جی؟"
"نہیں۔ چابی دے دو۔" وہ کار سے اتر کر اندر چل پڑی۔ جمشید نے جو کچھ کہا تھا وہ نہ جانے کیسا لگا اسے۔ ایک دباؤ سا پڑا تھا دل پر۔ یہ قصہ ہے یہ شخص پاگل ہے کیا۔ اتنی محنت کیوں کرتا ہے۔ حالانکہ اب تو وہ اس کی اتنی توہین کر چکی تھی کہ اسے خود شرمندگی ہونے لگی تھی لیکن وہ اس کے کام کی بھی قائل تھی بس ایک بار سمجھانا پڑتا۔ یوں لگتا جیسے وہ اس کے دماغ میں اتر جاتا ہے۔

بھی وہ نہیں چونکا تھا بلکہ اس کی آواز سنائی دی تھی۔
"ایک پیالی چائے پلا دو جمشید۔ اتنی دعائیں دوں گا کہ رکھنے کی جگہ نہ رہے گی۔"
رمشا آہستہ آہستہ اپنے دفتر کی طرف بڑھ گئی لاک لگا ہوا تھا وہ اندر گئی موبائل اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ باہر نکلی تو وہ خاموش کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی میز کے پاس پہنچ گئی پھر اس نے میز پر لگا نقشہ دیکھا یہ ایک ضروری کام تھا جس کے لئے اس نے ہدایت کی تھی کہ جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے۔
"تم اکثر دیر تک کام کرتے ہو۔" رمشا نے سوال کیا۔
"آج تک کوئی چیز گم ہوئی ہے آپ کی؟"
"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا میرا یہ مقصد ہے۔" رمشا نرم لہجے میں بولی۔
"میرا نام سجاد ہے میڈم! شاید آپ مجھے پہچان نہیں پا رہی ہیں۔" وہ بولا۔
"کیوں؟"
"آپ کا لہجہ نرم ہے اور آپ کی پیشانی پر بل بھی نہیں پڑے ہوئے۔"
"چلو ختم کرو یہ کام' کل کر لینا اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔"
"میں اسے صبح کو آپ کی میز پر پہنچا دینا چاہتا تھا۔"
"میں نے کہا نا۔ اتنی جلدی نہیں ہے۔"
"اگر اجازت دے دیں تو۔"
"نہیں۔ چلو جوتے پہنو۔" رمشا نے کہا اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر سامان سمیٹنے لگا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا۔
"خدا کی قسم مجھے معلوم ہوتا کہ آفس ٹائم کے بعد آپ اتنی نرمی سے گفتگو کرتی ہیں تو پہلے ہی آپ سے ملنے کی کوشش کرتا۔" وہ کچھ نہ بولی خاموشی سے کار کے قریب پہنچ گئی۔
"چلو بیٹھو" رمشا نے کہا اور ایک لمحے کے لئے سجاد کا منہ حیرت سے کھلا۔ فیاض چونکہ قریب ہی موجود تھا اس لئے وہ خاموشی سے اندر بیٹھ گیا۔ پھر وہ خود بھی کار میں بیٹھ کر بولی۔ "فیاض گرین مون چلو۔"
"جی میڈم۔" فیاض نے کہا۔ گرین مون ایک چھوٹا سا پرسکون ریسٹوران تھا اور کئی بار وہ اس میں تھا جا چکی تھی فیاض کو یہ بات معلوم تھی۔ ریسٹوران پہنچ کر فیاض نے کار مخصوص جگہ پارک کر دی۔ پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر وہ فیاض کو دیتی ہوئی

بولی۔

"فیاض چابی مجھے دو اور تم ٹیکسی سے گھر چلے جاؤ۔"

"جی میڈم!" فیاض نے کہا۔

"اور میں؟" بمشکل تمام سجاد نے کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ چائے پینا ہے جو دعائیں تم جمشید کو دینا چاہتے تھے وہ مجھے دینا۔"

وہ مسکرا کر بولی اور پھر وہیں کھڑے ہو کر موبائل فون پر گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فون مشعل نے ریسیو کیا تھا۔ "مشعل مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی امی سے کہنا فکر نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے باجی!" مشعل کی آواز سنائی دی اور اس نے فون بند کر دیا۔

"میڈم میرے کپڑے اس قابل نہیں ہیں کہ..........." سجاد نے کہا۔

"آؤ۔" وہ بولی۔ پھر وہ سجاد کے ساتھ اندر جا بیٹھی۔ ویٹر کو آرڈر دیا اور پھر بولی۔ "کیوں اتنی دیر تک کام کرتے ہو۔"

"آپ اس بات سے ناخوش ہیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ کام کر کر کے بیمار پڑ جاؤ۔"

"میڈم! آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ سب میرے بارے میں کہہ رہی ہیں۔" وہ حیرت سے بولا۔ رمشا کوئی جواب نہیں دے سکی۔ ایک وحشت سوار تھی اس پر جنونی ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے' سچ مچ وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کاغذ کا ایک بڑا سا ٹکڑا ہو جس کے ایک گوشے میں آگ لگ گئی ہو اور یہ آگ پھیلتی جا رہی ہو۔

ویٹر نے چائے کا سامان لگا دیا۔ لوازمات سامنے رکھ کر پلیٹیں لگائیں اور چلا گیا۔ تب اس نے چائے کے برتن اپنی طرف سرکائے تو سجاد جلدی سے بولا۔

"م' میں بناتا ہوں آپ ...." لیکن رمشا نے سنی ان سنی کر دی اور چائے بنا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ نیازمندی سے چائے پیتا رہا۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سجاد نے کئی بار کچھ بولنے کے لئے پہلو بدلا تھا لیکن کچھ بول نہیں سکا تھا۔ وہ بھی خاموش رہی چائے ختم ہو گئی تو اچانک اس نے ویٹر کو بلا کر بل طلب کر لیا۔ پھر ویٹر بل لے آیا تو پرس سے رقم نکال کر بل بک میں رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر آ کر کار کا

دروازہ کھولا پھر سائیڈ کا دروازہ کھول دیا۔

"بب' بیٹھ جاؤں۔"

"ہاں۔" وہ بولی اور سجاد دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ رمشا نے سیلف لگا کر کار سٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ "کہاں رہتے ہو؟"

"کک' کیوں؟" وہ بولا۔

"گھر نہیں جاؤ گے؟"

"جاؤں گا۔"

"بتاؤ۔ میں چھوڑ دوں گی۔"

"ارے آپ کو خدا کا واسطہ' میرے اعصاب اب جواب دے چکے ہیں۔ کیا بات ہے۔ یہ کیسا رویہ اختیار کیا ہے۔ کچھ تو بتا دیں۔"

سجاد نے کہا لیکن اس بات کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ سجاد پریشان بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ "مجھے بس سامنے والے چوراہے پر اتار دیجئے وہاں سے میرا گھر دور نہیں ہے۔"

وہ اب بھی خاموش تھی لیکن اس نے سجاد کی خواہش کے مطابق کار روک دی تھی۔ سجاد جلدی سے نیچے اتر گیا۔ پھر بولا۔ "السلام علیکم اور خدا حافظ۔ اس سے پہلے کہ آپ کو ہوش آ جائے بھاگ جانا بہتر ہے۔" اور واقعی اس نے دوڑ لگا دی تھی۔

ساری رات وہ بستر میں بھی جلتی رہی تھی بار بار سجاد کا خیال آ رہا تھا گزری ہوئی بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک شوخ' کھلنڈرا انسان ہے بلاوجہ اس سے رویہ خراب کر لیا تھا کوئی وجہ تو نہیں تھی اس کی لیکن وجہ تھی۔ اب وہ اپنے آپ سے خوفزدہ تھی۔ عمر ہی ایسی تھی ایک شخص نے دھوکہ دیا تھا مگر احساس کے ناگ تو زندہ تھے کبھی کبھی جذبات پھنکارنے لگتے تھے تو بے کسی کا احساس تو ہوتا تھا۔

دوسرے دن آفس نہیں گئی۔ عائشہ نے آفس سے فون کیا تھا۔

"خیریت ہے آفس نہیں آؤ گی۔"

"طبیعت پر کسل سوار ہے کوئی خاص بات تو نہیں۔"

"نہیں بس تیمور صاحب آئے تھے۔ وہ نقشے' انہیں دے دیئے ہیں بہت خوش ہو رہے تھے۔"

"کون سے نقشے؟"

"تیار ہو گئے تھے۔"

"وہ تکی صبح نہ جانے کس وقت آ گیا تھا۔ آرام سے تیار کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ تیمور صاحب نے تو بس یہ کہا تھا کہ معلوم کر لوں کتنا وقت لگ جائے گا مجھے معلوم تھا کہ سجاد ان پر کام کر رہا ہے' میں نے اس سے معلوم کیا تو اس نے وہ میرے سامنے رکھ دیئے۔"

"تیمور صاحب نے دیکھ لئے۔"

"بالکل مطمئن تھے۔"

"گڈ.........." وہ خود بھی خوش ہو گئی۔ تیمور جمال شاہ کے تمام کام تقریباً ختم ہو گئے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ تیمور بے حد مخلص انسان تھا اس کی شخصیت اس کے کردار کے بالکل برعکس تھی کئی پارٹیاں اس نے رمشا کو دلوائی تھیں اور کہا تھا۔

"آپ یہ نہ سمجھیں مس رمشا کہ میرا کام ختم ہو جائے گا تو ہمارے رشتے بھی ختم ہو جائیں گے۔"

"نہیں شاہ صاحب' میں یہ نہیں سمجھتی۔"

دوپہر کے بعد اس کی طبیعت کی کسل دور ہو گئی تھی۔ وہ بچیوں کو لے کر سیر کرانے نکل گئی تھی اس نے انہیں بہت سی شاپنگ کرائی تھی سب کے لئے خوب خریداری کی تھی شاید کوئی فیصلہ کر لیا تھا اس نے۔

دوسرے دن آفس پہنچی تو امتیاز احمد شیخ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے' یہ اس کے انکم ٹیکس کے وکیل تھے۔ کچھ ضروری کاغذات سائن کرانے آئے تھے۔

"یہ ریٹرن آج ہی جمع کرانے تھے۔ میں نے سوچا کہ اول وقت میں کام ہو جائے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"جی خدا کا شکر ہے۔ آپ خیریت سے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔" وہ بولی اسی وقت تیمور جمال شاہ نے دروازہ ناک کیا اور اندر داخل ہو گیا۔

"بے حد معذرت چاہتا ہوں مس رمشا! پندرہ دن کے لئے فرانس جا رہا ہوں۔ کل آپ کچھ علیل تھیں آپ کی خیریت پوچھنا چاہتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیں' یہاں سے سیدھا ایئرپورٹ جا رہا ہوں۔ یہ بتایئے کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"نہیں' میں بیمار تو نہیں ہوں۔ کل بس یوں ہی کچھ کسل مند ہو گئی تھی آپ

"نہیں' مس رمشا! اب سے کچھ دیر کے بعد میری فلائٹ ہے۔ کوئی بھی الجھن ہو میرے مینیجر سے رابطہ کیجئے۔ اچھا خدا حافظ۔" رمشا کھڑی ہوئی تو اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں پلیز۔ آپ تشریف رکھئے۔ اچھا خدا حافظ۔" وہ باہر نکل گیا۔ امتیاز صاحب حیرت بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ بولے۔

"ان صاحب کو جانتی ہیں آپ؟"

"تیمور جمال شاہ صاحب تھے۔"

"اللہ اکبر یہ تھے تیمور جمال شاہ۔"

"کیوں خیریت' آپ انہیں جانتے ہیں۔" رمشا نے پوچھا۔

"جانتا ہوں لیکن ٹی جے شاہ کے نام سے۔ اب سے کوئی سات سال پہلے ٹی جے شاہ کے نام سے پورے شہر میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا انہیں۔ حکومت کے اعلیٰ ترین رکن ان کے دوست تھے۔ الیکشن میں وہ حکومت چلی گئی تو مسٹر ٹی جے بھی روپوش ہو گئے۔ کئی کیس بھی ان کے نام سے ابھرے تھے لیکن پھر اخبارات اچانک خاموش ہو گئے۔

"اور اب تیمور جمال شاہ' ٹی جے شاہ' کمال ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' شاہ صاحب تو بے حد شریف آدمی ہیں۔" رمشا حیرت سے بولی۔

"شاید!" امتیاز صاحب نے کہا پھر فائل کھول کر سامنے رکھتے ہوئے بولے۔ "پلیز آپ یہ ریٹرن سائن کر دیں۔"

امتیاز صاحب اپنا کام کر کے چلے گئے لیکن وہ ایک عجیب سی خلش کا شکار ہو گئی۔ کیا واقعی تیمور اس قسم کا انسان ہے۔ اسے وہ رات یاد آ گئی جب حیدر زمان کو ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کے بعد واپس آ رہی تھی' پولیس نے اسے روکا اور تیمور کے آ جانے کے بعد اچانک صورت حال بدل گئی تھی۔ کوئی وجہ تو ہو گی۔ آخر یہ تیمور کا ماضی کیا ہے لیکن ذہن میں پیدا ہونے والا یہ سوال اسے خود ہی ہوش میں لے آیا۔ سارے جواب تو خود اس کے پاس موجود تھے۔ حیدر زمان وہ شخصیت تھے جنہوں نے اسے زمین سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ حیدر زمان نے اسے تیمور سے متعارف کرایا تھا اور اب بڑے اعتماد سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہر مشکل میں وہ تیمور سے مدد لے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تیمور کا اب تک کا رویہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ بے حد شریف انسان ہے۔ باقی وہ کچھ بھی

ہو۔ امتیاز صاحب نے بلاوجہ اس کا ذہن خراب کیا ہے۔

شام تک سجاد سے ملاقات نہیں ہوئی' ویسے پتا چل گیا تھا کہ آیا ہوا ہے۔ شام پانچ بجے وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ سجاد کی ٹیبل جس جگہ لگی ہوئی تھی وہ اس کے آفس سے بیرونی دروازے کے راستے میں نہیں پڑتی تھی۔ وہ خود گھوم کر سجاد کی طرف چل پڑی۔ باقی سٹاف تقریباً جا چکا تھا لیکن سجاد کام کر رہا تھا۔ ایک نئی پارٹی کا کام آیا تھا سجاد اس میں مصروف تھا۔ آج وہ جلدی سے اس کی طرف متوجہ ہوا اور پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔

"پانچ بج چکے ہیں۔" وہ بولی۔

"سس سوری میڈم!" وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور تمہاری ناک پر انک لگی ہوئی ہے۔"

"جی۔" اس نے کہا اور جلدی سے ناک صاف کر لی لیکن جس ہاتھ سے اس نے ناک صاف کی تھی اس پر اور زیادہ انک لگی ہوئی تھی چنانچہ پوری ناک کالی ہو گئی۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی پھر بولی۔

"اب تمہیں واش روم میں جانا ہو گا' میں نیچے کار میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ نیچے آ گئی ڈرائیور سے اس نے کہا۔ "تم گھر جاؤ۔ میں چلی جاؤں گی۔" کار میں بیٹھ کر وہ سجاد کا انتظار کرنے لگی۔ ساری رات کی سوچوں کے بعد یہ عمل ہوا تھا۔ جو گزر گئی تھی اسے بھول جانے میں ہی زندگی تھی دنیا سے کنارہ کشی تو نہیں کی جا سکتی۔ زندہ رہنا ہے اپنے لئے سب کے لئے۔

وہ آ گیا اور رمشا نے اسے کار میں بٹھا کر کار آگے بڑھا دی۔ پھر اس نے کار اس جگہ روکی تھی جہاں پچھلے دن اسے اتارا تھا۔ "یہاں سے تمہارے گھر کا فاصلہ کتنا ہے؟"

"زیادہ نہیں۔ بس میں چلا جاؤں گا۔"

"کار وہاں جا سکتی ہے۔"

"کک .... کار؟ ہاں جا سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"راستہ بتاؤ۔"

"وہ سامنے سے بائیں سمت۔" سجاد نے کہا۔ دو منزلہ سرکاری فلیٹ بنے ہوئے تھے کچھ لوگوں نے یہ چھوٹے فلیٹ کرائے پر اٹھا دیے تھے۔ وہ سجاد کو احکامات دیتی رہی اور وہ عمل کرتا گیا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی ساحرانہ عمل کے تحت وہ اس کے احکامات کی تعمیل کر رہا ہو [illegible]

سنبھل گیا۔ اس کے چہرے پر غمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اب آپ کو آسانی ہو گئی۔ میری کسی گستاخی کے جواب میں آپ مجھے میری اوقات بتا سکتی ہیں۔"

"تمہارے والدین یا بہن بھائی کوئی تو ہو گا اگر ہے تو کہاں ہے۔"

"ماں باپ مر گئے۔ بڑی بہن کی شادی ہوئی تو وہ شوہر کے ساتھ شکاگو چلی گئی۔ شکاگو جا کر کسی کو یاد رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ دو بڑے بھائی تھے جو ماں باپ کے ورثے کو ہڑپ کرنے کے لئے پہلے خود لڑتے رہے ہیں پھر آپس میں سمجھوتہ کر لیا کہ میرا حصہ کھا جائیں اور میں نے فراخ دلی سے انہیں حصوں کے ساتھ خدا حافظ کہہ دیا۔"

"پھر؟" وہ بولی۔

"اس کے بعد ذہن میں ایک جنون لئے یہاں آ گیا اور اب اس جنوں کے سہارے زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ بہت سے خواب صرف خواب ہوتے ہیں لیکن میڈم! آپ یقین کریں کہ یہ خواب زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔ میں جب بستر پر لیٹتا ہوں تو آنکھیں بند کر کے ان خوابوں کو پکارتا ہوں اور یہ پالتو ہرن اپنی حسین آنکھوں میں سے مجھے دیکھتے ہوئے میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ میں ایک خوبصورت دفتر بناتا ہوں اس پر ایک خوبصورت بورڈ لگاتا ہوں اور سٹاف ہوتا ہے جو مجھے بے حد چاہتا ہے۔ میں ان کی ہر آرزو پوری کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں اور پھر مجھے بڑی میٹھی نیند آ جاتی ہے۔"

"اس کے بعد ...." وہ بولی۔

"صبح ہو جاتی ہے" وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"کچن ہے یہاں؟" رمشا نے پوچھا۔

"کیا؟" وہ حیرت سے منہ پھاڑ کر بولا۔

"بھئی ہر گھر میں ایک کچن ہوتا ہے' تمہارے یہاں ہے۔"

"شاید ہے تو سہی' مگر اس سے ابھی تک کوئی واسطہ نہیں پڑا۔ اصل میں سامنے ایک ہوٹل ہے اور اس ہوٹل والے سے بڑی پرانی دوستی ہے میری۔ بڑا اچھا انسان ہے' بے روزگاری کے دور میں بھی اس نے کبھی مجھے قرض دینے سے ہاتھ نہیں روکا .... اور اب بھی خدا کے فضل سے یہ کیفیت ہے کہ پیسے دیتا ہوں تو کہتا ہے' کہ سجاد بابو کچھ حساب کتاب تو کر لیا کرو کیوں مجھے مقروض کر رہے ہو........."

"گھر میں کچھ نہیں کھاتے پکاتے۔"

"نہیں .... گھر میں تو صرف سونے کے لیے آتا ہوں اور صبح کا ناشتہ یا پھر کبھی کبھار رات کا کھانا۔ اصل میں میڈم ہر انسان کی زندگی کا ایک انداز ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وقت اس انداز کی تربیت کرتا ہے' انسان بذات خود نہیں۔"

"ہوں۔" پھر وہ کافی دیر تک سجاد کے ساتھ اس کے فلیٹ پر رکی' سجاد نے سامنے والے ہوٹل سے چائے منگوائی اور پھر شرمندگی سے بولا۔

"اور کوئی خاص بات نہیں بس یہی خرابی ہے ان لوگوں میں کہ برتن ذرا........"

"کوئی بات نہیں' ہیں تو انسان ہی جو ان برتنوں میں کھاتے پیتے ہیں۔"

پھر اس کے بعد سجاد کی اور اس کی ملاقات ہوتی رہی' وہ اکثر شام کو سجاد کے ساتھ نکل جاتی تھی اور پھر نہ جانے کہاں کہاں کی سیر ہوتی۔ اس نے سجاد کو بہت سے تحائف خرید کر دیئے تھے وہ کچھ اور بھی کر رہی تھی۔ خاص طور پر چیف اکاؤنٹینٹ کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آتے تھے' جو بڑی بڑی رقمیں بینک سے نکلی جا رہی تھیں اور جو اجنبی لوگ آتے تھے یا کبھی دن میں وہ آفس سے نکل جاتی تھی وہ بالکل نامعلوم باتیں تھیں۔

عائشہ ہر چند کہ اس کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتی تھی' سب ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے لیکن عائشہ نے خود کبھی کچھ منزلیں عبور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اپنے اور رمشا کے درمیان وہ فاصلے قائم رکھے تھے جو اصولی فاصلے تھے جبکہ رمشا نے کبھی عائشہ کو ایسی کوئی حیثیت نہیں دی تھی جہاں تک لبنیٰ کا معاملہ تھا اس میں عائشہ کبھی نہیں بولتی تھی۔ رمشا لبنیٰ کے لئے بھی وہی سب کچھ کرتی جو مشعل اور طوبیٰ کے لئے۔ گویا عائشہ نے صرف اپنے لئے ایک مقام کا تعین کیا تھا' جس پر کبھی خصوصی طور سے خود رمشا نے بھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی اب اس سے بالکل مطمئن تھی۔ کچھ دن کے بعد ایک دن اچانک تیمور جمال شاہ واپس آ گیا' رمشا کو اس نے فون کیا تھا۔

"مس رمشا! آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اوہو تیمور جمال صاحب' کب واپسی ہوئی آپ کی؟"

"واپس آئے ہوئے تو مجھے کافی دن گزر گئے مس رمشا! لیکن آپ کے آفس تین دفعہ جا چکا ہوں آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"کیا!" رمشا چونک پڑی۔

"جی ہاں' آج کل آپ زیادہ تر آؤٹ ڈور رہتی ہیں۔"

"مگر مجھے کسی نے بتایا نہیں۔"

"میں نے خود منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں خود ان سے مل لوں گا آپ براہ کرم انہیں میری آمد کے بارے میں بتائیے گا نہیں' اتفاق سے آپ ٹریس ہو گئی ہیں۔ چلئے خیر اب یہ بتائیے فرصت ہے۔"

"جی ہاں کیوں نہیں' آپ حکم دیجئے۔"

"تو پھر یوں کیجئے گا کہ آپ آج ڈنر میرے ساتھ کیجئے' کسی پسندیدہ ہوٹل میں۔"

"اوہو شاہ صاحب!"

"جی فرمائیے۔"

"آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟"

"نہیں مس رمشا! اس میں تکلیف کی بات نہیں ہے' اب یہ بتائیے آپ کو کس وقت پک کر لوں اور کہاں سے۔"

"آپ حکم دیجئے میں پہنچ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے' ہوٹل کینڈل ہاؤس ساڑھے آٹھ بجے۔"

"بہت بہتر' میں پہنچ جاؤں گی۔"

نہ جانے کیوں رمشا کے ذہن میں ایک الجھن کا سا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ تیمور جمال ایک نفیس شخصیت تھی اور رمشا نے زمانے کو اس حد تک دیکھ لیا تھا کہ اب اسے دنیا سے کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔

"او نہہ دیکھا جائے گا۔" اس نے سوچا اور ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیا۔

☆------☆------☆

ہوٹل کینڈل ہاؤس میں تیمور جمال شاہ نے اس کا استقبال کیا۔ تیمور شاہ بے حد خوبصورت لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے رمشا کو دیکھا اور بولا۔

"آخر ایسی کیا مصروفیات چل رہی ہیں جس کے بارے میں آپ کی سیکرٹری کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔"

"جی وہ بس ایسے ہی۔"

"اور کاروبار کی کیا پوزیشن ہے۔"

"آپ کی دعاؤں کے ساتھ چل رہا ہے شاہ جی۔"

"ویسے مس رمشا مجھے شاہ جی کہہ کر' مجھے میری عمر سے بیس سال آگے پہنچا دیتی ہیں۔ خیر آپ کی مرضی' ویسے آپ کو بتاؤں کہ گیا تو میں مختصر وقت کے لیے تھا لیکن میرا یہ دورہ بھی طویل ہو گیا اور یونہی گھومتا پھرتا حیدر زمان تک بھی پہنچ گیا۔ بہت پوچھ رہے تھے آپ کو کچھ تحائف بھی بھجوائے ہیں جن کے لیے ہدایت کی گئی تھی کہ براہ راست آپ ہی کے حوالے کروں۔ ویسے بہتر ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے اب ان کا۔"

"تت تو پھر۔"

"وہیں امریکہ میں ہی قیام کریں گے ان کے تمام بچے وہیں ہیں اور پھر وہ بچی تو انہیں واقعی بے پناہ چاہتی ہے۔ ان کی وجہ سے اب یہ سمجھ لیں کے موت کے منہ سے واپس آگئی ہے۔ ہوتا ہے نامحبتوں کا ایک یہ بھی انداز ہے اور یہ تحائف' میں لیے لیے پھر رہا ہوں آپ کے لیے۔"

تیمور جمال نے جیب سے ایک باکس نکالا۔ ہیرے کا جڑاؤ سیٹ تھا دیکھنے ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاکھوں روپے کی مالیت کا ہے۔ تیمور جمال کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آرہی تھی کہنے لگا۔

"اسے خریدتے وقت نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ احساس ابھرا تھا کہ اسے اپنے ہاتھوں سے آپ کی گردن میں پہناؤں گا' بعض اوقات انسان کیسی بچوں جیسی خواہشیں کرنے لگتا ہے۔ بعد میں خود ہی اپنے احساس پر شرمندہ ہو گیا' پھر آپ بھی نہ ملیں۔"

"لیکن تیمور صاحب یہ تو بہت قیمتی ہے۔"

"کیا آپ سے بھی وہ تمام روایتی باتیں کہوں جو ایسے موقعوں پر کہی جاسکتی ہیں کہ میری نگاہ میں آپ سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہے۔ رہنے دیجئے مس رمشا! مجھے یہ ساری باتیں کرنی نہیں آتیں۔ بس آپ اسے قبول کر لیجئے اور بتایئے کہ حیدر زمان کے دیئے ہوئے تحائف آپ تک کیسے پہنچاؤں۔"

"کسی وقت میں وصول کر لوں گی آپ انہیں اپنے پاس میری امانت سمجھئے۔"

"کبھی آیئے نا میرے گھر۔ آپ نے تو کبھی مجھے اپنے گھر بلایا ہی نہیں۔"

"شرمندہ کر رہے ہیں آپ' آپ ایسا کریں کل ہی تشریف لے آیئے۔"

"اپنے الفاظ کا مطلب سمجھتی ہیں آپ۔" تیمور جمال شاہ نے کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"آپ ایک بار کہہ دیں اور ہم نہ آئیں' اپنی اصلاح کر لیجئے اور فوراً کہہ دیجئے کہ صاحب غلطی سے یہ الفاظ نکل گئے۔"

"نہیں پلیز آپ کل تشریف لایئے میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"لیکن شام کو چائے پر۔"

"کھانا بھی ہمارے ساتھ کھایئے۔"

"نہیں وہ پھر کبھی سہی۔"

اس دن سجاد کو بھی اس نے دن ہی میں بتا دیا اور کہا کہ وہ چلا جائے اور شام کو تیار ہو کر اس کے گھر پہنچ جائے۔ پھر جب کوٹھی کے لان پر چائے کا شاندار بندوبست کیا گیا اور تیمور شاہ کی قیمتی کار وہاں آکر رکی تو سجاد بھی عین اسی وقت وہاں پہنچا تھا۔ سجاد نے جو سوٹ پہن رکھا تھا وہ دو تین دن قبل ہی رمشا نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ اور میچ کرتی ہوئی ٹائی۔ سجاد پھول کی طرح کھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تیمور صاحب کے پیچھے ہی پیچھے وہ آگیا تھا اور رمشا بے اختیار اس کی جانب بڑھی تھی۔ تیمور جمال کار سے اترا' اس کی تو خیر شخصیت ہی بے مثال تھی حالانکہ رمشا نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ وکیل صاحب نے جو کچھ تیمور جمال کے بارے میں بتایا تھا۔ رمشا کئی دن تک اس احساس میں ڈوبی رہی تھی کہ کہیں کسی مرحلے پر تیمور جمال اس کے لیے کوئی خطرناک شخصیت نہ ثابت ہو لیکن پھر اپنے احساس سے وہ خود ہی شرمندہ ہو گئی تھی۔ آج تک کے رویے میں تو مہربانی ہمدردی اور محبت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر اس کا ماضی ایسا رہا یا حال میں بھی وہ کسی ایسی صفت کا مالک ہے تو بہر طور رمشا پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ تیمور جمال نے ایسا کوئی اثر ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ جب وہ کار سے اترا تو رمشا بے اختیار آگے بڑھی' تیمور جمال نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا تھا' لیکن دوسرے لمحے عقب سے سجاد بھی آگیا اور رمشا نے بڑے پرجوش انداز میں سجاد سے ہاتھ ملایا۔

"ہیلو ہینڈسم۔ آیئے تیمور صاحب آیئے پلیز۔" اس نے کہا اور تیمور جو رمشا کو والہانہ اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اسے سجاد سے پہلے مخاطب دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا۔ پھر اپنی مخصوص مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے رمشا کو ہیلو کہا۔ سجاد کی طرف اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ کیونکہ بہرحال وہ جانتا تھا کہ سجاد رمشا کا ملازم ہے بعد میں اس نے

پوری نشست کے درمیان ایک بار بھی رمشا اور سجاد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی جبکہ سجاد ان پر مسلط رہا تھا اور اس نے کئی بار تیمور کو بھی مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔ بے تکلف آدمی تھا بہر حال واپس جاتے وقت تیمور نے ایک بڑا سوٹ کیس اپنی کار کی ڈگی سے اتارتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنے ملازم کے ہاتھ اندر بھجوا دیجئے گا یہ حیدر زمان نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

"اوہ کسی وقت آپ کے ہاں آکر لے لیتی جلدی کیا تھی۔"

"مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ جو کہہ رہی ہیں وہ کر دیں گی خیر کوئی بات نہیں ہے اچھا خدا حافظ۔"

رمشا نے مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا تھا۔ عائشہ کئی بار تشویش کی نگاہوں سے اسے دیکھ چکی تھی لیکن اس قدر نفیس طبیعت کی مالک تھی کہ اس نے گھر میں کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ اب رمشا آفس میں نہیں ہوتی۔ کئی پارٹیاں وقت پر کام پورا نہ ہونے کی وجہ سے ناراض ہو چکی تھیں۔ کاروبار کی وہ کیفیت ختم ہوتی جا رہی تھی جو پہلے تھی۔ خود کئی بار تیمور جمال نے بھی رابطے کی کوشش کی تھی لیکن رمشا سے رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر رمشا خود سجاد سے بھی الگ رہ کر جو کچھ کر رہی تھی اس کے لیے وہ کبھی کبھی نکل جایا کرتی تھی۔ ایک عجیب ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ حالانکہ دفتری حالات میں کوئی ایسی خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن رمشا کی بے توجہی سے بہت سے معاملات ایسے تھے جو باعث تشویش تھے کئی پارٹیاں اس بات کا اظہار کر چکی تھیں کہ اب جمالی اسکائیٹو میں اس طرح کا کام نہیں ہوتا' جیسے پہلے ہوا کرتا تھا لیکن رمشا کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا زیادہ وقت سجاد کے ساتھ باہر گزرتا تھا اور وہ کبھی ساحل سمندر پر' کبھی ہوٹلوں میں اور دوسرے تفریحی مقامات میں نظر آتے تھے۔ پھر ایک صبح رمشا سجاد کے فلیٹ پر آ پہنچی۔ سجاد نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔

"تیار ہو جاؤ۔" رمشا نے کہا۔

"جو حکم۔" سجاد نے کہا اور نہایت پھرتی سے شیو وغیرہ بنائی۔ رمشا اسے ساتھ لے کر چل پڑی۔ شہر کی ایک خوبصورت سڑک پر جہاں اعلیٰ درجے کے دفاتر تھے ایک حسین عمارت کے سامنے رمشا نے کار روکی سامنے چوکیدار موجود تھا جس نے دوڑ کر اندر داخل ہونے کا دروازہ کھولا تھا۔ سجاد نے حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کس کا آفس ہے اور یہ چوکیدار .... میرا مطلب ہے آپ کو دیکھ کر اس نے اس طرح تالا کھولا ہے جیسے یہ آپ ہی کا آفس ہو۔"

"آؤ۔" رمشا نے کہا اور اندر داخل ہو گئی۔ بڑا سا ہال تھا جس میں استقبالیہ تھا۔ پھر بہت سی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد شیشے کا ایک کیبن بنا ہوا تھا۔ جس میں انتہائی قیمتی فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ دروازے پر سجاد احمد کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

"سجاد احمد۔" سجاد نے حیرت سے کہا۔

"آؤ۔" رمشا نے پہلے کے سے انداز میں کہا اور سجاد اس کے ساتھ آفس میں داخل ہو گیا۔ رمشا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک عظیم الشان میز کے پیچھے لے گئی جس پر ڈائریکٹر کے نام کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ "بیٹھو" اس نے سجاد کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"مس رمشا۔ میں۔ میں اس کرسی پر میرا مطلب ہے کہ میں........... رمشا یہ کیا مذاق ہے میں یہ کرسی تو۔"

"تمہاری ہے' یہی خواب تھا نا تمہارا سجاد! بہت پہلے یہی خواب میں نے بھی دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ خواب صرف تغیر معدہ ہوتے ہیں۔ تعبیر صرف ایک لفظ ہے جو خواب کے مخالف استعمال ہوتا ہے بے حقیقت اور بے معنی لیکن مجھے تعبیر مل گئی۔ سجاد مجھے تعبیر مل گئی۔ پھر مجھے ایک اور خواب زدہ ملا اور مجھے خوشی ہے کہ جس طرح مجھے اپنے خواب کی تعبیر ملی' میں نے تمہارے خواب پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔"

سجاد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔ "لیکن یہ سب کچھ تو بہت ہے مس رمشا اور میں۔ میں بھلا اسے اپنے خوابوں کی تعبیر کیسے سمجھوں۔"

"باہر ایک سائن گلاس لگا ہوا ہے۔ جس پر شاید تم نے غور نہیں کیا' وہ سادہ ہے اس پر تم اپنی پسند کا نام لکھواؤ گے۔ یہ سب کچھ تمہارا ہے ان کاغذات کے تحت۔" رمشا نے میز کے بڑے دراز کا لاک کھولا اور ایک فائل نکال کر سجاد کے سامنے رکھ دی۔ سجاد دیوانہ وار ان کاغذات کو دیکھنے لگا۔ یہ عمارت یہ سب کچھ اس کے نام تھا وہ ان چیزوں کا مالک تھا۔ آخر میں رمشا نے کہا اور یہ آخری تحفہ تمہارے لیے۔ تمہارا اکاؤنٹ کھول دیا گیا ہے ظاہر ہے تمہیں اس کام کو شروع کرنے کے لیے بہت کچھ درکار ہو گا۔ تمہارے بینک کا منیجر کسی وقت آکر تمہارے کاغذات کی تعمیل کرالے گا۔"

"کاش مجھے اس ابوالحسن کے خواب پر یقین آجائے۔ کیا یہ الف لیلہ کا ایک باب نہیں ہے مس رمشا۔" سجاد نے مسرت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سب کچھ حقیقت ہے۔"

"مگر میں آپ کو اس کے جواب میں کیا دے سکوں گا' مس رمشا۔ میں.......... میں اس کا کیا صلہ دوں گا آپ کو۔"

"وہ شخص جس نے بے لوث میرے خوابوں کی تکمیل کی تھی اس نے بھی مجھ سے کوئی صلہ نہیں مانگا تھا۔"

"وہ کون تھا۔"

"حیدر زمان۔ ایک مخلص بزرگ' ایک فرشتہ صفت انسان۔" رمشا نے جواب دیا۔

☆-------☆-------☆

عائشہ نے فرزند علی سے کہا۔

"ابو میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ یوں سمجھ لیں بالکل مجبور ہو گئی ہوں۔"

"کیا بات ہے بیٹی!" فرزند علی نے حیرت سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابو۔ رمشا راستہ بھٹک گئی ہے۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے غلط راستوں کی طرف دوڑ رہی ہے۔ میں مرکر بھی اس کی شکایت نہ کرتی ابو میں اسے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ابو میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ میں خود اسے روک سکوں۔"

"مگر بات کیا ہے عائشہ۔"

"میں نہیں جانتی ابو کہ مردوں کے بارے میں رمشا کا تجربہ کیا ہے لیکن سجاد اچھا انسان نہیں ہے۔ ابو میں ایک سانپ کی ڈسی ہوئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ رمشا کسی سانپ کا شکار ہو۔"

"کون ہے وہ؟"

"سجاد اس کا نام ہے ہمارے دفتر میں نوکری کرنے آیا تھا لیکن اب رمشا اور وہ غائب ہوتے ہیں' رمشا نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مضبوط پارٹیاں چلی گئی ہیں ساکھ خراب ہو گئی ہے۔ کلائنٹ برا بھلا کہتے نظر آتے ہیں۔ بینک خالی ہو گئے ہیں۔ مختلف بینکوں سے ڈیڑھ کروڑ روپے نکالے جاچکے ہیں اور ان کا کوئی حساب نہیں ہے وہ رمشا

کے پرسنل اکاؤنٹ میں ڈالے گئے ہیں ان کے خرچ کا کوئی نشان نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ.......... سجاد اسے لوٹ کر کھا رہا ہے۔"

"ہاں ابو' ایسا ہی ہے۔"

"تم نے اسے روکا نہیں۔"

"وہ بہت اچھی ہے ابو لیکن میں نے کبھی اس کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیا۔ بہرحال اس نے ہمیں بہت بڑا مقام دیا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں۔ میرے خیال میں سائرہ بہن سے بات کرتا ہوں۔"

سائرہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ فرزند علی کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"یہ سب کچھ کہنے سے پہلے مجھے ڈوب مرنا چاہیے تھا سائرہ بہن' لیکن صحیح معنوں میں تم لوگوں نے میرا بڑھاپا سنوار دیا ہے۔ اب تو تمہارا نمک خوار ہوں۔ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔"

"میں کیا کروں بھائی صاحب۔ یہ سب کچھ اس نے خود ہی کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ سب اس کی جدوجہد ہے میرا منہ نہیں پڑے گا اس سے کچھ کہتے ہوئے۔"

"اللہ رحم کرے۔ اسے کچھ تو سمجھایا جائے۔ یا پھر یہ معلوم کیا جائے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی پلاننگ ہو۔ کسی خاص مقصد کے تحت وہ یہ سب کر رہی ہو۔ وہ اتنی نا سمجھ تو نہیں ہے کیا سے کیا کر ڈالا ہے اس نے۔" فرزند علی نے کہا۔

"آپ اس پر گہری نظر رکھئے۔ مجھے اس کے مشاغل کے بارے میں بتائیے۔ کسی وقت اس سے بات کرنے کی کوشش کروں گی۔" سائرہ بیگم نے کہا۔

"ہوں' ٹھیک ہے۔" فرزند علی بے بسی سے بولے۔ وہ اپنے اندر ابھی اتنی ہمت نہیں پاتے تھے۔ ویسے رمشا واقعی دیوانی ہو گئی تھی۔ بے شک حیدر زمان نے اسے بہت بڑا سہارا دیا تھا اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا لیکن اس کے بعد چلنا' دوڑنا' پھرنا اس نے خود شروع کیا تھا۔ جمالی اسکائینو نے جو بلندیاں حاصل کی تھیں۔ وہ اس کی محنت کا نتیجہ تھیں لیکن دیکھنے والے دیکھ اور سمجھ رہے تھے کہ اپنے بنائے کو کس طرح لٹایا جا سکتا ہے۔ جمالی اسکائینو کے ستون دھڑا دھڑ گر رہے تھے کام بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ اسٹاف کے عیش تھے مفت کی تنخواہیں مل رہی تھیں لیکن فرم پر مالی دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ادھر سجاد کی ساکھ بڑھتی جا رہی تھی بڑے بڑے ادارے اب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے

اور اس کے کام سے بے حد خوش تھے۔ رمشا ہی نے ایک بے حد خوبصورت لگژری اپارٹمنٹ فرنشڈ کر کے دیا تھا۔ اس کے اندر جذبات کے سوتے کھل گئے تھے اور وہ سجاد پر لٹا دینے پر تل گئی تھی لیکن پُر وقار شخصیت کی مالک تھی آج تک اس نے کسی ہلکے انداز میں اس سے لگاوٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ البتہ سجاد اگر پاگل ہی نہیں تھا تو ان عنایات کا مطلب بخوبی سمجھا جا سکتا تھا لیکن وہ ان دنوں کچھ نہیں سمجھ رہا تھا اپنے خوابوں کی تعبیر کو وہ اس قدر مستحکم کر دینا چاہتا تھا کہ کسی طور اس کا زوال نہ ہو۔ وہ بے حد محنت کر کے اپنی ہر پارٹی کو خوش رکھنا چاہتا تھا اور اس میں کامیابی حاصل کرتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اسٹاف جا چکا تھا بس اس کا چپڑاسی موجود تھا۔ رمشا آفس میں داخل ہوئی تو چپڑاسی نے سلام کیا۔

"کہاں ہیں؟"

"کام کر رہے ہیں۔" اس نے کہا اور اندر داخل ہو گئی۔ سجاد اسی طرح مصروف تھا جس طرح وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ "تم باز نہیں آؤ گے میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ اتنا کام نہ کیا کرو۔ بیمار ہو جاؤ گے۔"

"نہیں مس رمشا! اپنا مستقبل بنا رہا ہوں۔"

"اٹھو۔ چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"گھومنے چلیں گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مجھے یہ کام مکمل کرنا ہے دس بجے ایئرپورٹ جانا ہے کیونکہ اس کے بعد چند روز بالکل فرصت نہیں ملے گی۔"

"ایئرپورٹ کیوں جانا ہے۔"

"ایک ایسی شخصیت آ رہی ہے جس سے میری ایک شرط لگی ہوئی تھی اور .... وہ شرط میں جیت گیا ہوں۔"

"تو تم نہیں اٹھو گے۔"

"سوری مس رمشا۔"

"میں یہ پھاڑ کر پھینک دوں گی سمجھے۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"آپ ایسا کیوں کریں گی مس رمشا۔ یہ میری محنت ہے بے شک آپ کے مجھ پر احسانات ہیں لیکن اصولی طور پر آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔" سجاد کا لہجہ اتنا سپاٹ تھا کہ وہ

ششدر رہ گئی۔ "میں واقعی آپ کے ساتھ اس وقت نہیں جا سکتا اور میری درخواست ہے کہ آپ مجھے کام کرنے دیں پلیز۔"

اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔ سجاد کے لہجے نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔ سجاد چہرے پر خشک تاثرات سجائے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ واپس پلٹی تو اس نے اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر وہ دیر تک سوچتی رہی تھی یہ سب کیا ہے .... سجاد ....

کار کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا تھا لیکن دل ڈوب رہا تھا۔ سجاد نے کتنا خشک رویہ اختیار کیا ہے۔ بے شک کام کے معاملے میں وہ اتنا ہی جنونی ہے لیکن میرے ساتھ بھی۔

ایک اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے کچھ یاد آیا چند چیزیں درکار تھیں جو وہ اپنی پسند سے خود ہی خرید سکتی تھی۔ اس نے کار اسٹور سے تھوڑی آگے سڑک کے کنارے پارک کی اور خود کو سنبھال کر اسٹور میں داخل ہو گئی پھر وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنی مطلوبہ اشیاء کے پاس پہنچ گئی۔ ابھی وہ بھی پیکٹ اٹھا رہی تھی کہ عقب میں قدموں کی چاپ ابھری اور اچانک کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"رمشا .... میرے خدا .... رمشا .... یہ تم ہی ہو۔ خدایا تیرا کتنا شکر ادا کروں۔ کتنی مشکل سے تمہیں پایا ہے میں نے۔" رمشا نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اس کا خون خشک ہو گیا۔ وہ شاہد تھا۔

"میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ نہ جانے کتنے عرصے سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ آہ۔ تم اس طرح۔" وہ ایک دم سنبھل گئی اور غرا کر بولی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا۔"

"کبھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تمہارے اس طرح چلے آنے کے بعد ...."

"ہاتھ چھوڑو میرا۔" وہ زور سے چیخی۔

"میرے ساتھ چلو۔ سنو رمشا .... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ میں .... میں اسی اسٹور پر کام کرتا ہوں اور رمشا میں ...."

"ذلیل کمینے میرا ہاتھ چھوڑ۔" رمشا نے چیخ کر کہا۔

"ممکن نہیں ہے رمشا .... تمہیں معلوم نہیں کہ ...." ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ پٹاخہ جیسا پھٹنے کی آواز آئی اور شاہد اچھل کر ایک ریک پر جا گرا

اور ریک میں چنے ہوئے بے شمار پیکٹ گرنے لگے۔ رمشا نے چونک کر دیکھا۔ وہ تیمور جمال شاہ تھا۔ اسٹور کا مینیجر اور دوسرے چند سیلز مین دوڑ کر آ گئے تھے۔ تیمور نے اپنا کارڈ جیب سے نکال کر مینیجر کو دیتے ہوئے کہا۔

"اس شخص نے ان خاتون سے بدتمیزی کی تھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا جس کی اسے سزا ملی ہے۔ آپ کا اگر کوئی نقصان ہوا ہے تو اپنے کسی آدمی کو اس پتے پر بھیج کر پیسے منگوا لیجئے۔ آیئے مس رمشا.......... آیئے پلیز۔"

تیمور جمال شاہ اسے ایک ریستوران میں لے گیا تھا۔ رمشا کے اعصاب شدید کشیدہ تھے وہ یہ بھی نہیں کہہ سکی تھی کہ اس کی کار وہاں کھڑی ہے۔ اول تو سجاد کا رویہ .... پھر شاہد کا اچانک مل جانا۔ وہ بے جان سی ہو گئی تھی۔ تیمور نے کافی منگوائی تھی اور پھر خود اسے پیش کی تھی۔

"شش شکریہ.........." اس نے لرزتی ہاتھوں سے کافی اٹھائی۔

"اس کمینے نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ آہ .... دونوں بے سہارا رہ گئے ہوں گے .... اور وہ .... وہ اب یہاں آگیا ہے۔ وہ یقیناً مجھے پریشان کرے گا۔"

"آپ اسے جانتی ہیں۔"

"اس کا نام شاہد ہے وہ اسلام آباد میں رہتا تھا اس کی وجہ سے ہم نے اسلام آباد چھوڑ دیا تھا۔" بالکل بے اختیاری کے عالم میں اس نے تیمور شاہ کو اپنی زندگی کی ساری کہانی سنا دی۔ تیمور خاموشی سے گردن جھکائے سنتا رہا تھا۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو تیمور نے جیب سے موبائل نکالا اور اس پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر اسے کان سے لگا لیا پھر بولا۔

"اس کا نام شاہد ہے ایپاز اسٹورز پر سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتا ہے اسے غیر معینہ مدت کے لیے لاک اپ کر دو۔ جب تک میں اس کے بارے میں رابطہ نہ کروں اسے لاک اپ رہنے دو۔ او کے ...." اس نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھ دیا۔

☆--------☆--------☆

آج گھر پہنچی تو دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ یہ شام انتہائی سنسنی خیز حالات میں گزری تھی۔ جس وقت وہ سجاد کے آفس میں داخل ہوئی تھی اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ سب کچھ کر دیا تھا اس نے سجاد کے لیے۔ اچانک ہی اس کے دل میں چاہت کا طوفان اٹھا تھا پھر وہ اس

طوفان میں ایسی بہی کہ سنبھل ہی نہ سکی۔ سب کچھ تباہ کر دیا اس نے محبوب کے لیے۔ سجاد اتنا معصوم بھی نہیں تھا کہ اس کے دل میں جھانک نہ سکا ہو۔ بے شک رمشا نے زبان سے اسے کچھ نہ کہا ہو لیکن یہ ضروری تو نہ تھا۔ ایسا تو وہ کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر سجاد نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔ اسے اپنا مستقبل رمشا سے زیادہ عزیز ہے۔ کیونکہ وہ رمشا کو اپنا مستقبل نہیں سمجھتا۔ اچانک اسے سجاد کے کچھ اور الفاظ یاد آئے۔ دس بجے مجھے ایئر پورٹ جانا ہے ایک ایسی شخصیت آ رہی ہے.........."

ایئر پورٹ .... اس نے سوچا اور اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھرنے لگے۔ رات کو وہ خاموشی سے اپنے بیڈ روم سے نکلی۔ بس بال سنوارے تھے۔ کار کی چابی لی اور چل پڑی۔ پھر اس کی کار ایئر پورٹ چل پڑی۔ پارکنگ پر اس نے ایک طرف کار لگا کر سجاد کی کار تلاش کی۔ یہ کار اس کی اپنی کار سے زیادہ قیمتی تھی۔ شاندار تھی اور یہ چمچماتی کار اس نے سجاد کو تحفے میں دی تھی۔ وہ اپنی کار پارک کر کے نیچے اتری۔ اسے علم تھا کہ سجاد اندر موجود ہے۔ اناؤنسر کسی فلائٹ کے آنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس نے سجاد کو تلاش کر لیا۔

وہ انتہائی خوبصورت سوٹ میں ملبوس بہت شاندار نظر آ رہا تھا اور ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت بکے تھا۔ کون آ رہا ہے۔ رمشا نے سوچا ایسی شخصیت کا سجاد نے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ رمشا آگے بڑھی اس نے سر پر اسکارف باندھا ہوا تھا۔ اس نے اس طرح سر جھکا لیا کہ اس کا چہرہ چھپ جائے۔ وہ سجاد کے کافی قریب ہو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ فلائٹ کہاں سے آئی تھی۔ پتا نہیں اناؤنسر نے کون سے ملک کا نام لیا تھا مسافر اندر جھانک رہے تھے۔ بڑی اچھی حیثیت کے مالک لوگ معلوم ہوتے تھے۔ عورتیں مرد۔ پھر ایک خوبصورت الٹرا ماڈرن لڑکی باہر آئی اور سب اس کی طرف دوڑے۔ یہ لوگ اس کو ریسیو کرنے آئے تھے لیکن سجاد اور پھر وہ چونک پڑی سجاد میٹھی نظروں سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ تو کیا۔

اس وقت اس کے خیال کی تصدیق ہوئی جب سجاد نے آگے بڑھ کر بکے اسے پیش کیا لڑکی نے حیرت سے سجاد کو دیکھا اور پھر مسرت بھری آوازی میں بولی۔

"اوہ سجو تم۔ اوہ۔ ونڈر فل' اوہ سجو۔"

لڑکی کو ریسیو کرنے والوں نے چونک کو سجاد کو دیکھا تھا۔ پھر شاندار سوٹ میں ملبوس اس عمر رسیدہ شخص سے کہا تھا۔

"ماموں جان۔ پہچانئے تو جانوں۔ ارے یہ تم ہو ہے۔ سجاد احمد۔"

"وہ آرکیٹکٹ ...." معمر آدمی کے لہجے میں شناسائی تھی۔

"وہی کتنا شاندار ہو گیا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"آؤ دیر ہو رہی ہے۔" عمر رسیدہ شخص نے کہا اور سجاد نے اپنا کارڈ نکال کر لڑکی کو دیتے ہوئے کہا۔

"جب بھی فرصت ہو آئیے۔" لڑکی نے کارڈ لے لیا سجاد ان کے ساتھ ہی نکلا تھا۔ رمشا کامیابی سے ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ جہاں ان لوگوں نے اپنی اسٹیشن ویگن اور ایک ہائی روف پارک کی تھی۔ وہیں سجاد کی کار بھی پارک تھی۔ وہ لوگ اپنی کاروں میں بیٹھنے لگے تو سجاد نے بھی اپنی کار کا دروازہ کھولا۔ سب نے سجاد کو دیکھا تھا سجاد کار میں بیٹھا پھر اس لڑکی کی طرف ہاتھ ہلایا اور اپنی کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

رمشا اپنی کار کی طرف بڑھ گئی طبیعت بے حد مضمحل تھی اس ماحول اور ان حالات کو دیکھ کر اس کے ذہن میں بہت سی وضاحتیں ہو رہی تھیں کچھ نہ معلوم ہوتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ میں آرہا تھا اس کو سجاد کی یہ توہین گراں گزری تھی لیکن۔

پھر وہ گھر واپس آئی تھی۔ کار کھڑی کر کے وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔ راہداری میں داخل ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو سامنے سے سائرہ بیگم نظر آئیں وہ رک گئی۔

"کہاں جارہی ہیں امی۔" اس نے امی کو دیکھ کر کہا۔

"تمہارے پاس آرہی تھی۔"

"آیئے خیریت۔" اس نے خود کو سنبھال لیا۔ امی کے لہجے میں ایک عجیب سا کھردرا پن تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس کا ذہن دوسرے خیالات سے آزاد ہو گیا امی کا لہجہ نیا تھا۔ اس سے قبل اس نے یہ لہجہ کبھی نہ سنا تھا۔ "بیٹھئے امی۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور امی بیٹھ گئیں۔ "کیا بات ہے۔"

"مجھے جانتی ہو۔" امی نے کہا۔

"جی۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میں نے کہا مجھے جانتی ہو۔"

"کوئی گڑبڑ ہو گئی مجھ سے۔ آپ کس بات پر ناراض ہو گئی ہیں۔"

"جانتی ہوں بہت کچھ کیا ہے تم نے ہمارے لیے۔ جو بیٹے بھی نہیں کرپاتے۔ احسان ہے تمہارا مجھ پر اور میری دونوں بیٹیوں پر۔ اس احسان کو مانتی ہوں لیکن تم کہاں کھو گئی کیوں کھو گئیں۔"

"امی کیا ہو گیا ہے۔"

"ان تمام تر کامیابیوں کے باوجود تم میری بیٹی ہو .... اور .... اور تمہارے تصور کے ساتھ مشعل اور طوبیٰ کی شناخت بھی ہوتی ہے۔"

"اب میں اس وقت تک کچھ نہیں بولوں گی جب تک آپ اس ناراضی کی وجہ نہیں بتا دیں گی۔" رمشا بے بسی سے بولی۔

"وقت کیا ہوا ہے معلوم ہے۔"

"جی ہاں۔ پانچ۔" اس نے دیوار پر لگی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اور تم تنہا آئی ہو۔ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ تم اس وقت کہاں سے آئی ہو۔"

"کیا مجھ پر اعتبار ختم ہو گیا ہے امی ...." وہ دکھ بھری آواز میں بولی۔

"ہاں۔" امی کا جواب غیر متوقع تھا۔

"کیوں امی۔"

"تم نے بڑی محنت سے اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کی ہے۔ میں جانتی ہوں ہم سے دل اکتا گیا ہے یا اپنے باپ کے نام سے۔"

"یہ خیال آپ کو کیسے آیا۔"

"اس لیے کہ اب تم پورا وقت آفس سے باہر رہتی ہو اس لیے کہ اب تمہاری اسکائینو میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ تمام پارٹیاں چھوڑ چکی ہیں کیا یہ غلط ہے۔"

"نہیں امی۔"

"کیا وجوہات ہیں اس کی؟"

"میں تھک گئی ہوں امی۔"

"غلط کہہ رہی ہو۔"

"کیوں ...."

"یہ سجاد کون ہے ...." امی نے کہا اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے اچانک ہی ذہن میں شدت آگئی۔ اس نے خونی نگاہوں سے امی کو دیکھا اور بولی۔

"کیوں پوچھ رہی ہیں آپ۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے تم میرے حقوق کی نفی کر رہی ہو۔ ان حقوق کی نفی جو مجھے ماں کی حیثیت سے حاصل ہیں۔" سائرہ بیگم بھی بپھر گئیں۔

"میں آپ کے حقوق سے انکار نہیں کر رہی امی لیکن عائشہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے دفتری باتیں دفتر تک رہنا مناسب ہیں۔"

"عائشہ کا یہاں کیا ذکر۔"

"میرا کہنا مناسب نہ ہو گا آپ اسے منع کر دیجئے کل سے وہ آفس نہ آئے وہ لوگ یہاں شوق سے رہیں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ عائشہ جو کچھ یہاں سے لیتی ہے لیتی رہے لیکن ...."

"تمہیں باقی باتوں کا احساس نہیں ہے کیا وقت ہوا ہے۔ تم تنہا آئی ہو۔ کہاں گئی تھیں اتنا وقت کہاں گزارا تم نے۔ گھر کے کسی فرد کو معلوم ہے۔"

"آپ کے ان الفاظ کے جواب میں جو کچھ میں کہہ سکتی تھی' امی وہ میں کبھی نہیں کہوں گی لیکن آپ میرے بارے میں غلط نہ سوچیں۔"

"کیا کہو گی اس کے جواب میں تم۔ بولو اپنے احسانات گناؤ گی یہ کہو گی کہ تم نے ہماری تقدیر بدل دی ہے سنو لڑکی۔ پہلی بار تمہاری سرکشی کا احساس ہوا ہے۔ پہلی بار بولی ہوں تمہارے سامنے۔ ہمیں اس عیش و عشرت میں جینے کی عادت نہیں پڑی ہے ابھی فرزند علی کا کوارٹر موجود ہے اور ہم وہاں بھی جینا جانتے ہیں۔"

"آپ بات کہاں لے گئیں امی۔"

"اور میرے خیال میں مجھے اب یہی کرنا چاہیے۔" امی نے کہا اور اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"کیوں امی۔"

"اس لیے کہ میری دو بچیاں اور بھی ہیں۔" امی نے کہا۔

"امی۔" وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"ٹھیک۔ آپ نے وہی کہہ دیا ہے امی جو پہلے نہ کسی کے ذہن میں آیا اور اس طرح شاید کبھی کوئی میرے بارے میں نہ سوچ سکے گا۔ وہ آپ نے سوچا اور کہہ دیا ہے۔ آپ بالکل ٹھیک سوچ رہی ہیں واقعی ان دونوں کا تحفظ آپ پر فرض ہے۔ اس لیے جتنی

جلدی ممکن ہو آپ یہ گھر چھوڑ دیں۔ میرے خیال میں اب آپ مجھے سونے کی اجازت دیں گی۔"

سائرہ بیگم کا منہ حیرت سے کھلا پھر بند ہو گیا پھر وہ غصے سے سرخ ہو گئیں اس کے بعد وہ اٹھیں اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ یہ رات اس کے لیے قہر کی رات تھی۔ ایک لمحہ آنکھ نہیں لگی۔ کیا ہو شربا دن گزرا تھا۔ ساری رات وحشت کے عالم میں گزری زندگی کا ہر لمحہ یاد آ رہا تھا سب لوگ لوگ یاد آ رہے تھے اور سجاد ....

صبح کو نہ جانے کتنی دیر تک شاور کے نیچے بیٹھی ٹھنڈا پانی خود پر بہاتی رہی تھی پھر اٹھ کر لباس تبدیل کیا اور پھر خاموشی سے ناشتہ کیے بغیر باہر نکل آئی۔ گھر والوں کی طرف اس نے آنکھ بھی نہیں اٹھائی تھی۔ نہ جانے کب تک وہ بے مقصد سڑک پر کار دوڑاتی رہی تھی پھر نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے کار کا رخ سجاد کے دفتر کی طرف دیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سجاد نہیں پہنچا۔ تب وہ اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ وہاں سجاد نے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ جس نے بتایا کہ سجاد صبح صبح ناشتہ کے بغیر گھر سے نکل گیا ہے وہ سوچتی رہی۔ پھر اس نے آخری فیصلہ یہی کیا کہ جمالی اسکائینو ہی چلے۔

جمالی اسکائینو میں اسٹاف موجود تھا لیکن عائشہ اپنی سیٹ پر نظر نہیں آئی۔ وہ آفس میں داخل ہو گئی خود کو بہلانے کے لیے اس نے کچھ فائل نکلوائے اور انہیں دیکھنے میں مصروف ہو گئی لیکن کچھ نظر ہی نہیں آیا ہر چیز ایک لکیر کی سی شکل اختیار کیے ہوئے تھی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چپڑاسی نے کہا۔ "میڈم سجاد صاحب آئے ہیں۔"

"کون؟" .... وہ اچھل پڑی لیکن اتنی دیر میں سجاد معمول کے مطابق دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر جلدی سے پلٹ کر دروازے پر پہنچا اور بولا۔

"میں اندر آسکتا ہوں میڈم ...."

وہ خاموشی سے سجاد کو دیکھتی رہی سجاد نے ہنس کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آجاؤ ثانی یہ ہمارا مستقل معمول ہے۔" اور وہی ایئرپورٹ والی لڑکی اندر آئی اس نے رمشا کو سلام کیا تھا۔

"ہیلو .... میرا نام رمشا جمالی ہے۔"

"ہیلو .... میں ثانیہ اعجاز ہوں۔"

"بیٹھئے آپ لوگ پلیز۔" اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"مسز رمشا .... ثانیہ جسے میں ثانی کہتا ہوں میرے کلاس فیلو سے ہم بچپن سے

ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔" سجاد نے کہا۔

"ہم نہیں مس رمشا۔ یہ۔ یہ خود کو جمع کے صیغے میں استعمال کر رہے ہیں۔" ثانیہ نے جلدی سے کہا۔

"خیر یہ آپ کے سامنے شرمارہی ہیں مگر یہ بعد کی بات ہے اصل میں ایک اہم بات کی تصدیق کے لیے اس وقت میں نے آپ کو زحمت دی ہے بات اصل میں یہ ہے کہ بہت پہلے جب یہ ملک سے باہر گئی تھیں اتفاق سے ایک پارک میں ہمیں نجومی ٹکرا گیا تھا انہیں قسمت کی لکیروں پر بالکل یقین نہیں ہے لیکن مجھے ہے ان کے والد مرحوم کروڑوں کی جائیداد چھوڑ گئے تھے اور میں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے میں رمشا آپ کو کیا بتاؤں نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا۔

"تیرے ہاتھ میں دولت کی لکیر ہے بچے اور یہ دولت کسی عورت کی مدد سے تیرے ہاتھ آئے گی۔ یہ خاتون غلط فہمی کا شکار ہو گئیں یہ سمجھیں کہ میں نے ان کی دولت پر دانت لگائے ہوئے ہیں انہیں بتایئے مس رمشا کہ جس عورت کی وجہ سے مجھے دولت۔ شہرت اور عزت ملی وہ کون ہے نجومی سچا تھا یا جھوٹا دیکھ لیجئے مس ثانیہ یہ ہیں وہ خاتون اور اب میں نہیں بولوں گا۔ یہ بتائیں گی کہ نجومی سچا تھا یا بالکل جھوٹا۔"

"اس نے ایک بات اور بھی تو کہی تھی۔" ثانیہ ہنس کر بولی۔

"کیا.........؟"

"یہی کہ تمہاری موت بھی ایک عورت ہی کے ہاتھوں ہو گی۔" ثانیہ نے کہا۔

رمشا خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ثانی کی بات کے جواب میں سجاد ہنس کر بولا۔

"خیر نجومی نے جو کچھ کہا ہو ثانیہ بیگم لیکن میری موت جس عورت کے ہاتھوں ہو گی وہ کم از کم آپ نہیں ہوں گی۔"

"خدا نہ کرے میں اپنے ہاتھوں سے کسی کا خون کیوں بہاؤں۔" ثانیہ نے کہا۔

"ایک بڑی عجیب بات ہے مس رمشا ہم دونوں تعلیم کی دنیا میں ایک ساتھ رہے۔ ثانیہ کے والدین بے چارے انتقال کر چکے ہیں لیکن انہوں نے کروڑوں روپے کی دولت ان کے لیے چھوڑی ہے جس پر ان کے ماموں صاحب پھن کاڑھ کر بیٹھ گئے۔"

"لینگویج پلیز۔ ماموں انسان ہیں اور میرے ماموں ہیں۔" ثانیہ نے ہنستے ہوئے احتجاج کیا۔

"جانتی ہیں مس رمشا' میں انہیں ریسیو کرنے ایئرپورٹ گیا۔ وہاں قبلہ ماموں صاحب موجود تھے مجھے اچھی طرح جانتے ہیں دیکھ کر ناک چڑھ گئی حضرت کی۔ مجھے نظر انداز کر کے انہیں اپنی کھٹارہ گاڑی کی طرف لے کر چل پڑے لیکن جب انہوں نے مجھے اپنی کار میں بیٹھتے دیکھا تو طبیعت صاف ہو گئی جناب کی بس اس کے بعد ثانیہ خاتون کو اجازت مل گئی۔ یہ ہے آج کی دنیا۔"

"غلط فہمی ہے آپ کو سجاد صاحب' ماموں جان اگر مجھ پر کوئی پابندی لگاتے تو میں ملک سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔"

"مگر مجھے دیکھ کر تو وہ ضرور اڑ گئے تھے۔" سجاد نے کہا۔

"میں نے کہا ناں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے مس رمشا کہ ایک بار وہ بوڑھا نجومی خود ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔ عجیب سا آدمی تھا۔ ہمارے پیچھے پڑ گیا اور خود آ کر ہمارے ہاتھ دیکھے۔ میرے بارے میں اس نے کہا کہ میں ملک سے باہر کا سفر کروں گی۔ سجاد کے لیے اس نے کہا کہ بے شک انہیں دولت ملے گی اور اس کا ذریعہ کوئی عورت ہو گی اور یہ بھی واقعی کہا تھا کہ ان کی موت بھی کسی عورت کے ہاتھوں سے ہو گی اور اب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ آپ وہ خاتون ہیں جو ان کے لیے حصول دولت کا ذریعہ بنی ہیں۔"

"باہر آپ کون سے ملک میں رہی ہیں۔" رمشا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں جرمنی میں تھی۔"

"باہر کی دنیا میں سنا ہے کہ وقت کی بڑی قیمت ہے اور لوگ اس کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

"بہت زیادہ اور کبھی کوئی۔" ثانیہ بولتے بولتے رک گئی۔ شاید اسے رمشا کے الفاظ کا احساس ہو گیا تھا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھیں۔ یہ میرے کام کے اوقات ہیں اور میں اس وقت سخت مصروف ہوں۔" رمشا نے انتہائی نرم لہجے میں کہا اور سجاد کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ویسے کبھی فرصت کے اوقات میں مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہو گی۔"

"اوہ یقیناً مس رمشا۔ آئی ایم سوری۔" وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"اوکے۔ خدا حافظ۔" رمشا نے کہا اور سجاد بھی بادل نخواستہ کھڑا ہو گیا۔ رمشا نے سامنے رکھے ہوئے فائل [illegible]

طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔ سجاد بھی باہر نکل گیا اور رمشا کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ نہ جانے کیوں آنسو امڈے چلے آرہے تھے۔ اس نے انٹر کام آن کیا اور بولی۔ "جب تک میں اجازت نہ دوں کسی کو میرے پاس نہ آنے دیا جائے نہ کوئی کال مجھے دی جائے۔"

"یس میڈم۔"

اس نے آنکھیں بند کیں اور کرسی سے گردن ٹکا دی۔ سینے پر شدید دباؤ تھا۔ نہ جانے کیا کیا خیال ذہن سے گزر رہے تھے لیکن شام کو گھر روانہ ہونے سے پہلے اس نے خود کو سنبھال لیا گھر کی ٹینشن الگ تھی۔ امی سے جو باتیں کی تھیں اب ان کا احساس ہو رہا تھا کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا اس نے۔ پھر وہ گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک لمحے کے اندر اندر اسے احساس ہو گیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ گھر سنسان نظر آرہا تھا۔

"کہاں گئے یہ سب؟" اس نے ملازم سے پوچھا۔

"پتا نہیں جی۔ کچھ بتایا نہیں۔"

وہ حیران رہ گئی۔ سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا لیکن چھٹی حس کچھ احساس دلا رہی تھی۔

نو' دس' گیارہ پھر بارہ بج گئے۔ کوئی واپس نہیں آیا تو وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ سائرہ بیگم سے ہونے والی ہر بات یاد آگئی تھی۔ وحشت زدہ ہو کر اٹھی لباس تبدیل کیا اور باہر آگئی۔ دماغ میں سناٹے بھرے ہوئے تھے ایک ہی خیال آیا دیوانوں کی طرح کار دوڑاتی ہوئی فرزند علی کے پرانے گھر پہنچی لیکن وہاں اندھیرا تھا تالا لگا ہوا تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

"کہاں گئے سب ممکن ہے اب گھر آگئے ہوں۔" تیزی سے پلٹ کر گھر کی طرف دوڑی لیکن وہاں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر آکر بستر پر گر پڑی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ "ٹھیک ہے امی۔ ٹھیک ہے چھوڑ دیا نا سب نے ٹھیک ہے۔ آپ لوگ مجھے آوارہ سمجھتے ہوں گے۔ آبروباختہ سمجھتے ہوں گے۔ اسی قابل ہوں میں۔ واقعی میں اسی قابل ہوں۔"

ساری رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اب تک جو واقعات پیش آئے تھے وہ یاد آرہے تھے۔ احساس ہو رہا تھا کہ سب کچھ اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا ہے۔ شاہد سے زخم کھا چکی تھی پھر سجاد سے چوٹ کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ سارا مجاہدہ خاک میں مل گیا تھا۔ اپنی دیوانگی کا کیا علاج۔ سجاد بھی شاہد سے مختلف نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امی نے زیادتی کی ہے۔ کیا جوان اولاد کو اس طرح چھوڑ دیا جاتا ہے۔ الفاظ کتنے ہی سخت ہوں بچوں سے غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے تو پورے

خلوص سے حالات کو سدھارنے میں محنت کی تھی۔ امی کو اس بات کا خیال رکھنا تھا۔ ناراض ہو کر گھر چھوڑ گئیں۔ کہاں ہیں آخر۔ گھر سے کچھ لے بھی نہیں گئیں ہو سکتا ہے واپس آجائیں۔

تیار ہو کر گھر سے نکل سارا دن مارا ماری پھری۔ نہ جانے کہاں کہاں۔ ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گھر آتی تھی۔ معلوم کرتی تھی کہ کچھ پتا تو نہیں چلا اور پھر نکل جاتی تھی۔ پھر شام کو تھکن سے چور واپس لوٹ رہی تھی کہ سجاد کی کار نظر آئی۔ ثانیہ برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ پتا نہیں سجاد نے اسے دیکھا تھا یا نہیں۔ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے اپنی کار سجاد کی کار کے پیچھے لگا دی۔ ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے سامنے سجاد رکا اور پھر ہوٹل کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اس کا دل تو چاہا تھا کہ سجاد کا تعاقب کرے لیکن پھر اس نے سوچا کہ فائدہ ہی کیا دونوں کو جس طرح اس نے اپنے آفس سے باہر نکال دیا تھا۔ اس کے بعد اب اگر ان کے سامنے جائے گی تو وہ بھی انتقامی کارروائی کر سکتے ہیں۔ سب کچھ بھاڑ میں جائے اصل مسئلہ امی کا ہے آہ۔ کیا کروں ثانیہ تو سجاد پر قبضہ جما چکی ہے۔ بے چاری کا کیا قصور' سجاد' شاہد کا دوسرا روپ ہے اپنی ہی غلطی ہے۔ وہ رات بھی اس نے اسی طرح گزاری آفس کا رخ بھی نہیں کیا تھا لیکن اگلے دن صبح جب وہ بھوک سے نڈھال ہو کر بسکٹ کھا رہی تھی اور چائے پی رہی تھی۔ جمالی اسکائینو کے منیجر کا فون موصول ہوا۔

"میڈم آپ کچھ وقت دے سکتی ہیں۔"

"کیوں کیا بات ہے؟......."

"جی وہ افغانی صاحب آئے ہوئے ہیں سخت ناراض ہو رہے ہیں' اپنا سارا کام واپس مانگ رہے ہیں؟"

"تو واپس کر دو۔ جہنم میں جائیں۔"

"میڈم بہت بڑا پروجیکٹ ہے معمولی کام نہیں ہے اور پھر آپ جانتی ہیں کہ سجاد صاحب نے ان سے رابطہ قائم کیا ہے۔ کام اسی معیار کا ہو جائے گا جس معیار کا ہمارے ہاں سے ہوتا۔ آپ جانتی ہیں کہ سجاد صاحب کو ہمارے ہاں کے طریقہ کار کا پتا ہے۔"

"میں نے کہا نا۔ اچھا میں آتی ہوں......... وہ بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں کہتے ہیں فیصلہ کر کے جائیں گے۔"

"آرہی ہوں میں۔"

آفس میں افغانی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔

"بھئی یہ کیا شروع کر رکھا ہے آپ نے یعنی یہ کہ ابھی کام بھی شروع نہیں ہوا حالانکہ میں آپ کو بیس لاکھ روپے ایڈوانس دے چکا ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ آج کے دور میں بیس لاکھ روپے کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ جتنے دن سے میرا پیسہ آپ کے پاس پڑا ہوا ہے اتنے دن میں مجھے اس کا کیا ریٹرن مل سکتا تھا؟............"

"آپ سو فیصدی کاروباری آدمی ہیں افغانی صاحب' آپ اپنا یہ کام واپس لے جانا چاہتے ہیں۔"

"بالکل............ اب میں کسی قیمت پر آپ سے یہ کام کرانا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے منیجر صاحب آپ افغانی صاحب کو ان کے تمام کنٹریکٹس وغیرہ واپس دے دیجئے۔"

"اور ساتھ میں بیس لاکھ روپے بھی۔"

"جی آپ چاہیں تو ان پر جتنا انٹرسٹ بنتا ہے وہ بھی لے جایئے۔"

"خدا کا شکر ہے میں سود خور نہیں ہوں آپ مجھے میری اصل رقم ہی واپس کر دیجئے۔"

"منیجر صاحب فوراً انتظام کر دیجئے گا۔"

"جی بہت بہتر۔"

"پیسے میرے آفس بھجوا دیجئے گا۔ بات ختم ہو رہی ہے تو یہ رقم تو آپ کو واپس کرنا ہی ہو گی' ورنہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔" افغانی صاحب چلے گئے تو منیجر صاحب نے کہا۔

"میڈم وہ سارے چیک رک گئے جو مختلف کمپنیوں سے آئے تھے' پیسہ مسلسل Out ہو رہا ہے۔ ہمیں بیس لاکھ اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے دینا پڑیں گے۔"

"چیک کیوں رک گئے۔" اس نے پوچھا۔

"کام مکمل نہ ہونے کی وجہ سے۔"

"میڈم آپ نے سلسلے میں دوسرے عملے کے افراد کو بھی ہدایات جاری نہیں کیں۔"

"ان میں کسی کو نہیں معلوم کہ انہیں کیا کرنا ہے۔"

"جب تک لائٹ اینگل آپ نہیں دیتیں۔ کام کیسے شروع ہو سکتا ہے یہ کام تو سجاد

صاحب نے سنبھال رکھا تھا۔ اب تو وہ بھی نہیں ہیں۔"

"بھاڑ میں جھونکیں آپ' جو کام واپس مانگے اسے اس کا کام واپس کر دیجئے۔ میں اس وقت بالکل کام کے موڈ میں نہیں ہوں۔ لایئے مجھ سے چیک سائن کرا لیجئے۔ سب کو ان کی رقومات پرسنل اکاؤنٹ سے نکال کر واپس کرتے جایئے۔"

"لیکن میڈم۔"

"شٹ اپ آپ نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟"

"جی۔" منیجر صاحب نے کہا اور وہ آفس سے باہر آ گئی۔ اسی کی تلاش' فرزند علی کی تلاش' آفس سے باہر نکلی ہی تھی کہ تھوڑے فاصلے پر تیمور جمال شاہ کی کار کھڑی نظر آئی۔ تیمور شاہ اسٹیئرنگ پر موجود تھا وہ ذرا سی حیران رہ گئی تیمور جمال شاہ یہاں کیوں کھڑا ہوا ہے .... پھر وہ خود ہی اس کی جانب بڑھ گئی اور جب وہ اس کے نزدیک پہنچی تو جمال شاہ نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا۔

"آیئے۔"

"وہ آپ آفس کیوں نہیں آئے۔"

"بس اس لیے کہ میں نے سوچا کہ آپ کی کوئی مصروفیت میری وجہ سے ڈسٹرب نہ ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی آیئے۔"

"آپ آ جایئے میں آپ کو واپس چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ تیمور شاہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ بہت خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھا اور بہت عمدہ خوشبو لگائی ہوئی تھی اس نے۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ سفر کرتی رہی تیمور شاہ اسے اپنے آفس لے گیا تھا۔

"اصل میں بات صرف حیدر زمان کے کہنے کی نہیں ہے میں ذاتی طور پر بھی آپ کی ہر پریشانی سے پریشان ہوتا ہوں مس رمشا کم از کم حیدر زمان کے کہنے کا پاس رکھ لیجئے۔ آپ کیوں پریشان ہیں کیوں اپنا کاروبار تباہ کر رہی ہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے افغانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ شاید آپ کو اس بات کا علم ہو کہ ان سے میرے پرانے تعلقات ہیں۔"

"میں کسی کا بھی احسان اپنے شانوں پر نہیں رکھنا چاہتی۔ جمال شاہ صاحب میری امی مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں۔ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہیں وہ مجھے مل نہیں رہیں۔ میں بالکل تنہا

رہ گئی ہوں اس وقت سب لوگ چلے گئے ہیں زیادتی کی ہے انہوں نے میرے ساتھ۔"

"اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"ذہن کام ہی نہیں کر رہا کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی۔ میں بہت پریشان ہوں تیمور صاحب آپ تصور نہیں کر سکتے ہیں کتنی پریشان ہوں۔"

"حیدر زمان صاحب نے بہت تفصیل سے آپ کے بارے میں بتایا تھا' آپ نے خود بھی مجھ سے تذکرہ کیا تھا کہ آپ اسلام آباد سے تشریف لائی ہیں آپ مجھے ایک بات بتائیے آپ نے اسلام آباد والے گھر کا کیا کیا تھا۔"

تیمور شاہ کے ان الفاظ پر وہ چونک پڑی' آہ یہ تو خیال ہی نہیں آیا تھا وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ارے ہاں یہ بھی تو ہو سکتا ہے شاہ صاحب' مم میں .... میں چلتی ہوں اسلام آباد جاؤں گی میں۔"

"بیٹھ جائیے پلیز میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا.........." تیمور جمال نے کہا۔

"اسلام آباد!"

"جی۔"

"مگر میں فوراً جانا چاہتی ہوں۔"

"آپ براہ کرم بیٹھ جائیے میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گا۔ معاف کیجئے گا اگر میرے یہ الفاظ آپ کو برے لگ رہے ہوں تو.........."

تیمور جمال نے فون اٹھایا ایک اجنبی نمبر ڈائل کیا اور بولا۔

"اسلام آباد کے لیے دو سیٹیں چاہئیں میں اور مس رمشا جا رہے ہیں جو پہلی فلائٹ یہاں سے روانہ ہو رہی ہے ہر قیمت پر اس کے دو ٹکٹ کا بندوبست کرو اور مجھے وقت بتاؤ۔" اس نے فون بند کر دیا رمشا نے کرسی کی پشت سے گردن ٹکالی تھی۔

"میں ابھی آپ کے لیے کوئی چیز منگواؤں گا نہیں۔ ذرا مجھے میرے فون کا جواب مل جائے۔" رمشا گہرے گہرے سانس لیتی رہی تھوڑی دیر بعد بیل بجی اور تیمور جمال شاہ نے ریسیور اٹھا کر فون سنا پھر کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔

"آئیے ہمیں بیس منٹ کے اندر اندر ایئرپورٹ پہنچ جانا ہے فلائٹ تھوڑی سی لیٹ کرا دی جائے گی ہدایات دے دی گئی ہیں۔"

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن جب ایئرپورٹ پہنچ کر وہ اندر داخل ہوئے اور پھر

وہاں سے جہاز میں پہنچے تو جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ بورڈنگ وغیرہ کا بھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا وہاں پہلے سے تیمور کے دو افراد موجود تھے۔ ویسے بھی ان کے پاس کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ بس بورڈنگ کارڈ لینا پڑا تھا۔

جہاز میں بیٹھنے کے بعد اس نے ایک لمحے کے بعد سوچا کہ تیمور شاہ کے اختیارات آخر کہاں تک ہیں اور یہ شخص اس پر اتنا مہربان کیوں ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ انکل حیدر زمان اس سے کہہ کر گئے تھے ہو سکتا ہے حیدر زمان کے اس سے گہرے تعلقات ہوں۔ پھر اس کی ذہنی رو امی کی طرف چلی گئی۔ امی اگر اسلام آباد گئی ہیں تو یہ ایک بہت بڑا قدم ہے۔ نہ جانے انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا انہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا میں نے ایسا کوئی قدم تو نہیں اٹھا لیا تھا۔ بہت سی سوچوں کے درمیان اس کا سفر جاری رہا۔ تیمور کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ بھی تو اس دنیا کا انسان ہے کتنا اچھا ہے وہ حالانکہ وکیل صاحب نے اس کے بارے میں کیا فضول باتیں کی تھیں۔ صاحب حیثیت ہے' صاحب عزت ہے اور اس پر کتنا مہربان ہے شکریہ تو حیدر زمان کا ادا کرنا چاہیے۔ اتنے اچھے انسان کو اس پر مہربان کر دیا پھر اچانک اسے تیمور کے اختیارات کا خیال آیا اور اس کے ساتھ شاہد کا۔ وہ تیمور کی طرف رخ کر کے بولی۔

"آپ بہت خاموش ہیں تیمور صاحب کچھ سوچ رہے ہیں۔"

"آپ کی پریشانی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ پتا نہیں آپ کی والدہ کی ناراضگی کا کیا سبب تھا ممکن ہے وہ اسلام آباد بھی نہ آئی ہوں۔"

"بعض اوقات بزرگ اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں خیر۔ یہ بتائیے بعد میں اس شخص کا کیا ہوا۔ میری مراد شاہد سے ہے۔"

"وہ بدستور بند ہے۔ تھانہ انچارج نے اس سے بیان لیا تھا تو اس نے بہت سی فضول باتیں کیں۔ بچے تھے اس کے لیکن اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ میں نے تھانہ انچارج سے کہا ہے کہ اسے بند رکھے۔" وہ خاموش ہو گئی اسلام آباد پہنچ کر تیمور نے کہا۔

"میں کسی ہوٹل میں قیام کروں گا بلکہ ہوٹل کا نام نوٹ کر لیں اگر والدہ یہاں ہیں تو مجھے فون کر کے بتا دیجئے اور اپنا پروگرام بھی بتا دیجئے میں چلا جاؤں گا۔" اس نے شکر گزار نگاہوں سے تیمور کو دیکھا کیا ہی اچھا انسان ہے پھر وہ گھر پہنچی گھر کھلا ہوا تھا اور سب وہاں موجود تھے۔

"آپ ناراض بھی ہو گئی تھیں تو آپ نے یہ انوکھا فیصلہ کیوں کیا۔ آپ وہاں فرزند چچا کے گھر بھی جا سکتی تھیں۔"

"رمشا میں تمہیں کسی بھی سلسلے میں کوئی جواب نہیں دینا چاہتی میں نے جو کچھ کیا مکمل سوچ سمجھ کر کیا اور میری درخواست ہے کہ اب تم مجھ سے ہر طرح کے رابطے ختم کر دو۔ ہر انسان کے اندر ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ اچھا بھی ہوتا ہے برا بھی ہوتا ہے۔ ضدی بھی ہوتا ہے اور معصوم بھی۔ میں تمہاری ماں ہوں اس کے باوجود تمہاری کاوشوں پر تمہاری احسان مند ہوں لیکن جو روش تم نے اپنائی ہے وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی مشکوک ہے اور تم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سیکھ گئی ہو۔ مجھے اپنی دونوں بیٹیوں کی ذمے داری کا احساس ہوا تو میری اپنی سوچ بیدار ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے جو فیصلہ مناسب سمجھا کیا۔"

"گویا میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"بھئی۔ اب ہم تمہارے احسان سے آزاد ہو گئے ہیں۔ تم جو گل کھلا رہی ہو اس کا ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ دولت کے لیے تم نے سب کچھ کر ڈالا۔"

"کیا .... کیا امی؟ ...." وہ دہشت سے کانپ اٹھی۔ "کیا سوچ رہی ہیں آپ میرے بارے میں۔"

"ایک درخواست کروں تم سے ہمیں یہاں آرام سے رہنے دو۔ اپنے اور ہمارے رشتے بھول جاؤ۔ یہ تمہارا ہم پر احسان ہو گا میری دونوں بچیوں پر احسان ہو گا۔ ورنہ لوگ انہیں تمہاری بہنیں کہیں گے اور ...."

"امی ...." وہ چیخ پڑی۔ "اتنی گالیاں دیں گی آپ مجھے میں نے سوچا بھی نہیں تھا آپ آخر مجھے کیا سمجھتی ہیں بتایئے مجھے کیا سمجھتی ہیں۔"

"میں نہیں جانتی۔ کچھ نہیں جانتی میں لیکن بس تم ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارا احسان ہو گا ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔"

"کاش، میں اس سے زیادہ برداشت کر سکتی .... کاش آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں وہ نہ کہیں .... آپ نے مجھ سے میرا گھر چھین لیا ہے ٹھیک ہے امی .... ٹھیک ہے ...."

وہ وہاں سے تیمور کے پاس واپس چلی گئی۔

"ہاں .... وہ یہاں موجود ہیں۔"

"چلنے کے تیار نہیں۔"

"نہیں ہمیں واپس چلنا ہے۔"

"کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"نہیں۔" اس نے پتھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور تیمور خاموش ہو گیا۔ اپنی تنہائیوں میں اس نے سوچا امی بہت سخت ہو گئی تھیں نہ جانے ان کے ذہن میں کیا ہے۔ میں نے کوئی ایسا عمل تو نہیں کیا جس سے میرا کردار داغدار ہوتا ہو۔ ہاں سجاد کے سلسلے میں غلط کیا ہے میں نے ....

"مسٹر سجاد سے بات کرنی ہے۔" اس نے موبائل فون پر کہا۔

"آپ کون خاتون بول رہی ہیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"تم کون ہو .... کیا سیکرٹری؟ ...."

"نہیں ....؟"

"پھر کون ہو ....؟"

"میرا نام ثانیہ ہے سجاد مجھے ثانی کہتے ہیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی اور اس نے ریسیور پٹخ دیا۔ سارا وجود پھنک رہا تھا۔ آہ کیا کروں؟ سجاد کتنا برا انسان نکلا۔ مگر مجھے کیا ہو گیا تھا غلطی میری تھی نہ جانے مجھ پر کیا جنون سوار ہو گیا تھا۔

"ہیلو۔"

"کون سجاد ....؟"

"جی بول رہا ہوں۔"

"میری آواز نہیں پہچانی۔"

"اوہ مس رمشا۔"

"کہاں ہو تم ...."

"بس وہی مصروفیت ہے۔"

"آخر ایسی کیا مصروفیت ہے۔"

"شام کو ثانی کی برتھ ڈے ہے۔ سارے انتظامات مجھے کرنے ہیں عجیب دنیا ہے۔ مس رمشا وہ ثانی کے جو ماموں صاحب ہیں نا۔ اب میرے مرید بننے کے لیے تیار ہیں۔ ارے ہاں رمشا ناصر اینڈ کو کا سارا کام تم نے واپس کر دیا ہے وہ لوگ میرے پاس چکر لگا رہے کیا کروں بھئی ان کا۔ کہہ رہے تھے کہ کافی بڑی رقم انہوں نے جعلی اسکائینو کو

ایڈوانس دے رکھی ہے وہ بھی انہیں واپس نہیں مل رہی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو سجاد.........."

"تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ یوں کرو آج شام ثانی کے گھر آجاؤ۔ اس کی سالگرہ میں بھی شرکت کر لو۔ تم سے بات بھی ہو جائے گی۔"

ایک بار پھر اس کے وجود میں آگ کی لپٹیں گردش کرنے لگیں لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"دعوت نامے آپ جاری کر رہے ہیں مسٹر سجاد۔"

"ایں ہاں۔ تمام انتظامات ہی میں نے کیے ہیں بتایا تھا نا میں نے کہ ثانی کے ماموں صاحب بھی انہی لوگوں میں سے ہیں جو چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ اب آج کل ہماری جو بے جے کار ہو رہی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"

"اوکے میں آجاؤں گی۔" اس نے فوراً فیصلہ کر لیا۔

"ہم انتظار کریں گے۔" سجاد نے کہا ایک ایک جملہ دل کو جھلسائے دیتا تھا یہ لفظ "ہم" بھی اسے بری طرح چبھ گیا لیکن مقررہ وقت پر وہ ثانیہ کے گھر پہنچ گئی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے ثانیہ اور سجاد کو کس طرح اپنے آفس سے نکال دیا تھا۔ ذہنی طور پر اس نے اپنے آپ کو ہر توہین کے لیے تیار کر لیا تھا۔ ثانیہ کو وہ بے عزتی ضرور یاد ہو گی اور آج اسے موقع حاصل ہو گیا تھا کیونکہ اس نے خود دعوت نامہ بھی نہیں دیا تھا۔

ثانیہ کی کوٹھی اس کی حیثیت کی آئینہ دار تھی۔ بات کافی آگے کی تھی۔ تھوڑی سی الجھن اسے اس وقت ہوئی جب ثانیہ نے اسے بہت پُرجوش طریقے سے خوش آمدید کہا ور بہت محبت سے اسے ملی۔

"خدا کی قسم بے حد شرمندہ ہوں کہ آپ کو دعوت نامہ پہنچانے خود نہیں آئی۔ بس نہ جانے کیوں میری ہمت نہیں پڑی۔ بہرحال آپ نے مجھے عزت بخشی ہے۔ میں اس کے لیے شکر گزار ہوں۔" اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا پھر سجاد بھی آگیا بے حد قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا اور بہت دلکش نظر آرہا تھا۔

"ہیلو مس رمشا.......... کیسی ہیں آپ۔"

رمشا نے ہیرے کی انگوٹھی ثانیہ کو پیش کی اور ثانیہ نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ثانیہ رمشا کو اپنے ساتھ لے پھری۔ سجاد سے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ رمشا نے سوچا یہ اس کی چالاکی ہے سجاد بھی کئی بار اس کے پاس آیا اور ایک

بار اس نے موقع پا کر کہا۔

"میری کار ثانی کے استعمال میں ہے واپسی پر براہ کرم آپ مجھے اپنی کار میں چھوڑ دیں۔ وہ ناصر اینڈ کو کے بارے میں بھی بات ہو جائے گی۔"

اسے رخصت کرتے ہوئے ثانیہ نے کہا۔

"آپ نے میری ہمت بڑھا دی ہے۔ اب دوبارہ بھی آپ سے ملاقات کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"ضرور ثانیہ میں خود آپ سے ملوں گی۔" باہر سجاد موجود تھا کہنے لگا۔

"میں ڈرائیونگ کروں گا آپ بیٹھ جائیے۔"

"بیٹھو۔" رمشا نے سخت لہجے میں کہا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ وہ خاموشی سے رمشا کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ پھر رمشا نے کار اس کے فلیٹ پر روکی تھی۔ سجاد نے چابی نکال کر فلیٹ کا تالا کھولا اور اندر روشنیاں جلاتا ہوا بولا۔

"سب کچھ ہونے کے باوجود یہ گھر بے چراغ ہے۔ اصل میں میری مصروفیات بے پناہ ہیں آج تک یہ فلیٹ صرف اپنا بسیرا رہا ہے اس لیے میں نے کوئی مستقل ملازم بھی نہیں رکھا۔ دفتر کے چپڑاسی وغیرہ آکر صفائی کر جاتے ہیں کچھ چائے وغیرہ کا تو موڈ نہیں ہے۔"

"نہیں" وہ کھردرے لہجے میں بولی۔

"میں آپ کو ناصر اینڈ کو کے کاغذات دکھاتا ہوں اصل ہیں۔"

"اس موضوع پر آفس میں بات ہو گی فائل لے کر آفس آجانا۔ جتنا ایڈوانس انہوں نے دیا ہے اس کا چیک فوراً مل جائے گا۔"

"آخر آپ کام کیوں نہیں کر رہی ہیں مس رمشا۔"

"میں نے ساری پارٹیاں تو تمہیں دے دی ہیں تم کام کر رہے ہو کافی ہے۔"

"لیکن اس طرح.........."

"فضول باتوں سے گریز کرو سجاد.......... میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"جی فرمائیے۔"

"تم ثانی سے محبت کرتے ہو۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں مس رمشا۔" سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں مس رمشا۔ میرے خیال میں آپ غلطی پر ہیں۔ میں آپ کو کوئی جواب دینے پر مجبور نہیں ہوں اور یہ بالکل ذاتی سوال ہے۔ آپ اس کی وجہ بتائیں تو شاید میں جواب دینے پر غور کروں۔"

"تمہیں اپنی اوقات کا احساس ہے یہ اندازہ ہے تمہیں کہ میں نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ اپنا سب کچھ تباہ کر کے میں نے تمہاری حیثیت بنا دی اور اب تم مجھ سے کہتے ہو کہ تم مجھے جواب دینے پر مجبور نہیں ہو۔"

"صرف ایک سوال کا جواب آپ مجھے دے دیں تو میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے دوں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے صرف میرے لیے یہ کیوں کیا بہت سے آرکیٹکٹ کام کرتے تھے آپ کے پاس آپ نے سب کی یہ حیثیت کیوں نہ بنا دی۔"

"اس لیے کہ .... اس لیے کہ میں تمہارے فریب میں آ گئی تھی۔ میں تمہارے جال میں پھنس گئی تھی میں .... میں تم سے محبت کرنے لگی تھیں۔"

"فریب .... جال' آپ تو سچ بولنے کی عادی تھیں۔ مس رمشا آج جھوٹ کیوں بول رہی ہیں مجھے وہ دن بتائیں گی جب آپ نے مجھ سے یا میں نے آپ سے اظہار محبت کیا ہو۔ کبھی کوئی ایک جملہ یاد ہے آپ کو اس سلسلے میں۔"

رمشا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ تعجب بھری نظروں سے سجاد کو دیکھنے لگی۔ سچ کہہ رہا تھا وہ بات واقعی بالکل ٹھیک تھی یہ باتیں تو کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

"میں نے ایک بار ثانی کی موجودگی میں آپ کو بتایا کہ نجومی نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ میرا مستقبل بنے گا اور اس کا ذریعہ کوئی خاتون ہوں گی وہ آپ ہیں مس رمشا۔ اس کا اعتراف کرتا ہوں لیکن باقی سب کچھ۔ وہ سب۔ پاس گزاری تھی۔ مس رمشا .... میں ثانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور شاید بہت جلد۔"

اس کے بعد بھلا کیا کہتی۔ اپنے گھر کے ویرانے میں اپنے بیڈ روم میں اس نے تمام حالات پر غور کیا۔ واقعی اپنی حدیں عبور کر گئی تھی۔ وہ اپنی کامیابیوں کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ سب کچھ گنوا دیا تھا۔ اب اسے سنبھالنا مشکل تھا سب سے بڑی زیادتی اسی نے کی تھی لیکن کیا واقعی اسی نے زیادتی کی تھی یا پھر یہاں بھی۔ دوسرے دن وہ آفس گئی۔ ناصر اینڈ کو کو فون کیا اور فوری ناصر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔

"جی مس رمشا!" ناصر کا لہجہ پُر اخلاق تھا۔

"آپ اپنے مینیجر کو بھیج دیجئے میں آپ سے کام نہ ہونے کی معذرت کرتی ہوں۔

آپ کے ڈیوز.........."

"آ گئے ہیں' مل گئے ہیں۔ اصل میں ہمیں بھی جلدی ہے' میڈم! ورنہ آپ یقین کیجئے ...."

"آپ کے ڈیوز مل گئے ہیں آپ کو؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جی! وہ تیمور صاحب نے کیش کرا کر بھیج دیئے ہیں۔ میں آپ کا مشکور ضرور ہوں ویسے میڈم آپ جب بھی کام شروع کریں یوں سمجھیں.........."

اس نے فون بند کر دیا' تیمور شاہ نے یہ رقم بھجوا دی لیکن اسے کیسے معلوم ہوا۔

"آپ اسے ایشو نہ بنائیں۔ بات میرے علم میں آ گئی تھی۔ میں جمالی اسکائینو کی ساکھ خراب نہیں دیکھنا چاہتا نہ اسے آپ اپنی توہین تصور کریں۔ مجھے تھوڑا سا وقت دیجئے' فرصت ہو گی آپ کو؟"

"آپ پلیز' آپ سے معذرت چاہتی ہوں میں۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اسی شام وہ ایک ریستوران میں تیمور کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"میں آپ سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں مس جمالی! ہر مشکل کا ایک حل ہوتا ہے۔ آپ موم بن جائیے ہر شخص آپ کو اپنی پسند کے مطابق بنانے کی کوشش کرے گا۔ بس آپ موم نہ بنیں۔ اپنے آپ کو سنبھالیں جس ادارے کو آپ نے اپنے خون کی نمی سے تعمیر کیا ہے اسے مسمار نہ ہونے دیں۔ میں آپ کو اپنے بارے میں بتاؤں بس شہر کا ناسور تھا۔ کوئی جرم نہیں کیا تھا' میں نے۔ میرا جرم بس اتنا تھا کہ کچھ مجرم لوگوں نے مجھ سے جرم کرانے کی کوشش میں ناکام ہو کر میرے خلاف کام شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں انہوں نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں اور مجھے ایک خطرناک مجرم قرار دلوا دیا لیکن میں ان کے ہاتھ نہ لگا اور ملک سے باہر نکل گیا پھر میں نے ایک نئی زندگی تلاش کی اور بہت سی دولت اکٹھی کر کے وطن واپس آ گیا۔ اس دولت کے ذریعے میں نے انہیں شکست دی جو میرے دشمن تھے۔ آپ پلیز' خود کو سنبھالئے جمالی اسکائینو کی برتری پھر قائم کر دیجئے۔ باقی مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"

تیمور تو خیر ہمیشہ ہی فرشتہ ثابت ہوا تھا۔ اس کی باتوں نے رمشا کو بہت ڈھارس دی تھی۔ اس نے تنہائی میں ان باتوں پر غور کیا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ واقعی انتہا تھی اس نے خود اپنا گھر خاکستر کر دیا تھا لیکن بس دل کی سرکشی کا شکار ہو گئی تھی کم بخت سجاد نے ایسا پاگل کر دیا تھا کہ عقل و خرد کھو بیٹھی تھی اور وہ کہتا ہے کہ اس نے اس طرح کبھی نہیں سوچا

بکواس کرتا ہے کمینہ' اتنی پگلی وہ بھی نہیں تھی کہ گھٹیا انداز میں اظہار عشق کرتی۔ سجاد نے بھی ایسا ہی کیا تھا لیکن اشاروں کنایوں میں۔ اپنے ہر انداز سے اس نے رمشا پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور کھو بیٹھا ہے۔ سو فیصد یہی بات ہے تھی ورنہ .... ورنہ وہ اس قدر بے وقوف بھی نہیں تھی اور اب وہ ثانیہ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ثانیہ...........

"خدا کی قسم آپ شاید یقین نہ کریں' مس رمشا!" ثانیہ نے کہا۔

"کیا؟"

"اب سے کچھ دیر قبل میں آپ کے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"آپ نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔" رمشا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"اس وقت میں یہی سوچ رہی تھی کہ آپ کے آفس جاؤں یا گھر۔ آفس میں آتے ہوئے اس لئے جھجک ہو رہی تھی کہ آپ وہاں مصروف رہتی ہیں اور گھر میں کسی سے میرا تعارف نہیں ہے۔"

"چلئے میں آ گئی' اب آپ آفس یا گھر ضرور آئیں بلکہ کسی دن میرے ساتھ کھانا کھائیے۔"

"آج آپ ہماری دعوت قبول فرمائیے۔" ثانیہ نے کہا۔

"سجاد آئیں گے کیا؟"

"سجاد تو شاید سکھر گئے ہیں۔ پرسوں واپسی ہو گی۔ آج کل آپ سے شاید کوئی کھچاوٹ ہو گئی ہے؟"

"سجاد سے........."

"ہاں۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا۔" رمشا حیرت سے بولی۔

"میں نے محسوس کیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ آپ نے جلالی اسکائینو کو ان کی فرم کے مقابلے پر کھڑا کر دیا ہے اور شاید نئے سرے سے کام شروع کیا ہے۔"

"اوہ سجاد نے اسے محسوس کر لیا۔ ہاں مس ثانیہ بات اصل میں یہ تھی کہ پہلے میں بھی اسلام آباد میں فرم نوکری کرتی تھی۔ میرے ابو کا انتقال ہو گیا' میری آرزو تھی کہ میں اپنے ابو کے نام سے ایک فرم بناؤں یہ آرزو کراچی آ کر پوری ہو گی۔ سجاد میرے ہاں آئے اور انہوں نے بے پناہ فکر۔ اور محنت سے کام کیا جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ پھر

ایک دن انہوں نے مجھے اپنی خواہش سے آگاہ کیا کہ وہ بھی ایک فرم بنانے کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔ میں اپنا وقت یاد کر کے ان کے خواب کی تکمیل میں مصروف ہو گئی۔ میں نے اپنی ساری پارٹیاں انہیں دے دیں اور .... اور .... باقی سب کچھ .... لیکن........."

"میں جانتی ہوں' ایک سوال کروں مس رمشا!"

"ہاں۔"

"میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کس سلسلے میں؟"

"آپ کے خیال میں کیا میں سجاد سے عشق کرتی ہوں؟" ثانیہ نے سوال کیا اور رمشا تعجب سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہاں' میرا یہی خیال ہے۔"

ثانیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"اب میری ہر بات پر یقین کرنا رمشا! کیونکہ اگر اس وقت مجھے جھوٹا سمجھ کر تم میرا دل توڑو گی تو بعد میں تمہیں افسوس ہو گا۔" رمشا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' کچھ لمحوں کے بعد ثانیہ نے کہا۔

"میں نے نہ کبھی اس سے عشق کیا اور نہ اب کرتی ہوں۔ وہ میری تعلیمی زندگی کا ساتھی ہے اور یہ اندازہ تمہیں بھی ہو گیا ہو گا کہ وہ ذہین بھی ہے اور موقع شناس بھی۔ وہ انسان کی کمزوریاں پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن تعلیم کے زمانے میں ہی میں نے اس کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا اور اسے اپنے دل میں کوئی مقام نہیں دیا تھا۔ بعد میں میں ملک سے باہر چلی گئی۔ جرمنی میں ایک پاکستانی خاندان آباد ہے' اس خاندان کا ایک نوجوان اسد ہے' جسے میں پسند کرتی ہوں اور اسی سے میری شادی ہو گی۔ یہاں میری دولت وغیرہ کی دیکھ بھال ماموں کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی معاملات کے سلسلے میں ماموں نے مجھے بلایا تھا۔ اس کے لئے میں آئی ہوں اور بہت جلد واپس جا رہی ہوں۔ وہ بہرحال طویل عرصہ میرا دوست رہا ہے اور میں نے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی' وقت گزاری کے لئے وہ اچھا ساتھی ہے' یہ بھی سچ ہے رمشا! کہ ایک بار ایک نجومی کہیں مل گیا تھا' اس نے سجاد کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ دولت کی لکیر اس کے ہاتھ میں ہے اور اسے یہ دولت ایک عورت کے ذریعے ملے گی اور اسے سو فیصدی یقین ہو گیا تھا کہ وہ عورت میں ہوں

گی۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اس نے اس نجومی کو پیسے نہیں دیئے تھے تو نجومی نے غصے سے کہا تھا کہ اس کی موت بھی ایک عورت کے ہاتھوں سے ہو گی۔ خیر پھر میں تو ملک سے باہر چلی گئی اور وہ اپنی جدوجہد میں مصروف رہا۔ میرا اس سے خط و کتابت کا رابطہ رہا اور اس نے اپنے خطوط میں چھ بار تمہارا تذکرہ کیا لیکن جانتی ہو' کس انداز میں؟"

"بتانا پسند کرو گی؟" رمشا بولی۔

"اس نے لکھا تھا۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میں اس عورت تک پہنچ گیا ہوں جو میرے لئے دولت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک فرم کی مالک ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے' بظاہر سخت گیر اور ناقابل تسخیر نظر آتی ہے لیکن ہم بھی بلائے بے درماں ہیں' اسے شیشے میں نہ اتارا تو سجاد نام ہی کیا .... پھر اس نے دوسرے خط میں لکھا کہ زخمی عورت کے دل کا ناسور نظر آ گیا ہے۔ ثانی! میں اس کی چھان بین میں لگا ہوا ہوں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اسلام آباد میں اس نے کسی کے ہاتھوں چوٹ کھائی ہے' اب میں اس کے دل کے اس ناسور کے لئے مرہم تلاش کر رہا ہوں۔ دعا کرو کہ مجھے میری زندگی کا مقصد حاصل ہو جائے۔ ثانی! میں نے تمہیں دولت کے حصول کا ذریعہ کبھی نہیں سمجھا لیکن میری محبت تم ہی ہو وغیرہ......... پھر میں یہاں آئی اور اسے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی' وہ اچھی حالت میں تھا۔ اس کے بعد مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہوا۔ رمشا! تم مجھے پہلی نگاہ میں ہی اچھی لگی تھیں لیکن تمہارے رویئے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تم میرے بارے میں کس انداز میں سوچ رہی ہو۔ شاید میں اس طرح تم سے کبھی نہ ملتی لیکن سجاد نے مجھے تمہارے بارے میں پوری تفصیل بتائی اور کہا کہ کس طرح تم نے اس کے لئے خود کو تباہ کر لیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت' عورت کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے لیکن شاید عورت ہی دوسری عورت کے دکھ کو سمجھ بھی سکتی ہے اور وہ اس کی دوست بھی ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو سجاد سے بدظن نہیں کر رہی' آپ کو اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کا اختیار ہے لیکن آپ کو دو باتیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں میں۔"

رمشا بس خاموشی سے ثانیہ کو دیکھتی جا رہی تھی۔ ثانیہ نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ یہاں میرا کام ہو گیا ہے اور اب کسی بھی دن میں خاموشی سے یہاں سے چلی جاؤں گی کیونکہ اسد بہت اداس ہے' میرے بغیر۔ میں نے بے وقوف سجاد کو

اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس سے رمشا! میرے بارے میں غلط انداز میں نہ سوچیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کے بعد سجاد پر کبھی بھروسہ نہ کریں' وہ قابل اعتماد انسان نہیں ہے۔ سنا ہے آپ نے ایک بار پھر اپنی فرم پر توجہ دینا شروع کر دی ہے اور کوئی تیمور شاہ آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ وہ پھر آپ کے لئے کچھ جال تیار کرنے کی فکر میں ہے۔"

ثانیہ نے اس کے دل و دماغ کے بہت سے دروازے کھول دیئے اس نے وہ سب کچھ بتایا جو حقیقت تھی پھر اس پر یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد اس نے دل میں سوچا کہ واقعی سجاد کے سلسلے میں وہ بڑی ناتجربہ کار ثابت ہوئی تھی۔ سجاد نے تو اسے زمین بوس کر دیا تھا۔ اگر تیمور اسے سہارا نہ دیتا تو وہ ماری گئی تھی ماں اور بہنیں تک اس بار چھن گئی تھیں۔ اب کیا کروں کیا نہ کروں اب۔

تاہم اس نے اپنے کام سے پھر لگن لگا لی۔ وہ ایک بار پھر مصروف ہو گئی' سٹاف پورا موجود تھا' اس نے ذہین اور اچھا کام کرنے والوں کو شامل کیا اور کام میں جٹ گئی۔ جبار بھائی باٹلی والا اس سے ملا اور پریشانی سے بولا۔

"ارے بابا' میں تمہارے کو اپنا پروجیکٹ واپسی کے لئے کب بولا' آپ تو خود میرا کام میرے کو واپس کیا۔ بولو کیا یا نہیں؟"

"کیا بات ہے باٹلی والا؟" رمشا نے حیرت سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ شاہ صاحب میرے کو ناراض ہوتا پڑا ہے۔ ابھی دیکھو میرا گردن کٹیلا ہے۔ تھوڑا دباؤ بڑھ جاتا تو اپن تو خلاص ہونا پڑ گیا جی رحم کرو میرے پر بابا یہ سارا فائل لے آیا ہے تمہارے پاس۔ کام شروع کرو جتنا روکڑا مانگو ایڈوانس دینے کو تیار ہے۔ میں کب منع کیا۔"

"آپ کی ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی مسٹر باٹلی والا۔"

"بس بھیا' میرے پروجیکٹ پر کام دوبارہ شروع کر دو اور .... اور شاہ صاحب کو بولو کہ میرے اور تمہارے بیچ میں کوئی لفڑا نہیں ہے۔"

"کون شاہ صاحب۔" وہ الجھ کر بولی۔

"کائے کو ہماری جندگی خراب کرتی ہو بائی۔ میں تیمور شاہ صاحب کے بارے میں بولتا ہوں۔"

جبار بھائی باٹلی والا بہت بڑی پارٹی تھے' بہت بڑا کام تھا ان کا' جب وہ دیوانگی کے

دور میں تھی تو اس نے ان کا سارا کام واپس کر دیا تھا اور ان سے کافی تلخ کلامی کی تھی لیکن تیمور شاہ' یہ شخص آخر کیا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ کئی پروجیکٹس اس کے پاس واپس آ گئے اور وہ کام میں مصروف ہو گئی اس دوران تیمور شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی ثانیہ اور سجاد کے بارے میں اسے کوئی اطلاع ملی تھی۔ اس نے خود کو کام میں ڈبو دیا تھا۔ اس شام کچھ فرصت ملی تو اس نے تیمور جمال شاہ کو فون کیا' دوسری طرف سے آپریٹر بول رہی تھی۔

"تیمور شاہ صاحب سے بات کرائیے۔"

"آپ کون بول رہی ہیں میڈم!"

"رمشا جلال۔"

"میڈم! شاہ صاحب اسلام آباد گئے ہیں۔"

"اوہ.......... واپسی کب ہو گی؟"

"کنفرم نہیں شاید رات کو آ جائیں۔"

"او کے۔" اس نے فون بند کر دیا۔ پھر وہ خاموشی سے سامنے والی کھڑکی سے دوسری طرف دنیا کو گھورتی رہی۔ کتنی تنہائی ہے' قافلے کسی نہ کسی طرح منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ کیا میری کوئی منزل ہے؟ کیا اسی سفر میں میری زندگی گزر جائے گی۔ نہ جانے کیوں ثانیہ کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے ثانیہ کا نمبر تلاش کیا آفس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ آپریٹر جا چکی تھی۔ اس نے ثانیہ کا فون نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے ایک اجنبی خاتون کی آواز سنائی دی۔

"دیکھئے' میں رمشا جلال بول رہی ہوں۔ ثانیہ سے بات کرا دیجئے۔"

"نہیں میڈم! مس صاحبہ تو جرمنی جا چکی ہیں۔"

"جرمنی.......... کب..........؟"

"آج چھ دن ہو گئے۔"

"اوہ ٹھیک ہے.......... شکریہ!" اس نے فون بند کر دیا۔ دل میں ایک عجیب سی الجھن پیدا ہو گئی تھی اس کیفیت کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے کیا احساسات ہیں۔ گھر واپس آنے کے بعد کئی بار سجاد کا خیال آیا تھا۔

رات کے کوئی ساڑھے نو بجے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی بجی اور اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"میں.......... رمشا! میں سجاد بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی' وہ کچھ نہ بولی تو سجاد کی آواز دوبارہ ابھری۔ "میں سخت بیمار ہوں' مس رمشا! شاید' یہ میری زندگی کی آخری شام ہو۔ آپ کے پاس آنا چاہتا تھا لیکن .... بس تھوڑی دیر کے لئے آ جائیے۔ اتنی دیر کے لئے میں.........." اس کی آواز رندھ گئی۔

فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ دستک دی پھر اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم روشن تھا۔

"سجاد۔" رمشا نے زور سے آواز دی۔ پھر بولتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ سجاد صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے شراب کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ وہ حیرت سے ٹھٹک گئی۔ سجاد اتنی بری حالت میں نہیں تھا جتنا اظہار اس نے فون پر کیا تھا۔

"گڈ.......... تو تم نے یہ بھی شروع کر دی۔" رمشا نے کہا اور سجاد اسے گھورنے لگا۔

"یہ انسان کو حوصلہ بخشتی ہے رمشا! اس کی مدد کے بغیر میں وہ نہیں کر سکتا تھا جو میں کرنا چاہتا ہوں۔" سجاد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا لیکن جب اس نے دروازہ بند کیا تو رمشا کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ بدکردار شخص بہرحال ایک طاقتور مرد تھا.......... اور وہ خود..........

"سوری رمشا! آج میں اس وحشی مرد کا کردار ادا کر رہا ہوں جو اپنے اس قدم کو کامیابی کی آخری منزل سمجھتا ہے۔ تمہیں علم ہو گا ثانی چلی گئی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حالات جس نہج پر پہنچ گئے ہیں وہاں تمہارے لئے معافی کا کوئی پہلو نہیں ہو گا۔ چنانچہ مس رمشا! یہ میری آخری کوشش ہے' تم نے میری فرم کو ایک بار پھر ڈبو دیا ہے میں واقعی اس میدان میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اس گستاخی کے بعد میں تم سے شادی کی درخواست کروں گا۔ میں تم سے کہوں گا کہ جلال اسکائینو کو میری فرم میں ضم کر دو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے لیکن یہ اس قدم کے بغیر ممکن نہیں ہو گا جو میں اٹھانے جا رہا ہوں۔"

"خوب .... گویا تم اپنی آخری تصویر بھی میرے سامنے پیش کر چکے۔" رمشا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ابھی نہیں .... وہ تو ابھی.........." سجاد اس پر جھپٹ پڑا۔ رمشا نے اسے

جھکائی دی اور سجاد صوفے پر گر پڑا۔ رمشا نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی شراب کی وزنی بوتل اٹھائی اور پوری قوت سے سجاد کے سر پر دے ماری' دوسری' تیسری اور چوتھی بار اور سجاد کا بھیجہ باہر نکل پڑا۔ پہلی دو ضربوں نے ہی اس کا کام تمام کر دیا تھا' بعد کی ضربیں تو اضافی تھیں۔

رمشا نفرت سے بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی' پھر نفرت سے بھرے لہجے میں بولی۔

"نجومی نے ایک بات تجھے نہیں بتائی تھی سجاد! کہ تیرے لئے دولت کا ذریعہ بننے والی عورت ہی تیری موت کا ذریعہ بنے گی۔" وہ واپس پلٹی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اچانک اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سامنے ہی کوئی کھڑا تھا کچھ لمحے آنکھوں نے ساتھ نہ دیا پھر اس نے اسے پہچان لیا وہ تیمور جمال شاہ ہے۔ رمشا کے ہونٹ کپکپائے لیکن آواز نہ نکل سکی' تب تیمور نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں مس رمشا! میں نے سب کچھ دیکھ بھی لیا اور سن بھی لیا ہے اور میرے خیال میں آپ نے بالکل صحیح قدم اٹھایا ہے' یہ شخص اسی قابل تھا۔"

"شکریہ شاہ صاحب! آپ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا' اب میں اپنے اس عمل کی سزا خوشی سے قبول کر لوں گی۔"

"سزا؟" تیمور جمال نے کہا۔

"ہاں' پھانسی کا پھندہ۔ سزائے موت ہی میری منزل ہے' آپ نے مجھ پر بہت احسانات کئے ہیں۔ اب مجھے میری آخری منزل تک اور پہنچا دیجئے۔ کسی پولیس سٹیشن کیونکہ مجھ میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔"

"آپ کو منزل کی تلاش ہے مس رمشا! ایک بار صرف ایک بار میری ان پیاسی آنکھوں میں بھی جھانک لیجئے' صرف ایک بار .... کاش! ان میں آپ کو آپ کی منزل نظر آ جائے۔"

رمشا چونک پڑی۔ اس نے حیرت سے تیمور جمال کو دیکھا۔ دیکھتی رہی' پھر نہ جانے کس طرح تیمور جمال کے سینے سے اس کا سر جا لگا۔ اسے سکون کی ایک دیوار کا احساس ہوا۔ واقعی منزل تو سامنے تھی۔

تیمور نے اپنی جیب سے موبائل نکال لیا۔ اس پر کوئی نمبر ڈائل کیا اور آواز آنے پر بولا۔

"پتا نوٹ کرو .... یہ ایک فلیٹ ہے' اس کے ڈرائنگ روم میں ایک لاش پڑی ہے' اسے احتیاط سے ٹھکانے لگا دو اور قتل کے تمام نشانات مٹا دو۔ شراب کی بوتل پر انگلیوں کے نشانات بھی ہوں گے۔ کوئی نشان باقی نہ رہے۔"

تیمور نے موبائل بند کیا اور رمشا کو سہارا دیئے فلیٹ سے باہر نکل آیا۔

☆-------☆-------☆

"آہ! انسان کو کیسے کیسے سہارے مل جاتے ہیں۔" سونو کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور محسن چونک پڑا اس نے سونو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"میں سہاروں کی بات کر رہی ہوں۔"

"سنو سونو!"

"ہوں۔"

"انسان کی فطرت کیا ہے؟"

"میں سمجھی نہیں۔"

"یہ تو ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسان فطری طور پر برا نہیں ہوتا۔ وقت اس کے راستے متعین کرتا ہے اور وہ بے اختیار ان رستوں پر چل پڑتا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے؟"

"کیا ہم دونوں بھی وقت کے شکار نہیں ہیں۔"

"ہم دونوں؟"

"ہاں! تم اپنا ماضی دیکھو' تمہارے ماضی کی کہانی کچھ اور بھی ہو سکتی تھی۔"

"بے شک۔"

"میری بھی یہی کیفیت ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"ایک سوال میرے ذہن میں ہے سونو!"

"کیا؟"

"ہم ماضی میں لوٹ کر اپنے دوستوں کی راہ پر نہیں چل سکتے۔" محسن نے کہا اور سونو کی آنکھیں خوابناک ہو گئیں۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا اور ایک انوکھا ماحول اس کے ذہن میں ابھر آیا۔ اس نے خود کو ایک اجنبی روپ میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں

ایک چھوٹی سی بچی ابھر آئی جس کا نام کرن تھا۔

کرن کو بچپن ہی سے سانپ کا تماشا دیکھنے کا شوق تھا۔ جب سپیرا بین بجانا شروع کرتا اور اس کی پٹاری کا ڈھکن کھلتا تو یہ منظر اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ بڑے شوق سے سانپ کو پھن پھیلائے باہر نکلتے دیکھا کرتی لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے سپیروں سے خوف آتا۔ اس نے گھر کے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ سپیرے بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ دور ہی سے تماشا دیکھا کرتی اور دوسرے بچوں کی طرح گھر سے کبھی آٹا یا کوئی اور چیز لے کر سپیرے کے پاس نہ جاتی۔

نہ جانے سانپ اسے کیوں اچھے لگتے تھے۔ سپیروں سے خوف کے باوجود وہ سانپ کا تماشا ضرور دیکھتی تھی اور ہر بار پھن پھیلائے ہوئے رقص کرتے سانپ کو دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح انسانی شکل اختیار کر لے اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ سانپ ہر سال چاند کی چودھویں رات کو اپنی شکل بدل لیتے ہیں اور چاہے تو انسانی جون اختیار کر سکتے ہیں۔

بچپن میں اس نے بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں۔ ناگ شہزادہ' مظلوم ناگن' سانپوں کا راجہ اور ناگن کا انتقام۔ ان سب کہانیوں میں سانپ کو انسانی روپ بدلتے دکھایا گیا تھا۔

بین کی آواز نے اس کے اردگرد حصار بنا رکھا تھا جیسے چاروں طرف سے کوئی کسی کو گھیر لیتا ہے۔ اس کا جی چاہا اٹھ کر خود بھی بین کی لے پر رقص کرنے لگے لیکن پھر خود ہی وہ اپنے اس خیال پر مسکرانے لگی۔ کمرے کو چھوڑا اور کمرے سے نکل کر بالکونی کی گرل کے نزدیک آ گئی۔

سامنے بڑے گیٹ کے پاس ایک سپیرے کو بہت سے بچوں نے گھیر رکھا تھا اس کی نظر سیاہ چمکیلے پھن پھیلائے سانپ پر جم گئی جو بین کی لے پر مسلسل جھوم رہا تھا۔ وہ بالکونی پر جھکی' یہ تماشا دیکھتی رہی۔ پھر اس نے سپیرے کو دیکھا۔ ذہن میں اسی مخصوص سپیرے کا تصور تھا۔ سرخ آنکھوں اور ہیبت ناک شکل پر کالی بڑی بڑی مونچھیں جس کے گال بین بجاتے میں کبھی پھول رہے تھے کبھی پچک رہے تھے لیکن جیسے ہی اس نے سپیرے کو دیکھا' ساکت سی رہ گئی۔ بڑا مختلف سپیرا تھا۔ اس نے کالے رنگ کا کرتہ اور دھوتی پہن رکھی تھی' گلے میں رنگین موتیوں کی مالائیں اور کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے جو بین کی دھن کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

کرن ایک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ کیسا حسین سپیرا تھا۔ عجب سنہری گندم کی سی

رنگت یونانی نقوش گھنیری پلکوں والی سیاہ ادھ کھلی آنکھیں جن میں عجیب سا خمار تھا اس کے گال واقعی بین بجاتے ہوئے پھول اور پچک رہے تھے مگر کرن کو یہ عمل بے حد خوبصورت لگا۔

تمام بچے دلچسپی سے سانپ کو جھومتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن وہ سپیرے کی ذات میں گم تھی۔ اچانک بین بجاتے ہوئے سپیرے کی ادھ کھلی خمار آلود آنکھیں کرن سے ٹکرائیں اور بین کی اونچی آواز دم توڑنے لگی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ سرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں۔ کرن کو ان آنکھوں سے بالکل خوف محسوس نہ ہوا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آنکھیں ایک نشہ بن کر اس کی روح میں اتر رہی ہوں۔

اس نے سر کو جھٹکنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو پھر بھاری بین اس کے نرم ہونٹوں سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں غیر معمولی سیاہی اور چمک تھی۔

بین کی آواز مدھم پڑی تو سانپ پٹاری میں چلا گیا تھا اور بچے شور مچانے لگے۔

"ابھی اور .... ابھی اور.........."

لیکن سپیرا اور کرن ان آوازوں سے بہت دور پہنچ چکے تھے۔ یکایک کرن نے ایک جھرجھری سی لی۔

"یہ تجھے کیا ہو گیا کرن........" اس نے شرمسار ہو کر سوچا اور پھر تیزی سے واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ یکایک اسے محسوس ہوا جیسے اس کے پیر پتھر کے ہو گئے ہوں۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی مگر بڑھ نہیں سکتی تھی۔ عجیب خواب کی سی کیفیت تھی۔

سپیرے نے دوبارہ بین پر بڑی پُرسوز لے چھیڑ دی۔ کرن کا دل ڈوبنے لگا' اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ دوبارہ ٹیرس میں کھڑی ہو کر سپیرے کو دیکھے لیکن اپنی تمام تر قوت ارادی کو جمع کر کے وہ اپنے بھاری قدم کو گھسیٹتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سپیرے کی بین کی دھن مایوس ہو کر خاموش ہو گئی۔

"یہ تو .... کیا کرنے چلی تھی کرن۔" اس نے کانپ کر سوچا۔ "شریف لڑکیوں کے تو یہ چلن نہیں ہوتے تو سید زبیر کی بیٹی ایک سپیرے کے لئے اپنے بوڑھے باپ کی سفید داڑھی کو کالک لگانے چلی تھی۔ کیا تو پاگل ہو گئی ہے۔" وہ اپنے آپ سے جدوجہد کرتی کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے اس سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی لیکن

نہ جانے کیا بات تھی سپیرے کا چہرہ تصویر بن کر اس کی آنکھوں میں اور اس کا وجود ایک غیر مرئی قوت بن کر اس پر چھا گیا تھا۔

سیاہ کپڑے 'رنگین موتیوں کی مالائیں' کانوں میں بالے 'سنہری گندمی رنگت' کالی سحر طراز آنکھیں' اونچی ناک مسکراتے نرم لب۔ کرن کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ سپیرا نہیں حسین جادوگر ہو۔ جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہو۔

اس نے خود کو پھر کام میں مصروف کرنا چاہا مگر کڑھائی کے ریشمی ڈوریاں اور رنگین موتی سپیرے کے گلے میں پڑی مالاؤں کی شکل اختیار کر گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ادھورے کام پر سر ٹکا دیا۔

اسی لمحے ایک نوجوان عورت نے چپکے سے کمرے میں جھانکا.......... اے .... شش.......... ہوش میں آؤ اس نے سرگوشی کی کرن نے چونک کے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہوا تمہیں۔" وہ اس کے قریب چلی آئی۔

"کچھ نہیں۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"انڈسٹریل ہوم نہیں جانا۔"

"نہیں نسرین آپا! آج دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

"دل کیا چاہ رہا ہے؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔ نسرین آپا ان کے پڑوس میں رہتی تھیں ان کی شادی کو چار پانچ برس ہوئے تھے۔ ایک بیٹا تھا دونوں ایک انڈسٹریل ہوم میں کڑھائی کا کورس کر رہی تھیں۔ عمر میں فرق ہونے کے باوجود دونوں اچھی دوست تھیں۔

کرن نے سوچا وہ اپنے اندر کا ماجرا آپا سے بیان کر دے۔ مگر پھر وہ ضبط کر گئی۔ بھلا وہ کیا سوچیں گی کہ اچھی بھلی اور باشعور پڑھی لکھی لڑکی کیوں ایسا سوچ رہی ہے اور بہت سے لوگ بھی حسین ہیں۔ یہ ایک سانپ والا ہی کیا۔ اس نے تو بہت سے گھٹیا ترین لوگوں میں بھی حسن دیکھا تھا۔ بس کنڈیکٹر' سبزی والے' دھوبی' قصائی اور انہیں دیکھ کر وہ اور نسرین آپا رائے زنی کیا کرتے تھے۔

"ہائے نسرین آپا! دیکھو تو گویا خدا نے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اگر میلی شلوار قمیض اتار کر ڈھنگ کے کپڑے پہن لے تو.........."

"تو کرن.......... دل و جان سے تین بار ہاں کہہ دے۔" آپا اس کی بات کاٹ کر قہقہہ لگاتی۔ پھر وہ کہتی۔

"ذرا دیکھو کرن! یہ قصائی کیسا خوبصورت ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں چھرا اور گوشت نہ ہوتا تو.........."

"تو آپ ناصر بھائی سے فوراً طلاق لے لیتیں۔" کرن چھیڑتی یوں دونوں اکثر آپس میں ہنسی مذاق کیا کرتیں۔

مگر آج اس کی حالت کیسی تھی۔ آپا کو معلوم ہوتا تو سر پیٹ لیتیں۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ سن کر وہ واپس چلی گئیں اور کرن یونہی کھوئی کھوئی سے خلا میں گھورتی رہی۔ کبھی تصور میں اسے اپنے ماحول میں دیکھتی اور کبھی اس کے ماحول میں ڈھل جاتی۔

سارا دن اس کی یہی کیفیت رہی اس نے بارہا خود کو سمجھایا کہ یہ بڑی فضول سی بات ہے۔ بھلا ایک نظر میں کبھی کسی سے یوں زندگی وابستہ کی جا سکتی ہے۔ پھر وہ خانہ بدوش سپیرا گلی گلی پھر کر سانپ کا تماشا دکھانے والا بنجارہ اور وہ سید زبیر کے شریف اور باعزت گھرانے کی بیٹی۔ بھلا ان کا آپس میں کیا میل۔ آخر وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے ناممکن .... اس نے سر جھٹک کر خود کو سمجھایا پھر بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھی اور مطمئن ہو کر سو گئی۔

صبح معمول کے مطابق اٹھی۔ گھر کی صفائی اس کے ذمے تھی۔ باقی کام اس کی ماں کیا کرتی تھی۔ جھاڑن ہاتھ میں لئے وہ کمرے میں گرد جھاڑتی پھر رہی تھی کہ یکایک تھنک کر رک گئی وہی بین کی آواز فضا میں پھیل رہی تھی۔ اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوڑ کر بالکونی میں جائے اس نے دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر خود کو سنبھال لیا اور خود اعتمادی سے کام لے کر خود کو باہر جانے سے روک لیا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی باہر کی طرف لپکے جانے کتنی دیر وہ سانپ کا تماشا دکھاتا رہا اور پھر چلا گیا۔

اب وہ ہر روز وہاں آنے لگا اور ہر روز کرن کے اندر ایک عجیب سا خوف سرسرانے لگتا لیکن پھر بھی اس نے حسین سپیرے کا سامنا نہ کیا وہ سوچتی وہ ہر روز کیوں آنے لگا ہے۔ کیا اس کی نگاہ بھی سپیرے پر اثر کر گئی ہے اس نے اپنے آپ سے پوچھا پھر ہنس دی۔

ارے کرن بی بی تجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے اس کے ڈیرے کی لڑکیاں کیا کم حسین ہوتی ہوں گی لیکن پھر ایک عجیب سے خوف نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھا۔

ایک رات اس نے خواب میں دیکھا جیسے کوئی سانپ اس کے بدن پر رینگ رہا ہو وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سانپ کا وجود محض ایک خواب نکلا۔

پھر یہ خواب اس نے کئی بار دیکھا' رات کو وہ بے حد خوف زدہ رہتی لیکن دن کے وقت اپنے اس خوف پر خود ہی شرمندہ ہو جاتی وہ سمجھتی تھی کہ سپیرے کا خیال اسے لاشعوری طور پر یہ خواب دکھاتا ہے۔

پھر انہی دنوں میں اس کی پھوپھی کے بیٹے شہزاد سے اس کے رشتے کی بات چل نکلی۔ شہزاد چار سال پہلے پاکستان سے ڈنمارک گیا تھا اس وقت کسی کو اس رشتے کا وہم و گمان بھی نہ تھا مگر اب والدین آپس میں رشتے طے کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ برسات کے دن تھے۔

جس روز اس کی منگنی تھی آپا نے چھیڑ چھیڑ کر کرن کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کرن کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ جب بھی وہ شہزاد کی ہنستی مسکراتی صورت کو ذہن میں لانے کی کوشش کرتی ایک دھند سی چھا جاتی۔

وہ ابھی ڈنمارک میں ہی تھا منگنی کی رسم صرف رشتہ طے ہونے کا اعلان تھی۔ شادی کا پروگرام اس کی واپسی پر رکھا گیا تھا۔

اس کی پھوپھی اس کے لئے سرخ بھاری سی ساڑھی لائی تھیں۔ لڑکیوں نے اسے بالکل دلہن کی طرح سجایا سنوارا تھا۔ جس کمرے میں کرن تھی وہ لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ پھر بھی جانے کس طرح وہ تیز زہریلا سانپ کرن کے اوپر چڑھ گیا۔ اسے معلوم نہ ہوا اور وہ اس کی ریشمی ساڑھی میں سرسراتا ہوا اس کی گردن میں آ گیا۔ بس وہ ایک تیز چیخ تھی کرن کی جس پر گھبرا کر لڑکیوں نے دیکھا وہ پتلا سا زہریلا سانپ اس کی گردن پر ڈس کر تیزی سے بیڈ کے نیچے غائب ہو گیا تھا۔

چیخ کے ساتھ ہی کرن کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ لڑکیوں کی وحشت ناک چیخوں سے سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ کرن بے ہوش ہو چکی تھی۔

کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آپا کا شوہر جو بڑا کاروباری آدمی تھا۔ کسی سے کچھ نہ بولا۔ فوراً اپنا بائیک سٹارٹ کیا اور چلا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا وہ ڈاکٹر کو لینے گیا ہے لیکن کچھ دیر بعد وہ آیا تو اس کے ساتھ دو سپیرے تھے۔ معلوم ہوا اپنے علاقے میں کہیں اس نے سپیروں کا ڈیرہ دیکھا تھا۔ اس لئے جا کر انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ بات

سن کر فوراً چلنے کو تیار ہو گئے۔

بوڑھے سپیرے نے پانی گرم کرنے کو کہا اور ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس منگوایا اور نوجوان سپیرے نے آگے بڑھ کر زخم کا معائنہ کیا۔ گرم پانی آیا تو اس نے احتیاط سے زخم دھویا پھر ساتھ لائے ہوئے تیز دھار آلے سے زخم پر چیرا دیا اور منہ رکھ کر زہر چوسنا شروع کر دیا پھر اس نے سارا زہر چوس کر فرش پر تھوک دیا۔ باپ نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا اور نوجوان سپیرے نے پانی لے کر اچھی طرح منہ صاف کیا اور پانی باہر پھینک دیا۔ کئی بار یہ عمل دوہرا کر دونوں واپس جانے کو تیار ہو گئے۔

اس اثنا میں سانپ کو تلاش کیا گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ سب کا خیال تھا کہ برسات کے باعث کہیں زمین سے باہر نکل آیا تھا۔

کچھ دیر کرن یونہی ساکت لیٹی رہی پھر آہستہ آہستہ اس کی کانپتی پلکیں کھل گئیں۔ نوجوان سپیرا اسے وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔ کرن نے دل پر ہاتھ رکھا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

اس کے ماں باپ جن کے چہرے بیٹی کی موت کے خوف نے زرد کر دیئے تھے ایک لمحے کو چمک کر پھر بجھ گئے۔ پھوپھی اور ماں تڑپ کر رو دیں۔

"آپ گھبرائیں نہیں۔" نوجوان سپیرے نے مسکرا کر کہا۔ "یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اسے ہوش میں لاؤ۔"

پھر واقعی آپا نے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے تو وہ جلدی ہی ہوش میں آ گئی۔ باپ نے احسان مند نظروں سے سپیرے کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"بیٹے! تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بتاؤ ہم تمہاری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔"

"کچھ نہیں بابا!" وہ عجیب سی نگاہوں سے کرن کو دیکھتا رہا۔ "اس کا کوئی صلہ نہیں بس آپ مجھے یاد رکھنا۔"

"ہاں بیٹا! ضرور یاد رکھیں گے' کیسے نہیں رکھیں گے۔" سید زبیر نے محبت سے کہا۔ "ہمیں بتاؤ کیا نام ہے تمہارا کہاں رہتے ہو؟"

"آپ لوگ بیٹھیں بابا!" ناصر بھائی نے بوڑھے سپیرے کو کرسی پر بٹھایا لیکن نوجوان سپیرا کرن کے بستر کے قریب کھڑا رہا۔

"میرا نام جانا ہے۔" اس نے ایک نظر کرن کو دیکھا۔ "اور ہم کسی ایک جگہ نہیں

رہیے' کبھی کہیں' کبھی کہیں۔"

زبیر نے بہت اصرار کے ساتھ کچھ نوٹ اسے دینے چاہے لیکن دونوں باپ بیٹے نے انکار کر دیا اور خالی ہاتھ واپس چلے گئے۔

منگنی کی رسم جیسے تیسے ادا ہو گئی۔ مگر ایک دہشت تھی جو سب کے دلوں پر چھا گئی تھی۔ ہاتھ میں شیراز کے نام کی خوبصورت انگوٹھی پہن کر کرن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی خاموش ہو گئی تھی۔

منگنی کی رات ساری لڑکیاں تھکی تھکائی وقت سے کچھ پہلے ہی سو گئیں۔ مگر کرن نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ رات کے آخری پہر نیند کا جب غلبہ ہوا تو اس نے دیکھا۔ دور تک ایک نیلا گہرا سمندر ہے اور وہی سپیرا پانی کی سطح پر اپنے مخصوص کالے لباس میں کھڑا ہے اور وہ خود گیلی ریت پر اس کی طرف دوڑتی چلی جا رہی ہے۔ جانا ادھر آؤ .... جانا قریب آؤ۔ وہ پکار رہی تھی مگر وہ لمحہ لمحہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یکایک ایک اونچی لہر ان دونوں کو نزدیک لے آئی بہت نزدیک اب وہ جانا کے مضبوط جسم اور آہنی بازوؤں کے حصار میں تھی۔ اس کے کالے کپڑوں سے ایک عجیب سی بو آ رہی تھی۔ جو کرن کو ناگوار محسوس نہیں ہو رہی تھی اور پھر اس کی نیند ٹوٹ گئی جاگ جانے کے باوجود عجیب بات تھی۔ یہ احساس بڑا حیران کن تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھی لیکن جانا بھی وہاں موجود تھا۔ اپنے گرد آتے بازوؤں کو دیکھ کر کرن نے زور سے چیخ ماری۔ جانا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے بیڈ کے نیچے گم ہو گیا۔ چیخ سن کر کمرے میں موجود لوگ جاگ گئے وہ اپنے بستر پر بیٹھی کانپ رہی تھی۔ سب نے یہی خیال کیا کہ وہ خواب میں ڈر گئی تھی۔

اگلی رات کسی انجانے خوف کی وجہ سے اس نے لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہ جھپکائی۔

بس جانا کا خیال تھا جو دل' ذہن روح میں کروٹیں لے رہا تھا اور جب آدھی رات گزر گئی تو یکایک اس نے کھڑکی سے اسے اترتے دیکھا اس کا دل ساکت رہ گیا۔ جانا دبے پاؤں چلتا اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔

"یہاں کیوں آئے ہو جانا۔" کرن نے سرگوشی میں احتجاج کیا۔

"میں تجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" جانا نے بھاری آواز میں کہا۔ "تو ابھی میرے ساتھ چل کرن۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس نے کہا۔

"میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا کرن میں ہمیشہ تیرے آس پاس تیرے نزدیک رہوں گا۔ یاد رکھنا.........تو میری ہے......... صرف میری۔"

"سونو!" محسن کی آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے محسن کو دیکھنے لگی۔ پھر بے اختیار بولی۔

"جی.........؟"

"کیا بات۔ کس خیال میں کھوئی ہوئی تھیں۔"

"کون ہوں میں۔ کیا کرن؟"

"سونو ہوش میں آؤ۔"

"ہوش میں آ جاؤں۔" سونو نے بدستور عجیب سے انداز میں کہا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔"

"تیمور نے رمشا کو سہارا دیا۔ جانا نے کرن کو۔ میرا کوئی سہارا ہے محسن۔"

"اس کا جواب میں تمہیں جلدی دوں گا۔" محسن نے کہا۔

دوسرے ہی دن محسن سونو کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ ایک تیز رفتار بہتے دریا کے پل پر رک کر محسن نے وہ پراسرار ہیرا نکالا اور سونو سے کہا۔ "یہ ہیرا ہم دونوں کی ملکیت ہے سونو۔ تمہیں اس کی خصوصیات معلوم ہیں نا۔"

"یہ سوال کیوں کر رہے ہو محسن!" سونو نے کہا۔

"اس کی پہلی خوبی .... یہ انسانوں کے ذہن کھول دیتا ہے اور ہم اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ کیا اس کی دوسری خوبی پر تم نے غور نہیں کیا تھا سونو۔"

"وہ کیا.........؟"

"اس نے ہمیں خود میں الجھا کر جرم کی دنیا سے دور کر دیا۔ سونو ہم اس کی کہانیوں میں ایسے گم ہوئے کہ ہم نے اس دوران کچھ نہیں کیا۔ گویا ہم جرم سے بچے۔"

"ارے۔ ہاں۔ واقعی ایسا تو ہوا۔"

"اس نے ہماری اصلاح تو کر دی البتہ ہمیں عمل کی دنیا سے دور کر دیا۔ یہ دیکھو سونو۔ میں کیا کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اچانک محسن نے وہ ہیرا دریا میں اچھال دیا۔ سونو کے حلق سے ایک آواز سی نکلی لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔

"کیا میں نے غلط کیا سونو؟"

"نہیں۔" سونو تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔ آؤ میں تیمور ہوں۔ اب میں تمہیں اس دنیا میں سہارا دوں گا۔ ہم دنیا کو بتائیں گے۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ ہمارے بچے پیدا ہوں گے۔ ہم اس معاشرے میں دنیا میں ایک بہتر مقام بنائیں گے آؤ سونو۔" محسن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سونو اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اسے اپنا وجود بہت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔

☆------ ختم شد ------☆